قرآن حکیم کی مقدس آیات و احادیث نبوی آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور تبلیغ کے لئے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے لہذا جن صفحات پر آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

جلد 24 ❖ شمارہ 05 ❖ اپریل 2014ء

ماہنامہ سرگزشت کراچی

مدیرہ اعلیٰ: عذرا رسول

مصور: شاہد حسین

شعبۂ اشتہارات

منیجر اشتہارات محمد شہزاد خان 0333-2256789

نمائندہ کراچی محمد رمضان خان 0333-2168391

رانا محمد حمید 0323-2895528

نمائندہ لاہور فراز علی نازش 0300-4214400

◆◆◆

قیمت فی پرچہ 60 روپے ❖ زرِ سالانہ 700 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول

مقامِ اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ، کراچی 75500

پرنٹر: جمیل حسن

مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس، ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط و کتابت کا پتا ● پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone :35804200 Fax :35802551

E-mail: jdpgroup@hotmail.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قارئین کرام!
السلام علیکم!

مرے ہم وطنو! ہوشیار ہو جائیں۔ بس اگلا مہینا رجب کا ہے۔ یعنی تہواروں کی شروعات ہونے والی ہے۔ رجب کے بعد شبِ برأت پھر رمضان اور پھر عید۔ اسی دوران بجٹ کا شور بھی اٹھے گا۔ کچھ چیزوں پر نئے ٹیکس لگیں گے اور وہ مہنگی ہوں گی مگر اس سے پہلے تاجر برادری خود ہی کچھ چیزوں کی قیمت میں اضافہ کر دے گی۔ یہ بھی قابلِ غور بات ہے کہ تہوار ہر ملک و مذہب میں رائج ہیں یورپ میں عیسائیوں کی اکثریت ہے۔ وہ جب کرسمس کی آمد دیکھتے ہیں تو تمام سامان کی سیل لگا دیتے ہیں تاکہ غریب غربا بھی خوشیوں میں شریک ہو سکیں۔ یہودی بھی اپنے تہوار پر ہر چیز سستی کر دیتے ہیں کہ وہ بھی ثواب میں شریک ہو جائیں۔ اہلِ ہنود، کفر پر قائم ہیں۔ خود سے بنائی ہوئی مورتیوں کو رکھ کر خدا کے بجائے اسے سجدہ کرتے ہیں اور ان ایام میں یعنی دُرگا پوجا اور کالی پوجا کے وقت خصوصی سیل کا اہتمام کرتے ہیں۔ سنتے ہیں کہ ان کے ہاں رہ گئے مسلمان بھی ”عید“ کے موقع پر خصوصی بازار لگاتے ہیں جن کو ”لُوٹ بازار“ کہتے ہیں۔ لیکن ہمارے ہاں؟ اب آپ خود غور کریں کہ کیا ہم خود کو امتِ محمدیؐ کہتے ہوئے شرم محسوس نہیں کریں گے؟ مگر کیا کریں بقول نورالصباح بیگم

جہاں کہ آج بھی انسانیت کی قدر نہیں
وہاں آج بھی انسان تلاش کرتے ہیں

معراج رسول

پہلوان مبلغ

سرگزشت

جاپان کی سرزمین پر 1943ء میں اس نے جنم لیا۔ ابھی صرف پانچ سال کا تھا کہ اس کے سر سے باپ کا سایہ اٹھ گیا۔ اب وہ بھری دنیا میں بالکل اکیلا ہو چکا تھا۔ دن بھر ادھر سے اُدھر پھرنا، بس یہی ایک کام تھا، پڑھائی سے اسے زیادہ دلچسپی نہ تھی پھر ایک اور وجہ بھی تھی۔ جاپان میں لوگوں کا قد ساڑھے چار سے پانچ فٹ کا تھا جبکہ وہ جب کلاس سیون میں تھا تو اس وقت بھی اس کا قد چھ فٹ تھا۔ اسی وجہ سے کلاس کے لڑکے اسے ”لمبا پیڑ“ کہہ کر چھیڑتے تھے۔ جواب میں وہ ان کی دھنائی کرتا، اسی مار کٹائی سے اسے کراٹے کا شوق ہو گیا اور وہ دلجمعی سے اس کھیل کو سیکھنے کی کوشش کرنے لگا۔ صرف دو سال میں وہ اس کھیل میں اس قدر طاق ہو گیا کہ پورے علاقے میں کوئی اس کا ہم سر نہ تھا۔ اس نے باسکٹ بال کی ٹیم میں بھی جگہ بنالی تھی۔ لمبے قد کی وجہ سے وہ خوب فائدہ اٹھا رہا تھا۔ اس کے پاس بال آتے ہی باسکٹ میں جانا یقینی تھا اس لیے سب اسے اپنی ٹیم میں رکھنا چاہتے۔ باسکٹ بال کھیلنے کے لیے وہ دور دور کے شہروں تک جاتا اور انعامات حاصل کرتا۔ جس طرح وہ باسکٹ بال کی دنیا میں نام پیدا کر رہا تھا اسی طرح وہ کراٹے میں بھی شہرت حاصل کرتا جا رہا تھا۔ اس کھیل میں بھی اس کا قد مددگار تھا۔ شاٹ پٹ اور ڈسک تھرو میں بھی اس نے خاصا نام کما لیا تھا۔ گویا جس کھیل کی طرف توجہ کرتا وہ اس میں طاق ہو جاتا۔ اسی دوران یعنی جب وہ 14 سال کا تھا دوسری جنگِ عظیم شروع ہو گئی۔ اس جنگ میں جاپان بھی کود پڑا تھا۔ ایک طرف اتحادی تھے تو دوسری طرف جرمن اور جاپان۔ جنگ کا سیدھا اثر جاپان کی معیشت پر پڑا تھا۔ گراں بازاری عام ہو گئی تھی اور آمدن کا رستہ رک گیا تھا۔ بہتر آمدن کے خیال سے اس کے دادا نے کسی اور ملک میں ہجرت کی ٹھان لی پھر ایک رات یہ پورا خاندان برازیل کے لیے نکل پڑا۔ برازیل میں اس خاندان کو زیادہ پذیرائی نہیں ملی، بس روکھی سوکھی پر گزارا ہو رہا تھا۔ وہاں کے ایام خاصے دشوار تھے۔ گھر بھر کو مل کر محنت کرنا پڑ رہی تھی کہ ایک اور دشوار مرحلہ آ پہنچا۔ اس گھر کا سربراہ یعنی اس کے دادا کا انتقال ہو گیا۔ اس وجہ سے پورا گھرانا مشکلات میں گھر گیا۔ آمدنی نصف سے زائد گھٹ گئی تھی۔ اس قلیل آمدنی میں گھر کا خرچ پورا ہونا دشوار تھا نتیجہ یہ کہ فاقوں نے اس کے گھر کا رستہ دیکھ لیا۔ وہ ایسی حالت میں جب شکم کی آگ جلا رہی ہو محنت کرنا دشوار ترین امر ہو مگر وہ ڈٹا رہا، پہلے کی طرح کھیلوں میں حصہ لیتا رہا۔ اس کی تیزی پھرتی یہاں بھی کام آ رہی تھی۔ وہ نام پیدا کرتا جا رہا تھا۔ اسی دوران اس نے ڈسک تھرو چیمپئن شپ جیت لی۔ یہ ایک بڑی کامیابی تھی۔ اس کے گھر والے بھی خوش ہو گئے مگر انہیں اس اعزاز سے زیادہ اس رقم کی خوشی تھی جو اسے ملی تھی۔ اب وہ سترہ سال کا ہو چکا تھا۔ انہی دنوں اس کے گھر والوں نے وطن واپسی کا ارادہ کر لیا اور وہ برازیل سے جاپان لوٹ آیا۔ گزرتے وقت کے ساتھ اس نے کھیلوں میں مہارت حاصل کر لی تھی اس لیے جاپان آتے ہی اس نے قومی سطح پر کھیلنا شروع کر دیا مگر اب اس نے ڈسک تھرو، جولنگ تھرو اور دیگر کھیلوں سے ذہن موڑ لیا تھا۔ اس نے ساری توجہ کراٹے کی جانب مبذول کر لی تھی اور اس کھیل میں جدت لانے کی پوری کوشش کر رہا تھا۔ 1979ء میں اس نے جاپان کے کھیلوں کی تاریخ میں ایک نئے باب کا اضافہ کر دیا۔ اس نے عالمی چیمپئن باب بیک لن کو تاریخی شکست دے کر ریسلنگ کا عالمی اعزاز جاپان کے نام کر لیا۔ ورلڈ چیمپئن بننے کے بعد بھی وہ نت نئے تجربات کرتا رہا، عالمی ہیوی ویٹ چیمپئن محمد علی کلے کو باکسنگ کی دنیا کا بے تاج بادشاہ کہا جاتا تھا۔ اس نے اس اعزاز یافتہ شخص کو جاپان مدعو کیا اور اس کے ساتھ کشتی کے مقابلے کا انعقاد کیا۔ یہ مقابلہ بھی خوب تھا۔ ایک جانب باکسنگ کی دنیا کا بادشاہ دوسری جانب وہ جسے باکسنگ کی ابجد سے بھی واقفیت نہ تھی پھر بھی رِنگ میں خم ٹھونک کر اترا تھا۔ اس نے اس مقابلے میں ایک نئی تکنیک اپنائی تھی۔ پوری کشتی اس نے لیٹ کر لڑی۔ اسی دہائی میں اس نے پاکستان کا بھی دورہ کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ برصغیر کا فنِ کشتی اپنی نوعیت میں منفرد ہے۔ وہ یہاں کے پہلوانوں کو آزمانا چاہتا تھا۔ اس سلسلے میں اس نے پاکستانی پہلوانوں کو چیلنج دیا تھا۔ جھارا پہلوان اور اکرم پہلوان سے اس نے مقابلہ کیا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ جاپان کی طرح پاکستان میں بھی مقبول ہو گیا، پاکستان آ کر یہاں کے لوگوں کے اخلاق سے متاثر ہو کر اس نے اسلام کا مطالعہ شروع کر دیا۔ انگریزی اور دیگر زبانوں میں مذہبِ اسلام پر لکھی گئی کئی سو کتابوں کا اس نے مطالعہ کیا اور پھر 1980ء کی دہائی میں اس نے مذہبِ حق قبول کر لیا، وہ عیسائی مذہب سے تعلق رکھتا تھا۔ اس نے بدھ مذہب سے تعلق رکھنے والی ایک مشہور ٹی وی آرٹسٹ سے شادی کی تھی اور اس کی ایک بچی تھی، ان تینوں نے ایک ساتھ مذہبِ اسلام قبول کیا تھا۔ وہ جاپان کے قومی ہیروز میں شامل ہے۔ اس پر اس کی قوم فخر کرتی ہے۔ اپنے ملک میں لیجنڈ کے طور پر جانا جاتا ہے۔ اس لیے اس کی اسلام سے دلچسپی نے گہرا اثر ڈالا اور جاپان میں اسلام سے دلچسپی بڑھ گئی۔ اس لیجنڈ پرسن کا پرانا نام انتونیو انوکی ہے جو اب انوکی محمد حسین کے نام سے پہچانا جاتا ہے اور جاپان میں اسلام کی تبلیغ میں بھرپور حصہ لیتا ہے۔

☆ منشی محمد عزیز مئے کا خلوص نامہ لندن، وہاڑی سے " سرگزشت کے پرانے شمارے حاصل کرنے کی خاطر پرویز بلگرامی صاحب کے علاوہ لاہور، راولپنڈی، چکوال، بورے والا اور کراچی سے پشاور تک بہت سے افراد کو فون اور میسج کر چکا ہوں اور سرگزشت کے شہرِ خیال کے ساتھیوں تک میری یہ درخواست آپ پہنچادیں کہ اگر کوئی بھی صاحب یا خاتون 2012ء سے پہلے کے تقریباً تمام شمارے قیمتاً بیچنا چاہیں تو میں وہ تمام شمارے خریدنے کو تیار ہوں اور اس بات کے لیے تین سو کلو میٹر تک کا فاصلہ آنکھیں بند کر کے طے کرسکتا ہوں۔ چند روز قبل پرانے شماروں کی خاطر ملتان کا چکر لگایا اور صد شکر کہ ہزار روپے کرائے پر خرچ کے عوض تقریباً چوبیس پرانے شمارے ہاتھ لگے۔ اگر میں آپ کو وہ ساری باتیں بتانے بیٹھ جاؤں جو میں سرگزشت کی خاطر ان دنوں کر رہا ہوں تو بہت سے صفحات بھر جائیں گے مگر میرا دل نہیں بھرے گا۔ لہٰذا اس سے پہلے کہ آپ کا موڈ مکمل طور پر خراب ہوجائے، چلتے ہیں تازہ شمارے کی طرف۔ حسبِ معمول ابتدا سرورق سے کرتے ہیں، جہاں ایک حسینہ صاف چھپتے بھی نہیں نظر آتے بھی نہیں، والے مصرع کی عملی تصویر بننے کی ناکام سعی کررہی تھی۔ اشتہارات کو کراس کرتے ہوئے اداریے تک پہنچے جہاں محترم معراج رسول صاحب ہمارے ازلی دشمن کی سفاکانہ اور وحشیانہ درندگی کو بے نقاب کررہے تھے۔ انشاء اللہ ہمارا دشمن ناکام ونامراد رہے گا اور پاکستان کا نام تاابد قائم ودائم رہے گا (انشاء اللہ) مگر ہمیں بھی چاہیے کہ ہم اپنا احتساب کریں اور اپنی خامیوں اور کمزوریوں کو ختم کردیں۔ عہد ساز میں ڈاکٹر شریف ہاشانی کی زندگی کے حالات مختصراً مگر تفصیلاً پڑھے۔ شہرِ خیال کی صدارت وحید ریاست بھٹی کے حصے میں آئی۔ بھٹی صاحب! قبول فرمائیں مبارکبادیوں کو اور ہاں، سالانہ کارکردگی مرتب کرنے کا کام یقیناً بہت باریکی اور محنت طلب ہے لیکن آپ آئندہ بھی یہ سلسلہ جاری رکھیے گا۔ تبصرہ بڑا زبردست تھا آپ کا۔ بشریٰ افضل کا خط کچھ ادھورا سا لگ رہا تھا۔ قیصر عباس ڈیئر! اب دیکھیں تین تاریخ کو سرگزشت ملا ہے۔ پھر پڑھنا بھی ہے اور خط بھیجے اور کراچی پہنچتے پہنچتے تو چودہ پندرہ تاریخ ہوجاتی ہے عام ڈاک سے۔ رانا محمد شاہد جی، مجبوں میں کیسا حساب کرنا، یہی سوچ کر دل کو تسلی دے لیتے ہیں۔ عبدالخالق بھٹی! صدر پریس کلب کیا حال ہیں؟ بہت شکریہ پیارے بھائی۔ اب انشاء اللہ یہ سلسلہ ٹوٹنے نہیں پائے گا۔ وعلیکم السلام ڈاکٹر روبینہ نفیس بہنا! دیکھیے آپ لوگوں کی فضول باتوں کو دل پہ مت لیا کریں۔ دنیا کا کیا ہے۔ یہ تو کسی کو خوش دیکھ نہیں سکتی۔ آپ تھوڑا فریش اور خوش خوش رہا کریں۔ ٹھیک ہے ناں؟ ہر ایک بھائی کا مشورہ ہے۔ عمران ساحل جی! بہت شکریہ خط کی پسندیدگی پر اور ہاں ناراض نہیں ہوا کرتے بلکہ میری طرح ناراضی کا اظہار لبے لبے خطوط لکھ کر کیا کریں۔ جی آیاں نوں قرۃ العین جی! اعجاز حسین سنھار صاحب! آپ کے بھتیجے جواد سے آپ کا رابطہ نمبر لے لیا ہے انشاء اللہ رابطہ کروں گا۔ عمرے کی سعادت پہ مبارکباد قبول فرمایئے اور ہمارے لیے بھی دعا کرتے رہا کریں۔ سدرہ بانو ناگوری! شمیم بانو اور ڈاکٹر اقرا ابا تو کہاں ہوتی ہیں آج کل۔ محترمہ آپ نے بجا فرمایا لیکن پھر بھی کچھ تو ہونا چاہیے ورنہ قیمت سے زیادہ قیمتی تو صرف اقتباسات اور کترنیں ہوتی ہیں۔ جو برصغیر کے کسی ڈائجسٹ رسالے میں نہیں ملیں گی۔ ہر سطر قیمتی ہوتی ہے۔ تاریخی، فلمی اور اسلامی مضامین وغیرہ تو بالکل بونس میں سمجھیں اور اسی بات کے لیے تو ہم تین چار سو روپے کی بھی پروا نہیں کرتے۔ وحید ریاست بھٹی، آفتاب احمد نصیر اشرفی، ناصر حسین رند اور سدرہ بانو ناگوری کے خطوط تبصروں سے بھرپور تھے۔ رانا محمد شاہد، عزیز اللہ، قرۃ العین اور محسن مصطفیٰ نے بھی خوب لکھا۔ بیت بازی میں فاطمہ بانو ترمذی، امتیاز توقیر شاہ، ندرت بانو اور نسرین یاسین کا انتخاب پسند آیا اور ہاں کوپن کے حوالے سے ایک ضروری بات کہ پلیز کوپن اس طرح دیا کریں کہ اس کے دوسری طرف کوئی اشتہار نہ ہو، علمی آزمائش ہو کیونکہ پھر یہ چیز ریکارڈ سے غائب ہوجاتی ہے۔ علمی آزمائش نے سنچری پوری کرلی۔ مبارکباد قبول فرمایئے اور اس سلسلے کو رو کیے گا نہیں۔ شہزادی، اس مرتبہ ڈاکٹر ساجد امجد صاحب بھوپال کی شہزادی عابدہ سلطان کی داستانِ حیات لائے ہیں۔ شہزادی صاحبہ کے متعلق میں نے پہلی دفعہ پڑھا معلومات میں اضافہ ہوا ہے۔ کتنی عجیب وغریب اور حیرت انگیز شخصیت تھی محترمہ کی۔ بابائے ادب میں ابن کبیر مارک ٹوئن سے متعارف کروا رہے

تھے۔ ویسے حیرت انگیز اور ناقابلِ یقین بات لگتی ہے کہ مارک ٹوئن کو کم وبیش ہر حادثے سے متعلق پہلے علم ہوجاتا تھا۔ دم دار ستارے کے ساتھ ہی وہ بھی طلوع اور غروب ہوا۔ ویسے اس کی چالاکی پر بہت ہنسی آئی جب وہ جان بوجھ کر بگھی سے گر کر زخمی ہوگیا۔ ترکی نمی دانم میں ہم بھی محترم علی سفیان آفاقی کے ساتھ صرف ساٹھ روپے میں ترکی کی سیر کر آئے۔ ڈاکٹر عبدالرب بھٹی شاہانِ عشق، کے عنوان سے نپولین بوناپارٹ کے عشق کی داستان سنا رہے تھے جو کہ اپنے ہی جونیئر کی بیوی کے عشق میں مبتلا ہوگیا تھا۔ فلمی الف لیلہٰ میں آفاقی صاحب اس مرتبہ سنیل دت، دیو آنند اور اداکار شیام کے علاوہ ابن بطوطہ سے ملوا رہے تھے جبکہ شوکت رحمٰن خٹک صاحب نے راج کمار کے حالاتِ زندگی پر روشنی ڈالی۔ منظر امام صاحب ماہ مارچ سے متعلق معلومات فراہم کررہے تھے۔ میں نے ادارے کی معرفت منظر صاحب کو خط بھیجا تھا، کیا وہ ان تک پہنچ گیا تھا یا نہیں ضرور بتایئے گا (جی ہاں نکات انہیں نوٹ کرادیے تھے)۔ بیت بازی میں ایک غلطی آپ لوگ کرگئے۔ مفتی خورشید احمد کنول نے محمد اشفاق کراچی کے شعر کا جواب دیا تھا نہ کہ خورشید احمد کنول کا جواب اشفاق وغیرہ نے دیا تھا (صحیح نشاندہی کی ہے)۔ دیسی پیزا اچھی آپ بیتی ایک ایسی عورت کی داستان تھی جو کہ احساسِ کمتری کا شکار تھی اور جھوٹی شان وشوکت کی خاطر اپنے ساتھ ساتھ اپنے شوہر کی زندگی بھی خراب کردی اور اولاد بھی بالآخر اسے چھوڑ کر چلتی بنی۔ بہت افسوس ہوا کہ روبینہ کو سمجھ آئی بھی تو سب کچھ گنوانے کے بعد۔ خزاں کی فصل، سونیا اسحاق کی آپ بیتی بہت خوب لکھا ہے سونیا صاحبہ نے، ماں بالآخر ماں ہوتی ہے چاہے وہ مریبہ جیسی کیوں نہ ہو اور اپنی ماں کے بارے میں ایسی تلخ حقیقت بیان کرنا یقیناً بڑی ہمت والا کام ہے۔ مہربانی عجیب وغریب سچویشن والی کہانی تھی۔ عافیہ کی امی نے عامر کے ساتھ نکاح کر کے اچھا کیا۔ عافیہ کی خوش فہمی نے اسے بھٹکا دیا تھا لیکن اس میں اس کا کوئی قصور نہیں تھا۔ عاشق، ایک سچے عاشق رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی داستان تھی جس نے ایک بھٹکے ہوئے انسان کو راہ راست پر لادیا۔ روحوں کے شکاری پُراسرار قسم کی کہانی تھی۔ حیرت ہوئی کہ اس قسم کے لوگ بھی دنیا میں موجود ہیں جو روح کو قید کرلیتے ہیں۔ پارو ایک بھٹکی ہوئی لڑکی کی داستان تھی جو کہ غلط صحبت میں پڑ کر شروع ہی سے غلط راستے پر چل رہی تھی اور اس کی منزل فلمی دنیا تھی جس کے لیے وہ ہر قسم کی قربانی دینے کو تیار تھی۔ سجاد حسین شکر ادا کریں کہ مار کھانے کے باوجود بھی وہ بچ گئے اور ماں باپ کو اپنے پاس لے آئے ورنہ شاید وہ اس سے بدتر حالت میں پہنچ جاتے۔ اقتباسات اور کترنیں بہت ہی زبردست ہیں۔ میری کہانیوں کا کیا بنا؟ پلیز کوئی جواب تو دے دیں (اس ماہ ملاحظہ کرلیں)۔"

☆ سدرہ بانو ناگوری کا خلوص نامہ کراچی سے "اداریہ پڑھ کر فقط اتنا ہی کہوں گی کہ معراج انکل جیسے حساس دل رکھنے والے ہی پاک وطن کے سپاہی کا دکھ محسوس کرسکتے ہیں، بھلا مصروفیات کے بھنور میں پھنسی ہماری قوم کے پاس اتنا وقت کہاں کہ وہ وطنِ عزیز کے اس عظیم سپوت کی قربانیوں کو یاد رکھ سکیں۔ دعا ہے کہ خدا آپ کی تمام نیک خواہشات کو قبول فرمائے آمین۔ شہرِ خیال کی محفل میں پہنچے تو وحید ریاست بھٹی صدارت کی کرسی پر براجمان نظر آئے۔ کڈنی سینٹر میں ہونے والے گھناؤنے کھیل کے بارے میں پڑھ کر افسوس ہوا۔ رانا شاہد کے والد صاحب کو خدا پاک جلد صحتیاب کرے۔ ڈاکٹر روبینہ صاحبہ آپ کی بہنا تو آپ کی دعاؤں سے بالکل خیریت سے ہے آپ سنایئے آپ کی کیسی گزر رہی ہے۔ اعجاز حسین سنھار آپ کو ایک مرتبہ پھر روضہ رسولؐ کی حاضری نصیب ہورہی ہے۔ ہماری طرف سے ڈھیروں مبارکباد۔ ہمیں اپنی دعاؤں میں خصوصی طور پر یاد رکھیے گا۔ تمام ساتھیوں کے تبصرے بے حد پسند آئے، نئے ساتھیوں کی آمد اچھی لگی۔ سعید احمد چاند محفل سے غیر حاضر ہیں جلد حاضری دیں۔ ڈاکٹر ساجد امجد کی زبانی برصغیر کی عظیم شہزادی کا زندگی نامہ پسند آیا۔ ہم آپ کے تہِ دل سے شکر گزار ہیں کہ آپ کی زبانی ہمیں اپنی پسندیدہ شخصیت کے بارے میں تفصیل سے جاننے کا موقع ملا۔ فلمی الف لیلہ میں آفاقی انکل کی یادیں اور ماضی کے نامور اداکاروں کی تصاویر دیکھ کر دل اداس ہوگیا کہ وقت کی دھول نے کیسے کیسے گوہرِ نایاب مٹی میں ملادیے۔ سنیل دت کا مسلمانوں کے لیے جذبہ ہمدردی ہمیں متاثر کرگیا اگر آج وہ زندہ ہوتے، موجودہ حالات اور اپنے لاڈلے بیٹے کا حال دیکھ کر شاید جیتے جی مر جاتے۔ ابن کبیر کا تحفہ خاص، بابائے ادب، ہمیشہ کی طرح شاندار رہا۔ ابن کبیر لفظوں کا انتخاب اتنے خوبصورت طریقے سے کرتے ہیں کہ بعض اوقات ان کی تحریروں کے سحر سے نکلنا مشکل لگتا ہے۔ منظر امام کی مارچ کے حوالے سے تحریر معلوماتی رہی۔ دیسی پیزا، پہلی سچ بیانی دل دہلانے والی ثابت ہوئی، احساسِ کمتری کی ماری روبینہ نے اسٹینڈرڈ کے چکر میں اپنے آشیانے کو آگ لگالی۔ سلمان اگر شروع سے ہی سخت رویہ رکھتا تو شاید روبینہ کو اپنے فیصلوں پر پچھتانا نہ پڑتا، میرا اولا کیس، میں شاہدہ کی مغرب ومشرق کی طرف اشارہ کرتی آنکھوں کے دلچسپ فسانے نے ہمارے لبوں پر مسکراہٹ بکھیر دی، پارو اور دیگر کہانیاں بھی پسند آئیں۔"

☆ سید اکبر شاہ، روگی مانسہرہ سے رقمطراز ہیں "مارچ 2014ء کا سرگزشت پڑھے بغیر خط لکھنے کی جسارت کررہا ہوں۔ تمام دوستوں اور ڈائجسٹ ٹیم کو میرا اسلام۔ سرگزشت کے چند شمارے مزاج سمجھنے کے لیے پڑھے۔ کافی دلچسپ ڈائجسٹ ہے۔ علم ودانش سے بھرے مضامین اور سبق آموز سچ بیانیاں ہمیں متاثر کرنے میں کامیاب رہیں۔ فلمی الف لیلہٰ بھی اچھا سلسلہ ہے۔ سراب، حقیقی طور پر لہو کی گردش تیز کرنے والی ہے۔ یعنی ایکشن سے بھرپور، پس ہم نے بھی ایک کہانی ارسال کردی۔ چیک کرلیں کہ مجھے مزید کتنی محنت کرنی پڑے گی۔ کیا میری کہانی پڑھ کر یہ کہہ سکتے ہیں کہ میرے اندر ایک رائٹر پوشیدہ ہے؟ خطوط کی محفل کے تمام دوستوں کو میرا پیغام، خاص کر عمران جونانی اینڈ طاہرہ گلزار آپی کو۔"

☆ محمد خواجہ کراچی سے لکھتے ہیں "میں سرگزشت ہی نہیں بلکہ سسپنس ڈائجسٹ اور جاسوسی ڈائجسٹ کا بھی مستقل قاری ہوں۔ سرگزشت رنگ برنگی کہانیوں کے علاوہ معلوماتی، عالمی شخصیات، سفرنامے کے پھولوں سے سجا گلدستہ ہے۔ اس دفعہ میں ایک کہانی آپ کی خدمت میں پیش کرنے کی

جسارت کررہا ہوں۔ اگر آپ کو پسند آئے تو ضروری اصلاح کے بعد شائع کیجیے۔ (پرچے سے فارغ ہوکر فیصلہ ہوجائے گا)"

☆ بشیر احمد بھٹی کی فوجی بستی بہاول پور سے آمد" مارچ 2014 کا سرگزشت سامنے ہے۔ سب سے پہلے فلمی الف لیلہ کا مطالعہ کیا۔ قسط نمبر 225 میں ماضی کی سیر کی۔ سری لنکا کا پرانا نام سیلون ہے پڑھ کر معلومات میں اضافہ ہوا۔ دیو آنند اور سنیل دت کے بارے میں بہت کچھ لکھا گیا ہے۔ دیو آنند کی لاہور سے کافی یادیں وابستہ ہیں۔ آپ سے گزارش ہے کہ اس سلسلے میں ماضی کی تصویروں کا اضافہ کردیں۔ تصویریں بھی ماضی کی بھرپور عکاس ہوتی ہیں۔ فلمی پوسٹر بھی شائع کیا کریں۔ دوسرا مشورہ یہ ہے کہ علمی آزمائش میں اشتہارات والا اشتہار شائع نہ کیا کریں۔ یہ اشتہار کسی اور صفحے پر دیا کریں۔ تاکہ یہ اشتہار کٹنگ میں ضائع نہ ہو۔ اس دفعہ جاسوسی ڈائجسٹ کافی لیٹ ہے۔ 5 مارچ تک یہ مارکیٹ میں نظر نہیں آیا۔ دو تین ماہ سے لیٹ آرہا ہے۔ ایک اور شکایت یہ ہے کہ میں نے سچ بیانی کی مد میں ایک سال قبل دو زبردست قسم کی سچ بیانیاں ماہنامہ سرگزشت کے ایڈریس پر بھیجی تھیں۔ جن کا ابھی تک کوئی اتا پتا نہیں۔ کیا یہ بہتر نہیں کہ ناقابلِ اشاعت کہانیوں کے بارے میں آپ شائع کردیا کریں (یہ معیوب بات ہے کہ مسترد کہانی کے بارے میں کچھ چھاپا جائے۔ اگر تین ماہ تک شائع نہ ہو تو سمجھ لیں کہ یا تو مسترد ہے یا پھر اس پر زیادہ کام کرنا ہے۔ اس کا حل یہ ہے کہ فون پر پوچھ لیں، مسترد کہانیاں فوراً تلف کردی جاتی ہیں اس لیے فوٹو کاپی اپنے پاس ضرور رکھیں) آپ کا ادارہ پاکستان میں سب سے بڑا ادارہ ہے۔ اس لیے آپ کا معیار اور اسٹینڈر بھی اونچا ہے۔ بعض وقت یوں ہوتا ہے آپ جو کہانی ریجکٹ کردیتے ہیں وہ کہانی دوسرے مدیر اپنے ڈائجسٹ میں فوراً شائع کردیتے ہیں۔ کیونکہ انہوں نے اعزازیہ تو دینا نہیں ہوتا۔ ایک اعزازی کاپی بھیج کے کہانی کے مصنف کو خوش کردیتے ہیں۔ آپ چونکہ معاوضہ دیتے ہیں۔ اس لیے کہانی کی خوب چھان پھٹک کرتے ہیں۔ یہ اچھی بات ہے۔ پہلی کہانی کراچی کی شہزادی عبرت اثر کہانی تھی۔ عروج کے بعد زوال کرتا ہے براحال، ہر ماہ سچ بیانی کی نوکی نو کہانیاں زبردست ہوتی ہیں۔ یہ ملک کے کونوں کھدروں سے نئے لکھاری بھیجتے ہیں۔ یقین کریں یہ مزے دار ہوتی ہیں۔ آپ کے جو کاروباری لکھاری ہیں، وہ طویل کہانیوں میں بہت محنت کررہے ہیں۔ انگریزی ترجمے بھی اچھے ہوتے ہیں۔"

☆ بشریٰ افضل کی بہاولپور سے تشریف آوری "اپنی محفل میں پہنچے لیکن اس سے پہلے انکل کی باتیں سنا نہیں بھولے۔ وہ باتیں کیں جو ہمارے علم میں نہیں تھیں۔ خدا ہمارے ملک کو قائم ودائم رکھے آمین۔ انکل آپ کی معلومات کی داد دینی چاہیے آپ کا دماغ واقعی کمپیوٹر کا کام کرتا ہے۔ (عہد ساز) میں بھی ہمیں معلومات فراہم کی گئیں۔ شہرِ خیال میں داخل ہوئے۔ وحید ریاست بھٹی ویلکم کرسی صدارت مبارک ہو۔ تبصرہ جاندار تھا۔ اچھی تحریر کی تعریف نہ کرنا قاری کے ساتھ زیادتی ہوتی ہے! میں صحیح کہہ رہی ہوں ناں بچ بتائیں۔ آپ کا تبصرہ تو ڈیڑھ صفحہ پر مشتمل تھا۔ رانا محمد شاہد خدا آپ کے والد کو صحت عطا فرمائے۔ آمین۔ آفتاب احمد نصیر میں آپ کی رائے سے متفق ہوں بلکہ تمام ساتھی شہرِ خیال چاہیں گے کہ اس تجویز پر عمل کیا جائے۔ کتنا اچھا لگے گا اپنے پسندیدہ رائٹر کی تحریر پڑھ کر اس کی تصویر دیکھنا، آفتاب احمد نصیر اشرفی آپ کا شکریہ کہ ہمارے لیے دعا گو رہتے ہیں۔ اس محفل کی یہی خاص بات ہے۔ سب ایک دوسرے کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ ایک فیملی کی طرح ہی تو یہ محفل ہے نا۔ یہ حقیقت ہے کہ بیٹے بیویوں کے پیچھے لگ کر ماں باپ کو چھوڑ جاتے ہیں۔ اکثر بیٹیاں ہی والدین کا سہارا بنتی ہیں۔ آپ نے "اپنے پرائے" ڈراما نہیں دیکھا دنیا میں جو ہوتا ہے وہی دکھایا جاتا ہے۔ قیصر عباس خان، انجم فاروق ساحلی، آفتاب احمد نصیر، کے خطوط اچھے لگے۔ عالیہ نے یہ مہربانی کی کہ عافیہ کو غلط فہمی میں مبتلا کردیا۔ عامر نے عقل مندی کا مظاہرہ کرتے ہوئے عافیہ کی غلط فہمی رفع کردی۔ آج کل کی لڑکیوں کے لیے نصیحت کا پہلو پنہاں تھا۔ صدف کے والد نے سچے عاشق ہونے کا حق ادا کیا۔ کس قدر مختلف انداز میں جاوید کو اس غلط کام سے روکا اور شرمندہ بھی نہ کیا۔ خدا کی قدرت نے بھی جاوید کو راہِ راست پر لانے کے لیے سیدھا راستہ دکھایا۔ خدا جس کو چاہتا ہے ہدایت دے دیتا ہے سبحان اللہ۔ روحوں کے شکاری، ویسے آج کل دنیا جس ڈگر پر چل رہی ہے ایسے واقعات اور انہونیاں ہو ہی رہی ہوں اس کے لیے دل گردے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر خدا کا خوف ہو تو کوئی ایسا کام نہ کرے۔ چلو اس تو تھا ہی غیر مذہب کا امیرا والا کیس، اچھی کہانی تھی۔ عاجز نے اس کو شادی کے لیے راضی کرکے معرکہ سر کرلیا اور روزگار کا انتظام بھی کرلیا۔ دو پھول، اس کہانی نے تو دل موہ لیا۔ رانی نے اپنے باپ کی بات تو مان لی مگر اپنی جان سے گئی، دیسی پیزا، میاں بیوی دن رات کمانے میں لگے رہے اور اولاد پر توجہ نہ دی۔ اگر ان کو اچھے ہی اسکول میں داخل کروادیتی یا ٹیوشن ہی رکھوا دیتی تو وہ یہ راستہ اختیار نہ کرتے۔ افسوس ہوا۔ یہ کہانی دکھ دے گئی۔ خدا ان کو نیک ہدایت دے۔ آمین۔ علمی آزمائش میں انعام یافتگان کو مبارک ہو۔"

☆ شگفتہ مشتاق، ملتان روڈ لاہور سے لکھتی ہیں" آپ کا اداریہ بہت کچھ سوچنے پر مجبور کرتا ہے۔ ہمارے بے حس حکمران ...... لیکن انہیں ووٹ بھی تو عوام ہی دیتے ہیں نا۔ جانتے بوجھتے انہیں کیوں ووٹ دیتے ہیں۔ جہاز بیتی، بہت پسند آئی۔ دیسی پیزا، شوباز لوگوں کی بھرپور عکاس ہے۔ باقی سچ بیانیاں بھی اچھی ہیں۔"

☆ آفتاب احمد نصیر اشرفی، لاہور سے "اپنے گزشتہ خط میں شہرِ خیال کی ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری صاحبہ کے مسائل کے حل کا لکھا تھا جو بوجہ کسی حکمتِ عملی کے آپ نے حذف کردیا۔ سسپنس ڈائجسٹ میں چھپنے والی اشرف الاولیا کی سوانح بڑی متاثر کن تھی۔ ہم اشرفی سلسلے کی ایک محترم ہستی سے بیعت ہیں۔ ان بزرگ کی بہت سی کرامات میں سے ایک اولاد کے لیے ان کی دعا کا پورا ہونا بھی ہے۔ حضرت جی انڈیا سے سال میں ایک مرتبہ تشریف لاتے ہیں۔ کراچی میں موجود میرے گھر اور لاہور میں مجھے قدم بوسی کا شرف بخشنے میرے گھر تشریف ضرور لاتے ہیں اور میں ضرورت مندوں کو ان سے بلا تامل ملوا دیتا ہوں۔ روبینہ صاحبہ کے لیے گزارش یہ ہے کہ بلکہ شہرِ خیال کی کسی بھی ساتھی کو گھر بیٹھے یہ نعمت میسر

ہوسکتی ہے۔ بزرگوں کی دعاؤں میں کچھ ایسی ہی تاثیر ہوتی ہے جس سے آزمائش کی غرض سے نہیں بلکہ برکت کے حصول کی نیت سے استفادہ کیا جاسکتا ہے۔"

☆ صوبی شاہ نے ہری پور ہزارہ سے لکھا ہے "اصولاً تو مجھے خط تازہ شمارے کے بارے میں لکھنا چاہیے تھا مگر وہ ابھی تک ملا نہیں اور جب ملے گا تب تک خط لکھنے کی تاریخ نکل چکی ہوگی۔ مجھے جنوری کے شمارے میں ایک سچ بیانی نے بے حد متاثر کیا ہے۔ اس کا نام ہے یار عیار، نعمان صاحب کی تحریر ہے۔ اگر وہ اس وقت میرا خط پڑھ رہے ہیں اور تمام قارئین بھی تو میں ان سے کہنا چاہتی ہوں کہ ذرا سوچیے! ہمارا معاشرہ کدھر جارہا ہے؟ کیا یہی ہیں ہماری اسلامی اقدار، ماں باپ بچے بچیوں کو اعتماد کے ساتھ پڑھنے بھیجتے ہیں۔ وہ اسکول کالجز میں جاکر کیا گل کھلا رہے ہیں۔ کیا مریض بن گئے ہیں؟ دنیا میں کیا جینے کے لیے یہی طور طریقے سکھائے تھے ہمیں ہمارے دین نے، ہمارے اللہ اور رسول ﷺ نے۔ خدارا اب بھی وقت ہے سنبھل جائیں، اس سے پہلے کہ اللہ کی بے آواز لاٹھی حرکت میں آجائے۔ بے شک اس کی پکڑ بڑی سخت ہے۔ نعمان صاحب آپ کو صبر شاید ہی آئے۔ اور اللہ ذیشان جیسے لوگوں کو بھی غرق کرے۔ اس کا انجام بھی تو بخیر نہیں ہوا۔ باقی سارا شمارہ ہی اپنی مثال آپ ہے۔ میرے خیال سے یار عیار کو پہلے اور سلطانہ بیگم کو آخری نمبر پر لگنا چاہیے تھا۔ منظر امام کی تحریر بہت اچھی لگی ہے۔ اسے جاری رکھیں۔ معلومات میں بہت اضافہ ہوتا ہے۔"

☆ ڈاکٹر عدنان مسعود لکھتے ہیں" 1945ء میں جاپان پر کیے جانے والے ایٹمی حملے کے تاریخی پس منظر کا حوالہ دیا ہے بلکہ ضروری تصاویر بھی کہانی کے ہمراہ ارسال کی ہیں تاکہ قارئین ایٹم بم کی تباہ کاریوں کے بارے میں جان سکیں۔ یہ تفصیل بھی انشاء اللہ آپ کو بہت پسند آئے گی۔ امید ہے کہ آپ مجھے اپنے صفحات میں ضرور جگہ دیں گے اور آئندہ بھی میرے قلمِ ناتواں کو تقویت بخشتے رہیں گے۔ (جاپان پر حملے کی روداد چھپ چکی ہے)"

☆ رخسار افضل گاؤں عظیم والا سے لکھتی ہیں" آج پہلی بار آپ کی بزم میں انٹر ہورہی ہوں۔ امید ہے کہ آپ میری حوصلہ افزائی کریں گے۔ میں تین برس سے سرگزشت پڑھ رہی ہوں۔ مارچ 2014 کا میگزین زیرِ مطالعہ ہے۔ ہر بار اچھی کہانیاں اور باقی بھی سب تحریریں اپنے اپنے موضوعات کی بنا پر جامع ہوتی ہیں۔ پڑھ کر دل کو وہ تسکین ملتی ہے جو ایک حسین وادی کا نظارہ کرنے سے دل کو سکون ملتا ہے۔ شہرِ خیال کے تمام ساتھیوں کو دل کی اتھاہ گہرائیوں سے سلام پیش کرتی ہوں۔ خاص کر سدرہ بانو نا گوری کراچی کا جب تبصرہ پڑھا تو ایک دم دل باغ باغ ہوگیا اور کہانیوں میں سے سب سے پہلے اپنی فیورٹ کہانی سراب، پڑھی۔ جو سچ بیانی کی ایک عمدہ شکل تھی۔ اس کے بعد باقی تحریریں اپنے اپنے مقام پر اپنی حیثیت کی عکاسی کررہی تھیں۔ آخر میں سرگزشت کی پوری ٹیم کو سلام اور ہمیشہ کی طرح ان کے لیے دعا گو ہوں کہ خداوند کریم سرگزشت کا معیار عروج پر لانے والوں کو دن دگنی اور رات چوگنی ترقی عطا فرمائے۔"

☆ شاہد احمد خان کا گلستان جوہر، کراچی سے تحفہ "سرگزشت کے مارچ کے شمارے کو مختلف النوع قسم کے دلچسپ مضامین کا گلدستہ کہا جاسکتا ہے۔ عہد ساز کے عنوان سے ممتاز ماہرِ چشم ڈاکٹر ہاشانی کے بارے میں خوبصورت تعارف پڑھا۔ ڈاکٹر صاحب کی اعلیٰ خدمات کا اعتراف ہے۔ اپنے ملک کے مایہ ناز لوگوں کی خدمات کو سراہنا ہم سب کا فرض ہے۔ ڈاکٹر ہاشانی کے ذکر پر میں کراچی کے ڈاکٹر نیاز احمد بروہی صاحب کا تذکرہ کرنا چاہتا ہوں۔ ڈاکٹر نیاز احمد بروہی ایک نہایت تجربہ کار اور ہمدرد ماہر امراضِ چشم ہیں جنھوں نے حیران کن طور پر ایک لاکھ سے زائد مریضوں کی آنکھوں کے آپریشن کیے ہیں۔ حکومت پاکستان نے ڈاکٹر صاحب کی خدمات کے اعتراف کے طور پر ان کو تمغہ خدمت عطا کیا ہے۔ اس سال ماہ اپریل میں ڈاکٹر نیاز بروہی کو جاپان کی اندھے پن کے خلاف جہاد کرنے والی ایک انجمن کی جانب سے ایشیا کے بہترین آنکھوں کے ماہر کے ایوارڈ کے لیے مدعو کیا گیا ہے جو ہم سب پاکستانیوں کے لیے قابلِ فخر بات ہے۔ ان کے بارے میں بھی ایک تحریر ہونی چاہیے۔ جناب آقاقی صاحب کے سفرنامہ اور فلمی الف لیلہ کے علاوہ ڈاکٹر ساجد امجد کی شہزادی، حسن رزاقی صاحب کی جہاز بیتی اور ابن کبیر صاحب کی مارک ٹوئن خاص طور پر قابلِ ستائش ہیں۔ امید ہے کہ جہاز بیتی کا سلسلہ جاری رہے گا۔"

☆ انور عباس شاہ نے دریا خان بھکر سے لکھا ہے "بڑے جان لیوا انتظار کے بعد شمارہ موصول ہوا۔ دھڑکتے دل کے ساتھ اسے کھولا۔ سب سے پہلے شہرِ خیال میں نظر دوڑائی تو نہ جانے کتنے وولٹ کا بجلی کا شاک محسوس ہوا کیونکہ نہ تو اس میں ہمارا خط شامل تھا اور نہ تو تاخیر سے موصول ہونے والوں میں ہمارا نام شامل تھا۔ حالانکہ خط تو ہم نے بروقت پوسٹ کردیا تھا۔ تبصرہ بھی خوب کیا تھا اور لکھائی بھی ہماری اچھی ہے۔ پھر یہ آپ لوگوں کی بے رخی ہے یا محکمہ ڈاک والوں کی مہربانی (محکمہ ڈاک کی مہربانی ہم تک پہنچتا تو کسی نہ کسی طرح لگ ہی جاتا۔ اسی مہینے ایک خط ہمیں 16 مارچ کو موصول ہوا جس پر بھیجنے والے ڈاک خانے کی تاریخ 5 فروری ہے) ہمارے پیارے ملک پاکستان میں تو ہر محکمہ اپنی مثال آپ ہے۔ غریب عوام کو تنگ کرنے کا انہوں نے بیڑا اٹھایا ہوا ہے، اس سلسلے میں واپڈا اور نادرہ پیش پیش ہیں۔ تھوڑے سے کام کے لیے دفتروں کے بے شمار چکر لگانا پڑتے ہیں اور اگر درمیان میں رشوت یا سفارش نہ ہو تو کام ہرگز نہیں ہوتا۔ یہ بات ہر کوئی جانتا ہے، حکام بھی جانتے ہیں لیکن سب خاموش ہیں کیونکہ خاموشی عبادت ہے۔ "شہرِ خیال" میں قارئین کے تبصرے خوب پسند آئے باذوق قارئین رسالے کی زینت ہیں۔ فلمی الف لیلہ کا سلسلہ ہمیشہ کی طرح خوب دلچسپ اور معلومات سے بھرپور تھا۔ آقاقی صاحب فلموں کے متعلق اس انداز میں معلومات فراہم کرتے ہیں کہ ہماری

ساری تشنگی دور ہو جاتی ہے۔ پچھلے خط میں ہم نے آپ کو ایک تجویز یہ دی تھی کہ اس دفعہ اگست کا شمارہ آزادی نمبر، نکالیں اس نمبر میں ان واقعات کو بیان کریں جو ہجرت کے وقت مسلمانوں کے ساتھ پیش آئے۔ اس سلسلے میں کافی عرصہ پہلے ایک نمبر شائع ہوا تھا پھر بھی واقعات تو بے شمار ہیں۔ اپریل 2011ء میں مہدی حسن کا ایک تفصیلی مضمون شائع ہوا تھا جو بہت ہی مقبول ہوا تھا۔ مہدی حسن صاحب کے متعلق کافی معلومات ہم تک پہنچی تھیں۔ اب آپ سے گزارش ہے کہ اپریل کے شمارے میں اسی طرح احمد رشدی کا ایک تفصیلی مضمون شائع کر دیں تو بہت مہربانی ہوگی کیونکہ 11 اپریل کو احمد رشدی کی برسی بھی تھی۔ انکل ہم نے سنا ہے کہ کراچی کے کسی روڈ یا اسٹریٹ کا نام بھی احمد رشدی کے نام پر رکھ دیا گیا ہے۔ کیا یہ سچ ہے؟ اگر یہ سچ ہے تو یہ روڈ یا اسٹریٹ کراچی کے کس مقام پر ہے (ہم نے بھی صرف سنا ہے) ہمارے ایک اور معروف گلوکار مجیب عالم بھی تھے غالباً ان کے بارے میں سرگزشت میں کوئی معلومات فراہم نہیں کی گئیں۔ افسوس ناک بات تو یہ ہے کہ یہ عظیم گلوکار ہمارے ہی علاقے یعنی بھکر کے تھے اور ہم ہی ان کے بارے میں زیادہ نہیں جانتے۔"

☆ غضنفر علی کراچی سے لکھتے ہیں "سرگزشت پہلے شمارے سے زیر مطالعہ ہے۔ میری دلچسپی صرف معلوماتی مضامین تک محدود ہے۔ آپ کی توجہ درج ذیل امور کی جانب کراتا ہے کہ شخصیات کے متعلق مضامین معلومات افزا ہوتے ہیں۔ اس کے ساتھ ایک مختصر تعارف ضروری ہے۔ کئی دفعہ پورا مضمون پڑھ کر معلوم نہیں ہوتا ہے کہ اصل مصنف کا نام کیا ہے، آپ صرف مترجم کا نام شائع کرتے ہیں۔ سرگزشت آدھا تیتر اور آدھا بٹیر ہے۔ ایک انتہائی طویل قسط وار کہانی اور آدھے رسالہ میں کہانیاں بقیہ شروع کے حصہ میں نہایت اعلیٰ معلوماتی بلکہ علمی مضامین یا کچھ ادبی ہے۔ میری تجویز ہے کہ آپ اس کو علمی رسالہ تک محدود کریں اور کہانیاں اپنے دوسرے رسالوں میں شائع کریں۔ رسالہ کی قیمت صرف 50 روپے سے بڑھنے نہ پائے۔ (آپ کی فرمائش اعلیٰ ہے لیکن مجبوری یہ ہے کہ سرگزشت کو ہر طبقے اور پسند کے لوگ پڑھتے ہیں اس لیے ہر طرح کی چیزیں شامل کی جاتی ہیں)"

☆ فاطمہ زہرہ سٹیلائٹ ٹاؤن بہاولپور سے لکھتی ہیں "سالہا سال سے یہ رسالہ پڑھ رہی ہوں۔ اب دل چاہا خود بھی لکھوں بھی بچپن میں تعلیم وتربیت میں لکھا کرتی تھی، ادھوری، سچی کہانی ہے نام اور مقام تبدیل کر کے لکھی ہے۔ امید ہے معیار پر پوری اترے گی۔ چھپنے کے قابل ہو تو چھاپ دیں۔ (منتخب ہوگئی ہے نمبر آنے پر شائع ہو جائے گی)"

☆ طاہرہ گلزار کی پشاور سے آمد "چھوٹی چھوٹی تبدیلی تو ہم خود بھی لا سکتے ہیں مثل اپنے گھر کے ساتھ ساتھ گلی کوچے کو گندے سے صاف رکھنا۔ عورتوں کی عزت واحترام کرنا۔ بڑوں کی عزت کرنا اور چھوٹوں سے شفقت سے پیش آنا۔ جھوٹ نہ بولنا۔ دوسروں کا حق نہ چھیننا۔ حقوق اللہ کے ساتھ حقوق العباد ادا کرنا۔ والدین کا احترام کرنا۔ اپنی ڈیوٹی پوری کرنا۔ یقین کریں بہت سکون سے زندگی گزرتی ہے۔ آزما کے دیکھ لیں۔ سید فصیح اقبال صاحب اور رائٹر عزیز میر تھی صاحب کو اللہ تعالیٰ جنت فردوس میں مقام عطا فرما دیں اور ان کے گھر والوں کو صبر عطا فرما دیں آمین ثم آمین۔ جانا تو ہم سب کو باری باری ہے پہلے کون، بعد میں کون یہ اللہ کو علم ہے۔ میں نے اپنے پچھلے خط میں لکھا تھا جو شائع نہیں ہوا کہ میرے علم میں آیا ہے کہ آغا فرید احمد خان آف سکھر جو سسپنس اور جاسوسی کے تبصرہ نگار اور سرگزشت کے خاموش قاری ہیں، بھائی آغا جانی پلیز آپ سرگزشت پر بھی تبصرہ کیا کریں۔ معراج رسول انکل آپ کے یہ زرین الفاظ کہ ہمارے دشمن کچھ بھی کر لیں پاکستان کا نہ کچھ بگڑا ہے نہ بگڑے گا۔ یہ شب قدر کو اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ ملک ہے۔ تا ابد قائم و دائم رہے گا انشاء اللہ! دل پہ میٹھے میٹھے پھوار کی طرح لگی۔ انکل یہ ملک مقبول حسین جیسے عظیم لوگوں کے دم سے ہی آباد ہے۔ انکل آپ کو اللہ صحت عطا کرے آمین ثم آمین۔ یک صفحی میں ڈاکٹر شریف ہاشمانی کے بارے میں پڑھا، سمندر کو کوزے میں بند کرنا اسی کو کہتے ہیں۔ ڈاکٹر شریف ہاشمانی کے بارے میں میں نے اپنی بہن جو مجھ سے چھوٹی ہے ان سے سنا تھا۔ میری یہ بہن بھی امراضِ چشم کی ڈاکٹر ہے۔ اب ذرا اپنے سنجیدہ سنجیدہ دوستوں کے خطوط کے آپریشن کرتے ہیں۔ پہلے نمبر پر وحید ریاست بھٹی رہے، بھائی بہت بہت مبارکاں، وحید بھائی آپ صحیح فرما رہے ہیں کہ ہم ویسے امریکا، برطانیہ اور بھارت کو دشمن کہتے ہیں لیکن ان سے زیادہ دشمن تو ہمارے اندر کے ہیں جسے ہم بھول بیٹھے ہیں جو انسانیت سوز تکالیف ہمیں دیتے ہیں۔ وحید بھائی آپ کی کاوشوں کی تعریف تو ہم ناچیز نے بھی ہر خط میں کی ہے لیکن افسوس ہم تو چار پانچ مہینے سے بلیک لسٹ ہو رہے ہیں، وحید بھائی آپ کی تصویر والی گزارش مردوں اور رائٹرز کی حد تک ٹھیک ہے لیکن لیڈیز کے لیے نامناسب ہے۔ لو جی وحید بھائی آپ نے پکارا اور انجم فاروق ساحلی بھائی آگئے۔ اتنے پیارے سے بھی اس ناچیز بہن کو بھی یاد کریں۔ انجم بھائی اللہ ہم سب پر رحم کرے قصہ خوانی کا دھماکا میرے کالج سے صرف پانچ منٹ کے فاصلے پر ہوا ہے۔ بشریٰ افضل جی یہ کیا اتنی مختصر تحریر؟ اب آپ کا وہ پہلے والا دم خم نہیں رہا۔ رانا محمد شاہد بھائی اللہ تعالیٰ آپ کے والد صاحب کو صحت عطا فرما دیں۔ میرے والد صاحب کی بھی دو دفعہ این جوگرافی ہوئی ہے۔ 1986ء میں ایکسیڈنٹ کے بعد سے بہت مشکل سے چلتے ہیں۔ شاہد بھائی پاکستان کے پولیس، ڈاکٹرز اور حکمرانوں کا کیا رونا، یہ کبھی ٹھیک نہیں ہوں گے۔ یہ بے حس اور مظلوم عوام اور ظالم حکمران کبھی سدھرنے والے نہیں۔ آفتاب احمد نصیر بھائی آپ نے عمران جونانی بھائی کے بارے میں صحیح کہا ہے۔ ان کے لیے رشتہ ڈھونڈ لیجیے ورنہ میں تو اس کا رشتہ ماسی مصیبتے سے کر دوں گی۔ آفتاب بھائی بیٹیاں بیٹوں سے بہت اچھی ہوتی ہیں۔ یہ آپ کو ہر وقت کنفیوژن میں رہنے کا مرض کیوں ہے۔ آفتاب بھائی یہ روایات اب کب توڑیں گے۔ میری Birthday 1-4-2014 ہے سب بھائی مجھے وش کریں۔ میری عمر 48 سال ہو جائے گی۔ اشفاق صاحب کا پورا خط ہی درخواستوں پر مشتمل تھا، اچھا لگا۔ احمد خان توحیدی صاحب تو اس بار کچھ ہائی بی، پی کے ساتھ حاضر تھے۔ ارے ہم بے حس عوام یہ سب

کچھ سہنے پر مجبور ہیں۔ بموں کے دھماکے، مہنگائی کے دھماکے، بجلی، گیس اور لوڈشیڈنگ کے دھماکے، اغوا برائے تاوان کے دھماکے۔ ہائے رے پاکستانیوں کے نصیب۔ عبدالخالق بھٹی بھائی اتنی مختصر تحریر تشنگی رہ گئی۔ روبینہ نفیس جی کبھی ہم ناچیز کو بھی یاد کیا کریں اور یہ کیا صرف 3 لکیروں کا خط واہ جی واہ۔ یہ آپ مردوں کی عادت ہے۔ احسان سحر بھائی آپ نے بالکل صحیح کہا ہے کہ ہم درخت تو کیکر کا لگاتے ہیں اور امید میٹھے پھل کی کرتے ہیں۔ احسان بھائی خط مختصر لیکن انداز بہت دلچسپ اور بے حسی کے زخموں میں سوئی چبھونے والا ہے۔ گڈ۔ آتے رہا کریں۔ محمد عامر ساحل بھائی آپ کا شکایتی انداز اچھا لگا۔ قرۃ العین Sweeti sis آپ کا انداز تحریر بہت اچھا لگا۔ ف۔ الف سے میری بھی درخواست ہے کہ میرے لیے بھی دعا کریں تاکہ میری دو تین جائز خواہشات پوری ہو جائیں اور روبینہ نفیس بہن کے لیے بھی دعا کریں۔ اکرام اللہ صاحب آپ کی واپسی کی خوشی ہوئی اب آتے رہا کریں۔"

☆ نجمی فردوس احمد گوجرانوالہ سے لکھتی ہیں "میں اپنے پیارے سرگزشت کے لیے دو کہانیاں ارسال کر رہی ہوں۔ دونوں سو فیصد سچی ہیں۔ امید ہے حوصلہ افزائی کریں گے۔ اگر آپ جیسے بڑے لوگ ہم نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی نہیں کریں گے تو ہم کہاں جائیں گے۔ کون ہمارا پرسانِ حال ہوگا۔ پلیز میری دونوں کہانیاں پڑھیں، جہاں کہیں کوئی غلطی یا کمزوری نظر آئے اس کی وضاحت کر دیں۔ (پرچے سے فارغ ہو کر دیکھ لیا جائے گا)"

☆ ڈاکٹر قرۃ العین کا سندیسہ اسلام آباد سے "سب سے پہلے سچ بیانیاں پڑھتی ہوں۔ روحوں کے شکاری، بہت اچھی تحریر تھی۔ دراصل مجھے بھی پُراسرار کہانیاں پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ پچھلے خط میں آپ سے سرگزشت کے پُراسراریت نمبر کے بارے میں پوچھا تھا مگر کوئی جواب نہ ملا۔ خدارا ہمارا صبر اور نہ آزمائیں اور جلدی سے ایک شاندار سا پُراسراریت نمبر شائع کریں۔ (پراسراریت نمبر صرف ایک سال قبل شائع ہوا ہے اس لیے مستقبل قریب میں امکان کم ہے) دیسی پیزا، ایک فکر انگیز تحریر تھی جس سے مجھے مکمل اتفاق ہے۔ میں نے خود ٹاٹ والے اسکول میں پڑھا ہے۔ کسی انگلش میڈیم اسکول کی شکل تک نہیں دیکھی لیکن خدا کا شکر ہے کہ میں نے جرمنی سے فزکس میں پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی ہے۔ ہاں باہر جا کر ضرور احساس ہوتا ہے کہ ہمارے اور ان کے تعلیمی معیار میں بہت فرق ہے۔ انگلش میڈیم اسکول کے بچے انگلش بولنا تو نہیں سیکھ پاتے ہاں اردو ان کی بہت کمزور ہو جاتی ہے۔ دوسری سچ بیانیوں میں پارو، دو پھول اور عاشق بہت متاثر کن تھیں۔ مضامین پڑھنے کا ابھی موقع نہیں ملا۔ اس لیے تبصرے سے قاصر ہوں۔ فلمی الف لیلہ پہلے بہت شوق سے پڑھتی تھی لیکن اب لگتا ہے کہ سب اداکاروں کا ذکر ہو چکا ہے اور مزید کوئی مواد باقی نہیں رہا۔ آفاقی صاحب سے گزارش ہے کہ اب ٹی وی اداکاروں کے بارے میں لکھنا شروع کریں۔ شہرِ خیال میں جانے پہچانے ساتھیوں کے نام پڑھ کر اچھا لگتا ہے۔ وحید ریاست بھٹی صاحب کا تبصرہ بہت جامع ہوتا ہے۔ سرگزشت کے دیگر قارئین اور ساتھی بھی بہت باذوق ہیں اور اچھا لکھتے ہیں۔ شاہد صاحب کے والد صاحب کو اللہ تعالیٰ صحت کاملہ عطا فرمائے۔ معراج صاحب سے درخواست ہے کہ وہ سچ بیانیوں کے صفحات بڑھا دیں۔ ڈاکٹر ساجد امجد صاحب اگر حضرت داتا گنج بخش کے حالاتِ زندگی پر ایک تحقیقی مضمون شائع کریں تو بہت اچھا ہوگا۔ (شائع ہو چکا ہے)"

☆ وحید ریاست بھٹی کا کلر سیداں، راولپنڈی سے پیام "معراج انکل گزشتہ کئی سالوں سے آپ کا اداریہ پڑھتے ہیں پھر آگے پڑھتے ہیں۔ اس بار آپ نے ٹوٹے حوصلوں کو مجتمع اور ایک آس کا دیا جلانے کا فریضہ نہایت ہی احسن انداز میں سرانجام دیا۔ یقین مانیں سراغ منزل پاکر نہایت جذباتی ہو گیا اور ساتھ ہی احساسِ تفاخر بھی انگڑائیاں لیتا محسوس ہوا کہ آج چاہے وطنِ عظیم پہ کتنا ہی کڑا اور کٹھن وقت ہے انشاء اللہ کل تو ہمارا سنہری ہے کل تو امن کے دیپ جلائے جائیں گے۔ بے شک ان روشن دیوں کے لیے ان روشن دنوں کے لیے آج ہمیں خونِ جگر دینا پڑ رہا ہے۔ شریف ہاشمانی کی مختصر مگر جامع سرگزشت نے ہمیں بہت کچھ سوچنے کا موقع فراہم کیا کہ کیسے کیسے عظیم سپوت اس مادرِ وطن میں جنم لیتے رہے ہیں جن کے لیے نہ صرف دل بلکہ آنکھیں بھی محوِ دعا ہیں۔ گزارش یہ کرنی تھی کہ اگر ہم بھی یک صفحی سرگزشت کے لیے کسی شخصیت کے حوالے سے کچھ تحریر کریں تو کیا آپ اسے زیورِ اشاعت پہنانا پسند کریں گے؟ (اگر جامع اور حوالاجات سے مکمل ہوا تب) شہرِ خیال میں داخل ہوئے تو سب سے پہلے جس نام پر نظر پڑی وہ اس فقیر پر کا تھا۔ اپنے آپ کو کرسی صدارت پہ براجمان ہونے کے متعلق کبھی کبھی سوچتے ضرور تھے لیکن منزل اتنی جلد مل جائے گی خواب وخیال میں نہ تھا۔ ایک عجیب سی کیفیت تھی واقعی کسی نے بالکل سچ فرمایا کہ کرسی کا اپنا ہی نشہ ہوتا ہے اور کرسی اگر صدارت کے لیے ہو تو بندے کا پاگل ہونا کوئی اچنبھے کی بات نہیں۔ معراج صاحب دستورِ زمانہ ہے کہ جو کرسی پہ بیٹھے گا اس کے پاس کچھ اختیارات کا ہونا بھی ضروری ہے۔ تو آج ایک مہینے کے لیے کل اختیارات اس فقیر کے پاس ہیں اور مابدولت کرسی صدارت پر متمکن ہوتے ہی سب سے پہلا آرڈر جناب ڈاکٹر ساجد امجد صاحب کو دیتے ہیں کہ جس طرح آپ نے مولانا نسیم صدیقی کے حوالے سے سفرِ حراج کے نام سے مقالہ سپردِ قلم فرمایا تھا اسی انداز میں ہمارے پیارے انکل معراج رسول صاحب کی سرگزشت "سفرِ معراج" یا معراج نامہ، کے نام سے ضبطِ تحریر میں لائیں اور عاشقانِ سرگزشت کو سال 2014ء کا خصوصی تحفہ پیش کریں۔ باقی مزید رائے کے لیے شہرِ خیال کے باسیوں سے رابطہ کیا جا سکتا ہے۔ کیا خیال ہے میرے پیارے ساتھیو...... باقی دوستوں کے خطوط بھی لائقِ مطالعہ تھے۔ انجم فاروق ساحلی صاحب سے گزارش ہے کہ آپ مستقل لکھنے پہ توجہ دیں آپ میں جوہرِ قابل چھپے ہوئے ہیں۔ بشریٰ افضل صاحبہ سے گزارش ہے کہ سچ بیانیوں سے ہٹ کر باقی مضامین پر اظہارِ خیال فرمایا کریں۔ سچ بیانیوں کے لیے تو عمر پڑی ہے۔ قیصر عباس خان صاحب پر حیرت ہو رہی ہے کہ اس دفعہ سچ بیانیوں پر کوئی رائے نہ دے پائے شاید شمارہ تاخیر سے موصول ہوا

ہوگا۔ رانا محمد شاہد صاحب آپ کو اپنی محفل میں رونقِ محفل بننے پر ہم مبارکباد پیش کرنا چاہیں گے۔ آپ کا شکریہ جو سالانہ تجزیہ آپ کو پسند آیا۔ خوش وخرم رہیں۔ آفتاب احمد نصیر اشرفی صاحب سے گزارش ہے کہ ہم پہلے سے ہی بلند فشارِ خون کے مریض ہیں لیکن پھر بھی آپ کے مشورے دل سے لگائے جانے کے قابل ہیں۔ آپ کا اندازِ تبصرہ بہت پسند آیا۔ احمد خان توحیدی صاحب بہت جلدی میں نظر آئے اور بہت کم اظہارِ خیال کے لیے وقت دے پائے چلیں یار زندہ صحبت باقی۔ ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری آپ کا سلام ہمیں پہنچ گیا، سدا سلامت رہیں آپ کی تحریر کافی مہینوں سے نظر نہیں آئی۔ عزیز اللہ صاحب کافی سے زیادہ جذباتی واقع ہوئے ہیں۔ پیارے بھائی ٹھنڈے ٹھنڈے مشروبات سمجھ کر تیخ بیانیاں نوش فرمایا کریں۔ احسان سحر کا نامہ شاہد سب سے بہتر طور پر لکھا گیا تھا۔ لطف آ گیا پڑھتے ہوئے۔ محمد عامر ساحل صاحب شکریہ آپ نے خاص نمبر کے حوالے سے ہمارے تجویز کردہ ناموں سے اتفاق کیا۔ قرۃ العین صاحبہ کو شہرِ خیال میں ہم بھی خوش آمدید کہتے ہیں۔ اور ان کے جنون کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتے کہ تمام شماروں کو انڈر لاک سنبھال کر رکھا ہوا ہے بالکل میری طرح۔ اور آخر میں شاہد جہانگیر شاہد صاحب کے ممنون ہیں جو انہوں نے ہماری سالانہ رپورٹ کے حوالے سے تاریخی خراجِ تحسین پیش کیا، شکریہ جناب، آپ بھی ہمارے ہاں تشریف لائیں تو مونگ پھلی کیا چیز ہے اس سے بڑھ کر آپ کی خدمت کا فریضہ سرانجام دیں گے۔"

☆ احسان سحر کا خط میانوالی سے "پھول کی اہمیت خوشبو سے ہے اور سرگزشت وہ پھول ہے جس کی خوشبو پڑھنے والے ہیں۔ اس پھول کی بنیاد رکھنے والے ہمارے اور آپ سب کے ہردلعزیز جناب معراج رسول صاحب ہیں۔ اللہ پاک انہیں صحت اور ڈھیروں خوشیاں عطا فرمائے آمین، باقی سب قطرے بھی سورج کی روشنی میں دلکش انداز میں چمک کر اپنی خوبصورتی کا احساس دلا رہے تھے۔ پہلی سوغات معراج انکل کی چھوٹی سی مگر سب پہ بھاری بات سے کروں گا۔ اس دفعہ انکل فوجی مقبول حسین کے حوالے سے ایک یاد تازہ کر گئے۔ مقبول حسین نمونہ ہونے والی شخصیت ہیں۔ ہمیں انہی واقعات کو دیکھ کر سبق حاصل کرنا ہوگا کہ دشمن ہمیں ایک دوسرے کا دشمن بنا کر نہ صرف اس ملک کو کھوکھلا کر دینا چاہتے ہیں۔ ہمیں سبق سیکھنا ہوگا۔ عہد ساز میں ڈاکٹر شریف ہاشانی سے آگاہی ملی۔ ہمارے لوگوں کی ہمیشہ سے ہی بدقسمتی اور بری عادت رہی ہے۔ ان میں سے جو ہمت کرکے کچھ بننے کی کوشش کرتا ہے ہم لوگ بجائے اسے سپورٹ کرنے کے اسے بزدل اور اس پر طنز شروع کر دیتے ہیں۔ شہزادی عزم بہادری اور سب کچھ کر دکھانے کا عزم رکھنے والی شہزادی نے ثابت کر دیا کہ اگر ہمت اور جرات پیدا کر لی جائے تو سب کچھ ممکن ہے۔ ایسے کردار ہر جگہ موجود ہیں اور بس انہیں سمیٹ کر محفوظ جگہ سنبھلنے کی ضرورت ہے۔ یہ سبق ہے ان قوموں اور لوگوں کے لیے جو بے پروائی کی نیند میں ڈوب چکے ہیں۔"

☆ چودھری مدثر حسین دیدڑ کا حسنِ بیاں کھاریاں سے "انکل ہر انسان کسی مخصوص نظریے کے مطابق زندگی گزارتا ہے اور وہ نظریہ ہی اس انسان کا مقصدِ حیات اور نصب العین ہوتا ہے۔ ایک قوم افراد سے مل کر بنتی ہے اور افراد کا نظریہ ہی قوم کا نظریہ کہلاتا ہے ہر قوم کا اپنا نظریہ ہوتا ہے اور اس نظریے کے تحت ہی قوم کی تہذیبی، سیاسی اور معاشرتی زندگی کا نظام ترتیب پاتا ہے۔ برصغیر میں علیحدہ مسلم ریاست کے مطالبے کے پیچھے دو قومی نظریہ کارفرما تھا۔ یعنی برصغیر میں دو الگ الگ قومیں مسلمان اور ہندو آباد ہیں، جن کا مقصدِ حیات، اندازِ فکر اور نصب العین ایک دوسرے سے مختلف ہے۔ اسلام کا نظریہ ہندومت سے بالکل مختلف ہے۔ اسی وجہ سے مسلمانانِ برصغیر الگ مسلم ریاست کا قیام ناگزیر سمجھتے تھے۔ جب ہندوؤں نے انگریزوں سے کہا کہ "ہندوستان چھوڑو" تو قائداعظم نے کہا کہ تقسیم کرو تب چھوڑو۔ کیونکہ قائداعظم جانتے تھے کہ مسلمانوں کے لیے ہندوستان کی آزادی کا مطلب صرف حکمرانوں کی تبدیلی ہے۔ مسلمان اقلیت میں تھے اور اکثریت میں ہونے کی وجہ سے ہندوؤں کو ہی حکمران بننا تھا۔ اس لیے مسلمانوں کے لیے الگ وطن کے بغیر اپنے نظریے پر عمل کرنا مشکل تھا۔ پھر تاریخ نے دیکھا کہ مسلمانوں نے اپنے مضبوط نظریے کی بنا پر اقلیت میں ہونے کے باوجود برصغیر میں الگ وطن حاصل کر لیا۔ ہمارا نظریہ آج بھی وہی ہے جو قیامِ پاکستان کے وقت تھا اور نظریۂ پاکستان آج بھی اتنا ہی اہم ہے جتنا قیامِ پاکستان کے وقت تھا۔ پاکستان کی قومی سلامتی نظریۂ پاکستان کے تحفظ اور عمل سے ہی ممکن ہے۔ 1971ء میں اس نظریے سے روگردانی کی وجہ سے پاکستان دو ٹکڑے ہو گیا تھا۔ نظریے کو پسِ پشت ڈالنے سے قوموں کا وجود آہستہ آہستہ ختم ہو جاتا ہے۔ آج وطنِ عزیز میں ہر کوئی خود کو پاکستانی کی بجائے پنجابی، سندھی، بلوچی، پٹھان وغیرہ سمجھتا ہے شیعہ، سنی، دیوبندی، بریلوی سمجھتا ہے۔ کسی کے ذہن میں نظریہ پاکستان کا کوئی تصور نہیں ہے۔ صوبائیت پرستی اور فرقہ پرستی کی وجہ سے ملک میں خانہ جنگی جیسی حالت ہے۔ اس خانہ جنگی پر قابو پانے کے لیے نظریۂ پاکستان کو مدِنظر رکھنا ضروری ہے۔ ہمیں چاہیے کہ ایک قوم بن کر سوچیں اور نظریۂ پاکستان کی روشنی میں استحکامِ پاکستان کے لیے کام کریں۔ یقیناً اس سے مستحکم پاکستان کا خواب جلد حقیقت میں بدل جائے گا۔ پاکستان کی سلامتی اور ترقی کے لیے ہمیں سب سے پہلے پاکستان، جیسی سوچ رکھنا ہوگی۔"

☆ ملک جاوید محمد خان سرکانی درانی، بروز کی جھجھ سے لکھتے ہیں "یک صفحی سرگزشت کی شخصیت جناب شریف ہاشانی واقعی ایک قابلِ تقلید اور عہد ساز ہستی ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کے جذبوں، عزائم اور کام کو سلامت رکھے آمین، شہرِ خیال اس دفعہ دوستوں کی خیال آفرینیوں یعنی تجاویز سے بھرا ہوا ہے۔ وحید ریاست بھٹی، محمد اشفاق گجرات اور ناصر حسین رند کی تجاویز اس قابل ہیں کہ ان پر عمل کیا جائے۔ جناب ناصر حسین رند یاد کرنے پر شکریہ کافی عرصے سے غیر حاضر ساتھیوں میں راجا ثاقب نواز ثاقب، انور اعجاز خان، محمد نثار بٹ اور ایڈووکیٹ قرۃ العین زینب بھی شامل نہیں جبکہ بہن طاہرہ گلزار بھی کم کم حاضر ہوتی ہیں تاہم علمی آزمائش کے جوابات میں امتیاز حسین بخاری چکڑالوی کا نام پڑھ کر خوشی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ

خوش رکھے لالا شیر باز کے بھتیجے بھائی مظفر کے بیٹے سلیم اقبال کی شادی میں شرکت کے لیے ان کے گاؤں ڈھوک کچا جانا ہوا جو کہ چکڑالہ کے نواح میں آباد ہے۔"

☆ رانا محمد شاہد 26 گلستان کالونی بورے والا سے "3 مارچ کو لاہور سے بورے والا آتے ہی شمارہ خرید لیا۔ لاہور میں بزمِ اسلام کے زیرِ اہتمام ایک مضمون نویسی کا مقابلہ ہوا تھا۔ سارے پاکستان سے 42 لڑکے، لڑکیوں نے حصہ لیا تھا۔ الحمدللہ پہلی پوزیشن آئی۔ اداریے میں معراج رسول صاحب نے سپاہی مقبول حسین کے ساتھ دشمن ملک کی سفاکی کا بتایا۔ بھارت ہمارے بارے میں کیا سوچ رکھتا ہے۔ اس کا اندازہ تو آپ کو حالیہ ایشیا کپ سے بھی ہو گیا ہوگا۔ جب پاکستان نے سنسنی خیز مقابلے کے بعد شاہد آفریدی کے چھکوں کی بدولت فتح حاصل کی تو اس فتح کی خوشی منانے پر نہ صرف کشمیری طلباء کو یونیورسٹی سے نکال دیا گیا بلکہ غداری کا مقدمہ چلانے کی بھی خبریں ملیں۔ جمہوریت کا نام نہاد چمپئن صرف کھیل کی بنیاد پر ایسا غیر جمہوری رویہ رکھے گا تو دشمنی میں کہاں تک جائے گا؟ ڈاکٹر شریف ہاشانی جیسے لوگ ہی ملک ومعاشرے کا سرمایۂ افتخار ہوتے ہیں۔ کیونکہ اپنے لیے تو سبھی جیتے ہیں اصل جینا تو وہی ہوتا ہے جو دوسروں کے لیے ہو۔ پیسا کمانا ہی سب کچھ نہیں ہوتا۔ انسانیت کی خدمت ہی انسان کو دلوں میں زندہ رکھتی ہے۔ وحید ریاست بھٹی کی خط کے ساتھ اور مصنفین کے آرٹیکلز کے ساتھ تصاویر والی تجویز اچھی ہے۔ تجربہ کر دیکھیے اگر اچھا ردعمل ہوا تو جاری رکھیے گا۔ وحید بھائی یاد فرمانے کا شکریہ۔ آفتاب احمد نصیر جان بچانے کے حوالے سے آپ کی تجویز نہایت معقول ہے۔ یہ جملہ تو بہت ہی بھایا "ہم شاندار گھر بنوا لیتے ہیں مگر گلی میں موجود گٹر کا ڈھکن نہیں لگواتے" اور عبدالقیوم خان کو آپ کنفیوژن دور کرنے کا کہہ رہے تھے جبکہ روبینہ نفیس انصاری کو کہہ رہے ہیں کہ آپ اس لیے زیادہ دکھی ہیں کہ محسوس زیادہ کرتی ہیں۔ آپ خود بتایئے جو لکھنے پڑھنے والا ہو وہ عام آدمی سے زیادہ حساس ہوگا یا نہیں؟ محمد اشفاق کی خاص شمارے والی تجویز اچھی ہے مگر یہ تو آپ کسی نہ کسی موضوع کا چناؤ کرکے پوری کر دیتے ہیں، ہاں صفحات 350 نہیں ہوتے۔ عبدالخالق بھٹی! بابائے قوم کے مزار پر انتظامیہ جو کچھ کرتی رہی، اس نے تو ویسے ہی اس قوم کا سر شرم سے جھکا دیا ہے کہ اخلاقی طور پر کسی قوم کے گرنے کی بھی کوئی حد ہوتی ہے۔ کیا بابائے قوم کی روح یہ سوال نہ کرتی ہوگی کہ بداخلاق کے لیے بھی تمہیں میری ہی آخری آرام گاہ ملی تھی؟ اللہ اس قوم کے حال پر رحم فرمائے (آمین) اکرم اللہ خان! سرگزشت سے اچھے پرانے تعلق ومحبتوں کو یاد کر رہے تھے۔"

☆ ابن سید ڈونگہ بونگہ بہاولپور سے لکھتے ہیں "میں عرصہ قریب سے سرگزشت کا خاموش قاری ہوں اور پہلی دفعہ اس بازیچۂ اطفال میں شامل ہو رہا ہوں۔ ویسے تو رسالے کی تعریف سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے۔ لیکن جس تحریر نے قلم اٹھانے پر مجبور کیا وہ دیسی پیزا ہے یہ سچ ہے کہ میاں بیوی کا رشتہ بہت انمول اور نازک ہوتا ہے اور دونوں کو افہام وتفہیم سے زندگی کی گاڑی چلانی چاہیے۔ جہاں کسی ایک فریق کو برتری حاصل ہو تو پھر صورتِ حال دیسی پیزا جیسی ہو جاتی ہے۔ جو کہ کسی نہ کسی شکل میں نقصان دہ ثابت ہوتی ہے۔ شہرِ خیال میں سب بھائی بہنوں کے تبصرے تجزیے نوک جھوک بہترین ہوتے ہیں۔ مجھے پتا کرنا تھا کہ سراب کی گزشتہ اقساط کتابی شکل میں دستیاب ہیں یا نہیں؟ (ابھی نہیں) اور اناڑی مکمل کتابی شکل میں مل جائے گی؟ (جی ہاں) اور مجھے کتنے میں ملے گی (یہ آپ کتابیات پبلی کیشنز والوں سے پتا کریں)۔"

☆ قیصر عباس خان کی بھکر سے آمد "معراج انکل کی طرح ہم بھی پرامید ہیں کہ پاکستان کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ مارچ کے مہینے میں سب کے تبصرے زیدار تھے ڈاکٹر صاحبہ کا تبصرہ بہت مختصر سا تھا۔... احمد خان توحیدی کے خط میں گرامر کی غلطیوں کی نشاندہی تھی۔ وحید صاحب کری صدارت پر بہت اچھے تبصرہ کے ساتھ تھے۔ تصویر والا خیال اچھا ہے۔ اور رانا شاہد صاحب بھی حاضر تھے، اللہ تعالیٰ نے ان کے ابو کے دل کے آپریشن کو کامیابی دی۔ آفتاب احمد نصیر اشرفی صاحب نے ٹھیک کہا کہ ہماری انفرادی غیر ذمہ داریوں کا شاخسانہ ہے تمام معاشرتی مسائل۔ محمد عامر ساحل صاحب آپ محبت کرنے والے انسان ہیں آپ کا ناراض ہونا نہیں بنتا۔ تبصرہ اچھا ہوتا ہے آپ کا۔ قرۃ العین صاحبہ کا تبصرہ اچھا لگا۔ رسالے جمع کرنا اور سنبھال کر رکھنے والی عادت میرے جیسی ہے۔ اکرم اللہ خان کی واپسی خوش آیند ہے۔ اعجاز حسین سٹھار کو بہت بہت مبارکباد۔ آپی سدرہ بانو کے تبصرے میں عمران صاحب کو اچھا ادبی جواب ملا ہے۔ آپی طاہرہ گلزار... حاضر نہیں۔ عمران صاحب غائب تھے اور لیٹ میں بھی نام نہیں تھا۔"

☆ عبدالخالق بھٹی اللہ آباد سے لکھتے ہیں "اس بار کا شمارہ کئی سمتوں میں جدت کا حامل تھا۔ یک صفحی میں "ڈاکٹر ہاشانی کے جہدِ مسلسل کی تحریک نے بے ساختہ خراجِ تحسین پیش کرنے کو کہا۔ باقی کہانیاں بھی زبردست تھیں۔ خاص کر دیسی پیزا، اس بار اتنا ہی انشاءاللہ اگلے ماہ مفصل لکھوں گا۔"

تاخیر سے موصول ہونیوالے خطوط

احمد جان، بھکر۔ فدا حسین، لاہور۔ نینا افضال، دینہ۔ شیخ اقبال احمد چنیوٹ۔ ظہیر بٹ، حیدرآباد۔ نیاز ملکانی، کراچی۔ فضل الٰہی، دبئی (عرب امارات)

ڈاکٹر ساجد امجد

اس نے پورے خطۂ عرب میں عربی دانی کا سکہ جمارکھا تھا۔ بڑے سے بڑا دقاق عربی داں بھی اس کا ہم پلّہ نہ تھا۔ اس کے تبصرے وتنقید نے اہلِ عرب میں ہلچل مچادی تھی۔ عراق، ایران، مصر، ہروہ خطۂ عرب جہاں تعلیمی معیار بلند تھا وہاں اسے سرآنکھوں پر بٹھایا جاتا تھا مگر اہلِ ہند نے اس کی قدر نہ کی۔ وہ غمِ دوراں کو پلکوں کی اوٹ میں چھپائے رہا پھر جب لوگوں نے مشورہ دیا کہ آپ جیسے اہلِ علم کی ضرورت پاکستان کو ہے تووہ یہاں منتقل ہوگیا مگر یہاں بھی اسے وہ مقام نہ ملا جس کا وہ اہل تھا۔ اک عزم سے وہ گلستان پہنچا تھا لیکن اسے آشیاں سجانے کے لیے تنکے بھی نہ ملے۔ تزئینِ گلستاں کا خواب، خواب ہی رہا اور وہ عمرکے آخری ایام میں بھی مثل ہوئے گل پریشاں ہی رہا۔

عربی زبان کے ایک ماہر کی داستانِ زیست

اس چھوٹی سی مسجد کا مقدر اُس وقت جاگ اُٹھا جب مولانا عبدالخالق نے راج کوٹ (کاٹھیاواڑ) میں قیام کیا اوراس مسجد میں درس دینے بیٹھ گئے۔ چند بزرگ اور آبیٹھے اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے مسجد کی رونق میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

اہلِ کاٹھیاواڑ میں دینی جذبہ اور مہمان نوازی بہت تھی۔ ہندوستان کے مختلف علاقوں سے علما، صوفیا وغیرہ کثرت سے آتے رہتے تھے، خصوصاً رمضان میں۔ ان کے لیے ہر مسجد کے ساتھ مسافر خانہ بنایا جاتا تھا جہاں ان کے کھانے ٹھہرنے کا انتظام ہوتا تھا۔

مولانا عبدالخالق اصلاً کشمیری تھے لیکن لکھنو میں رہے۔ تحصیل علم کے لیے گجرات آئے پھر جوناگڑھ چلے گئے اوراب اہلِ کاٹھیاواڑ کا دینی جذبہ اور مہمان نوازی دیکھ کر راج کوٹ کو مستقر بنالیا۔ ایک سادہ سا مکان بنوایا۔ قریب ہی مسجد تھی۔ اس میں جا بیٹھے اور درس وتبلیغ کا آغاز کردیا۔ خطاب ایسا پُراثر تھا کہ جو سنتا تھا پروانہ وار ان کے گرد طواف کرنے لگتا تھا۔ ایک مسیحا تھا جو راج کوٹ کے لوگوں کو مل گیا تھا۔ دل بدل رہے تھے، ذہنوں کو جِلا مل رہی تھی۔ لوگ اپنے مسائل لے کر آتے اور آپ شریعت کی روشنی میں انہیں راستہ دکھاتے۔

ایک روز درس ہورہا تھا۔ لوگ مولانا عبدالخالق کے گرد حلقہ باندھے بیٹھے تھے کہ اٹھارہ اُنیس سال کا ایک نوجوان مسجد میں داخل ہوا۔ لوگوں نے تعجب اور خوشی کے ساتھ اس نوجوان کی طرف دیکھا۔ تعجب اس لیے ہوا کہ ایسی محفلوں میں بزرگ ہی آتے تھے۔ خوشی اسی لیے ہوئی کہ نوجوانوں کو بھی توفیق ہوئی۔

کبھی ایسا نہیں ہوا تھا کہ مولانا نے کسی کے آنے پر درس روک دیا ہو اور اس کے بیٹھنے کا انتظار کیا ہو لیکن اس نوجوان میں کوئی ایسی بات ضرور تھی کہ مولانا نے نہ صرف درس روک دیا بلکہ اشارہ کیا کہ وہ ان کے پاس آکر بیٹھ جائے۔ نوجوان مجسّم ادب کی تصویر بن کر ان کے برابر بیٹھ گیا۔

مولانا نے درس پھر شروع کردیا۔ جب درس ختم ہوا اور لوگ مولانا کی دست بوسی کے بعد رخصت ہونے لگے تو نوجوان نے بھی مصافحہ کے لیے ہاتھ آگے بڑھائے۔ مولانا

نے نہایت شفقت سے اس کا ہاتھ کھینچ کر اسے اپنے پاس بٹھالیا۔

"صاحب زادے، کیا نام ہے آپ کا؟ کس خوش قسمت باپ کے بیٹے ہو؟"

"حضرت، میرا نام عبدالکریم ابانی ہے۔ میرے والد یعقوب ابانی ہیں۔ ہمارے آباو اجداد پڑدھڑی کاٹھیاواڑ میں رہتے تھے۔ جب راج کوٹ انگریزوں نے اپنے قبضے میں لے لیا تو میرے والد راج کوٹ میں آبسے۔ حکومت وقت نے انہیں رہائش کے لیے زمین فراہم کی جہاں انہوں نے اپنے اور اپنی اولاد کے لیے چھوٹے موٹے مکانات تعمیر کروالیے۔ کچھ زمینیں ہیں جن پر ہم لوگ چھوٹی موٹی زمینداری کرلیتے ہیں۔"

"آپ لوگ تو میمن ہیں۔ مسلمان خوشحال تاجروں کی برادری، آپ اور کاشتکاری؟" مولانا نے فرمایا اور عبدالکریم سن کر خاموش ہوگیا۔

"خیر، میرے پاس آتے رہنا۔ یہاں سے کچھ لے کر ہی جاؤ گے دینا نہیں پڑے گا۔"

"مجھے آپ کی باتیں اچھی لگی ہیں۔ اب میں آتا رہوں گا۔"

عبدالکریم پانچوں وقت کی نماز اس مسجد میں ادا کرنے لگا اور باقاعدگی سے درس میں شریک ہونے لگا۔ رفتہ رفتہ یہ عقیدت اتنی بڑھی کہ ملاقاتیں درس تک محدود نہیں رہیں۔ یہ ملاقاتیں قربت میں بدلیں اور فارغ اوقات میں ان کے پاس جاکر بیٹھنے لگا۔ مولانا بھی اس شفقت سے پیش آنے لگے جیسے کوئی باپ اپنے بیٹے کا خیال رکھتا ہے۔

☆☆☆

یعقوب ابانی ایک روز گھر آئے تو بہت خوش تھے۔ آتے ہی عبدالکریم کا پوچھا۔ جب انہیں بتایا گیا کہ وہ گھر پر نہیں ہے تو وہ اپنی زوجہ یعنی والدہ عبدالکریم کے پاس جاکر بیٹھ گئے۔ خوش اتنے تھے کہ بات نہیں ہورہی تھی۔

"اللہ آپ کو اسی طرح خوش رکھے۔ کیا بات ہوئی ہے جو یوں خوش ہیں؟"

"ہمارے شہر میں ایک بزرگ مولانا عبدالخالق آئے ہوئے ہیں۔ سال دو سال سے یہیں مقیم ہیں۔ میری بدبختی دیکھو کہ ان سے آج تک ملاقات ہی نہیں ہوئی تھی۔ آج ان سے سرراہ ملاقات ہوگئی۔ نہ جانے کس طرح مجھے پہچان گئے۔ شاید جو لوگ ان کے ساتھ تھے انہوں نے بتایا ہو۔ مجھے تعجب ہوا جب وہ خود میرے پاس تشریف لائے پھر جانتی ہو کیا ہوا؟"

"مجھ گھر میں بیٹھنے والی کو کیا معلوم۔"

"ہاں تم کون سی وہاں موجود تھیں جو تمہیں معلوم ہو۔ اگر موجود ہوتیں تو تم بھی اتنی ہی خوش ہوتیں جتنا میں خوش ہو رہا ہوں۔"

"یا اللہ بتایئے بھی کیا بات ہوئی؟"

"مت پوچھو، اس وقت میری کیا حالت ہوئی جب انہوں نے سب لوگوں کے سامنے میرے عبدالکریم کی تعریفیں شروع کردیں۔ وہ کہہ رہے تھے ہمارا عبدالکریم نہایت نیک اور صالح بچہ ہے۔ ایک بزرگ کی زبانی ایسی تعریف سننا کم خوشی کی بات ہے؟"

"وہ عبدالکریم کو کیسے جان گئے؟"

"مسجد میں درس ہوتا ہے۔ عبدالکریم اس درس میں شریک ہوتا ہے۔"

"اللہ نے اس عمر میں میرے بچے کو دین کا ایسا شوق دیا ہے۔"

"اس کی نماز کا یہ عالم ہے کہ جب وہ اپنے کھیت پر جاتا ہے تو خود ہی اذان دیتا ہے اور کسی کو اپنے ساتھ بلاکر باجماعت نماز ادا کرتا ہے۔ کوئی ساتھی نہیں ملتا تو سائیکل اٹھاتا ہے اور ولی محمد سیٹھ کی مسجد میں باجماعت نماز ادا کرتا ہے۔ یہ سب باتیں مجھے معلوم تو ہورہی تھیں لیکن یہ معلوم نہیں تھا کہ یہ تبدیلی اس میں مولانا عبدالخالق کی صحبت کی وجہ سے آئی ہے۔ آج مولانا نے اظہار کیا تو مجھے معلوم ہوا۔ وہ میری اور تمہاری بھی تعریف کررہے تھے کہ ہم نے اس کی اچھی تربیت کی ہے۔"

"اس کی تربیت میں مجھ سے زیادہ آپ کا ہاتھ ہے۔ تعریف کے قابل آپ ہیں۔"

"میں بھی کیا، یہ سب اللہ کی مہربانی ہے۔"

"ارے ہاں۔" یعقوب ابانی نے چونکتے ہوئے کہا۔ "جو بات کہنے کے لیے بھاگا چلا آرہا تھا وہ تو رہ ہی گئی۔"

"کوئی اور بھی ملا تھا کیا جو عبدالکریم کی تعریف کررہا تھا۔"

"ہاں تعریف ہی سمجھو۔ جب کوئی اپنی بیٹی اپنے منہ سے کسی کو دے تو تعریف ہی ہوتی ہے۔ ایک جاننے والے ملے تھے۔ میرے پاس اکثر آتے ہیں۔ عبدالکریم سے بھی

واقف ہیں، وہ کہہ رہے تھے میں عبدالکریم کو ان کی دامادی میں دے دوں۔ بہت شریف اور نیک گھرانا ہے۔"

"آپ نے کیا کہہ دیا؟"

"میں تم سے پوچھے بغیر کیسے کوئی جواب دے سکتا تھا۔"

"مجھ سے کیا پوچھنا۔ عبدالکریم سے ذکر کرکے دیکھ لو۔"

"وہ میرے حکم سے کیسے سرتابی کرے گا۔ وہ میرے حکم سے باہر تھوڑی ہے۔"

"وہ اپنی تمام خوبیوں کے باوجود ذرا اکھڑ اور ضدی ہے۔ کیا خبر انکار ہی کردے۔"

"میں اس کا بھی باپ ہوں۔ انکار کرکے تو دیکھے۔"

عبدالکریم گھر آیا تو اس کی ماں نے اس کی شادی کے بارے میں اس سے بات کی۔ وہ سن کر چپ ہوگیا۔ ماں شش و پنج میں تھی کہ اسے وہ اس کا انکار سمجھے یا اقرار۔

باپ نے الگ بات کی۔ وہ کچھ دیر تو چپ رہا لیکن پھر یہ کہہ کر اٹھ گیا کہ وہ مولانا عبدالخالق سے بات کرنے کے بعد ہی کچھ کہہ سکے گا۔ باپ کے لیے اس کا یہ فیصلہ کچھ عجیب سا تھا لیکن مولانا سے اس کی عقیدت دیکھ کر وہ چپ ہوگئے۔

عبدالکریم جب مولانا سے ملا تو اس نے گھر میں ہونے والے چرچوں کا ان سے تذکرہ کیا۔

"حضرت، میرے والد میری شادی کرنا چاہتے ہیں۔"

"تم کیا چاہتے ہو؟"

"میں تو چاہتا ہوں ابھی کچھ اور وقت آزادی کا مل جائے۔"

"میاں کچھ اور وقت لے کر کیا کروگے۔ والدین کی خوشنودی سے بھی جاؤ گے۔"

"آپ بھی یہی کہتے ہیں۔"

"میں کیا، خدا اور اس کا رسولؐ بھی یہی کہتے ہیں۔"

"آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کے لیے وقت کی قلت ہوجائے گی۔"

"یہ کیوں نہیں سوچتے کہ جو وقت تم اپنے بیوی بچوں کو دوگے وہ عبادت میں شمار ہوگا۔"

"میں آپ کے سامنے ایک عہد کرتا ہوں کہ شادی کے بعد جو پہلی اولادِ نرینہ ہوگی میں اسے دین کی تعلیم کے لیے وقف کردوں گا اور عربی کا عالم بے بدل بناؤں گا۔ آپ اپنی زبانِ مبارک سے ارشاد فرمادیجیے کہ ایسا ہی ہو۔"

مولانا نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھادیے۔ "اے اللہ! عبدالکریم کو نیک بیوی عطا فرما۔ اس کے بطن سے جو اولاد پیدا ہو وہ بھی نیک اور صالح ہو۔ اے اللہ! تو غیب سے ایسا سامان فراہم فرمادے کہ عبدالکریم کی پہلی اولادِ نرینہ کو دین کی تعلیم کا شغف ہو۔ اس کی علمیت کے چرچے دور دور ہوں۔ دنیا میں آفتاب و مہتاب بن کر چمکے۔ زبانِ عربی پر اسے ایسا عبور ہو کہ اس پر اہلِ عرب ناز کریں۔"

عبدالکریم ان کے پاس سے اٹھا تو بہت مطمئن تھا۔ گھر آکر اس نے یہ نوید سنادی کہ وہ شادی کے لیے راضی ہے۔

شادی کے لیے برات لے کر گونڈل جانا تھا کیونکہ لڑکی کا میکا وہیں تھا۔ تیاریاں شروع ہوگئیں۔ نہایت دھوم دھام سے برات گونڈل پہنچی۔

لڑکی کا نام مریم بائی تھا۔ مریم بائی بیاہ کر راج کوٹ آئیں تو چند روز کی رفاقت ہی میں عبدالکریم کو اندازہ ہوگیا کہ اس کی دعا کو قبولیت حاصل ہوگئی۔ مریم بائی نہایت مسکین طبیعت، نیک دل اور عبادت گزار تھیں۔ ابھی عبدالکریم کی دعا کا دوسرا حصہ ظہور میں آنا باقی تھا۔

قدرت کو بھی اس کی دعا قبول کرنے کی جلدی تھی۔ بچے کی ولادت کے آثار ظاہر ہوئے تو وہاں کے دستور کے مطابق مریم بائی کے والدین انہیں گونڈل لے گئے۔

قاعدہ یہی تھا کہ پہلے بچے کی ولادت لڑکی کے والدین کے گھر ہوتی ہے۔

عبدالکریم سجدہ ریز تھے کہ یاراللہ! مجھے اولادِ نرینہ دے۔ اس لیے نہیں کہ مجھے بیٹیاں اچھی نہیں لگتیں بلکہ اس لیے کہ میں نے تجھ سے وعدہ کیا ہے کہ اپنے پہلے بیٹے کو دین کی تعلیم دلاؤں گا اور عربی کا بے بدل عالم بناؤں گا۔

اس کی یہ دعا بھی سن لی گئی۔ مریم بائی گونڈل میں تھیں کہ انہوں نے 123 اکتوبر 1888ء کو ایک بیٹے کو جنم دیا۔ اس کا نام عبدالعزیز رکھا گیا۔

عبدالکریم کو اپنا عہد یاد تھا۔ گھر میں پہلی اولاد تھی اور وہ بھی بیٹا۔ گلشن میں بہار اتر آئی تھی۔ دادا زندہ تھے جو چند ماہ کے عبدالعزیز کو گود میں لیے لیے پھرتے تھے۔ ایک کھلونا تھا جو سب کے ہاتھ آگیا تھا۔ عبدالکریم کو تو دُہری خوشی حاصل ہوئی تھی۔ وہ باپ بھی بنے تھے اور ان کی مراد بھی

پوری ہوئی تھی۔ اب انہیں اس دن کا انتظار تھا جب عبدالعزیز پڑھنے کی عمر کو پہنچے اور وہ اپنا عہد پورا کریں۔

راج کوٹ ایک پسماندہ علاقہ تھا۔ تعلیم حاصل کرنے کا عام رواج نہیں تھا۔ زیادہ تر لوگ تجارت سے وابستہ تھے یا کھیتی باڑی کرتے تھے۔ خود عبدالکریم کے خاندان میں کوئی قابلِ ذکر علمی ہستی نہیں گزری تھی لیکن عبدالکریم خواب دیکھ رہے تھے کہ ان کا بیٹا بڑا ہو اور وہ اسے عالم دین بنائیں۔

دن پر دن گزرتے چلے گئے۔ گھر میں دو بچے اور کھیلنے کو آ گئے۔ عبدالعزیز اب باتیں کرنے لگا تھا بلکہ باتوں کے میلے سجانے لگا تھا۔ اسکول جانے سے پہلے بہتر تھا کہ اسے قرآن کی تعلیم گھر پر دی جائے۔ اس وقت کا عام قاعدہ بھی یہی تھا۔

عبدالعزیز گھر پر رہ کر قرآن کریم ناظرہ پڑھنے لگا۔ کبھی والدہ سبق یاد کرواتیں، کبھی دادی کے پاس جا بیٹھتا۔ گھر والے یہ بات محسوس کر رہے تھے کہ بچہ نہایت ذہین ہے۔ جو سبق دیا جاتا ہے فوراً یاد کر لیتا ہے۔ عبدالکریم نے اسے انجمن حمایت اسلام لاہور کی جانب سے شائع کردہ اردو ریڈر لا کر دے دیے۔ کچھ دیر بیٹھ کر اسے لفظ جوڑنا سکھائے اور پھر وہ حیرت ناک طور پر خود پڑھنے لگا۔ شوق اتنا تھا کہ ہر وقت کتابیں سینے سے لگائے لگائے پھرتا تھا۔

گجراتی مادری زبان تھی لہٰذا گجراتی کی ابتدائی کتب بھی اسے پڑھائی گئیں تاکہ وہ گجراتی بھی لکھنا پڑھنا سیکھ جائے۔

اس کی عمر اب سات سال ہوگئی تھی۔ قرآن ناظرہ ختم کر لیا تھا۔ اردو اور گجراتی کی ابتدائی کتابیں بھی ختم کر لی تھیں۔ اب اسے کسی مدرسے میں باقاعدہ تعلیم حاصل کرنے کے لیے بٹھانا تھا۔

جونا گڑھ کے مسلمانوں کی علمی پستی دور کرنے کی غرض سے نواب سر مہابت خاں کے نام پر مہابت مدرسہ قائم کیا گیا تھا۔ اس مدرسے میں مفت تعلیم دی جاتی تھی اور قابل طلبہ کو وظائف بھی دیے جاتے تھے۔ تعلیم بھی ایسی تھی کہ دور دور شہرت ہوگئی تھی۔

عبدالکریم کے دوستوں نے انہیں مشورہ دیا کہ وہ عبدالعزیز کو مہابت مدرسہ جونا گڑھ میں داخل کروا دیں۔

یہ مشورہ اس لیے بھی دیا جا رہا تھا کہ عبدالکریم کے ایک بھائی محمد یوسف یعنی عبدالعزیز کے چچا جونا گڑھ میں مقیم تھے۔ بچے کے قیام و طعام کی مشکل بہ آسانی حل ہو سکتی تھی۔ محمد یوسف کوئی غیر نہیں چچا تھے۔ ان کی نگرانی بھی رہتی۔

پہلی اولاد تھی۔ دل گوارا نہیں کر رہا تھا کہ اسے گھر سے دور بھیجا جائے لیکن تعلیم بھی ضروری تھی۔ دل پر پتھر رکھنا پڑا۔ عبدالعزیز راج کوٹ سے جونا گڑھ اپنے چچا کے گھر چلا گیا۔

جب اس کے چچا اسے مہابت مدرسہ داخلے کے لیے لے کر گئے تو وہ مدرسے کی عمارت دیکھ کر حیران رہ گیا۔ مدرسہ کیا تھا ایک محل تھا۔ اس نے ایسی شاندار عمارت پہلے نہیں دیکھی تھی۔ وہ دل میں یہ سوچ کر خوش ہو رہا تھا کہ وہ ایسی شاندار عمارت میں تعلیم حاصل کرے گا۔

وہ اس مدرسے میں داخل ہوگیا اور باقاعدگی سے مدرسے جانے لگا۔ اس نے اس مدرسے میں تین سال تک دینی تعلیم حاصل کی۔ دینی کتب کے علاوہ آمد نامہ بھی پڑھی اور خطِ نستعلیق کی تعلیم بھی حاصل کی۔

تین سال گزرے تھے کہ باپ نے کھینچا تانی کی۔ عبدالعزیز کو دوبارہ راج کوٹ بلا لیا گیا۔ اب عبدالعزیز کی عمر دس سال ہوگئی تھی۔

سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ عبدالعزیز کی تعلیم کا اب کیا بندوبست کیا جائے پھر یہی سوچا کہ مقامی اساتذہ کی مدد سے اسے اردو فارسی کی مروجہ دینی کتب کی تعلیم دی جائے۔ یہ بے سمت سفر تھا مگر اسے اس سفر پر روانہ کر دیا گیا۔

تین سال مزید گزر گئے۔ اس کی عمر اب تیرہ سال ہوگئی تھی۔ ایک مرتبہ پھر مولانا عبدالخالق نے عبدالکریم کی رہنمائی کی۔

”صاحبزادے کی تعلیم کا کیا حال ہے؟“ مولانا نے پوچھا۔

”تین سال سے اردو، فارسی کی دینی کتب کا مطالعہ کر رہا ہے۔ کچھ اپنے طور پر کچھ اساتذہ کی مدد سے۔“

”یہ تو بہت اچھا ہے لیکن اسے کامل بنانا ہے تو لائق اساتذہ کی ضرورت ہوگی جو تمہیں راج کوٹ میں تو میسر آئیں گے نہیں۔ یوں بھی قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کا یہ شیوہ رہا ہے کہ وہ علم کے حصول کے لیے سفر اختیار کیا کرتے تھے۔ کسی کی قابلیت جانچنے کے لیے یہ دیکھا جاتا تھا کہ اس نے کتنے سفر اختیار کیے اور کتنے اساتذہ سے تعلیم حاصل کی۔ عبدالعزیز کو راج کوٹ سے باہر بھیجو۔ کندن بن کر لوٹے گا۔ تمہارے سامنے میری مثال موجود ہے۔ میں کشمیری ہوں، لکھنو میں تعلیم حاصل کی پھر مزید تعلیم کے لیے گجرات چلا گیا، جونا گڑھ گیا اور اب راج کوٹ میں ہوں۔“

”حضور، تیرہ سال کی جان کو کہاں بھیجوں؟“

”کمال کرتے ہو، دہلی بھیجو۔ اگر دہلی میں کوئی واقف کار ہے تو اس کے پاس بھیج دو ورنہ وہاں طالب علموں کے لیے مسجدوں کے دروازے کھلے ہیں۔ کہیں بھی رہ لے گا مگر تعلیم تو حاصل کرے گا۔ بچہ ذہین ہے، بہت جلد پارس بن جائے گا۔“

”حضور ایک صاحب حافظ عبدالرزاق نام کے میرے آشناؤں میں ہیں تو سہی۔ راج کوٹ اکثر آتے جاتے رہتے ہیں۔ عبدالعزیز کو ان کے سپرد کر سکتا ہوں۔“

”بس تو پھر دیر کس بات کی ہے۔“

عبدالکریم نے اسی وقت سوچ لیا تھا کہ وہ اپنے بیٹے کو دہلی بھیج دیں گے لیکن گھر آتے آتے خود سے جنگ کرنے لگے۔ ایک دل کہتا تھا دہلی بھیجیں، ایک دل کہتا تھا نہ بھیجیں۔ اتنا بڑا شہر ہے وہ وہاں کیسے رہے گا۔ حافظ عبدالرزاق اس کے ساتھ نہ جانے کیا سلوک کریں۔ گھر جیسا آرام اسے کہاں ملے گا۔ یہ تو ان کی دلیلیں تھیں۔ دوسری طرف مولانا عبدالخالق کی باتیں یاد آ رہی تھیں کہ کوئی طالب علم گھر سے دور رہ کر سختیاں جھیلے بغیر عالم نہیں بن سکتا۔ خدا سے کیا ہوا عہد یاد آتا تھا۔

ابھی وہ کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکے تھے کہ ایک صاحب ملے عبدالخالق دہلی جا رہے تھے۔ عبدالکریم نے ان سے ذکر کیا اور عبدالعزیز کو ان کے ساتھ دہلی بھیج دیا۔ یہ ہدایت بھی کر دی کہ وہ عبدالعزیز کو سبزی منڈی میں مقیم حافظ عبدالرزاق تک پہنچا دے۔ وہ خود اسے کسی مدرسے میں داخل کروا دیں گے۔

اس وقت شہر دہلی شہر علم و حکمت تھا۔ تشنگانِ علم دور دور سے آتے اور اپنی پیاس بجھاتے تھے۔ ہر دس بیس قدم پر ایک نہ ایک عربی مدرسہ ہوتا تھا اور ان مدارس میں بنگال، پنجاب، افغانستان، عرب اور کاشغر تک کے طلبہ آتے تھے۔ دہلی کے باشندے ان مدارس کی ہر طرح سے امداد کرتے۔ دہلی والے ان طلبہ کو ہر موسم کے لحاظ سے ضروری کپڑے مہیا کرتے تھے۔ بعض غریب بیبیاں بھی طلبہ کے کپڑے بلامعاوضہ سی کر دینے کو بڑی سعادت سمجھتی تھیں۔ فتح پوری سے گھنٹا گھر تک۔ صدر سے قرول باغ تک۔ فراش خانے سے چاوڑی بازار تک ہر دس پندرہ قدم پر کوئی نہ کوئی طالب علم آتا جاتا ضرور دکھائی دیتا تھا جس کے ہاتھ میں مشکوٰۃ شریف، ابوداؤد اور صحیح بخاری کی چوڑی چکلی جلدیں ہوتی تھیں یا کبھی کبھی ان طلبہ کے پاس لمبی تقطیع کی صحیح مسلم شریف ہوتی۔ دہلی کے صاحبِ ثروت لوگ طلبہ کو دعوتیں دینا فخر سمجھتے تھے۔

عبدالعزیز نے دہلی میں قدم رکھا اور بازاروں سے گزرا تو علم کی یہ گرم بازاری اس کی نظروں سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔ اس نے جگہ جگہ طالب علموں کو آتے جاتے دیکھا۔

”یہاں تو پورا شہر ہی طالب علم ہے۔“ اس نے دل میں سوچا۔ دوسری جانب وہ یہ بھی سوچ رہا تھا کہ شہر اتنے بڑے بھی ہوتے ہیں۔ یہاں کے لباس اور بول چال بھی نئی تھی۔ اس سے پہلے وہ کاٹھیاواڑ کے علاقے سے باہر ہی نہیں نکلا تھا۔ اپنے میزبان کے گھر پہنچتے پہنچتے اسے یقین ہوگیا تھا کہ اس شہر میں رہ کر وہ تعلیم حاصل کر سکتا ہے۔

حافظ عبدالرزاق نے اسے کشادہ دلی سے خوش آمدید کہا۔ چند روز اپنے پاس رکھا اور دہلی کی سیر کرواتے رہے۔ انہیں یہ دیکھ کر تعجب ہوا کہ بچے تو سیر و تفریح کے دل دادہ ہوتے ہیں لیکن وہ ان سے ضد کر رہا تھا کہ وہ جلد سے جلد اسے کسی مدرسے میں داخل کروا دیں۔ اس کا شوقِ علم ان کے لیے باعثِ حیرت تھا۔

حافظ عبدالرزاق نے اسے ایک دن اپنے ساتھ لیا اور صدر بازار میں واقع مولوی عبدالوہاب کے مدرسے پہنچ گئے۔

مولانا عبدالوہاب جھنگ کے رہنے والے تھے۔ ابتدائی تعلیم امرتسر سے حاصل کی پھر دہلی آ کر مولانا میاں نذیر حسین محدث سے تحصیلِ حدیث کی۔ تکمیلِ علم کے بعد دہلی میں مدرسہ دارالکتاب والسنہ قائم کیا۔

عبدالعزیز اس مدرسے میں پڑھنے کے لیے بیٹھ گیا۔ مدرسے میں ہی قیام تھا۔ وہ جس طرح دوسرے طالب علم پڑھ رہے تھے اسی طرح پڑھنے لگا۔ وہی روایتی طریقہ جس میں سمجھنے سے زیادہ رٹنے پر زور دیا جاتا ہے۔

ایک روز وہ مدرسے کی سیڑھیوں پر بیٹھا تھا کہ اس کی نظر ایک شخص پر پڑی۔ چہرہ کچھ شناسا معلوم ہوا۔ غور کرنے پر یاد بھی آ گیا۔ اس کا نام رحمت اللہ تھا۔ یہ شخص کبھی راج کوٹ آیا تھا اور ایک مسجد میں مثنوی مولانا روم پڑھ کر سنائی تھی۔ عبدالعزیز نے اسے پہچان لیا لیکن پھر بھی تصدیق ضروری تھی۔

''تم کبھی راج کوٹ آئے تھے؟''

''ہاں۔''

''تم نے مسجد میں مثنوی مولانا روم پڑھی تھی؟''

''ہاں۔''

''تمہارا نام شاید رحمت اللہ ہے؟''

''ہاں یہی نام ہے۔''

''یہاں کیسے آنا ہوا؟ کیا یہاں مثنوی مولانا روم پڑھاؤ گے؟''

''میری اتنی قابلیت کہاں، میں تو یہاں تعلیم حاصل کرنے آیا ہوں۔''

''کمال ہے، اتنی عمر گزرنے کے بعد پڑھو گے۔ تم نے پہلے ہی بہت کچھ پڑھ لکھ لیا ہے۔''

''پڑھنے کی کوئی عمر نہیں ہوتی۔'' رحمت اللہ نے کہا۔ ''تم سناؤ، تم یہاں کیسے؟''

''میں بھی یہاں پڑھنے آیا ہوں اور عربی شروع کی ہے۔''

''تم نے عربی شروع کی ہے؟''

''ہاں۔''

''کہاں تک پہنچ گئے؟''

''شرحِ جامی شروع کی ہے۔''

''دیکھوں کتنی قابلیت حاصل کرلی، کچھ سوال پوچھوں؟''

''پوچھو۔''

رحمت اللہ نے اس سے کچھ سوال پوچھے۔ وہ کسی بھی سوال کا معقول جواب نہ دے سکا۔ رحمت اللہ کو بڑا تعجب ہوا۔

''تم اتنا آگے چلے گئے لیکن معمولی معمولی باتیں تک نہیں معلوم۔ یہ تو کوئی بات نہ ہوئی۔''

عبدالعزیز کو ایسی شرمندگی ہوئی کہ اگر بس چلتا تو زمین میں گڑ جاتا۔ اس نے بڑے فخر سے رحمت اللہ سے کہا تھا کہ تم اب پڑھنے آئے ہو ہم تو کہاں سے کہاں پہنچ گئے لیکن جب اس نے سوال پوچھے تو ایک کا بھی جواب نہ بن پڑا۔ اس کا مطلب یہی نکل سکتا تھا کہ استاد اپنا فرض پورا نہیں کررہے ہیں۔ انہوں نے کبھی یہ جاننے کی کوشش ہی نہیں کی کہ مجھے کچھ آتا بھی ہے یا یونہی خالی بیٹھا رہتا ہوں۔ اگر مجھے کچھ بننا ہے تو خود ہی کوشش کرنی پڑے گی۔ اس نے استادوں پر تکیہ کرنا چھوڑ دیا۔ عربی کی معرکتہ الآرا کتب جو مدرسے میں پڑھائی بھی نہیں جاتی تھیں خود لے کر بیٹھ گیا۔ جو مضمون ایک کتاب سے سمجھ میں نہیں آتا دوسری کتاب سے رجوع کرتا۔ رفتہ رفتہ یہ حال ہوا کہ دہلی میں چند ہی طالب علم ہوں گے جو اس کی برابری کرسکتے ہوں۔

جب وہ اپنی بنیادیں مضبوط کرچکا تو اس نے قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کا طریقہ اختیار کیا۔ اس نے کسی مدرسے میں باقاعدہ طالب علم بن کر بیٹھنے کے بجائے دہلی میں موجود نامور اساتذہ کی خدمت میں حاضری دینا شروع کردی۔ بہت سی یادگار مسجدیں تھیں جن میں اساتذہ درس دیا کرتے تھے۔ عبدالعزیز خود بھی ایک مسجد میں رہنے لگا۔ چٹائی بچھا کر فرش پر سوجاتا اور پھر اساتذہ کی تلاش میں نکل جاتا۔ مشکوٰۃ شریف کے ابواب کا درس لینے لگا۔ عربی کی کچھ کتابیں بھی ان سے پڑھیں۔ مولانا محمد بشیر سہوانی بڑے اور اونچے درجے کے محدث اور فلسفی تھے، ان سے حدیث و تفسیر کی تعلیم حاصل کی۔ مولوی عبدالرحمٰن سے صحیح بخاری اور مسلم شریف پڑھیں۔

عربی زبان پر عبور حاصل کرنے کے بعد جب وہ عربی ادب کی طرف راغب ہوا تو اسے ایک ایسے استاد کی تلاش ہوئی جو عربی داں بھی ہو اور ادیب بھی۔ ڈپٹی نذیر احمد کے سوا اس وقت کوئی ایسا آدمی دلی میں موجود نہیں تھا۔ وہ اردو کے نامور ادیب، انشا پرداز اور ناول نگار تھے۔ اردو ادب کے حوالے سے ان کی شہرت اتنی زیادہ ہوگئی تھی کہ ان کی عربی دانی اور عربی ادب و شاعری میں مہارت دب سی گئی تھی ورنہ حقیقت یہ تھی کہ اس عہد میں عربی زبان و ادب کے چند ہی ماہر ہوں گے جو ڈپٹی صاحب کے ہم پلہ ہوں۔ پڑھنے کے علاوہ پڑھانا بھی ان کا دل پسند مشغلہ تھا۔ نذیر احمد کے سوا اور کوئی معروف شخصیت ایسی نظر نہیں آتی تھی جو جاہ و ثروت کی اس بلندی پر پہنچ کر بھی اتنے ذوق و شوق اور پابندی سے طلبہ کی جماعتوں کو پڑھایا کرتی ہو مگر ان کی شاگردی کرنے کے لیے طلب صادق کی ایسی کڑی شرط عائد تھی کہ کوئی بدشوق طالب علم ان کے حلقۂ درس میں ٹکنے نہ پاتا تھا۔ طلبہ کو ایک دن کی بھی چھٹی نہ ملتی۔ عید، بقرعید کو بھی آنا پڑتا تھا۔ ظاہر ہے چھٹیوں سے وہ خود بھی بے نیاز تھے۔ ابھی ایک جماعت رخصت ہوکر گئی تو دوسری جماعت آگئی۔ کوئی طالب علم بضد ہوا تو آرام کا وقت بھی اسے دے دیا۔

عبدالعزیز کی خوش قسمتی تھی کہ جب وہ دلی پہنچا تو مولوی صاحب ترکِ ملازمت کے بعد حیدرآباد دکن سے دلی آگئے تھے۔ تصنیف و تالیف میں مشغول تھے یا طلبہ کو درس دیا کرتے تھے۔

وہ جس مسجد میں رہتا تھا اس کے حجرے میں بیٹھا تھا کہ مسجد فتح پوری کے کچھ طلبہ اس سے ملنے آئے۔ باتوں باتوں میں ڈپٹی نذیر احمد کا ذکر نکل آیا۔ یہ طلبہ ڈپٹی نذیر احمد سے پڑھتے تھے۔ انہوں نے ڈپٹی نذیر احمد کے پڑھانے کا نقشہ کھینچنا شروع کیا۔

''طالب علم ایک شعر پڑھتا ہے وہ صرف و نحو کے نکات سمجھاتے ہیں۔ معانی و مطالب پر روشنی ڈالتے ہیں پھر اسی مضمون کے اشعار اور مقولوں کا سلسلہ شروع ہوجاتا ہے۔ حسبِ موقع کوئی قصہ یا لطیفہ یا اپنی زندگی کا کوئی واقعہ بھی سناتے ہیں۔ عربی نظم گوئی میں تو کمال کی قدرت حاصل ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت عربی میں ان سے اچھا شعر کہنے والا کوئی نہیں۔''

عبدالعزیز نے کرید کرید کر ان کے بارے میں مزید کچھ باتیں معلوم کیں اور دل میں تہیہ کرلیا کہ وہ ڈپٹی صاحب سے ضرور کسبِ فیض کرے گا۔

وہ دو منزلہ مکان تھا۔ زیریں منزل میں ادھر ادھر کتابوں کے ڈھیر پڑے تھے جو ان کی تصنیفات تھیں جنہیں وہ خود چھپواتے تھے۔

بالائی منزل پر پہنچ کر اسے نذیر احمد نظر آئے۔ سرخ و سفید چہرہ، دُہرا کسرتی بدن لیکن ورزش چھوڑ دینے سے توند نکل آئی تھی۔ سر بہت بڑا اور سرسید کے سر کی طرح ان کی سرداری کی علامت تھا۔ آنکھوں میں غضب کی چمک تھی۔ کلہ جبڑا ازبردست اور دہانہ بھی بڑا تھا۔ نووارد کو دیکھ کر جب انہوں نے اس کے آنے کا سبب پوچھا تو معلوم ہوا آواز نہایت پاٹ دار ہے۔

''جنابِ ڈپٹی صاحب، میں اس لیے حاضر ہوا ہوں کہ سمندر سے کچھ قطرے مجھے بھی مل جائیں۔''

''تم دلی والے تو معلوم نہیں ہوتے۔'' انہوں نے گاؤ تکیے پر لیٹے لیٹے پوچھا اور قریب رکھے حقے کی نے کو منہ سے لگالیا۔

''میں راج کوٹ کاٹھیاواڑ کا رہنے والا ہوں۔ طلب علم کا شوق دلی کھینچ لایا ہے۔''

''یہاں کس کے پاس ٹھہرے ہو؟''

''ایک مسجد میں رہتا ہوں، وہیں کی روٹی کھاتا

ہوں۔"

"کن اساتذہ سے کیا کیا تعلیم حاصل کر چکے ہو؟"

اس نے اساتذہ کے نام گنوائے۔ تعلیمی استطاعت کا احوال بیان کیا۔ ڈپٹی صاحب سن کر بہت خوش ہوئے لیکن یہ بھی کہا۔ "ان اساتذہ کو قرآن وحدیث کا تو بہت علم ہے لیکن ان میں ایسا کوئی نہیں جو عربی ادب سے واقف ہو اور خود ادیب بھی ہو۔"

"جی...... جی ہاں۔"

"تم سمجھتے ہو مجھ میں یہ صلاحیت ہے۔"

"میں یہی سن کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوا ہوں۔"

"صرف حاضر ہونے سے کچھ نہیں ہوتا۔ میرے اصول بہت کڑے ہیں۔ جسے شوق ہوتا ہے وہی ٹکتا ہے۔ میں بھی اپنے زمانۂ طالب علمی میں مسجد میں سوتا تھا، وہیں کی روٹی کھاتا تھا۔ مولوی صاحب کا سودا سلف لاتا تھا۔ ان کے گھر کے کام کاج کرتا تھا۔ تب یہ مقام پایا ہے۔ تم میں اور مجھ میں کچھ باتیں مشترک ہیں لہٰذا آجایا کرو، جو کچھ مجھے آتا ہے پڑھا دیا کروں گا۔"

دوسرے دن وہ پھاٹک حبش خاں کے بالمقابل گلی بتاشوں والی پہنچ گیا جہاں ڈپٹی صاحب کا مکان تھا۔ حکم ہوا حقہ بھر کے لاؤ۔ اس نے حقہ بھر کر سامنے رکھ دیا۔

ڈپٹی صاحب نے اپنے کتب خانے سے دیوان حماسہ نکالا اور اس کے سامنے رکھ دیا۔ "بھئی اس دیوان سے شروع کریں گے۔"

عبدالعزیز نے یہ سوچ کر کہ پڑھاتے وقت ڈپٹی صاحب کو اس کی ضرورت پڑے گی دیوان کا رخ ڈپٹی صاحب کی طرف کر دیا۔

"میاں مجھے یہ زبانی یاد ہے، تم اسے اپنے ہی سامنے رکھو۔ مجھے یاد تو سب ہوتا ہے بس اتنا ہے کہ کتاب سامنے ہو تو تسلی سی رہتی ہے۔"

پڑھانا شروع کیا۔ عبدالعزیز کو نہ صرف یہ دیکھ کر حیرت ہوئی کہ انہیں واقعی پورا دیوان یاد ہے بلکہ یہ دیکھ کر مزید حیرت ہوئی کہ وہ ایک شعر کی تشریح کرتے وقت دوسرے شعرا کے دسیوں اشعار بے تکان سناتے چلے جاتے ہیں۔ اسے خود بھی شوق ہوا کہ وہ بھی عربی اشعار کا ذخیرہ اپنے ذہن میں محفوظ کرے۔ حافظہ اس کا بھی خداداد تھا۔ جو دیوان پڑھتا اس کا بڑا حصہ زبانی یاد کر لیتا۔

ڈپٹی صاحب سے اس نے دیوان حماسہ، دیوان متنبی، مقامات حریری کتابیں وغیرہ پڑھیں۔ یہ تمام عربی ادب کی اونچے درجے کی کتب ہیں۔

اس نے اپنی ذہانت اور شوق سے ڈپٹی صاحب کو شیشے میں اتار لیا۔ روز بہ روز ڈپٹی صاحب کی مہربانیاں اس پر بڑھتی جا رہی تھیں۔ ان کے حقے کو کوئی ہاتھ نہیں لگا سکتا تھا لیکن عبدالعزیز کو اجازت تھی کہ وہ ان کا حقہ پی سکتا ہے۔

ایک دن خوش ہو کر یہ بھی فرمایا۔ "میرے کتب خانے سے تم جو کتاب چاہو لے جاؤ۔" دراصل ان کے مزاج کی تیزی صرف اوسط درجے کے طالب علموں کے لیے تھی۔ جس سے وہ خوش ہو جاتے تھے اس کے ساتھ نہایت شفیق تھے۔

عبدالعزیز اسی دوران ریاضی پڑھنے کے لیے محمد الحق رامپوری کی خدمت میں پہنچ گیا۔ اس کے یہ دن نہایت عسرت کے تھے۔ کاپی خریدنے کے لیے پیسے نہ ہوتے تو سڑک کے کنارے یا دفاتر کے باہر پڑے ہوئے ردی کاغذات کو جمع کر کے ان پر درسیات لکھ لیا کرتا تھا۔ تہی دستی کا یہ عالم تھا کہ کتب خریدنے کی بھی استطاعت نہ تھی چنانچہ اس کا حل اس نے یہ نکالا کہ ضروری کتب گھنٹوں محنت کر کے اپنے ہاتھ سے نقل کرتا۔

یہی زمانہ تھا کہ حکیم نورالدین بھیروی خلیفہ قادیان دہلی آئے۔ عبدالعزیز نے سن رکھا تھا کہ عربی نحو کا ایک نایاب رسالہ ان کے پاس ہے۔ وہ اس رسالے کے حصول کی خاطر ان کے پاس پہنچ گیا۔ وہاں ایک مجمع موجود تھا۔ وہ بھی ایک گوشے میں خاموش بیٹھ گیا۔

جب سب لوگ چلے گئے تو حکیم صاحب اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

"کہو صاحبزادے، تمہیں کیا پوچھنا ہے؟"

"میں نے سنا ہے کہ آپ کے پاس عربی نحو کا نایاب رسالہ "لب الالباب فی علم الاعراب" ہے؟"

"ہاں ہے۔" انہوں نے فرمایا۔ "اور اس وقت بھی کتابوں کے صندوق میں موجود ہے مگر آپ کو دے نہیں سکتا۔"

"میں آپ سے مانگ نہیں رہا ہوں۔ میں آپ کے سامنے اس کو پڑھوں گا اور نقل کروں گا۔"

"ہاں یہ ہو سکتا ہے، آپ کل صبح تشریف لے آیئے میں اسے نکال کر رکھوں گا۔"

وہ چلا آیا اور دوسرے دن علی الصباح وہاں پہنچ گیا۔

سارا دن لگا رہا اور شام تک اس کو نقل کر لیا۔

وہ سارے جہاں کا علم اپنے دامن میں سمیٹ رہا تھا اور شاید اپنے علم پر کچھ ناز بھی ہو گیا تھا چنانچہ ایک معمولی سے اختلاف کی بنیاد پر ڈپٹی نذیر احمد اور اس کے درمیان ان بن ہو گئی۔ وہ ابوالعلا معری کا دیوان پڑھ رہا تھا کہ ایک شعر کے نحوی مسئلے پر دونوں میں یعنی استاد اور شاگرد میں اختلاف ہو گیا۔ دونوں اپنی اپنی جگہ جمے رہے اور نتیجے میں دونوں کے درمیان مفارقت ہو گئی۔ عبدالعزیز نے ان کے پاس جانا چھوڑ دیا۔ اب وہ ریاضی کی تعلیم میں مشغول تھا۔

ڈپٹی نذیر احمد کے پاس جانا چھوڑ دیا تو اس کے پاس کچھ وقت فاضل بچ جاتا۔ ریاضی کے کئی مسئلے پڑھ چکا تھا۔ یہ اس کا میدان بھی نہیں تھا۔ نذیر احمد سے مفارقت کے بعد اسے کچھ مایوسی بھی ہوئی تھی۔ وہ دھیان بٹانے کے لیے کچھ دن کے لیے راج کوٹ چلا آیا۔

باپ نے جو دیکھا تو خوشی سے نہال ہو گئے۔ وہ اب اٹھارہ سال کا کبرو جوان تھا اور باپ کے خیال میں اس کی تعلیم بھی مکمل ہو گئی تھی۔ نہ جانے کب سے دل میں خیال لیے بیٹھے تھے۔

"اب تم آگئے ہو تو لگے ہاتھوں تمہاری شادی کے فرض سے بھی نمٹ جاؤں۔"

"ابھی تو میں اپنی تعلیم سے بھی فارغ نہیں ہوا ہوں۔"

"وہ تو تم کبھی فارغ نہیں ہو گے۔ جو لوگ پڑھے لکھے نہیں ہوتے کیا وہ شادی نہیں کرتے؟"

"میں نے کب انکار کیا لیکن پہلے پڑھ لکھ کر اپنے پیروں پر تو کھڑا ہو جاؤں۔"

"اتنا تو پڑھ ہی لیا ہے کہ کہیں نوکری مل سکتی ہے۔"

"میں نوکری کے لیے نہیں پڑھ رہا ہوں۔ آپ نے تو کہا تھا مجھے عالم بنائیں گے۔"

"میں تمہیں عالم بننے سے نہیں روک رہا ہوں۔"

"پھر میری ایک شرط ہے۔ میں شادی کیے لیتا ہوں لیکن آپ مجھے تحصیل علم سے نہیں روکیں گے۔ کچھ دن گزار کر میں پھر دہلی چلا جاؤں گا۔"

اس کے والد عبدالکریم ابانی نے سوچا کہ جب شادی ہو جائے گی تو دہلی خود بخود بری لگنے لگے گی۔ کچھ دن دہلی میں رہے گا پھر چلا آئے گا بیوی کے پاس راج کوٹ۔ انہوں نے اس کی یہ شرط منظور کر لی۔

عبدالکریم نے اپنے بھائی ہاشم کی بیٹی سے اس کی شادی کروا دی۔ عبدالعزیز نے کچھ دن اپنی بیوی کے ساتھ گزارے اور پھر جو کہا تھا وہ کیا۔ دہلی کے لیے رخت سفر باندھ لیا۔

اس شادی کا بہت جلد خاتمہ بھی ہو گیا۔ والد اور چچا مل کر کاروبار کیا کرتے تھے۔ لین دین میں کچھ جھگڑا ہوا تو والد اتنے غصے میں آئے کہ انہوں نے عبدالعزیز سے کہا کہ وہ اپنی بیوی کو طلاق دے دے کیونکہ عبدالعزیز کی بیوی ان کے بھائی کی بیٹی تھی۔ یہ عجیب سا مطالبہ تھا اس لیے عبدالعزیز نے طلاق دینے سے گریز کیا اور باپ کو سمجھایا۔

"اگر چچا جان سے آپ کی لڑائی ہو گئی ہے تو اس میں ان کی بیٹی کا کیا قصور۔ سزا اسے کیوں ملے۔ میں اتنا کر سکتا ہوں کہ اسے اس کے ماں باپ سے نہ ملنے دوں۔ آپ اس غریب کی زندگی کیوں خراب کرتے ہیں۔"

عبدالعزیز نے بہت کوشش کی کہ طلاق نہ ہو لیکن والد کا اصرار بڑھتا گیا۔ وہ مزاج کے تیز تھے اور طبیعت میں ضد بھی بہت تھی جس بات کی ٹھان لیتے تھے اسے کر کے ہی چھوڑتے تھے۔ عبدالعزیز کو طلاق دینی پڑی۔ اس شادی کا انجام افسوس ناک ہوا۔

عبدالعزیز نے بادل نخواستہ باپ کی خوشنودی کی خاطر طلاق دے تو دی تھی لیکن اتنا دل برداشتہ ہوا تھا کہ دل ہی دل میں آیندہ شادی نہ کرنے کا عہد بھی کر لیا تھا۔

ان جذباتی صدموں سے گزرنے کے بعد اس نے ایک مرتبہ پھر تعلیمی سلسلے کو جوڑا۔ اس مرتبہ اس نے شیخ حسین بن محسن انصاری سے حدیث کی تعلیم حاصل کی اور سندِ حدیث حاصل کی۔

اب اس کا رجحان عربی ادب کی جانب ہو گیا تھا۔ دہلی میں اگر کوئی استاد اس کے اس معیار پر پورا اترتا تھا تو وہ ڈپٹی نذیر احمد تھے۔ ان سے مفارقت ہو چکی تھی۔ اب دہلی میں کیا رہ گیا تھا۔ بھنورا نئے پھولوں کی تلاش میں گلستانِ دہلی سے نکلا اور امروہہ کے چمن میں جا اترا۔

وہ امروہہ اس لیے آیا تھا کہ وہاں رہ کر اپنی علمی تشنگی دور کرے۔ اس نے یہاں قیام بھی کیا۔ کئی اساتذہ سے رجوع بھی کیا لیکن پھر سوچا کہ امروہہ اس کے عزم اور حوصلے کے لیے نامناسب ہے۔ وہ حصول علم کی خاطر کسی کامل کا متلاشی تھا۔ یہ شخصیت مدرسۂ عالیہ رام پور کے صدر مدرس علامہ طیب عرب مکی کی تھی۔

طیب عرب مکی تو ادرِ عالم سے ایک نادرہ تھے۔ علوم کا بہتا دریا تھے۔ وطن مکہ تھا، نہ جانے ہندوستان کس طرح آنکلے۔ مولوی فضل حق خیر آبادی سے معقولات میں کمال حاصل کیا۔ نقلی علوم میں صاحب دستگاہ تھے۔ کتاب سے بے نیاز، ان کا علم ان کے سینے میں تھا۔ ادب میں اپنا جواب نہیں رکھتے تھے۔ کلام جاہلیت پر اس قدر عبور تھا کہ گھنٹوں قصیدے پر قصیدے مسلسل سناتے جاتے۔ پڑھنے کے انداز سے شعری تصویر کی عکاسی کر دیتے۔ نکات سخن بیان کرتے اور دادِ سخن دیتے۔ جس محفل میں بیٹھ جاتے کسی کا چراغ نہ جلنے دیتے۔

مدرسۂ عالیہ رام پور ملک گیر شہرت کا حامل ادارہ تھا اور طیب عرب اس کے صدر مدرس تھے۔

وہ امروہہ میں ایک سال گزارنے کے بعد کف افسوس مل رہا تھا کہ اب تک اسے مدرسۂ عالیہ کا خیال کیوں نہیں آیا۔ پڑوس میں دریا بہہ رہا تھا اور وہ اس سے بے خبر تھا۔

امروہہ سے رام پور کا فاصلہ ہی کتنا تھا۔ وہ رام پور پہنچا اور مدرسۂ عالیہ میں داخلہ لے لیا۔

اس زمانے میں معقولات کا بڑا چرچا تھا۔ قدیم فلسفہ اور منطق کی کتابیں پڑھے بغیر کوئی شخص صحیح معنوں میں عالم کہلانے کا مستحق نہیں سمجھا جاتا تھا اور ان علوم کا سب سے بڑا مرکز مدرسۂ عالیہ رام پور تھا۔ نہ صرف ہندوستان بلکہ افغانستان اور ترکستان تک کے طلبہ رام پور کھنچے چلے آرہے تھے۔

عبدالعزیز جیسا شائق علم بھی اس صف میں شامل ہوگیا۔ اس نے علامہ فضل حق رام پوری، شیخ محمد طیب عربی، شاداں بلگرامی اور مولوی عبدالعزیز جیسی نابغۂ روزگار ہستیوں سے اکتساب فیض کیا۔

شیخ محمد طیب عرب مکی سے اس نے عربی ادب میں استفادہ کیا جبکہ شاداں بلگرامی سے ادب فارسی میں تکمیل کی۔

جب فارسی کی کمزوری کچھ دور ہوگئی تو اس نے رام پور کے قیام کے دوران ہی پنجاب یونیورسٹی سے منشی فاضل کا امتحان پاس کیا اور پوری یونیورسٹی میں اول آیا۔ اب وہ عالم کہلانے لگا تھا اور لوگ اس کی تعظیم کرنے لگے تھے۔ ادب سے نام لیتے۔

اب انہوں نے فلسفہ اور کچھ انگریزی پڑھنی شروع کی۔ عربی اور فارسی میں طاق پہلے ہی ہو چکے تھے۔ ٹھیک ایک سال بعد 1913ء میں ارادہ کیا کہ لاہور جاکر مولوی فاضل کے امتحان میں بیٹھیں۔ وہ رام پور سے چلے اور لاہور آگئے۔

امتحان دینے کے بعد وہ امرتسر چلے آئے۔ یہ وہ وقت تھا جب وہ شدید مالی مشکلات سے دوچار تھے۔ امرتسر سے ایک اخبار وکیل نکلتا تھا۔ انہوں نے اس اخبار میں ملازمت کرلی۔ اسی اخبار کے دفتر سے ''تہذیب الاخلاق'' نامی رسالہ بھی نکلتا تھا۔ اس رسالے کے لیے انہوں نے تقریباً بیس بائیس روز تک کام کیا۔ امرتسر ہی میں انہیں اطلاع ملی کہ وہ مولوی فاضل کے امتحان میں فرسٹ کلاس فرسٹ آئے ہیں۔ یہاں ایک غلط فہمی ہوگئی تھی۔ ان کا ایک ہم نام بھی فرسٹ کلاس پاس ہوا تھا۔ اب یہ نہیں معلوم ہوتا تھا کہ نمبر زیادہ کس کے ہیں۔ ان کے یا دوسرے عبدالعزیز کے۔ وہ لاہور گئے، معلوم ہوا وہ فرسٹ بھی ہیں اور فرسٹ کلاس بھی یعنی دوسرے عبدالعزیز کے نمبر ان سے کم ہیں۔ انہوں نے جتنے نمبر حاصل کیے تھے وہ ایک ریکارڈ تھا۔ یہ ریکارڈ اگلے چالیس سال تک کوئی نہیں توڑ سکا۔

وہ لاہور آکر بیمار پڑ گئے اس لیے لاہور میں رکنا پڑا۔ ان کا یہ مختصر قیام ہی ان کی آیندہ ترقی کا سبب بن گیا۔ وہ لاہور ہی میں تھے کہ ایڈورڈز کالج پشاور میں عربی کے پروفیسر کی اسامی خالی ہوئی۔ پرنسپل ایڈورڈ کالج نے اورینٹل کالج لاہور کے پرنسپل مسٹر وولنر کو تار دیا کہ مجھے عربی فارسی کا ایک پروفیسر چاہیے۔

مسٹر وولنر، عبدالعزیز کی قابلیت اور صلاحیت سے واقف تھے۔ وہ فرسٹ کلاس فرسٹ آئے تھے۔ انہیں تعلیمی وظیفے کی پیش کش بھی کی گئی تھی۔

مسٹر وولنر نے تار کے ذریعے پرنسپل ایڈورڈ کالج کو اطلاع دی کہ'' ایک طالب علم نہایت لائق، عربی زبان وادب میں اس وقت یکتا وتنہا میرے اختیار میں ہے۔ ضرورت مند بھی ہے۔ میں اسے آپ کے پاس بھیج رہا ہوں۔ اگر آپ اس سے مطمئن ہوجائیں تو اسے رکھ لیں۔''

عبدالعزیز نے اس پیش کش کو قبول کرلیا اور پشاور چلے گئے۔ ایڈورڈز کالج پشاور کا پرنسپل بھی ایک انگریز مسٹر مارٹن تھا۔

مسٹر مارٹن اپنے دفتر میں بیٹھے تھے کہ انہیں عبدالعزیز

کی آمد کی اطلاع دی گئی۔ طویل القامت، گورے چٹے رنگ کا ایک نوجوان۔ چہرے پر پوری داڑھی، میمن کٹ پتلون پر شیروانی پہنے سر پر ترکی ٹوپی لگائے ان کے کمرے میں داخل ہوا۔ مسٹر مارٹن اسے دیکھ کر متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ علمی قابلیت کا جو ایک نور ہوتا ہے وہ موجود تھا اور پھر انہیں مسٹر وولنر کی طرف سے بھیجا گیا تھا۔ پرنسپل نے چند باتیں ان کے متعلق پوچھیں اور مطمئن ہوکر تنخواہ کے بارے میں ان سے پوچھا۔

''آپ تنخواہ کتنی لیں گے؟''

''پندرہ روپے۔''

وہ اس وقت ان حالات سے گزر رہے تھے کہ پندرہ روپے ان کے لیے بڑی رقم تھی۔ سادگی کا یہ عالم تھا کہ انہیں یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ لیکچرار کی تنخواہ 75 روپے مقرر ہے۔ پرنسپل صاحب اس قلیل رقم کا مطالبہ سن کر مسکرا دیے۔

''مولوی صاحب، آپ تو بہت سادہ ہیں۔ آپ کو یہ بھی معلوم نہیں کہ ہم آپ کو 75 روپے ماہانہ دینے والے ہیں کیونکہ لیکچرر کی تنخواہ 75 روپے ماہانہ ہے۔''

''میں نے علم کو کبھی روزگار کا ذریعہ بنانے کے لیے حاصل نہیں کیا لہٰذا مجھے اس سلسلے میں کچھ معلومات نہیں۔ اب بھی آپ جو دینا چاہیں لے لوں گا۔'' ان کا تقرر ہوگیا۔

عربی ادب پر عبور، شعرائے جاہلیہ کے کلام کا احاطہ، رموزِ زبان وقواعد کا علم۔ ایک دریا تھا جو کلاس روم میں رواں دواں تھا۔ طلبہ تصویرِ حیرت تھے کہ پڑھایا اس طرح بھی جاتا ہے۔ سبق کے دوران کوئی شعر آیا نہیں کہ انہوں نے اس مضمون کی مناسبت سے دوسرے شعرا کے اشعار سنانا شروع کردیے۔ بعض اوقات تو پورا پورا قصیدہ سنا دیا کرتے تھے۔

ان کے پائے کا عالم صرف درس وتدریس سے نہیں بہل سکتا تھا۔ وہ اپنا بیشتر وقت علمی مشاغل میں صرف کرتے۔ ان مشاغل میں عربی ادب کی کتب کا مطالعہ اور نادر قلمی نسخوں کی نقل حاصل کرنا تھا۔

اسلامیہ کالج پشاور کے لائبریرین نے اسلامیہ کالج میں محفوظ مخطوطات کی ایک فہرست تیار کی تھی۔ اس میں دو ہزار سے زیادہ مخطوطات اور 688 مصنفین کے حالات بڑی محنت سے لکھے تھے۔ بظاہر اس فہرست میں کسی اضافے کی گنجائش نہیں تھی پھر بھی انہوں نے یہ فہرست عبدالعزیز میمن کی خدمت میں بھیجی جو اس وقت ایڈورڈز کالج میں آچکے تھے اور گزارش کی کہ اس پر ایک نظر ڈال لیں۔

یہ فہرست اتنی مکمل تھی کہ اضافے کی گنجائش نہیں تھی لیکن عبدالعزیز میمن نے ایک ایک اندراج کا بغور مطالعہ کیا اور اپنی وسیع معلومات کی بدولت نہ صرف بعض اغلاط کی تصحیح کی بلکہ قلم برداشتہ ضروری اضافے بھی کیے۔ اس وقت ان کی عمر صرف تیس سال تھی لیکن ان اضافوں کے ایک ایک لفظ سے وسیع معلومات کا اظہار ہوتا ہے۔ اسی لیے وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ وہ عبدالعزیز میمن سے علامہ عبدالعزیز میمن کے درجے پر فائز ہوئے۔

اگر برصغیر پاک وہند کے انگریزی زبان کے ماہرین اور انشا پردازوں کے حالات کا مطالعہ کیا جائے تو ہمیں پتا چلے گا کہ انگریزی ادب اور انگریزی انشا پردازی کے کئی ماہر گزرے ہیں لیکن عربی زبان کے ایسے ماہرین جنہوں نے اس زبان میں کمال حاصل کیا ہو اتنے بھی نہیں کہ انہیں ہاتھ کی انگلیوں پر بھی گنا جاسکے۔ اس دور میں وہ اکیلے نظر آتے تھے خصوصاً ایک بات تو حیرت انگیز تھی۔ ان کے خاندان میں دور دور تک کسی کا علم وتحقیق سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ ان کا آبائی تعلق علمی لحاظ سے پسماندہ علاقے سے تھا۔ انہیں عربی زبان کی تعلیم کے لیے خاص عربی ماحول نہیں ملا۔ ایک ایسا شخص جس نے ایک دن بھی کسی کالج یا یونیورسٹی میں تعلیم حاصل نہیں کی اور جس کو ایک دن بھی کسی عرب ملک میں رہنے کا موقع نہیں ملا محض اپنی محنت سے وہ علامہ کے درجے تک پہنچ گیا۔ ان کی علمی قابلیت کا اعتراف عالمی سطح پر اور خصوصاً عالم عرب کی سطح پر کیا گیا۔

پشاور کے قیام ہی کا زمانہ تھا جب ان کی تحریری اور تصنیفی سرگرمیوں کا آغاز ہوا۔ یہیں انہوں نے جدید مغربی تعلیم کے طریقوں کا بغور مطالعہ کیا۔ عربی، فارسی ادب کے مطالعے میں اضافہ کیا۔ مصر کے رسالے الزہرا کے لیے مضامین لکھے۔ اس کے علاوہ لاہور سے شائع ہونے والے معروف علمی وادبی رسالے مخزن کے لیے نہایت مفید سلسلہ مضامین آداب العربیہ شروع کیا۔ یہ مضمون اردو میں لکھا گیا تھا۔

رسالہ مخزن کے ایڈیٹر تاجور نجیب آبادی تھے جو خود علامہ تھے۔ عربی فارسی کے منتہی تھے۔ ان کی کڑی تنقیدی نظر اس مضمون کو یونہی شائع نہیں کرسکتی تھی۔ علامہ میمن نے یہ مضمون جب مخزن میں اشاعت کے لیے بھیجا تو علامہ تاجور

نجیب آبادی نے یہ نوٹ لکھ کر انہیں ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا۔

"ذیل کا مضمون جناب مولانا عبدالعزیز صاحب میمن پروفیسر مشن کالج پشاور کے رشحات ادب سے ہے۔ مولانا موصوف عربی ادب سے بہت شغف رکھتے ہیں اور ان چند افراد میں سے ہیں جن پر دنیائے ادب فخر کر سکتی ہے۔ یہ مضمون پڑھ کر اہل علم فاضل ادیب کی وسعت معلومات کا اندازہ کر سکیں گے۔"

پشاور میں وہ بہت خوش تھے۔ ایڈورڈز کالج کا علمی ماحول انہیں کام کرنے کا پورا موقع دے رہا تھا۔ چھٹیوں میں وہ اپنے وطن راج کوٹ چلے جاتے تھے۔ ان کی پھوپی کی لڑکی زینب بائی شادی کی عمر کو پہنچ گئی تھی۔ لڑکا گھر میں تھا لیکن وہ تو پہلی شادی کے تلخ انجام کے بعد طے کر چکا تھا کہ شادی نہیں کرے گا۔ والد بھی خاموش ہو گئے تھے لیکن اب وہ برسر روزگار تھا پورے خاندان کی آنکھ کا تارا تھا۔ پھوپی نے بھائی پر زور دیا۔

"ہم زینب کا رشتہ باہر کہاں ڈھونڈتے پھریں گے۔ آپ عبدالعزیز سے بات کیوں نہیں کرتے۔ اگر وہ تیار ہو جائے تو کتنا اچھا ہو۔"

"اس سے اچھی کوئی بات نہیں لیکن میں نے اس کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ وہ مجھ سے روٹھا ہوا ہے شاید نہ مانے۔"

"وہ وقتی غصہ تھا۔ آپ بات کر کے تو دیکھیں۔ میں اسے جانتی ہوں وہ آپ کی بات کبھی نہیں ٹالے گا۔"

"دیکھو بات کر کے دیکھتا ہوں۔ چھٹیوں میں راج کوٹ آیا تو بات کروں گا۔"

عبدالعزیز جب 1915ء کی چھٹیوں میں راج کوٹ گئے تو باپ کا رویہ بدلا ہوا دیکھا۔ گھر کے اور لوگ بھی آگے پیچھے تھے۔ پہلے تو کچھ سمجھ میں نہ آیا پھر بات کھل گئی۔ باپ نے بات نکالی اور ماں نے ہاں میں ہاں ملائی۔ عبدالعزیز اپنی ضد پر کچھ ہی دن قائم رہ سکے۔ ان کی سعادت مندی نے بالآخر والد کی بات مان لی۔

ان کی دوسری شادی پھوپی زاد زینب بائی سے ہوگئی۔ شادی کے بعد وہ پھر پشاور آگئے۔ اہلیہ راج کوٹ ہی میں تھیں۔

پشاور میں رہتے ہوئے سات سال ہو گئے تھے انہیں اطلاع ملی کہ اورینٹل کالج لاہور میں استاد عربی کی اسامی خالی ہوگئی ہے۔ انہوں نے لاہور کی ادبی فضا کو دیکھتے ہوئے اس اسامی کے لیے درخواست دے دی۔ یہ درخواست منظور ہوئی اور ان کا تقرر اورینٹل کالج لاہور میں ہوگیا۔ انہیں عارضی طور پر ہاسٹل میں بطور مہمان ٹھہرایا گیا۔

اورینٹل کالج میں اس زمانے کے ہر شعبے کے ماہرین علم و فضل موجود تھے۔ ان حضرات کی صحبت نے علامہ میمن کے علمی و تحقیقی ذوق کے لیے مہمیز کا کام کیا۔ ان حضرات میں مولانا محمد طلحہ عربی، شاداں بلگرامی اور ڈاکٹر شیخ محمد اقبال جیسے اساتذہ موجود تھے۔

ان حضرات کے مشورے پر ہی علامہ میمن نے عبدالقادر بغدادی کی کتاب "خزانۃ الادب" کا انڈیکس تیار کیا جو پنجاب یونیورسٹی کی طرف سے شائع کیا گیا۔

علامہ میمن کو ابھی یہاں آئے تین سال ہوئے تھے کہ وہ اپنے بیٹے محمود کو راج کوٹ سے لاہور لے آئے۔ یہ اتنی آسانی سے نہیں ہوگیا۔ محمود کی والدہ نہیں چاہتی تھیں کہ ان کا بیٹا ان کی نظروں سے دور ہو۔ علامہ میمن کا استدلال یہ تھا کہ ان کے یہاں نہ ہونے سے محمود راج کوٹ کی گلیوں میں عام لڑکوں کے ساتھ کھیل کود میں وقت ضائع کرے گا۔ اس کی تعلیم اسی وقت بہتر طریقے پر ہوگی جب وہ ان کی نظروں کے سامنے ہو۔

لاہور آنے کے بعد انہیں خود احساس ہوا کہ محمود کے یہاں آجانے سے اس کی ماں پر کیا گزر رہی ہوگی۔ انہوں نے پرانی انارکلی میں ایک مکان کرائے پر لے لیا اور زوجہ کو بھی لاہور بلا لیا۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ انہوں نے لاہور میں مستقل قیام کا فیصلہ کر لیا ہے لیکن حالات اس قیام کے فیصلے کے خلاف چلے گئے۔

ان کے لاہور پہنچنے کے تھوڑے عرصے بعد ہی پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ عربی کے پروفیسر محمد شفیع نے ان سے گزارش کی کہ عبدالقادر بغدادی کی تالیف کا اشاریہ ترتیب دیں۔ علامہ میمن نے اس ذمے داری کو قبول کر لیا اور نہایت جانفشانی سے اسے تکمیل تک پہنچا بھی دیا۔ انہوں نے اس اشاریے کے ساتھ ایک مقدمہ بھی تحریر کیا۔ محمد شفیع نے ان پر زور دیا کہ اسے مختصر کرنے کے لیے اس میں کاٹ چھانٹ کی جائے۔ علامہ میمن نے رفع شر کے لیے ان کی ہدایت کی تعمیل کی اور چند ایسی چیزوں کو حذف کر دیا جن کو حذف کرنے میں کوئی نقصان نہیں تھا۔

جب یہ کام مکمل ہوگیا تو محمد شفیع نے یہ زور دیا کہ اس

اشاریے کا عنوان تبدیل کر دو۔ علامہ میمن نے اس کا نام اقلید الخزانہ رکھا تھا۔ محمد شفیع نے اس کا نام بدل کر فہرست الخزانہ رکھنے کا مشورہ دیا۔ علامہ میمن نام بدلنے کو تیار نہیں تھے۔ انہوں نے اسی نام کے ساتھ اسے طباعت کے لیے دے دیا۔ ابھی یہ مسودہ طباعت کے لیے مطبع میں تھا کہ ناشر نے انہیں خط لکھا۔

"مسٹر شفیع آپ کا تحریر کردہ مقدمہ ہرگز شائع نہ ہونے دیں گے بلکہ وہ خاصا اصرار کر کے مجھ سے چھین کر لے گئے ہیں۔"

وہ ان دنوں سید سلیمان ندوی کی دعوت پر خطبہ دینے لکھنؤ گئے ہوئے تھے۔ انہوں نے وہیں سے اس بارے میں پروفیسر شفیع کو خط تحریر کیا مگر ان کی جانب سے جواب نہیں آیا۔ انہوں نے پرنسپل اورینٹل کالج مسٹر وولنر سے مراسلت کی۔ پروفیسر شفیع نے غالباً انہیں بھی بہکا دیا تھا لہٰذا انہوں نے بھی چپ سادھ لی۔ تنگ آکر انہوں نے مسٹر وولنر کو لکھا کہ میرا مقدمہ شائع کیا جائے یا یونیورسٹی اس سے دست بردار ہو جائے۔ میں اپنی جیب سے شائع کروا لوں گا۔ انہوں نے اس کا بھی کوئی جواب نہیں دیا۔

اس صورت حال سے دوسروں نے فائدہ اٹھانا شروع کر دیا۔ صاحب مطبع نے انہیں مطلع کیا کہ محمد شفیع آپ کی راہ میں روڑے اٹکا رہے ہیں اور لگتا یہ ہے کہ انہوں نے مسٹر وولنر کو آپ کے خلاف بھڑکایا ہے۔ ایک دوست نے صاحب مطبع کی زبانی بتایا کہ محمد شفیع کی نیت خراب ہوگئی ہے اور محسوس یہ ہوتا ہے کہ فی الحال وہ کتاب کو دبا کر بیٹھ جائیں گے حتیٰ کہ لوگ اسے بھول جائیں اور پھر وہ کچھ عرصہ بعد اسے اپنے نام سے شائع کروا دیں۔"

ایسی ہی کچھ باتیں محمد شفیع کے کانوں تک بھی پہنچائی گئی ہوں گی لہٰذا دونوں میں شکر رنجی پیدا ہوگئی۔

علامہ میمن نے اس صورت حال سے نمٹنے کے لیے ڈاکٹر ضیاالدین احمد وائس چانسلر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے رابطہ کیا اور ان سے گزارش کی کہ وہ مسٹر وولنر سے اس سلسلے میں بات کریں چنانچہ اس مسئلے پر دونوں کے درمیان دو مرتبہ خط و کتابت ہوئی لیکن حاصل کچھ نہ ہوا البتہ یہ فائدہ ہوا کہ علامہ ایک ایسی سرکاری تحریر حاصل کرنے میں کامیاب رہے جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ کتاب ان کی تالیف ہے۔

یہ کتاب بعد میں مقدمے کے بغیر شائع ہوگئی۔ اس تمام جھگڑے نے علامہ میمن کو دل برداشتہ کر دیا اور وہ لاہور

اعتراف عظمت

"ہزاروں پڑھنے والوں میں سے چند ہی کو اس کا اندازہ ہوا ہوگا کہ یہ برصغیر ہی کا نہیں، یہ عہد اور عالم عربی کیسے عظیم المرتبت ادیب اور عربی زبان کے مبصر و محقق سے محروم ہو گیا۔ زمانے کے حالات، تعلیمی نظام اور قدیم و جدید مدارس کی جو کیفیت اس وقت دیکھنے میں آرہی ہے اس سے کیا امید کی جا سکتی ہے کہ علامہ جیسا مستند اور صاحب نظر عربی زبان و ادب کا عالم پیدا ہوگا۔"

(مولانا سید ابوالحسن ندوی)

علامہ میمنی عربی زبان کے اسرار و دقائق سے واقف تھے۔ اس کی سحر انگیزی اور اعجاز بیانی کے راز داں تھے۔ اس کے علما شعرا اور اصحاب لغت سے واقف تھے۔ تمام عمر اس زبان کی خدمت میں گزار دی۔ وہی تھے جنہوں نے عربی زبان کو بام عروج پر پہنچایا اور اسے روشنی کا مینار بنا کر پیش کیا۔ محققین کے لیے راہ ہموار کر دی۔ شاندار تصنیفات سے نوازا۔ عرب ذخائر کو کھنگال کر جوہر نایاب فراہم کر دیا۔

(ڈاکٹر شاکر الفحام، شام)

عربی ادب کے کسی محقق کے لیے مناسب نہیں کہ وہ علامہ میمنی کے عظیم احسانات کا ذکر نہ کرے جو بہت سی ادبی کتابوں کو تحقیق کے ساتھ شائع کر چکے ہیں۔ ان کے علم و فضل کا انکار نہیں کیا جا سکتا۔

(ڈاکٹر عدنان خطیب، شام)

سے رخصت ہونے کے لیے پر تولنے لگے۔ موقع کی تلاش میں تھے کہ انہیں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں شیخ عبدالحق بغدادی کی وفات کی خبر ملی اور یہ بھی معلوم ہوا کہ ان کی جگہ اب تک خالی ہے۔ وہ اورینٹل کالج کے ناخوشگوار حالات سے دل برداشتہ ہو چکے تھے لہٰذا انہوں نے اس آسامی کے لیے کوشش شروع کر دی۔ انہیں معلوم ہوا کہ اس اسامی کے لیے پروفیسر عابد احمد علی بھی امیدوار ہیں۔ یہ صاحب آکسفورڈ یونیورسٹی کے ڈی فل تھے۔ سر سید احمد خاں سے بھی ان کی قرابت داری تھی۔ اس لحاظ سے وہ مضبوط امیدوار تھے۔ دوسری طرف علامہ میمن تھے جنہوں نے کسی کالج یا یونیورسٹی کی شکل بھی نہیں دیکھی تھی۔ جو کچھ حاصل کیا

تھا اپنی محنت سے حاصل کیا تھا۔ مولوی فاضل کے سوا کوئی ڈگری ان کے پاس نہیں تھی۔

تقرری کمیٹی میں تین افراد تھے ڈاکٹر سر ضیاالدین احمد، ایک مستشرق پروفیسر کالے اور مولانا سید سلیمان ندوی۔ انٹرویو شروع ہوا تو مختلف سوال جواب کے بعد دونوں خارجی ممبروں نے عبدالعزیز میمن کی تائید کی۔

پروفیسر کالے نے کہا۔ ”میمن کے مقابلے میں ڈاکٹر عابد احمد علی کی کوئی حیثیت نہیں۔“

علامہ میمن کا تقرر صدر شعبۂ عربی کی حیثیت سے ہوگیا۔

سید سلیمان ندوی نے معارف اعظم گڑھ میں لکھا۔

”آج پہلا موقع ہے کہ علی گڑھ یونیورسٹی میں شعبہ عربی کو ایک اہل اور مستحق آدمی کے سپرد کیا گیا ہے۔“

وہ شعبۂ عربی کے پہلے ہندوستانی صدر تھے۔ ان سے پہلے اس عہدے پر انگریز، جرمن مقرر ہوئے یا عرب۔

علی گڑھ میگزین کے ایڈیٹر بشیرالدین احمد صدیقی نے علی گڑھ میگزین کے جوبلی نمبر میں ان کے تقرر کو ان الفاظ میں خراج تحسین پیش کیا۔

”مولانا عبدالحق بغدادی کے بجائے عربی ڈیپارٹمنٹ میں ایک نہایت قابل قدر اضافہ ہوا ہے۔ مولانا عبدالعزیز میمن صاحب ہمارے تعارف اور تحسین سے مستغنی ہیں۔ ان کا علمی ذوق اور ادب عربی میں ان کی عالمانہ تحقیق ان کو ان بلندیوں پر پہنچا چکی ہے جہاں لوگ بہ مشکل پہنچتے ہیں۔ مولانا کی مختلف اور متعدد عربی تصانیف مصر اور لاہور سے شائع ہوئی ہیں......“

علامہ میمن نے اپنی تقرری کے بعد ذرا غور کیا تو یہ عقدہ ان پر کھل گیا کہ یہاں معیار تعلیم نہایت پست ہے۔ انہوں نے چارج سنبھالتے ہی نصاب تعلیم کی اصلاح کی۔ عربی کتب کی بنیادی کتب نصاب میں شامل کیں۔

علی گڑھ پہنچنے کے بعد ابتدا میں یونیورسٹی کی حدود میں مکان نہ ملنے کی وجہ سے یونیورسٹی سے دور مکان لیا بعد میں یونیورسٹی میں مکان مل گیا اور وہ وہاں منتقل ہوگئے۔ بہت بعد میں انہوں نے اپنی کوٹھی ”میمن منزل“ بنوائی تھی۔

اب انہیں اتنی مالی سہولت میسر آگئی تھی کہ کسی فکر کے بغیر اپنے معمولات زندگی کو پورا کرسکیں۔ صبح سویرے اٹھ کر وضو کرتے نماز فجر ادا کرتے، ناشتے سے فارغ ہوکر حقہ پیتے اور کتب بینی یا تصنیف وتالیف میں لگ جاتے۔ وہ اس کام میں اتنے محو ہوجاتے کہ یونیورسٹی جانے کے وقت کا احساس بھی نہیں ہوتا۔ بیوی انہیں ہوشیار کرتی۔ جلدی جلدی تیار ہوتے اور یونیورسٹی پہنچ جاتے۔ بارہ بجے واپسی ہوتی۔ دوپہر کا کھانا کھاتے، بستر پر لیٹے لیٹے حقہ پیتے کچھ دیر اخبار پڑھتے تاکہ نیند آجائے۔

تین اور چار بجے کے درمیان اٹھ بیٹھتے اور پھر تحقیقی کاموں میں مصروف ہوجاتے۔ نماز عصر ادا کرتے اور شام کی سیر کو نکل جاتے۔ اس وقت کوئی نہ کوئی شاگرد ساتھ ہوتا۔ سیر کے دوران وہ اسے اپنے علم سے فیض یاب کرتے جاتے۔ مغرب کی اذان کے وقت واپسی ہوتی۔ نماز ادا کرتے، کچھ دیر بعد رات کا کھانا کھاتے، حقہ پیتے اور جلد سوجاتے۔ کسی بچے کو بھی اجازت نہیں تھی کہ وہ رات دیر تک جاگے۔

سونے سے پہلے افرادِ خانہ سے باتیں کرنا اور ریڈیو پر خبریں سننا ان کے معمولات میں شامل تھا۔

ایک مخصوص کمرا تھا جسے سب کتابوں والا کمرا کہتے تھے۔ اس میں مشرقِ وسطیٰ سے لایا ہوا قالین بچھا ہوا تھا۔ ایک جانب زمین پر بیٹھ کر لکھنے کی پرانی وضع کی ڈھلواں میز رکھی تھی۔ کمرے کے چاروں طرف بغیر دروازوں کی کتابوں کی الماریاں تھیں جن میں کتابیں، قلمی نسخے اور مسودات بھرے ہوئے تھے۔ تقریباً تمام کتابیں عربی کی تھیں۔ اسی کمرے میں بیٹھ کر وہ تصنیف وتالیف کا کام کرتے تھے۔

ان کی عربی دانی کا ایسا شہرہ تھا کہ مشرقِ وسطیٰ سے جو نامور حضرات علی گڑھ یونیورسٹی دیکھنے آتے تھے اور یہاں خطاب کرتے تھے ان کی ترجمانی کی ذمے داری علامہ میمن ہی کو سونپی جاتی تھی۔

علامہ عبدالعزیز میمن کو ابھی علی گڑھ آئے ہوئے دو ڈھائی سال سے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا کہ انہیں وہ اعزاز حاصل ہوا جو پورے برصغیر میں ان سے قبل صرف حکیم اجمل خاں کو ہوا تھا۔ یہ اعزاز ”شام“ کے ایک مشہور علمی ادارے کی رکنیت تھی۔ کسی غیر عرب کو اس کی رکنیت بہت بڑا اعزاز تھا جو نامور اور سربرآوردہ یورپین مستشرقین اور گنے چنے چند مشرقی فضلا وادبا کو حاصل تھا۔

اس ادارے کے تحت جو سہ ماہی رسالہ نکلتا تھا۔ یہ رکنیت اس بات کا اعتراف تھا کہ علامہ کا علم وفضل اس لائق ہے کہ ان کے مضامین اس رسالے میں شائع ہوسکتے ہیں۔ ان کے مضامین نہایت آب وتاب کے ساتھ شائع ہونے لگے۔

1935ء تک علامہ میمن کی عربی دانی کی شہرت ہندوستان سے نکل کر عالم عرب تک پھیل چکی تھی۔ وہ اس وقت تک ہندوستان کے تقریباً تمام اہم کتب خانوں کو کھنگال چکے تھے۔ اب انہیں یہ خواہش ہوئی کہ عالم اسلام کے کتب خانوں سے استفادہ کریں۔ ایک تحقیقی کتاب بھی مرتب کی تھی۔ اس کا مسودہ تیار تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ یہ کتاب قاہرہ سے شائع ہو۔ ان مقاصد کے تحت انہوں نے عالم اسلام کا سفر کیا۔

قاہرہ، اسکندریہ، حلب، دمشق، بیت المقدس، بغداد، نجف اور استنبول کے کتب خانوں کی خاک چھانتے پھرے۔ 750 سے زیادہ کتب خانوں سے استفادہ کیا۔ ان تمام کتب خانوں کے نادر مخطوطات پر مشتمل یادداشت بھی لکھی۔

ان کتب خانوں سے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ اپنی وسیع معلومات کو کام میں لاتے ہوئے بعض محققین کی علمی معاونت بھی کی۔ ایک سال گزارنے کے بعد ہندوستان واپس آئے۔

1938ء میں لاہور میں ادارہ معارف اسلامیہ کی تیسری کانفرنس منعقد ہوئی جس میں علامہ میمن بھی شریک ہوئے۔ یہاں انہوں نے اس نادر مخطوطے کے بارے میں مقالہ بھی پڑھا جو انہوں نے حیدرآباد دکن کے کتب خانہ سعیدیہ میں دریافت کیا تھا۔

یہاں سے ان کی شہرت ایک ایسے عربی داں کی حیثیت سے ہوئی جسے عربی کے نادر مخطوطات کی شناخت اور انہیں پڑھنے میں کمال حاصل تھا۔

31 مارچ 1951ء کو وہ ریٹائر کردیے گئے۔ انہیں یہ توقع تھی کہ ان کی عالم گیر شہرت کے پیش نظر انہیں مدت ملازمت میں توسیع دی جائے گی۔ یہ توسیع انہیں ملی ضرور لیکن صرف ایک سال کی جبکہ شعبۂ فارسی اور شعبۂ تاریخ کے دو پروفیسروں کی ملازمتوں میں چار چار سال کا اضافہ کیا گیا۔ اس تفریق سے ان کے دل کو ٹھیس پہنچی۔ وہ سوچنے لگے کیا ان کی خدمات کا یہی صلہ ہے؟ کیا یہی قدر دانی ہے۔ انہوں نے علی گڑھ یونیورسٹی کو دنیا بھر میں متعارف کروایا تھا اور ان کے ساتھ یہ سلوک ہورہا ہے۔ اس پر طرہ یہ ہوا کہ ان کی پنشن 1300 روپے کے بجائے 800 روپے کردی گئی۔

یہ وہ وقت تھا جب ان کے دونوں بڑے صاحب زادے پاکستان منتقل ہوچکے تھے۔

☆☆☆

علامہ عبدالعزیز میمن کا تعلق علمی وادبی مراکز سے دور ایک پسماندہ علاقے سے تھا۔ خاندان میں کوئی علمی روایت موجود نہیں تھی۔ یہ خدا کی دین ہی تو تھی کہ زندگی کا کارواں جیسے جیسے آگے بڑھتا گیا عربی زبان وادب سے ان کا تعلق مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا گیا۔ تمام تر سہولتوں کے باوجود کوئی عالم اس مقام تک نہ پہنچ سکا جہاں وہ محض اپنی محنت اور تائید الٰہی سے پہنچ گئے تھے۔

ان کے والد نے تو صرف اتنا چاہا تھا کہ وہ اپنی پہلی اولاد نرینہ کو دینی تعلیم دلائیں گے۔ قدرت نے ان کا رخ عربی زبان کی طرف موڑ دیا۔ ڈپٹی نذیر احمد سے ملاقات ہوئی اور وہ ان کی صحبت میں عربی ادب کی طرف متوجہ ہوگئے۔ پھر وہ اس راستے پر اتنا تیز چلے کہ سب کو پیچھے چھوڑ گئے۔

یہ منزلیں سر ہوئیں تو وہ عربی زبان کے نادر مخطوطات کی تحقیق میں مشغول ہوگئے۔ ان سب کاوشوں کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ وہ خود عربی کے صاحب اسلوب ادیب ہوگئے۔ سیکڑوں کتابیں اور مقالے تحریر کیے جن سے خود اہلِ عرب نے استفادہ کیا۔

مشہور اہل قلم عرب حضرات نے اس بات کا بارہا اظہار کیا۔ ”استاد المیمنی جیسی عربی زبان خود عرب بھی نہیں لکھ پاتے۔“

علامہ میمن نے نہ صرف خود عربی زبان وادب میں اعلیٰ درجے کی مہارت حاصل کی بلکہ اس علم سے اپنے تلامذہ اور اہل تعلق کو بھی فیض یاب کیا۔ وہ عربی مخطوطات کے بارے میں وسیع معلومات رکھتے تھے۔ انہیں علم تھا کہ کون سا مخطوطہ کس زمانے کا ہے اور دنیا کے کس کتب خانے میں محفوظ ہے۔ حافظے کا یہ عالم تھا کہ انہیں برسوں بعد بھی یاد رہتا تھا کہ انہوں نے کون سا مخطوطہ کہاں دیکھا ہے۔ اس مخطوطے ... کے دیگر نسخوں میں کیا کمی بیشی ہے اور کہاں کتابت کی غلطی ہوئی ہے۔

معروف جرمن مستشرق ریٹر استنبول کے جرمن انسٹی ٹیوٹ کا ڈائریکٹر تھا۔ وہ ایک نادر عربی مخطوطے پر تحقیق کررہا تھا۔ اس مخطوطے میں کئی مقامات ایسے تھے جو اس سے حل نہ ہوسکے تھے۔ اس نے کئی ماہرین سے رابطہ کیا لیکن کوئی بھی

اس کی مدونہ کر سکا۔

علامہ میمن ان دنوں استنبول میں تھے لہٰذا ایک ترک پروفیسر نے ان کے سامنے علامہ کا نام پیش کیا۔

"ہندوستان سے عربی کے ایک عالم آئے ہوئے ہیں ان سے رابطہ کیا جائے۔"

"بات عربی کی ہے اور وہ ہندی نژاد ہیں۔ اس مشکل کو عرب علما تک حل نہ کر سکے۔ میں نے بہت سوں سے رابطہ کیا۔"

"استاد المیمنی کی زبان دانی کو خود اہلِ عرب تسلیم کرتے ہیں۔"

"ٹھیک ہے، انہیں بھی دیکھے لیتے ہیں، ان عالم صاحب سے کہیں خوب تیاری کر کے آئیں اور مخطوطے کو دیکھیں۔" اس ترک پروفیسر نے یہ پیغام عبدالعزیز میمن تک پہنچا دیا۔

انہوں نے کہا۔ "مجھے کسی تیاری کی ضرورت نہیں۔ وہ جب فرمائیں میں اس علمی خدمت کے لیے حاضر ہو جاؤں گا۔"

جب وقتِ مقررہ پر وہ ریٹر سے ملے اور ریٹر نے مخطوطے کے مذکورہ مقامات علامہ کے سامنے رکھے تو علامہ نے فرمایا۔

"یہ کوئی مشکل مسئلہ نہیں۔ بات صرف اتنی ہے کہ کاتب نے ان مقامات پر تحریف کر دی ہے۔" اس کے بعد انہوں نے درست عبارات لکھوا دیں۔

ریٹر اس حد تک مطمئن ہو گیا تھا کہ اب مطلب سمجھ میں آ گیا تھا لیکن ایک کانٹا پھر بھی کھٹک رہا تھا۔

"مولانا، مطلب تو سمجھ میں آ گیا لیکن یہ کیسے ثابت ہوگا کہ جو عبارت آپ نے لکھوائی ہے وہی درست ہے اور اصلی عبارت ہے۔"

"یہ بات میں اپنے عربی زبان اور خصوصاً مخطوطات کے علم کی بنیاد پر کہہ رہا ہوں۔"

اس کے بعد انہوں نے یہ اطلاع بھی فراہم کی کہ اس مخطوطے کی ایک نقل فلاں کتب خانے میں موجود ہے۔ اس میں یہ عبارت اسی طرح موجود ہے جیسی میں نے لکھوائی ہے۔ اگر آپ کو وہ نسخہ میسر آ جائے تو ملا کر دیکھ لیجیے گا۔"

ریٹر کے پاس حیران ہونے کے سوا کچھ نہیں رہ گیا تھا۔

میمن صاحب نے عربی شعر و نثر کے بہت سے ادبی جواہر پارے یاد کیے تھے۔ بعض دیوان و کلیات تو پورے کے پورے حفظ تھے۔ کلاس میں نصابی کتاب بھی ساتھ نہ لائے اور طلبہ سے کہتے کتابیں کھولو اور ایک طالب علم قصیدے کا پہلا لفظ پڑھے۔ پہلا لفظ یا مصرعہ پورا ہوتے ہی میمن صاحب کی باری آ جاتی اور وہ پورا قصیدہ محض اپنی یاد سے سناتے۔ اس کا تاریخی پس منظر بیان کرتے اور ضروری تشریح و تنقید کرتے۔

☆☆☆

علامہ کے دونوں بیٹے کراچی میں تھے۔ 1954ء میں وہ اپنے صاحبزادوں سے ملنے کراچی آئے۔ ان دنوں ڈاکٹر عبدالوہاب عزام پاکستان میں مصر کے سفیر تھے۔ علامہ میمن جب مصر گئے تھے تو ان سے ملاقات ہوئی تھی اور دوستی ہو گئی تھی پھر جب ڈاکٹر صاحب علی گڑھ گئے تھے تو علامہ میمن سے ملاقاتیں رہی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب ان کی علمیت کے معترف بھی تھے اور قدردان بھی۔

علامہ میمن ان سے ملاقات کو گئے تو مل کر بہت خوش ہوئے اور پہلی ملاقات میں یہی سمجھے کہ علامہ پاکستان آ گئے ہیں لیکن علامہ نے اس کی صراحت کر دی۔ "یہ میرا قطعی خانگی دورہ ہے۔ میں اپنے بیٹوں سے ملنے پاکستان آیا ہوں۔"

"آپ پاکستان کیوں منتقل نہیں ہو جاتے۔ عربی کی ضرورت وہاں سے زیادہ یہاں ہے۔ وہاں کا سیاسی رنگ مسلمانوں کے لیے نہایت مایوس کن ہے۔"

"جب حکومت ہی کو احساس نہیں تو مجھے کیوں ہو۔"

"یہ بات واقعی قابلِ غور ہے۔ پاکستان کے لوگوں کو کوئی احساس ہی نہیں کہ اتنے تجربے کا حامل شخص ہندوستان میں بےکار پڑا ہے۔"

"میں آپ کی ان گزارشات پر بعد میں سوچوں گا۔"

"بعد میں نہیں آپ کو ابھی سوچنا ہوگا۔"

"میں اپنے کتب خانے کی منتقلی اور آئندہ زندگی گزارنے پر اطمینان ہوئے بغیر کیسے نقل مکانی کر سکتا ہوں۔"

"اس کی یقین دہانی کروانا میرا کام ہے۔ میں حکومتی سطح پر آپ کے لیے کوئی انتظام کرتا ہوں۔"

ڈاکٹر عزام نے جناب ممتاز حسن سے ان کا تذکرہ کیا۔ ممتاز حسن نہایت علم دوست شخصیت تھے۔ علامہ کے کاموں سے واقف بھی تھے۔ انہوں نے بھی ڈاکٹر عزام کی

تائید کی اور دونوں نے مل کر اے بی اے حلیم سے ملاقات کی جو اس وقت کراچی یونیورسٹی کے وائس چانسلر تھے۔ حلیم صاحب علی گڑھ میں علامہ میمن کے رفیق کار رہ چکے تھے اس لیے انہیں کچھ بتانے کی ضرورت نہیں تھی۔

"علامہ میمن نے تمام زندگی طلبہ کی پرورش کی ہے۔ وہ کراچی آئے ہوئے ہیں۔ پاکستان کی علمی دنیا کی خوش قسمتی ہوگی اگر وہ یہاں رہ جائیں۔ اگر انہیں آپ کسی طرح یونیورسٹی میں لے لیں تو ان کے روزگار کا وسیلہ بن جائے گا۔"

"بھائی وہ عربی کے آدمی ہیں اور یونیورسٹی میں شعبہ عربی موجود نہیں۔ جب تک ہم شعبۂ عربی کھولنے میں کامیاب نہیں ہو جاتے اس وقت تک انہیں انتظار کرنا پڑے گا۔"

☆☆☆

علامہ میمن واپسی کے لیے پر تول رہے تھے لیکن ڈاکٹر عزام مُصر تھے کہ اب آپ پاکستان آ گئے ہیں تو یہی رہ جائیں۔ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اس وقت مرکزی وزیر تعلیم تھے۔

"اب میمن صاحب پاکستان آ گئے ہیں تو انہیں ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہیے۔ پاکستان کی خوش قسمتی ہوگی کہ انہیں ایسا آدمی مل جائے گا۔ ہمارے ہاں مصر میں بھی اس پائے کے آدمی شاید ہی ہوں گے۔"

ان دنوں حکومت پاکستان سینٹرل انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک اسٹڈیز کے لیے منصوبہ بندی کر رہی تھی۔ اشتیاق حسین قریشی نے وعدہ کیا کہ فی الحال وہ انہیں انسٹی ٹیوٹ کا ڈائریکٹر مقرر کر دیتے ہیں۔ جب شعبۂ عربی قائم ہو جائے گا تو وہ یونیورسٹی میں آ جائیں گے۔ ان کی اصل جگہ یہی ہے۔

انہوں نے اس ادارے کی سربراہی یہ سوچ کر قبول کر لی کہ وہ اس ادارے کو نایاب ذخیرۂ کتب فراہم کریں گے اور اس عالمِ ضعیفی میں دنیا کے جھمیلوں سے آزاد ہو کر ریسرچ کرنے والے طلبہ کی مدد کرتے رہیں گے۔

یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ اس نوزائیدہ اسلامی مملکت کی خدمت اور علمی و تحقیقی ادارے کی خاطر علامہ نے کسی تنخواہ کے بغیر اعزازی طور پر ادارے کی سربراہی قبول کی تھی۔ وہ جب تک اس ادارے سے وابستہ رہے بلا معاوضہ خدمت انجام دیتے رہے۔

عالم اسلام کے محققین اور علما ان سے بخوبی واقف تھے۔ ان پر اعتماد کرتے تھے۔ ان کی عزت کرتے تھے۔ وزارت تعلیم کے اربابِ حل و عقد بھی جانتے تھے کہ اس ادارے کے لیے حصولِ کتب کے سلسلے میں ان سے بہتر کوئی شخص نہیں لہٰذا یہ ذمے داری انہیں سونپی گئی کہ ادارے کے لیے نادر کتب و مخطوطات حاصل کریں۔

وہ چونکہ چند ماہ کے لیے پاکستان آئے تھے لہٰذا انسٹی ٹیوٹ کی سربراہی ملنے کے بعد واپس بھارت چلے گئے اور حیدرآباد، بمبئی اور دہلی وغیرہ کا سفر کر کے فارسی اور اردو کے نوادرات فراہم کیے۔ اپنے کتب خانے کی منتقلی کا بندوبست کیا اور مستقل طور پر کراچی واپس آ گئے۔ اس وقت تک کراچی یونیورسٹی میں شعبۂ عربی قائم ہو چکا تھا۔ انہیں پروفیسر شپ آفر کی گئی جو انہوں نے قبول کر لی لیکن سینٹرل انسٹی ٹیوٹ کا کام اعزازی طور پر جاری رکھا۔ اسی سال وہ

سوانحی خاکہ

نام...... عبدالعزیز میمن
والد...... شیخ عبدالکریم ابانی
پیدائش...... گونڈل
وطن...... راج کوٹ، کاٹھیاواڑ
ابتدائی تعلیم...... مہابت مدرسہ، جوناگڑھ
تعلیم کے لیے سفر...... دہلی، امروہہ، رام پور
منشی فاضل...... لاہور
مولوی فاضل...... لاہور، پنجاب یونیورسٹی
ملازمت...... ایڈورڈز مشن کالج، پشاور۔ اورینٹل کالج، لاہور۔ علی گڑھ یونیورسٹی، جامعہ کراچی۔
سیاحت...... تیونس، مراکش، ایران، شام، عراق، لبنان، ترکی، مصر
اعزاز...... پرائڈ آف پرفارمنس
اساتذہ...... مولوی عبدالوہاب، میاں نذیر حسین، مولوی عبدالرحمن، ڈپٹی نذیر احمد، محمد اسحٰق رام پوری، شیخ حسین، علامہ طیب عرب مکی، فضل حق، شاداں بلگرامی
پیدائش...... 1888ء
وفات...... 27 اکتوبر 1978ء
تدفین...... سوسائٹی قبرستان، کراچی

WWW.PAKSOCIETY.COM

مصر، شام، عراق وغیرہ کے سفر پر نکلے اور اپنے انتخاب سے انسٹی ٹیوٹ کے لیے آٹھ دس بکس نادر کتابوں کے جمع کیے۔

1957ء میں وہ اپنی اہلیہ کے ہمراہ فریضۂ حج ادا کرنے کے لیے گئے۔ ان کی قدر افزائی کے طور پر سفر اور قیام وطعام کے تمام انتظامات حکومت سعودی عرب نے برداشت کیے تھے۔

ریاض سے شائع ہونے والے ایک معروف ہفت روزہ نے ان کی علمی خدمات کے اعتراف میں ایک مضمون شائع کیا جس میں لکھا گیا۔ "دنیا میں قدر دانی اور قدر شناسی کا مستحق کون ہے بمقابلہ اس شخص کے جس نے اپنی ساری زندگی عربوں، ان کی زبان اور ان کے ادب کی خدمت میں بتادی۔ کون لائق تحسین ہوسکتا ہے بجز علامہ استاد المیمنی کے جنہوں نے اس عظیم زبان وادب کی محبت کے سبب بہت زیادہ تکالیف اٹھائیں اور عربی زبان کے شاہ کاروں کی تلاش میں سرگرداں رہے۔ انہوں نے ہندوستان، ترکی، شام اور مصر وغیرہ کا سفر اختیار کیا اور عربی زبان کے نادر قلمی نسخوں کا کھوج لگایا۔"

وہ حج کی ادائیگی کے لیے گئے تھے لیکن اس دوران بھی چند نایاب کتب لے کر آئے۔

1958ء میں انہوں نے پھر انسٹی ٹیوٹ کے لیے سفر کیا۔ اس دورے کی خاطر تمام اخراجات قیام وطعام حکومت پاکستان برداشت کر رہی تھی۔ وہ چاہتے تو مہنگے مہنگے اور پرتعیش ہوٹلوں میں قیام کر سکتے تھے اور حکومت سے زیادہ سے زیادہ رقم حاصل کر سکتے تھے لیکن اپنی فطری سادگی، پاکستان سے محبت اور یہاں ایک اسلامی ادارے کے مضبوط بنیادوں پر قیام کی خاطر انہوں نے تمام موقعوں پر انتہائی سادگی سے گزر بسر کی اور اپنی پوری توجہ نادر کتابوں کے حصول پر مرکوز رکھی۔ ذاتی تعلقات اتنے تھے کہ ہر کتاب رعایت کے ساتھ ملی۔ تن تنہا صبح سات بجے سے رات کے دس بجے تک کتب خانے کھنگالتے اور کتب فروشوں کے ہاں کتابوں کی تلاش میں خاک چھانتے۔

جس مقصد کے حصول کے لیے انہوں نے یہ دورے کیے تھے اس میں انہیں غیر معمولی کامیابی ہوئی اور تقریباً پچپن ہزار روپے میں پانچ چھ ہزار قیمتی کتابیں، قدیم قلمی نسخے حاصل کیے۔

یہ دو لاکھ سے اوپر کے نوادرات تھے جو ان کے ذاتی تعلقات کی وجہ سے بہت کم قیمت پر دستیاب ہوگئے۔

1960ء کے اوائل تک انسٹی ٹیوٹ (مرکزی ادارہ تحقیقات اسلامی) کے کتب خانے میں چھ ہزار کتب کا ذخیرہ جمع ہوگیا تھا۔ انہیں صحیح طور پر ترتیب دیا گیا اور فہرستیں تیار کی گئیں اور اب یہ اس قابل ہوگیا تھا کہ اسلام پر کام کرنے والے حضرات کی تحقیقی ضروریات کو پورا کر سکے لیکن اس وقت علامہ میمن کے سوا کوئی اور تحقیقی کام کرنے والا نہ تھا۔ اس سلسلے میں مزید تقرریوں کی ضرورت تھی لیکن حکومت کی بے حسی نے یہ تقرریاں نہیں ہونے دیں۔ سیاست کے نقار خانے میں علمی کام کرنے والوں کی کسی نے نہیں سنی۔ مجبور ہوکر ادارے کی لائبریری نے نجی علمی کام کرنے والوں اور یونیورسٹی کے طلبہ کے تحقیقی کام میں مدد اور سہولت دینا شروع کردیا۔ بہت سے لوگوں نے استفادہ کیا۔

علامہ میمن کی عمر اب ستر سال ہوچکی تھی۔ دو دو ذمے داریوں کا بوجھ اٹھانا اب ان کے لیے مشکل ہوتا جارہا تھا چنانچہ انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی پوری توجہ ادارۂ تحقیقات اسلامی پر صرف کریں گے۔ انہوں نے 31 مارچ 1959ء کو جامعہ کراچی سے اپنا تعلق منقطع کرلیا۔

یہ ان کا ایک اور ایثار تھا جو انہوں نے علمی و تحقیقی کاموں کے لیے کیا۔

علامہ میمن کا ذوق خالص تحقیقی تھا جبکہ یہ ادارہ سرکاری تھا اور حکومت کی اپنی ترجیحات ہوتی ہیں جو ضروری نہیں کہ اہل علم سے موافق ہوں۔ انہیں عربی زبان وادب پر بے شک غیر معمولی عبور حاصل تھا لیکن عہد جدید کے نئے مسائل اور ان کے حل کے لیے ان کی صلاحیت ناکافی تھی لہٰذا انہیں اس ادارے سے سبکدوش کردیا گیا۔

علامہ میمن کا بیان کچھ یوں ہے۔

"کچھ عرصے بعد یہ ادارہ انگریز کے زمانے کی پود کے حوالے کردیا گیا جنہیں اسلام اور عربی زبان سے کچھ واقفیت ہی نہ تھی اور یہ اسلامی ادارہ رویت ہلال کے تنازے برپا کرنے، نماز، روزے بخشوانے کے شوقین اور سود کو جائز قرار دینے والوں کے ہاتھوں میں چلا گیا۔ انسٹی ٹیوٹ کے بارے میں میرا یہ خیال تھا کہ اس ادارے سے یہ ملک علم وآگہی اور تاریخ اسلام کا مخزن بن جائے گا لیکن افسوس عالم اسلام میں اس ادارے کو کوئی اہمیت نہ مل سکی۔"

یہ ادارہ بعد میں اسلام آباد میں منتقل ہوگیا، آج کل یہ ادارہ فیصل مسجد اسلام آباد کی عمارت میں قائم ہے۔

☆☆☆

ستمبر 1964ء میں یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور کے تحت عربی زبان کی ایک عالمی کانفرنس منعقد کی گئی۔ اس وقت کالج کے پرنسپل علامہ میمن کے شاگرد ڈاکٹر سید عبداللہ تھے چنانچہ انہوں نے استاد کو نہایت ادب واحترام سے اس کانفرنس میں شرکت کے لیے لاہور بلایا۔

علامہ میمن کے لیے نہ لاہور نیا تھا نہ اورینٹل کالج۔ پرانی یادوں نے اکسایا اور وہ عمر رفتہ کو آواز دینے پیرانہ سالی کے باوجود لاہور گئے اور کانفرنس میں بھرپور شرکت کی۔

پنجاب یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر حمید احمد خاں علامہ میمن کے علمی مقام سے بخوبی واقف تھے۔ عربی کانفرنس کے دوران انہیں مولانا کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ مولانا کے علم، قوتِ حافظہ اور تحقیقی کارناموں نے انہیں مسحور کردیا۔ دل ہی دل میں انہوں نے فیصلہ کرلیا کہ پنجاب یونیورسٹی کے شعبۂ عربی کی کرسی صدارت کے لیے مولانا عبدالعزیز سے بڑھ کر کوئی اور مستحق نہیں۔ انہوں نے علامہ سے پرزور درخواست کی کہ اورینٹل کالج میں بہ حیثیت صدر شعبۂ عربی تشریف لائیں اور اپنے علم سے طلبہ کو فیض یاب کریں۔ ان کی عمر 76 سال ہوچکی تھی لیکن علم کے اس شائق نے ان کی یہ درخواست قبول کرلی۔ چند روز بعد اہلیہ کے ہمراہ لاہور تشریف لے گئے۔

پروفیسر حمید اللہ خاں سے غلطی ہوئی کہ انہوں نے ڈاکٹر سید عبداللہ سے مشورہ کیے بغیر یہ قدم اٹھالیا۔ انہیں شکوہ یہ تھا کہ وہ اورینٹل کالج کے بااختیار پرنسپل ہیں۔ انہیں اعتماد میں لیے بغیر وائس چانسلر نے یہ قدم کیوں اٹھایا۔ یہ قضیہ اتنا بڑھا کہ سید عبداللہ استعفیٰ دے کر گھر بیٹھ گئے۔

کچھ لوگوں نے اس واقعے کو ہوا دی اور یہ مشہور کیا کہ سید عبداللہ، علامہ میمن کی تقرری کے خلاف تھے حالانکہ ایسا نہیں تھا۔ علامہ میمن ان کے استاد تھے اور وہ ان کا احترام کرتے تھے۔ انہیں تو اختلاف حمید اللہ خاں سے ہوا تھا جو ایک اصولی اختلاف تھا۔

علامہ میمن نے ان جھگڑوں سے الگ تھلگ ہوکر اپنا علمی، تدریسی اور تحقیقی سفر جاری رہا۔ وہ ہر اتوار کو عربی کتب کے معروف ناشر و تاجر خان عبدالحق ندوی کے مکتبۂ علمیہ میں آجاتے۔ عربی زبان وادب سے شغف رکھنے والے اصحاب بھی وہیں آجاتے۔ علمائے سلف موضوع گفتگو بنتے۔ عربی کے کسی لفظ کے صحیح تلفظ پر بحث چھڑ جاتی یا کسی قدیم مخطوطے پر بات ہوتی۔ اپنے علمی سفرناموں پر گھنٹوں تقریر

نامور مستشرقین جنہوں نے علامہ سے استفادہ کیا

1۔ فرٹز کرینکو...... تعلق جرمنی
2۔ کرتشکوفسکی...... تعلق روس
3۔ البرٹ ڈیٹریش...... تعلق جرمنی
4۔ وان ارنڈوک...... تعلق ہالینڈ
5۔ جوزف فیوک...... تعلق جرمنی
6۔ ہیلمٹ ریٹر...... پروفیسر فرینکفرٹ یونیورسٹی
7۔ اوٹو اشپیز...... تعلق جرمنی
8۔ روڈلف گانز...... تعلق جرمنی
9۔ سی، اے سٹوری...... تعلق علی گڑھ یونیورسٹی
10۔ ایڈورڈ براؤن...... تعلق کیمبرج یونیورسٹی
11۔ ڈی ایس مارگولتھ...... تعلق آکسفورڈ یونیورسٹی
12۔ آر اے نکلسن...... تعلق کیمبرج یونیورسٹی
13۔ پال کالے...... تعلق جرمنی، پروفیسر آکسفورڈ
14۔ الیگزینڈر بلٹن ہارلے...... تعلق مدرسہ عالیہ کلکتہ
15۔ اے ایس ٹریٹن...... تعلق علی گڑھ یونیورسٹی

☆☆☆

منظوم خراج

علامۂ زماں تھے عبدالعزیز میمن
سرخیل عالماں تھے عبدالعزیز میمن
عشق ان کو تھا زباں سے سرکار دو جہاں کی
نازِ جہانیاں تھے عبدالعزیز میمن
ان کے کمال کی تھی مصر و عرب میں شہرت
بے مثل نکتہ داں تھے عبدالعزیز میمن
عمر طویل اپنی تدریس میں بسر کی
ابر گہر فشاں تھے عبدالعزیز میمن
تقریریں ان کی اب تک ہیں خلد گوش راغب
"گلبار خوش بیاں تھے عبدالعزیز میمن"
1398ھ

کرتے۔ کوئی لفظ ایسا نہیں تھا کہ جس سے جہانِ معلومات کا دروازہ نہ کھل جاتا ہو۔ انہیں دکھ تھا تو یہ کہ لوگوں میں علمی ذوق کم ہوتا جا رہا ہے۔ ایک مرتبہ کسی نے پوچھا ”کیا وہ پنجاب یونیورسٹی کے ایم اے عربی کے نصاب سے مطمئن ہیں؟“

علامہ نے فرمایا۔ ”بالکل نہیں۔“

”اگر ایسا ہے تو آپ اس نصاب کو تبدیل کیوں نہیں کردیتے؟“

انہوں نے فرمایا۔ ”نصاب میں کل سات مضامین ہیں۔ میں زیادہ سے زیادہ دو مضامین پڑھا سکتا ہوں۔ اگر نصاب تبدیل کردیا جائے تو بقیہ مضامین کون پڑھائے گا؟“

عربی دانی کے ذوق کی کمی کا اندازہ اس سے لگایا جاسکتا ہے کہ جب حکومتِ پاکستان کو ان کی علمی خدمات کے اعتراف میں پرائڈ آف پرفارمنس دینے کا خیال آیا تو معلوم ہوا کہ عربی خدمات پر تمغائے حسن کارکردگی موجود ہی نہیں لہٰذا انہیں اردو خدمات کے اعتراف میں تمغا برائے حسن کارکردگی عطا کیا گیا۔

اورینٹل کالج میں تقرری کا کنٹریکٹ دو سال کا تھا جس کی تکمیل کے بعد جون 1966ء میں وہ کراچی واپس آگئے۔ اس وقت ان کی عمر 78 سال ہوچکی تھی۔ ان کی شہرت تمام عالم میں پھیل چکی تھی۔ اس طویل عمری میں بھی ان کی خدمات مصر سعودی عرب اور ایران کی جامعات نے حاصل کرنے کی کوشش کی لیکن اب ضعیف العمری پاؤں اٹھانے کی اجازت نہیں دے رہی تھی۔

ممتاز حسن ان کے بڑے مداح تھے اور ان سے ملاقات کے لیے اکثر ان کے گھر آتے رہتے تھے۔

ممتاز حسن ان دنوں ترقی اردو بورڈ کے چیئرمین تھے۔ ایک روز وہ آئے تو یہ درخواست لے کر آئے کہ وہ ان کے دفتر میں تشریف لائیں اور عربی لغت نگاری پر خطبات ارشاد فرمائیں تاکہ اہلِ علم مستفید ہوں۔ علامہ اس پر راضی ہوگئے اور لغت نگاری کی تاریخ پر نہایت عالمانہ خطبات ارشاد فرمائے۔ اس وقت ان کی عمر 80 برس ہوچکی تھی لیکن اس عمر میں بھی حافظے کا یہ عالم تھا کہ طویل نشستوں کے دوران محض حافظے کے سہارے یہ خطبات ارشاد فرماتے۔ کسی لکھی ہوئی چیز کا سہارا نہ لیتے۔

بعد میں ان خطبات میں سے چند کو ڈاکٹر سید محمد یوسف نے قلم بند کیا اور اردو لغت بورڈ کے ماہنامہ اردو نامہ میں شائع کروایا۔

اسی سال اسلام آباد میں جشن نزول قرآن کی چودہ سو سالہ تقریبات کے حوالے سے کانفرنس منعقد ہوئی۔ علامہ میمن کو بھی مدعو کیا گیا۔ وہ کراچی سے اسلام آباد گئے اور اس موقع پر خطاب بھی فرمایا۔

ممتاز حسن ایک اور نہایت شاندار کام انجام دے رہے تھے۔ قومی عجائب گھر کراچی میں محفوظ کرنے کے لیے عربی، فارسی، اردو مخطوطات خرید رہے تھے۔ یہ جانچنے کے لیے، کون سا مخطوطہ اہم ہے کون سا غیر اہم، اصلی کون سا ہے نقلی کون سا ہے کسی ماہر کی ضرورت تھی۔ علامہ میمن کی زندگی ان مخطوطوں کے درمیان گزری تھی۔ پڑھے بغیر محض ایک نظر دیکھ کر بتا سکتے تھے کہ مخطوطہ اصلی ہے یا جعلی۔ ایک مرتبہ ایک صاحب ایک مخطوطہ لے کر آئے اور ان سے پوچھا کہ مخطوطہ اصلی ہے یا جعلی۔

انہوں نے ایک نظر اس پر ڈالی اور بے اعتنائی سے کہا۔ ”اصلی ہے۔“

اس بے اعتنائی پر وہ صاحب مایوس ہوئے اور کہنے لگے۔ ”آپ نے پڑھے بغیر کیسے کہہ دیا کہ یہ اصلی ہے؟“

”معلوم ہوتا ہے آپ کی تشفی نہیں ہوئی۔ میرے ساتھ گھر میں آؤ۔“

وہ انہیں لے کر اپنے کمرے میں آگئے۔ خود تو حقہ تیار کرنے لگے اور ان صاحب سے کہا۔ ”چارپائی پر پورے مخطوطے کو پھیلا دو اور بالکل آخر کی عبارت محدب عدسے سے دیکھو جو قریب ہی رکھا ہے۔“

یہ مخطوطہ ایک جھلی پر نہایت باریک خط نسخ میں لکھا ہوا تھا۔ ان صاحب نے اسے چارپائی پر پھیلا دیا۔ علامہ میمن دور بیٹھے تھے۔

”اب جو عبارت میں بولوں دیکھو وہی لکھی ہے یا نہیں۔“

وہ دور سے عبارت بولنے لگے جس میں خطاط کا نام اور سنہ کتابت لکھی تھی اور یہ خطاط کس مکتبِ خطاطی کا ہے وغیرہ تفصیل بیان کی۔

وہ صاحب ان کی یادداشت پر حیران رہ گئے کیونکہ وہ وہی عبارت بول رہے تھے جو عبارت اس مخطوطے پر لکھی ہوئی تھی۔

یہ مخطوطہ انہوں نے نہ جانے کب پڑھا ہوگا اور اب تک لفظ بہ لفظ یاد تھا۔

غرض یہ کہ جب ممتاز حسن نے قومی عجائب گھر کے لیے

مخطوطات خریدنے شروع کیے تو خریداری کی کمیٹی میں علامہ صاحب کو ماہرانہ رائے دینے کے لیے شامل کیا۔ علامہ ہر مخطوطے کو ملاحظہ کرتے اور اس موضوع پر اپنے وسیع علم کی روشنی میں اپنی رائے تحریر کرتے۔

قومی عجائب گھر میں یہ مخطوطات اب بھی محفوظ ہیں جن پر علامہ میمن کی یہ آرا آج بھی دیکھی جاسکتی ہیں۔ وہ اب مستقل کراچی میں رہ رہے تھے۔ بہادر آباد میں واقع میمن منزل اپنے وسیع کتب خانے کے ساتھ آباد تھی۔ یہیں وہ ان کتابوں سے استفادہ کرتے نیز آنے والوں سے ملاقات بھی کرتے۔

ان کے دونوں بڑے صاحب زادے حیدرآباد سندھ میں مقیم تھے جبکہ چھوٹے صاحبزادے امریکا جاچکے تھے۔ دونوں کا اصرار تھا کہ وہ حیدرآباد منتقل ہوجائیں لیکن ان کا جواب یہی ہوتا کہ ان کی لائبریری کا کیا ہوگا۔ ان کے دوست احباب کراچی میں ہیں۔ عالم عرب کے محققین اور علما اکثر ان سے ملنے آتے ہیں۔ وہ کہاں حیدرآباد آتے پھریں گے۔

اپنا سارا کام خود اپنے ہاتھوں سے انجام دیتے رہے۔ ایمپریس مارکیٹ سودا سلف خریدنے خود ہی جاتے۔ عربی زبان کا یہ بے بدل عالم بس میں سفر کرتا تھا، کبھی بیٹھ کر کبھی بس کا ڈنڈا پکڑ کر۔ عام لوگوں کو کیا معلوم ہوتا کہ یہ شخص کون ہے۔

1974ء میں لاہور میں اسلامی سربراہی کانفرنس ہوئی۔ اس موقع پر عالم اسلام کے تمام سربراہ شریک ہوئے۔ ان حضرات میں بعض نے اس وقت کے وزیرِ خارجہ سے اس خواہش کا اظہار کیا کہ عربی زبان کے عالم علامہ عبدالعزیز میمن سے ان کی ملاقات کروائی جائے۔ وزیراعظم نے اپنے وزیرِ خارجہ کو کراچی بھیجا کہ علامہ میمن کو لاہور لایا جائے۔ وزیرِ خارجہ، میمن منزل آئے اور ان مہمانوں کی خواہش کا اظہار کیا لیکن آپ نے صاف انکار کردیا۔

”میں مانتا ہوں کہ ان حضرات کو مجھ سے مل کر خوشی ہوگی لیکن مجھے ان سے مل کر کوئی خوشی نہیں ہوگی کیونکہ ان کا علم سے کوئی تعلق نہیں۔ اگر وہ ملنا ہی چاہتے ہیں تو انہیں مجھ سے ملنے یہاں آنا چاہیے۔“

ایک طرف یہ عالم دوسری طرف یہ واقعہ۔ ایک مرتبہ ڈاکٹر عطیہ خلیل عرب ان سے ملنے میمن منزل بہادر آباد گئیں۔ ان کی گود میں ان کا کم سن صاحبزادہ تھا۔ علامہ میمن نے بڑی شفقت سے ان کا استقبال کیا اور گفتگو ہونے لگی۔ کچھ دیر بعد علامہ میمن نے ڈاکٹر عطیہ کے بچے کو دیکھا۔ باہر صحن میں گئے۔ ضعیف العمری کے باوجود اوپر چڑھ کر اپنے ہاتھوں سے شریفے توڑے اور بڑی محبت سے بچے کو دیے۔ ابھی گفتگو جاری ہی تھی کہ ایک معروف شخصیت علامہ سے ملنے آئی۔ علامہ نے ناگواری کا اظہار کیا اور ان سے بے ساختہ کہا کہ آپ کو فون کرکے آنا چاہیے تھا۔ اس وقت میری بیٹی اور میرے شیخ (شیخ حسین عرب) کی پوتی مجھ سے ملنے آئی ہے۔ اس وقت میں کسی سے نہیں مل سکتا۔ وہ صاحب معذرت کرکے چلے گئے۔

یہ شب و روز گزر ہی رہے تھے کہ ان کی اہلیہ پر بلڈ پریشر کا شدید حملہ ہوا اور وہ جسمانی و دماغی طور پر معذور ہوگئیں۔

یہ ان پر ایک بڑی افتاد تھی۔ ان کی اپنی پیرانہ سالی تھی کہ بیوی معذور ہوگئیں۔ ان کی دیکھ بھال کرنے والا یہاں کون تھا۔ دونوں بیٹے حیدرآباد میں تھے لہٰذا بڑے بیٹے پروفیسر محمود میمن انہیں اپنے ہمراہ حیدرآباد لے گئے۔ وہ کراچی ہی میں رہے۔

ان کی خودداری نے انہیں بیٹوں کے پاس منتقل نہیں ہونے دیا کہ کہیں لوگوں کو یہ تاثر نہ ملے کہ وہ بیٹوں کے محتاج ہیں۔

دو سال بعد یعنی 1976ء میں ان کی اہلیہ کا انتقال ہوگیا۔

اہلیہ کے انتقال کے بعد بقیہ عرصہ انہوں نے میمن منزل کراچی ہی میں گزارا۔ ان کے معمولات وہی رہے جو تھے۔ صبح سویرے اٹھتے۔ نماز فجر ادا کرتے۔ اپنا ناشتا خود ہی تیار کرتے۔ ناشتے کے بعد بڑے اہتمام سے حقہ تیار کرتے اور اس سے لطف اندوز ہوتے، اس کے بعد مطالعے کے کمرے میں چلے جاتے۔ اس عمر میں بھی ان کی بینائی درست تھی۔ چشمہ لگائے بغیر پڑھتے تھے۔

بارہ بجے کمرے سے نکلتے۔ دوپہر کا کھانا کھاتے۔ نماز ظہر ادا کرتے اور قیلولے کے لیے لیٹ جاتے۔

آخری عمر میں جوڑوں کا درد ستانے لگا تھا لیکن صبح کی سیر پھر بھی ناغہ نہیں ہوئی۔ پیروں پر پٹیاں باندھ کر علی الصباح گھر سے نکل جاتے اور بہادر آباد سے جیل چورنگی تک چہل قدمی ضرور کرتے۔

ان کی چھوٹی بیٹی صفیہ میمن نے ان کا بہت خیال

رکھا۔ جب کبھی ان کی طبیعت ناساز ہوتی تو وہ علامہ کو اپنے گھر طارق روڈ لے آتیں اور ان کی تیمارداری کرتیں۔

اپنی تمام تر صحت کے باوجود انہیں یہ یقین ہونے لگا تھا کہ وہ زیادہ دن زندہ نہیں رہ سکیں گے۔ وہ اپنے کتب خانے کو قابلِ قدر ہاتھوں میں دینے کے متمنی تھے۔ سندھ یونیورسٹی جام شورو نے یہ ذخیرۂ کتب ڈیڑھ لاکھ روپے میں خرید لیا۔ ان کے قدردان ممتاز حسن نے اس ذخیرے کے لیے تین لاکھ کی پیشکش کی تھی لیکن انہوں نے آدھی قیمت پر فروخت کردیا محض اس لیے کہ یہ کتب یونیورسٹی میں محفوظ ہورہی تھیں جہاں طلبا ان سے استفادہ کرسکتے تھے۔ اس ذخیرے میں عربی فارسی اور اردو مطبوعات کے علاوہ مخطوطات بھی شامل تھے۔

کچھ کتابیں انہوں نے اپنے چہیتے شاگرد ڈاکٹر سید محمد یوسف کو ہدیہ کردیں۔ یہ کتابیں ڈاکٹر یوسف کے انتقال کے بعد ان کے کتب خانے کے ساتھ کتب خانہ بیت الحکمت میں منتقل ہوگئیں۔ جو کتابیں رہ گئی تھیں وہ ان کے صاحبزادے محمد عمر میمن، علامہ کے انتقال کے بعد امریکا لے گئے۔

☆☆☆

آخری دنوں میں علامہ کے پوتے جاوید سعید میمن ان کے پاس آکر رہ گئے تھے جن سے انہیں بڑا سہارا ہوگیا تھا۔ 27 اکتوبر 1978ء کو علامہ نے اپنے دن کا آغاز حسبِ سابق کیا۔ دوپہر کو اپنے دوست عثمان صاحب کے ہاں دھوراجی چلے گئے۔ واپس آئے تو گلے سے خرخر کی آوازیں آنے لگیں۔ جاوید سعید نے چائے بنائی۔ چند گھونٹ پیے تھے کہ بیت الخلا جانے کی ضرورت پیش آئی۔ جاوید نے چاہا کہ سہارا دے کر انہیں بیت الخلا لے جائے لیکن انہوں نے ہاتھ جھٹک دیا اور دیوار پکڑ پکڑ کر بیت الخلا گئے۔ واپسی میں ضعف طاری ہوگیا۔ جاوید انہیں سہارا دے کر بستر تک لایا اور صفیہ میمن کو فون کردیا۔ وہ فوراً آئیں اور انہیں اپنے گھر لے گئیں۔

ڈاکٹر کو بلایا گیا جس نے تصدیق کردی کہ نبض ڈوب رہی ہے۔ رات تقریباً ساڑھے تین بجے ایک گہری ہچکی آئی، جسم میں جنبش سی ہوئی اور پھر جسم ساکت ہوگیا۔

دوسرے دن یہ کوشش کی گئی کہ ان کی تدفین جامعہ کراچی میں ہو۔ ایک صاحبِ علم، اہلِ علم کے درمیان دفن ہو لیکن کارپردازانِ جامعہ کراچی کی عدم دلچسپی کی وجہ سے یہ نہ ہوسکا لہٰذا بعد نماز ظہر سوسائٹی قبرستان میں انہیں دفن کردیا گیا۔

نوے برس قبل گونڈل جیسے غیر معروف قصبے میں طلوع ہونے والا یہ سورج سوسائٹی کے قبرستان میں غروب ہوگیا۔

اہلِ علم کے ساتھ ناروا سلوک ان کی موت کے بعد بھی برقرار رہا۔ عالمِ عرب میں آج بھی ان کا نام احترام سے لیا جاتا ہے اور ان کی علمی خدمات کا اعتراف کیا جاتا ہے لیکن ہمارے ہاں عام لوگ تو کیا جن اداروں سے ان کا تعلق رہا وہاں بھی انہیں کوئی یاد کرنے والا نہیں۔

پر علی گڑھ نے البتہ انہیں فراموش نہیں کیا۔ 1985-86ء میں شعبۂ عربی علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی جانب سے دو ضخیم نمبر ڈاکٹر مختار الدین احمد کی زیرِ ادارت شائع ہوئے۔ 2003ء میں علامہ میمن پر کل ہند سیمینار منعقد ہوا جس میں پڑھے گئے مقالات کا مجموعہ شائع ہوا۔

محمد عزیز شمس (جامعہ ام القریٰ، مکہ مکرمہ) نے علامہ کے تمام عربی مقالات دو جلدوں میں مرتب کرواکے بیروت سے شائع کیے۔

اردو میں محمد راشد شیخ نے ان کی سوانح مرتب کی جو 2009ء میں شائع ہوئی۔

ان کی اصل دولت ان کے بے شمار شاگرد ہیں جو اُن کے نام کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ ماضی و حال کا کون ایسا استاد ہے جس کے چھ شاگرد برصغیر پاک و ہند کی معروف جامعات میں صدر شعبۂ عربی ہوئے۔ یہ اعزاز علامہ میمن کے حصے میں آیا۔ ان کے علاوہ بھی لاتعداد شاگرد ہیں جو درخشندہ ستارے بنے۔ ڈاکٹر نبی بخش بلوچ، ڈاکٹر ریاض الرحمن، مولانا امتیاز عرشی (ماہرِ غالبیات) ڈاکٹر سید عبداللہ، ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ، ڈاکٹر ظہور احمد اظہر، ڈاکٹر احمد خاں، ڈاکٹر محمد یوسف، ڈاکٹر سید رفیع الدین، ڈاکٹر سید اختر امام، پروفیسر حبیب اللہ غضنفر وغیرہ۔

علامہ میمن نے تمام عمر عربی زبان کی خدمت کی اور ان کے شاگردوں نے ان سے تحقیق کے گر سیکھے۔ استاد کا تسلسل اس کے شاگردوں سے جاری رہتا ہے۔ علامہ میمن خوش قسمت تھے کہ انہیں ایسے شاگرد میسر آئے اور شاگرد خوش قسمت تھے کہ انہیں ایسا استاد میسر آیا۔

خوش بختیوں کا یہ سفر اب تک جاری ہے۔ چراغ سے چراغ اب تک جل رہا ہے۔ وہ ایک نسل تیار کرگئے۔ درخت کتنا ہی گھنا ہوجائے بیج کی اہمیت پھر بھی قائم رہتی ہے۔

ماخذات

علامہ عبدالعزیز میمن، سوانح اور علمی خدمات' محمد راشد شیخ

مولوی نذیر احمد دہلوی (احوال و آثار) ڈاکٹر افتخار احمد صدیقی

ابن کبیر

یورپ بھر میں ایک ایسی وبا پھیلی تھی جس کا نام موت رکھ دیا گیا تھا۔ اس وبا سے نہ عام شہری محفوظ تھے اور نہ شاہی خاندان۔ کئی ممالک نے اس وبا کے خوف سے اپنی سرحدیں تک بند کردی تھیں۔

ایک عجیب و غریب مرض کا تذکرہ جس نے تباہی پھیلا دی تھی

کسی آسیب کے مانند سیاہ موت نے دنیا پر حملہ کیا۔ 1346 میں طاعون کے غارت گر جرثومے کا ظہور ہوا۔ اس کے مکروہ قہقہوں کی گونج دور تک سنائی دی۔ فقط دو برس میں یہ مرض برطانیہ کی نصف آبادی کو نگل گیا۔ اس وبا نے تاریخ کو جھنجوڑ ڈالا۔ انمٹ نقوش چھوڑے، مگر اس کے سامنے ہتھیار ڈالنے والا انسان اقتدار کی ہوس سے جان نہیں چھڑا سکا۔ جنگیں پورے زور شور سے جاری رہیں۔ زمین خون سے سرخ ہوتی رہی۔

طاعون کا قہر تھمے سو برس نہیں گزرے تھے کہ برطانیہ کے تاج کے لیے خانہ جنگی کا آغاز ہوگیا۔ اس کشمکش کو "غلاموں کی جنگ" کہہ کر یاد کیا جاتا ہے۔ ہوا کچھ یوں کہ شاہی خاندان پلانتاجانت کی دو شاخوں لنکاسٹر اور یارک گھرانوں میں تخت کے لیے ٹھن گئی۔ اس کشمکش نے جلد جنگ کی شکل اختیار کر لی۔ پوری ریاست لپیٹ میں آگئی۔

غلاموں کی جنگ میں 22 اگست 1485 کی حبس زدہ صبح شروع ہونے والا معرکہ بوسوورتھ بے حد اہم تھا۔ اس قدر اہم کہ لگ بھگ سو برس بعد لازوال شاعر شیکسپیئر اُسے اپنے ایک ڈرامے کا موضوع بنانے والا تھا۔

اس روز گھمسان کا رن پڑا۔ میدان لاشوں سے اٹ گئے۔ بوسوورتھ کے معرکے میں یارک گھرانے کا رچرڈ سوم ہلاک ہوگیا۔ جنگ ختم ہوگئی۔ حکومت لنکاسٹر گھرانے کے ہاتھ آگئی۔ ہنری ہفتم تخت پر بیٹھا اور اپنی موت تک برسرِ اقتدار رہا۔

ہنری ہفتم برطانیہ کی تاریخ کا آخری بادشاہ تھا جسے تخت کے لیے جنگ لڑنی پڑی۔

ہنری بے حد ذہین آدمی تھا۔ اُس نے بڑے سبھاؤ سے حکومت کی۔ سازشوں کا قلع قمع کیا، دشمنوں کے دانت کھٹے کیے مگر ایک دشمن ایسا بھی تھا جس کے سامنے اس نے خود کو لاچار و بے بس پایا کیونکہ وہ ظالم دکھائی نہیں دیتا تھا۔

یہ دشمن اُس زمانے سے ہنری ہفتم کا پیچھا کر رہا تھا جب وہ غلاموں کی جنگ کے بعد تختِ برطانیہ پر بیٹھا۔ یہ دشمن... ایک پُراسرار مرض تھا۔ ایسا مرض جو سیاہ موت کی تلخ یاد تازہ کرنے والا تھا۔

بوسوورتھ کی جنگ سے قبل ہی دارالحکومت میں عجیب و غریب واقعات رونما ہونے لگے۔ گرمی کی شدت میں اضافہ ہوگیا۔ شہروں میں اموات کی شرح یکدم بڑھ گئی۔ ہر گھر سے جنازے اٹھنے لگے۔

جنگ کی گہما گہمی میں اس کی جانب توجہ نہیں دی جاسکی مگر تخت سنبھالنے کے بعد وزراء بادشاہ کے کانوں میں پریشان کن سرگوشیاں کرنے لگے۔

ہو کچھ یوں رہا تھا کہ ہٹا کٹا صحت مند انسان یکبارگی سر تھام کر بیٹھ جاتا۔ درد کی شدت سے اس کا دماغ پھٹنے لگتا۔ پھر اسے معدے میں کانٹے چبھتے محسوس ہوتے۔ منہ میں ریت ہوتی۔ گرمی اچانک بڑھ جاتی۔ پسینا پانی کی طرح بہنے لگتا۔ لوگ اپنے کپڑے اتار پھینکتے۔ اب بخار حملہ کرتا۔ پسینا مزید شدت سے بہنے لگتا۔ اس میں تیزابی بُو ہوتی۔ اور یہ سب بے حد تیزی سے رونما ہوتا۔ بیشتر معاملات میں بارہ گھنٹے اور کبھی کبھار تو تین گھنٹے میں آدمی کی کمر بستر سے لگ جاتی۔ کچھ دیر بعد وہ دم توڑ دیتا۔

بادشاہ کو اس مرض کی خبر ملی تو وہ بڑا اسٹپٹایا۔

"کہیں یہ طاعون تو نہیں؟" اُس نے وزیر سے سوال کیا۔ لہجے میں اندیشوں کی دھمک تھی۔

"نہیں حضور! اس سے یکسر مختلف۔" وزیر نے جواب دیا۔

اس نے شاہی طبیب کو اس مرض کی تشخیص پر لگا دیا۔ سرکاری طبی مراکز میں ہنگامی حالات نافذ کر دیے گئے۔ ادویہ سازی کی رفتار تیز کی گئی۔ مگر یہ کوششیں بارآور ثابت نہیں ہوئیں۔

ادویہ تیار کرنے والا محکمہ یکسر لاعلم تھا کہ اُسے کس بیماری کا علاج کرنا ہے۔ طبی مراکز یوں بے مصرف تھے کہ وہاں تک پہنچنے سے قبل ہی مریض کی موت واقع ہوجاتی۔ شاہی طبیب بھی ناکام رہا۔ اس کی تحقیق و تشخیص سے کچھ حاصل نہیں ہوا۔ منہ لٹکائے واپس آگیا۔

"حضور یہ بیماری پُراسرار ہے۔" طبیب کا سر جھکا ہوا تھا۔ "اب تک کی تاریخ میں اس کا تذکرہ نہیں ملتا تھا۔ ہم بے بس ہیں۔"

"اگر تم بیماری کا علاج نہیں کر سکتے۔" بادشاہ غصے سے پھنکارا۔ "تو بری خبروں پر روک لگا دو۔ اموات ہوں مگر ان کا تذکرہ نہ ہو۔"

"ایسا ہی ہوگا سرکار۔" وزیر نے آگے بڑھ کر کہا۔ "جنازے اٹھیں گے، مگر ماتم نہیں ہوگا۔"

وزیر کا دعویٰ کھوٹا ثابت ہوا۔ موسم گرما آسیب زدہ تھا۔ سڑکوں پر چلتے پھرتے لوگ کمر اور کاندھے میں درد کی شکایت کرتے۔ کچھ دیر بعد وہ جگر اور معدے کے درد سے کراہ رہے ہوتے۔ چند گھنٹوں بعد وہ بستر پر پسینے سے تربتر پڑے ہوتے... اور پھر موت انہیں آلیتی۔

جنازے اس تعداد میں اٹھے کہ گریے کا سلسلہ طول پکڑ گیا۔ حکومتی اہلکار بے بسی سے تماشا دیکھنے کے سوا اور کچھ نہیں کر سکے۔ نادیدہ دشمن نے حملے جاری رکھے۔

مرض لندن سے نکل کر برطانیہ کے دیگر قصبوں میں پھیل گیا۔ اُس نے برق رفتار گھوڑوں سے زیادہ تیز سفر کیا۔ دریا عبور کیے، پہاڑ سر کیے۔ کچھ ہی عرصے بعد اس کا آئرلینڈ

میں ظہور ہوا۔ وہاں بھی اس وحشی نے کہرام مچا دیا۔ کیا شہر کیا دیہات، ہر مقام پر یہ پسینا آور مرض پہنچ چکا تھا۔

گو ہنری ہفتم نے اس مرض کے تذکرہ کو کبھی سرکاری دستاویزات کا حصہ نہیں بننے دیا، مگر اس عہد میں برطانیہ کا رخ کرنے والے غیر ملکی سیاحوں کی تحریروں میں اس کا حوالہ ملتا ہے۔ ایک اطالوی سیاح کیلیو نے اپنی کتاب میں اس عہد کو یوں بیان کیا۔

"لوگوں کو اندھا کر دینے والا سر درد آلیتا۔ جلد ہی درد پورے بدن میں پھیل جاتا... وہ دیوانے ہوجاتے۔ پسینا آنے لگتا۔ اگر سو بیمار پڑے تو سو کے سو مارے جاتے۔"

اپنی حکومت کے ابتدائی دس برسوں میں ہنری ہفتم نے بے بسی سے ہزاروں افراد کو اس پُراسرار مرض کا شکار بنتے دیکھا۔ اس کی کوششیں بے ثمر گئیں۔ قبرستان بھر گئے تھے۔ زندگی مفلوج ہوگئی۔

مگر پھر... دھیرے دھیرے یہ مرض خاموش ہونے لگا۔ 1492 کے آخر میں یہ سست گیا۔ شمالی ساحلوں سے آنے والی ہواؤں نے اس کا اثر توڑ دیا۔ برطانیہ زندگی کی سمت لوٹنے لگا۔

ان ہی برسوں میں شاہی طبیب نے بادشاہ کے سامنے دو انکشافات کیے۔

اس کے پاس کاغذات کا پلندا تھا۔ اس نے خاصے اعداد و شمار اکٹھے کیے تھے۔ بہت سر کھپایا تھا۔ اس نے بادشاہ سے کہا۔

"یہ امر حیرت انگیز ہے حضور والا۔" آواز ڈرامائی تھی۔ "برطانیہ ہزاروں انسانوں کی موت کا گواہ بنا، جنازے ہمارا مقدر بن گئے، مگر حیرت انگیز طور پر مرنے والوں میں کوئی ایک بچہ بھی نہیں تھا۔"

"کیا مطلب؟" بادشاہ کے لہجے میں حیرت تھی۔

"میں جانتا تھا کہ حضور کے لیے یقین کرنا مشکل ہوگا مگر خادم نے شب و روز ایک کر کے تحقیق کی۔ ابتدا میں تو میں خود بھی حیران تھا۔ یہ سچ ہے کہ مرد عورتیں، بوڑھے جوان، سب اس پُراسرار مرض کا شکار ہوئے، مگر کوئی نومولود اس کی زد میں نہیں آیا۔"

"یہ تو واقعی حیرت انگیز امر ہے۔" وزیر نے کہا۔

"ہے تو سہی۔ مگر ہمیں پروا کرنے کی ضرورت نہیں۔" شاہی طبیب مسکرایا۔ "یہ مرض جا چکا ہے۔ اب آپ کی سلطنت میں امن ہے۔ روزگار ہے۔ تحفظ ہے۔ راوی چین ہی چین لکھتا ہے۔"

بادشاہ کی مدحت بیان کرنے والا شاہی طبیب چاپلوس ضرور تھا، مگر بیوقوف نہیں۔ وہ جانتا تھا کہ یہ مرض لوٹ سکتا ہے۔

اور 1502 میں ایسا ہی ہوا۔

☆☆☆

وہ پُرآشوب زمانہ تھا۔

سولہویں صدی میں آنے والی تبدیلیاں دنیا کا نقشہ بدلنے کو تھیں۔ ایک پرتگالی مہم جو نے جنوبی افریقا کے ساحلوں سے گزرتے ہوئے وہ راستہ کھوج نکالا جو ہندوستان کی سمت جاتا تھا۔ کولمبس کے امریکا دریافت کرنے کے ٹھیک چار برس بعد واسکوڈی گاما گوا کے نزدیک کالی کٹ کے ساحل پر کھڑا تھا۔ ٹھیک ربع صدی بعد بابر ہندوستان کا تخت سنبھالنے والا تھا۔

سولہویں صدی ہی میں لی نارڈو ڈونچی اور مائیکل اینجلو جیسے عظیم فنکاروں نے عروج حاصل کیا۔ ممتاز سیاسی مفکر میکاولی کا شہرہ ہوا۔ جنگوں میں آتشی اسلحے کا استعمال بڑھ گیا۔ انگریز بحری فوج نے ہسپانوی جنگی بیڑے کو تاریخ ساز شکست دی۔ ریاست برطانیہ کی سرحدیں پھیلنے لگیں۔

ہنری ہفتم دنیا بھر میں اپنی قوت کا سکہ جما چکا تھا لیکن دارالحکومت میں وہ ایک بڑی اُلجھن کا شکار ہونے والا تھا۔

وہ 1502 کا موسم گرما تھا۔ ایک حبس زدہ شام، بادشاہ محل کی بالکونی میں کھڑا تھا۔ ہوا میں بوجھل پن تھا۔ باغات میں سبزہ خاموش تھا۔ ماحول اکتاہٹ کو مہمیز کرتا۔

اچانک اُسے کاندھے میں چبھن محسوس ہوئی۔ ابتدا میں تو اس نے توجہ نہیں دی مگر دھیرے دھیرے درد بڑھنے لگا۔ اس کے ماتھے پر پسینے کے قطرے ظاہر ہوئے۔ یکدم دل ڈوبنے لگا۔ اگلے ہی لمحے بادشاہ زمین پر آرہا۔

جب شاہی طبیب کو اطلاع ملی تو اس کے ہاتھوں کے طوطے اُڑ گئے۔ قاصد نے جو علامات بیان کی تھیں، وہ من و عن وہی تھیں، جو پسینا آور مرض میں ظاہر ہوتی ہیں۔ وہ دوڑا دوڑا محل پہنچا۔

وزیر خواب گاہ کے باہر ٹہل رہا تھا۔ چہرے پر اس کے اضطراب تھا۔

بادشاہ کا بدن تپ رہا تھا۔ نقاہت چہرے سے عیاں تھی۔ وہ گرمی کی شکایت کر رہا تھا۔ درد بھی شدید تھا۔

طبیب نے تشخیص شروع کی۔ ماتھے پر بل پڑ گئے۔

تمام علامات وہی تھیں۔ خطرہ قوی تھا، بس ایک الجھن تھی۔ بوڑھے بادشاہ نے تاحال معدے میں درد کی شکایت نہیں کی تھی۔

دو گھنٹے بعد جب طبیب خواب گاہ سے باہر آیا تو وزیر کو اپنے رُوبرو پایا۔

"وہی مرض؟" وزیر نے سوال کیا۔

"شاید ہاں!" طبیب کے لہجے میں تذبذب تھا۔ "یا پھر شاید نہیں!"

ہاں، یہ وہ مرض نہیں تھا۔ بادشاہ کو پسینا تو آ رہا تھا مگر اس میں بُو نہیں تھی۔ رات تک اس کی حالت سنبھلنے لگی۔ تیسرے روز وہ اپنے پیروں سے چل کر دربار آیا۔

غسل صحت یابی کے بعد جشن کا اہتمام کیا گیا۔ شان دار جشن ہوا۔ لنگر خانہ کھول دیا گیا مگر مسرت کی فضا زیادہ دیر قائم نہیں رہی۔ بدقسمتی وار کرنے والی تھی۔

اپریل کے اوائل میں جوان سال امیر ویلز کی ناگہانی موت پوری ریاست کو غمگین کر گئی۔ آرتھر کی عمر فقط پندرہ برس تھی۔ وہ بادشاہ کے بعد تخت کا وارث تھا۔ اس کی موت شروپشائر کے قلعہ لودلو میں ہوئی، جہاں وہ اپنی بیوی کیتھرین آف آراگن کے ساتھ مقیم تھا۔

بعد میں کیتھرین کی شادی مرحوم آرتھر کے چھوٹے بھائی ہنری ہشتم سے ہوئی، جو 1509 میں شاہ کی موت کے بعد برسر اقتدار آیا اور کیتھرین نے ملکہ کا منصب سنبھالا۔

مگر یہ تو بہت بعد کا واقعہ ہے۔ اس وقت تو برطانیہ پر آرتھر کی موت کا غم سوار تھا۔ جشن سوگ میں تبدیل ہو گیا۔ مضطرب بادشاہ محل کی راہ داریوں میں ٹہل رہا تھا۔ وزراء کو چپ لگ گئی تھی۔

ویلز کے طبیب نے جو دستاویز بھیجی تھی، اس میں موت سے قبل آرتھر میں ان تمام علامتوں کے ظہور کی تفصیلات تھیں جس نے چند عشروں قبل ہزاروں برطانویوں کو موت کی نیند سلا دیا تھا۔

"تم نے کہا تھا کہ وہ منحوس مرض بچوں پر اثر انداز نہیں ہوتا؟" بادشاہ دہاڑا۔ وہ بدحواس معلوم ہوتا تھا۔ شہزادے کا غم اسے کھائے جا رہا تھا۔

شاہی طبیب تھر تھر کانپنے لگا۔ اسے اپنی موت سامنے نظر آ رہی تھی۔

"تم نے جھوٹ کہا تھا۔" بادشاہ کی آنکھوں میں خون تھا۔ "کیا میں تمہارا سر اُڑانے کا حکم جاری کر دوں۔"

وزیر فوراً آگے بڑھا۔ "جان کی امان پاؤں تو کچھ عرض کروں جناب۔"

بادشاہ کرسی پر ڈھیر ہو گیا۔ اس نے سر سے خفیف سا اشارہ کیا۔

وزیر نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ "حضور، ہمیں شہزادے کی موت کا شدید غم ہے۔ شاید ہی کوئی غم اس غم سے بڑا ہو۔ مگر یہ بھی سچ ہے کہ گزشتہ چند برسوں میں اس وبا کی ہمیں کوئی خبر نہیں ملی۔ خواص کو تو رہنے ہی دیں، کوئی عام شہری بھی اس سے ہلاک نہیں ہوا۔ ہم مطمئن تھے۔ یہ ہماری بدقسمتی ہے کہ اس نے شہزادے کو نشانہ بنایا۔ میں درخواست کروں گا کہ حضور غصے سے اجتناب برتیں۔ اس ریاست کو آپ کی ضرورت ہے۔"

بادشاہ کچھ ٹھنڈا ہوا تو شاہی طبیب آگے بڑھا۔ "سرکار کا اقبال بلند ہو۔ شہزادہ ہمارا مستقبل تھا، میں جانتا ہوں کہ آپ پر کیا گزر رہی ہے۔ آپ مجھ سے ناراض ہیں، مگر مجھ پر لازم ہے کہ اپنے فرائض تن دہی سے ادا کرتا رہوں۔ جناب، شہزادے نے گزشتہ چند ماہ شکارگاہوں میں گزارے تھے۔ وہ دریاؤں کے نزدیک رہا۔ موسم گرما میں ویسے ہی یہ علاقے وبا کی لپیٹ میں آ جاتے ہیں۔ شاید شہزادے کو وہیں یہ مرض لاحق ہوا۔ خاکسار کی ایک تجویز ہے۔"

"کہو، میں سن رہا ہوں۔" بادشاہ نے گہرا سانس لیا۔

"تخت کے وارثوں کی حفاظت کے لیے یہ حکم جاری کر دیا جائے کہ تمام شہزادے، خصوصاً شہزادہ ہنری جنگلات اور دریاؤں سے دور رہے۔ اب وہی آپ کا وارث ہے حضور۔"

بادشاہ کو تجویز معقول لگی۔ اس نے وزیر کو اس ضمن میں ہدایت جاری کی، ساتھ ہی حکم بھی دیا کہ آرتھر کی موت کے اسباب کو خفیہ رکھا جائے۔

"ایسا ہی ہوگا جناب۔" وزیر نے مودبانہ لہجے میں کہا۔

☆☆☆

کچھ برس پُراسرار خاموشی رہی۔

شاطر مرض چپ چاپ گھنے جنگلات میں پڑا رہا۔ آرتھر کی موت کے بعد کسی معروف شخص کے اس مرض سے ہلاک ہونے کی خبر نہیں ملی۔ جہاں تک عوام کا تعلق ہے، اُن کی کسے پروا تھی۔

ریاستی معاملات خوش اسلوبی سے آگے بڑھ رہے تھے۔ بادشاہ نے اپنے بیٹے ہنری کو امورِ سلطنت کے تمام رموز سکھا دیے۔ وہ وراثت کی منتقلی کے لیے تیار تھا۔

اب بادشاہ بیمار رہنے لگا۔ وہ اپنی موت کی سمت بڑھ رہا تھا۔

1507 کے اواخر میں جب شہزادہ باقاعدگی سے دربار میں بیٹھنے لگا، ایک بار پھر برطانیہ کے دور افتادہ قصبوں سے پُراسرار واقعات کی خبریں آنے لگیں۔

اس برس موسم گرما کچھ زیادہ ہی مہلک ثابت ہو رہا تھا۔ اموات کی شرح حیران کن حد تک بڑھ گئی۔ طبی مراکز بے معنی ہو گئے۔ جنازوں کی قطار لگ گئی۔

شاید پسینے کا آسیب لوٹ آیا تھا۔ شاید موت کا رقص شروع ہونے کو تھا۔ دارالحکومت میں سب دم سادھے بیٹھے تھے۔ انہیں ایک وبا کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔

خوش قسمتی سے اس بار موسم گرما مختصر رہا۔ تازہ ہواؤں کی آمد کے ساتھ ہی بری خبروں کا سلسلہ سکڑنے لگا۔ اموات کی شرح کم ہونے لگی۔ مرض دارالحکومت پہنچنے سے قبل ہی خاموش ہو گیا۔

باپ کی موت کے بعد جون 1509 میں ہنری ہفتم نے تخت سنبھال لیا۔ اس کے بھائی کی بیوہ اور اس کی بیوی کیتھرین ملکہ بن گئی۔

اور اب انہیں اِس آفت کا سامنا کرنا تھا۔ یہ دشمن انہیں وراثت میں ملا تھا۔

ایک عشرہ سکون سے گزر گیا۔ بیرونی محاذوں پر برطانوی فوجوں نے فتح کے جھنڈے گاڑے۔ معاشی طور پر ریاست مستحکم ہوئی۔ اس کی سرحدیں پھیلنے لگیں۔ کئی ممالک اس کی کالونی بن گئے۔ لوٹ کھسوٹ سے خوب دولت اکٹھی ہوئی۔

اور تب... 1517 کا قاتل سال آیا اور گرجا گھروں کے گھنٹے ازخود بجنے لگے۔

☆☆☆

جنوبی برطانیہ کے وسط میں ایک پُرسکون شہر آباد تھا۔ پہلو سے جس کے دریائے ٹیمز بہا کرتا۔

یہ آکسفورڈ کا تذکرہ ہے جو علم و تہذیب کا مرکز تھا۔ قدیم عمارتیں اس کی پہچان تھیں۔ ان میں سے چند تو بارہویں صدی میں تعمیر ہوئیں۔ تاریخی اہمیت کی حامل ان ہی عمارتوں میں آکسفورڈ یونیورسٹی بھی شامل تھی جو اس وقت دنیا کی سب سے بڑی درس گاہ سمجھی جاتی۔ یہی جامعہ شہر کے سر کا

کیا نشانہ شاہی خاندان تھا؟

پسینا آور مرض نے لگ بھگ تیس لاکھ جانیں لیں۔ اتنی بڑی تعداد میں ہلاکتوں کی مثال کم ہی ملتی ہے۔ اس نے شاہی خاندانوں کو بھی اذیت میں مبتلا رکھا۔ شاہ برطانیہ ہنری ہفتم اسے اپنا سب سے بڑا دشمن تصور کرتا تھا۔ تخت نشینی سے یہ موذی مرض اس کا تعاقب کر رہا تھا۔ کوشش کے باوجود بادشاہ اسے شکست نہیں دے سکا۔ یہ ظالم نہ تو دکھائی دیتا تھا، نہ ہی اپنا کوئی نشان چھوڑتا۔

1485 میں یہ پہلی بار ظاہر ہوا۔ جہاں اس نے ہزاروں جانیں لیں، وہیں دو ناظموں، چھ نائب رئیس بلدیہ اور تین شیرف کو بھی نگل گیا۔ آئرلینڈ میں بھی اہم عہدے دار اس کا نشانہ بنے۔

1502 میں اس نے شاہ برطانیہ کو بھاری صدمہ پہنچایا، جب تخت کا وارث شہزادہ آرتھر اس کا شکار ہو کر زندگی کی بازی ہار گیا۔ 1507 میں اس نے آکسفورڈ اور کیمبرج میں کئی نامی گرامی اسکالرز کی جان لی، جن میں دو رئیس زادے بھی شامل تھے۔

1528 میں اس کا حملہ سب سے خطرناک تھا، جب یہ برطانیہ سے نکل کر پورے یورپ میں پھیل گیا اور روس تک پہنچا۔ آئرلینڈ میں اس نے لارڈ چانسلر ہیک لینگ کو ابدی نیند سلا دیا۔

1551 میں اُس نے شاہی خاندان پر ایک اور بھیانک حملہ کیا۔ شہزادہ ہنری اور شہزادہ چارلس اس کا شکار بنے۔ ہنری ہشتم کی وفات کے بعد اس کے بیٹے ایڈورڈ نے تخت سنبھالا تھا۔ چھ برس بعد اس کا انتقال ہو گیا۔ اس کی موت کے اسباب پُراسرار ہیں۔ چند مورخین کا خیال ہے کہ وہ بھی پسینا آور مرض کا شکار بنا تھا۔

بلاشبہ اس مرض نے لاکھوں گھر اجاڑے، لیکن اگر یہ کہا جائے کہ اس کا اصل نشانہ برطانیہ کا شاہی خاندان تھا تو کچھ ایسا غلط نہیں ہوگا۔

تاج تھی، اُس کی وجۂ شہرت۔ مگر اب... اس شہر کی شہرت کا حوالہ بدلنے والا تھا۔

مگر آکسفورڈ تنہا بدبخت نہیں تھا۔ لندن سے پچاس میل دُور شمال میں دریائے کیم کے پہلو میں واقع ایک اور شہر تباہی کی لپیٹ میں آنے والا تھا۔ اُس شہر اور آکسفورڈ میں عجیب مماثلت تھی۔ ٹھیک آکسفورڈ کے مانند یہ شہر بھی قدیم درس گاہوں کے لیے مشہور تھا۔ نام اُس کا کیمبرج تھا۔

شاید بدبختی کے آسیب نے اُس برس درس گاہوں کو تاراج کرنے کی ٹھان رکھی تھی۔

جوں ہی سورج عروج پر آیا، حدت بڑھی، دونوں ہی شہروں میں سراسیمگی پھیل گئی۔ موت کی ہوائیں زندگیوں کے چراغ بجھانے لگیں۔

آغاز مضافات سے ہوا۔ چند کسان کھیتوں میں ہل چلاتے ہوئے دم توڑ گئے۔ پھر کارخانوں میں یاسیت کا ظہور ہوا۔ صبح کارخانے آنے والے مزدور شام چار کاندھوں پر گھر گئے۔ اگلا شکار بندگاہیں تھیں جہاں پسینا آور مرض اس تیزی سے پھیلا کہ تجارتی سرگرمیاں دم توڑ گئیں۔ آکسفورڈ اور کیمبرج باقی دنیا سے کٹ گئے اور تب بیماری نے پوری قوت سے مرکزی علاقوں پر حملہ کیا۔ انتظامیہ کے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ ادویہ کا اثر زائل ہوگیا۔ معالجین کی کوششیں بے کار گئیں۔ موت چاروں طرف رقص کرنے لگی۔ تیزابی بُو پھیل گئی۔

دونوں ہی شہروں میں نظامِ زندگی مفلوج ہوگیا۔ سڑکیں ویران ہونے لگیں۔ درس گاہوں میں سناٹے کا آسیب اتر آیا۔ گھر گھر سے ماتم کی صدائیں سنائیں دینے لگیں۔

مرض سے محفوظ رہنے کے لیے کئی گھرانوں نے شہر چھوڑ دیا، مگر وہ بدبختی کو شکست نہیں دے سکے۔ مرض نے بیچ راستے میں انہیں آلیا۔ بگھیوں میں بیٹھے بیٹھے لوگوں نے جان دے دی۔ پورے پورے خاندان موت کی نیند سو گئے۔

کیمبرج اور آکسفورڈ سے اٹھنے والی صدائیں سلطنت برطانیہ میں پھیل گئیں۔ ہنری ہشتم حواس باختہ ہوگیا۔ اس نے قریبی ممالک کے معالجین سے مشورے کے لیے اپنے سفیر دوڑائے۔

جونہی... سفیروں نے سلطنت سے باہر قدم رکھا، یہ مرض دہاڑتا ہوا کیمبرج اور آکسفورڈ سے باہر آگیا۔ شہر کیلس اور انٹیورپ اس کا اگلا شکار بنے۔ انٹیورپ کی بندگاہوں پر کہرام مچ گیا۔ کیلس کے ساحلوں پر ویرانی چھاگئی۔

ہر سو موت ہی موت تھی۔

بہ ظاہر یوں لگتا تھا کہ اب یہ مرض پورے برطانیہ میں پھیل جائے گا مگر ہمیشہ کی طرح ایک بار پھر یہ بالکل اچانک خاموش ہوگیا۔ مزید آگے نہیں بڑھا۔ شاید اس کی پیاس بجھ چکی تھی۔ شاید اب یہ ظالم کچھ آرام کرنا چاہتا تھا۔

کچھ ہی ہفتوں میں پسینا آور مرض نے آکسفورڈ اور کیمبرج کی نصف آبادی کو نگل لیا۔ گورکنوں کے بازو قبریں کھود کھود کر شل ہوگئے۔ کئی لاشیں گھروں میں پڑے پڑے سڑ گئیں۔ شہر پچاس برس پیچھے چلا گیا۔ وہاں افرادی قوت کا کال پڑ گیا۔ صنعتیں بے معرف ہوگئیں۔ اپنے پیروں پر کھڑے ہونے میں انہیں کئی برس لگے۔

قریبی ریاستوں کو روانہ کردہ سفیر جب لوٹے تو ماسوائے دیسی ٹوٹکوں کے... ان کے پاس کچھ نہیں تھا۔ وہ مضمحل اور تھکے ہوئے تھے۔

بادشاہ کے حکم پر تمام ٹوٹکوں کو دستاویز کی شکل دی گئی۔ اس کی چھٹی حس کہہ رہی تھی کہ برطانوی عوام کو جلد اِن کی ضرورت پڑنے والی ہے۔

☆☆☆

12 جنوری 1528 کو گوستاو اول کے سر پر سویڈن کا تاج رکھا گیا۔ فروری میں اسکاٹ لینڈ کے پروٹسٹنٹ مصلح پیٹرک ہیملٹن کو قتل کیا گیا۔ مستقبل میں علم الٰہیات کے آسمان پر چمکنے والے ستارے جیکب اینڈریلی کی جرمنی میں پیدائش ہوئی۔ ماہ جون میں اطالویوں اور فرانسیسیوں کے درمیان لینڈریئنو کی جنگ چھڑ گئی۔

اِن واقعات کی اہمیت سے انکار نہیں۔ انہوں نے تاریخ کا رخ موڑ دیا مگر جو کچھ مئی کے مہینے میں شہر لندن میں رونما ہوا، اُس کا ذکر کیے بغیر سن 1528 کا تذکرہ ادھورا ہے۔

واقعہ کچھ یوں ہے کہ تاریک، مرطوب جنگلات میں محوِ استراحت مرض پھر جاگ اٹھا تھا۔ وہ موت کے رتھ پر سوار تھا جو کھیتوں کو روندتے اور دریا عبور کرتے لندن کی سمت بڑھ رہا تھا۔ اس کے نتھنوں سے شعلے نکل رہے تھے۔ وہ بھوکا تھا اور انسانوں کے شکار پر نکلا تھا۔

یہ پراسرار مرض کا چوتھا حملہ تھا۔ اور یہ ماضی کے تمام حملوں سے زیادہ خطرناک تھا۔ اس بار پسینا آور بیماری وبائی شکل اختیار کرنے والی تھی۔

مورخین بیان کرتے ہیں کہ ایک صبح لندن میوزیم کے سامنے بچھی بینچ پر دو آدمی مردہ پائے گئے۔ ان کے جسموں سے تیزابی بو اٹھ رہی تھی۔ پھر دریائے ٹیمز کے نزدیک تین لاشیں ملیں۔ محکمۂ ڈاک کا ایک اہل کار اندھا ہوکر سڑک پر دوڑ پڑا۔ ایک درخت کے نیچے پہنچ کر اس نے دم توڑ دیا۔ ایک درزی اپنی دکان میں اس حالت میں ملا کہ ایک ہاتھ مشین پر تھا اور دوسرا سینے پر۔ ایک آیا پنگوڑے کے پاس ڈھیر ہوگئی۔ ایک نرس اسپتال کی چھت پر مردہ پائی گئی۔ ایک رئیس بگھی میں دم توڑ گیا۔ ایک ٹھگ بیوہ کی کوٹھی سے نکلتے ہوئے ڈھیر ہوا۔

شہر میں کہرام مچ گیا تھا۔ اسپتالوں کے باہر قطاریں لگ گئیں۔ مریضوں کو درد کے افاقہ کی تیز دوا دی گئی مگر کچھ افاقہ نہیں ہوا۔ درد بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔

شام تک ہر گھر سے جنازے اٹھ رہے تھے۔

شاہ تک بھی خبر پہنچی۔ اسے فوراً ہی دیسی ٹوٹکوں پر مشتمل کتاب کا خیال آیا جو شاہی کتب خانے کے کسی کونے میں پڑی تھی۔

ایک درباری کو دوڑایا گیا۔ وہ شخص کبھی لوٹ کر نہیں آیا۔ کتب خانے میں اس حالت میں مردہ پایا گیا کہ ایک ہاتھ میں ٹوٹکوں کی کتاب تھی اور جسم پسینے میں تربتر۔

لندن میں جیسے زلزلہ آگیا، جس کی شدید لہریں اسی شام قرب و جوار میں پہنچ گئیں۔ مرض نے ہوا کی رفتار سے سفر کیا اور جہاں جہاں اس کے سبز قدم پڑے، ماتم کی صدائیں بلند ہونے لگیں۔

بیماری کے جرثومے نے چند ہی روز میں برطانیہ کی سرحد عبور کر لی۔ اس بار آئرلینڈ تو حیرت انگیز طور پر محفوظ رہا، البتہ اسکاٹ لینڈ میں اس نے قہر ڈھایا۔ وہیں اُس نے اپنا پہلا بڑا شکار کیا۔ لارڈ چانسلر ہیگ لینگ پہلے درد کی شدت سے چلایا پھر اس کے ہر مسام سے پسینا ٹپکنے لگا۔ کچھ ہی گھنٹوں میں اس نے دم توڑ دیا۔

لندن کی بگڑتی صورتِ حال نے ہنری ہشتم اور اس کی بیوی کو خوفزدہ کر دیا۔ ان کا خاندان پہلے بھی اِس نادیدہ دشمن کا شکار بن چکا تھا۔ پھر اسے اپنی بیٹی میری کی بھی پروا تھی۔ اُس کی ایک ہی اولاد تھی اور وہ ہی مستقبل میں تخت کی وارث ہوتی۔

بادشاہ نے سرگرمیاں محدود کر دیں۔ وہ مسلسل اپنی رہائش بدلنے لگا۔ شاہ پادریوں کو بلوا کر اپنی اور اپنے اہلِ خانہ کی زندگی کی دعائیں کرواتا مگر جب ایک دعائیہ تقریب کے دوران بزرگ پادری دم توڑ گیا تو اس نے یہ مشق ترک کر دی۔

دو روز بعد اس مرض نے حیران کن جست لگائی۔ جرمنی کے دوسرے بڑے شہر ہیمبرگ میں اس کی علامات ظاہر ہوئیں۔ اندیشوں کا گھنٹا بجتے ہی پورے یورپ میں سراسیمگی پھیل گئی۔

جلد ہی اس نے وبائی شکل اختیار کر لی۔ ہزاروں جرمن اپنی زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔ ہیمبرگ انتظامیہ بے بسی کی تصویر بنی یہ تباہی دیکھتی رہی۔

ہیمبرگ کے واقعات نے مشرقی یورپ پر لرزہ طاری کر دیا تھا۔ وہاں کے حکمران عوام سے کٹ گئے اور محلوں میں دبک گئے۔

برطانیہ کے برعکس جرمنی کے معالجین نے زیادہ باریک بینی اور سنجیدگی سے اس مرض کا جائزہ لیا۔ انہوں نے انکشاف کیا کہ نکاسی آب کا ناقص نظام اس کے پھیلاؤ کی وجہ بن رہا ہے۔

اس انکشاف کے بعد مشرقی یورپ کے کئی ممالک میں نکاسی آب کے نظام میں بہتری کی مہم شروع ہوئی۔ بلدیہ کے ہزاروں کارکنوں کو کام پر لگا دیا گیا۔ رئیسِ شہر کو نگرانی کی ذمے داری سونپی گئی۔

یہ مہم بے ثمر گئی۔ کئی خاکروب صفائی کے دوران چل بسے۔ نگران بھاگ کھڑے ہوئے۔ کئی علاقوں میں یہ مشق روکنی پڑی۔

دسمبر میں یہ مرض دوڑتا پھنکارتا سوئٹزرلینڈ جا پہنچا۔ اس زمانے کی سرکاری دستاویزات میں اس ہلاکت خیز بیماری کا یوں بیان ملتا ہے:

”لوگ درد کی شکایت کرتے۔ کچھ دیر بعد اُن کے بدنوں سے بدبودار پسینا بہنے لگتا۔ دس سے بارہ گھنٹے میں وہ سسک سسک کر دم توڑ دیتے۔ یہ مرض ناقابلِ علاج ہے۔ اسپتالوں میں خاموشی چھائی ہے۔“

سوئٹزرلینڈ میں وبا پھیلنے کی خبر نے اردگرد کے ممالک کو چوکنا کر دیا۔ انہوں نے سرحدیں بند کر دیں مگر یہ پُراسرار بیماری سرحدوں کو خاطر میں لانے کا ارادہ نہیں رکھتی تھی۔ وہ جست لگا کر شمال کی سمت بڑھی۔ ڈنمارک، سویڈن اور ناروے میں اس کی علامات ظاہر ہوئیں۔ موت ناچنے لگی۔ ہزاروں افراد مارے گئے۔ جو درد کی شکایت کرتا، ان

میں کوئی ایک بھی زندہ نہیں بچتا۔ سیکڑوں لوگ اندھے ہوئے اور پھر موت کی تاریکی میں اتر گئے۔

پورا یورپ سکتے میں تھا۔ نظام زندگی مفلوج ہوگیا تھا۔ جنازے اٹھانے کے لیے لوگ کم پڑ گئے۔ کئی لاشیں تدفین سے رہ گئیں۔

جنوری میں ناروے کے ماہرین طب نے دعویٰ کیا کہ یہ مرض پینے کے پانی کے ذریعے پھیل رہا ہے۔ دریا آلودہ ہوگئے ہیں۔

یہ ایک ایسا بیان تھا جس نے یورپ کو حواس باختہ کر دیا۔ دریاؤں کے قریب واقع گاؤں اور قصبے خالی ہوگئے۔ لوگوں نے کئی کئی روز تک پانی نہیں پیا۔ جب مجبور ہوگئے تو ابال کر اور چھان کر پینے لگے۔ یہ نسخہ کارگر نہیں ہوا۔ ہلاکتوں کی تعداد ہنوز بڑھ رہی تھی۔

یہ مرض انسانی خون سے اپنی داستان رقم کر رہا تھا۔

☆☆☆

اُس زمانے میں ماسکو میں فاسیلی سوم کی حکومت تھی۔

وہ ایک گھاگ آدمی تھا۔ دشمن کی ہر چال پر گہری نظر رکھتا۔ باغیوں کو بھرے بازاروں میں پھانسی لگا دیتا۔ اس شاطر نے کبھی سوچا بھی نہیں ہوگا کہ مغربی سرحد سے ایک غیر مرئی فوج اس کی ریاست پر دھاوا بول دے گی۔

پولینڈ سے ہوتا ہوا یہ پسینا آور مرض اب وسیع و عریض روس میں داخل ہوچکا تھا اور ماسکو حیرت کے زیر اثر تھا۔ جتنی دیر میں فاسیلی سوم حالات کا اندازہ لگاتا، سیکڑوں افراد زندگی سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

دسمبر کے اواخر میں خبر آئی کہ موت کی ہوائیں فرانس اور اٹلی بھی پہنچ چکی ہیں۔

یہ بیماری اٹلی اور فرانس میں کیسے داخل ہوئی، اس کا پتا کبھی نہیں چل سکا۔ البتہ اس بات کی تاریخ گواہ ہے کہ اس نے دونوں ریاستوں میں اپنے پنجے گاڑ دیے۔ ہزاروں انسانوں کا خون چوسا۔ اپنے مکروہ قہقہوں سے شہروں کو ویران کردیا۔ دونوں ریاستیں لرز اٹھیں۔ ایک ہی گڑھے میں درجنوں لاشیں دفنائی جانے لگیں۔

دوسری جانب روس میں فاسیلی سوم کے شاہی طبیب نے اس مرض کے تدارک کے لیے ایک انوکھی ترکیب وضع کی۔

شہر میں منادی کروادی گئی کہ جونہی کسی شخص کے اس مرض میں مبتلا ہونے کا انکشاف ہو، ایسے اسباب کیے جائیں کہ اس کا مزید پسینا بہہ نکلے۔ یا تو اسے آگ کے نزدیک بٹھا دیا جائے یا اس پر گرم کمبل ڈال دیے جائیں۔

فوراً ہی اس حکم پر عمل درآمد شروع ہوگیا۔ دستاویزات میں ملتا ہے کہ اس برس موسم گرما میں کمبلوں اور لکڑیوں کی خرید ماسکو میں یکدم بڑھ گئی۔ یہ ٹوٹکا پہلے پولینڈ پہنچا، پھر مشرقی یورپ سے ہوتا ہوا اسی سرزمین میں داخل ہوا جہاں سے اس عذاب کا آغاز ہوا تھا۔

لندن میں یہ ٹوٹکا آزمایا جانے لگا۔ بھاری تعداد میں لکڑیاں اور کمبل خریدے گئے۔

یہ ٹوٹکا غارت گر ثابت ہوا۔ بخار میں تپتے ہوئے سیکڑوں مریض بھاری کمبلوں کے نیچے دم توڑ گئے۔ آتش دانوں کے قریب لاشیں ملیں اور ایسا ہر قریے میں ہوا۔

حکومت برطانیہ نے فوراً یہ ٹوٹکا ترک کردیا۔

اُسی زمانے میں ہالینڈ میں لوگ اس قاتل مرض کا شکار ہونے لگے۔ وہاں کی سرکار نے برطانیہ سے تمام سفارتی، تجارتی اور سیاحتی تعلقات منقطع کرلیے حکومت ہالینڈ کا خیال تھا کہ ان کے ہاں یہ مرض برطانیہ سے پہنچا ہے۔

دیگر ممالک میں تو پسینا آور مرض میں مبتلا شخص کا مزید پسینا نکالنے کا احمقانہ ٹوٹکا رد کردیا مگر روس میں اگلے کئی روز تک اس پر عمل کیا جاتا رہا، یہاں تک وزراء چلّا اٹھے۔ پادریوں نے کتاب مقدس اٹھالی۔

تب فاسیلی سوم نے اپنے شاہی طبیب کو بلوا کر دس جوتے لگوائے۔

گو اس مرض نے لاکھوں افراد کی جان لی مگر اس کا اثر طویل عرصے نہیں رہا۔ اس کے جراثیم کسی بھی قریے میں زیادہ سے زیادہ پندرہ روز زندہ رہتے۔

جونہی نیا سال شروع ہوا ماسکو اور لندن میں خوف کی دھند چھٹنے لگی۔ یہ مرض غائب ہوگیا۔ البتہ سوئزرلینڈ میں یہ مزید کچھ ماہ رہا۔

لندن میں سکون ہوگیا۔ ہنری ہشتم نے تمام مستقبل بینوں کو اکٹھا کیا۔ شاہی نجومی کی سربراہی میں ستاروں کی چال کا جائزہ لیا گیا۔ پانسے پھینکے گئے۔ تاش کے پتے استعمال ہوئے۔ عاملوں سے رائے لی گئی۔ جادوگروں سے رجوع کیا گیا۔

ایک ہفتے کی تحقیق کے بعد شاہی نجومی دربار میں پیش ہوا۔ اس نے دس صفحات پر محیط ایک رپورٹ پڑھی جس کے آخر۔ میں دعویٰ کیا کہ یہ مرض ہمیشہ ہمیشہ کے لیے برطانیہ سے رخصت ہوچکا ہے۔

"میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں اور میرا کوئی دعویٰ غلط ثابت نہیں ہوا۔ آپ کے مرحوم والد کی روح اس کی گواہ ہے۔" نجومی کی آواز میں گھن گرج تھی۔

شاہی نجومی خوش قسمت تھا۔ وہ زیادہ عرصے زندہ نہیں رہا۔ ورنہ ماسکو کے شاہی طبیب کی طرح اسے بھی بھرے دربار میں جوتے کھانے پڑتے۔

☆☆☆

وسیع و عریض جائداد کی مالک کیتھرین ولوبی جب بیاہی گئی تو اُس کی عمر فقط چودہ برس تھی۔ جب کہ اس کا شوہر پچاس برس کا تھا!

مگر یہ کوئی حیرت انگیز امر نہیں تھا۔ چارلس برینڈن سافک کاؤنٹی کا پہلا ڈیوک تھا۔ نظام حکومت میں اسے ایک طاقتور رئیس کے طور پر دیکھا جاتا۔ ہر لڑکی اس سے شادی کی خواہش مند تھی۔ مگر کیتھرین کا معاملہ کچھ اور تھا۔

چارلس برینڈن دراصل سابق شاہ برطانیہ ہنری ہفتم کا بھانجا اور داماد تھا۔ اس نے بادشاہ کی لڑکی میری ٹوڈور سے شادی رچائی، جو کچھ عرصے فرانس کی ملکہ بھی رہی۔

خدا نے اس جوڑے کو دو بیٹوں سے نوازا۔ بدقسمتی سے پہلا بیٹا فقط چھ برس کی عمر میں دنیا سے کوچ کرگیا۔ 1523 میں دوسرے بیٹے کی پیدائش ہوئی جسے ہنری برینڈن کا نام دیا گیا۔ اب وہ ہی ماں باپ کی امیدوں کا مرکز تھا۔ انہوں نے اس کے لیے دلہن کی تلاش شروع کردی۔

اُن کی نظر انتخاب رئیس ولوبی کے گھر ٹھہری جس کی جاگیر وسیع و عریض اور زرخیز تھی۔ وہاں پانی کے ذخائر تھے اور وہاں کے کسان جفاکش تھے۔

رئیس ولوبی کی ہونہار بیٹی کیتھرین جاگیر کی وارث تھی۔ لڑکی سمجھ دار تھی۔ میاں بیوی نے رشتہ بھیجنے کا حتمی فیصلہ کرلیا تھا کہ ان ہی دنوں میری اچانک بیمار پڑ گئی۔ بستر سے اس کی کمر ایسی لگی کہ وہ پھر اٹھ نہیں سکی۔ 1533 میں وہ انتقال کرگئی۔

یہ چارلس کے لیے بھاری صدمہ تھا۔ وہ بڑے بیٹے کی موت کا غم ہی نہیں بھلا سکا تھا کہ بیوی بھی ساتھ چھوڑ گئی۔ مگر گریہ کرنے کے لیے وقت پڑا تھا۔ اسے فوری فیصلے کرنے تھے۔ اس کے اکلوتے بیٹے ہنری کی عمر ابھی کم تھی۔ وہ فقط دس برس کا تھا۔ ولوبی کی وارث یعنی کیتھرین اس سے پورے چار برس بڑی تھی۔ چارلس ولوبی کی جاگیر نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ آخر کار اس نے اسی لڑکی سے شادی کا فیصلہ کرلیا جسے اُس نے اوائل میں اپنے بیٹے کے لیے چنا تھا۔

اور یوں وہ نوجوان جو کیتھرین کا متوقع شوہر تھا، اب وہ اسے ماں کہہ کر پکارنے لگا۔

کیتھرین کو اس کی پروا نہیں تھی۔ اس کا شوہر سافک کاؤنٹی کا رئیس تھا۔ ایک بااثر اور ذہین آدمی۔

ستمبر 1533 میں کیتھرین نئے گھر میں منتقل ہوگئی۔

بددعا کا اثر

توہم پرستی دنیا کا قدیم ترین مرض ہے۔ ٹیکنالوجی کی دنیا میں آنے والا انقلاب بھی اس کا تدارک نہیں کرسکا۔ جب سائنس کسی مسئلے کا جواب نہیں دے پاتی، محققین ناکام رہتے ہیں، تو توہم پرستی کی بیماری مزید شدت اختیار کرلیتی ہے۔

پسینا آور مرض کے بارے میں بھی سائنس چپ ہے۔ اسی خاموشی نے توہمات کو ہوا دی۔ یوں تو ایسے قصوں کی فہرست طویل ہے، مگر سب سے مشہور واقعہ رچرڈ سوم کی بددعا سے متعلق ہے۔

پندرہویں صدی کے آخر میں یارک اور لنکاسٹر خاندان کے درمیان تخت برطانیہ کے لیے محاذ آرائی کا آغاز ہوا۔ خانہ جنگی چھڑ گئی۔ معرکۂ بوسوورتھ میں یارک گھرانے کے سربراہ رچرڈ سوم کو شکست ہوئی اور ہنری ہفتم نے تخت سنبھالا۔

چند روایتوں کے مطابق جنگ میں کام آنے سے قبل رچرڈ نے بددعا دی تھی کہ جس تخت کے لیے اُسے قتل کیا گیا، وہ کانٹوں کا بستر بن جائے گا۔ اس پر بیٹھنے والا اپنی نسلوں کو روئے گا۔ نادیدہ قوتیں اس پر حملہ کریں گی... اور وہ جنازے اٹھاتے اٹھاتے ہلکان ہوجائے گا۔

گو بددعائیں سائنس کی کسوٹی پر خام نکلتی ہیں مگر عوام کی بڑی تعداد اُن کے اثرات پر آج بھی ایقان رکھتی ہے۔ پسینا آور مرض کو فکشن کا حصہ بنانے والے چند ادیبوں نے بھی رچرڈ کی بددعا کو بنیاد بنایا۔

اس کا سافک میں شان دار استقبال ہوا۔ شہر میں خوشیاں رقص کر رہی تھیں، مگر محل میں ایک آفت چھپی بیٹھی تھی۔ آفت، جس کی بابت ڈیوک کچھ نہیں جانتا تھا۔

بدقسمت رئیس اپنا بیٹا اور بیوی تو کھو ہی چکا تھا، شادی کے اگلے ہی برس دوسرا بیٹا ہنری برینڈن بھی بیمار پڑ گیا اور خاموشی سے موت کی وادی میں اتر گیا۔

کاؤنٹی میں سوگ کا کہرا چھایا تھا۔ ڈیوک ٹوٹ گیا۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اپنا سب کچھ کھو چکا ہے۔

خوش قسمتی سے کیتھرین اس لمحے اس کے ساتھ تھی۔ اس نے اپنے شوہر کو سنبھالا۔ اسے دھیرے دھیرے زندگی کی جانب واپس لائی۔

ڈیوک اس شام کئی ہفتوں بعد مسکرایا، جب اسے پتا چلا کہ اس کی حسین بیوی حاملہ ہے۔ وارث ملنے کی خوشی نے اسے قوت عطا کی۔ درد کی دھند چھٹی۔ وہ سنبھلنے لگا۔ بیوی نے اپنی جاگیر بھی اس کے نام کر دی تھی۔ سافک کی سرحدیں پھیل گئی تھیں۔ اس نئی ذمے داری نے بھی ڈیوک کے غموں کا بوجھ خاصا کم کیا۔

1535 میں کیتھرین نے ایک بیٹے کو جنم دیا، جس کا نین نقش اپنے باپ جیسا تھا۔ ڈیوک پھول کر کپا ہو گیا۔ اس لڑکے کو ہنری کا نام دیا گیا۔ محل میں جشن کا اہتمام ہوا۔ مجرموں کی سزائیں معاف ہو گئیں۔ کئی روز تک شاہی لنگر کھلا رہا۔ ٹھیک دو برس بعد چارلس کی پیدائش ہوئی۔

فاسک میں زندگی اپنی ڈگر پر جاری رہی تھی۔ ڈیوک اور اس کی بیوی خوش تھے۔

برطانیہ میں بھی زندگی جوبن پر تھی۔ پسینا آور مرض کو لوگ بھول چکے تھے۔ شاہ ہنری ہشتم کے دربار میں نجومی نے جو پیش گوئی کی تھی، قریے قریے میں اُس کی منادی کروا دی گئی۔

آج کی طرح اس دور میں بھی عوام حکمرانوں کی باتوں پر فوراً یقین کر لیا کرتے تھے۔ وہ بے چارے واقعی یہ سمجھنے لگے کہ یہ مرض کبھی نہیں لوٹے گا۔

وہ کس قدر غلط تھے۔

☆☆☆

1545 میں کئی اہم واقعات رونما ہوئے۔

اینکرم مور کی جنگ میں اسکاٹ لینڈ فاتح رہا۔ فرانس اور برطانیہ کے درمیان لولنت کا معرکہ ہوا۔ دونوں ملکوں کی فوجوں کے درمیان بونجرچ میں گھمسان کا رن پڑا۔ لاشوں کے ڈھیر لگ گئے۔ لیکن اگر کوئی کیتھرین سے پوچھتا کہ اس برس کون سا بڑا سانحہ پیش آیا، تو وہ پُرنم آنکھوں کے ساتھ ایک ہی جواب دیتی۔ ”آہ، مجھ بدقسمت نے اپنے پیارے شوہر کو کھو دیا!“

ہاں ڈیوک آف سافک کا انتقال ہو چکا تھا۔ جاگیر یتیم ہو گئی۔

اسے اس صدمے سے باہر... آنے میں خاصا وقت لگا۔ وہ اس قدر غم زدہ تھی کہ ہنری ہشتم کو.... سنبھالنے کی ذمے داری ملکۂ برطانیہ کو سونپنی پڑی۔

ملکہ سمجھ دار عورت تھی۔ اس نے سب سے پہلے بیوہ کو دونوں بچوں کی جانب متوجہ کیا۔ ”وہ ریاست کا مستقبل ہیں اور اب تم ہی ان کا سہارا ہو۔“

بڑا بیٹا اس وقت دس برس، جب کہ چھوٹا آٹھ برس کا تھا۔ وہ دبے پاؤں اپنی غم زدہ ماں کے پیچھے پیچھے چلا کرتے اور سمجھنے سے قاصر تھے کہ ان کا باپ کہاں چلا گیا۔

کیتھرین ان کی جانب متوجہ ہوئی تو غم کی قوت کم زور پڑنے لگی۔ جب زندگی کچھ ڈگر پر آئی تو سمجھ دار ملکہ کیتھرین کو دھیرے دھیرے احساس دلانے لگی کہ اب اُسے ہی جاگیر سنبھالنی ہے۔

”ہمت سے کام لو۔ اب جاگیر تمہاری ذمے داری ہے۔ جب بچے بڑے ہوں تو انہیں ایک خوش حال فاسک ملے، بجائے اس کے کہ وہ اپنے ماں باپ کو کوسیں۔“

بات کیتھرین کی سمجھ میں آ گئی۔ اس نے بچوں کے مانند جاگیر کو بھی بھرپور توجہ دی۔

نظامِ حکومت میں فاسک کی کاؤنٹی بے حد اہم تھی۔ کیتھرین کو اس کا احساس تھا۔ اس کی کوششوں نے جاگیر کو استحکام بخشا۔ مرکز نے بھی معاونت کی۔ وہاں زراعت نے خاصی ترقی کی۔ درس گاہیں اور طبی مراکز قائم ہوئے۔

دونوں شہزادوں کی تربیت بہترین اتالیق کی زیرِ نگرانی ہو رہی تھی۔ انہیں اعلیٰ درس گاہیں میسر آئیں۔ دھیرے دھیرے وہ شعور کی دہلیز عبور کرتے گئے۔

اپنے تہذیبی اطوار کے طفیل دونوں بچے شاہی خاندان کے دل میں گھر کر گئے۔ وہ سب کے چہیتے تھے۔

ہنری اب سولہ برس کا ہو گیا تھا۔ ذہانت اُسے ماں سے وراثت میں ملی تھی۔ گفتگو کا فن جانتا تھا۔ وہ اعتماد کے ساتھ چلا کرتا۔ جس محفل میں ہوتا توجہ کا مرکز بن جاتا۔ کئی بڑے رئیس گھرانے خواہش مند تھے کہ ہنری اُن کا داماد بن

جائے۔

چارلس اپنے باپ سا شجاع اور پُروقار تھا۔ عمر اس کی چودہ برس تھی۔ ریاستی امور میں وہ دل چسپی لینے لگا تھا۔ ہتھیاروں کے استعمال میں اس کی مہارت اشارہ تھی کہ وہ مستقبل میں فوج کی کمان سنبھالے گا۔

سچ تو یہ ہے کہ ان دونوں نے شاہی گھرانے کے دیگر نوجوانوں کو پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ وہ اپنی ذہانت، شجاعت اور اطوار کے باعث نظروں کا مرکز بن گئے تھے۔ فاسک کے عوام کو ان سے بہت امیدیں تھیں۔ ماں بھی انہیں دیکھ کر پھولے نہ سماتی۔

شاہ برطانیہ اکثر کہا کرتا تھا کہ اسے ان بچوں میں سلطنت برطانیہ کا اگلا حکمراں دکھائی دیتا ہے۔

کہتے ہیں، نظر انسان کو کھا جاتی ہے۔ شاید ان خوبرو نوجوانوں کے ساتھ ایسا ہی ہوا۔

سب کچھ دُرست سمت میں جا رہا تھا۔ اور تب... گھنے تاریک جنگلات میں عجب واقعات رونما ہونے لگے۔ چاند کو گہن لگا۔ تین ہرن دریا کنارے مردہ پائے گئے۔ لنگور غائب ہو گئے۔

موت کے عفریت نے انگڑائی لی تھی۔ وہ جاگ چکا تھا۔

☆☆☆

وہ ایک حبس زدہ دوپہر تھی۔ ہوا تھم گئی۔ درختوں کی شاخیں جھکنے لگیں۔ ایک عجیب سے بو فضاؤں میں تھی۔ دریا اپنی روانی کھو چکا تھا۔

کیتھرین صبح سے الجھن میں تھی۔ عجب اضطراب تھا جسے وہ کوئی نام دینے سے قاصر تھی۔

ناشتے کے بعد اسے خبر ملی کہ جنوب مشرقی گاؤں کے کھیتوں میں اچانک آگ بھڑک اٹھی ہے۔

اطلاع لانے والا بری طرح ہانپ رہا تھا۔ وہ بیمار معلوم ہوتا تھا۔

کیتھرین نے شہری امور کے وزیر کو حکم جاری کیا کہ اس مسئلے پر فوری توجہ دی جائے۔ پھر وہ اپنی خواب گاہ میں آ گئی۔

خواب گاہ کی کھڑکی کے سامنے ایک گھنا درخت تھا۔ وہاں ایک گھونسلا تھا۔ چڑیا نے ابھی ابھی انڈے دیے تھے۔

اچانک ایک قوی الجثہ پرندہ منظر میں ظاہر ہوا۔ وہ جست لگا کر نیچے آیا اور گھونسلے پر دھاوا بول دیا۔ اسے تار تار کر دیا۔ انڈے زمین پر جا گرے۔ پرندہ حبس زدہ دوپہر میں غائب ہو گیا۔ چڑیا کی کرب ناک پکار منظر پر چھا گئی۔

ظہرانے پر چارلس کچھ تاخیر سے پہنچا۔ وہ صبح جاگیر کے مغربی حصے کی طرف چلا گیا تھا۔ ہنری بھی خلافِ توقع چپ تھا۔ گو کوئی خاص بات نہیں تھی۔

کیتھرین کچھ مضطرب تھی۔ جب سے اس نے وہ منظر دیکھا تھا اسے ایک بے چہرہ اندیشہ کھائے جا رہا تھا مگر اس نے اپنے بچوں کے سامنے اس کا اظہار نہیں کیا۔

طعام کے بعد وہ تینوں خاموشی سے میز سے اٹھ گئے۔

کتب خانے کی جانب جاتے ہوئے ایک بوڑھے خادم نے اُسے افسر اطلاعات کا پیغام پہنچایا۔ ”ملکہ عالیہ، جس کھیت میں آگ بھڑک اٹھی تھی، اس کے کنارے چار کسانوں کی لاشیں ملی ہیں۔“

کیتھرین کی دھڑکن تیز ہو گئی۔

ظہرانے کے بعد خواب گاہ کی سمت بڑھتے ہنری کے سر میں شدید درد اٹھا۔ اس سے پہلے کہ خادم اسے سنبھالتا، وہ زمین پر آ رہا۔

محل کے ایک کمرے سے چارلس کی کرب انگیز چیخ سنائی دی۔ وہ بدقسمت اپنی بینائی کھو چکا تھا۔

کیتھرین تڑپ اٹھی۔ وہ اس حصے کی سمت دوڑی، جہاں شہزادوں کی خواب گاہیں تھیں۔ دونوں بھائیوں کی حالت حیران کن حد تک یکساں تھی۔ وہ اپنے نرم بستروں پر سر تھامے بیٹھے تھے اور بینائی سے محرومی پر گریہ کر رہے تھے۔

فوراً طبیب بلائے گئے۔ علامات دیکھ کر ان کی سٹی گم ہو گئی۔ سر اور کاندھے سے شروع ہونے والا درد اب پورے بدن میں پھیل گیا تھا۔ بخار سے ان کا جسم تپ رہا تھا۔ پسینے سے بستر گیلے ہو گئے۔

انہیں دو بستروں پر، ایک دوسرے کے پہلو میں لٹا دیا گیا۔ ان کی ماں درمیان میں کرسی رکھ کر بیٹھ گئی۔ گرم دوپہر یاسیت زدہ شام میں تبدیل ہوئی۔ تیز رفتار ہرکاروں نے لندن خبر پہنچا دی۔ بادشاہ کے پیروں تلے سے زمین نکل گئی۔ شاہی طبیب کو روانہ کیا گیا۔

شہر فاسک میں شہزادوں کی بیماری کی خبر جنگل کی آگ کی طرح پھیلی۔ عوام سکتے میں تھے۔

ہنری اور چارلس کا بخار بڑھتا جا رہا تھا۔ ان کے لیے سانس لینا مشکل ہو گیا۔ دھڑکن ڈوبنے لگی۔ وہ بستر سے

اترنے کے قابل نہیں رہے تھے۔ غشی ان پر طاری ہو گئی۔

بے بس ماں یاس کی تصویر بنی بیٹھی تھی۔ کوئی امید نہیں تھی۔ کوئی سہارا نہیں تھا۔ وہ اپنے بچوں کو، جاگیر کے مستقبل کو کل کے حکمرانوں کو دم توڑتے دیکھ رہی تھی۔

”ماں مجھے ڈر لگ رہا ہے۔“ ہنری کی کمزور آواز خواب گاہ میں لرزی۔

وہ فوراً آگے بڑھی۔

”میرے بیٹے۔“ آواز رندھی ہوئی تھی۔ اس نے ہنری کا ہاتھ تھام لیا جو تپ رہا تھا۔

لڑکا غنودگی میں تھا۔ وہ دھیرے دھیرے کراہ رہا تھا۔

کیتھرین نے ٹھنڈے پانی کی پٹیاں ہنری اور چارلس کے ماتھوں پر رکھیں۔ دُکھی ماں انہیں لوریاں سنانے لگی۔ لوریاں جو وہ انہیں بچپن میں سنایا کرتی تھی۔ جنہیں سن کر وہ بہل جاتے تھے۔

محل میں یاسیت کا آسیب حرکت کر رہا تھا۔ شہر خوف زدہ تھا۔ شہزادے اندھیرے میں اتر رہے تھے۔

ماں کی لوریاں خاموش ہو گئیں۔ اب اس کی جگہ دعاؤں نے لے لی۔

شاہی طبیب جب خواب گاہ میں داخل ہوا، تیزابی بو اس کے نتھنوں سے ٹکرائی۔ وہ اس بو کو خوب جانتا تھا۔

”وہی ہے۔ سو فیصد۔“ اس نے دھیرے سے کہا۔

1551 کے موسم گرما کی وہ رات... قاتل رات تھی۔

فاسک کی تاریخ میں اس جیسی منحوس رات کا ذکر نہیں ملتا۔ راویوں نے اس کا ذکر ایک خاص نوع کے کرب اور ہیبت کے ساتھ کیا۔ وہ اسے بدقسمتی کی رات قرار دیتے ہیں۔ بدقسمتی... جو برینڈن خاندان کے تعاقب میں تھی، جو اس کے وارثوں کو ایک ایک کر کے چاٹ رہی تھی۔

ایک راوی لکھتا ہے ”پہلے جاگیر اپنے دونوں وارثوں سے محروم ہوئی... ڈیوک کی بیوی میری سے ہونے والے لڑکے ہلاک ہوئے۔ کچھ برس بعد اُسے بھی موت نے آ لیا۔ اور اس رات دونوں شہزادے ناقابلِ علاج مرض کا شکار بنے... ریاست کا مستقبل بستر پر پڑا دم توڑ رہا تھا۔“

ہاں، وہ قاتل رات تھی۔ پہلے ہنری کی آنکھیں بند ہوئیں۔ کچھ دیر بعد چارلس کا سانس تھم گیا۔ کیتھرین ان وحشت ناک لمحات کی گواہ بنی۔

محل کی بتیاں بجھا دی گئیں۔ شاہی طبیب لوٹ گیا۔ شہر میں سوگ کا اعلان کر دیا گیا۔

شہزادوں کی تدفین کے موقع پر پورا شاہی خاندان موجود تھا۔ ہر چہرے پر یاسیت تھی۔ ہر آنکھ نم تھی۔ وہ بھاری غم تھا۔ برطانیہ صدمے میں تھا۔

انہیں اُن کے باپ کے پہلو میں دفنایا گیا۔ کیتھرین نے اسی شام ان کے کپڑے جلانے کا حکم صادر کر دیا۔ وہ اتنی غم زدہ تھی کہ اپنے بچوں کی یاد دلانے والی کوئی شے اپنے پاس نہیں رکھنا چاہتی تھی۔

شاہ کے حکم پر برطانیہ میں ایک ماہ سوگ منایا گیا۔ فاسک پورے برس غم زدہ رہا۔

☆☆☆

شہزادوں کی موت کی خبر ملتے ہی پڑوسی ممالک نے اپنی سرحدیں بند کر دیں۔ ہنری ہشتم کی ریاست دنیا سے کٹ گئی۔

یہ پانچواں منحوس موقع تھا، جب پسینا آور مرض نے برطانیہ پر حملہ کیا، مگر اس بار اُس نے عجیب چال لی۔ ایک چھاپا مار سا رویہ تھا اس کا۔

کبھی وہ کسی شہر میں ظاہر ہوتا، ایک رات اپنا قہر ڈھاتا، پھر غائب ہو جاتا۔ پھر خبر آتی کہ اس بیماری نے دور کسی قصبے میں کارروائی کی ہے۔ کچھ روز خاموشی رہتی۔ پھر پتا چلتا کہ اس نے لندن کے مضافات میں چند جانیں لے لیں۔

ایک صبح کچھ یوں ہوا کہ مچھیروں کو دریا میں ایک کشتی ڈولتی ملی، جس کے سوار ابدی نیند سو رہے تھے۔ سرائے کے کمروں سے لاشیں ملنے لگیں۔ خودکشی کا رجحان بڑھ گیا۔ چوری اور ڈکیتی کی وارداتوں میں بھی تیزی دیکھی گئی۔ لوگوں کو راستے میں لوٹا جاتا اور قتل کر دیا جاتا۔

شاہ نے ملک میں ہنگامی حالات نافذ کر دیے۔

شہزادوں کی موت کے چند روز بعد یکدم خاموشی چھا گئی۔ بری خبروں کی آمد دم توڑ گئی۔ حالات میں سدھار آنے لگا۔ اگلے کئی ہفتوں تک مرض کی کوئی خبر نہیں ملی۔

اس عہد کے معروف برطانوی معالج جان کائیس نے اس پُراسرار بیماری سے متعلق ایک طویل کتاب لکھی، جس کا ایک اقتباس یہاں نقل کیا جا رہا ہے:

”کمر اور کاندھے کا درد اس مرض کی ابتدائی علامت ہیں۔ پھر مریض جگر اور معدے میں درد کی شکایت کرتا۔ پھر وہ سر تھام لیتا۔ چوتھی علامت یہ تھی کہ اس کا دل ڈوبنے لگتا۔

مریض زور زور سے سانس لیتا۔ ایک دن سے زیادہ زندہ نہیں رہتا۔"

ڈاکٹر جان نے علامات تو بیان کیں، مگر وہ اس کے اسباب پر روشنی ڈالنے میں زیادہ کامیاب نہیں رہے۔ انہوں نے بھی اپنے پیش روؤں کی طرح اِس کی وجوہات کو نامعلوم قرار دیا۔

1551 میں یہ وحشت ناک مرض آخری بار ظاہر ہوا۔ بعد کی تاریخ میں اس ہلاکت خیز وبا کی خبر نہیں ملتی۔

ہاں... 1718 اور 1861 میں فرانس کے صوبے پکارڈی میں اس سے ملتی جلتی بیماری ظاہر ہوئی تھی مگر وہ اتنی ہلاکت خیز ثابت نہیں ہوئی۔ چند سو ہی اموات ہوئیں۔

پسینا آور مرض ایک معما بن گیا۔

کوئی نہیں جان سکا کہ یہ کہاں سے آیا؟ اس کی وجوہات کیا تھیں؟ اِس بات کا بھی تعین نہیں ہوسکا کہ یہ معتدی تھا یا نہیں؟

یہ کیوں اچانک غائب ہوا، یہ ہم نہیں جانتے۔ البتہ یہ ضرور جانتے ہیں کہ اس بیماری نے کس قدر تباہی مچائی۔ غیر سرکاری اعداد و شمار کے مطابق تیس لاکھ افراد اس ہیبت ناک مرض کے ہاتھوں اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے اور کروڑوں گھر بے سہارا ہوئے۔

☆☆☆

وقت گزرتا رہا۔ صدیاں بیت گئیں۔

آنے والے برسوں میں کئی معالجین نے اس مرض پر تحقیق کی، مگر کچھ حاصل نہیں ہوا۔ وہ اس کے اسباب نہیں جان سکے۔ اس کا بڑا سبب یہ تھا کہ اُس صدی کے معالجین نے مریضوں کے خون اور رطوبتوں کے نمونے محفوظ نہیں کیے تھے جس کے باعث ٹھوس بنیادوں پر جانچ ممکن نہیں رہی۔

چونکہ مرض دوبارہ ظاہر نہیں ہوا، اس کے لیے حکمران بھی اسے بھول گئے۔ آخرکار بیسویں صدی کے آخر میں اس مرض پر سنجیدہ تحقیق کا آغاز ہوا۔

برطانیہ کے تین معالجین ڈاکٹر گائے تھوایٹس، ڈاکٹر مارک ٹیوریز اور ڈاکٹر وانیا گینٹ نے اس مرض پر کام کیا۔ انہوں نے اس زمانے کی دستاویزوں کا جائزہ لیا۔ ان معالجین کے روزنامچوں سے رجوع کیا، جنہوں نے اس بیماری کے شکار بننے والوں کی تشخیص کی تھی۔

ان کی تحقیق "نیو انگلینڈ جرنل آف میڈیسن" میں شامل ہوئی۔ تینوں ڈاکٹروں کے مطابق اس مرض کا سبب ایک خاص قسم کے چوہوں کا فضلہ تھا، جس میں ہینٹا وائرس نامی جراثیم پایا جاتا ہے۔ چوہوں سے یہ وائرس ان پسوؤں میں منتقل ہوا جو اُن کے بالوں میں پلتے ہیں۔ اور وہاں سے یہ انسانی آبادیوں میں آیا اور وبائی شکل اختیار کر گیا۔

رپورٹ میں یہ وضاحت بھی کی گئی کہ مفروضہ دستیاب معلومات کی بنیاد پر قائم کیا گیا، حتمی طور پر کچھ کہنا اسی وقت ممکن ہوگا جب کسی مریض کے خون کا ٹیسٹ کیا جائے۔

اِس رپورٹ پر ملا جُلا ردِعمل آیا۔ چند حلقوں نے اس مفروضے کو دُرست قرار دیا۔ البتہ چند نے اسے غیر حتمی ٹھہرایا۔

اِس رپورٹ کو رد کرنے والے افراد برطانیہ کے جغرافیے کو جواز کے طور پیش کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جس رفتار اور جس طریقے سے مرض پھیلا، اسے دیکھتے ہوئے چوہوں کو اُس کی اکلوتی وجہ قرار دینا کسی طور درست نہیں۔ انہوں نے وبا کے درمیانی وقفوں کی بابت بھی کئی اہم سوال اٹھائے۔

سب سے اہم سوال یہ تھا کہ آخر یہ مرض غائب کیوں ہوگیا۔

اس کا جواب کسی کے پاس نہیں تھا۔

☆☆☆

کیا یہ مرض آج بھی کرۂ ارض پر موجود ہے؟

ہم اس بابت کچھ نہیں جانتے۔ اور اسی لاعلمی سے خوف جنم لیتا ہے۔ پسینا آور مرض ایک ایسا انسانی دشمن ہے، جس کا کوئی چہرہ نہیں۔ کوئی بُو نہیں۔ اس کی آمد کا اندازہ اس وقت تک نہیں لگایا جاسکتا، جب تک وہ خود کو ظاہر نہ کردے۔

تاریخ میں پانچ مرتبہ اس نے اپنا مکروہ چہرہ ظاہر کیا اور ہر بار ہزاروں انسانوں کو نگل لیا۔ اگر وہ چھٹی بار ظاہر ہوا تو قوی امکان ہے کہ سیکڑوں جانیں جائیں گی۔

"نیو انگلینڈ جرنل آف میڈیسن" میں شائع ہونے والی رپورٹ بھی اندیشوں کو ہوا دیتی ہے۔ دنیا میں چوہوں کی کئی اقسام پائی جاتی ہیں۔ کئی ایسی ہیں، جن کی بابت سائنس دان یکسر لاعلم ہیں۔ ممکن ہے کہ ان میں کوئی قسم آج بھی اس وائرس کی پرورش کررہی ہو اور ایک روز یہ خاموشی سے انسانوں میں منتقل ہوجائے۔

زمانے کے ساتھ مزاج، انسانی رویّے، ریت و رواج تبدیل ہوجاتے ہیں۔ زبان و ادب بھی اس اثر پذیری کے زیرِ اثر نظر آتے ہیں برصغیر میں ادبی رشحات صرف فارسی میں ڈھلتے تھے۔ اردو تو بہت بعد میں سامنے آئی۔ اس دور میں جب ادبی زبان فارسی تھی، ایک بہت بڑا نام نظر آتا ہے۔ وہ نام بیدل عظیم آبادی کا ہے جس کا ذکر بیدل دہلوی کے نام سے بھی کیا گیا ہے۔ عظیم آباد (پٹنہ، بہار) کا یہ عظیم شاعر کس پائے کا تھا اس کا اندازہ لگانے کے لیے اتنا کہنا ہی کافی ہے کہ مرزا غالب و علامہ اقبال بھی اس کے معتقد تھے۔ اس کے مضامین اپنے اشعار میں ڈھالنا فخر سمجھتے تھے۔

شاہد جہانگیر شاہد

اس عظیم شاعر کا تذکرہ جسے ہم نے بھلا دیا ہے

سلطنتِ مغلیہ اپنے پورے شباب پر تھی۔ شاہ جہان لال قلعہ میں تختِ طاؤس پر جلوہ افروز تھا اور دادِ جہانبانی دے رہا تھا۔ شاہ جہان کا دورِ حکومت (1038-1069 ہجری مطابق 1628-1658 عیسوی) ہندوستان کے مسلم حکمرانوں میں سب سے زیادہ خوشحال تھا۔ تخت نشینی کی جنگ کے سوا شاہ جہان اپنی تمام لڑائیاں اپنے والد شہنشاہ جہانگیر کے عہد میں لڑ چکا تھا۔ اسے نسبتاً پُرامن دور ملا تھا۔ کیونکہ تمام بغاوتیں کچلی جاچکی تھیں، سلطنت کے تمام باغی

کیفرِ کردار کو پہنچ چکے تھے یا سلطنتِ مغلیہ کی حدود سے راہِ فرار اختیار کر چکے تھے۔ تخت نشینی کی جنگ کے خاتمے اور امن و امان کی بحالی کے بعد شاہ جہان نے اپنے عوام کی خوشحالی اور فلاح و بہبود کے کاموں کی جانب توجہ مبذول کی۔ خوش قسمتی سے اسے خزانے بھرے ہوئے ملے۔ جسے اس نے کھلے دل سے عوام کی خوشحالی پر خرچ کیا۔ عوام کو ضروریاتِ زندگی انتہائی سستے داموں میسر کرائیں۔ اس دور میں بازاروں میں غلے کی فراوانی تھی۔ ذخیرہ اندوزی ناقابلِ معافی جرم تھا۔ یہی وجہ تھی کہ عوام بہت خوش تھے اور بادشاہ سے محبت کرتے تھے۔

فلاحی کاموں سے فراغت ملی تو شاہ جہان نے تعمیراتی کاموں کی طرف توجہ دی۔ تباہ ہونے والے قلعوں اور محلات کی مرمت اور تعمیرِ نو کروائی۔ لال قلعہ دہلی، جامع مسجد دہلی، شاہی قلعہ لاہور ، شیش محل و نولکھا لاہور تعمیر کروایا۔ لاہور و کشمیر میں شالامار باغ بنوائے۔ ان کے علاوہ بھی بہت سے شہروں میں قلعہ جات تعمیر کرائے۔ محل اور دیگر بہت سی خوبصورت عمارات بنوائیں۔

تختِ طاؤس اور تاج محل جیسا نادر روزگار عجوبہ معرضِ وجود میں آچکا تھا۔ اسی خوش ذوقی اور تعمیرات کی بدولت شاہ جہان کو تاریخ میں معمار یا انجینئر بادشاہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

اسی خوشحال دور میں صوبہ بنگالا کا سب سے اہم شہر عظیم آباد (پٹنہ) بھی ترقی یافتہ شہر کہلا رہا تھا۔ اس شہر میں بھی کئی اہم عمارات وجود میں آچکی تھیں۔ دور دور سے علم پرور کھنچے آرہے تھے۔ انہی میں ایک کا گھرانا بھی تھا۔ یہ گھرانا تصوف پسند تھا۔ اسی گھرانے میں سن 1054ھ میں مرزا عبدالقادر کی پیدائش ہوئی۔ مرزا عبدالخالق کے اجداد کا تعلق مغل ارلاس قبیلے سے تھا۔ وہ بخارا سے ہجرت کرکے ہندوستان آئے تھے اور عظیم آباد (پٹنہ) میں رہائش اختیار کی تھی۔ مغل دربار سے وابستہ تھے پیشہ سپاہیانہ تھا۔ عبدالقادر ابھی ساڑھے چار سال کے تھے کہ ان کے والد گرامی کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ اب بچے کی پرورش کی تمام ذمّے داری ان کے چچا مرزا قلندر کے سر آپڑی تھی۔

مرزا قلندر بچے کے سگے چچا نہیں تھے۔ لیکن والدہ دونوں کی ایک تھیں۔ گویا وہ عبدالخالق کے سوتیلے بھائی تھے۔ دونوں بھائیوں میں بے حد محبت تھی۔ اخلاص کا جذبہ کارفرما تھا۔ چھٹے سال کے چھٹے مہینے میں عبدالقادر کو اس کی والدہ نے ابجد سکھانا شروع کیا۔ سات ماہ تک ورق گردانی ہوتی رہی۔ سال کے اختتام تک اس نے قرآن مجید پڑھ لیا۔ پھر مدرسہ کی تعلیم شروع ہوگئی۔ اسی دوران ایک اور افتاد آپڑی۔ اس کی والدہ کا سایہ بھی سر سے اٹھ گیا۔ اب وہ بالکل یکا و تنہا تھا۔ ایسے وقت میں چچا مرزا قلندر آگے آئے اور اسے اپنی آغوشِ پرورش میں لے لیا۔ دسویں سال تک عربی اور فارسی کی تعلیم جاری رہی۔

ابھی وہ بلوغ کو نہیں پہنچا تھا کہ تحصیلِ علم کی کوشش چھوڑ دی۔ چونکہ بچپن ہی سے اولیائے کرامؒ کی محبت دل میں تھی۔ گھرانا بھی تصوف پسند تھا اس لیے تصوف کے رموز سے اوائل عمری میں ہی آگہی ہوگئی۔ چنانچہ جب باقاعدہ شاعری شروع کی تو اس نسبت سے "رمزی" تخلص اختیار کیا لیکن جب ایک روز گلستانِ سعدیؒ کا دیباچہ پڑھا اور اس شعر پر پہنچے۔

گر کسی اُو زمن پُرسد

بیدل از بے نشان چہ گوید باز

مذکورہ شعر پڑھتے ہی طبیعت پر اہتزاز کی کیفیت طاری ہوگئی۔ خداوند تعالیٰ کی عظمت و کبریائی اور محبت کے متعلق دل میں جو جذبات و احساسات تھے، یک لخت ابل پڑے۔ دیر تک بے حال رہا۔ زبان پر بار بار یہ مصرع آتا تھا۔

بیدل از بے نشاں چہ گوید باز

اس کا تحت الشعور جن کیفیات اور خیالات سے لبریز تھا اس مصرع کا لفظ "بیدل" اسے ان کی پوری پوری ترجمانی کرتا محسوس ہوا۔ وہ سوچنے لگا کہ جس معبودِ حقیقی کی عبادت کا حق ادا کرنا بڑے سے بڑے عبادت گزاروں کے لیے ناممکن ہے۔ جس کی ذاتِ پاک کا کما حقہ عرفان حاصل کرنا خود انبیاؑ اور اولیاؒ کے لیے امرِ موہوم ہے۔ جملہ کمالات کے اس خالق کا وصف وہ ناچیز انسان کیسے بیان کرسکتا ہے جو عشق کے پہلے داؤ میں دل ہار بیٹھا ہو اور جس کا پہلو اب دل سے بالکل خالی ہے۔ اس حالت میں وہ اظہارِ عجز سے زیادہ اور کیا کرسکتا ہے۔ اسی لیے اسے صاف نظر آیا کہ رمزی تخلص رکھنا جسارت ہے۔ چنانچہ فاتحہ پڑھنے کے بعد اس نے حافظ شیرازیؒ کی روحِ پُرفتوح سے فال کے ذریعے استمداد لی اور اپنا تخلص بیدل رکھ لیا۔

والد گرامی، حضرت شیخ کمالؒ کے مرید و خلیفہ تھے اور حضرت شیخؒ کے توسط سے حضرت غوث الاعظم سیدنا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ سے منسلک تھے اور چچا مرزا قلندر کو بھی ان پر فخر تھا۔ حضرت شیخؒ نے اس کی پیدائش کی دو تاریخیں کہیں "فیضِ قدس/ 1054ھ اور "انتخاب/ 1054ھ"۔

وہ اپنے چچا مرزا قلندر کے ساتھ اکثر شیخ کمال کی محفل میں حاضری دیا کرتا تھا۔ ایک روز حضرت شیخ نے مرزا قلندر کو جن اتارنے کے لیے ایک اسم بتایا جو اس کے ذہن نشین ہوگیا۔ ان دنوں وہ بہت کم سن تھا۔ ہر چیز کو تفریح کے زمرے میں لے آتا تھا، اس اسم کو بھی اس نے تفریح کا ذریعہ بنالیا کہ وہ کبھی عاملوں کی طرح ہونٹ ہلاتا اور کبھی مریض کے سر پر ہاتھ پھیرتا۔ کبھی اپنے گلے کا تعویذ مریض کی گردن میں ڈال کر سورہ فاتحہ پڑھتا تھا۔ اگرچہ یہ حرکتیں طفلانہ تھیں مگر فضلِ ایزدی سے بیماروں کو صحت ہوجاتی تھی۔ پھر جب حروف و خطوط کی تمیز ہوئی تو جہاں کہیں بھی کوئی دعا نظر آئی اسے لکھ لیتا اور یاد کرلیتا۔ ایک دن وہ ساتھیوں کے ساتھ کھیل رہا تھا کہ اسے معلوم ہوا کہ نزدیکی گھر میں ایک عورت پر جن آیا ہوا ہے اور وہ دو دن سے بے ہوش ہے۔ عاملوں کا ایک گروہ مسلسل ہرمل کی دھونی دے رہا ہے لیکن کچھ فائدہ نہیں ہورہا۔ اچانک حفظ کردہ عمل کے امتحان کا خیال آیا۔ گھر کے ایک فرد کو بلا کر وہی اسمِ اعظم اس کی انگلی پر دم کردیا تاکہ مریضہ کے کان میں ڈالے۔ عمل کرتے ہی جن چیخ پڑا اور وہاں سے رفو چکر ہوگیا۔

جب حضرت شیخ کمالؒ کو اس بات کی خبر ہوئی تو آپ نے اسے بلوا کر پوچھا کہ اس طرح کے عملیات محض خیالی نہیں ہوتے۔ تمہیں کہاں سے علم ہوا؟ اس نے عرض کیا کہ آپ ہی سے سیکھا ہے۔ چنانچہ آپ کی رحمت نے جوش مارا۔ فرمایا کہ آج تک ہم نے جو عملی فوائد حاصل کیے ہیں وہ اس کام کے عوض تمہارے حوالے کیے۔ باخبر ہو کہ تمہارا طالع سلیمانی نظر، اور تمہارا دم عیسوی اثر ہے۔

مرزا قلندر چچا ہونے کے ساتھ ساتھ اس کے استاد بھی تھے۔ ان کی پیل تنی، (ہاتھی جیسی طاقت) کا یہ عالم تھا کہ اکثر لوہے کی چیزیں جو ہتھوڑے سے بھی سیدھی نہیں ہوتی تھیں ہاتھ سے سیدھی کردیتے تھے۔ جس فوج کی سرداری کرتے اسے لازمی فتح نصیب ہوتی۔ اُمّی ہونے کے باوجود موزوں طبع تھے۔ ان کے خصائص میں یہ تھا کہ ان کے سایہ میں سانپ، بچھو اور دیگر زہریلے حشرات الارض مرجاتے تھے۔ مرزا عبدالقادر کی تربیت، آداب و اخلاق کی تعلیم میں وہ پوری توجہ فرماتے تھے بلکہ اس کی شاعری بھی انہی کی خداداد طبیعت کا عکس تھا۔ ایک دن مدرسہ میں جلسہ تھا۔ دو مولوی صاحبان کو دورانِ بحث ایک دوسرے سے فحش کلامی کرتے سن کر اسے مدرسہ سے اٹھالیا اور فرمایا۔ "یہ بے عقل زندگی بھر تعلیم حاصل کرتے ہیں اور اس کے بعد غرور یا پشیمانی چنانچہ درس سے منع کردیا اور فرمایا کہ تحقیق کتابوں کی پابند نہیں۔ تمہاری تاریخ پیدائش فیضِ قدس اور انتخاب سے ظاہر ہے کہ تم میں کمال کی استعداد موجود ہے۔ کلام نظم و نثر کا مطالعہ کیا کرو اور پسندیدہ اشعار اور نثر کے قابلِ قدر حصے علیحدہ لکھ کر ہر شام مجھے سنایا کرو چنانچہ اس کا انتخاب سن کر بعض اوقات بڑے متاثر ہوتے تھے۔ فی البدیہہ شعر کہنے لگ جاتے تھے حالانکہ مرزا قلندر اُمّی محض تھے مگر طبعِ موزوں قدرت کی طرف سے انہیں ملی تھی۔

جب اس کی عمر دس سال ہوئی ان دنوں اس کا ایک ہمدرد دوست اکثر اپنے منہ میں لونگ رکھے رہتا تھا۔ اس کی خوشگوار خوشبو سے متاثر ہوکر قادر نے پہلی رباعی منظوم کی۔

جب بھی فکر میں اہتزاز ہوتا ، بے اختیار کوئی مصرع موزوں ہوجاتا۔ دوستوں کی ترغیب سے تالیف کا شوق ہوا اور چند شیرازے مرتب کیے۔ سن 1076ھ میں مرزا قلندر فوت ہوئے تو اس نے مرثیہ لکھا اور یہ تاریخ کہی۔

قلندر یافت وصلِ جاودانی/ 1076ھ

ایک دن حضرت شاہ ابوالفیض معانیؒ پٹنہ میں اس کے ماموں مرزا ظریف کے گھر کو زینت بخشے ہوئے تھے اس نے یہ رباعی موزوں کرکے ان کی خدمت میں پیش کی۔

بیدل ز غم و نشاط دوران بگذر

از بیش و کم مشکل و آساں بگذر

در گلشنِ دھر چون نسیم دمِ صبح

آزادہ و رائے دامن افشاں بگذر

رباعی پڑھ کر حضرت نے فرمایا۔ اس کلام سے کمال کی بو آتی ہے۔ اس کم عمری میں ایسا پختہ مذاق، ندرت اور قدرت کی دلیل ہے۔

اسی زمانے میں اردو جسے ریختہ کے نام سے پکارا جاتا تھا وہ اس زبان میں بھی شعر کہنے لگا۔ جب بیدل بہار کو الوداع کہنے لگا تو آخری ملاقات کے لیے اپنی مہربان ایک کنجڑن کے پاس گیا۔ رخصت ہوتے وقت اس نے فی البدیہہ کہا:

سر پر جب کوئی نہیں، تب دشمن آپن کیس

پٹنہ نگری جھاڑ دیں، اب بیدل چلے بدیس

اس کا جواب کنجڑن نے بھی فی البدیہہ دیا:

سر پر مایہ رام ہے پکن، کاہ بدلے بے صبری

بیدل نگری کرمت چھاڑو پوتا آپن نگری

ایک مدت وہ متھرا میں مقیم رہا۔ ایک دن ایک دوست نے جس کے ذمے قریب کے قلعہ کا انتظام تھا یہ فریاد کی کہ تین سال سے زیادہ عرصہ ہو رہا ہے کہ اس قلعہ پر جنوں کا ہجوم ہے اور وہاں کے مکین خوف میں مبتلا ہیں۔ اسی وقت یہ شعر موزوں کیا۔

یا عفاریت جہانِ دیگر
جائے کم نیست مکانِ دیگر

ایک جھنڈے پر مذکورہ شعر لکھ کر آسیب کی جگہ نصب کر دیا۔ وہ تین سال مزید وہاں رہا لیکن قلعہ میں آنے جانے والوں سے یک زبان یہی سنا کہ اس وقت سے اب تک اس آسیب کا کوئی نشان نہیں۔

شاہ صاحب سرائے بنارس میں جو بہار کے نواح میں ایک جگہ تھی، ایک درخت کے نیچے رہتے تھے۔ بھوک پیاس سے بے نیاز تھے۔ ایک بار مرزا قلندر کو قصبہ رانی ساگر، میں جو حضرت مولانا کمالؒ کا وطن تھا ٹھہرنا پڑا۔ سرائے بنارس سے رانی ساگر کا فاصلہ ایک کوس سے زیادہ نہیں تھا۔ اس لیے شاہ ملوکؒ اکثر قدم رنجا فرماتے تھے اور ہفتوں اس کی کٹیا میں ٹھہرتے تھے ایک بار چند قلندروں نے آپ سے بے ادبی کی، اچانک آپؒ کی برقِ غیرت کوندی نتیجہ یہ ہوا کہ وہ سب آپس میں ہی الجھ پڑے یہاں تک کہ ایک دوسرے کو جان سے مار ڈالا۔

سن 1071ھ میں عبدالقادر کے ماموں مرزا ظریف اڑیسہ کے سفر پر روانہ ہوئے اور اسے بھی ساتھ چلنے پر مجبور کیا۔ ان دنوں شاہ صاحب بھی ہندوستان کی سیر کرتے ہوئے اس علاقے میں مقیم تھے۔ تین سال تک مرزا ظریف ان سے فیض حاصل کرتے رہے اور وہ طفیلی بنا رہا۔ ان دنوں خان دوران سید محمود اڑیسہ کا حاکم تھا۔ اتفاق سے اس کے ناخن زہر آلود ہو گئے اور سارا جسم زخموں سے بھر گیا۔ جب حکماء اس کے علاج سے عاجز آ گئے تو اس نے روحانی مدد طلب کی۔ بارہا شاہ صاحب کی خدمت میں پیغام بھجوایا مگر آپ نے توجہ نہ دی۔ آخر کار مرزا ظریف درخواست کرنے خود پہنچ گئے مرزا کے کہنے پر آپؒ وہاں تشریف لے گئے اور اس پر ایک نظر ڈالی۔ بس وہی ایک نظر ڈالنا کافی تھا۔ اس کا سارا مرض جاتا رہا اور چند ہی دنوں میں سارے زخم بھر گئے اور اس نے غسلِ صحت کر لیا۔

اس واقعہ نے ذہن پر ایسا اثر دکھایا کہ سفر گویا زندگی کا حصہ بنالیا اور کٹک، جا پہنچا دریا کے کنارے مقیم ہوا۔ ایک دن مرزا ظریف سے تفسیر پڑھ رہا تھا کہ ایک فقیر نے آکر یہ مژدہ سنایا کہ شاہ صاحب تمہارے پاس آ رہے ہیں۔

یہ کوئی معمولی بات نہ تھی۔ محوِ انتظار... فرشِ راہ بنی نظریں منتظر تھیں کہ آپ تشریف لے آئے۔ آتے ہی فرمایا الحمدللہ! ہم تم ایک ہی شہر میں مقیم ہیں۔ اس کے بعد آپؒ نے چند آیتوں کی تفسیر فرمائی۔ مرزا نے سر آپ کے قدموں پر رکھ دیا اور عرض کیا میں چالیس سال تک مدرسوں کی خاک چھانتا رہا ہوں لیکن اب معلوم ہوا کہ تفسیر کسے کہتے ہیں۔ لوٹتے وقت عبدالقادر ان کے ہمراہ تھا، آپؒ نے فرمایا اگر کبھی نظم یا نثر لکھو تو ہم سے اصلاح لے لیا کرو۔

ایک روز آپؒ کے بھائی میر عبدالسلام نے کہا کہ اگر بیدل جیسا قابل آپ کی محبت سے فیض پاتا رہا تو بہت جلد یہ ہلال، کمال کو پہنچ جائے گا۔

حضرتؒ نے فرمایا "یہ اس گروہ سے ہے جو ازل سے فضلِ حقیقی لے کر آیا ہے۔ اسرار نبویؐ باطن کی تربیت کرتا ہے اور انوارِ ولایت شاملِ حال ہے لاخوفٌ علیھم ولا ھم یحزنون"

یہ الفاظ اس کے لیے سند کا درجہ رکھتے تھے۔ اس وقت اس کے دل کی کیفیت کیا تھی بیان نہیں کیا جا سکتا۔

کچھ دن ٹھہرنے کے بعد وہ پھر نئے سفر پر روانہ ہو گیا۔ راہ میں متھرا آتا تھا، وہ متھرا کے مضافات اکبر آباد میں ٹھہرا ہوا تھا۔

انوپ چند مصور ایک مدت سے بیدل کا آشنا تھا۔ اکثر عرض کرتا کہ اس کی ایک تصویر بنائے لیکن وہ ان فضول باتوں پر توجہ نہیں دیتا تھا۔ ایک دن بہت ہی اسرار کیا اور آخر کار ایسی تصویر بنا ڈالی کہ وہ جتنا بھی غور کرتا، اپنے اور تصویر میں سرِ مو فرق نہ پاتا۔ اتفاقاً سن 1100ھ میں اسے بیماری لاحق ہوئی اور سات ماہ تک بستر پر پڑا رہا۔ ایک دن ایک دوست اس کتاب کو جس میں تصویر تھی، دیکھ رہا تھا، اچانک بولا، افسوس یہ تصویر خراب ہو گئی۔ شاید کسی بچے نے نم ہاتھ اس پر پھیر دیا اور اس کا رنگ جاتا رہا۔ اس نے بھی تصویر دیکھی۔ واقعی اس کا رنگ غائب تھا۔ جب صحت ہوئی تو اس تصویر کا خیال آیا۔ وہ کتاب منگوا کر دیکھی تو تصویر پھر سے نئی تھی۔ گویا ابھی مسکرا پڑے گی۔ دیکھنے والے چلا پڑے۔ یہ کیا بلا ہے۔ بیدل بھی ہوش کھو بیٹھا۔ جب افاقہ ہوا تو اس نے تصویر چاک کر ڈالی۔

ایسے عجیب واقعات زندگی کا حصہ بنتے جا رہے تھے

کہ شادی ہو گئی اور دہلی میں قیام ہوا تو انہی دنوں ایک کنیز بخار میں مبتلا ہو کر بستر پر پڑ گئی اور ساری دوائیں بے اثر ثابت ہوئیں۔ ایک صبح یہ خبر ملی کہ اس کی زندگی کی شمع گل ہو گئی ہے۔ فوراً وہ اس کے گھر پہنچا۔ لوگ بے اختیار رو رہے تھے۔ بیدل کنیز کے پاس پہنچا اور جنون میں ایک مُکا اس کے سینے پر مارا۔ کنیز اچھل پڑی اور صحن میں جا کھڑی ہوئی۔ یہ دیکھ کر ہر ایک حیرت زدہ رہ گیا اور کئی ایک نے تو بیعت کی خواہش کا اظہار بھی کر دیا۔

دہلی سے نکلا تو اکبر آباد جا پہنچا، کئی دن کے فاقے سے تھا۔ کافی کمزوری محسوس کر رہا تھا۔ افلاس ہر شخص سے چھپا رہا تھا۔ لیکن وضع سے وہ محتاج نہیں لگتا تھا۔ لوٹتے ہوئے جب دروازے کے قریب پہنچا تو پاؤں لڑکھڑا گئے اور وہ زمین پر بیٹھ گیا۔ فوراً یہ شرم دامن گیر ہوئی کہ کوئی حال کی تفتیش نہ کرے۔ چنانچہ استنجا کے بہانے وہاں سے اٹھا اور ڈھیلا تلاش کرنے لگا۔ اس کے ہاتھ میں ایک سنگریزہ آ گیا، دیکھا تو دور اکبری کا سکہ تھا جس کی قیمت اس وقت پانچ گنی تھی۔ یہ غیبی امداد مدت تک سرمایہ قناعت رہی۔

جس سال شاہ شجاع نے اپنے والد (شاہ جہاں) کی بیماری کی خبر سن کر دہلی کی طرف لشکر کشی کی تو اس نے تربت کی تسخیر کے لیے اس کے چچا مرزا قلندر کے ایک رشتے دار مرزا عبداللطیف کو متعین کیا۔ اتفاق سے بیدل بھی مرزا عبداللطیف کے ساتھ تھا۔ جب جاسوس یہ خبر لائے کہ اورنگ زیب نے شوکت شجاعی ختم کر دی تو لوگ پریشان ہو گئے۔ لشکر منتشر ہو گیا۔ جس کا جس طرف رخ ہوا چلتا بنا۔ آخر کار مرزا عبداللطیف بھی شکار کے بہانے نکل کھڑے ہوئے کیونکہ باقی لشکر بھی ساتھ چھوڑ کر غائب ہونا شروع ہو گیا تھا۔ مرزا اور وہ دس روز میں پٹنہ پہنچے۔

سن 1070ھ میں جب مرزا قلندر بنگالا کے سفر پر گئے تو سامان قصبہ مہسی میں جو کہ پٹنہ سے بیس کوس کے فاصلے پر ہے وہاں چھوڑ دیا۔ بیدل کو ایک ضرورت سے قصبہ میں جانا پڑا۔ ایک خادم کے ساتھ پیدل چل پڑا چونکہ ہمیشہ سواری پر سفر کیا تھا اس لیے پہلے دن ہی پاؤں میں چھالے پڑ گئے۔ رات اس نے سرائے جنا پور میں بسر کی، صبح کو کرائے کی سواری کرنی چاہی مگر راستے کے خطرے کے باعث کوئی تیار نہ ہوا۔ آخر کار خدا پر توکل کر کے وہ چل پڑا۔ دوپہر کے وقت گرمی کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ ایک درخت کے نیچے آرام کرنا پڑا۔ اچانک کان میں آواز آئی۔ سر اٹھا کر دیکھا۔ ایک کمزور سا بوڑھا، گھوڑے پر سوار چلا آ رہا ہے۔ نزدیک پہنچ کر اس نے سلام کیا اور کہا کہ میرا نام جان محمد ہے۔ میں خواجہ شاہ محمد کا نوکر ہوں جو مہسی میں مرزا قلندر کے پڑوسی ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد گھوڑی پیش کی اور سوار ہونے کو کہا۔ وہ مجبوراً سوار ہوا کیونکہ پاؤں کے چھالوں کے باعث پیدل چلنے میں اب بے حد تکلیف محسوس ہو رہی تھی۔ اسے بھی اپنے ساتھ سوار ہونے کے لیے کہا۔ لیکن اس نے انکار کر دیا اور گھوڑے کی باگ پکڑ کر آگے آگے چل پڑا۔ جلد ہی وہ مہسی پہنچ گئے۔ وہ خواجہ شاہ محمد کے دروازے پر پہنچ کر رک گیا۔ بیدل نے شکریہ ادا کیا اور گھر کی راہ لی۔ اگلے روز جب خواجہ صاحب کے بیٹے اس سے ملنے آئے تو اس نے بوڑھے کی تعریف کی۔ انہوں نے حیرت سے کہا کہ اس نام کا ان کے گھر کوئی نوکر نہیں ہے۔

جس زمانے میں عالمگیر بادشاہ دکن کی تسخیر میں معروف تھے اور ہندوستان پر بے کسی کی بجلی چمک رہی تھی۔ متھرا کے اکثر پرگنے ظلم کی زد میں تھے۔ بیدل بھی اپنی بے دست و پائی سے مشکلات میں مبتلا تھے۔ آخر سن 1096ھ میں یہ خیال کیا کہ جیسے بھی ہو، دہلی جانا ہے چنانچہ چند بیل گاڑیاں کرائے پر لیں اور دہلی روانہ ہو گئے۔ اعظم آباد پہنچ کر لوگوں نے منع کیا کہ بغیر سواری اور محافظوں کے سفر کرنا مناسب نہیں۔ مگر انہوں نے سفر کا ارادہ منسوخ کرنا مناسب نہ سمجھا اور سفر جاری رکھا۔ راستے میں شیر گڑھ آتا تھا انہوں نے وہیں رات بسر کی۔

اگلی صبح گاڑی بانوں نے فریاد کی کہ جلد تیاری کرو ورنہ قافلہ کوچ کر جائے گا۔ اسی وقت وہ روانگی کے لیے تیار ہوئے۔ یہ گاڑی بان درحقیقت قزاقوں سے ملے ہوئے تھے۔ جب وہ دیہات میں پہنچے تو ایک مسلح سوار کو دیکھا کہ ہندوؤں کے گروہ سے ان کی طرف آیا۔ جب قریب پہنچا تو گاڑی بانوں پر چلایا کہ اے بدبختو! تمہیں کس چیز نے اندھا کیا ہے کہ تم خدا کے محبوب بندوں کے ساتھ بے ادبی کے مرتکب ہوئے ہو۔ وہ ڈر کر بولے کہ ڈاکا ڈالنے کا خیال ہمیں یہاں تک لایا۔

سوار نے اپنے گھوڑے کی لگام موڑی اور اپنے پیچھے آنے کو کہا۔ تھوڑی دیر میں وہ قافلے والوں سے جا ملے اور اس طرح ہلاکت کے بھنور سے نجات پائی۔

منزل بہ منزل چلتے ہوئے اکبر آباد پہنچے۔ ایک مکان کرائے پر لیا۔ تقریباً تین سال تک اکبر آباد میں ہی قیام

رہا۔ سن 1081ھ میں ایک رات خواب دیکھا کہ کوئی ان کے سرہانے موجود ہے۔ جب انہوں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ حضور ختم رسالت صلی اللہ علیہ والہ وسلم تشریف فرما ہیں اور آنحضرتؐ روحی فداہ کے سایۂ عاطفت میں حقائق کے رموز وا ہورہے ہیں۔

کچھ دیر بعد پردۂ مثال پر ایک نظارہ دیکھا کہ شاہِ ولایت جناب علیؓ مرتضٰی تختِ ولایت پر تشریف فرما ہیں اور اب وہ آپ کے رُوبرو ہیں۔ جناب ولایت مآبؓ کی ہیبت سے بیدل کا بند بند کانپنے لگا۔ حضورؐ نے دولتِ اتحاد سے نوازا اور اپنے پہلو میں جگہ دی۔ حضورؐ کی غریب نوازی نے جرأت دلائی اور بیدل نے عرض کیا کہ ابھی ابھی جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ والہ وسلم کی زیارت نصیب ہوئی ہے اور پھر اپنی سوختہ جانی پر اظہارِ تاسف کیا۔ جنابؓ نے فرمایا:

حقیقت محمدیہؐ ہمہ وقت تیرے حال پر سایہ فگن رہے گی اور باطن نبوت تربیت کا دامن کبھی تیرے سر سے نہیں اٹھائے گا۔ اس موقع کی کیفیات کے زیرِ اثر بیدل نے یہ نعت پاک لکھی۔

آن کہ امکان تا وجوب وواحدیت تا احد
صورت تمثالی از آئینۂ زانوئے اوست
رونقِ این بزمِ محفل از چراغش پرتوی
جوشِ این بحر اخضر رشحہ ای از جوی اوست
از سواد ملک ہستی تا شبستانِ عدم
ہر کجا مژگان کشائی سایۂ گیسوی اوست
ہر چہ آید در خیال وآنچہ باید در نظر
یک قلم جوش بہارستان رنگ وبوی اوست
خواہ مشرق واشمار وخواہ مغرب کن قیاس
ہر طرف روی نیاز آوردہ باشی روی اوست
کثرتی کز وحدتش خارج شماری باطل است
چار سوئی شش جہت ہنگامۂ یک سوئی اوست
موج از دریا و ریگ از دشت بیرون تا زنیست
ہر دو عالم در کنارش محوِ جست وجوی اوست

مرزا عبدالقادر بیدل نے اکبر آباد میں اپنے تین سالہ قیام.... کے بعد دہلی میں مستقل رہائش کا سوچا اور اپنے ایک عقیدت مند نواب شکر اللہ خان کو لکھا کہ فصیلِ شہر کے باہر لبِ دریا ان کے لیے کوئی مکان تلاش کیا جائے۔ جہاں وہ سکون سے زندگی گزار سکے اور سخن فہمی کی محفلیں سجا سکے۔

بیدل 27 جمادی الآخر 1096ھ کو اہل وعیال سمیت دہلی میں مستقل اقامت کے لیے وارد ہوئے۔ نواب شکر اللہ خان نے جلد ہی ان کی رہائش کے لیے چھ ہزار روپے مالیت کی ایک حویلی خرید دی، جہاں عبدالقادر بیدل نے زندگی کے بقایا 36 سال نہایت اطمینان اور سکون سے گزارے۔ بیدل جیسی مشہور ومقبول شخصیت کا مستقل طور پر دہلی منتقل ہونا معمولی واقعہ نہ تھا۔ سخنورانِ ہند خصوصاً اہلیانِ دہلی اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتے تھے کہ بیدل جیسی اہم شخصیت ان کے درمیان موجود ہے۔ شعر وسخن کے لحاظ سے اسے بیدل کا دور کہا جاسکتا ہے۔ دور دور سے شعرا اپنے کلام پر اصلاح لینے ان کی محفل میں حاضری اپنے لیے باعثِ فخر سمجھتے تھے۔

بیدل کے شاگردوں میں ہر مذہب وملت کے افراد شامل تھے۔ بیدل سب سے ہی بے حد اخلاص ومحبت سے پیش آتے تھے۔ ان کے ایک ہندو شاگرد بندرابن داس، جن کو بیدل نے ان کی قابلیت اور خوش آوازی کی بنا پر ’’خوشگو‘‘ کا تخلص عطا کیا تھا، کہتے ہیں کہ دہلی منتقلی کے بعد حضرت بیدل کی پوری توجہ شاعری کی جانب ملتفت ہوگئی تھی۔ فارغ اوقات میں طبابت بھی کرتے تھے۔ ان کی بنائی ہوئی مختلف قسم کی حبوب دہلی میں خوب فروخت ہوتی تھیں۔ اس کے علاوہ نواب شکر اللہ خان نے دو روپے یومیہ مقرر کردیا جو انہیں تادمِ مرگ ملتا رہا۔ ان کی سخاوت اور استغنا کا یہ عالم تھا کہ امرا جو نذرانے ان کی خدمت میں پیش کرتے تھے وہ انہیں دیگر حاجت مندوں میں تقسیم کردیا کرتے تھے۔

بندرابن داس ’’خوشگو‘‘ اپنی کتاب ’’معارف‘‘ میں بیدل کے حالاتِ زندگی بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ حضرت عبدالقادر بیدل، مغل بادشاہ شاہ جہان کے دورِ حکومت میں پیدا ہوئے تھے جو کہ ہر لحاظ سے ہندوستان کی تاریخ کا سنہرا دور تھا۔ 1037ھ میں شہنشاہ جہانگیر نے وفات پائی اور تخت نشینی کی جنگ کے اختتام پر 1038ھ میں شاہ جہان سلطنتِ ہندوستان کے تخت پر جلوہ افروز ہوا۔ ان سولہ سترہ برسوں میں شاہ جہان کی اسلام دوستی اور اس کی عظمت وجلال کے قصے زبان زدِ خلائق ہوچکے تھے۔

شاہ جہان کی وفات پر بیدل نے مرثیہ بھی لکھا۔ اس مرثیہ کو پڑھتے ہوئے اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ بیدل نے ہمیشہ بادشاہوں کی مدح گوئی سے اجتناب کیا۔ اگرچہ

بیدل 1133ھ میں فوت ہوئے جب ہندوستان پر محمد شاہ رنگیلا حکمران تھا اور اس تمام عرصہ میں اورنگ زیب عالمگیر سے لے کر فرخ سیر تک تمام شہنشاہوں نے حضرت بیدل کا بے حد احترام کیا لیکن شاہ جہان کے علاوہ اور کسی کی وفات پر بیدل نے مرثیہ نہ کہا۔

بندرابن داس خوشگو لکھتے ہیں کہ حضرت بیدل بہار اور اڑیسہ میں 1075ھ تک رہے۔ اس کے بعد اکبر آباد اور دہلی چلے گئے۔ ان کے چچا مرزا قلندر تخت نشینی کی جنگ کے خاتمے اور شاہ جہان کے نظر بند ہونے پر بنگال چلے گئے تھے۔ ماموں مرزا ظریف کا انتقال بھی 1075ھ میں ہوگیا۔ اب بیدل کا کوئی ذریعۂ معاش نہ رہا۔ اس لیے واقف کاروں کے مشورے سے بیدل نے شاہانِ مغلیہ کے دارسلطنت کا رخ کیا۔ اس وقت عمر اکیس برس کی تھی، عین عالم شباب، میانہ قد، کشادہ سینہ، کھلی اور روشن جبین، ابرو کی قوسیں ایک دوسرے سے الحاق پر مائل۔ کمال درجہ کے حسین تھے، ریش ہمیشہ صاف رہی۔ بعض تذکروں کے مطالعہ سے پتا چلتا ہے کہ زندگی کے کسی مرحلے پر مختصری ریش کی عادت بھی ڈال لی تھی۔

اگرچہ ماحول نے بیدل کو تصوف کے لیے وقف کردیا تھا مگر فطرتاً وہ عسکری تھے۔ سپاہیوں والا مضبوط گٹھا ہوا جسم، فولادی اعضا اور بچپنے سے سخت مشقت کی ورزش کے عادی تھے اور محض عسکری تربیت کے لیے چچا نے فوج میں بھرتی کروایا تھا۔ تمام تذکرہ نگار اس بات سے متفق ہیں کہ زورِ بازو اور شجاعت کے لحاظ سے بیدل اپنی مثال آپ تھے۔

بہار چھوڑنے کے بعد پورے اکیس سال تک بیدل دہلی، اکبر آباد اور متھرا کے درمیان چکر لگاتے رہے اور کسی ایک شہر میں بھی مستقل طور پر اقامت گزیں نہ ہوئے۔ طبیعت کو کہیں بھی سکون میسر نہ آتا تھا۔ سن 1079ھ میں شادی کی اور انہی ایام میں اورنگ زیب عالمگیر کے بیٹے شاہزادہ اعظم شاہ کی سرکار میں پانچ صدی ذات وسوار کے عہدے پر ملازم بھی ہوئے مگر جلد ہی مستعفی ہوگئے۔ شاہجہان آباد کے مستقل قیام نے بیدل کو مغلوں کی معاشرتی زندگی سے پوری طرح آشنا ہونے کے مواقع بہم پہنچائے۔ اکبر آباد بھی مغلوں کا ایک اہم صدر مقام تھا مگر مغل صحیح معنوں میں صرف شاہ جہان آباد کی فضاؤں میں ہی نگاہوں کے سامنے آئے۔ متھرا، اکبر آباد اور دہلی میں کوئی بیس سال تک آتے جاتے رہنے کی وجہ سے اقتدار مطلق سے سرشار مغلوں کے متعلق انہوں نے بہت کچھ معلومات حاصل کرلی تھیں اور اسی لیے ان کے وجود کا رُواں رُواں بہ زبانِ حال پکار رہا تھا۔

بترس از آہِ مظلومان کہ ہنگام دعا کردن
اجابت از درِ حق بہر استقبال می آید

ترجمہ: (مظلوم کی آہ سے ڈرو کہ جب وہ دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتا ہے تو قبولیت کے تمام دروازے کھل جاتے ہیں)

اورنگ زیب عالمگیر بیدل کا ذکر اپنے رقعات میں کرتے تھے۔ وہ شہنشاہ جو شعرا کو چنداں درخورِ اعتنا نہیں سمجھتا تھا، اپنے عہد کے ایک جواں سال شاعر کے اشعار بطور نصیحت اپنے امرا اور دیگر حکومتی عہدے داروں کے نام خطوط واحکامات میں درج کرتا۔ مظلوموں کی دادرسی کے لیے مذکورہ بالا شعر اکثر اپنے خطوط میں لکھتا تھا۔ اسی طرح قناعت کا درس دینے کے لیے بیدل کا یہ شعر بھی لکھتا تھا۔

حرص قانع نیست بیدل ورنہ اسباب معاش
آنچہ ما درکار داریم، اکثری درکار نیست

اور بیدل کے اس شعر سے شہزادہ اعظم شاہ کو کاہلی انگاری اور سستی ترک کرنے کو کہتا:

من نمی گویم زیاں کن یا بہ فکرِ سُود باش
ای ز فرصت بے خبر در ہر چہ باشی زود باش

جن دنوں بیدل شاہ جہان آباد میں رہتے تھے۔ یہ وہ شہر تھا جو مغل تمدن کا نقطہ عروج تھا۔ اب وہ کنارے پر بیٹھ کر امواج کا نظارہ نہیں کرتے تھے۔ بلکہ عین قعرِ دریا میں امواج کے تھپیڑے کھا رہے تھے۔ ان کے تعلقات عوام کے ساتھ بھی تھے اور خواص کے ساتھ بھی۔ وہ اپنی جری فطرت کی بنا پر اس بات کے قائل تھے کہ مہمات کو مردانگی سے سر کرنا چاہیے۔ اس لیے مغل دارالسلطنت کو جب بیدل نے کئی اخلاقی اور فکری امراض میں مبتلا دیکھا تو ان کے تدارک کے لیے بڑی دلیری اور بے باکی سے کمربستہ ہوگئے۔ انہوں نے گردوپیش کا جائزہ ایک حکیم کی نگاہ سے لیا اور اپنے ہم عصروں کی اصلاح کا عزم اپنے دل میں پیدا کیا۔ انہوں نے دیکھا کہ زراندوزی کا خبط ہر دل میں موجود ہے۔ بہترین انسانی صلاحیتیں حصولِ مال وزر کے لیے وقف ہوچکی ہیں۔ ہر شخص محلات کی تعمیر کے خواب دیکھ رہا ہے اور چاہتا ہے کہ صاحبِ حشم وجاہ بن جائے۔ اس کی ڈیوڑھی پر نقارہ بج رہا ہو اور نام و نگین اس کے لیے وقف ہوچکا ہو۔ مفلس ونادار لوگوں کا کوئی ہمدرد نہیں ہے۔ ہر کوئی

ان کے خون کا آخری قطرہ تک نچوڑ لینا چاہتا ہے۔ غرور تکبر کا دور دورہ ہے۔ حق پرستی اور دین داری کا کسی کو ذرہ بھر خیال نہیں ہے۔ خال خال حق شناس لوگ موجود ہیں، مگر ان کا وجود صرف اس بات کا اعلان کر رہا ہے کہ انسانوں کا تحت قحط پڑ چکا ہے اور تن پرستی، عیش کوشی اور نفس پروری روز افزوں ہے۔ ان مناظر نے ہی اسے تنقید پر اکسایا تھا۔

جب سن 1118ھ میں اورنگ زیب عالمگیر فوت ہوئے تو وہ روح بھی رخصت ہو گئی جو اس مضمحل، معطل اور بے کار معاشرے میں کم و بیش جنبش کا موجب تھی۔ جہاں دار شاہ کے عہد میں جب نفس پرستی اپنی انتہا کو پہنچ گئی اور میاں تان سین کی اولاد میں سے ایک لڑکی "لعل کنور" ملکہ عالم بنی تو کلاونت لوگ ہفت ہزاری اور پنج ہزاری عہدوں پر ممتاز ہو گئے اور وہ اودھم مچا کہ الامان والحفیظ۔ بیدل نے شاہ جہان کے عہد میں مسلمانوں کی سطوت کو اپنے کمال پر دیکھا تھا اور پھر انہوں نے وہ ایام بھی دیکھے جب آفاق کی حدود سمٹتی چلی جا رہی تھیں اور مسلمان ہندو جاٹوں اور مرہٹوں کے ہاتھوں رسوا اور ذلیل ہو رہے تھے۔ جہاں دار شاہ کے زمانے میں بیدل نے یہ بھی دیکھا کہ تخت طاؤس کا مالک مغل شہنشاہ، جس کے اجداد کا نام سن کر بڑے بڑے فرعون طبع کانپ اٹھتے تھے، ہوس پرستی کی خاطر دہلی کے بازاروں اور میخانوں میں آوارہ گردی کر رہے تھے۔ ماضی اور حال کے درمیان اس تضاد کو دیکھ کر بیدل سخت افسردہ ہوئے اور انہوں نے بصد تاسف کہا۔

زِ بے مغزیِ شکوہِ سلطنت شد تنگ کنّاسی
بجائے استخواں گہ خوردہ می گردد ہما اینجا

انہی دنوں بیدل کے جوہر کھل کر سامنے آئے۔ حضرت بیدل کے ایک امیر کبیر اور فاضل شاگرد آنند رام مخلص کہتے ہیں "بہ درِ مخلوق تشریف نہ فرمودند، بعد از خسرو دہلوی، مثل بیدل از
خاکِ پاک ہند بر نخواستہ، از برگزیدگان جناب الٰہی بودو بہ تفریق
توکل و استقامتِ معاش می فرمود"

حضرت بیدل کی انہیں صفات کی بنا پر خوشگو لکھتے ہیں:
"در متاخرین ہیچ شاعری بایں عزت و آبرو بسر نبردہ کہ او داشت" اور یہ کہنا کہ متقدمین سے بھی دو ایک شعرا کو وہ عزت و آبرو حاصل ہوئی ہوگی جو کہ حضرت بیدلؒ کے حصے میں آئی تھی۔ امیر خسروؒ نے متعدد بادشاہوں کا زمانہ دیکھا اور ہر زمانے میں انہیں قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھا گیا۔ لیکن ان کے احترام کا دارومدار زیادہ تر ان کے قصائد پر تھا۔ سلطان محمود غزنوی کے دربار میں عنصری جس شان و شوکت سے رہتے تھے، اس کا تصور بھی آنکھوں کے سامنے چکاچوند پیدا کر دیتا ہے، لیکن عنصری کی شان و امارت بھی قصیدہ گوئی کی مرہونِ منت تھی۔ اُدھر بیدل نے زندگی بھر دنیوی اغراض سے اعراض اور قصیدہ گوئی سے اجتناب کیا۔ اورنگزیب عالمگیر کے بیٹے شہزادہ اعظم شاہ نے اضافۂ منصب اور خطاب "خانی" کا وعدہ کیا، مگر انہوں نے جہانِ معنی کا خان خاناں بننا قابلِ ترجیح سمجھا اور شہزادے کی ملازمت سے مستعفی ہو گئے۔ بہادر شاہ اول نے اپنے وزیر نواب منعم خان خاناں کی معرفت مغلوں کا شاہنامہ لکھنے کی کئی بار درخواست کی۔ نواب صاحب سے مراسم بھی بڑے مخلصانہ تھے مگر بیدل نہ مانے اور آخری بار تو کہلا بھیجا "اگر بادشاہ خوانخواہ ہی اس ناچیز کے پیچھے پڑا ہے تو یہ فقیر لڑنے کی طاقت تو نہیں رکھتا لہٰذا ان کی سلطنت کی حدود سے کہیں اور نکل جائے گا۔" استغنا اور قناعت کا یہ عالم تھا کہ میر عنایت اللہ خان شاکر فرزند نواب شکر اللہ خان جو بیدل کے قریبی دوست اور انتہائی عقیدت مند تھے شہنشاہ فرخ سیر سے دکن کی جاگیر لے کر دی مگر بیدل نے لینے سے قطعاً انکار کر دیا۔ شہنشاہ فرخ سیر نے کنایتہً ملاقات کے لیے آرزو کا اظہار کیا مگر بیدل نے خاموشی اختیار کی آخر بادشاہ نے ایک ہاتھی اور دو ہزار روپے مرحمت فرمائے مگر بیدل نے اپنی وضع کے مطابق استغنا کا اظہار کیا۔ روپے تو کسی طور پہنچ گئے جو کہ بیدل نے ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیے مگر ہاتھی لانے کے لیے بیدل کی طرف سے کوئی آدمی نہ گیا۔ اسی طرح ایک بار نظام الملک آصف جاہ نے حقِ شاگردی ادا کرنے کے لیے کچھ خدمت کرنا چاہی اور دکن آنے کی دعوت دی، مگر بیدل نے جواب میں لکھا:

دنیا اگر دہند نہ جنبم زِ جائی خویش
من بستہ ام حنائی قناعت بہ پائی خویش

جس شاعر کے استغنا کا یہ عالم ہو اور جو اس قدر سیر چشم اور قانع ہو اس کے سامنے انوری، ظہیر فاریابی، یا عہد مغلیہ کے فیضی کا ذکر کرنا بالکل ناموزوں ہے۔ ان الفاظ سے اساتذۂ قدیم کی تنقیص مقصود نہیں صرف یہ ظاہر کرنا مطلوب ہے کہ سیرت و شخصیت کی جو عظمت و برتری ہمیں بیدل کے ہاں نظر آتی ہے کہیں اور نہیں۔

معمول یہ تھا کہ عام طور پر تمام روز گھر کے اندر رہا کرتے تھے۔ اس دوران شعر گوئی جاری رہتی یا کتب کا مطالعہ کرتے۔ حبوب سازی کی طرف بھی غالباً اسی وقت توجہ دیتے ہوں گے جو کہ ان کی روزمرہ کی آمدنی کا بڑا ذریعہ تھا۔ مرزا عباد اللہ ماموں زاد بھائی تھے۔ ان کے بیٹے محمد سعید حضرت بیدل کے ہاں رہتے تھے اور حبوب سازی کا کام غالباً انہی کے ذمّے ہوگا، کیونکہ بیدل کی وفات کے بعد مرزا محمد سعید کی گزران کا دارومدار بھی بیدل کی مجوزہ حبوب کی فروخت پر تھا۔ ورزش کے لیے بھی باقاعدگی سے وقت نکالتے تھے۔ تین تین چار چار ہزار بیٹھکیں لگاتے اور ایک تنومند گھوڑے سے کشتی لڑتے جو اس غرض کے لیے پال رکھا تھا کیونکہ قوی ہیکل سے قوی ہیکل پہلوان بھی ان سے مقابلے کی تاب نہ لاسکتا تھا۔ جوانی میں خوراک سات آٹھ سیر تھی، بعد میں دو تین سیر ہو گئی۔ جوانی میں نفس کشی کے لیے بڑی چلہ کشی کی تھی۔ لیکن جب متھرا اور بعد میں دہلی مستقل اقامت اختیار کی . . تو پھر فقر و فاقہ سے کنارہ کش ہو گئے۔

شام کو دیوان خانے میں تشریف فرما ہوتے۔ احباب، شاگرد اور دل دادگانِ سخن جمع ہو جاتے۔ غلام کا نام "مضمون" تھا، جو حقہ تازہ رکھتا۔ بیدل اپنی زندگی کے بصیرت افروز تجارب بیان کرتے، ساتھ ساتھ موزوں اور مناسب حکایات بھی بیان فرماتے۔ سخن فہمی، شعر گوئی اور تصوف کے تذکرے جاری رہتے۔ دورانِ گفتگو کہہ اٹھتے "بھئی اب عبادتِ الٰہی کرنی چاہیے۔" اپنا کلیات اٹھا لیتے اور بلند آواز کے ساتھ اشعار سناتے۔ اس طرح کہ گلی سے گزرنے والے بھی سنا کرتے۔ باری باری حاضرین میں سے ہر ایک کو مخاطب کرتے۔

اسی طرح آدھی رات تک یہ محفل جمی رہتی تھی۔ یہ محفل کیا تھی؟ فیوض اور برکات کا سرچشمہ تھی۔ ادب، شعر اور تصوف کے ایسے ایسے نکات بیان ہوتے تھے کہ حاضرین حیرت زدہ رہ جاتے تھے۔ اساتذۂ قدیم کے اسالیب، تازہ گو شعرا کے محاسن اور عیوب، تصوف کے مختلف مکاتبِ فکر، آئمہ متصوفین کے تذکرے، اولیاء اللہ کی کرامات اور اُن کی مبارک صفات، یہ تمام باتیں ایک ایسے بزرگ کی زبان سے بیان ہوتی تھیں جس کی وجہ سے اساتذہ قدیم کی تخلیقی اور تحقیقی روایات زندہ ہوتی تھیں، جو خود علم تصوف میں مہارت تامہ رکھتا تھا اور اس کے اعمال کا پابند ہو کر اس کی روح سے پوری طرح آشنا ہو چکا تھا۔ اس لیے بیدل کی محفلِ شبانہ نادرہ روزگار چیز تھی۔ ہر شخص اپنی اپنی استعداد کے مطابق مستفیض ہوتا تھا۔ "خوشگو" لکھتے ہیں:

"اکثر خورد و بزرگ شہر سرِ شام بخدمتش می رفتند و انواع چیز ہا بری داشتند۔"

اب آپ حاضرین محفل کے کسبِ فیض کا اندازہ لگائیں، بیدل کے ایک شاگرد لالہ سکھراج سبقت تھے۔ انہوں نے جب دیکھا کہ ادب و شعر کے متعلق فنی کتب کے مطالعے سے اچھے اچھے صاحبِ ذوق لوگوں کے لیے جو کچھ حاصل کرنا از قبیلِ ناممکنات ہے، وہ اس بزرگوار کی محفل میں پہنچ کر ہر کس و ناکس حاصل کر سکتا ہے، تو انہوں نے ایک رباعی کہی۔

کرسی، بیٹھک، صحبت، محفل، ہم نشینی، موزونیت کو نشست کہتے ہیں، ہر بات کی طرح اسلام میں نشست لینے یا محفلوں میں جانے اور انہیں بیٹھنے کے بھی آداب مقرر ہیں۔ راستوں میں بیٹھنے کی اجازت نہیں محفل میں یا کہیں بھی جماہی آنے کی صورت میں منہ پر ہاتھ رکھ لیا جائے۔ چھینک آنے کی صورت میں الحمد اللہ کہنا چاہیے۔ اور سننے والوں کو یرحمک اللہ کہنا چاہیے۔ محفل سے کسی آدمی کو اٹھانا بھی جائز نہیں اگر کوئی شخص مجلس سے اٹھ کر چلا جائے تو واپسی پر وہی اس جگہ کا زیادہ حق دار ہے۔ بڑے بوڑھوں، برگزیدہ شخصیتوں وغیرہ کے لیے جگہ خالی کر دینا کارِ ثواب ہے۔ دو آدمیوں کے درمیان بلا اجازت نہیں بیٹھنا چاہیے۔ ایک حدیث میں آیا ہے جو شخص غیر مطلق حلقے میں جا کر بیٹھے حضور نے اس پر لعنت فرمائی ہے۔ محفل کے دوران آپس میں گفتگو یا ادھر ادھر تکتے رہنا بھی بدتمیزی میں شمار ہوتا ہے۔

مرسلہ: فیض الحسن، کوئٹہ

آن ذاتِ ابد قدرت تنزیہ مقام
عبدالقادر نمود تمثیش تام
شُد زندہ یکی بہرِ مسیحائی دین
آمد دگرا کنون پی احیائی کلام

ایک عبدالقادر (حضرت سیدنا شیخ عبدالقادرؒ جیلانی غوث پاک) مسیحائی دین کے لیے پیدا ہوئے اور اب دوسرے عبدالقادر (بیدل) احیائے کلام کے لیے تشریف لائے ہیں اور جس طرح صوفیائے کرام کے نزدیک حضرت عبدالقادر جیلانیؒ اپنے وصال کے بعد بھی روحانی تربیت فرماتے ہیں، جناب عبدالقادر بیدل بھی عالمِ بقا کو سدھار جانے کے بعد عرس کے ذریعے شعر و شاعری کو زندگی بخشنے کا موجب ثابت ہوئے۔ یہ ان کے ایک ہندو شاگرد کے تاثرات ہیں جو حضرت بیدل کی محافلِ شبینہ سے مستفیض ہوتے رہے، مسلمانوں کے دلوں میں بیدل کی کیا قدر ہوگی۔

بیدل کے اس طویل قیامِ دہلی کے دوران میں حصولِ تاج و تخت کے لیے تین جنگیں لڑی گئیں۔ اول اورنگ زیب عالمگیر کی وفات پر، دوم بہادر شاہ اول کے فوت ہونے پر اور تیسری جہاندار شاہ اور فرخ سیر کے درمیان۔ اس دوران سادات بارہہ نے بادشاہ گر کا کردار ادا کیا۔

دوآبہ گنگ و جمن ضلع مظفر نگر میں قدیم زمانے سے بارہ گاؤں مشہور چلے آتے ہیں۔ ان کو بارہہ کہتے ہیں۔ ان کی بیشتر آبادی سادات پر مشتمل ہے۔ ان سادات کو سادات بارہہ کہتے ہیں۔ انہوں نے مغلوں کے زمانہ عروج میں بڑے بڑے کارنامے انجام دیے۔ سب سے پہلے اکبر نے سادات بارہہ کی قدر دانی کی۔ محمود خان، بارہہ سادات میں ممتاز شخصیت کا مالک تھا۔ وہ اکبر کے ملازموں میں شامل ہو کر پنج ہزاری کے عہدے تک پہنچا اور شجاعت و سخاوت میں غیر معمولی شہرت حاصل کی۔ اپنے دلیرانہ کارناموں کی وجہ سے اکبر، جہانگیر، شاہ جہاں، اورنگ زیب اور فرخ سیر کے عہد تک سادات بارہہ بڑے بڑے عہدوں پر فائز رہے لیکن جیسے جیسے مغل حکمران و امرا اخلاقی گراوٹوں اور دوسری کمزوریوں میں مبتلا ہوتے گئے تو اصل اقتدار سادات بارہہ کے ہاتھوں میں آتا چلا گیا۔ جہاندار شاہ کی بدکرداریوں کے باعث سادات بارہہ نے فرخ سیر کا ساتھ دیا۔ جہاندار شاہ، لعل کنور کو لے کر فرار ہو گیا اور اسی حالت میں قتل ہو گیا۔ فرخ سیر برسرِ اقتدار آئے اور امن و امان بحال ہو گیا۔ فرخ سیر اچھے حکمران ثابت ہوتے لیکن سادات بارہہ کو اپنا اقتدار خطرے میں نظر آیا، لہٰذا کچھ عرصہ بعد بغاوت کر کے "فرخ سیر" کی حکومت کا تختہ الٹ دیا۔ فرخ سیر کو قید کر کے پہلے اندھا کر دیا اور پھر قتل کر دیا۔ فرخ سیر کی جگہ محمد شاہ رنگیلا کو تختِ ہندوستان پر بٹھا کر پسِ پردہ سادات بارہہ حکومت کرتے رہے۔

فرخ سیر کو 1131ھ میں جب قتل کیا گیا تو بیدل سے یہ ظلم نہ دیکھا جا سکا اور انتہائی غم و اندوہ سے اس المناک واقعہ کی تاریخ کہی۔

بیدل کی زبان سے نکلی ہوئی تاریخ اس قدر برجستہ اور موزوں تھی کہ دیکھتے ہی دیکھتے پورے ملک میں مشہور ہو گئی اور ہر کس و ناکس کی زبان پر جاری ہو گئی جس سے سادات بارہہ کی بے حد رسوائی ہوئی اور لوگوں کے دلوں میں ان کے لیے شدید غم و غصہ پیدا ہو گیا۔ سادات نے انتقام لینا چاہا تو بیدل کی جان کو خطرہ پیدا ہو گیا۔ ان کے دوستوں اور بہی خواہوں نے انہیں مجبور کر دیا کہ جب تک حالات ان کے موافق نہیں ہو جاتے وہ اپنے دوست لاہور کے صوبہ دار عبدالصمد خان کے پاس چلے جائیں۔ اس وقت ان کی عمر 77 سال تھی۔ سادات بارہہ کے سردار امیر الامرا سید حسن علیخان بارہہ اور اس کا بھائی قطب الملک حسین علیخان بارہہ جو کہ پہلے حضرت بیدل کے بے حد عقیدت مند تھے اور حضرت بیدل سے اپنے کلام پر اصلاح بھی لیا کرتے تھے، لیکن معزول بادشاہ فرخ کے انتہائی بیدردی سے قتل کی تاریخ کہنے کی وجہ سے بیدل کے دشمن ہو گئے اور ان کے قتل پر آمادہ ہو گئے جس کی وجہ سے بیدل کو لاہور کا سفر اختیار کرنا پڑا۔

6 ذی الحج 1132ھ (مطابق 9، اکتوبر 1720ء) کو جب امیر الامرا سید حسن بارہہ کو دکن میں "طورہ" کے مقام پر قتل کر دیا گیا اور اس کے بھائی قطب الملک سید حسین بارہہ کو شکست ہوئی تو اس طرح سادات بارہہ کے اقتدار کا خاتمہ ہو گیا۔ محمد شاہ رنگیلا کا تخت و تاج محفوظ ہو گیا اور وقتی طور پر ملک میں امن و امان کی صورتِ حال قدرے بہتر ہو گئی۔

سادات بارہہ کے اقتدار کے خاتمہ پر حضرت بیدل شاہ جہان آباد لوٹ آئے۔ غالباً ضعیفی، پے در پے صدمات اور سفر کی صعوبتوں نے ان کی توانائی کو شدید طور پر متاثر کیا تھا، محرم کا مہینا تپِ محرقہ میں مبتلا رہے۔ بخار کی شدت کسی طور کم نہ ہوئی اور بالآخر 4 صفر 1133ھ (مطابق 5

دسمبر 1720ء) کو حضرت ابوالمعانی مرزا عبدالقادر بیدلؒ نے اس جہانِ فانی سے عالمِ جاودانی کی طرف پرواز کی۔ انہیں ان کی وصیت کے مطابق اپنی حویلی کے صحن میں سپردِ خاک کیا گیا۔

بیدلؒ کے عزیز شاگرد و دیرینہ ساتھی بندرابن داس خوشگو نے اس اندوہناک واقعہ کی دو تاریخیں کہیں:

تاریخِ اول۔ "یوم پنج شنبہ چہارم ماہ صفر"
1133ھ

تاریخِ وفات دوم:
افسوس کہ بیدلؒ از جہان روی نہفت
واں جوھرِ پاک در تہ خاک بخفت
خوشگو چو زِ عقل کرد تاریخ سوال
"زِ عالم رفت میرزا بیدلؒ" گفت
1133ھ

خوشگو کے اس بیان کی تائید تمام تذکرہ نویس کرتے ہیں۔ میر غلام علی آزاد بلگرامی جو سن 1116ھ میں پیدا ہوئے اور اس لحاظ سے حضرت بیدل کے ہم عصر تھے، اپنے تذکرہ سروِ آزاد میں تحریر کرتے ہیں:

"بیدلؒ در صحنِ خانہ خود مدفون گردید"

غلام علی آزاد بلگرامی اپنے تذکرہ "خزانۂ عامرہ" میں بھی اپنے اسی بیان کا اعادہ کرتے ہیں:

آنند رام مخلص شاگرد بیدل (سن 1164ھ میں فوت ہوئے) لکھتے ہیں "در سالِ یک ہزار و یک صد و سی و سہ ودیعتِ حیات سپردند و در صحنِ حویلی بیوتت قبرایشان است"

حسین قلی خان عظیم آبادی نے اپنا تذکرہ "نشترِ عشق" سن 1233ھ میں مکمل کیا، وہ بھی رقم طراز ہیں:

"بیدلؒ در صحنِ مکان خودش برلبِ آب مدفون شد"

سراج الدین علی خان آرزو، عطاء اللہ عطا اور دیگر شاگردانِ بیدل نے بھی حضرت بیدلؒ کی وفات کی تاریخیں کہیں اور سب ہی نے مزار بیدل کے متعلق اپنے تذکروں میں یہی لکھا ہے کہ مزار بیدلؒ شہر پناہ اور دہلی دروازے سے باہر دریائے جمنا کے کنارے حویلی لطف اللہ خان کے صحن میں کھلے آسمان کے نیچے واقع تھا۔

حضرت بیدلؒ کی وفات دارالخلافہ دہلی کا کوئی معمولی سانحہ نہ تھی۔ امراء شعرا اور عوام الناس و خواص میں ایک تہلکہ برپا ہو گیا۔ سب لوگ اس بلند شخصیت والے انسان کو ہاتھوں سے کھو کر سخت غمزدہ تھے جو علم و فضل، حکمت و تصوف، ادب و شعر، اخلاق و کردار کی ان تمام روایات کا زندہ پیکر تھا، جو فکرِ انسانی نے اس وقت تک قائم کی تھیں۔ نگاہیں اس مردِ کامل کو ڈھونڈتی تھیں جو شجاعت و ہمت میں رستمِ زماں تھا، جذب و شوق کے اعتبار سے بایزیدِ وقت، مسائلِ تصوف کو زبانِ شعر میں بیان کرنے کے لحاظ سے اپنے عہد کا سنائی، فارسی زبان کا ابن العربی، زبان پر قدرت رکھنے کے اعتبار سے خاقانیِ دَوراں، حسنِ بیان میں سعدیٔ زمان، درد و سوز سے حافظ کی طرح لبریز، استغنا کے خیال سے حکمائے یونان کا مثیل اور رومی کی طرح للّٰہیت کا زندہ نمونہ اور پھر ان تمام صفاتِ عالیہ اور اس عظمت کے باوجود نہایت ہی متواضع اور منکسر المزاج، امیر غریب سب کا غمگسار محتاجوں اور مسکینوں کا ہمدرد، مسلم اور ہندو سب کا دوست۔

بندرابن داس خوشگو شاگردِ بیدل نے حضرت بیدل کی وفات پر جو تاریخی رباعی لکھی ہے اس میں انہیں "جوہرِ پاک" کہہ کر یاد کیا ہے یعنی تمام خوبیوں کا نہایت ہی پاکیزہ نچوڑ، ایک اور موقع پر لکھتے ہیں:

"بہ جامعیت کمالات، حسنِ اخلاق، بزرگی و ہمواری، شگفتگی و رسائی، تیز فہمی و زود رسی و اندازِ سخن گفتن و آدابِ معاشرت و حسن سلوک و دیگر خصائلِ انسانی، ہیچ وی نہ دیدہ ام، تختۂ پیشانی وسیع داشتہ کہ گوئی قلم تقدیر جمیع کمالاتِ انسانی بر و مرقسم کردہ۔"

حضرت بیدلؒ کے مشہور شاگرد سراج الدین علی خان آرزو جو کہ عام طور پر خان آرزو کے نام سے پکارے جاتے ہیں۔ بیدل کے عرس کے موقع پر صدرِ مجلس ہوا کرتے تھے۔

حضرت ابوالمعانی مرزا عبدالقادر بیدلؒ کی وفات کے بعد حویلی لطف اللہ خان میں مزار بیدل زیارت گاہِ ہر خاص و عام بن گیا۔ حضرت بیدل کے بھتیجے مرزا محمد سعید ان کے سجادہ نشین مقرر ہوئے۔ وہ حویلی کے صحن میں واقع حضرت بیدلؒ کے مزار کی دیکھ بھال بحسن و خوبی سرانجام دیتے رہے۔ ہر سال ماہ صفر کی تین اور چار تاریخ کو حضرت بیدلؒ کا عرس منعقد ہوتا تھا۔ شاگردِ بیدل، بندرابن داس خوشگو نے اپنا تذکرہ "سفینہ" دو جلدوں میں سن 1147ھ میں مکمل کیا۔ اس میں عرسِ بیدلؒ کا ذکر بھی موجود ہے۔ خوشگو لکھتے ہیں کہ عرس کے موقع پر کلیاتِ بیدل جو کہ انتہائی خوشخط تحریر میں حضرت بیدل نے اپنی نگرانی میں لکھوائے تھے۔ کلیات کے عنوان پر مندرجہ ذیل رباعی مرقوم تھی:

اے آئینہ طبع تو ارشاد پذیر
در کسب فوائد سنائی تقصیر
مجموعہ فکر ما صلائے عام است
سیری کن و دست تسلی بر گیر

خوشگو لکھتے ہیں کہ عرس کے موقع پر کلیاتِ بیدلؒ ان کے مزار کے پہلو میں رکھ دیا جاتا تھا۔ ہر سطر میں چار مصرے تھے، کل ننانوے ہزار اشعار اس میں درج تھے جس کا وزن چودہ سیر شاہ جہانی تھا۔ کلیات کی تکمیل پر حضرت بیدل نے ترازو کے ایک پلڑے میں کلیات اور دوسرے پلڑے میں زر و جواہر رکھ کر تولا تھا اور پھر یہ سب ضرورت مندوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ حضرت بیدلؒ کا یہ طریقہ کار تھا کہ روزانہ جو فتوحات آتیں وہ شام ہونے سے قبل ہی حاجت مندوں اور درویشوں میں تقسیم کر دیا کرتے تھے۔ گھر کا خرچ وہ انہی دو روپیہ یومیہ سے پورا کرتے تھے جو نواب شکر اللہ خان نے حویلی خرید کر دیتے وقت مقرر کیا۔ یہ یومیہ تا دمِ مرگ حضرت بیدل کو ملتا رہا۔ اس کے علاوہ کچھ معجونیں اور حبوب بھی فروخت کے لیے اپنے بھتیجے محمد سعید مرزا کے ذریعے تیار کروا کر بازار میں بھجوایا کرتے تھے جو کہ دہلی میں بے حد مقبول تھیں۔ یہی دو آمدنی کے ذرائع تھے جو کہ بیدل جیسے قناعت پسند بزرگ کے گھریلو اخراجات کے لیے کافی تھے۔ عرس کے موقع پر جب کلیاتِ بیدل مزار بیدل کے پہلو میں رکھ دیا جاتا تو اس نشست گاہ جس پر حضرت بیدل تشریف رکھا کرتے تھے وہاں حضرت بیدل کا مشہور و معروف عصا بھی تبرک کے طور پر مزار کے پہلو میں کلیات کے ساتھ رکھ دیا جاتا تھا۔ حضرت بیدل نے اس لوہے کے بنے ہوئے 35 سیر شاہ جہانی عصا کا نام ''بولاس'' رکھا ہوا تھا جس کا مطلب ہے ''شاخِ نازک''۔ اس شاخ کو بیدل بہت آسانی سے چھڑی کی طرح اٹھا کر چلتے تھے جبکہ مضبوط دست و بازو رکھنے والے افراد اپنا پورا زور لگا کر بمشکل اس ''شاخِ نازک'' کو اٹھا سکتے تھے۔ خوشگو لکھتے ہیں کہ اگر کسی کو یقین نہ ہو تو خود مزارِ بیدل پر آ کر دیکھ سکتا ہے، ہاتھ کنگن کو آرسی کیا؟

قدرتِ قادری سے پوری طرح لطف صرف اسی وقت اٹھایا جا سکتا ہے جب یہ بات ذہن میں رہے کہ بیدل کا اسم گرامی عبدالقادر تھا اور طاقت و شجاعت کے لحاظ سے وہ رستم ثانی تھے۔ اسی لٹھ کے متعلق خوشگو ایک لطیفہ بھی بیان کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ایک روز بیدل مرحوم لٹھ لیے گھر سے باہر نکلے شیخ کبیر راستے میں مل گئے۔ شیخ صاحب دیرینہ ہم صحبت تھے اور آشنا تھے اور بلا ناغہ متواتر تیس سال تک ان کی زیارت سے مستفیض ہوتے رہے تھے۔ شیخ صاحب نے بر سبیلِ ظرافت اس ''سبک'' سی چھڑی کا ذکر چھیڑ دیا۔ بیدل نے زیرِ لب مسکراتے ہوئے درج ذیل پانچ مقفیٰ فقرے عصا کی تعریف میں فی البدیہہ کہہ دیے:

''سنت الانبیاء، زینت الصلحاء، مونس الاعمیٰ، ممد الضعفاء، دافع الاعدا'' اور اس کے بعد فرمایا کہ شرِ اعدا کے دفیعے کے لیے مضبوط عصا چاہیے۔ یہ واقعہ جب ہوا ہے حضرت بیدل کی عمر ستر سال سے یقیناً متجاوز تھی۔

خوشگو لکھتے ہیں کہ عرس کے روز مزار بیدل کے پاس قلمی کلیات اور عصا دونوں رکھ دیے جاتے تھے۔ لوگ سمجھتے تھے کہ ایسا ماحول پیدا ہو چکا ہے جو بیدل کی یاد تازہ کرنے میں ممد ہو سکتا ہے۔ شعرا کا مجمع ہوتا تھا۔ شہر کے تمام نازک خیال اکٹھے ہو جاتے تھے، پہلے کلیاتِ بیدل سے ایک غزل پڑھی جاتی تھی اور پھر ہر ایک بار باری اپنے ذاتی جوہر کا اظہار کرتا تھا۔ اپنا اپنا تازہ کلام سنایا جاتا اور ایک نہایت ہی پُرلطف مجلسِ شعر انعقاد پذیر ہوتی تھی۔ مرزا محمد سعید (بیدل کے بھتیجے) جانشین بیدل، مجلس آرائے عرس ہوا کرتے تھے۔

نواب صاحب مزید لکھتے ہیں کہ بیدل کے برادر زادہ مرزا محمد سعید جو معنی یگانہ کی طرح مرزا بیدل کی نسبتِ معنوی سے بیگانہ ہیں، حاضرینِ مجلس کی خاطر تواضع اور شمع و چراغ کا انتظام کرنے میں بڑی عرق ریزی اور مستعدی کا اظہار کرتے ہیں۔ گل محمد المعروف معنی یاب خان، جن کا تخلص (شاعر) تھا۔ آزاد بلگرامی اور خوشگو نے بھی ان کا ذکر کیا ہے۔ انہیں حضرت بیدل کے شاگردوں میں امتیازی مقام حاصل تھا۔ بیدل کو ان سے بڑی محبت تھی۔ مرزا بیدل کی وفات کے بعد معنی یاب خان بیدل کے متعلقین کی بڑی باقاعدگی سے خدمت کرتے رہے۔ مسکین بیدل دہلی میں بیدل کی وفات تک تقریباً سینتیس سال تک دل دادگانِ شعر و سخن کا مرجع بنا رہا۔ اس طویل مدت میں بڑے بڑے باکمال لوگوں نے بیدل جیسے بے نظیر استادِ فن سے استفادہ کیا۔ آپؒ کے سیکڑوں شاگرد تھے اور آپ کا دولت کدہ صحیح معنوں میں ایک عظیم دار التربیت تھا۔ جس نے اچھے اچھے اہلِ فن پیدا کیے۔ سعد اللہ جان گلشن، آنند رام مخلص، بندرابن داس خوشگو اور خان آرزو وغیرہ تمام ماہرینِ فن یہیں کے تربیت یافتہ تھے اور پھر جب بیدل فوت ہوئے تو ان کے مزارِ مقدس نے وہی حیثیت اختیار کر لی جو پہلے ان کے مبارک مسکن کو حاصل تھی۔ اگر ہم مرزا محمد رفیع سودا کی دہلی سے روانگی کے سال کو عرس بیدل کا آخری سال فرض کر لیں (یہ ہم نے کم سے کم عرصہ لکھا ہے) تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ 52 سال کے طویل عرصہ تک مزار بیدل شعرائے دہلی کی تربیت گاہ بنا رہا۔ جہاں دہلی بھر کے شعرا جمع ہوتے تھے۔ ایک فقید النظیر اجتماع ہو جایا کرتا تھا اور شعر و سخن کی بڑی پُررونق محفل منعقد ہوا کرتی تھی جس میں کلیاتِ بیدل سے استفادے کو بہت اہمیت دی جاتی تھی۔ اس کا مزید یہ مطلب ہوا کہ بیدل کی مستقل سکونت دہلی 1096ھ تا وفات (1133)ھ اور پھر ان کے تلامذہ کی وجہ سے پورے نوے سال تک دہلی میں شعر و سخن کے لحاظ سے بیدل کے اثرات باقاعدگی سے نفوذ کرتے رہے۔ اہلِ کمال بالخصوص مشرق و جنوب سے ہجرت کر کے ایک ہی جگہ یعنی دارالحکومت دہلی میں جمع ہو گئے تھے اور بزم تیموریہ منتشر ہونے سے پہلے ایک دفعہ پُررونق بن گئی اور چونکہ ایک مستقل ادارے کی وجہ سے بیدل کے اثرات کی اشاعت ہو رہی تھی اس لیے محال نظر آتا ہے کہ کوئی ادیب یا شاعر بیدل سے متاثر نہ ہوا ہو۔ بیدل نے اور ان کے شاگردوں نے فارسی کے علاوہ اردو زبان کو نئے مضامین، اصطلاحات، تراکیب و استعاروں کا بے بہا خزانہ بخشا۔ بیدل نے اردو میں بھی اشعار کہے ہیں لیکن کم کہے ہیں کیونکہ ان کا اصلی میدان فارسی تھا اور وہاں ان کا شمار بڑے اساتذہ میں ہوتا ہے۔ بہار میں رہتے ہوئے اپنے عہدِ طفولیت میں ہی بیدل اردو زبان سے آشنا ہو چکے تھے۔

یہ شاد عظیم آبادی کا بیان ہے اس سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرتے ہیں کہ ابتدائے شباب میں خود بیدل کی زبان پر بہار میں مروجہ اشعار بے ساختہ وارد ہو جایا کرتے تھے اور یہ سب کچھ ماحول کی وجہ سے تھا۔ لیکن دہلی میں رہتے ہوئے انہوں نے بعد میں جو شعر اردو زبان میں کہے ہیں وہ زیادہ صاف ہیں اور ناسخ اور غالب کے انداز کی طرف واضح طور پر انگشت نمائی کرتے دکھائی دیتے ہیں:

مت پوچھ دل کی باتیں، وہ دل کہاں ہے ہم ہیں
اس تخمِ بے نشاں کا حاصل کہاں ہے ہم ہیں
جب دل کے آستاں پر عشق آن کر پکارا
پردے سے یار بولا، بیدلؒ کہاں ہے ہم ہیں

ان اشعار کے علاوہ مجھے اردو میں بیدل کا اور کوئی شعر نہیں مل سکا۔ شمس ولی دکنی جو کہ اردو کے پہلے صاحبِ

مرثیہ شہنشاہ شہاب الدین شاہ جہان
(1076ھ)

یادِ آں موسم کہ بے وصم و بہار و فصل وی
داشت میائی فلک جام طرب لبریزِ می
انجمن نازاں چمن خنداں طراوت گلفشاں
شاخِ گل رقاص و بلبل بستہ در منقار نی
دورِ سعدی بود و عہدِ امن و ایامِ شریف
خلق در حمدِ خدا از عدلِ شاہِ نیک پی
شاہِ شاہاں جہاں، شاہ جہاں کز شوکتش
تاج بر خاک او فگندی کسریٰ و کاؤس و کی
از زمیں تا آسماں شہبازِ حکمش کردہ صید
رخشِ فرمائش ز مشرق تا بہ مغرب کردہ طی
دستِ جودی داشت چوں موسیٰ دلِ دریا شگاف
تیغِ عدلی پائی ظلمت کردہ چوں خورشید پی
کوہ در فکر و قارش بستہ خوں در دلِ زحل
بحر از شرمِ عطاہائش ز گوہر کردہ خوی
کامراں شاہی چو او نگزشتہ در اقلیمِ دہر
کمتریں چاکر اش بادشاہِ مصر و ری
عاقبت رفت آں شہِ قدسی نشاں بر قصرِ عرش
سوئے اصلِ خویش می باشد رجوعِ کل شی
بہرِ تاریخِ وصالش از خرد کردم سوال
گفت بیدلؒ ''بر سریرِ قربِ یزداں جائی وی''
1076ھ

دیوان شاعر کہلاتے ہیں۔ ان کا دیوان سن 1133ھ کے وسط میں دہلی پہنچا تھا اور حضرت بیدلؒ 1133ھ کی ابتدا یعنی محرم میں بیمار ہوئے اور 4 صفر 1133ھ میں وصال فرمایا۔ اس لیے یہ مفروضہ غلط ہے کہ ولی کے تتبع میں بیدل نے یہ اشعار کہے ہوں گے۔ علاوہ بریں فارسی گوشاعر کی حیثیت سے ان کا رتبہ اتنا بلند تھا کہ انہیں اپنی بقائے دوام کا حتمی یقین ہو چکا تھا۔ کہتے ہیں:

سخن تا در جہان باقیست از معدوی آزادم
زبان گفتگو ہا بال پرواز است عنقارا

اس لیے اس وقت انہیں کسی کی تقلید کی ضرورت ہی نہیں رہی تھی۔ جس صاحبِ فن کا نام فارسی زبان کے

اساتذۂ قدیم کی فہرست میں شامل ہو چکا تھا وہ اب کسی نئے شاعر کا اتباع کیسے کرتے۔ بہرحال اردو زبان میں بیدل کے یہی تین چار شعر ملتے ہیں۔ اس لیے اردو زبان پر بیدل کا جو اثر ہے وہ بالواسطہ ہوا اور وہ ان کی مجالس شبینہ اور ان کی وفات کے بعد ان کے شاگردوں کے ذریعے۔ خصوصاً بیدل نے شاگردوں کی فوج نہیں بنائی بلکہ گنتی کے لوگوں کو اصلاح دینا شروع کی جن میں سراج الدین علی خان آرزو، شیخ سعد اللہ گلشن، نواب امیر خان انجام، رائے آنند رام مخلص وغیرہ شامل ہیں۔

مولانا محمد حسین آزاد، خان آرزو کے متعلق لکھتے ہیں کہ خان آرزو کو اردو پر وہی دعویٰ پہنچتا ہے جو کہ ارسطو کو فلسفہ ومنطق پر ہے۔ جب تک کہ کل منطقی ارسطو کے عیال کہلائیں گے تب تک اہلِ اردو، خان آرزو کے عیال کہلائیں گے۔ خان آرزو وہی شخص ہیں جن کے دامنِ تربیت سے ایسے شائستہ فرزند تربیت پا کر اٹھے، جو زبانِ اردو کے اصلاح دینے والے کہلائے اور جس شاعری کی بنیاد جگت اور ذو معنی لفظوں پر تھی اسے کھینچ کر فارسی کی طرز اور ادائے مطالب پر لے آئے، یعنی مرزا مظہر جان جاناں، مرزا رفیع سودا، میر تقی میر، خواجہ میر درد وغیرہ، کتنے کھلے دل سے مولانا محمد حسین آزاد تمام اہلِ اردو کو خان آرزو کے عیال کہہ رہے ہیں۔ اور خان آرزو کو براہِ راست جناب بیدل سے شرفِ تلمذ حاصل تھا۔ اب آپ بیدل کے بلند مقام کا بھی اندازہ لگائیں اور اس بات پر بھی توجہ دیں کہ بالواسطہ بیدل نے زبانِ اردو پر بالخصوص اس کے عبوری دور میں کتنا عظیم اثر ڈالا۔

میر غلام علی آزاد بلگرامی، بندرابن داس خوشگو، آنند رام مخلص، سراج الدین علیخان آرزو وغیرہ نے حضرت بیدلؒ کے مزار کا محل وقوع اپنے اپنے تذکروں میں واضح کر دیا ہے کہ وہ دلی دروازے اور شہر پناہ سے باہر دریائے جمنا کے کنارے واقع حویلی لطف اللہ خان کے صحن میں واقع تھا۔ حضرت بیدلؒ کی زندگی میں تو یہ حویلی شعر و ادب اور دیگر علوم و فنون کا مرکز تھی ہی لیکن ان کے وصال کے بعد بھی ان کے شاگردوں اور متوسلین کی وجہ سے اسی طرح شعر و ادب کی محفلیں برپا ہوا کرتیں جیسے کہ حضرت بیدل کی زندگی میں۔

دور دراز سے حضرت بیدل کے عقیدت مند اور خصوصاً اہلیانِ دہلی بڑی تعداد میں ان روحانی اور ادبی محافل میں شرکت کے لیے آتے تھے۔ خصوصاً تین اور چار صفر کو عرسِ بیدل کے موقع پر خصوصی جلسوں کا اہتمام کیا جاتا تھا۔ مزار اور حویلی کی غلام گردشوں اور برآمدوں میں چراغاں کیا جاتا تھا۔ اور زائرین میں لنگر تقسیم کیا جاتا تھا۔ عرس کا اہتمام حضرت بیدل کے بھتیجے مرزا محمد سعید کیا کرتے تھے جو حضرت بیدل کے سجادہ نشین مقرر کیے گئے تھے۔ عرس کی تقریبات کا مفصل تذکرہ پہلے ہو چکا اب مزار کے بے نشان ہونے کی تفصیل بھی سن لیں۔

دہلی کی بنیاد نہ جانے کیسی گھڑی میں رکھی گئی تھی کہ اس کی مانگ کئی بار اجڑی اور کئی بار آباد ہوئی۔ پہلے سادات بارہہ کی شورشوں پھر مرہٹہ گردی، اس کے بعد نادر شاہ افشار (درانی) کی خون ریزی، قتل و غارت، لوٹ کھسوٹ اور پھر احمد شاہ ابدالی کے بار بار کے حملوں کے باعث نہ صرف عوام الناس بلکہ شعرا، ادبا اور دیگر علوم و فنون سے تعلق رکھنے والے اربابِ فن نے دلی کو چھوڑ کر لکھنو، فرخ آباد، دکن اور دوسرے شہروں کا رخ کیا۔ پے درپے انقلابات اور اس کے نتیجے میں ہونے والی قتل و غارت اور لوٹ کھسوٹ کی وارداتوں کی وجہ سے دہلی شہر خالی ہونے لگا۔ انہی شورش زدہ حالات کی وجہ سے حضرت بیدل کے سجادہ نشین مرزا محمد سعید کا بھی کچھ پتا نہ چلا کہ آیا وہ انتقال کر گئے یا دیگر شعرا اہلِ فن کی طرح کسی اور علاقے کی جانب ہجرت کر گئے۔ اب مزارِ بیدل کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہ رہا۔ غلام ہمدانی مصحفی نے اپنا تذکرہ "عقدِ ثریا" 1199ھ میں مکمل کیا۔ وہ بیان کرتے ہیں کہ اس وقت بیدل کا مکان جس کے صحن میں ان کی تربت تھی ویران محض ہو چکا ہے۔

دہلی کے الم ناک حالات کا ذکر پہلے ہو چکا ہے جن کی بنا پر لوگوں نے اسے ترک کرنا شروع کر دیا تھا۔ حتیٰ کہ وہ دن بھی آ گیا جب جہان آباد کے سب سے بڑے محب اور مداح "میر تقی میر" بھی 1197ھ میں اسے بصد حسرت و یاس الوداع کہنے پر مجبور ہو گئے۔ باقی اہلِ علم و اربابِ فن تو پہلے ہی دلی چھوڑ چکے تھے۔

گھر کے مکین ہجرت کر گئے۔ حویلی سنسان ہو گئی۔ مزار کو پوچھنے والا کوئی نہ رہا اس لیے پہلے یہ ویران ہوا بعد میں بالکل ناپید ہو گیا۔ امتدادِ زمانہ کے ساتھ ساتھ مزار کا تعویذ ٹوٹ پھوٹ گیا۔ خود مزار زمین کے ساتھ ہموار ہو گیا اور انجام کار مزارِ بیدل کا نام و نشان بھی جاتا رہا۔ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت بیدلؒ کے متوسلین یا تلامذہ میں سے کوئی بھی پھر واپس دہلی نہیں آیا۔ نتیجتاً لوگ بھول گئے کہ مزارِ بیدل کہاں واقع تھا۔ مرزا غالب، حضرت بیدل کے بڑے معتقد تھے، ان کے دل میں عمر بھر بیدل کے "لوحِ مزار" کو دیکھنے کی حسرت رہی۔ کہتے ہیں:

گر ملے حضرتِ بیدل کا خطِ لوحِ مزار
اسد آئینۂ پروازِ معانی مانگے

مرزا غالب کے بعد تو لوگ مزارِ بیدل کو بالکل ہی بھول چکے تھے مگر قدرت کو ابھی ایک طرفہ تماشا دکھانا منظور تھا۔ خواجہ حسن نظامی نے جب نواب درگاہ قلی خاں کی فارسی تصنیف "مرقعِ دہلی" کا اردو زبان میں ترجمہ کیا تو عرسِ بیدل کا ذکر پڑھ کر ان کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ مزارِ بیدل، تلاش کیا جائے۔ چنانچہ اپنے 24 اپریل 1947ء کے مراسلے میں دفتر آل انڈیا چشتی پارٹی دہلی کے نام خط میں لکھا:

"میں نے اس کتاب "مرقعِ دہلی" کا اردو زبان میں ترجمہ کیا تو اس پر نوٹ لکھا کہ بہت کوشش کے باوجود معلوم نہ ہو سکا کہ مرزا بیدلؒ کا مزار کہاں ہے؟ یہ نوٹ پڑھ کر حضرت شاہ سلیمانؒ صاحب پھلواری نے مجھے لکھا کہ بیدل کا مزار پرانا قلعہ دہلی کے سامنے حضرت نورالدین بار پرانؒ کے مزار کے قریب واقع ہے۔ میں خود وہاں گیا۔ مزار بے نشاں ہو چکا تھا مگر مزار کی جگہ مل گئی۔ تب حضور.... نظام کو لکھا اور انہوں نے دو ہزار روپے بھیج کر مزارِ بیدل بنوا دیا اور اس پر ان کے نام کا کتبہ بھی لگوا دیا۔"

اس موقع پر جو کتبہ مزار پر لگوایا گیا اس کی عبارت درج ذیل ہے:

"مرقد مرزا عبدالقادر بیدل، تاریخ وفات 3 صفر 1133ھ۔ اس کی ضروری تعمیر و ترمیم اعلیٰ حضرت پُرنور آصف جاہ سابع دکن کی توجہاتِ شاہانہ سے سن 1359ھ مطابق 1941ء میں کرائی گئی۔"

تعمیر جدید مزارِ بیدل کے سلسلے میں حضرت خواجہ حسن نظامی سے دو بڑی غلطیاں ہوئیں۔ پہلی یہ کہ حضرت بیدلؒ کی تاریخ وفات 4 صفر 1133ھ کے بجائے، 3 صفر 1133ھ کتبہ پر لکھوا دی اور دوسری یہ کہ حضرت بیدل کے شاگردوں اور ہمعصروں مثلاً خوشگو، خان آرزو، آنند رام مخلص اور میر غلام علی آزاد بلگرامی، حسین قلی خان اور غلام ہمدانی مصحفی کے بیانات اور تذکرے پڑھ کر فوراً یہ خیال دل میں آتا ہے کہ مولانا حسن نظامی نے بیدل کا مزارِ جدید بالکل غلط جگہ پر بنوا دیا ہے۔ خواجہ حسن نظامی، مزارِ بیدل "پرانے قلعے" کے سامنے حضرت نورالدین بار پرانؒ کے مزار سے منسلک بتاتے ہیں جبکہ خوشگو اور دوسرے شاگردانِ بیدل اور ہمعصرانِ بیدل اپنے اپنے تذکروں میں مزار بیدل شہر پناہ اور دہلی دروازہ کے باہر دریائے جمنا کے کنارے محلہ کھیکر یاں نزد گزر گھاٹ کے قریب واقع حویلی لطف اللہ خان کے صحن میں بتاتے ہیں۔ اب پرانا قلعہ اور دہلی دروازے میں تقریباً 3 میل کا فاصلہ ہے۔

حضرت بیدل کے مزار کے متعلق ایک زمانے میں یہ افواہ بھی اڑی تھی کہ احمد شاہ ابدالی نے اپنے حملوں کے دوران بیدل کے تابوت کو کابل منتقل کر دیا تھا اور ان کا مزار کابل کے نواح میں ہے اور ان کے دیگر اہلِ خانہ اور والدین اور چچازاد بھائیوں کی قبریں بھی ان کے مزار کے قریب ہیں۔ لیکن خود کابل کے اہلِ قلم حضرات نے اس کی تصدیق سے انکار کر دیا تھا اور اسے جھوٹ پر مبنی قرار دیا۔

بیدل کو فوت ہوئے 5 دسمبر 2013ء کو 293 سال کا عرصہ گزر چکا ہے۔ اگر ماہرین آثار قدیمہ چاہیں تو مزارِ بیدلؒ کو تلاش کیا جا سکتا ہے۔ سائنس نے اتنی ترقی کر لی ہے کہ ہزاروں سال پرانے آثار کو کھدائی کر کے دنیا کے سامنے لا چکے ہیں تو مزارِ بیدل کو تو صرف 293 برس کا عرصہ گزرا ہے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ متعصب اور انتہا پسند ہندو ایسا کب کرنے دیں گے جو بابری مسجد جیسی قدیمی عبادت گاہ کو رام جنم بھومی میں بدل دیتے ہوں وہ کب ایک مسلمان صوفی شاعر کے مزار کی تلاش و تعمیر کی اجازت دیں گے۔ اور وہ بھی ایک ایسے صوفی شاعر جو مسلمان اور ہندو سب سے خلوص اور مروت سے پیش آتے تھے۔

حضرت ابوالمعانی مرزا عبدالقادر بیدلؒ کا کمالِ فن یہ ہے کہ اگرچہ انہوں نے اپنے کلام میں اول سے آخر تک وحدت الوجود ہی کا فلسفہ پیش کیا ہے اور اسی ایک بات کو ہزار رنگ سے ادا کیا ہے مگر شعریت کا دامن ان کے ہاتھ سے کبھی نہ چھوٹا۔ بیدل اپنی طرز کے اکلوتے شاعر ہیں۔ غالب کے علاوہ بھی بیدل کے ہمعصروں نے ان کا انداز اپنانے کی کوشش کی مگر جس بلندی پر بیدل فائز تھے کہ وہاں ان کا مدمقابل کوئی دوسرا شاعر نہ بن سکا۔

اگرچہ مرزا غالب کو طرزِ بیدل میں بقول علامہ اقبال کامیابی نہ ہو سکی تاہم اس میں شک نہیں کہ انہوں نے حضرت بیدل کے کلام سے بہت کچھ استفادہ کیا جس کا اعتراف انہوں نے جگہ جگہ کیا ہے۔ غالب نے بیدل سے اپنی عقیدت کا اظہار ان اشعار میں کیا ہے:

آہنگِ اسد میں نہیں جز نغمۂ بیدل
عالم ہمہ افسانۂ ما دارد و ما ہیچ

مجھے راہِ سخن میں خوفِ گمراہی نہیں غالب
عصائے خضرِ صحرائے سخن ہے خامہ بیدل کا

اسد! ہر جا سخن نے طرزِ باغ تازہ ڈالی ہے
مجھے رنگِ بہار ایجادیٔ بیدل پسند آیا

ہمچنان آن محیطِ بے ساحل
قلزمِ فیض مرزا بیدل

مرزا غالب نے بیدل کو "قلزمِ فیض" اس لیے قرار دیا ہے کہ ان کے بہت سے بلند پایہ اشعار کی گہرائی میں فکرِ بیدل ہی موجزن ہے۔ اسی طرح حضرت علامہ اقبال، حضرت بیدل کو "مرشدِ کامل" کہہ کر یاد کرتے ہیں۔

پہلے مرزا غالب کے چند اشعار جو کہ کلامِ بیدل سے ماخوذ ہیں:

اشعار مرزا اسد اللہ خان غالب کے نیچے بیدل کے اشعار ہیں۔ قارئین خود جائزہ لیں کہ غالب نے بیدل کے اشعار کو کس طرح اپنا لیا:

ضعف سے گریہ مبدل بہ دمِ سرد ہوا
باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا

آہم زنارسائی شد اشک و با عرق ساخت
پستیست گر خجالت شبنم کند ہوا را

..................☆☆☆..................

مے سے غرض نشاط ہے کس رُوسیاہ کو
اک گونہ بیخودی مجھے دن رات چاہیے

مطلبم از مے پرستی ترکِ مافیہانہ بود
یک دو ساغر آب دادم گریاہ مستانہ را

..................☆☆☆..................

سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں
خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

خلقے بہ عدم دردِ دل و داغِ جگر بُرد
خاک ہمہ صرفِ گل و سنبل شدہ باشد

..................☆☆☆..................

بے طلب دیں تو مزہ اس میں سوا ملتا ہے
وہ گدا جس میں نہ ہو خوئے سوال، اچھا ہے

اے خوش آن جود کہ از خجالت وضعِ سائل
لب باظہار نیار ندو بہ ایما بخشند

..................☆☆☆..................

نشو و نما ہے اصل سے غالب فروغ کو
خاموشی ہی سے نکلے ہے جو بات چاہیے

سازِ ہستی غیر آہنگ عدم چیزے نداشت
ہر نوائے را کہ وادیدم خموشی می سرود

..................☆☆☆..................

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن
ہم کو تقلیدِ تنک ظرفیٔ منصور نہیں

من و سازِ دکانِ خود فروشی ہا چہ حرف است ایں
جنونِ ایں فضولی در سرِ منصوری باشد

..................☆☆☆..................

بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

سحر آہ و گلستان نکہت و بلبل فغان دارد
جہانِ سوئے بے رنگی زِ حسرت کاروان دارد

..................☆☆☆..................

اگر بیدل اور غالب کے کلام کا تقابلی جائزہ لیا جائے تو غالب کے اور بہت سے اشعار ایسے مل سکتے ہیں جن کا تخیل، بیدل کے اشعار سے ماخوذ ہے۔

اور اب حضرت علامہ اقبالؒ کے چند اشعار جس میں حضرت بیدل کا رنگ نمایاں ہے۔ حضرت علامہ، مرزا بیدل کو مرشدِ کامل قرار دیتے ہیں اور لکھتے ہیں کہ علومِ جدید کی بنیاد محسوس پر ہے جبکہ بیدل کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ:

باھر کمال اندکے آشفتگی خوش است
ھر چند عقلِ کل شدۂ بے جنون مباش

اقبال نے مذکورہ بالا شعر بیدل کی تضمین کر کے اپنے فلسفۂ زندگی کی بخوبی وضاحت کر دی ہے۔ "ضربِ کلیم" میں "مرزا بیدل" کے زیرِ عنوان نظم میں اقبال نے کائنات کی ماہیت کے مسئلے کو سلجھانا چاہا ہے اور بیدل کے ایک شعر کی تضمین کرتے ہوئے بتایا ہے کہ یہ شعر اس حیرت کدے کا دروازہ بخوبی کھولتا ہے:

دل اگر می داشت وسعت بے نشاں بود ایں چمن
رنگِ مے بیرون نشست از بسکہ مینا تنگ بود

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر اقبال، بیدل کے اس قدر مداح کیوں ہیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ دونوں کا حق اور حقیقت کے بارے میں نقطۂ نظر بہت مماثل ہے۔ بحیثیت مجموعی وہ بیدل کی نفسِ انسانی میں گہری بصیرت کے بے حد مداح نظر آتے ہیں۔ پھر دونوں عظیم شعرا وجدان ہی کو وہ معیار اور وسیلہ قرار دیتے ہیں جس کی مدد سے کائنات کی تفہیم ممکن ہے۔ دونوں کا موقف یہ ہے کہ مجرد اور نری کھری عقل

پرستی سے کام نہیں چلتا۔ دونوں عظمتِ انسان کے قائل ہیں اور دونوں کی نظر وجودِ انسانی میں موجود ان بے پناہ امکانات پر ہے جن کے بل پر فطرت کی قوتوں کو تسخیر کیا جا سکتا ہے۔

اشعار علامہ اقبالؒ

حُسن کا گنجِ گراں مایہ تجھے مل جاتا
تو نے فرہاد نہ کھودا کبھی ویرانۂ دل

..................☆☆☆..................

آشنا اپنی حقیقت سے ہو اے دہقاں ذرا
دانہ تو، کھیتی بھی تو، باراں بھی تو حاصل بھی تو

..................☆☆☆..................

آدم از بے بصری بندگیٔ آدم کرد
گوہرے داشت ولے نذرِ قباد و جم کرد

..................☆☆☆..................

یعنی در خوئے غلامی زِ سگاں خوار تر است
من نہ دیدم کہ سگے پیشِ سگے سر خم کرد

..................☆☆☆..................

تقلید کی روش سے تو بہتر ہے خودکشی
رستہ بھی ڈھونڈ خضر کا سودا بھی چھوڑ دے

اشعار حضرت ابوالمعانی بیدلؒ

برونِ دل نتواں یافت ہرچہ خواہی یافت
کدام گنج کہ در خانۂ خرابِ تو نیست

..................☆☆☆..................

حیف نشگا فیم پردۂ دل
دانہ بود است مہرِ خرمن ہا

..................☆☆☆..................

بیدلؔ بحصولِ رزق آمادہ بسر
سگ چاکرِ سگ نہ گشت خربندۂ خر

..................☆☆☆..................

طبیعتِ خلق از حق غافل کرد
ترکِ تقلید گیر تحقیق ایں است

..................☆☆☆..................

حضرت علامہ اقبالؒ اپنے ایک انگریزی مقالہ "Bedil in the Light of Bergson"

"مطالعۂ بیدل فکرِ برگساں کی روشنی میں" ایک جگہ فرماتے ہیں کہ مرزا عبدالقادر بیدل اعلیٰ درجہ کے مفکر تھے جبکہ مشہور ہندو فلسفی شنکر اچاریہ ایک زبردست منطقی تھا جو بڑی بے رحمی سے ٹھوس حسّی تجربے کی تحلیل کرتا ہے تاکہ اس میں موجود ذاتِ بسیط (The Universal) کو بے نقاب کر سکے اس کے برعکس بیدل۔ شاعر بیدل کے لیے تحلیل طبعاً ایک تکلیف دہ اور غیر فنکارانہ عمل ہے اور وہ عالمِ محسوس کو زیادہ لطیف انداز میں دیکھتے ہیں اور اس میں موجود ذاتِ بسیط کی طرف ایسے نقطۂ نظر سے اشارہ کرتے ہیں جو اس کے شایانِ شان ہو۔

زِ موج پردہ بروئے حباب نتواں بست
تو چشم بستہ اے بے خبر نقاب کجاست

ترجمہ (موج سمندر کے چہرے کو ڈھانپ نہیں سکتی۔ اے بے خبر تو نے اپنی آنکھیں بند کر رکھی ہیں (ورنہ) نقاب کہاں ہے)

بیدل کہتے ہیں۔

می کشم چوں صبح از اسبابِ ایں وحشت سرا
تہمتِ ربطے کہ نتواں بست بر اجزائے من

ترجمہ (اس دنیا کے صحرا میں حالات و اسباب نے صبح کی مانند مجھ پر ایک ربطِ مادی کی ایسی تہمت دھری ہے جس کی متحمل میری فطرت نہیں ہوتی)

موج و کف مشکل کہ گردد محرمِ قعرِ محیط
عالمے بیتابِ تحقیق است و استعداد نیست

ترجمہ (سمندر کی موج اور جھاگ، سمندر کی گہرائیوں میں نہیں دیکھ سکتے۔ ایک عالم ہے جو حقیقت کی ماہیت جاننے کے لیے بیتاب ہے لیکن اس کی استعداد سے عاری ہے)

سراپا وحشتم اما بناموسِ سبک روحی
زِ چشمِ نقشِ پا چو ریگ می دارم سفر پنہاں

ترجمہ (میں سراپا وحشت ہوں لیکن باطنی زندگی کے ناموس کی خاطر صحرا کی ریت کی طرح نقوشِ پا کی نگاہوں سے بھی اسے پوشیدہ رکھتا ہوں) صحرا کی ریت کے بارے میں گمان کیا جاتا ہے کہ وہ ہمہ وقت محوِ سفر رہتی ہے اگرچہ نقشِ پا... کی آنکھ (فارسی شعرا نقوشِ پا کو آنکھ سے تعبیر کرتے ہیں) بھی اس کی حرکت دیکھ نہیں پاتی حالانکہ وہ (آنکھ) اپنی ماہیت و اصلیت کے اعتبار سے ریت سے نہایت قریبی تعلق رکھتی ہے۔ شاعر ہمیں بتاتا ہے کہ بالکل اسی طرح ہمارے اندر حرکتِ حیات کی نزاکت کا ادراک نہیں کیا جا سکتا)

حضرت ابوالمعانی مرزا عبدالقادر بیدلؒ کی نثر جتنی سلیس ہے ان کی شاعری اتنی ہی پیچیدہ اور مشکل ہے،

ان کے کلام کی بہت سی تفسیریں اور تراجم بیدل کے اجداد کے ملک بخارا (وسط ایشیا) اور افغانستان میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ بیدل اپنی زندگی میں بھی بے حد مقبول ہوئے اور بعد وفات بھی فارسی شعر و ادب میں ایک بلند ترین مقام پر فائز ہیں۔ ان کی شخصیت و فن نے وسط ایشیا کے تاجک اور ازبک ادب کو بھی شدید طور پر متاثر کیا۔ ماوراُلنہر اور افغانستان میں ''مسلکِ بیدل'' ظہور میں آیا اور ''بیدل خوانی'' کی اصطلاح نے رواج پایا۔ چنانچہ بیدل کے شعری اور فلسفیانہ نکات پر بحث کے لیے ہفتہ وار اجلاس (ہر جمعرات کو) ہونے لگے۔ اصل میں اٹھارویں صدی عیسوی کے وسط میں شمالی ہندوستان، افغانستان اور بالخصوص بیدل کے اجداد کے وطن وسط ایشیا میں بیدل کی تحریروں نظم و نثر کو خصوصی عزت دی گئی۔ مکتبوں میں ان کے علمی اور شعری کارناموں کو بنیادی نصابات میں شامل کیا گیا۔ بیدل کی شاعری نے لوک ادب تک رسائی حاصل کی اور حفاظ حضرات کلامِ بیدل بہت شوق سے محفلوں میں خوش آوازی سے سنایا کرتے تھے۔ خود مجھے بھی اپنے استاد گرامی غلام دستگیر امانزئی صاحب کی وساطت سے ایسی بہت سی محفلوں میں شرکت کا موقع ملا۔ میں امانزئی صاحب سے مثنوی معنوی مولانا رومؒ اور دیوانِ حافظ کی تفسیر پڑھا کرتا تھا اور اپنے فارسی اشعار پر اصلاح لیا کرتا تھا۔ تقریباً 5 سال میں مثنوی معنوی اور دیوانِ حافظ کی شرح استاد امانزئی صاحب سے پڑھی اور اسی دوران میرا فارسی دیوان ''کاروانِ عشق'' بھی مکمل ہوا۔ اسی دوران ایک روز استاد گرامی پروفیسر غلام دستگیر امانزئی صاحب جو پلاننگ اینڈ ڈیولپمنٹ میں ماسٹر کی ڈگری رکھنے کے علاوہ بہت اچھے شاعر بھی تھے اور افسر تخلص اختیار کیا تھا۔ مجھے یونیورسٹی روڈ پر واقع ایک محفل میں لے گئے جو ''بزمِ بیدل شناسی'' کہلاتی تھی۔ ایک کچی چار دیواری کے اندر بڑے سے ہال نما کمرے میں صاحبِ خانہ رحیل پر جہازی سائز کا کلیاتِ بیدل، کھولے بیٹھے تھے اور ان کے اردگرد بہت سے بزرگ و جوان دائرے کی شکل میں قرونِ اولیٰ کے اسلامی مدارس کی طرح بیٹھے تھے۔ استاد گرامی کی آمد پر حاضرین احتراماً کھڑے ہوگئے۔ استاد گرامی فرداً فرداً سب سے ملے اور میرا بھی ان سے اردو اور فارسی کے شاعر کی حیثیت سے تعارف کرایا۔ محفل میں بڑے بڑے علماء شعرا اور بزرگ شخصیات تشریف فرما تھیں۔ مجھے اتنے عالم فاضل لوگوں کے درمیان اپنا آپ ایک حقیر تنکے کی طرح معلوم ہوتا تھا۔ استاد گرامی کی آمد کے بعد بزمِ بیدل کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ صاحبِ خانہ احسان جان اسیر جو کہ ایک بہت بزرگ اور بیدل شناس شخصیت محترم عبدالحمید اسیر کے صاحبزادے تھے، نے کلیاتِ بیدل میں سے ایک غزل منتخب کی اور پہلے تحت اللفظ میں پڑھی اور پھر اس کی تفسیر بیان کی۔ سب اہلِ محفل نوٹ کرتے رہے۔ میں نے بھی دیکھا دیکھی اپنی ڈائری میں اشعار اور ان کی تفسیر کے نوٹس لکھے۔ اب صاحبِ خانہ نے حاضرینِ محفل کو اپنے اپنے خیالات کے اظہار کی دعوت دی۔ جب کئی افراد نے تفسیر سے اتفاق نہ کیا تو آخر میں محترم امانزئی صاحب کو دعوت دی گئی کہ ان کی کیا رائے ہے۔ اور پھر جب محترم استاد گرامی نے کلامِ بیدل کی تشریح و تفسیر بیان کی تو بے اختیار لوگوں نے آفرین آفرین کہہ کر محفل میں گرمی پیدا کردی اور صاحبِ خانہ سمیت تمام اہلِ محفل نے کشادہ دلی سے استاد گرامی کی بیان کردہ تفسیر کو کھلے دل سے قبول کیا اور کہنے لگے کہ واقعی کلامِ بیدل کی یہی تفسیر ہوسکتی ہے۔

میری کلامِ بیدل میں دلچسپی دراصل استاد امانزئی صاحب ہی کی مرہونِ منت ہے۔ اللہ انہیں طویل اور صحتمند زندگی عطا فرمائے۔ (آمین)

ماخذات

1۔ چہار عنصر...... از حضرت ابوالمعانی مرزا عبدالقادر بیدل 2۔ کلیاتِ بیدل...... 3۔ مطالعۂ بیدل فکرِ برگساں کی روشنی میں، حضرت علامہ اقبال 4۔ Bedil in the Light of Bergson ...... 5۔ روحِ بیدل...... از ڈاکٹر عبدالغنی 6۔ شرح دیوانِ غالب 7۔ دیوانِ غالب...... 8۔ کلیاتِ اقبال 9۔ توزکِ جہانگیری ...... خودنوشت شہنشاہ جہانگیر 10۔ شاہ جہان نامہ...... محمد صالح کمبوج 11۔ تاریخ پاک و ہند

دوسرا اور آخری حصہ

حسن رزاقی

ہماری قومی ہوا باز کمپنی پی آئی اے میں کچھ کرنے کی دھن میں وہ نوکر ہوا تھا، اس نوکری نے اسے کیسے کیسے تجربات سے دوچار کیا یہ بھی کم دلچسپ نہیں ہے۔ اس نے تجربات کی بھٹی میں خود کو کندن بنانے کے لیے ہر مرحلۂ دشوار کو کس طرح آسان بنایا یہ سبق ہے ان لوگوں کے لیے جو پل بھر میں حوصلہ ہار دیتے ہیں۔

آسان پیرائے میں ایک دلچسپ خودنوشت

اب تک صرف جہاز پر کام کرنے کا شوق سرفہرست تھا مگر بغیر آف لوڈ ہوئے سکھر کا سفر خیریت سے مکمل کرنے کے بعد مزید ہوائی سفر کا شوق سر ابھار رہا تھا۔

مشرقی پاکستان کا میں نے صرف نام ہی نام سنا تھا۔ دیکھنے کا شوق تھا۔ تہور صاحب کی داستانوں نے جو انہوں نے مجھے گوٹھ بلو میں سنائی تھیں، اس آتشِ شوق کو اور بھی بھڑکا دیا تھا۔

ان دنوں پی ٹی وی پر بنگالی زبان سکھانے کا اہتمام

کیا جاتا تھا۔ اس پروگرام میں گیت سنگیت سے بھی استفادہ کیا جاتا تھا۔ گیت اگر کانوں کو بھلے لگیں تو آسانی سے یاد رہ جاتے ہیں اور ان کا اثر دیرپا ہوتا ہے۔ ایسا ہی ایک گیت تھا ”او تانگہ والا گھوریہ دکھادے اماے کراچی شہر کی۔“

شہر کراچی تو ہر روز ”گھوریہ“ دیکھتے تھے لیکن شہر ڈھاکا گھوریہ دیکھنے کا کبھی اتفاق نہیں ہوا تھا۔ پی آئی اے میں ملازمت یعنی ہوائی سفر کے مواقع تھے تو کیوں نا یہ شوق پورا کرلیا جائے۔ میں نے مشرقی پاکستان جانے کے ارادے سے ایک ہفتہ کی چھٹی کی درخواست دے دی۔

میری چھٹی کی درخواست منظور ہوچکی تھی۔ میرا سالانہ ٹکٹ میرے ہاتھ میں تھا۔ میں ڈھاکا کی پرواز پکڑنے ائرپورٹ روانہ ہوگیا۔ جہاز رن وے پر دوڑ لگانے کے بعد فضا میں بلند ہوچکا تھا۔ یہ بوئنگ کا B-707 جہاز تھا جو اپنے دور کے کامیاب ترین جہازوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ بوئنگ کمپنی کو صحیح وقت پر صحیح جہاز بنانے کا ملکہ حاصل ہے۔ اس کمپنی کے B-747 جہاز نے لگ بھگ پچاس سال اس کرۂ ارض کی فضاؤں پر حکمرانی کی ہے۔ کیونکہ مسافروں کی اس گنجائش کا اور کوئی جہاز موجود نہیں تھا۔ جہاز ران اداروں میں یہ جہاز کیش کاؤ کے نام سے مشہور تھا۔ یہ وہ گائے تھی جس کا دودھ کبھی ختم نہیں ہوسکتا تھا اور بوئنگ اس دودھ کو جس قیمت پر چاہے بیچے۔ اب A-380 ائربس کے آجانے کے بعد B-747 کی حکمرانی تقسیم ہوچکی ہے۔

کراچی سے چلتے وقت موسم خوشگوار تھا لیکن ڈھاکا پہنچتے پہنچتے موسم بدل گیا گہرے بادل چھائے ہوئے تھے۔ جہاز ہچکولے کھا رہا تھا۔ ڈھاکا میں جس وقت جہاز نے لینڈ کیا .... ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔

ڈھاکا کے تیج گاؤں ائرپورٹ پر لینڈنگ ہوئی تھی۔ تیج گاؤں ائرپورٹ انگریزوں نے دوسری جنگ عظیم کے دوران 1941ء میں ائرفورس کے استعمال کے لیے بنایا تھا۔ تقسیم ہند کے بعد تیج گاؤں ائرپورٹ مشرقی پاکستان کا واحد انٹرنیشنل ائرپورٹ کے طور پر استعمال ہوا۔ (1980ء میں ایک نیا انٹرنیشنل ائرپورٹ بنایا گیا جو ضیاء انٹرنیشنل ائرپورٹ کہلایا۔ اب اس کا نام بدل کے شاہ جلال ائرپورٹ رکھ دیا گیا ہے۔ تیج گاؤں ائرپورٹ اب ائرفورس کے استعمال میں ہے)

ہینگر میں میرے ساتھ ایک سپروائزر کام کرتے تھے جن کا تعلق ڈھاکا سے تھا۔ انہوں نے مجھے ڈھاکا کے متعلق بنیادی معلومات فراہم کردی تھیں اور ایک ہوٹل کا پتا بھی دیا تھا کہ میں وہاں قیام کرسکتا تھا۔ میں ٹیکسی لے کر اس ہوٹل میں پہنچ گیا۔ معمولی سا ہوٹل تھا مگر صاف ستھرا۔ میں نے ایک کمرا کرائے پر لے لیا۔

ان دنوں میرے محلے کے ایک دوست قیوم جو اَب کرنل قیوم علی خان (ریٹائرڈ) ہیں۔ ڈھاکا میں اپنے چچا کے یہاں مقیم تھے۔ ان کو میں نے اپنی آمد سے مطلع کردیا تھا اور ہوٹل کا پتا بھی بتادیا تھا۔ وہ ہوٹل آئے تو بہت مایوس ہوئے۔ کہنے لگے کہ اس چھوٹے سے ہوٹل میں ٹھہر کر میں نے پی آئی اے کی بے توقیری کی ہے۔ قیوم میرے اس زمانے کے دوست ہیں جب ہم محلے کے لڑکوں کا ڈرائنگ روم یا تو بہادر آباد کی چورنگی پر لگا کرتا تھا یا اس چورنگی پر جہاں اب رنگون والا ہال ہے۔ اُن دنوں وہ جگہ تقریباً اجاڑ ہوا کرتی تھی۔ کہیں کہیں اِکّا دُکّا گھر بنے ہوئے تھے۔ بہادر آباد کی چورنگی کا بھی یہی حال تھا۔ وہاں شام کے وقت چورنگی کی دکانوں کے اطراف صرف چھ سات گاڑیاں کھڑی دکھائی دیتی تھیں، جس وقت بہادر آباد کی اسکیم بنی ہے اور پلاٹ بکنا شروع ہوئے ہیں تو یہ علاقہ شہر سے باہر ہوتا تھا۔ شہر کی حدود سینٹرل جیل تک آ کر ختم ہوجاتی تھیں۔ زمین وہاں پر بہت سستی تھی یعنی تین روپے فی گز لیکن لوگ پھر بھی نہیں خریدتے تھے کہ اس جنگل میں کون جا کر رہے گا۔

وہ مجھے لے کر سیر کے لیے نکل آیا ہم ایک دکان سے کچا ناریل (ڈاب) کا پانی پی کر باہر نکلے تو سامنے آغا سرور صاحب دکھائی دیے۔ سرور بھائی سے ڈھاکا میں مڈبھیڑ ہوجانا کلی طور پر غیر امکانی تھا۔ یہ محض اتفاق تھا کہ وہ بھی ڈھاکا میں اس وقت موجود تھے جب میں بھی وہاں تھا اور اسی سڑک پر جہاں سے میں گزر رہا تھا۔ قیوم ان کو بااصرار اپنے چچا کے گھر لے گئے کہ وہ سب سرور بھائی کے مداح تھے لیکن گانوں کی محفل نہ جم سکی کہ طبلہ اور ہارمونیم کہاں سے آتا۔ رات کا کھانا ہم سب نے مل کر وہیں کھایا جس کے بعد میں واپس اپنے ہوٹل آگیا۔ ڈھاکا کا شہر گھومنے کا پروگرام کل پر ٹل گیا۔

اگلے روز میں صبح جلدی اٹھ کر تیار ہوگیا کہ سہ پہر کی پرواز سے مجھے چٹاگانگ جانا تھا۔ ڈھاکا گھومنے کے لیے زیادہ وقت نہیں تھا۔ آج میں صرف بیت المکرم اور ستارہ مسجد دیکھنا چاہتا تھا باقی ڈھاکا چٹاگانگ اور کاکس بازار سے واپسی پر دیکھا جاسکتا تھا۔

بیت المکرم دنیا کی دسویں بڑی مسجد ہے۔ اس مسجد کا تصور ابتداً عبداللطیف ابراہیم باوانی صاحب نے پیش کیا تھا جس میں ایک بڑی جامع مسجد کے علاوہ دکانیں، دفاتر، لائبریری اور پارکنگ شامل تھے۔ اس کا ڈیزائن عبدالحسین طھاریانی صاحب کا بنایا ہوا ہے۔ یہ ڈیزائن اس لحاظ سے منفرد ہے کہ اس مسجد میں کوئی گنبد نہیں ہے، سپاٹ چھت ہے۔ اس کی عمارت چوکور ہے، خانہ کعبہ کی طرز پر۔ مسجد کا رقبہ ابتدا میں تیس ہزار مربع فٹ تھا، اب اس میں توسیع کی جاچکی ہے۔ اس کی اونچائی 99 فٹ ہے۔ منبر بہت اونچا ہے اور اس میں آٹھ منزلیں ہیں۔ اس کے مقابلے میں ستارہ مسجد بہت ہی چھوٹی ہے۔ جب یہ شروع میں بنائی گئی تو اس کا رقبہ صرف 33x11 فٹ تھا جو بعد میں توسیع ہونے کے بعد 65x25 فٹ کردیا گیا۔ اس مسجد کو اٹھارویں صدی میں مرزا غلام نے مغل طرزِ تعمیر پر بنوایا تھا۔ اس کے تین گنبد تھے جو اَب پانچ ہیں۔ بعد میں بیسویں صدی کے اوائل میں ایک مقامی تاجر علی جان بیپاری نے اس کی توسیع اور تزئین کروائی۔ اس تزئین میں چینی ٹھیکری (ٹائلز) کا کام کروایا گیا جو اس زمانے میں بہت مقبول تھا۔ اس میں چینی ٹھیکری سے ستارے بنائے گئے جس سے یہ ستارہ مسجد کہلائی۔ مسجد کے اندر بھی چینی ٹھیکری سے دلکش نقوش بنائے گئے ہیں۔

ان دونوں مقامات کو دیکھنے کے بعد میں ہوٹل واپس آیا اور کھانا کھانے کے بعد ائرپورٹ روانہ ہوگیا۔

ڈھاکا سے چٹاگانگ کا سفر فوکر F-27 سے طے ہوا۔ موسم ڈھاکا سے روانگی کے وقت سے ہی خراب ملا۔ بادل، بجلی اور ہلکی بارش، چھوٹا جہاز ہونے کے ناتے فوکر کا یہ جہاز زیادہ تر ہچکولے کھاتا اور ڈولتا رہا۔ جہاز نے چٹاگانگ کے ائرپورٹ پر لینڈ کیا تو بارش تھم چکی تھی۔ ہوا میں نمی تھی موسم خوشگوار تھا۔

چٹاگانگ مشرقی پاکستان (اب بنگلہ دیش) کا دوسرا بڑا شہر ہے۔ یہ اس ملک کی مرکزی بندرگاہ بھی ہے۔ یہ بندرگاہ قدرتی ہے۔ لیکن مجھے چٹاگانگ سے زیادہ چٹاگانگ ہل ٹریکٹس میں دلچسپی تھی۔ تہور صاحب کی سنائی ہوئی داستانیں زیادہ تر انہی، ہل ٹریکٹس کے بارے میں تھیں۔ اس کے علاوہ میں نے کالج کے زمانہ میں ایک فلم دیکھی تھی جس کا نام تھا ”درشن“ اس فلم کے مرکزی کردار رحمان اور شبنم تھے یہ فلم رانگا مائی میں فلمائی گئی تھی۔ اس فلم کا ایک گانا...... یہ موسم یہ مست نظارے...... بہت مقبول ہوا تھا۔ اس گانے کو رانگا مائی کے محکمہ پانی اور بجلی کے ریسٹ ہاؤس کے سامنے والی جھیل کے پس منظر میں فلمایا گیا تھا۔ اس جگہ کے مناظر حد درجہ حسین اور خوبصورت تھے۔ ایسے قدرتی مناظر میری کمزوری ہیں۔ چٹاگانگ کی تارکول کی سڑکوں میں وہ کشش نہ تھی جو ان حسین مناظر میں تھی۔ اگلے دن میں رانگا مائی کے لیے روانہ ہوگیا۔ رانگا مائی چٹاگانگ سے تقریباً 80 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔

چٹاگانگ ہل ٹریکٹس تین اضلاع میں تقسیم ہیں۔ رانگا مائی، خاگراچری اور بندربن۔ اس کا زمینی رقبہ تقریباً پانچ ہزار مربع میل ہے جو بنگلہ دیش کے کل زمینی رقبہ کا تقریباً دس فیصد ہے۔ ضلع رانگا مائی ہل ٹریکٹس کے شمال میں ہے۔ یہاں کا مرکزی شہر بھی رانگا مائی ہی کہلاتا ہے۔ یہی میری منزلِ مقصود تھی۔ یہاں پہنچ کر میں نے اسی ریسٹ ہاؤس میں قیام کیا جہاں فلم ”درشن“ فلمائی گئی تھی۔ میں نے نظاروں کو اتنا ہی مسحور کن پایا جتنا اس فلم میں دیکھا تھا۔ رانگا مائی کی زیادہ تر آبادی مختلف قبائل پر مشتمل ہے جن میں سب سے زیادہ تعداد چکمہ قبیلہ کی تھی۔ چکمہ قبیلہ کے لوگ نسبتاً گورے اور نقش بھدے ہوتے ہیں۔ آج کے شہر رانگا مائی کا حال تو مجھے نہیں معلوم۔ لیکن آج سے کوئی پینتالیس سال پہلے جب میں اس شہر میں وارد ہوا تھا تو وہاں قدرتی نظاروں کے علاوہ اور کوئی قابلِ ذکر اہم جگہ نہیں تھی۔ میں ان نظاروں سے لطف اندوز ہوچکا تھا میری اگلی منزل کپتائی کا ہائیڈرو بجلی گھر تھا۔

یہ بجلی گھر دریائے کرنافلی کے کپتائی ڈیم پر بنایا گیا ہے اور کرنافلی ہائیڈرو الیکٹرک پاور اسٹیشن کہلاتا ہے۔ کپتائی ڈیم کی تعمیر سے کیب کرنافلی وجود میں آئی۔ اس بجلی گھر کا ابتدائی منصوبہ 1906ء میں بنایا گیا تھا جس کے بعد 1923 میں اس پر دوبارہ کام کیا گیا۔ ڈیم بنانے کا مقام دو تین دفعہ تبدیل کرنے کے بعد بالآخر موجودہ جگہ پر 1951 میں منتخب کیا گیا۔ اس کی تعمیر 1957 میں شروع ہوکر 1962 میں مکمل ہوئی۔ اس وقت اس میں چالیس چالیس میگاواٹ کے دو جنریٹر نصب کیے گئے۔ 1982 اور 1988 کے دوران اس میں پچاس پچاس میگاواٹ کے تین مزید جنریٹر نصب کیے گئے۔ آج اس میں کل 230MW کے جنریٹر موجود ہیں۔

پاور اسٹیشن پہنچ کر اپنی آمد کا مقصد بیان کیا کہ

الیکٹریکل انجینئر ہونے کے ناتے اس پاور اسٹیشن کو تفصیل سے دیکھنا چاہتا ہوں۔ مجھے چیف انجینئر صاحب کے دفتر پہنچا دیا گیا جو نہایت گرمجوشی سے ملے اور بذاتِ خود میری خواہش کو پایہ تکمیل تک پہنچایا۔ ان کو خوشی اس بات کی تھی کہ مغربی پاکستان سے کوئی انجینئر خاص طور سے کپتائی آیا تھا صرف ان کے پاور اسٹیشن کو دیکھنے۔ دورے کے اختتام پر انہوں نے بڑے تپاک اور محبت سے ہاتھ ملا کر رخصت کیا۔

پاور اسٹیشن سے باہر نکلا تو سہ پہر کے تین بج چکے تھے۔ تیز دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ بھوک اور پیاس دونوں کی شدت تھی۔ پاور اسٹیشن کے بالکل سامنے ایک لکڑی کا کھوکھا تھا جہاں چولہے پر دو دیگیں چڑھی ہوئی تھیں۔ ایک میں موٹے چاول، دوسرے میں مرغی کا سالن، ساتھ میں سمندری نمک اور گرم پانی۔ اس وقت کا یہ کھانا مجھے آج تک یاد ہے۔ اس کا مزہ آج بھی میری زبان پر ہے۔ اس شدت کی بھوک میں جو مزہ اس کھانے میں آیا شاید کبھی نہیں آیا ہوگا۔ کھانا ختم ہو چکا تھا۔ میں نے اس گرم پانی کا گلاس پیا جو وہاں موجود تھا اور چٹاگانگ شہر کی بس پکڑی۔

چٹاگانگ سے آگے مجھے کاکس بازار جانا تھا۔ یہ سفر بس کے ذریعے تھا۔ بس میں میری ملاقات ایک صاحب سے ہوگئی جو چٹاگانگ کے باسی تھے وہ بندربن جا رہے تھے۔ میں سمجھا سندربن کی بات کر رہے ہیں۔ انہوں نے واضح کیا کہ بندربن جدا جگہ ہے، بے انتہا حسین، میرے قدرتی مناظر کا شوق دیکھ کر مشورہ دیا کہ میں بھی ان کے ساتھ بندربن چلا چلوں۔ کوکس بازار وہاں سے واپسی پر ہو لوں۔ سبز نظارے سبز باغ میں تبدیل ہوتے نظر آئے۔

بندربن جانے کے لیے ہمیں راستے کے شہر دوھاذری میں اترنا تھا کہ وہاں سے جیپ کے ذریعہ بندربن جانا تھا۔ سڑک بہت بنیادی قسم کی تھی، عام گاڑیاں اس پر نہیں چل سکتی تھیں۔

دوھاذری کے بس اسٹاپ پر اتر کر ہم بندربن جانے والی جیپ کا انتظار کرنے لگے۔ بس اسٹاپ پر خوانچہ فروش کھانے پینے کی اشیا بیچ رہے تھے۔ ان چیزوں کے درمیان مجھے ایک کچھ عجیب سی چیز دکھائی دی۔ اس طرح تھی جیسے ناریل پر ریشے چڑھے ہوتے ہیں مگر سائز میں بہت چھوٹی خوبانی جتنی۔ ریشے بہت ہی ملائم، میں نے تجسس سے اپنے ساتھی سے پوچھا جن کا نام نذرل تھا کہ یہ کیا ہے؟ وہ ہنسے اور بولے کہ چھالیا ہے۔ اگر آپ اس کے ریشے اتاریں گے تو آپ کو اندر چھالیا کی گری ملے گی۔ میں نے پانچ چھ دانے خرید لیے۔

ایک گھنٹے بعد جیپ آگئی ہم اس میں سوار ہو گئے۔ راستہ واقعی بہت زیادہ ناہموار تھا مگر سیف الملوک جھیل جانے والی سڑک کے مقابلے میں ہائی وے تھا۔ تیس میل کے قریب فاصلہ تھا جلد طے ہو گیا۔

سانس رک جانے والا منظر تھا۔ بندربن کی آبادی تقریباً مسطح جگہ پر تھی جس کے بالکل نیچے دریا بہہ رہا تھا۔ دریا کے دوسرے کنارے پر پہاڑی تھی جس کی ڈھلان کا اندازہ کرنے کے لیے کافی اوپر دیکھنا پڑا۔ میں مبہوت ہو کر اس منظر کو دیکھ رہا تھا۔

نذرل نے میرا شانہ ہلایا اور بولا "اب میں چمبک قبیلہ کی طرف جا رہا ہوں۔ خدا حافظ۔"

میں نے پوچھا کہ یہ چمبک کیا بلا ہے تو اس نے بتایا کہ چمبک ایک نیم جنگلی قبیلہ ہے جو بندربن سے کچھ فاصلے پر رہتا ہے۔ ہر پیر اور جمعرات کو وہاں بازار لگتا ہے۔ نذرل اسی بازار میں جا کر اپنا سامان بیچ کر اپنی روزی کماتا تھا۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ نذرل جو تھیلا اٹھائے ہوئے تھا اس میں کیوں الم غلم قسم کی چیزیں بھری ہوئی تھیں مثلاً پلاسٹک کی عینک، تانبہ قسم کی دھات کا زیور وغیرہ، وغیرہ۔

میں نے اصرار کیا کہ میں بھی چلوں گا تو وہ بولا کہ رات وہاں ٹھہرنا پڑے گا۔ میں نے جواب دیا کہ جہاں وہ ٹھہریں گے میں بھی ٹھہر جاؤں گا۔ بازار اگلے دن تھا۔ اس پر نذرل نے کہا کہ جلدی کریں کہ ہم لوگوں کو "نوکے" میں سفر کرنا ہوگا۔ پتا چلا کہ "نوکا" کشتی کو کہتے ہیں جس کے لیے ہمیں دریا کی طرف جانا ہوگا۔ دریا پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ آج پانی کی سطح بہت کم ہے۔ نوکے نہیں چل رہے ہیں۔ مایوسی ہوئی۔

اب بندربن میں قیام کا بندوبست کرنا تھا۔ یہاں بھی نذرل کام آیا، کہنے لگا یہاں پر ایک سرکاری ریسٹ ہاؤس ہے آپ اگر وہاں کے چوکیدار سے بات کریں تو ٹھہرا لے گا۔ فالتو پیسے لے گا۔

میں وہاں پہنچا تو چوکیدار نے ہاتھ کے اشارے سے روک دیا کہ چند سرکاری افسر اپنے سامان سمیت ریسٹ ہاؤس سے رخصت ہو رہے تھے۔ موقع نازک تھا۔

ان کے جانے کے بعد وہ میری طرف متوجہ ہوا، کہنے لگا یہ ریسٹ ہاؤس صرف سرکاری لوگوں کے لیے ہیں اور

کوئی نہیں ٹھہر سکتا۔ وہ اپنے فالتو پیسوں کا بندوبست کرنا چاہتا تھا۔ میں نے اپنا پی آئی اے کا ID کارڈ دکھایا تو ایک دم اس کا رویّہ بدل گیا کہ میں بھی کسی طور سے سرکار کا ملازم تھا اور وہ مجھے نہ ٹھہرا کر یا زیادہ پیسے لے کر اپنے لیے کوئی مصیبت پیدا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ کرایہ صرف ڈیڑھ روپے یومیہ تھا جو میں نے ایڈوانس میں دے دیا۔

بندربن میں قدرتی نظاروں کے علاوہ اور کچھ نہ تھا۔ لیکن میرے لیے یہی سب کچھ تھا۔ دوسرے دن صبح میں نے چوکیدار سے چمبک نہ جا سکنے کے افسوس کا اظہار کیا تو وہ بولا۔ "صاحب ایک اور طریقہ ہے۔ یہاں پر جو چرچ ہے اس کے پاس ایک جیپ ہے جو وہ آنے والے سیاحوں کو دے دیتے ہیں کہ وہاں کا پادری بہت اچھا آدمی ہے۔ باہر سے آنے والوں کا خیال کرتا ہے۔"

میں اس کو لے کر چرچ پہنچا تو فادر وہاں موجود نہیں تھے۔ لیکن برادر سے ملاقات ہوگئی۔ انہوں نے افسوس کا اظہار کیا، کہنے لگے کہ وہ ضرور مجھے جیپ دے دیتے بشرطیکہ میں پٹرول کے پیسے دے دیتا۔ لیکن وہ مجبور تھے کہ جیپ موجود نہ تھی کہ علاقہ کے انسپکٹر آف اسکولز اسی جیپ کو لے کر... کل شام چمبک چلے گئے تھے۔ شام تک واپس آ جائیں گے۔ میں اگلے دن چمبک جا سکتا ہوں۔ میرے پاس مزید ایک دن کا وقت نہ تھا کہ مجھے کاکس بازار بھی جانا تھا۔

برادر خوش اخلاق آدمی تھے۔ چائے منگائی اور کافی دیر باتیں کرتے رہے۔ پتا چلا کہ چرچ مشنری کلیسا ہے جس کا مقصد چمبک اور اس سے بھی دور افتادہ علاقوں میں عیسائیت پھیلانا ہے۔ فادر اپنے کام سے بہت مخلص ہیں۔ دور دراز علاقوں میں جانا پڑتا ہے جہاں سواری کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ عام طور سے ان کا مشن ہفتہ دس دن کا ہوتا ہے۔ وہ کچھ خشک گوشت اور چنوں کی تھیلی ساتھ لے کر جاتے ہیں کہ چنوں میں طاقت ہوتی ہے۔ اسی میں ان کا گزارا ہو جاتا ہے۔ دشوار گزار پہاڑی علاقوں میں زیادہ وزن لے کے ساتھ نہیں چڑھا جا سکتا۔ وہ ان جنگلی اور نیم جنگلی قبیلوں کے کئی سو لوگوں کو عیسائی بنا چکے ہیں۔ میں سوچنے لگا کہ اس ملک میں جو مسلمانوں کا اس وقت سب سے بڑا ملک تھا، کیا کوئی بھی ایسا ادارہ یا کوئی ایسا فرد ہے جو اتنی جانفشانی سے اپنے مذہب میں جان لڑا سکے جس طرح کہ فادر لڑا رہے تھے۔

چرچ سے واپس آ کر میں نے اپنا بیگ اٹھایا کہ اب دوھاذری واپسی کا ارادہ تھا۔ میں جب باہر جانے لگا تو چوکیدار ایک رجسٹر اٹھا لایا اور بتایا کہ اس میں آنے والے مہمان اپنی رائے کا اظہار کرتے ہیں۔ آپ بھی کچھ لکھ دیجیے۔ کچھ لکھنے سے پہلے میں نے اس رجسٹر کو پڑھا۔ کئی لوگوں نے اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا اور ساتھ ساتھ کچھ مشورے بھی دیے تھے۔ ایک مشورے پر خاص طور سے میری نظر اٹک گئی۔ لکھا تھا "اس ریسٹ ہاؤس کا کرایہ بہت زیادہ ہے اس کو ڈیڑھ روپے سے گھٹا کر ایک روپیہ کر دینا چاہیے۔" (بہتوں کا بھلا ہوگا)

میں نے اپنی رائے لکھی اور بیگ اٹھا کے باہر نکل گیا کہ جیپ کے آنے کا وقت قریب آ رہا تھا۔ دوھاذری پہنچ کر میں نے کاکس بازار کی بس پکڑی جس نے مجھے کچھ دیر بعد کاکس بازار پہنچا دیا۔

کاکس بازار سمندر کے کنارے واقع ہے۔ ساحلِ سمندر ایک چند کمروں کا ہوٹل تھا۔ میں نے ایک کمرا کرائے پر لے لیا۔ سامان کمرے میں چھوڑ کر ساحلِ سمندر پر نکلا تو تازہ اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکے نے استقبال کیا۔ میرے پھیپھڑوں میں جتنی ہوا سما سکتی تھی میں نے سمو لی۔ سمندر کراچی والوں کے لیے کوئی انوکھا نظارہ نہیں ہے۔ لیکن اس وقت کا منظر دلفریب تھا۔ غروب آفتاب کا وقت ہوا چاہتا تھا۔ سورج ایک دہکتے ہوئے گولے کی طرح سطح سمندر سے ایک فٹ کی اونچائی پر دکھائی دے رہا تھا۔ چند منٹ کے اندر اندر سورج سمندر میں ڈوب چکا تھا۔ آسمان پر شفق کی لالی حسین منظر پیش کر رہی تھی۔ میں ریت پر بیٹھ کر یہ منظر دیکھتا رہا کہ جھٹپٹا ہونے لگا۔

میں کمرے میں واپس آ گیا۔ رات کا کھانا کھا کر میں پھر ساحل کی طرف نکل گیا۔ آسمان پر چودھویں کا چاند ماہِ کامل بن چکا تھا ہر طرف دھیمی اور سحر انگیز چاندنی پھیلی ہوئی تھی۔ سمندر کی موجیں چاند سے گلے ملنے کے لیے اپنی پوری طاقت اور زور سے اچھل رہی تھیں۔ علامہ اقبال کا شعر:

سوتوں کو ندیوں کا شوق۔ بحر کا ندیوں کو عشق
موجۂ بحر کو تپش، ماہِ تمام کے لیے

تخیل کا مرہونِ منت نہ رہا تھا۔ حقیقت کا روپ دھار چکا تھا۔

منظر مسحور کن تھا۔ آنکھیں نیند سے بوجھل ہو رہی تھیں۔

رات سوتے وقت میں کھڑکی کا پردہ بند کرنا بھول گیا

تھا۔ صبح صبح ابھرتے ہوئے سورج کی کرنوں کی تپش نے مجھے وقت سے پہلے جگا دیا۔ میں تیار ہو کر شہر گھومنے نکل گیا کہ آج شام میں مجھے چٹا گانگ اور وہاں سے ڈھاکا جانا تھا۔

شہر گھوم کر میں واپس آیا تو ہوٹل کے سامنے ان دکانوں پر رک گیا جہاں پر سیپیوں، گھونگوں وغیرہ سے بنی ہوئی مختلف چیزیں بکتی ہیں۔ میرے لیے یہ کوئی انوکھی چیزیں نہ تھیں کہ کراچی کے ساحل پر بھی اسی قسم کی بے شمار چیزیں ملتی ہیں۔ لیکن ان دکانوں میں سے ایک دکان خاص تھی۔ اس میں ایک نوجوان صرف اپنے ہاتھ سے بنائی ہوئی اشیا فروخت کرتا تھا۔ لوگوں نے اس کا نام آرٹسٹ رکھ چھوڑا تھا۔ یہ نام اس کو اس لیے دیا گیا تھا کہ اس کی بنائی ہوئی چیزیں نہایت نفاست سے بنی تھیں اور دوسروں کی بنائی ہوئی عام چیزوں سے مختلف ہوتی تھیں۔ ان سب چیزوں پر اس کے ہنر کی چھاپ لگی ہوتی تھی کہ جس طرح تصویریں تو سب ہوتی ہیں مگر چغتائی آرٹ چیز ہی کچھ اور ہے۔ میں نے اس کی بنائی ہوئی چند اشیا خریدیں۔ یہ چیزیں اور چھالیا کئی سال میرے پاس رہیں۔

میرا ڈھاکا کا واپسی کا قیام ایک دن کا تھا۔ قیوم کراچی واپس جا چکے تھے۔ میں دوبارہ اسی ہوٹل میں ٹھہر سکتا تھا جس میں کراچی سے آمد کے وقت ٹھہرا تھا۔ ہوٹل سے باہر آکر میں نے ایک سائیکل رکشا پکڑا۔ اس کو بتایا کہ میں صرف ڈھاکا کے ایک دو اہم مقامات دیکھنا چاہتا ہوں لیکن مجھے نہیں معلوم کہ وہ کیا ہیں اور کہاں ہیں۔ لہٰذا وہ مجھے ان مقامات کی سیر کروا دے۔ بیت المکرم اور ستارہ مسجد کے علاوہ کہ وہ میں دیکھ چکا تھا۔

ڈھاکا میں نسبتاً ہر چیز کا سائز چھوٹا تھا۔ آدمیوں کے علاوہ جانوروں کا بھی۔ مجھے وہاں کی گائے اس گائے کے مقابلے میں چھوٹی معلوم ہوئی جو مغربی پاکستان میں ہوتی ہیں۔ سائیکل رکشا بھی اسی تناسب سے بنائے گئے تھے اور ان میں بیٹھنے کی جگہ تنگ تھی، دو آدمی بیٹھ جائیں تو کھوے سے کھوا چھلتا تھا۔ یہ رکشے امام نذیر کے اس دور کے لیے بہت کارآمد ہو سکتے تھے جب وہ اپنی منگیتر کا قرب حاصل کرنا چاہتے تھے مگر وہ سائرن بجا دیتی تھیں بالکل دھوپ دھوپ کی طرح۔ وہ رکشا میں بیٹھ کر جتنا چاہتے گھومتے گو ہرِ مقصود کبھی حاصل ہوتا اور سائرن بھی نہ بجتا۔

رکشے والا مجھے گھماتا رہا۔ مشقت سے رکشا چل رہا تھا اور وہ بار بار پیشانی سے اپنا پسینا پونچھ رہا تھا۔ ایک جگہ ہم لوگ کھانے کے لیے رک گئے۔ اب ہم تقریباً دوست بن چکے تھے۔ وہ مجھ سے کراچی وغیرہ کے متعلق باتیں کر رہا تھا۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ ایک عام بنگالی شہری کے مغربی پاکستان کے متعلق کیا خیالات ہیں۔ ان کا خیال تھا کہ بنگال میں رہنے والوں کا استحصال کیا جا رہا ہے۔ بنگال پٹسن پیدا کرتا ہے اور مغربی پاکستان اس پر عیش کرتا ہے۔ میں نے کوشش کی کہ اس کو اپنا نظریہ بتا دوں مگر زیادہ کامیابی نہ ہوئی۔

میں ڈھاکا سے کراچی آگیا اور روزمرہ کے معمول میں مصروف ہو گیا۔ لیکن مصروفیت زیادہ طویل ثابت نہ ہوئی اور ایک نیا پروانہ جاری ہو گیا۔ ہوا یہ تھا کہ...... تین سال کی مدتِ ملازمت پوری کرنے پر پی آئی اے میں ایک سہولت ملتی تھی۔ بیرونِ ملک سفر کی سہولت۔ اسی ID90 ٹکٹ پر۔ مغرب میں استنبول تک اور مشرق میں ٹوکیو تک۔ میری ایک ذاتی سہولت اور تھی کہ میرے بڑے بہنوئی ڈاکٹر امین الدین انٹرنیشنل اٹامک انرجی ایجنسی (IAEA) کی اسکالرشپ پر اوساکا میں پوسٹ ڈاکٹرل ریسرچ کر رہے تھے۔ طعام اور قیام کا مفت اور اعلیٰ بندوبست موجود تھا۔ حسنِ اتفاق کہ اسی سال اوساکا میں عالمی میلہ بھی لگا ہوا تھا۔ ان ساری سہولتوں کے بعد بھی جاپان نہ جانا کفرانِ نعمت تھا۔

پی آئی اے کی فلائٹ ہفتہ میں دو بار براستہ بنکاک اور منیلا، کراچی سے ٹوکیو جاتی تھی، راستے میں ڈھاکا بھی رکتی تھی کہ ابھی 1970ء میں بنگلہ دیش نہیں بنا تھا۔ مشرقی پاکستان سلامت تھا۔ میں نے رقمِ خطیر یعنی تین سو روپے کے بدلے ID90 ٹکٹ خرید لیا۔ راستے میں بنکاک میں بھی دو روز کا قیام تھا۔ پورا ٹکٹ تین ہزار روپے کا آتا تھا ہمیں صرف دس فیصد پیسے دینے تھے جو تین سو روپے بنتے تھے۔ اس زمانے میں کراچی سے لاہور کا ٹکٹ صرف دو سو روپے کا تھا جو اب دس یا بارہ ہزار روپے ہے۔ سستے زمانے تھے۔ ایوب خان کا دور تھا۔ بھٹو صاحب کی اپنی سیاست کا ابھی آغاز نہیں ہوا تھا۔ لیکن ان کی مقبولیت بڑھ رہی تھی۔ ایک دفعہ میں بھی اسی فلائٹ پر سفر کر رہا تھا جس میں بھٹو صاحب بھی موجود تھے۔ جہاز بیچ میں رکتا تھا۔ اس دوران مسافروں کو لاؤنج میں بھیج دیا جاتا تھا۔ میں لاؤنج میں آیا تو دیکھا کہ بھٹو صاحب اکیلے ٹہل رہے ہیں اور کچھ لوگ ان کی طرف اشتیاق بھری نظروں سے دیکھ رہے ہیں لیکن آگے نہیں بڑھتے۔ پھر ان میں سے ایک نے آگے بڑھنے کی

ہمت کی اور ان سے ہاتھ ملایا۔ اس آدمی کا بھٹو صاحب سے ہاتھ ملانا تھا کہ پورا مجمع ان پر ٹوٹ پڑا اور ان سے ہاتھ ملانے اور بات کرنے کا خواہشمند تھا۔ اتنے میں پرواز کا اعلان ہوا اور مسافر جہاز کی طرف روانہ ہو گئے۔

چونکہ جاپان سے واپس آتے ہی مجھے لائسنس کا امتحان دینا تھا اس لیے میں نے صرف دس دن کی چھٹی لی۔ راستے میں بنکاک بھی رکنا تھا۔

آج کے بنکاک کے مقابلے میں 1970 کے بنکاک کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ بنکاک اور کراچی کا مقابلہ ایسے ہی تھا جیسے حیدرآباد اور کراچی۔ اس زمانے میں ترقی پذیر ملکوں میں پاکستان کی کچھ حیثیت تھی۔ ایک کتاب میں پاکستان اور انڈونیشیا کا موازنہ تھا کہ پاکستان کس قدر بہتر حالت میں ہے۔ سنگاپور کے وزیراعظم نے پاکستان کی مثال دی تھی اور کہا تھا کہ ہم پاکستان سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں صرف یہ دیکھ کر کہ پاکستان کیا کر رہا ہے اور کیسے۔ کئی دہائیوں بعد جب سنگاپور معاشیاتی ترقی کی مثال بن گیا اور پاکستان انحطاط پذیر تھا تو انہی وزیر کو پاکستان آنے کی دعوت دی گئی کہ ہم ان کے تجربے سے فائدہ اٹھا سکیں۔ سنگاپور واپس جانے پر انہوں نے اپنی کابینہ سے پھر وہی جملہ دہرایا کہ ہم پاکستان سے بہت کچھ سیکھ سکتے ہیں۔ مگر اس دفعہ وجہ مختلف تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ سنگاپور کو معلوم کرنا چاہیے کہ پاکستان نے کیا کیا ہے...... کہ وہ اس حالت کو پہنچ گئے ہیں...... ان چیزوں کے کرنے سے بچنا چاہیے۔ یہ واقعہ مجھے میرے ایک پاکستانی دوست نے سنایا تھا جو سنگاپور میں کافی عرصہ سے مقیم تھے۔ میں وثوق سے نہیں کہہ سکتا کہ یہ سو فیصد سچ ہے۔

جہاز میں ایک صاحب سے ملاقات ہوئی جو انگریز نژاد تھے اور بنکاک اکثر جایا کرتے تھے کہ اپنی بیوی کی زیادتیوں کو بھلا سکیں۔ بنکاک میں اس وقت ایک لاکھ سے زیادہ ایسی رجسٹرڈ ہوسٹس تھیں جو آپ کا ہر غم بھلانے کے لیے ہر وقت اور ہر جگہ تیار رہتی تھیں۔ امیگریشن کے مرحلے سے گزرنے کے بعد انہوں نے پوچھا "کس ہوٹل میں ٹھہرے ہو۔" میں نے جواب دیا کہ مجھے کسی ہوٹل کا پتا نہیں ہے شہر جا کر دیکھوں گا۔ انہوں نے مشورہ دیا کہ ان کے ساتھ ان کے ہوٹل چلوں وہ ہمیشہ وہیں ٹھہرتے ہیں۔ شہر کے بیچوں بیچ ہے۔ صاف ستھرا ہے اور کم قیمت۔ ہوٹل میں اتنی ساری خوبیاں یکجا ہونا مشکل ہوتا ہے۔ میں بھی ان کے ساتھ ٹیکسی میں بیٹھ گیا۔ ٹیکسی کی بھی وہی خستہ حالت تھی جو پورے بنکاک شہر کی تھی۔

جونسن نے مجھے مشورہ دیا کہ آج رات میں ان کے ساتھ بنکاک گھوموں اور کل صبح "روز گارڈن" کا ٹور کروں کہ وہاں پر مجموعی طور پر تھائی لینڈ کی تہذیب کی عکاسی کرنے والی چیزیں موجود ہیں۔ ٹور کی بکنگ ہوٹل سے ہو جائے گی۔

رات میں جونسن بنکاک گھومنے نکل گئے۔ جونسن ہر گلی کوچے سے واقف تھے۔ مجھے سارا شہر دکھا دیا پھر ایک بار میں داخل ہوئے یہاں اسٹیج پر ڈانس ہو رہا تھا اور ایک گلوکارہ تھائی گیت گا رہی تھی۔ سازوں کی آواز تیز تھی۔ گیت کی دھن بہت اچھی تھی اور زبان سے نا آشنا ہونے کے باوجود سُرور آ رہا تھا۔ جونسن نے دو بیئر آرڈر کیے میں نے معذرت کی کہ میں بیئر نہیں پیتا۔ میرے لیے کوکا کولا آگیا۔ گانا ختم ہوا تو وہ گلوکارہ جو ابھی گانا گا رہی تھی ہماری میز پر آکر کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی۔ جونسن نے تعارف کرایا کہ وہ ان کی پرانی دوست تھی اور وہ اسی کی خاطر بنکاک کے چکر لگاتے تھے۔ نام مختصر سا تھا "ٹنک"۔ ٹنک کو ابھی ایک دو گیت اور گانے تھے۔ جب وہ اپنے گیتوں سے فارغ ہوئی تو آدھی سے زیادہ رات گزر چکی تھی۔ ہم تینوں نے ٹیکسی کی اور ہوٹل واپس آگئے۔ میں اپنے کمرے میں آگیا۔ وہ جونسن کے کمرے میں چلی گئی۔ سوتے سوتے رات کے تین بج گئے۔

صبح صبح عجیب سی آوازیں سنائی دیں۔ میں چونک کر اٹھ گیا۔ کچھ دیر تو سمجھنے کی کوشش کی جب نیند کا خمار اترا تو پتا چلا کہ کوئی دروازہ پیٹ رہا ہے۔ آنکھیں ملتے ہوئے دروازہ کھولا تو ہوٹل کا بیرا سامنے کھڑا تھا۔ ٹوٹی پھوٹی انگریزی میں اس نے بتایا کہ روز گارڈن جانے والی ویگن نیچے کھڑی ہے اور انتظار ہو رہا ہے فوراً نیچے پہنچوں۔ اس کے الفاظ تھے۔ "یو ہری اپ سون" ناشتے کا کوئی سوال نہ تھا۔ جلدی جلدی تیار ہو کر نیچے پہنچا۔ بس ہم لوگوں کو لے کر روانہ ہو گئی۔ پانچ چھ آدمی اس میں پہلے سے ہی بیٹھے ہوئے تھے۔

روز گارڈن ایک بہت بڑے احاطہ میں تھا جس میں تھائی زندگی اور ثقافت کے متعلق اسٹالز تھے۔ جن میں تھائی زندگی کی جھلک دکھائی جا رہی تھی۔ جیسے ریشم بنانا۔ (تھائی سلک دنیا بھر میں مشہور ہے) ہاتھیوں سے کام لینے کا طریقہ۔

پہاڑی علاقہ چانگ مائی چانگ رایا کی ثقافت، وہاں کے لباس زیور وغیرہ۔ ایک اسٹال پر تھائی باکسنگ کا مظاہرہ ہو رہا تھا۔ یہ باکسنگ ہاتھوں کے بجائے پیروں سے

لڑی جاتی ہے۔ ایک اسٹال پر تھائی ڈانس ہو رہا تھا۔ یہ سارا سلسلہ ختم کرکے ہوٹل پہنچے تو ڈھائی بج رہے تھے۔ بھوک اپنے عروج پر تھی۔ جونسن اور تنگ میرا انتظار کر رہے تھے۔ جونسن نے کہا کہ آج کا کھانا میرے کھاتے میں۔ میں تم کو آج اصلی تھائی کھانا کھلاؤں گا۔ تم جلدی سے منہ ہاتھ دھوکر آجاؤ۔

اس زمانے میں بنکاک میں سڑک کے کنارے لکڑی کے کیبن نما کھوکھے ہوا کرتے تھے جن میں خالص تھائی کھانا ملتا تھا اور یہ اس ہوٹل کی مالکن خود تیار کرتی تھی۔ صرف چھ سات آدمیوں کے کھانے کی جگہ ہوتی تھی۔ مجھے ان میں سے کسی ایک بھی ڈش کا نام یاد نہیں لیکن مزہ سب کا یاد ہے۔ انتہائی لذیذ کھانا تھا یا شاید بھوک زیادہ لگی ہوئی تھی۔

ہوٹل پہنچ کر ان دونوں نے مجھے الوداع کہا کہ وہ دونوں چانگ مائی جا رہے تھے۔ تنگ کا آبائی گھر چانگ مائی میں تھا۔

چانگ مائی کا علاقہ میں نے کئی سال بعد دیکھا جب میں سعودی ائیرلائن کے لیے کام کر رہا تھا۔ پہاڑی علاقہ ہے اور قدرت نے اس کو حسین مناظر سے نوازا ہے۔ اس کے ساتھ ہی یہاں کی لڑکیوں کو بھی حسن کی دولت دی ہے۔ لیکن یہی دولتِ حسن ان میں سے اکثر کے لیے عذابِ جاں بن جاتی ہے۔ ان لڑکیوں کی رنگت گوری اور نقش دلکش ہوتے ہیں۔ ناک بھی اتنی دبی ہوئی نہیں ہوتی جتنی بقایا تھائی لڑکیوں کی ہوتی ہے۔ یہاں کے لوگ زیادہ تر غریب ہوتے ہیں۔ کھیتی باڑی کرتے ہیں۔ بنکاک میں گروہ ہیں جو ان لڑکیوں کو اغوا کرکے لے جاتے ہیں۔ بنکاک لاکر ان کے ساتھ بہیمانہ سلوک کیا جاتا ہے۔ لاتعداد مرتبہ اجتماعی زیادتی کی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ مکمل طور پر ٹوٹ پھوٹ جاتی ہیں۔ ان کی قوتِ مدافعت ختم ہو جاتی ہے۔ عزتِ نفس دم توڑ دیتی ہے۔ اس کے بعد ان کو جسم فروشی کے پیشے پر لگا دیا جاتا ہے۔

تنگ کے ساتھ بھی یہی کچھ ہوا تھا۔ مگر اس کی تقدیر اچھی تھی کہ قدرت نے اس کو اچھی آواز سے نوازا تھا۔ اس کو گلوکارہ بنا دیا گیا اور وہ روز روز کے دھندے سے بچ گئی۔

جونسن نے اپنے کمرے میں جانے سے پہلے بتایا کہ تھائی لینڈ کی ایک اور منفرد چیز ہے جسے دیکھے بغیر یہ نہیں کہا جاسکتا کہ میں نے تھائی لینڈ دیکھا ہے۔ یہ تھے نہروں میں تیرتے بازار۔

اگلی صبح میں ویگن میں سوار ہوکر تیرتے بازار کی طرف روانہ ہوگیا۔ ویگن نے ہمیں نہر کے کنارے اتار دیا۔ وہاں سے آگے گائیڈ کے ساتھ جانا تھا۔ یہ ایک غیر معمولی منفرد بازار تھا۔ نہر میں بیسیوں کشتیاں کھڑی تھیں جن میں انواع واقسام کی چیزیں تھیں اور لوگ بھاؤ تاؤ میں لگے ہوئے تھے۔

بازار سے فارغ ہوکر میں نے ہوٹل جانے کے بجائے شہر کا رخ کیا۔ میں پیدل چل رہا تھا۔ جگہ کا نام شاید نورو تھا۔ وہاں پر ایک میدان میں درختوں کے نیچے چند میزیں کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ لوگ کھانا کھا رہے تھے۔ مجھے تجسس ہوا کہ دیکھوں یہ کیسا کھانا ہے۔ قریب پہنچا تو ایک لڑکا کھانا لا رہا تھا۔ میں نے اس سے انگریزی میں پوچھا کہ کھانے میں کیا ہے۔ وہ ہونقوں کی طرح میرا منہ دیکھنے لگا پھر مجھے رکنے کا اشارہ کرکے باورچی خانہ نما کمرے کی طرف بھاگا اور اپنی مالکن کو بلا لایا۔ وہ بے چاری بھی حیران پریشان مجھے دیکھتی رہی۔ اتنے میں کسی نے پیچھے سے میرے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر تھپتھپایا۔ میں نے مڑ کر دیکھا تو ایک چینی نقوش کا آدمی کھڑا تھا۔ مجھ سے پوچھنے لگا کہ تمہیں کیا چاہیے، میں نے جواب دیا کہ میں کھانا کھانا چاہتا ہوں مگر اس میں خنزیر کا گوشت نہیں ہونا چاہیے۔

اس نے پوچھا "یو وائٹ فلائیڈ لائس۔"

میں نے جواب دیا کہ نہ میں مکھی کھا سکتا ہوں نہ ہی جوئیں۔ وہ جھنجلا گیا۔

بولا "نو نو" پھر ایک چاول کی ڈش کی طرف اشارہ کیا اور کہا "ڈس" اب میں سمجھا کہ یہ مجھ سے "فرائیڈ رائس" کی بات کر رہا تھا۔ میں نے سر ہلا دیا۔ اس نے مالکن سے کہا کہ ایک پلیٹ فرائیڈ رائس، لے آئے جس میں سؤر کا گوشت نہ ہو پھر بڑبڑا کر میری طرف دیکھا اور پوچھا۔ "یو مسلم۔"

میں نے کہا "ہاں۔"

اس نے اپنا ماتھا پیٹ لیا اور کچن کی طرف بھاگا۔ میں پریشان تھا کہ کیا معاملہ ہے۔ وہ مالکن کو اپنے ساتھ لے آیا تھا۔ ہانپتے ہوئے مجھ سے پوچھا۔ "یو وائٹ لارڈ" میں سمجھا انتقامی کارروائی کے طور پر کسی انگریز لارڈ کو چبا جانے کے متعلق پوچھ رہا ہے۔ میں نے جواب دیا کہ میں آدم خور نہیں ہوں۔

اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو چکا تھا اپنے پیروں پر ہاتھ مارتے ہوئے تقریباً چیختے ہوئے بولا۔ "نو نو پورک فیٹ۔"

میں نے کانوں کو ہاتھ لگایا کہ میں سؤر کی چربی میں بنائی ہوئی کوئی چیز نہیں کھا سکتا۔

اب اس کو اطمینان ہوا۔ اس نے مڑ کر مالکن سے کہا کہ میرا کھانا کسی اور چربی میں بنائے لارڈ استعمال نہ کرے۔

میں نے اس کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے میرا ایمان بچا لیا۔ وہ خود بھی چینی مسلمان تھا۔ تھائی لینڈ میں بہت سے چینی آباد ہیں۔ کھانا کھا کر میں ہوٹل آیا اور ائیرپورٹ کے لیے روانہ ہوگیا۔

اگلا اسٹاپ منیلا تھا۔ منیلا ائیرپورٹ کی اپروچ نہایت دلکش تھی۔ سمندر ہر طرف، ہریالی کا دور دور پتا نہ تھا، ریگستان کا سماں لگتا تھا۔ کراچی میں رطوبت بھی بہت زیادہ ہوتی ہے لیکن اس معاملے میں منیلا بازی لے گیا۔ گرمی کے دن تھے رطوبت اپنے عروج پر تھی۔ جہاز کے دروازے سے نکلتے ہی لگتا تھا کہ پسینے میں نہا گئے۔ کوچ میں بیٹھ کر ائیرپورٹ کی عمارت میں داخل ہوگئے اور ٹرانزٹ لاؤنج کا رخ کیا کہ یہاں میرا قیام نہ تھا۔ ایک گھنٹے بعد واپس جہاز میں ٹوکیو کے لیے کوچ۔

ٹوکیو میں جہاز سے نیچے اتر رہا تھا کہ آواز آئی "رزاقی۔"

مجھے حیرت ہوئی کہ ٹوکیو میں کون مجھے آواز دے رہا ہے۔ آواز کی سمت نظر اٹھائی تو دیکھا وہاں پی آئی اے کے انجینئر سلام صاحب کھڑے تھے۔ ہاتھ ہلا کر اپنی طرف آنے کا اشارہ کر رہے تھے۔ سلام صاحب ہینگر میں ایوانکس انجینئر تھے اور میں ان کے زیرِ نگرانی کام کر چکا تھا۔ ان کے کام کروانے کا انداز کچھ ایسا تھا۔ "ہم آپ سے کہہ رہے ہیں کہ یہ کارڈ لیجیے اور کام ختم کرنے کے بعد ہم کو آکر بتایئے۔" اس انداز کی بنا پر ہینگر میں وہ کمانڈر کے نام سے مشہور تھے۔ بہت ہی بھلے اور ذہین آدمی تھے۔

سلام صاحب کے نزدیک پہنچا تو بڑے جوش سے گلے ملے اور پوچھا "یہاں کیسے؟"

میں نے جواب دیا "ID90 کے طفیل اوساکا میں بین الاقوامی میلہ گھومنے آیا ہوں۔"

اپنے کمانڈر والے انداز میں بولے۔ "مجھے کیوں نہیں بتایا کہ جاپان آرہے ہو۔"

عرض کیا کہ مجھے ان کی ٹوکیو پوسٹنگ کا علم نہ تھا۔

انہوں نے سزا دیے بغیر معاف کر دیا۔ ان کا بڑا پن تھا۔

دوسرا سوال تھا کہاں ٹھہرے ہو۔ میں تمہاری بکنگ کینسل کرواؤں گا، میرے ہوتے ہوئے تم اور کہیں نہیں ٹھہر سکتے۔ میں نے عرض کیا کہ ابھی میں نے کوئی بکنگ نہیں کروائی ہے شہر جاکر معلوم کرنے کا ارادہ تھا۔ اس پر دوسری ڈانٹ پڑی کہ غیر ملک میں منہ اٹھائے چلے آرہے ہو یہ تک نہیں معلوم کہ کہاں ٹھہرو گے، بچپنے کی انتہا ہے۔ اس کے بعد گھر فون کرکے اپنی بیگم کو میرے آنے اور ان کے گھر قیام کی اطلاع دی۔ مجھے ایک جاپانی کے حوالے کیا کہ وہ ٹیکسی کا بندوبست کرکے مجھے گھر بھجوا دے۔ جب گھر پر اتر کر میں نے کرایہ ادا کرنا چاہا تو پتا چلا کہ کرایہ اس کو دیا جا چکا ہے۔ سلام صاحب کی شفقت اور محبت نے مجھے احسانمند کر دیا۔

بیگم سلام میری منتظر تھیں۔ بڑے تپاک سے ملیں۔ مجھے میرا کمرا دکھایا اور کہنے لگیں کہ آپ منہ ہاتھ دھولیں میں آپ کے لیے چائے بناتی ہوں۔ میں نے شکریہ ادا کیا کہ چائے میں جہاز پر پی چکا تھا۔ اس وقت صرف سونے کا خواہشمند ہوں۔ لیٹتے ہی نیند آگئی۔

یکایک میری آنکھ کھلی، دیکھا تو لائٹ جلی ہوئی تھی۔ سلام صاحب سامنے کھڑے تھے۔ بولے "گرمی میں سو رہے ہو AC نہیں چلایا۔"

میں نے جواب دیا کہ اگر AC ہوتا تو ضرور چلاتا۔

اس پر انہوں نے فرش پر لگے اے سی کی طرف بڑھ کر اس کو چلا دیا۔ فرش پر نصب اے سی میں نے پہلی بار دیکھا تھا۔ صرف اے سی ہی نہیں میں نے اس سفر میں اور بھی بہت سی چیزیں پہلی بار دیکھی تھیں۔ یہ پاکستان سے باہر میرا پہلا سفر تھا۔ سلام صاحب شب بخیر کہہ کر چلے گئے۔ میں نیند کی آغوش میں لڑھک گیا۔

صبح اٹھا تو سلام صاحب باہر جا چکے تھے، بیگم سلام نے ناشتہ تیار کر رکھا تھا۔ میں ناشتا کرتا رہا۔ پردیس میں رہ کر دیس کی یاد ستاتی ہے۔ بیگم سلام کراچی کی باتیں کرتی رہیں۔ ناشتا ختم کرکے میں نے اپنا سامان اٹھایا۔ بیگم سلام سے ان کی مہربانیوں کا شکریہ ادا کیا اور ٹیکسی میں بیٹھ کر اسٹیشن روانہ ہوگیا۔ اوساکا کا قصد تھا۔

1970 میں دنیا کی تیز ترین ٹرین جاپان میں تھی جس کا نام ہکاری تھا مگر اپنی رفتار کی بنا پر بلٹ ٹرین کہلاتی تھی۔ ٹوکیو اور اوساکا کے درمیان چلتی تھی۔ میں اسٹیشن دیر سے پہنچا۔ بلٹ ٹرین گولی کی طرح نکل چکی تھی۔ اوساکا کے

لیے اگلی ٹرین آدھے گھنٹے بعد تھی جو ایکسپریس ٹرین تھی۔ یہ بھی خاصی تیز رفتار گاڑی تھی۔ میں ٹکٹ خرید کر پلیٹ فارم پر آ گیا۔ وہاں پر ایک گارڈ نما ریلوے ملازم گشت کر رہا تھا۔ میں اس کے پاس گیا تاکہ معلوم کروں کہ میری ٹرین کہاں آئے گی۔ جاپان میں ان دنوں انگریزی عام نہ تھی بہت کم لوگ انگریزی بولتے تھے۔ اس نے میرے سوال کا کوئی جواب نہ دیا صرف کہا ''ٹکٹ'' میں نے ٹکٹ دکھایا تو اس کو لے کر مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ میں اس کے پیچھے چل پڑا۔ مطلوبہ پلیٹ فارم پر پہنچ کر وہ رک گیا۔ فرش پر دو دو تین تین فٹ کے فاصلے پر مختلف رنگوں کی لائنیں کھینچی ہوئی تھیں۔ ایک لائن کی طرف اشارہ کر کے بولا۔ ''یو ہیئر'' پھر جملہ بڑھایا ''یور ٹرین ہیئر'' یعنی تم یہاں کھڑے ہو جاؤ تمہاری گاڑی یہاں آئے گی۔

گاڑی ٹھیک وقت پر پلیٹ فارم میں داخل ہوئی شاید سیکنڈوں کی بھی دیر نہ تھی۔ میرا ڈبا میرے سامنے آکر رکا۔ اس کا دروازہ ٹھیک اسی لائن کے سامنے تھا جہاں پر میں کھڑا تھا۔ دروازہ کھلا اور میں ڈبے میں داخل ہو گیا۔ دروازہ بند ہو گیا لیکن میرا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ جاپانیوں کی کارکردگی بے نظیر تھی۔

اوساکا میں ڈاکٹر امین الدین میرے منتظر تھے۔ ہم لوگ تھوڑی ہی دیر میں ان کی قیام گاہ پر پہنچ گئے۔ یہ گھر یونیورسٹی کے ایک ریٹائرڈ پروفیسر کا تھا۔ اسی کا ایک حصہ ڈاکٹر صاحب نے کرائے پر لے رکھا تھا۔ گھر انتہائی سادگی سے بنا ہوا تھا اور جاپانی زلزلوں کو مدِنظر رکھ کر بنایا گیا تھا۔ دو کمرے تھے جن کے درمیان لکڑی کے فریم کی بنی ہوئی ریکسین یا ترپال قسم کے کپڑے سے منڈھی دیوار تھی۔ بیٹھنے کے لیے کشن، کھانے کے لیے چار فٹ قطر کی نیچی میز، اس کے ساتھ بیٹھنے کے لیے کشن۔ یہ اتنی سادہ قوم تھی۔ میری آمد کی خبر پر خاتونِ خانہ نے ہم کو اپنے گھر کی طرف آنے کی دعوت دی۔ ان کے بقایا گھر کی سادگی بھی قابلِ تعریف تھی۔ انہوں نے دہی سے بنا ہوا ایک مشروب پیش کیا۔ کچھ کھٹا کچھ میٹھا مزہ تھا بلکہ بے حد لذیذ۔ اس کا ذائقہ آج بھی میرے ذہن میں محفوظ ہے۔ نام تھا کالپیز۔

رات کا کھانا کھانے، میں اور ڈاکٹر صاحب باہر نکلے، ایک پلازہ میں گئے جس میں دو تین ریسٹورنٹ تھے۔ ہر ریسٹورنٹ کے باہر شیشے کے شوکیس میں مختلف کھانوں کی پلیٹیں سجی ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ یہ اصلی کھانے نہیں ہیں۔ بلکہ موم سے ان کی شبیہہ بنا کر شوکیس میں سجادی جاتی ہے تاکہ لوگ ان کو دیکھ کر اپنا کھانا پسند کریں۔ یہ انوکھا طریقہ بھی میں نے پہلی دفعہ دیکھا تھا۔ اس کا ایک فائدہ ریسٹورنٹ والوں کو یہ تھا کہ ان کے سجائے کھانوں کو دیکھ کر لوگوں کی اشتہا بڑھ جاتی تھی اور بھوکے پیٹ کو زیادہ دیر بہلانا مشکل ہو جاتا تھا۔ کاغذ کے بے جان مینو میں یہ بات کہاں۔ دوسرا فائدہ ہم جیسے لوگوں کا تھا کہ جن کو جاپانی زبان سے آشنائی نہ تھی کہ ویٹر کے آگے شرمندہ نہیں ہونا پڑتا تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنا ایک انوکھا تجربہ سنایا۔ ایک دفعہ انہوں نے اسی قسم کی ایک سجی سجائی پلیٹ دیکھی جو رال ٹپکانے کے لیے کافی تھی۔ ریسٹورنٹ والے کو اپنا انتخاب [...] اور نیپکن لگا کر کھانے کی آمد کا انتظار کرنے لگے۔ کھانا آیا [...] کھایا۔ بے حد مزے کا لگا ڈاکٹر صاحب چاہتے تھے کہ [...] تصدیق ہو جائے کہ انہوں نے کیا چیز کھائی ہے۔ ویٹر کو بلا کر پوچھا تو معاملہ نہ بنا کہ ویٹر انگریزی سے نابلد تھا۔ ڈاکٹر صاحب کو ترکیب سوجھی انہوں نے نیپکن لے کر اس پر مرغی کی تصویر بنا کر ویٹر کو بتایا۔ ویٹر نے سر کو ہلا کر مایوسی کا اظہار کیا اور بولا ''نو'' پھر نیپکن لے کر اس پر مینڈک کی تصویر بنادی۔ وہی مزہ جو اب تک بے انتہا لذیذ تھا ڈاکٹر صاحب کو کڑوا ہوتا محسوس ہوا۔ فوراً جا کر کلی کی لیکن مینڈک کلیوں کی منزل سے بہت دور نکل چکا تھا۔

ایسا ہی ایک اور واقعہ پیش آیا جو میرا اور ڈاکٹر صاحب کا مشترکہ تجربہ تھا۔ اس پر ہم دونوں کو برابر کا حق حاصل تھا۔ ہم چاہتے تھے کہ جب میں گھر واپس جاؤں تو گھر والوں کے لیے کوئی ایسا تحفہ لے جاؤں جو خاص جاپانی ہو۔ کھلونے ہماری تلاش میں شامل نہ تھے۔ کافی تلاش کے بعد گوہرِ مقصود سامنے آ گیا۔ یہ بسکٹ کے ڈبے تھے جن کا انداز بالکل نرالا، ہرے، نیلے اور لال رنگ کے گول اور لمبے بنے ہوئے تھے اور ڈبوں پر جاپانی زبان نقش و نگار لگ رہی تھی۔ ہم نے گھر کے ہر فرد کے لیے ایک ڈبا خرید لیا۔ کراچی پہنچ کر میں نے ایک ڈبا اپنی والدہ کو دیا اور ایک بڑی بہن [...] ڈاکٹر صاحب کی بیگم کی خدمت میں پیش کیا۔ سب کو نرالے انداز کے بسکٹ بہت دلکش اور بھلے لگے۔ لیکن یہ کیا ہوا۔ سب نے بسکٹ منہ میں رکھتے ہی فوراً تھوک دیا۔ یہ بسکٹ خاص مچھلی کے گوشت سے بنے ہوئے تھے اور اس قدر بساندوالے اور بدمزہ تھے کہ پاکستانی منہ اور زبان ان کو

برداشت کرنے سے قاصر تھے۔ ہر چمکتی چیز سونا نہیں ہوتی۔

کھانے کے دوران کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہ آیا' ہم لوگ ٹھنڈے ٹھنڈے گھر واپس آ گئے۔ کل سے میلہ دیکھنے کا پروگرام تھا۔

میلہ اس قدر بڑا اور پھیلا ہوا تھا کہ پورا گاؤں کا گاؤں لگتا تھا۔ ایک سرے سے دوسرے سرے تک چلنا ناممکن تھا۔ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے مونوریل کا بندوبست تھا جس کے غالباً چار اسٹاپ تھے۔ ہر اسٹاپ سمت کے حساب سے تھا یعنی ایسٹ گیٹ، ویسٹ گیٹ وغیرہ۔ ہر اسٹاپ سے پہلے اناؤنسمنٹ ہوتا تھا کہ کون سا گیٹ آنے والا ہے۔ انگریزی زبان جاپان میں بہت کم بولی جاتی تھی اس لیے ان کا تلفظ بھی بہت مختلف تھا جو اناؤنسمنٹ کرنے کے لیے موزوں نہ تھا۔ مونوریل میں جو ہوسٹس لڑکیاں تھیں ان کو اناؤنسمنٹ کی خاص طریقے سے تربیت دی گئی تھی اور انگریزی سے نابلد ہونے کے سبب ان کو بڑی دقت اور مشقت سے گیٹ کا نام ادا کرنا پڑتا تھا۔ (ٹ) پر اس قدر زور ہوتا کہ لگتا تھا لوہار ہتھوڑے مار رہا ہے۔ مگر ہر انتظام نہایت عمدہ تھا۔ ہر طرح کی معلومات ٹکٹ گھر کے آگے موجود تھیں۔ ہر ملک کے اور خاص خاص کمپنیوں کے اسٹال کا جائے وقوع اور خصوصیات شامل تھیں۔ خاص طور سے یہ کہ آپ کو کس اسٹال کے لیے کس گیٹ پر اترنا ہے۔ لوگوں کا اتنا ہجوم تھا کہ ہر اسٹال میں داخلہ کے لیے لائن میں لگنا پڑتا تھا اور انتظار کا وقفہ چند منٹ سے لے کر ڈیڑھ گھنٹے تک ہو سکتا تھا۔ ایک دن میں اسی طرح کی ایک لائن میں لگ گیا۔ شاید ہٹاچی یا ایسی ہی کسی اور کمپنی کا اسٹال تھا۔ یہ نہ معلوم ہو سکا کہ کس نوعیت کا اسٹال تھا اس لیے کہ آس پاس کسی کو انگریزی نہ آتی تھی۔ بغیر جانے بوجھے لائن میں لگنے کی وجہ اس اسٹال کی نوعیت تھی...... یہ اسٹال زمین پر ہونے کے بجائے ایک اونچے ٹاور پر تھا اور اوپر آنے جانے کے لیے لفٹ لگی ہوئی تھی۔ لفٹ میں ایک وقت میں دس بارہ آدمی اوپر جا سکتے تھے۔ لائن آہستہ آہستہ کھسک رہی تھی آخر کار میری باری بھی آ ہی گئی۔ اوپر پہنچ کر میں نے اپنا سر پیٹ لیا۔ میری نظروں کے سامنے جہاز کی کاکپٹ کا نمونہ تھا جس کو لوگ بڑے انہماک اور تجسس سے دیکھ رہے تھے۔ یہ وہ چیز تھی جس کو میں دن رات اور ہر روز کئی کئی دفعہ دیکھتا تھا۔ اس اسٹال میں داخلہ کے انتظار میں جو وقت ضائع ہوا تھا اس سے بڑا وقت کا زیاں نہ ہو سکتا تھا۔ ستم یہ کہ میں فوراً نیچے بھی واپس نہ جا سکتا تھا کہ جب تک گائیڈ کاکپٹ کے نمونے کی پوری پوری تفصیل دیکھنے والوں کو نہ سمجھا لیتے اور ان کے تمام سوالوں کا تشفی بخش جواب نہ دے لیتے۔ بڑا صبر آزما مرحلہ تھا۔

میلے کی تفصیل اور نیرنگیوں پر تو پوری کتاب لکھی جا سکتی ہے مگر یہاں اس کا موقع نہیں۔ ذاتی تفصیل اتنی سی ہے کہ میں نے تین دن میلہ کی دل بھر کر سیر کی، ہر روز مختلف ملکوں کے کھانے کھائے اور چوتھے روز ٹوکیو واپس جانے کے لیے اسٹیشن پہنچ گیا لیکن اس دفعہ یہ احتیاط رکھی کہ اس کی برق رفتاری سے لطف اندوز ہوا جا سکے۔ ہکاری میں سفر کا لطف ہی کچھ اور تھا۔ اس کے لیے خاص طور سے مونوریل بنائی گئی تھی جس پر یہ رواں دواں رہتی تھی لگتا تھا پانی پر چل رہی ہے۔ سبک رفتاری اس پر ختم تھی سونے پر سہاگا راستے کے حسین مناظر تھے۔ مجھے کالج کے زمانے کی پڑھی مجاز لکھنوی کی ''ریل'' والی نظم یاد آ گئی جس میں انہوں نے ریل کی رفتار، آواز، موڑ اور خم کو اس انداز سے بیان کیا تھا کہ اس کے آگے محبوب کی رفتار بھی مات تھی۔ شاید یہ نظم انہوں نے ہکاری ہی کے لیے لکھی تھی۔

ٹوکیو میں میرا ایک دن کا قیام تھا، اگلے روز کراچی واپسی کی فلائٹ پکڑنی تھی۔ سلام صاحب کو مزید تکلیف دینا غیر مناسب تھا۔ میں نے ہوٹل کی راہ لی۔ سامان کمرے میں چھوڑ کر ٹوکیو شہر کی سیر کو نکل گیا۔ گنزا اسٹریٹ کا بہت نام سنا تھا۔ شروعات وہیں سے کی۔ سہ پہر کا وقت تھا مگر ٹریفک کا وہ عالم نہ تھا جو سن رکھا تھا کہ گنزا میں چلنا مشکل ہو جاتا ہے۔ دنیا کی معروف ترین سڑک پر آدمیوں کا سیلاب رہتا ہے۔ آس پاس کی عمارتوں کو دیکھتا رہا۔ جاپان پانچ جزیروں پر مشتمل ہے۔ اس میں پھیلنے کی جگہ بہت کم ہوتی تھی۔ جاپان اوپر کی سمت بڑھ رہا تھا۔ کئی کئی منزلہ اونچی اونچی عمارتیں ہر طرف دکھائی دے رہی تھیں۔ صرف عمارتیں ہی اونچی سے اونچی نہیں ہو رہی تھیں زمین کی قیمت بھی آسمان سے باتیں کرنا چاہتی تھیں۔ ٹوکیو کی زمین کا شمار دنیا کی مہنگی ترین زمینوں میں ہوتا ہے۔ اب نئی پود کے بس میں نہیں ہے کہ وہ زمین خرید کر نئی عمارت تعمیر کریں۔ موروثی جائداد تقسیم در تقسیم ہو چکی ہے۔ ہر وارث کے لیے اب جو عمارت یا زمین میسر ہے پورے خاندان کے رہنے کے لیے قطعی ناکافی ہے۔

میں ایک پلازہ میں چکر لگا رہا تھا۔ اتنا بڑا شاپنگ پلازہ بھی پہلی دفعہ دیکھا تھا۔ پیاس شدت سے لگ رہی تھی۔ سامنے ایک بار دکھائی دیا جس پر بیئر اور شراب کی بوتلوں کے ساتھ ساتھ کوکا کولا کا اشتہار بھی تھا۔ اندر داخل ہوا تو برابر سے آواز آئی ہائی (Hi) میرا کوئی واقف نہیں تھا۔ اس طرف دیکھا تو ایک امریکی نژاد نیگرو دکھائی دیے۔ سامنے میز پر بیئر کا گلاس تھا۔ گود میں ایک جاپانی لڑکی جو اپنے ہونٹوں سے ان کا شیو بنانے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے بھی جواباً ہائی کہہ دیا اور کاؤنٹر پر جا کر کوکا کولا کی درخواست کی۔ کاؤنٹر پر کھڑے لڑکے نے میرے ہاتھ میں کوک کا کین پکڑا دیا۔ کوک کا کین بھی میں نے پہلی دفعہ دیکھا تھا کراچی میں اس کا رواج ہوا نہیں تھا۔ میں اس کو کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس لڑکے نے شاید میری مشکل کو بھانپ لیا۔ میرے ہاتھ سے کین لے کر اس کو نہ صرف کھول دیا بلکہ ایک اسٹرا بھی تھما دیا تاکہ اگر میں چاہوں تو اس کو استعمال کرلوں۔

یہ کین بھی صنعتی ارتقا کی ایک نشانی تھی۔ اس سے پہلے بوتلوں کا استعمال عام تھا جس کے اوپر ڈھکن لگے ہوتے تھے۔ لیکن یہ ڈھکن بھی تدریجی ارتقا کا نتیجہ تھے۔ اس سے پہلے بوتل بند کرنے کا جدا طریقہ مروج تھا۔ ایک شیشے کی گیند ہوتی تھی جو بوتل کے منہ میں پھنسا دی جاتی تھی۔ جب بوتل کھولنا ہو تو اس گیند پر ضرب لگائی جاتی تھی جس کے نتیجہ میں وہ بوتل کے اندر گر جاتی اور بوتل کا منہ کھل جاتا۔ اب آپ اس بوتل کے منہ کو اپنے منہ سے لگا سکتے تھے۔

شام ہو چلی تھی۔ میں پلازہ سے باہر نکلا تو گنزا اسٹریٹ کے جس آدم زاد سیلاب کی داستانیں سنی تھیں شروع ہو چکا تھا۔ قدم دھرنا مشکل تھا۔ میں تھک گیا تھا ہوٹل واپس آکر اپنے کمرے میں جا کر بستر پر گر گیا۔ جلد نیند نے آدبوچا۔ آنکھ کھلی تو رات کے تین بجے تھے۔ بھوک لگ رہی تھی مگر کھانا بے وقت ہوتا میں پھر سو گیا۔ صبح اٹھا ناشتا کرنے کے بعد تھوڑی دیر گھومنے باہر نکل گیا۔ واپسی پر ائیرپورٹ جانے کا وقت ہو چکا تھا۔

☆☆☆

جہاز ڈھاکا ائیرپورٹ پر اتر چکا تھا۔ پاکستان کا پہلا ائیرپورٹ ہونے کے ناتے کسٹم اور امیگریشن یہیں ہونا تھا۔ امیگریشن سے فارغ ہو کر اپنا سوٹ کیس اٹھایا اور کسٹم کے کاؤنٹر پر رکھ دیا۔ کسٹم افسر بنگالی بابو تھے۔ عمر رسیدہ اور لمبی ڈاڑھی سے چہرہ پُرنور ہو رہا تھا۔ میرا سامان الٹ پلٹ کر دیکھتے رہے پھر مایوسی سے بولے ”آپ جاپان سے آرہے ہیں اور کچھ شاپنگ کرکے نہیں لائے۔“

میں نے نفی میں سر ہلا دیا کہ میں نے وہاں پر صرف اپنے پہننے کے لیے ایک قمیص خریدی تھی اور کچھ بھی نہیں۔

کسٹم افسر میری خریداری کی کوتاہی پر کافی دیر تک افسوس کرتے رہے۔ ایک دفعہ پھر سامان ٹٹولا۔ کچھ ہاتھ نہ آیا سوائے 555 سگریٹ کے ایک ڈبے کے جو میں نے اپنے ایک دوست کی فرمائش پر خریدا تھا۔ پوچھنے لگے ”یہ کس کا ہے۔“

میں نے جواب دیا کہ اپنے دوست کے لیے خریدا ہے۔ جواب سن کر کہنے لگے ”آپ اپنا سوٹ کیس بند کردیں مگر یہ ڈبا باہر ہی رہنے دیں۔“

میں نے ایسا ہی کیا۔ بولے ”اب آپ جائیں۔“

میں نے سوٹ کیس اٹھالیا۔ دوسرا ہاتھ سگریٹ کے ڈبے کی طرف بڑھانے کا ارادہ کیا تھا کہ ان کے کھنکھارنے کی آواز سنائی دی۔ مجھے آنکھ کا اشارہ کیا کہ سگریٹ وہیں رہنے دیں۔ میں آگے بڑھ گیا مگر اپنی قوم پر افسوس کرتا رہا کہ یہ ”اسفل السافلین“ بن چکے ہیں۔ ان میں ہر طرح کا احساس جاتا رہا ہے۔ اتنی پستی میں گر گئے ہیں کہ ایک سگریٹ کا ڈبا ناجائز طور پر چھینتے ہوئے ان کو شرم نہیں آتی۔ آج ہم اپنی قوم کو جس حالت میں دیکھ رہے ہیں اس پستی کی ابتدا اسی وقت ہو چکی تھی جب ڈھاکا ابھی پاکستان کا حصہ تھا۔ میں سوچنے لگا کہ جاپان ٹین کے کھلونے بناتے بناتے اپنی ایمانداری، لگن اور انتھک محنت کی بنا پر کہاں سے کہاں پہنچ گیا ہے اور ہم کس اخلاقی اور معاشی پستی کی طرف جا رہے ہیں۔ ہم کو پھر بھی یہ زعم ہے کہ مسلمان ہونے کے ناتے یا یوں کہے کہ صرف کلمہ پڑھنے کے ناطے ہم اللہ تعالیٰ کی چنیدہ قوم ہیں اور ہمارا یقینی آخری ٹھکانا جنت ہے۔ ہم علامہ اقبال کے شعر کا پہلا مصرع بھول چکے ہیں اور اس مصرع میں نشاندہی کی گئی اقدار کو پامال کرنے کے باوجود ہم اپنے آپ کو یہ دھوکا دے رہے ہیں کہ لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا۔ اس سے بڑھ کر خود فریبی اور کیا ہو سکتی ہے۔

سید بدر الدین عظیم آبادی

جب اسپ زیست طویل فاصلہ طے کرلے تو انسان پیچھے مڑ کر ضرور دیکھتا ہے۔ گزرے ایام کی تلخی وشیرینی سے جرعہ جرعہ لطف اندوز ہوتا ہے۔ ہمارے بھی ایک ساتھی جو عمر کی چوٹی پر براجمان ہیں اپنی کھٹی میٹھی یادوں سے لطف اندوز کرا رہے ہیں۔

ذائقہ بدلنے کے لیے ایک مختصر تحریر

انسان کی زندگی حادثات وواقعات کا مجموعہ ہے۔ عقلمند وہی کہلاتا ہے جو ان واقعات سے سبق حاصل کرے۔ میری زندگی میں تین ایسے واقعات گزرے ہیں جو ناقابل فراموش بھی ہیں اور سبق آموز بھی۔ انہیں بھلانا بھی چاہوں تو بھلا نہیں سکتا۔

یہ اُن دنوں کی بات ہے جب میں نے لڑکپن کو خیرباد کہہ کر جوانی کی سیڑھی پر پہلا قدم رکھا تھا۔ انہی دنوں یعنی دسمبر 1946ء میں پورے صوبہ بہار میں اک آگ سی بھڑک اٹھی تھی۔ زبردست ہندو مسلم فساد برپا ہوا تھا جس میں لگ بھگ ایک لاکھ مسلمان مرد، عورتیں اور بچے شہید ہوئے تھے۔ ہمارا ننھیال موضع نرانواں ضلع پٹنہ (بہار) میں تھا۔ وہ ایک چھوٹی سی بستی تھی۔ فساد شروع ہوا تو پہلا نشانہ وہی گاؤں بنا تھا۔ ہمارے ماموں کا پورا گھرانا مع گاؤں کے دوسرے افراد شہید کردیے گئے۔ مکانوں میں آگ لگا دی گئی۔ کھیتوں کو لوٹ لیا گیا۔ پٹنہ کے تلہاڑا، گوریا کھاری، مظفر پور کی بنی آباد، ضلع گیا کی بہت سی بستیاں، جہان آباد کی بستیاں، منگھیر اور بھاگلپور کی بہت سی مسلمان بستیوں کو صفحہ ہستی سے مٹا دیا گیا۔

ہر طرف خوف کا عالم تھا۔ کچھ ہی دنوں پہلے یعنی 1941ء میں اسکول کی تعلیم سے فارغ ہوا تھا اور حافظِ قرآن بننے کے لیے کلام پاک حفظ کر رہا تھا۔ ابھی حفظ کے ابتدائی مراحل میں ہی تھا کہ 44-1943ء میں میرے گلے میں یکے بعد دیگرے سات زخم نکل آئے تھے جسے ہندی زبان میں ”کنٹھ مالا“ کہتے ہیں جو یکے بعد دیگرے تیار ہوتے

ہیں۔ اس بیماری سے چھٹکارے کے لیے آپریشن ہوئے جس سے میری آواز بیٹھ گئی اور یوں میرے کلام پاک حفظ کرنے کا سلسلہ ختم ہوگیا جس کے بعد میں نے اپنے ہی محلہ باقر گنج (پٹنہ) میں ایک چھوٹا سا جنرل اسٹور کھول لیا جو کہ بہنوئی کی جائداد کے مقدمے اور ہندو مسلم فساد کی نذر ہوگیا۔

باقر گنج میں ہی محمد یٰسین نامی ایک شخص رہتا تھا جو ڈاکخانہ میں ملازم تھا اور میری دکان سے سودا سلف لیتا تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ "یٰسین! میرے حفظ کا سلسلہ تو ختم ہی ہوگیا، کاروبار بھی چوپٹ ہوگیا۔ اگر کوئی چانس لگے تو ڈاکخانہ میں میری ملازمت کا انتظام کرادو۔"

یہ دعا کی قبولیت کی گھڑی تھی اور قدرت ہم پر مہربان تھی کہ یٰسین نے فوراً ہی کہا کہ ڈاکخانہ میں بھرتی ہو رہی ہے، تم کل پٹنہ جی پی او میں گیارہ بجے آجاؤ، میں وہیں ملوں گا اور تمہیں بھرتی کروادوں گا۔"

میں یٰسین کی بات سن کر حیران رہ گیا اور حیرت سے اس کا منہ تکنے لگا کہ یہ کیا کہہ رہا ہے؟ سرکاری نوکری وہ بھی انگریزوں کی حکومت میں۔ نہ میری کوئی درخواست نہ کوئی کال لیٹر۔ کیا سرکاری نوکری اس کی جیب میں پڑی ہے جو یہ اتنے دعوے سے کہہ رہا ہے کہ کل آجاؤ، بھرتی کروادوں گا۔ میں نے کہا "یٰسین! تم یہ کیا کہہ رہے ہو؟ یہ کیسے ممکن ہے کہ بغیر کسی درخواست کے سرکاری محکمے میں نوکری ہوجائے؟"

"تم آؤ تو سہی، پھر دیکھو کہ نوکری کیسے نہیں ہوتی ہے۔" یٰسین نے ہنس کر کہا۔

فروری 1947ء کے دوسرے ہفتے کی بات ہے اسے آزمانے کے لیے میں پٹنہ جی پی او پہنچ گیا۔ تیواڑی بابو سپروائزر تھے جن کی طوطی بولتی تھی۔ بڑا رعب ودبدبہ تھا۔ جی پی او کے پوسٹ ماسٹر پنالال مشرا بھی ان کی بات نہیں ٹالتے تھے۔

یٰسین نے میرا تعارف کراتے ہوئے کہا "تیواڑی بابو! یہ میرا خالہ زاد ہے، کل جو امتحان ہو رہا ہے، اس میں اس کو بٹھا دیجیے گا اور پاس بھی کر دیجیے گا۔"

تیواڑی بابو نے ہامی بھرلی اور واقعی ایسا ہی ہوا کہ مجھے بغیر کسی درخواست کے امتحان میں بیٹھا دیا اور پاس بھی کردیا۔

غور کرنے کا مقام ہے کہ دسمبر 1946ء میں پورے صوبہ بہار میں ہندو مسلم فساد ہوا ہے اور فروری 1947ء میں ایک ہندو افسر ایک مسلمان کے کہنے پر دوسرے مسلمان کو بغیر کسی درخواست کے امتحان میں بٹھا بھی رہا ہے اور پاس کردینے کی ہامی بھی بھر رہا ہے۔ یعنی اچھے برے ہر جگہ مل جاتے ہیں۔

تیواڑی کی کوشش سے 11 اپریل 1947 کا جاری کردہ اپائنٹمنٹ لیٹر 13 اپریل 1947ء کو مجھے موصول ہوگیا (جو آج بھی اوریجنل میرے پاس موجود ہے) اور اس طرح میں اپریل 1947ء سے محکمہ ڈاک میں ملازم ہوگیا۔ میری پہلی پوسٹنگ باڑھ پور پوسٹ آفس (پٹنہ) میں ہوئی۔

ایک اور امر بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے، سرکاری نوکری کے لیے نزدیکی تھانے سے کیریکٹر سرٹیفکیٹ لینا ضروری تھا۔ اس سلسلے میں، میں اپنے تھانہ، پیر بہوڑ میں پولیس رپورٹ کے لیے گیا تو تھانہ میں ہندو ہیڈ محرر بیٹھا تھا جو غالباً غازی پور (یوپی) کا رہنے والا تھا۔ مجھے دیکھتے ہی پوربی زبان میں بولا۔

"آ ببوا آ، کیسے آئیلہ، کونو کام با۔" (آؤ بابو آؤ، کیسے آئے ہو، کوئی کام ہے؟)

میں نے کہا "ہاں کام با۔" (ہاں، کام ہے)

"کا کام ببوا" (کیا کام ہے بابو)

میں نے پوسٹ ماسٹر پٹنہ جی پی او کا لیٹر بڑھاتے ہوئے کہا کہ میری نوکری ڈاکخانہ میں ہوگئی ہے۔ مجھے پولیس رپورٹ چاہیے۔ اس نے لیٹر لیتے ہوئے محبت بھرے لہجے میں کہا۔ "ببوا، بیٹھا بیٹھا ابھی بنا دی دے ہے۔" (بابو بیٹھو بیٹھو، ابھی بنا دیتے ہیں)

نہ کوئی انکوائری، نہ بارگیننگ، نہ ڈیمانڈ، نہ ٹال مٹول۔ فوراً قلم دوات نکالا۔ سرکاری لیٹر پیڈ نکالا، رپورٹ لکھی، دستخط کیا، تھانے کی مہر لگائی اور میرے حوالے کرتے ہوئے بولا "لے ببوا، توہار کام ہو گیل، جا۔" (لو بابو، تمہارا کام ہوگیا) واضح ہو کہ وہاں ہر چھوٹے کو بابو کہتے ہیں۔

میں رپورٹ لے کر کمرے سے نکلنے لگا تو ہیڈ محرر نے ہنستے ہوئے پیار اور محبت بھرے لہجے میں کہا "ببوا، چاء پیلیبا۔" (بابو، چائے نہیں پلاؤ گے) یہ کوئی رشوت نہیں محبت کا اظہار تھا۔

میں نے کہا "ہاں پیلائیب۔" (ہاں پلائیں گے)

جیب سے ایک اکنی نکالی اور اسے دے دی۔ وہ اتنا خوش ہوا کہ میں بیان نہیں کرسکتا۔ میرے سر پر ہاتھ رکھ کر بولا۔ "جا ببوا کھس رہا۔" (جاؤ بابو خوش رہو)

وہ خوش کیوں نہ ہوتا کہ اس زمانے میں۔ ایک پیسے کے چار پاپے، ایک پیسا کپ چائے۔ ایک روپے کا دس سیر چاول۔ ایک روپے میں آٹھ نو سیر آٹا۔ تین آنے سیر چینی۔ چھ آنے سیر بکرے کا گوشت مل جایا کرتا تھا۔ گویا آٹھ آنے میں وہ ہیڈ محرر 16 دنوں تک ناشتا کرسکتا تھا۔

خیر میں پولیس رپورٹ، کیریکٹر سرٹیفکیٹ اور تعلیمی اسناد کی کاپی لے کر تھانے کے برابر ہی میں اپنے علاقے کے باڑھ پور پوسٹ آفس چلا گیا۔ گھوش صاحب پوسٹ ماسٹر تھے۔ انہوں نے خود ہی اپنے ڈاکخانہ میں 14 یا 15 اپریل 1947ء سے نوکری پر جوائن کرادیا اور ہمارے سارے کاغذات پٹنہ جی پی او، یہ کہہ کر بھجوائے کہ تمہیں جی پی او انٹرویو کے لیے جانے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ اتنا عرصہ گزر گیا ہے، اس ہیڈ محرر کی زبان کی چاشنی محبت اور پیار بھرے الفاظ آج بھی مجھے کانوں میں گونجتے محسوس ہوتے ہیں۔

پہلی تنخواہ مجھے باون روپے آٹھ آنے ملی تھی جو اس وقت کے لحاظ سے بہت بڑی رقم تھی۔ گھر والے بہت خوش تھے۔ محمد یٰسین کا اکثر پٹنہ جی پی او جانا ہوتا تھا۔ ایک روز تیواڑی بابو سے ملاقات ہوگئی۔ انہوں نے ازراہ مذاق یٰسین سے کہا "ارے یٰسین، تیرے بھائی کو امتحان میں بٹھا دیا، پاس کروادیا اور وہ نوکری پر بھی لگ گیا۔ لیکن تو نے مٹھائی نہیں کھلائی۔"

یٰسین نے مجھ سے کہا "دو روپے دے دو۔ دو روپے میں ایک سیر گلاب جامن آجائے گی جو منہ میٹھا کرنے کے لیے کافی ہے۔"

دوسرے دن میں جی پی او تیواڑی بابو کے پاس گیا اور دو روپے مٹھائی کے لیے دیے تو وہ بہت خوش ہوئے اور ہم سے پوچھا کہ باڑھ پور پوسٹ آفس میں کام کر رہے ہو نا۔ میں نے کہا جی تیواڑی بابو۔ پھر انہوں نے مجھے نصیحت آمیز لہجے میں کہا کہ دل لگا کر محنت اور ایمانداری سے کام کرنا۔ بس کام چوری نہ کرنا ورنہ نوکری چلی جائے گی۔

اس زمانے کے یہ وہ عظیم لوگ تھے جو دل میں خلوص، محبت اور ہمدردی رکھتے تھے۔ ہر قسم کے تعصب کو پس پشت رکھتے تھے۔ ماضی کی یہ سب باتیں اور یادیں اب خواب ہوگئی ہیں۔

اس عمر میں یہ باتیں یاد کرنا اچھا لگتا ہے۔ انہی باتوں کو یاد کرتے کرتے کچھ ایسی باتیں بھی یاد آنے لگتی ہیں جن کو توجیہہ عقل سے دینا ممکن نہیں، ایسا ہی ایک واقعہ آپ بھی سن لیں۔ جون 1947ء کا آخری ہفتہ یا جولائی 1947ء کا شروع ہفتہ تھا۔ جمعہ کا دن تھا۔ میں ڈیوٹی سے شام کو جب گھر آیا تو دیکھا کہ میری بیوہ ممانی آئی ہوئی ہیں۔ انہوں نے مجھ سے کہا کہ میرا کچھ سامان گیا اجو بھیا کے گھر کریم گنج میں رکھا ہوا ہے جا کر لادو۔ (سید عزیز الحق صاحب، گاؤں کی رشتے داری کے لحاظ سے ماموں لگتے تھے جنہیں ہم لوگ اجو ماموں کہتے تھے، وہ گیا میں ریلوے میل سروس (پوسٹل ڈیپارٹمنٹ) میں ملازم تھے اور کریم گنج گیا (بہار) میں رہائش تھی۔

میں نے "گیا" شہر دیکھا نہیں تھا۔ دیکھنے کا اشتیاق پیدا ہوا۔ دوسرے دن ہفتہ تھا، اس روز ڈیوٹی سے آیا تو پلاننگ کرلی کہ آج گیا جانا ہے، کچھ پیسے لیے اور پٹنہ جنکشن کے لیے روانہ ہوگیا۔

"پٹنہ گیا لوکل ٹرین" شام کے 5 یا 6 بجے پٹنہ سے روانہ ہوکر رات کے ساڑھے دس گیارہ بجے گیا پہنچتی تھی۔ ارادہ یہ تھا کہ ہفتہ کی رات اجو ماموں کے گھر گزار کر دوسرے دن اتوار کے روز پورے گیا شہر میں گھومیں پھریں گے اور پھر شام کو ممانی کا سامان لے کر 6 بجے والی لوکل ٹرین سے پٹنہ کے لیے روانہ ہوجائیں گے تاکہ رات دس گیارہ بجے پٹنہ پہنچ جائیں اور دوسرے دن پیر کو ڈیوٹی پر حاضر ہوجائیں۔

بارشوں کا موسم تھا۔ رم جھم اور کبھی تیز بارش ہو رہی تھی، کبھی بارش بند بھی ہوجاتی تھی۔ اسی حالت میں اسٹیشن پہنچا، چھ آنے کا ٹکٹ لیا اور ٹرین میں بیٹھ کر گیا کے لیے روانہ ہوگیا۔

اجو ماموں کے گھر کا پتا معلوم کرنے کے لیے اسٹیشن پر ہی ان کے دفتر آر، ایم، ایس (ریلوے میل سروس) میں چلا گیا۔ میں نے وہاں کے اسٹاف سے کہا کہ میں عزیز الحق صاحب کا بھانجا ہوں۔ پٹنہ سے آیا ہوں، ان سے ملا دیں۔ دفتر والوں نے کہا کہ وہ تو میل وین میں ہزاری باغ چلے گئے۔ میں نے کہا کہ ان کے گھر کریم گنج کا پتا سمجھا دیں۔ انہوں نے کہا کہ اسٹیشن کے گیٹ سے باہر نکلو، سیدھے ہاتھ کو جو سڑک جا رہی ہے، اس پر چل پڑو۔ سو ڈیڑھ سو قدم چلنے کے بعد سیدھے ہاتھ کی طرف والی سڑک پر مڑ جاؤ۔ وہی کریم گنج ہے۔

میں اسٹیشن کے گیٹ سے باہر آیا۔ دو تین ٹم ٹم (تانگا) کھڑے تھے۔ سامنے ہی پہاڑ کا نظارہ تھا۔ اسی پہاڑ پر وہ برگد کا درخت تھا جس کے سایہ میں بیٹھ کر گوتم بدھ نے تپسیا (عبادت) کی تھی۔ بارش لگاتار اسی طرح کبھی رم جھم، کبھی زوردار برس رہی تھی۔ راستے سنسان تھے۔ ہر طرف گھپ اندھیرا تھا۔ نہ آدم نہ آدم زاد، رات کے گیارہ بجے کا وقت ہوگا۔ میں یہ بھی بھول گیا کہ اتنا فاصلہ سڑک کا طے کرنے کے بعد مجھے سیدھے ہاتھ والی سڑک پر مڑنا ہے۔

گیٹ کے باہر تین اطراف کو سڑکیں جا رہی تھیں۔ میں مخمصے میں پڑ گیا کہ کریم گنج جانے کے لیے کون سا راستہ اختیار کروں۔ ایک ارادہ یہ کیا کہ ٹم ٹم (گھوڑا گاڑی) کر لوں وہ مجھے کریم گنج پہنچا دے گا مگر یہ سوچ کر ارادہ ترک کر دیا کہ یہ لوگ ہندو ہیں، میں مسلمان ہوں۔ گیا میرے لیے نئی جگہ ہے، اندھیری رات ہے، ہو کا عالم ہے اگر میں ٹم ٹم کر لوں تو پتا نہیں یہ مجھے کہاں لے جائے اور مار کے پھینک دے۔ میں اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ ان تینوں تانگوں کو دوسرے مسافر کرایہ پر لے کر چلے گئے۔ اس سوچ بچار میں تقریباً پون گھنٹا گزر گیا۔ بارش اسی رفتار سے ہو رہی تھی۔ بالآخر اللہ کا نام لے کر سڑک پر چل پڑا۔

اندھیری رات، سنسان سڑک، بارش کا سماں۔ سڑک کے دونوں طرف بڑے لمبے لمبے درخت تھے۔ اتنی رات میں اسی سڑک پر میں بارش میں رواں دواں تھا تھوڑا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ بارش زوروں کی ہونے لگی۔ میں شرابور ہو گیا۔ آنکھوں میں پانی جانے کی وجہ سے کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ بدلی چھٹی، چاندنی نکلی تو سیدھے ہاتھ کی طرف مجھے ایک وسیع و عریض باؤنڈری وال نظر آئی، کالج یا اسکول جیسی کوئی عمارت تھی۔ بھیگنے سے بچنے کے لیے اس میں داخل ہو گیا اور عمارت کے وارانڈے میں کھڑا ہو گیا۔ ابھی پانچ منٹ بھی نہیں گزرے تھے کہ ایک آواز آئی "اے، کون ہے باہر نکل جاؤ۔"

میں نے کہا "بھائی میں مسافر ہوں، پٹنہ سے آرہا ہوں۔ کریم گنج جانا ہے۔ بارش تیز ہو رہی ہے اس لیے ٹھہر گیا ہوں۔ بارش رکتے ہی چلا جاؤں گا۔"

جواباً اس نے بڑے کرخت لہجے میں کہا کہ یہ اسپتال ہے یہاں نہیں ٹھہر سکتے۔

چوکیدار یہ کہہ کر کسی اور طرف چلا گیا۔ ادھر وقت بتانے والا سرکاری گھنٹا بجا اس نے بارہ گھنٹے بجائے تھے یعنی رات کے بارہ بج گئے تھے (واضح ہو کہ انگریز کے دورِ حکومت میں ہر بڑے شہر کی بلند ترین سرکاری عمارت پر حکومت کی طرف سے پیتل کا گھنٹا لگا ہوتا تھا۔ جسے سرکاری عملہ وقت کی مناسبت سے 24 گھنٹے بجاتا تھا تاکہ عوام کو وقت کا پتا چلے کہ اس وقت اتنے بجے ہیں)

بارش رک گئی تھی چنانچہ میں اپنی منزل تک پہنچنے کے لیے اسپتال سے نکل کر سڑک پر آگیا۔ سڑک کے دونوں جانب گھنے درخت جھوم رہے تھے اور سڑک پر تنِ تنہا میں چلتا چلا جا رہا تھا۔ ابھی کوئی بیس پچیس ہی قدم چلا تھا کہ درختوں پر اچھلنے کودنے، ہنسنے کی آوازیں آنے لگیں جیسے اس پر بہت سارے لوگ بیٹھے چہلیں کر رہے ہوں۔ ان کے پیروں میں بندھے گھنگھرو بج رہے تھے۔ میں نے چونک کر دیکھا مگر کوئی نظر نہیں آیا۔ پھر بھی ایسا لگ رہا تھا جیسے بہت ساری عورتیں ہیں جو ہنسی ٹھٹھول کر رہی ہیں۔ وہ کبھی کبھی کرتی، ہنستی ہوئی درخت پر چڑھ جاتیں مگر نظر کچھ نہیں آتا تھا صرف آواز ہی سنائی دیتی تھی۔ یہ احساس جان لیوا تھے۔ میرے تو اوسان خطا ہو گئے۔

بارش میں شرابور ہونے کے باوجود پسینے چھوٹنے لگے اور مجھے جتنی قرآنی آیات اور سورتیں یاد تھیں، سب پڑھ پڑھ کر اپنے جسم پر دم کرتا ہوا آگے بڑھتا رہا۔ چلتے چلتے سڑک کے آخری حصے میں پہنچ گیا۔ کریم گنج مجھے پھر بھی نہ ملا۔ اب سامنے پانی کا ٹھاٹھیں مارتا دریا تھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کروں کیا؟ سامنے کچھ مکانات بھی تھے جس سے گمان ہو رہا تھا کہ شاید وہی کریم گنج ہے۔ ارادہ کیا کہ پانی میں اتر کر اس پار چلا جاؤں پھر یہ سوچ کر رک گیا کہ اگر یہ ندی نالا ہے تو میں تو ڈوب جاؤں گا اور کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا۔ مگر اب کروں تو کیا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ ڈر، خوف تو تھا ہی۔ تھک بھی اتنا گیا تھا کہ واپسی کے لیے نہ میرا قدم اٹھ رہا تھا اور نہ ہمت ہو رہی تھی۔ تبھی سرکاری گھنٹے نے ایک کا گھنٹا بجایا یعنی رات کے ایک بج گئے تھے۔ چار و ناچار ریلوے اسٹیشن کو ہی واپس جا کر رات گزارنے کا ارادہ کر لیا لیکن جس خطرناک منظر سے گزر کر آیا تھا، اسی راستے سے واپس جانا میرے لیے ممکن نہیں تھا لیکن وہاں اکیلے کھڑے رہ کر کرتا بھی کیا۔

میں نے ہمت کر کے کلامِ الٰہی کا سہارا لیا۔ کلامِ پاک کی صورتیں پڑھ پڑھ کر جسم پر دم کیا اور وِرد کرتے کرتے سڑک کے بائیں طرف سے واپس چلنا شروع کیا۔ رات اندھیری تو تھی ہی آنکھوں میں پانی آجانے سے اور زیادہ الجھن ہو رہی تھی۔

چلتے چلتے الٹے ہاتھ کی طرف ایک سڑک آبادی کے اندر جاتی ہوئی نظر آئی۔ میں نے سوچا کہ وہاں شاید کوئی مل جائے تو کریم گنج کا معلوم کروں بس میں اسی طرف مڑ گیا۔

دونوں اطراف مکان، بیچوں بیچ سڑک پر میں رواں دواں تھا۔ چلتے چلتے اس سڑک کے آخری سرے پر پہنچ گیا۔ یعنی یہ سڑک بھی یہیں ختم اور سامنے ایک بہت بڑے رقبے میں چاروں طرف باؤنڈری وال جس میں ایک بہت بڑا لوہے کا گیٹ لگا ہوا تھا۔ میں گیٹ کو پکڑ کر کھڑا ہو گیا اور

سوچنے لگا کہ کیا یہ کسی راجا مہاراجا، رئیس یا زمیندار کا محل یا بنگلا ہے جس کی اتنی بڑی باؤنڈری وال اور اس پر اتنا بڑا لق و دق مضبوط آہنی گیٹ ہے اور اگر ایسا ہی ہے تو یہ اندھیرا کیوں ہے۔ اس میں روشنی کیوں نہیں ہے؟ کوئی چوکیدار یا پہرے دار کیوں نہیں ہے؟

ابھی یہ سوچ ہی رہا تھا کہ بدلی چھٹی اور چاندنی نکل آئی جس کی روشنی میں، میں نے لوہے کے گیٹ کی سلاخوں سے جھانک کر دیکھا تو حدِ نگاہ تک قبر ہی قبر نظر آئیں، تب میری سمجھ میں آیا کہ یہ قبرستان ہے۔ کسی راجا کا محل یا زمیندار کا بنگلا نہیں ہے۔ ہوا کے جھونکے سے کبھی خوشبو، کبھی بدبو ناک میں آرہی تھی۔ بات چیت کرنے کی آواز بھی آرہی تھی لیکن سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کس زبان میں باتیں ہو رہی ہیں۔ ادھر میری حالت یہ تھی کہ کاٹو تو جسم میں لہو نہیں، خوف کے مارے کپکپی شروع ہو گئی اور میں پسینے میں شرابور ہو گیا۔ سوچنے لگا کہ میں بھی کس مصیبت میں پھنس گیا، ایک خطرناک حالات سے دوچار ہو کر نکلا ہی تھا کہ دوسرے خطرناک جال میں پھنس گیا۔ شاید موت مجھے کھینچ کر گیا لائی ہے؟ گو کہ میرے قدم اٹھ نہیں رہے تھے۔ جسم بے روح اور بے جان ہو رہا تھا۔ پھر بھی ہمت و حوصلہ کر کے وہاں سے واپس پلٹا۔ کوئی بیس قدم واپس چلا ہی تھا کہ سڑک کے دائیں ہاتھ کی طرف وارانڈے میں تین چار بندے سوئے ہوئے نظر آئے۔ میں ڈرتے ڈرتے قریب گیا اور آواز لگانی شروع کی "بھائی صاحب، بھائی صاحب!"

ایک شخص اٹھا اور سخت لہجے میں بولا "کون ہے، کیا ہے؟"

میں نے کہا، "بھائی صاحب میں مسافر ہوں، پٹنہ سے آیا ہوں۔ مجھے کریم گنج جانا ہے، میں بھٹک گیا ہوں۔"

اس نے کہا کہ کریم گنج تو یہی ہے۔ اس کے یہ کہنے پر میرے جسم میں جان آگئی کہ میں منزلِ مقصود تک پہنچ گیا۔ میں نے کہا کہ مجھے عزیز الحق صاحب (اجو ماموں) کے یہاں جانا ہے۔ اس نے کہا کہ اسی سڑک کی دوسری جانب والی رو میں تیسرا مکان ہے۔

میں وہاں سے سڑک کی دوسری جانب والی رو کے تیسرے مکان میں گیا۔ اس مکان میں اجو ماموں مرحوم کی رشتے کی بہن صالحہ خاتون (جو میری گاؤں کی رشتے داری کے لحاظ سے خالہ لگتی تھیں جن کے سامنے ہم پلے بڑھے) رہتی تھیں۔ میں نے دروازے پر دستک دی۔ اندر سے آواز آئی، کون ہے ہم نے کہا کہ خالہ، میں ہوں بدر الدین۔ نراتواں الطاف ماموں کا بھانجا۔ خالہ نے جانتے پہچانتے کے باوجود مزید کچھ نہ پوچھا بلکہ دروازہ بند کر لیا۔ میں یہ آس اور امید لگائے کھڑا رہا کہ خالہ مجھے اندر بلائیں گی۔ خیریت اور آنے کا مقصد معلوم کریں گی۔ گیلے کپڑے اتروا کر دوسرے کپڑے پہننے کو دیں گی۔ کھانا پانی کا پوچھیں گی۔ لیکن کہاں وہ تو دروازہ بند کر کے ایک دم سے خاموش ہی ہو گئیں۔ باہر وارانڈے میں بید کی ایک ٹوٹی ہوئی کرسی پڑی تھی۔ تھکا ہارا تو تھا ہی، گیلے کپڑے میں سردی سے ٹھٹھر بھی رہا تھا۔ بھوک پیاس کے مارے نڈھال بھی ہو رہا تھا اوپر سے وہ خوف بھی طاری تھا، جس سے گزر کر یہاں تک پہنچا تھا۔ کافی دیر کھڑے کھڑے انتظار کے بعد میں اسی ٹوٹی ہوئی کرسی پر بیٹھ گیا اور باقی رات اسی طرح اسی حالت میں بیٹھے بیٹھے گزار دی۔ میرا موڈ خراب ہو گیا تھا۔

دوسرا دن اتوار کا تھا۔ صبح چھ بجے اٹھا۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔ خالہ نے دروازہ کھولا۔ میں نے کہا کہ خالہ میں جا رہا ہوں، میری ممانی کا جو سامان ہے دے دیں۔ اس وقت بھی نہ انہوں نے ہمدردی کے دو بول بولے، نہ کچھ کھانے پینے، ناشتا چائے کا کہا بلکہ غیریت کا مظاہرہ کرتے ہوئے سامان کی طرف اشارہ کیا۔ میں نے وہ سامان جس میں ایک سوٹ کیس، بیڈنگ اور کچھ کپڑوں کا ایک تھیلا تھا، اٹھایا، باہر لایا، رکشا کیا اور سیدھے ریلوے اسٹیشن آگیا۔ چھ آنے کا فل ٹکٹ لیا۔ پٹنہ، گیا لوکل ٹرین پر بیٹھا اور تقریباً گیارہ ساڑھے گیارہ بجے پٹنہ جنکشن پہنچ گیا۔ وہاں سے رکشا لیا اور اپنے گھر باقر گنج پہنچ گیا۔ سامان ممانی کے حوالے کیا۔ اپنے سفرنامے کے حالات و واقعات اور صالحہ خالہ کے غیر اخلاقی اور غیر انسانی سلوک سے جب والدہ اور ممانی کو آگاہ کیا تو دونوں نے غم و غصے کا اظہار کیا۔

میری عمر اس وقت پچاسی (85) سال ہونے کو آئی۔ چھیاسٹھ (66) سال سے نوکری کر رہا ہوں۔ اور اتنا ہی عرصہ اپنے ساتھ بیتے ہوئے ان حالات و واقعات کو بھی ہو گئے لیکن ایسا لگتا ہے کہ ابھی یہ کل کی بات ہے۔ یاد کرتا ہوں تو خوف کے مارے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ دوسری جانب تھانہ کے اس ہندو ہیڈ محرر اور تیواڑی بابو کی خوش اخلاقی اور ہمدردی اور خالہ کی بد اخلاقی و بدسلوکی باقی زندگی کے آخری سانس تک یاد رہے گی۔

یہ اجنبی سی منزلیں اور رفتگاں کی یاد
تنہائیوں کا زہر ہے اور ہم ہیں دوستو!
آنکھوں میں اڑ رہی ہے لٹی محفلوں کی دھول
عبرت سرائے دہر ہے اور ہم ہیں دوستو!

ایسے نادر روزگار خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ جو نصف صدی سے علم وادب ' صحافت و فلم کے میدان میں سرگرم عمل ہوں اور اپنے روزاول کی طرح تازہ دم بھی۔ ان کے ذہن رسا کی پرواز میں کوئی کمی واقع ہو، نہ ان کا قلم کبھی تھکن کا شکار نظر آئے۔ آفاقی صاحب ہمارے ایسے ہی جواں فکر وبلند حوصلہ بزرگ ہیں۔ وہ جس شعبے سے بھی وابستہ رہے ' اپنی نمایاں حیثیت کی نشان اس کی پیشانی پر ثبت کردی۔ مختلف شعبہ ہائے زندگی سے وابستگی کے دوران میں انہیں اپنے عہد کی ہر قابل ذکر شخصیت سے ملنے اور اس کے بارے میں آگاہی کا موقع بھی ملا۔ دید وشنید اورمیل ملاقات کا یہ سلسلہ خاصا طولانی اور بہت زیادہ قابل رشک ہے۔ آئیے ہم بھی ان کے وسیلے سے اپنے زمانے کی نامور شخصیات سے ملاقات کریں اور اس عہد کا نظارہ کریں جو آج خواب معلوم ہوتا ہے۔

ادب وصحافت سے فلمی دنیا تک دراز ایک داستاں درداستاں سرگزشت

فیض احمد کی شاعری، صحافت، علم وفضل اور شخصیت کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا چکا ہے لیکن فیض ان شخصیات میں سے ہیں جن کے بارے میں لکھے جانے کا سلسلہ شاید کبھی ختم نہ ہو۔

اردو شعرا میں بہت زیادہ کتابیں اور مضامین غالب کے بارے میں لکھے گئے ہیں۔ غالب کے اشعار خود ان کے بقول "گنجینہ معنی کا طلسم" ہیں۔ غالب نے شاعری، رومان، فلسفہ حکمت اور دنیا بھر کے معاملات کو اپنے اشعار میں اس

طرح سمودیا ہے کہ دنیا کی کسی زبان میں اس کی مثال نہیں ملتی۔ شیکسپیئر نے خیالات کے پنڈورا کا جو باکس کھولا ہے اس کے حوالے سے وہ عالمگیر شہرت رکھتا ہے۔ لیکن غالب کا کمال یہ ہے کہ انہوں نے دو مصرعوں کے ایک شعر میں بہت کچھ سمودیا ہے۔ غالب کے ایک ایک شعر کی وضاحت کرنے کے لیے درجنوں دانشوروں اور صاحبِ علم لوگوں نے تشریح کی ہے لیکن غالب کہنا کیا چاہتے ہیں یہ آج تک وثوق سے نہیں کہا جاسکتا جس کی وجہ سے اشعار کی تشریح کا یہ سلسلہ ختم ہوتا دکھائی نہیں دیتا۔

غالب اور فیض کی شاعری میں زمین آسمان کا فرق ہے لیکن یہ حقیقت تسلیم کرنی ہوگی کہ فیض بھی غالب سے مرعوب اور ان کے مداح تھے۔ فیض کو ترقی پسندوں نے ترقی پسند شاعر کہا، کمیونسٹوں نے انہیں کمیونسٹ ٹھہرایا۔ حکومت نے بھی ان پر کمیونسٹ ہونے کا ٹھپا لگادیا مگر درحقیقت فیض نہ تو اس زمانے کے ترقی پسندوں کی مانند ترقی پسند تھے اور نہ ہی کمیونسٹ۔ یہ فرق ان کی ساحر لدھیانوی اور دوسرے ترقی پسند شعرا کے کلام میں دیکھا اور محسوس کیا جاسکتا ہے۔ دراصل وہ آزاد خیال، انسان دوست اور انتہائی حساس شاعر تھے۔ انہوں نے اپنے خیالات کا جس طرح اشعار میں اظہار کیا ہے وہ سکہ بند اور معروف ترقی پسندوں سے بالکل مختلف ہے۔ البتہ یہ درست ہے کہ وہ غالب سے نہ صرف متاثر تھے بلکہ غالب کے مداح بھی تھے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ ان کی شاعری میں غالب کی تراکیب اور بندشیں صاف نظر آتی ہیں۔ انہوں نے اپنی کتاب کا نام ہی ''دستِ صبا'' رکھا تھا۔ دوسرے مجموعوں کے نام بھی ایسی ہی اصلاحات سے مزین نظر آتے ہیں۔ فیض احمد فیض نے انگریزی لٹریچر میں ایم اے کی ڈگری لی تھی۔ اس کے بعد انہوں نے عربی میں بی ایم اے کیا۔ فارسی سے بھی وہ بخوبی واقف تھے۔ اس امتزاج نے انہیں ایک روایت پسند شاعر بنادیا۔ بعض نقاد کہتے ہیں کہ میر کی صدی اور غالب کی صدی کی طرح موجودہ صدی فیض کی صدی ہے۔ اگرچہ اس بارے میں وثوق سے تو نہیں کہا جاسکتا لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس صدی میں فیض کو انفرادیت اور بڑائی حاصل ہے۔ اس عہد میں اردو کے بڑے بڑے شاعر پیدا ہوئے لیکن انہیں فیض جیسا ہمہ جہت کوئی دوسرا نظر نہیں آتا۔

فیض احمد ایک درویش صفت آدمی تھے۔ بردبار، متحمل مزاج، طبیعت میں انکسار، دولت اور نام ونمود سے بے پروا اور بے نیاز۔ بدقسمتی سے اپنی زندگی کا بڑا حصہ انہیں ملک سے باہر گزارنا پڑا۔ کئی ممالک انہیں اپنی شہریت دینے کو تیار تھے مگر فیض احمد کو پاکستان سے محبت تھی اس لیے انہوں نے زندگی کے آخری ایام پاکستان ہی میں گزارے اور لاہور کی زمین میں دفن ہوئے۔ فیض احمد نے بہت خراب اور کڑے دن بھی گزارے لیکن کبھی حرفِ شکایت زبان پر نہ لائے۔ وہ ہر حال میں مطمئن اور صابر رہے۔ ان پر جو تنقید کی جاتی تھی، فیض احمد نے کبھی اس کا جواب نہیں دیا۔ دوستوں کے اصرار پر صرف اتنا کہا کہ یہ ان کی رائے ہے اس کا جواب دینے میں وقت ضائع کرنے سے بہتر ہے کہ آپ کوئی مفید اور کارآمد کام کریں۔ کسی دوسرے شاعر کے بارے میں ''اچھا ہے'' کہہ کر وہ موضوع بدل کر خاموش ہوجاتے تھے۔ وہ کسی پر نکتہ چینی نہیں کیا کرتے تھے۔

فیض احمد فیض کی دو بیٹیاں ہیں لیکن زیادہ لاڈلی چھوٹی بیٹی سلیمہ ہاشمی ہیں۔ انہوں نے پہلی بار اپنے عظیم المرتبت والد کے بارے میں اپنے تاثرات تحریر کیے ہیں جو تخلیق لاہور میں شائع ہوئے تھے۔ سلیمہ ہاشمی کی تحریر فیض احمد فیض کی ذاتی گھریلو زندگی کے ان گوشوں کو اجاگر کرتی ہے جو سلیمہ ہاشمی کے سوا کوئی اور نہیں جانتا۔ سلیمہ ہاشمی عالمی شہرت رکھنے والی مقررہ اور شعیب ہاشمی کی بیگم ہیں۔

فیض احمد فیض 13 فروری 1911ء میں پیدا ہوئے تھے۔ انہوں نے زندگی کا ایک بڑا حصہ ملک سے باہر گزارا لیکن وفات لاہور میں پائی اور لاہور کی مٹی میں (ماڈل ٹاؤن) میں دفن ہوئے۔

بچپن سے ہی چڑ تھی ان لوگوں سے جو پچکار پچکار کر پوچھتے۔ ''فیض کی بیٹی ہو شعر نہیں کہتیں؟'' ابو سے شکایت کی تو انہوں نے سگریٹ کا کش لگا کر کہا۔ ''بھئی کہہ دیا کرو کہ ایک خاندان میں ایک شاعر کافی ہے۔'' کچھ ایسے ہی انداز میں جب 60ء کی دہائی میں آرٹ کونسل کے زمانے میں کمال احمد رضوی جو اُن دنوں میں ڈرامے کی ریہرسل کررہے تھے اور ہیروئن ڈھونڈنے میں ناکامیاب تھے۔ ابو کے پاس شور مچاتے ہوئے آئے اور کہا ''فیض صاحب 7 دن میں ڈراما شروع ہے اور ہیروئن نہیں ہے۔ کچھ کیجیے!'' ابو نے حسبِ معمول سگریٹ کی راکھ جھاڑی اور بولے ''تو بھئی ہمیں رکھ لو......''

بہت مشکل ہے کہ میں ابو کے بارے میں کچھ کہوں یا لکھوں۔ ان سے اپنا رشتہ بیان کرنا بہت دشوار ہے۔ میں تو آج تک یہ فیصلہ نہیں کرسکی کہ ابو کے لیے اپنے بچوں سے

فیض ایلس اور بچے

رشتہ زیادہ گہرا تھا یا وہ رشتہ زیادہ گہرا تھا جو اُن کا باقی دنیا کے لوگوں سے تھا۔ دنیا میں گھومتے پھرتے مجھے لاتعداد لوگ ملے ہیں جنہوں نے مجھ سے اپنے اور ابو کے رشتے کے بارے میں بتایا ہے۔ یہ بات میں شکایت کے طور پر نہیں کہہ رہی۔ رشتے تو دو ہی قسم کے ہوتے ہیں ایک رشتہ تو نفرت کا رشتہ ہوتا ہے وہ تو ابو کا کسی سے بھی نہیں تھا اور دوسرا محبت کا رشتہ ہوتا ہے۔ یہ رشتہ جیسے مجھ سے تھا ویسا ہی اور سب سے تھا۔ مگر اس پیار کے رشتے کا کمال ہی یہ ہے کہ جتنا اس کو بڑھاتے جاؤ اتنی ہی جگہ اس کے لیے دل میں نکلتی آتی ہے۔ میرے خیال میں ابو نے کبھی بھی یہ نہیں سوچا کہ فرد کی محبت کہاں ختم ہوئی اور وطن کی شروع ہوگئی اور وطن کی کہاں ختم ہوئی اور بنی نوع انسان کی شروع ہوگئی۔ اسی لیے تو جب لکھا:

میں جہاں پر بھی گیا اے ارضِ وطن
تیری تذلیل کے داغوں کی جلن دل میں لیے
تیری حرمت کے چراغوں کی لگن دل میں لیے
تیری الفت، تیری یادوں کی کسک ساتھ گئی
تیرے نارنج شگوفوں کی مہک ساتھ گئی
تو فلسطین بھی وطن بن گیا

اور جب کہا:

میں افریقا ہوں دھارلیا میں نے تیرا روپ
تو افریقا وطن بن گیا

اور یہ کہ

اس عشق نہ اس عشق پہ نادم ہے مگر دل
ہر داغ ہے اس دل میں بجز داغِ ندامت

اور اس لیے جب ابا کے چلے جانے کے بہت بعد امریکا میں تھی کہ سنا کہ ان کو نشانِ امتیاز Posthumous دیا جارہا ہے تو میں مسکرائی اور سوچا کہ کہیں 40's میں جنگ کے زمانے میں O.B.E دیا گیا (Order of British Empire) تھا لینن امن ایوارڈ اور لوٹس پرائز بھی لیکن شاید وہ جو وطن سے رشتہ تھا وہ کسی انعام، کسی ایوارڈ سے سہلایا نہیں جاسکتا۔

بہرحال میں نے یہ بھی سوچا:

سی گئی ہے بالآخر برہنہ پائی کی......

اور وہ بھی شاید اس انعام کا سوچ کر مسکرا دیے۔

جب وہ آخری مرتبہ گھر آئے تو کسی نے ان سے سوال کیا کہ فیض صاحب آپ کا دنیا میں اتنا نام ہے اور ساری دنیا میں اتنی عزت ہے لیکن افسوس ہے کہ آپ کے اپنے ملک میں آپ کو اتنی پریشانیوں کا سامنا ہے تو فوراً جواب دیا کہ ''نہیں ہمارے خیال میں ہم سے زیادہ خوش قسمت بہت کم لوگ

ہوں گے۔ لوگوں کو تو گلہ رہتا ہے کہ انہیں زندگی میں ان کے لائق رتبہ نہیں ملا۔ ہمیں تو اپنے حصے سے کہیں زیادہ لوگوں کی محبت ملی......" اور پھر ذرا ازورد ے کر بولے۔

"شاید آپ حکومتِ پاکستان اور پاکستان کے عوام کو آپس میں Confuse کررہے ہیں۔"

دراصل وہ دنیا میں جہاں بھی گھومتے ان کا دل یہیں وطن میں لگا رہا اور جسم کے چلے جانے کے بعد بھی۔

پہنچی وہیں پہ خاک، جہاں کا خمیر تھا
وہی وطن، جو مقتل بھی ہے اور کوچۂ جاناں بھی

وہ آخری برسوں میں artist circle of being کی بات کرتے تھے۔ کہتے تھے کہ لکھنے والے، فنکار، تخلیقی لوگ، تین دائروں میں رہ کر کام کرتے ہیں۔ ایک تو پہلا دائرہ جو اپنی ذات کا ہے۔ دوسرا دائرہ جو وطن اور اپنی زمین کا ہے اور پھر وہ آخری دائرہ جس میں یہ دونوں دائرے گھومتے ہیں اور وہ ہے انسانیت کا۔ بنی نوع انسان کا جو فنکار ان تینوں دائروں میں نہیں رہتا اس کا کام ادھورا رہ جاتا ہے۔

مجھے یاد ہے کہ جب وہ بیروت میں رہ رہے تھے تو ایک مرتبہ انہیں جاپانی ادیبوں کی کانفرنس میں جانا تھا۔ وہ دو سال سے پاکستان نہیں آئے تھے اور یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں تھی کہ انہیں بتادیا گیا تھا کہ اگر وہ واپس آئے تو ضیاء صاحب کی حکومت ان کی تواضع یوں کرے گی کہ انہیں دوبارہ ملک چھوڑنے کی اجازت نہ ملے گی۔ جاپان جاتے ہوئے جہاز میں کوئی تکنیکی مسئلہ ہوگیا اور کراچی اترنا پڑا اور نیا جہاز طلب کیا گیا۔ مسافروں کو stopover دیا گیا اور امیگریشن والوں نے ابو کو ائرپورٹ سے باہر جانے کی اجازت دے دی۔ ہم لوگ لاہور میں تھے کہ B.B.C سے خبر سنی۔

Mr Faiz Ahmed Faiz was not allowed to proceed to japan after his stopover in Karachi.

میں نے فوراً کراچی باجی (بیگم مجید ملک) کے ہاں فون ملایا۔ بہت دنوں بعد ابو کی آواز سنی۔ میں نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ "ابو، واپس آنا کیسا لگ رہا ہے؟"

ذرا سا p a u s e تھا پھر جواب دیا۔

"Wonderful"

اور یہ تو میں جانتی تھی 1980ء جولائی میں میں نے طے کرلیا کہ اپنے دونوں بچوں کو لے کر ماما اور ابو کے پاس بیروت ہو آؤں۔ سرکاری ملازم ہونے کی وجہ سے اجازتوں کا سلسلہ لمبا اور کٹھن تھا۔ لیکن آخر اجازت نامہ ہاتھ میں آگیا۔ شعیب کو خدا حافظ کہا اور 11 سالہ یاسر اور 5 سالہ میرا کے ساتھ بیروت پہنچی۔ خانہ جنگی کا زور تھا۔ اسرائیلی فوج، بحریہ اور ائرفورس اکثر شہر کو اپنی کاوشوں سے نوازتی تھیں لیکن ایک عجیب جوش و خروش کا سماں تھا۔ زندہ دلانِ بیروت میں بہت سے فلسطینی فنکار، شاعر، ادیب شامل تھے۔ ابو کا دفتر اور فلیٹ ایک ہی عمارت میں چھٹی منزل پر تھے۔ میرے پہنچنے سے پہلے اس عمارت میں دو مرتبہ بم پھٹ چکے تھے لیکن فوری طور پر مرمت بھی ہوگئی تھی۔ ابو کے کمرے کے شیشے جو کہ چکنا چور ہوگئے تھے دوبارہ نئے سرے سے لگا دیے گئے تھے اور Lift بھی چل رہی تھی۔

اس زمانے میں بیروت پورے مشرق وسطیٰ کے دانش وروں کا سینٹر تھا۔ مصر سے بھاگے ہوئے پروفیسر، شاعر، عراق کے آرٹسٹ، دمشق کے صحافی، کویت اور ایران کے مفرور ادیب یہیں موجود تھے۔ لبنانی، فلسطینی ادیب اور شاعر تو تھے ہی۔ کبھی Edward Saeed، کبھی معین بسیو، کبھی Adrian اور کبھی محمود درویش اور کبھی اور۔ ابا کے ساتھ ان کی ملاقاتیں رہتی تھیں۔ لیکن جب شام ڈھلتی تو ابا اس چھوٹے سے فلیٹ کی اس سے بھی چھوٹی بالکونی پر اپنی کرسی گھسیٹ لے جاتے اور سمندر پہ نظر جمائے، گلاس ہاتھ میں تھامے، سگریٹ پیتے رہتے، شاید کسی ایسی ہی ایک شام میں کہا:

خیال سوئے وطن رواں ہے
سمندروں کی ایال تھامے
ہزار وہم و گماں سنبھالے
کئی طرح کے سوال تھامے

میرے بیروت جانے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ بیروت سے جنوری 80ء کے ایک خط میں بچوں کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے لکھا:

"In exill, I am missing your children's childhood. as I missed missed yours in Jail-"

60ء کی دہائی میں شعیب اور میں لندن میں مقیم تھے۔ ابا کا آنا جانا رہتا تھا۔ جب بھی وہ آتے تو کوئی نہ کوئی چھوٹی سی بجلی کی gadget کی فرمائش ہوتی۔ جو اُن سے

کبھی چلتی نہیں تھی۔ ایک مرتبہ اچانک خیال آیا کہ انہیں Shaver کی ضرورت ہے۔ انہیں اسی دن واپس لوٹنا تھا اور اتوار کا دن تھا۔ سن 60ء کے زمانے میں اتوار کو سب دکانیں بند رہتی تھیں۔ شعیب نے کہا دیکھیں آج اتوار ہے بہر حال ڈھونڈتے ہیں۔ آپ کو کیسا Shaver چاہیے۔ بولے ایسا Shaver چاہیے جو کہ battery سے بھی چلے اور بجلی سے بھی۔ A.C بھی ہو اور D.C بھی ہو اور rechargeable بھی ہو۔

شعیب نے کہا "فیض صاحب فیرتے بھاپ نال چلن والا لبھے گا!"

لیکن قسمت کیا تھی کہ کچھ ایسی ہی چیز مل گئی!

جب بھی سفر سے لوٹتے ہمیشہ حیران ہوکر قصے سناتے کہ کس طرح ائرپورٹ والوں نے آؤ بھگت کی۔ کسٹم والے کس پیار سے پیش آئے وغیرہ وغیرہ۔ البتہ جب وہ لینن انعام پانے کے بعد واپس کراچی لوٹے تو ایک نوجوان کسٹم والے نے اصرار کر کے سامان کھلوا دیا۔ آس پاس کے مسافر اور دوسرے کسٹم افسران کو برا لگا۔ لیکن جب سامان میں سے لینن ایوارڈ اور میڈل برآمد ہوا تو نوجوان بولا "فیض صاحب بس اسی ایوارڈ کو دیکھنے کی تمنا تھی" اور اس نے فخر سے نکال کر اپنے ساتھی افسروں کو دکھایا۔

ابا کی دوستیوں کا یہ عالم تھا کہ ہمارے دوستوں اور ہمارے دوستوں کے دوستوں سے بھی یاری۔

ارشد محمود شعیب کا شاگرد۔ اب تو نامور music director ہے لیکن اس زمانے میں advertising میں نئی نئی نوکری کی تھی۔ جوانی کے نشے میں ایک شام ماڈل ٹاؤن ابا کے گھر پہنچا اور کہا "فیض صاحب ایک jingle تو لکھ دیں۔"

"ابا بولے "کیا؟"

ارشد نے کہا "National کے مصالحے ہیں ان کے لیے Jingle لکھ دیں، میں کہہ آیا ہوں کہ آپ سے ہی لکھواؤں گا۔"

ابا نے ہلکا سا ڈانٹ کے کہا۔ "ارے بھائی ہم jingle نہیں لکھتے۔"

ہز ماسٹرز وائس کا نشان

ارشد محمود دکھی ہوکر ہمارے یہاں جی بلاک آ گیا۔ ابھی وہ دروازے میں سے اندر آہی رہا تھا کہ ابا کا فون آگیا۔

"بھئی ارشد تمہاری طرف آیا ہے؟ اسے ذرا فون دینا۔"

ارشد نے فون لیا۔

ابا بولے "ہاں، لکھو۔"

وہ ہم نے کہا ہے۔

"ادرک دھنیا مرچ اور ہلدی
نیشنل نے سب کی کایا پلٹ دی
کون کرے مرچوں کی پسائی
ادرک دھنیے کی رگڑائی
پل میں مصالحہ ہے تیار
خالص عمدہ خوشبودار!"

خواجہ خورشید انور سے ابا کی دوستی گورنمنٹ کالج کے زمانے کی تھی۔ ابا کہا کرتے تھے کہ اس زمانے میں خواجہ صاحب ان سے بہتر شاعر تھے۔ جب ابا بیروت میں تھے تو خواجہ صاحب جو دنیا سے کافی کنارہ کش ہوچکے تھے مجھے کہیں ملے اور کہا "فیض کو خط لکھو تو کہہ دینا کہ بیمار ضرور ہوں لیکن اسے ملے بغیر دنیا سے نہیں جاؤں گا۔ اسے معلوم ہے کہ میں کتنا ڈھیٹ ہوں۔"

ابا جب بالآخر گھر لوٹے تو خواجہ صاحب ریلوے اسپتال میں داخل تھے۔ ابا کے آتے ہی میں نے ذکر کیا تو بولے "کل چلیں گے۔"

دوسرے روز ہم اسپتال پہنچے تو دونوں ملے۔ خواجہ

صاحب بہت اچھے موڈ میں تھے اور کوئی خاص کمزور بھی نہیں نظر آرہے تھے۔ ابا کی صحت بھی پہلے سے بہت بہتر تھی۔ دونوں گلے ملے اور ان کی آنکھیں بھر آئیں۔ میں نے دیکھا کہ معاملہ کچھ جذباتی ہو رہا ہے تو تقریباً ڈانٹ کر کہا "خواجہ صاحب سردیاں آرہی ہیں اب آپ دونوں باہر باغ میں بیٹھ کر اپنی اپنی کتابیں لکھیں۔ خواجہ صاحب آپ نے صدیوں سے موسیقی پر کتاب لکھنے کا وعدہ کیا ہے اور ابو آپ کو اپنی autobiography شروع کرنی ہے۔"

خواجہ صاحب مسکرا دیے اور کہنے لگے۔ "فیض توں آگیا ایں۔ ہن بس میں ٹر چلاں آں۔"

ابا کی آنکھوں میں مجھے کچھ نظر آیا۔ جلدی سے جواب دیا۔ "ہاں نال چلاں گے۔"

لیکن خواجہ صاحب اپنی بات کے پکے تھے۔ ہفتے بھر بعد دنیا چھوڑ گئے۔ ابو جو دوستی نبھانے کے قائل تھے 20 دن بعد وفات پا گئے۔

آخر تک جب بھی پوچھا گیا کہ آپ کیا کرنا چاہتے ہیں یا آپ نے کیا کیا تو یہی کہا کہ

کچھ عشق کیا کچھ کام کیا
اور پھر تنگ آکر کہتے
دونوں کو ادھورا چھوڑ دیا

میرے خیال میں تو ابو نے شاعری اس لیے شروع کی کہ وہ عام زندگی میں محبت کا اظہار یا کوئی بھی جذباتی اظہار کرنے سے جھجکتے تھے۔

ایسی طبیعت جس میں اتنے لوگوں کا درد بھی ہو اور منہ سے کچھ کہنے کی عادت بھی نہ ہو خاصا مسئلہ پیش کرتی ہے۔ مگر دل کھول کر جب بھی بات کی تو صرف شاعری میں ہی کی۔ ملال کی بھی، درد کی بھی۔

اس راہ میں جو سب پہ گزرتی ہے وہ گزری
تنہا پسِ زنداں کبھی رسوا سرِ بازار
زندگی کا بہت سا عرصہ وہ بھی تھا جو پابجولاں بازار میں چل کر گزارا اور وہ بھی تھا جو دور پردیس کی بے مہر گزرگاہوں میں اجنبی شہر کی بے نام ونشاں راہوں میں گزارا اور ان میں سے وہ دن بھی تھے جب جلاوطنی میں کہا کہ

دیں گلی گلی صدائیں
کریں رخ نگر نگر کا
کہ سراغ کوئی پائیں
کسی یارِ نامہ بر کا
ہر اک اجنبی سے پوچھیں
جو پتا تھا اپنے گھر کا

لیکن ان باتوں کے باوجود فیض کی زندگی نہایت ہی بھرپور زندگی تھی کیونکہ بات جہاں آخر ٹھہرتی تو یہیں پہ کہ سحر کی بات۔ امید سحر کی بات سنو۔

میرے خیال میں اس کی دو وجہ ہو سکتی ہیں ایک تو یہ کہ ایک مرتبہ ماما نے پوچھا کہ آج کل کون بہت اچھی شاعری کرتا ہے تو فراز کا نام لیا۔ دو ایک اور نام لیے تو ماما نے پوچھا کہ ان سب میں سب سے اچھی شاعری آپ خود کرتے ہیں یا کوئی اور؟ تو سوچ کر مسکرا کر کہا۔

"نہیں میں خود ہی کرتا ہوں۔"

تو ماما (جو کہ آخر میم صاحبہ ہیں) بولیں "تو اس کا مطلب ہے کہ اس وقت آپ اردو زبان کے سب سے بڑے شاعر ہیں تو کہنے لگے "I suppose I am"

تو یہ تو اپنے آپ کو جاننے کی بات۔ لیکن اپنے آپ کو کچھ سمجھنے کی جو بات ہے تو وہ یہ کہ

میرا درد نغمۂ بے صدا
مری ذات ذرۂ بے نشاں!

یہ بات کہ اپنے آپ کو سمجھنا کچھ بھی نہ اور جاننا سب کچھ، ایک تو یہ اچھی زندگی کا نسخہ ہے اور دوسری بات اگر پوچھیں تو زندگی میں مال متاع کیا حاصل کیا تو کل متاع جس کی پروا کی وہ لوح و قلم ہے اور جس نے اپنی لوح پر سے دنیا کی پرانی نفرتوں، بے مروتیوں کے نقش مٹا دیے ہوں اور دل کی لوح کو متاع سمجھ لیا اور اسے شفاف بھی کر لیا ہو۔

اب کچھ خود سلیمہ ہاشمی کے بارے میں خود ان کے قلم سے:

جب اصرار کیا گیا کہ جدید مصوری پر کچھ لکھوں تو میں ذرا جھجکی۔

اس کا ٹھیکا تو کب سے انور سجاد کو ملا ہوا ہے اور ویسے بھی مصوری تو کرنے کی چیز ہے۔

ہمارے گھر میں بہت پہلے سے لکیریں کھینچی ہوئی تھیں۔ ماما کے اپنے طریقے تھے۔ ہمارا وقت پر اٹھنا، وقت پر اسکول جانا، ہوم ورک کرنا، میز پر بیٹھ کر کھانا، کہنی میز پر نہ رکھنا اور وقتاً فوقتاً Please اور thank you کہتے رہنا۔

ان سب میں ان کا عمل دخل تھا۔ گھر کا انتظام اور دنیا کے وہ کام جو کہ civilised behaviour کے ضمن میں نہیں آتے تھے وہ ابو کی راج دھانی تھی لیکن ابو کے جیل جانے کے بعد یہ نظام درہم برہم ہو گیا اور گھر اور اسکول کے اس دائرے میں باقی دنیا نہایت بدتمیزی سے داخل ہوئی اور ان حالات میں میں نے سمجھ لیا کہ خاموشی ہی بہتر ہتھیار ہے لہٰذا بات چیت بالکل محدود کر دی اور اوروں سے گفتگو کے بجائے اسکول کی کاپیوں کتابوں کے حاشیوں میں اپنی ہی بنائی ہوئی الٹی سیدھی لکیروں سے دوستی کر لی۔

یہ تمہید اس لیے باندھی ہے کہ مجھے اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ میرا کام نہیں۔ یہ ضرور ہے کہ 30 سال سے NCA میں مصوری پڑھا رہی ہوں اور اس کے ساتھ ساتھ بہت کچھ اور اس "کچھ اور" میں وہ سب چیزیں شامل نہیں جو ہمارے نوجوانوں کو ہمارے تعلیمی ادارے مہیا نہیں کرتے۔ جن میں سرفہرست وہ قوتِ بینائی ہے جو کہنے کو تو ہے لیکن آنکھیں واقعی دیکھنے کی عادی نہیں ہوتیں۔

پہلے ہی ہفتے میں فرسٹ ایئر کی کلاس کے ساتھ میں ایک چھوٹا سا تجربہ کرتی ہوں۔ ان سے پوچھتی ہوں کہ کالج کے دروازے سے کلاس تک وہ کتنی محرابوں سے گزرے۔ کالج کے والان میں کتنے درخت تھے۔ کیا باغ میں پھول کھلے تھے وغیرہ وغیرہ۔ ان کو خود جلد احساس ہو جاتا ہے کہ ہر چیز کو سرسری طور پر دیکھنا اس طرح کہ کچھ بھی نظر نہ آئے عام ہے۔ اس خود کار اندھے پن کی وجہ کچھ تو عادت ہے اور دوسری یہ کہ ہم ہر چیز کو لفظوں کے چشمے پہن کر دیکھتے ہیں۔ یہ احساس کہ تخلیقی عمل پر لفظ حاوی ہے۔ یہ ادراک تو مجھے بہت پہلے سے تھا لیکن ایک استاد کی حیثیت سے یہ حقیقت اور بھی سنگین ہے۔

اور اسی لیے آج مصوری کو لفظوں کے تانے بانے میں جکڑنے کو آپ سے مخاطب ہوں۔ حالانکہ مصوری کی زبان، اس کی لغت، گرامر اور ساخت آج جن پُر پیچ راستوں سے ہمارے یہاں گزر رہی ہے تو اس کے سنگِ میل اس کے نشانِ راہ دھندلے دھندلے سے ہیں لیکن اس سب کے بیچ طالب علموں میں رہ کر سیکڑوں آنکھوں سے دیکھنا سیکھا بھی ہے اور یہ بھی سکھانے کی کوشش کی کہ:

To see. is to forget the name
of the thing one sees.

وہ دیدۂ بینا جو نام ونسب سے نکل کر شے کی حقیقت تک جا پہنچے۔ مگر ایسا ہوتا نہیں۔ جب پڑھنا سیکھا تو مجھے اتنا ضرور یاد ہے کہ بہت ہی تکلیف دہ عمل تھا۔ حروف کی ایک اپنی مرضی تھی۔ اس کے مقابلے میں خود کار لائنیں مختلف تھیں۔ ان کو اپنی خواہش کے مطابق موڑنے سے کہانیاں بُنی جا سکتی تھیں۔ شفاف ہموار سطح پر لائن کھینچنے کا لطف، رنگوں کی مٹھاس اور ان کے سفید کاغذ پر پھیلانے کی لذت۔ وہ جادو جو دیکھتے ہی دیکھتے زرد رنگ کی آڑ میں سرخ کو قریب سے گزرتے ہوئے نارنجی کر دیتا۔ وہ دلدار کاسنی رنگ جس میں ڈوبنے کو جی بھی چاہتا اور خوف بھی آتا۔ کیونکہ لگتا کہ اس میں ڈوب کر نکل کر واپس لوٹنا ممکن نہیں۔

گھر کی دیواروں پر کئی Painting سجی تھیں اور کتابوں میں تصویریں۔ تصویریں جن سے لفظوں سے آگاہی ہونے سے پہلے جان پہچان ہو گئی تھی۔ مجھے اپنی پھوپی کے ہنسی سے لوٹ پوٹ ہونے کی وجہ سمجھ ہی نہ آتی۔ جب چھ برس کی عمر میں میں نے انہیں نہایت سنجیدگی سے بتایا کہ گھر کی الماریوں میں پڑی کتابوں کی تمام تصویریں میرے ابو کی بنائی ہوئی ہیں۔

آٹھ سال کی عمر میں پتا چلا کہ ان کا میدان تو شاعری ہے۔ یہ وہی زمانہ ہے کہ جب وہ 5 سال کے لیے جیل گئے اور جیل میں کہی گئی ہر نظم جب خط میں آتی تو ایک طلسم کی طرح گردش کرتی اور چھپنے پر 20 روپے مہیا کرتی۔ یہ 20 روپے میرے اور میری بہن کے نئے جوتوں، کہانی کتابوں اور وٹامن کی گولیوں (جو کہ ہماری فکر مند ماں باقاعدگی سے ہم پر ٹھونسا کرتیں) میں بدل جاتے۔ اس سے اندازہ تو ہوا کہ شاعری کئی لوگوں کے لیے اہم ہے اور مضبوط رویے ابھار سکتی ہے۔ مصوری کے معاملے میں ایسی بات کہاں۔ لیکن پھر بھی اس عمر میں یہ بھی جانا کہ گہرے احساسات، بیرونی واقعات کے اثر سے نیا روپ دھار لیتے ہیں۔

کئی سال بعد ایک نوجوان ماں کی ذمے داریاں نمٹا کر جب مصوری کی طرف لوٹی تو اپنی تصویروں میں اس درد کا پتا دینے کی کوشش کی جس نے بنگلہ دیش کی جدوجہد کی خونی کشمکش سے جنم لیا۔ جان بوجھ کر اس سلسلے کی تصاویر کا نام "سوہنی دھرتی" رکھا۔ ان تصاویر کو اب دیکھ کر محسوس ہوتا ہے کہ یہ اس المیے کا ایک سادہ سا ریکارڈ رکھنے کی کوشش تھی۔ یہ کاوش شاید ورثے میں ملے سامان کی طرح تھی جیسے آنکھوں کا رنگ، ہری مرچوں سے رغبت، نہ، نہ کر سکنے کی عادت، تصنع کے سامنے کھلکھلا پڑنا۔

جب 17 سال کی عمر میں نیشنل کالج آف آرٹس میں داخلہ لینے کا فیصلہ کیا تو ڈیزائن کا کورس چنا کیونکہ شک تھا کہ مصور بننے کی نہ تو مجھ میں صلاحیت ہے اور نہ ہی جذبہ لیکن Bath Academy of Art میں جانے اور خصوصاً HowardHodgekin کی Painting Class ..... میں Bonnard کی تصویروں میں رنگوں کی چکاچوند یا راجستانی مصوری کی جذباتی کیفیت موضوعِ گفتگو رہتی۔ جیسے ہی میرا خوف کم ہوتا محسوس ہوا ویسے ہی تصاویر میں زندگی کے امکانات زیادہ ہوئے۔

اس سب سے کچھ سال پہلے شملہ پہاڑی لاہور والے گھر میں مصور آتے جاتے تھے۔ معین نجمی، شمزا، علی امام، صفدر خودم اور شاکر علی۔ سبھی چچا تھے جن کی ذات اور کام دونوں سے واقفیت تھی۔ اکیلے چغتائی ہی تنہائی پسند تھے۔ مشہور تھا کہ وہ اپنے راوی روڈ کے اسٹوڈیو سے کبھی باہر نہیں نکلتے لیکن بچپن کی یادوں میں ان کی دھندلی یاد موجود ہے جبکہ اس وقت کی تصویریں اب بھی نظروں میں یوں بسی ہیں جیسے کسی دوست کی مانوس صورت۔ ان کی ایک Ekling میں ایک دوشیزہ۔ سوچا کہ دوشیزہ کے بجائے کوئی اور لفظ کہوں لیکن چغتائی کی تصویروں میں، لڑکیاں یا عورتیں کبھی نظر نہیں آئیں۔ وہ سب .... دوشیزائیں ہی رہیں۔ ان کے گیسو گیسو ہی ہیں بال نہیں، ان کی آنکھیں چشمِ آہو، جن پر لٹ نہیں گرتی، زلف لہراتی ہے، کرتہ شلوار کا تو نام و نشان نہیں، کہیں قبا ہے تو کہیں دوشالہ تو کہیں انگرکھا۔ یہ تو مجھے معلوم ہے کہ چغتائی صاحب کے دوستوں میں تاثیر، فیض، چراغ حسن حسرت، امتیاز علی تاج وغیرہ تھے۔ لیکن خیال آتا ہے کہ کیا کبھی ان کی صحبت منٹو سے بھی رہی؟

لاتعداد دوستوں کی کتابیں کے کور انہوں نے بنائے۔ کیا کبھی منٹو نے بھی ان سے فرمائش کی؟ اور اگر چغتائی صاحب مان جاتے تو ان کی Imagery کا دامن کس رنگ میں رنگا جاتا؟ احمد پرویز سے لاہور میں دور ہی سے ملاقات تھی۔ البتہ لندن میں ان کے کینوس کی چپ ٹوٹی اور بے ساختہ رنگوں کی پھلجھڑیاں بکھر بکھر کر نظر سہلاتیں اور پرویز تصویر کی تفسیر باوازِ بلند جاری رکھتے۔

لاہور میں شور شرابے والے چچاؤں میں شمزا اور علی امام پیش پیش تھے۔ شاکر مسکراتے رہتے اور ان کے دعووں سے کنارہ کشی اختیار کر لیتے۔ مصوری کے نئے پیمانوں کی بحث چلتی تو شمزا کے مکوں کی میز پر بارش ماما کی انٹری پر رک جاتی ہے لیکن میں یہ سوچتی کہ زندگی کے بجائے یہ سب لوگ لینڈ اسکیپ اسٹائل لائف اور Undes کیوں بناتے ہیں۔

بعد میں جب نیشنل کالج کے استاد کی حیثیت سے مجھے جن مسائل کا سامنا کرنا پڑا ان میں نوآبادیاتی بیانی طریقوں کا رواج اور مختلف موضوعات کے چناؤ کے اختیار کا ہونا شامل تھا۔ یہاں پر مصور، استاد، پرنسپل شاکر علی کی موجودگی کافی تھی لیکن 70ء کی دہائی کے میرے معاصرین اور شاگرد ایک شدید اور مسلسل مکالمے میں معروف تھے۔ ایسے ہی وقت میں ظہور الاخلاق نے نہایت پیار سے ایک مضمون مجھے پڑھ کر سنایا جس کی پہلی پانچ سطریں کچھ یوں تھیں۔ ”جدیدیت ایک جدید گالی ہے غالباً سلیمہ ہاشمی کے لیے مناسب ہے، ویسے تو جدیدیت موزوں کر سکتے ہیں۔ اپنے تمام ناپسند ہم عصروں پر جو عملِ پیہم کی بدولت سرک سرک کر بڑھتے رہتے ہیں۔ اپنی جان فشانی سے، جذبے اور فکر سے، تن من دھن سے اپنے آپ کو سپرد کر دیتے ہیں۔ فکر کی ایک کرن سے اجالا جو کہ ان کے من میں بستا ہے۔ روزنِ ذات سے چھن چھن کے یہ فیض بہت سوں کو پہنچا ہے۔“

ظہور الاخلاق اور شاکر علی استاد شاگرد دونوں کی تحریریں اتنی ہی واضح جتنی کہ ان کی گفتگو غیر حاضر۔ ظہور کی کم گوئی اس انتہا کی تھی کہ شاید ہی کوئی دوست ہوگا کہ جس نے خوشی میں، غم میں، غصے میں یا عام گفتگو میں ان سے چار پانچ لفظ مسلسل سنے ہوں۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ ظہور اپنی تصویروں میں اتنا کچھ کہہ جاتا تھا کہ زبانی کچھ کہنے کی گنجائش نہ رہتی تھی۔ نہ کوئی ضرورت، نہ مقام۔

اس میں عجیب باتیں دو ہیں۔ ایک تو یہ کہ وہ زندگی سے یا زندگی کے کسی بھی کونے کھدرے سے کنارہ کش نہیں تھا بلکہ اس کے برعکس زندگی کے ہر لمحے میں بے حد منہمک ہوتا اور دوسرے یہ کہ ظہور کو گفتگو کا بے حد شوق تھا۔ جس دوست سے بھی پوچھو وہ یہی کہے گا کہ اس کے ساتھ گپ لگانے کا بہت مزہ آتا تھا لیکن اگر پوچھو کہ کیا گپ لگی تو ہر کوئی ”ہوں“ یا ”ہاں“ کا کوئی قصہ سنا دے گا۔

شاکر علی کی گفتگو کے بارے میں تو انتظار حسین صاحب ایکسپرٹ ہیں۔ لیکن جب شاکر علی کی لاہور میں پہلی نمائش 1952ء میں ہوئی، سی آئی ڈی نے خاصی پوچھ گچھ کی۔ انہیں گمان تھا کہ ان تصویروں میں اشتراکی نقطہ نظر

افتخار عارف، جمیلہ دہلوی، شہرت بخاری، گوپی چند نارنگ، فیض احمد فیض، زہرہ نگاہ اور احمد فراز بی بی سی کے مشاعرے میں

کا پرچار کیا جا رہا ہے اور انہیں سیفٹی ایکٹ کے تحت گرفتار کر لینا چاہیے۔ غالباً شاکر صاحب سے گفت و شنید کے بعد انہوں نے اپنا ارادہ بدل دیا ورنہ تو یہ پاکستان کی مصوری کی تاریخ میں پہلی سزا یافتہ یا کم سے کم گرفتار شدہ پینٹنگز ہوتی۔ کم گو، تو معین نجمی بھی تھے۔ دبلے پتلے، لمبے قد کے نہایت وجیہہ آدمی تھے، جب چلتے تو تھوڑا سا پیچھے کو جھک کر۔ مصور کا سن کر جو ذہن میں ایک Bobemian کی تصویر آتی ہے اس سے بہت مختلف، بے حد صاف ستھرے کپڑوں میں مصور کم اور افسر زیادہ نظر آتے۔

جب برسوں کوئی تصویر نہ بناتے تو کبھی کوئی ذکر چھیڑ ہی دیتا۔ جواب دیتے ”تجربہ اکٹھا کر رہا ہوں۔ جب کافی ہو جائے گا تو پینٹنگ خود بخود بن جائے گی۔“ ہر کسی کو نجمی صاحب کا تجربہ اکٹھا ہو جانے اور پینٹنگ بننے کا انتظار رہتا کیونکہ سالہا سال پینٹنگ نہ بنانے کے باوجود وہ نہ صرف مصوروں کی صف میں رہتے بلکہ مصوروں کے ہر حلقے کا محور ہوتے۔ آج بھی وہ مون اسکیپ یاد ہے۔ الحمرا کی اس بیچاری سی آرٹ گیلری کی دیوار پر (جہاں آج ایک قد آور فن کا مقبرہ کھڑا ہے) آسمان پر عنابی رنگ کا پھیلاؤ اور اس دہکتے رنگ میں ابھرتا ہوا چاند، سفید رنگ، چاندی رنگ تصویر جب دیکھی تو جی چاہا کہ آنکھیں ہاتھ بن جائیں، انگلیاں کینوس پر Palette knife سے لگے ہوئے رنگ کے ابھار چھو سکیں۔ اس تصویر کے بعد نجمی صاحب سے کبھی تصویر نہ بنانے کے بارے میں کچھ نہ --- کہا گیا کہ معین نجمی پر زیادہ سے زیادہ الزام لگ سکتا ہے کہ انہوں نے کم مصوری کی لیکن اچھی کی۔ جبکہ ہمارے قبیلے کے بہت سے ایسے بھی ہیں جن پر اس کے الٹ الزام لگایا جا سکتا ہے۔

79ء کی دہائی میں ٹی وی بھی ذریعۂ اظہار بنا جو 1977ء کے مارشل لاء کے ساتھ رک گیا اور ہم جیسے لوگوں سے TV کو پاک کر دیا گیا۔ اس کے بعد زندگی واپس اظہار کے ذاتی طریقوں کی طرف چلی گئی جس میں کیمرا، کاغذ، Canvas، رنگ اور ناظرین کا ایک محدود حلقہ شامل تھا۔ شاید Dickens کی Tale of 2cities میں بہتر کیا گیا ہے کہ:

it was the best of times' it
was the worst of times

دوست مجبر ہو گئے اور کمزوروں نے ریاستی جبر کا شاعرانہ حوصلے سے سامنا کیا۔ اس مقابلے میں جسم و زباں کی قید سے پہلے رشتوں سے وفاداری نے یقین سے رہنا اور مستقبل کی امید کا شعور دیا۔

سو مصوری، مقابلے کی سعی اور فرار کا عمل دونوں تھے۔ ذریعۂ اظہار، معنی و مطلب میں بدلتا گیا۔ اپنے اردگرد کے موضوعات کام کا حصہ بننے لگے۔ میں نے کیمرا لے کر پاکستان کا سفر شروع کیا اور عورتیں میرا موضوع، قبائلی علاقے، سندھ کی جھیلیں، ماہی گیر، صحرا کے گرد آلود گاؤں، گلیاں اور خیمے۔ یہ ایسا ہی تھا کہ گویا کوئی پھانسیوں اور کوڑوں کے جنونی ماحول میں سمجھ بوجھ کا سرا ڈھونڈنے کی کوشش کرے۔ جبر کا عمل اور اس کے سہے جانے کا کوئی جواز نہ تھا۔ پھر اس وقت فوٹو گرافی ہمیشہ سے موجود دوسری حقیقتوں کے بیان کا ذریعہ بن گئی۔

1980ء میں اسلام آباد میں منعقد بچوں کی فوٹو گرافی کی میری نمائش کے بروشر کے لیے فیض صاحب نے

ایک نظم لکھی۔ بیروت میں جلاوطنی کے عرصے میں ان کی نظمیں خطوں میں آئیں۔ دوبارہ سے ایک طلسماتی شے کی طرح پڑھی جاتیں، یاد کی جاتیں، گائی جاتیں، تقسیم ہوتیں۔ ایک عجب تضاد کے عالم میں وہ تو بیروت میں آزاد اور یہاں ہم سب مقید۔

جب ایک موسم گرما میں بچے اپنے نانا سے ملنے بیروت گئے تو خانہ جنگی کی پُر پیچ صورتِ حال سے آگاہی ہوئی۔ فلسطینیوں کی جدوجہد، روز کی بمباری، شہر کی گلیوں میں گولیوں کی سنسناہٹ، جان بچانے کے آسان طریقے۔ یہ کئی سال تک کام میں ظاہر ہوتے رہے۔ صابرہ اور شتیلہ کے کیمپوں کی خون ریزی، تصویروں کے ایک نئے سلسلے کی بنیاد بنی۔ حیات اور حیاتِ نو، درخت، مرجھاتے پتے اور نئے سرے سے پھوٹتی کونپلیں غم کے سائے میں امید کی علامتیں تھیں۔

کئی سال اپنے آپ کو انفرادی نمائش کرنے سے باز رکھا۔ اس یقین کے ساتھ کہ میرے پاس بیان کرنے کو کوئی اہم نکتہ نہیں ہے۔ ایک مرتبہ میرے بزرگ خالد اقبال سے (جنہوں نے خود انفرادی نمائش کرنے سے گریز کیا ہے) گپ شپ کرتے ہوئے وعدہ کیا کہ اپنے کام کی نمائش 40 سال کی عمر میں کروں گی۔ 40 کا ہندسہ قریب تھا اور کام میں موضوعات اور مختلف ہیئتوں کے تجربے جاری تھے۔

Crayon کولاج، آبی رنگ اور روغنی رنگوں سے بنی تصاویر میں پتوں کی شبیہہ موجود تھی جو کہ زندگی، مزاحمت، انکار اور بغاوت کی علامت تھی۔

ایک ایسے وقت میں جب عورتوں کی آئینی حیثیت کمزور کی جارہی تھی۔ پارلیمنٹ میں عورتوں کے لیے چادر پر اصرار ریاستی منافقت کا مظہر تھا۔ خطرے سے بھرپور اور بغاوت پر آمادہ نسوانی جسم کو چھپانے اور خاموش کرنے کی قومی ضرورت تھی۔ اس رویّے نے نسوانی جسم کی حرمت اور حیثیت کو نئے معنی پہنائے۔ میرے کام میں nude کی شانِ نزول شاعری ہے یا پھر رکاوٹوں کے باوجود اپنی حیثیت کا اقرار، image معنی خیز بھی ہے اور غنائیہ بھی اور معاشرے کے تشدد کو للکارنے کا ایک بہانہ۔ 83ء میں خواتین تنظیموں اور سیاسی ورکرز پر پولیس action کی اخباری تصاویر کو کام میں استعمال کرنا شروع کیا۔ ان کو آبی رنگوں کی مختلف تہوں تلے چھپاں کیا تا کہ ان کی شدت نرم پڑ جائے اور مدھم انداز میں بات چلے۔ یہ paintings چھوٹے سائز کی تھیں تا کہ ان کو قریب سے دیکھا جاسکے اور اس کی عملی وجہ یہ تھی کہ گیلری میں پولیس کی کارروائی جو کہ ایک معمول تھا کے دوران آسانی سے غائب کی جاسکیں اور مصوروں کے ہمراہ 1980ء کی قومی نمائش سے چند گھنٹے پہلے ہماری تصاویر نمائش سے اتاردی گئیں۔ ان میں سے ایک مصور کے کام کو فحش قرار دیا گیا اور میری طرح دوسرے مصور کا کام بھی مزاحمتی سمجھا گیا۔

میں اس پر حیران تھی کیونکہ میرا خیال تھا کہ موضوع (یعنی بھٹو کی پھانسی) خاصی ذہانت سے چھپایا گیا تھا اور اس کے حوالے اتنے واضح نہیں تھے۔ میں نے پنجابی فلموں کے پوسٹرز کے تراشے استعمال کیے تھے لیکن شاید ان میں پھندے کی موجودگی نے خطرے کی گھنٹی بجادی اور اس تصویر کے علاوہ میری دوسری تصاویر بھی کسی قسم کے تکلیف دہ موضوع کی غیر موجودگی کے باوجود احتیاطاً اتاردی گئیں اور ہوشیار Buearocrat ہنگامہ سے پاک قومی نمائش منعقد کرنے میں کامیاب ہوگئے۔

نسوانی شبیہہ کے ساتھ ساتھ اور علامتیں بھی اظہار کا حصہ بنیں۔ سیاسی اور سماجی گھٹن نے فرار کی ہر خواہش کو جنم دیا۔ اچانک دروازے اور کھڑکیاں، باہر کا راستہ اور داخلی سفر کی علامتیں کام میں در آئیں۔ 1984ء میں کھڑکیوں سے نظر آتے اڈے بادل اور ہاتھوں کی imagery بدلی سوچوں اور وسیع دکھ کی علامت تھیں لیکن پھر غالب کی ایک ترکیب جو کہ فیض نے استعمال کی۔ دست تہ سنگ نے ہاتھوں کی معنویت بدل دی۔ یہ اب وابستگی کا اظہار تھے۔ پھر وہی لفظوں کی آمریت۔

1988ء میں lilies of the field نامی سیریز میں گہرے سرمئی پس منظر میں ابھرتے، زندہ پھول روشنی لپیٹے ہوئے آئے اور تصویروں کی ساخت پھیل گئی۔ سائز بڑا ہوگیا اور اچانک بغیر کسی وجہ کے آمر مرگیا۔ اب راتیں نیند سے معمور تھیں۔ سرسوں کے کھلے کھیتوں اور ہری شاخوں پر نارنجی پھلوں کے خوابوں سے بھرپور تھیں، اب شاید تصویر بنانے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔

1989ء میں گھر سے ایک سال دور رہنا ہوا۔ تنہائی، ذہنی انہماک اور ذات کی دریافت کا سال۔ اس دوران پہلی بار landscape بنائے لیکن یہ جذبوں اور داخلی اور خارجی واردات کے بیان کے استعارے تھے۔ پرنٹ اور چارکول کی ایک series میں کھڑکی کے عنصر کی

نئے سرے سے بازیافت ہوئی۔ کھڑکی اب حقیقت کا بیان بھی تھا اور اس کے متعلق رویّوں کا اظہار بھی۔ سماجی، سیاسی اور ذاتی تجربہ یادکی تہ سے بیان کے تکلیف دہ مرحلے پر آگیا۔

ملکی اور عالمی واقعات احساس کو گھیرے میں لیتے رہے۔ خلیج کی جنگ اور عورتوں سے زیادتیوں کے واقعات کا جواب کسی نہ کسی طور پر کام میں نظر آتے رہے۔ ”تیسری دنیا کی بہنیں“ زینب کے لیے ایک نظم نامی تصاویر کے سلسلے ہمارے درمیان موجود تضادات کی کھوج تھی۔ ہاتھ سے بنے وزنی اور موٹے سوتی کاغذ پر کام کرنے کا عمل مجھے اپنے کولاج کے زمانے میں واپس لے گیا۔ ڈھاکا کے سفر کے دوران عورتوں کے تیار کردہ بنفشہ کے پھولوں سے بنے کاغذ کو دریافت کیا۔ اس کاغذ کو پھاڑ کر اس کے نیچے موجود image دکھانا توجہ چاہتا تھا۔ جب میں نے فوٹو transfer کے ذریعہ اس کاغذ پر کام کیا تو اس کی سطح انسانی جلد کی طرح سکڑنے لگی۔ پین، پنسل، سیاہی، Croyon اور چارکول اس کام میں سمٹ آئے۔ مختلف میڈیم برتنے سے تصویروں کی تہوں کے درمیان ہم آہنگی کی چاہت غالب تھی۔ چائے کے رنگ میں کاغذ کو بھگونے سے لگتا تھا کہ کاغذ کی عمر بڑھ گئی ہے۔ نسواری، ہرے، جامنی اور ارغوانی رنگوں، کسی شجاعانہ موضوع کی تشکیل کے بجائے ایک بھولے کرب کے نشان کی تلاش بنے۔ خواہش بس یہی رہی ہے کہ یہ نشان وقت کے تقاضوں کو پورا بھی کرے اور اپنے احساس کے تحت بھی ہو۔ مصوری دراصل صرف اس لیے کی جاتی ہے کہ دل کی آواز ہوتی ہے۔ میرے لیے دل کی آواز یہ رہی اور بڑوں کی آواز کچھ اور تھی۔ خوش قسمتی سے اس تضاد کے بارے میں جو کچھ کہنا چاہیے وہ بھی بڑے خود ہی کہہ گئے ہیں میں ان سے بہتر کیا کہوں گی۔ یہی میری خوش قسمتی کی داستان بھی ہے اور میری بات کا اختتام بھی۔ مگر فیض کی آواز میں اس کا آغاز بھی......

وہ لوگ بہت خوش قسمت تھے
جو عشق کو کام سمجھتے تھے
یا کام سے عاشق کرتے تھے
ہم جیتے جی معروف رہے
کچھ عشق کیا کچھ کام کیا
کام عشق کے آڑے آتا رہا
میں عشق سے کام الجھاتا رہا
پھر آخر تنگ آکر ہم نے
دونوں کو ادھورا چھوڑ دیا

☆☆☆

ہندوستان کی فلمی صنعت میں قیام پاکستان کے بعد بہت اتھل پتھل ہوئی۔ ملک تقسیم ہوگیا تھا تو لوگ بھی تقسیم ہوگئے۔ ہندو پاکستان سے ہندوستان چلے گئے اور مسلمان جمے جمائے کاروبار چھوڑ کر ہندوستان سے پاکستان آگئے پھر بھی کچھ لوگ جو بمبئی میں ہی آباد تھے وہیں رہ گئے۔

1950ء کے بعد ہندوستان میں جو اداکار باقی رہ گئے تھے ان میں سرفہرست دلیپ کمار تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ وہ دور دلیپ کمار ہی کا دور تھا۔ ان کے نام کا ڈنکا بجتا تھا۔ انہوں نے مختلف قسم کے کردار اس قدر خوبی سے ادا کیے تھے کہ فلم بین ان کے دیوانے ہوگئے تھے۔ کسی فلم کے پوسٹر یا اشتہار پر دلیپ کمار کا نام دیکھ کر لوگ کشاں کشاں سنیما کی طرف چل پڑتے تھے۔ دلیپ کمار کی ہر فلم کامیابی سے ہم کنار ہوتی تھی۔ لگاتار سپرہٹ فلموں کی ایک قطار تھی جو ختم ہونے میں نہیں آتی تھی۔ وہ جس ہیروئن کے ساتھ کام کرتے تھے وہ کامیاب ہوجاتی تھی۔ اس کا شہرہ ہوجاتا تھا۔ اسی لیے ہر ہیروئن دلیپ کمار کے ساتھ کام کرنے کی تمنائی تھی۔ ہر ہیروئن کی آرزو ہوتی تھی کہ وہ دلیپ کمار کے ساتھ کام کرے کیونکہ وہ جانتی تھی کہ دلیپ کمار کے ساتھ کام کرنا ایسا تھا کہ ہیروئن کندن بن جاتی تھی۔ اس کو انگریزی میں Midas touch کہتے ہیں۔ مطلب یہ کہ جسے چھولیا وہ کندن بن گئی۔

50 کی دہائی میں ہندوستان کی فلمی صنعت میں تین بڑے ہیرو تھے۔ دلیپ کمار، راج کپور اور ایک دیو آنند۔ یہ تینوں Big three کہلاتے تھے۔ اس نسل کے تین بڑے اداکار، لیکن سچ تو یہ ہے کہ اس بات میں صداقت نہیں ہے کیونکہ اداکاری کے اعتبار سے دیکھا جائے ان تینوں میں کوئی مقابلہ ہی نہیں تھا۔ رومانی اور المناک کرداروں کے لیے دلیپ کمار سے بہتر اداکار کوئی نہ تھا۔ وہ جس فلم میں کام کرتے تھے اپنی چھاپ لگادیتے تھے۔ راج کپور اداکار کی حیثیت سے کلاؤن تھے۔ فلم ”آوارہ“ کے سوا انہوں نے کسی بھی فلم میں بہترین اداکاری نہیں کی۔ ان کی اداکاری کا ایک مخصوص انداز تھا۔ اوور ایکٹنگ کرنا ان کی عادت تھی۔ وہ بہت اچھے فلم ساز اور ہدایت کار تھے۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے لیکن بھارتی میڈیا اور فلمی صنعت نے زبردستی انہیں

تین بڑوں میں شمار کرلیا تھا۔

تیسرے بڑے اداکار دیو آنند تھے۔ وہ ایک تعلیم یافتہ اور بہت کشادہ دل انسان تھے۔ ان کی اداکاری کا بھی ایک مخصوص انداز تھا۔ وہ اس دور کے ناراض اور باغی اداکار تھے۔ اچھے کردار اور اچھے ہدایت کار ملنے پر وہ بہت اچھی اداکاری کرتے تھے۔ ضدی، گائیڈ، ٹیکسی ڈرائیور، بازی، جال وغیرہ ان کی بہت کامیاب فلمیں ہیں۔ اداکاری کے وہ خود بھی معترف تھے۔ وفات سے چند سال پہلے انگریزی میں ان کی جو سوانح عمری شائع ہوئی ہے اس میں انہوں نے دلیپ کمار کے بارے میں کھلے دل سے لکھا ہے کہ دلیپ کمار ہندوستان کے عظیم ترین اداکار ہیں۔ دیو آنند نے دلیپ کمار کے ساتھ دو فلموں میں کام کیا تھا۔ راج کپور نے صرف ایک فلم ''انداز'' دلیپ کمار کے ساتھ کام کیا۔ یہ ایک یادگار فلم بھی۔ محبوب صاحب نے ایک بالکل نئے انداز کی فلم بنائی تھی جس کو رجحان ساز فلم کہا جاتا ہے۔ اس فلم میں دلیپ کمار اور نرگس کی اداکاری کے مقابلے میں وہ اداکاری کے جوہر نہیں دکھا پائے تھے حالانکہ ''انداز'' میں یہ کردار انہوں نے بذاتِ خود اپنے لیے منتخب کیا تھا۔ محبوب صاحب نے فلم کا اسکرپٹ مکمل ہونے کے بعد انہیں پڑھنے کو دیا کہ وہ جو بھی کردار پسند کریں گے وہ انہیں مل جائے گا۔ راج کپور نے بہت سوچنے کے بعد اپنے لیے نرگس کے شوہر کا کردار پسند کیا تھا لیکن فلم دیکھ کر جو بھی سنیما گھر سے باہر نکلتا تھا اس کی زبان پر دلیپ کمار کا نام تھا۔ راج کپور کو تو وہ بھول ہی گئے تھے۔ کہانی، ہدایت کاری، اداکاری اور موسیقی کے اعتبار سے یہ فلم ہر ایک کو آج بھی یاد ہے۔

اگلی نسل کے تین بڑوں میں امیتابھ بچن، راجیش کھنہ اور دھرمیندر شامل تھے۔ اپنے زمانے میں ان تین اداکاروں نے بھی خوب دھومیں مچائیں اور ایک عرصے تک فلمی صنعت پر چھائے رہے۔

امیتابھ بچن کی لگاتار ایک درجن سے زیادہ فلمیں اوپر تلے فلاپ ہوئیں۔ اگر کوئی اور اداکار ہوتا تو فلمی صنعت کے دروازے اس پر بند ہو چکے ہوتے مگر امیتابھ قسمت کا دھنی تھا۔ بالآخر اس کو فلم ''زنجیر'' میں کام کرنے کا موقع ملا۔ یہ ایک سپر ہٹ فلم تھی جس نے امیتابھ کی تقدیر بدل دی۔ اس کے بعد امیتابھ نے مڑ کر نہیں دیکھا اور صحیح معنوں میں ایک سپر ہیرو کا مقام حاصل کرلیا۔ اسی زمانے میں راجیش کھنہ بھی پورے عروج پر تھے۔ اوپر تلے ان کی پندرہ فلمیں سپر ہٹ ہوئی تھیں جو کہ ایک ریکارڈ ہے۔ دھرمیندر کی فلمیں بھی کامیاب ہو رہی تھیں۔

اس کے بعد آج کی نسل میں جو تین بڑے ہیں ان میں شاہ رخ خان، عامر خان اور سلمان خان شامل ہیں۔ یہ تینوں خان اس وقت ہندوستان کی فلمی صنعت پر اپنی جگہ پر قائم ہیں۔ آج بھی یہی ہندوستان کی فلمی صنعت کے ستون ہیں اور مستقبل قریب میں بھی انہیں ہلانے والا کوئی نظر نہیں آتا۔

امیتابھ کا معاملہ عجیب وغریب اور ناقابلِ فہم ہے۔ ایک دبلا اور لمبا معمولی شکل کا اداکار، جس کی ڈیڑھ درجن کے قریب ابتدائی فلمیں لگاتار فلاپ ہوئی ہوں فلمی دنیا میں کیسے موجود رہا؟

''زنجیر'' امیتابھ کی پہلی سپر ہٹ فلم تھی جس کے بعد وہ اپنی نسل کے تین بڑوں میں شامل ہو گئے۔ وقت کے ساتھ اداکار کی مقبولیت میں کمی ہوتی ہے لیکن امیتابھ وقت گزرنے کے ساتھ زیادہ مقبول ہوتے رہے۔ اس عمر میں جب اداکار بڑی عمر کے کردار ادا کرتے ہیں امیتابھ کی مقبولیت عمر کے ساتھ ساتھ بڑھتی رہی۔ اس وقت 63 سال کی عمر میں وہ ایک مقبول اداکار ہیں۔ انہوں نے بڑی عمر میں بہت اچھے کردار ادا کیے جس کی وجہ سے اب انہیں بہت اچھا اداکار تسلیم کیا جاتا ہے اور ان کی مقبولیت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ چکی ہے۔

فلم فیئر نے ایک خصوصی نمبر دلیپ کمار، امیتابھ اور شاہ رخ خان کے بارے میں مضامین اور ان کے انٹرویوز شائع کیے ہیں۔ دلیپ کمار کا بہت عرصے بعد ایک انٹرویو آپ پڑھ چکے ہیں۔ آیئے اب ذرا امیتابھ کے بارے میں بھی ان کے اپنے انٹرویو کے حوالے سے کارآمد باتیں جاننے کی کوشش کرتے ہیں۔ فلم فیئر میں شائع شدہ یہ تازہ ترین اور شاید منفرد کوشش ہے کہ انہوں نے دلیپ کمار، امیتابھ اور شاہ رخ خان کو یکجا کیا اور ان کے بارے میں خود ان کی زبانی وہ معلومات فراہم کیں جن کا حاصل کرنا اب شاید ممکن نہ ہو۔

فلم فیئر لکھتا ہے:

''وہ آئے، ہم نے دیکھا اور انہوں نے ہمیں جیت لیا۔ یہ ایسے مقبول اور دلوں کو فتح کرنے والے سپر اسٹارز کی داستان ہے جنہوں نے باکس آفس پر حکمرانی کی ہے۔ بلکہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ باکس آفس ان کا غلام بن گیا۔ انہوں نے فلمی صنعت اور فلم سازوں سے اپنی شرائط منوائیں۔ دلیپ

کمار کی حکمرانی کا سلسلہ 1950ء سے شروع ہوا۔ دلیپ کمار چاہتا تو درجنوں فلمیں سائن کرلیتا لیکن اس نے ہمیشہ ایک وقت میں ایک فلم ہی میں کام کیا۔ طویل دور میں دلیپ کمار کی فلموں کی تعداد 60 سے زائد نہیں ہے۔ اس نے تعداد کے مقابلے میں معیار کو ترجیح دی۔ یہی وجہ ہے کہ دلیپ کمار نے ساٹھ سال کے طویل عرصے میں صرف ساٹھ فلموں میں کام کیا لیکن دلیپ کمار کی ریلیز ہونے والی ہر فلم کو سنگ میل کہا جاسکتا ہے۔ ساٹھ فلموں کے ذریعے دلیپ کمار نے فلم بینوں کے دلوں میں ایک بلند اور ناقابلِ فراموش حیثیت حاصل کرلی۔

اس کے برعکس امیتابھ نے جو بھی فلم آفر ہوئی اس میں کام کرنا منظور کرلیا۔ امیتابھ نے ہر قسم کے کردار خوبصورتی سے نبھائے۔ فلم بین امیتابھ اور شاہ رخ خان کی فلموں کی طرف اس طرح لپکتے تھے جیسے ان کے ناموں اور جسموں میں مقناطیس لگا ہوا ہو۔

شاہ رخ خان دلیپ کمار اور امیتابھ بچن کا مجموعہ ہے۔ وہ ہر عمر کے فلم بینوں میں یکساں مقبول ہے۔ ہندوستانی فلمی صنعت کے ایک سو سال کی تقریبات کافی عرصے تک جاری رہیں۔ دلیپ کمار امیتابھ بچن اور شاہ رخ خان کی مقبولیت شاید ہی اور کسی کو حاصل ہو۔

فلم فیئر نے فلم کے ایک سو سال گزرنے کے بعد دلیپ کمار، امیتابھ بچن اور شاہ رخ خان کو اپنے سرورق کے لیے منتخب کیا اور ان تینوں سے انٹرویوز بھی لیے۔ جب امیتابھ بچن 1982 میں فلم ''قلی'' کی شوٹنگ کرتے ہوئے زخمی ہوئے تو سارا ہندوستان اور دنیا بھر میں امیتابھ بچن کے پرستار غمزدہ ہو گئے۔ امیتابھ کی صحت کے بارے میں ہر روز اخبارات میں تازہ ترین خبریں شائع ہوتی تھیں۔ صحت یاب ہونے کے بعد امیتابھ نے پھر اداکاری شروع کردی۔

امیتابھ نے اپنی زندگی میں بہت سے نشیب وفراز دیکھے ہیں۔ صحت مند ہونے کے بعد امیتابھ بچن کئی ناکامیوں اور مشکلات کا نشانہ بنا یا اس کی فلمیں فلاپ ہوتی رہیں۔ اس نے راجیو گاندھی کی وزارت عظمیٰ کے زمانے میں سیاست کا مزہ بھی چکھا مگر یہ تجربہ بھی کامیاب نہ ہوسکا۔ بوفورس توپوں کی خریداری میں کرپشن کے مرحلے سے بھی وہ گزرا۔ اس نے جو ذاتی فلم ساز کمپنی بنائی تھی وہ دیوالیا ہو گئی۔ وہ کئی قسم کی بیماریوں میں مبتلا رہا۔ یہ اس کی اداکاری کا تاریک ترین دور تھا لیکن محبتیں، بلیک اور باغبان جیسی

دلیپ کمار راج کپور اور دیو آنند

فلموں نے اسے نئی زندگی بخشی، فلموں سے قطع نظر ٹی وی پر امیتابھ کا شو ''کون بنے گا کروڑ پتی'' اتنا مقبول ہوا کہ امیتابھ کو نئی زندگی مل گئی۔ یہ مقبول ترین ٹی وی پروگرام سب سے زیادہ پسندیدہ اور مقبول پروگرام ہے۔

ٹی وی کے اس پروگرام کے ذریعے امیتابھ کو جیسے ایک نئی زندگی مل گئی۔ چھوٹی اسکرین پر انہیں سب سے زیادہ پسندیدہ ٹی وی پروگرام کرنے کا موقع ملا۔ امیتابھ بچن اب تین نسلوں کے فنکار ہیں اور بہت زیادہ مقبول بھی ہیں۔ اتوار کی صبح ان کے پرستار ان کے درشن کے لیے ان کے بنگلے کے سامنے اکٹھے ہوتے ہیں۔ لگ بھگ سات دہائیاں پہلے ان کے والد (جو بذاتِ خود ہندی کے بہت بڑے مصنف اور شاعر تھے) ہری ونش رائے بچن نے ان کا نام انقلاب سے بدل کر امیتابھ بچن رکھ دیا تھا۔ امیتابھ کے معنی ہیں ہمیشہ قائم رہنے والی روشنی۔ یہ نام امیتابھ کو بہت راس آیا۔ وہ کئی سالوں سے اپنے فن کی روشنی سے فلمی دنیا کو جگمگا رہے ہیں۔

امیتابھ سے اس موقع پر ایک خصوصی انٹرویو لیا گیا تھا جو پیش کیا جارہا ہے۔

سوال: ابتدائی عمر میں آپ کس قسم کی فلمیں دیکھتے تھے۔

امیتابھ: انگریزی زبان کی فلموں میں دو مسخروں لارل اینڈ ہارڈی کی فلمیں مجھے پسند تھیں۔ یہ مزاحیہ فلمیں ہوتی تھیں جنہیں دیکھ کر میں ہنستے ہنستے لوٹ پوٹ ہوجاتا تھا۔ ویسی فلمیں اب نہیں بنتیں۔ اب جو کارٹون فلمیں بنتی ہیں انہیں دیکھ کر ہنسی نہیں آتی۔ پھر بچوں کی فلمیں بھی ہوتی تھیں۔ سینڈریلا، سنو وہائٹ جیسی فلمیں مجھے بہت اچھی لگتی

تھیں۔ پھر ذرا بڑا ہوا تو جاگرتی جیسی فلمیں پسند کرنے لگا۔ فلم ''چندرلیکھا'' دیکھی تو اداکار رنجن کی تلوار بازی بہت اچھی لگی اس کے بعد جب ہوش آیا تو دلیپ کمار، راج کپور، اور دیو آنند کی فلمیں دیکھتا تھا جو مجھے بہت اچھی لگتی تھیں۔

جب سمجھ دار ہوا تو مجھے اچھی اور بری فلم اور اچھے برے ایکٹر کی پہچان ہوگئی۔ دلیپ کمار میرے لیے ایک مثالی اداکار تھے اور اب بھی ہیں۔ میں ان کی شخصیت سے بہت متاثر ہوا۔ ان کی بالکل حقیقی اداکاری نے مجھے ان کا گرویدہ کرلیا۔

مجھے موتی لال بھی اچھے لگتے تھے اس لیے کہ ان کی اداکاری میں کوئی بناوٹ نہیں تھی۔ انہوں نے دلیپ کمار کو یہی مشورہ دیا تھا کبھی اداکاری نہ کرنا۔ وہی کرنا جو عام زندگی میں کرتے ہو۔ دیکھنے والوں کو یہ احساس نہیں ہونا چاہیے کہ تم اداکاری کررہے ہو۔ دلیپ کمار کی اداکاری میں ایسی بات ہے جو دوسرے اداکاروں کی اداکاری میں نظر نہیں آتی۔

سوال: آپ ہمیشہ دلیپ کمار کے مداح رہے ہیں۔ ہمیں بھی بتایئے کہ آپ کو ان کی اداکاری کی کون سی ادا پسند آگئی۔

امیتابھ: یوں تو تقریباً ان کی سبھی فلمیں مجھے اچھی لگیں لیکن فلم ''گنگا جمنا'' میں انہوں نے کمال کی اداکاری کی ہے (یہ فلم 1961ء میں ریلیز ہوئی تھی) یہ فلم مجھے سب سے زیادہ پسند ہے۔ میں تو اس لیے حیران ہوں کہ وہ کس طرح مختلف کرداروں میں اپنے آپ کو ڈھال لیتے ہیں۔ ایک شخص جو پشاور میں پیدا ہوا ہو، جس کی زندگی کا بڑا حصہ بمبئی میں گزرا ہے لیکن انہوں نے یوپی کی ایک علاقائی زبان پوربی ایسے لب و لہجے میں بولی ہے جیسے ان کی زندگی ہی پوربی علاقوں میں گزری ہو۔ یہ ان کی اداکاری کا کمال ہے۔

سوال: آپ کی سب سے زیادہ پسندیدہ رومانی فلمیں پیاسا اور کاغذ کے پھول ہیں۔ وحیدہ رحمٰن کو آپ پسند کرتے رہے۔ یہ بات سب جانتے ہیں۔

امیتابھ: ان کی فلموں میں پیار اور کاغذ کے پھول میں کبھی نہیں بھول سکوں گا۔ یہ فلمیں بہت اچھی تھیں اور ان میں وحیدہ رحمٰن کی اداکاری میں بھول نہیں سکوں گا۔ میرے نزدیک وہ ایک مثالی ہندوستانی عورت کی مثال ہیں۔ ان کی شخصیت میں ایک وقار ہے اس کے ساتھ ایک شوخی بھی ہے۔

سوال: آپ نے سب سے پہلا اسکرین ٹیسٹ کس فلم کے لیے دیا تھا۔

امیتابھ: میں نے کسی فلم کے لیے کبھی اسکرین ٹیسٹ نہیں دیا۔ ہاں ایک بار میں منوج کمار کی فلم کے سیٹ پر نرگس جی سے ملنے گیا تو ان کے کہنے پر منوج کمار نے میرا اسکرین ٹیسٹ لیا تھا۔ موہن سہگل اس فلم کے ہدایت کار تھے۔

سوال: آپ نے ہدایتکار من موہن ڈیسائی، پرکاش مہرا، یش چوپڑا اور ہری کیش مکرجی کے ساتھ کام کیا ہے۔ ان کی تمام فلمیں سپرہٹ ثابت ہوئیں اور انہوں نے کامیابیوں کے جھنڈے گاڑ دیے۔ آپ اس بارے میں کیا کہیں گے۔

امیتابھ: من موہن ڈیسائی کی خوبی یہ تھی کہ وہ ناقابلِ یقین واقعات کو بھی دلچسپ اور قابلِ یقین بنادیتے تھے۔ یہ ان کی نمایاں خوبی تھی، پرکاش مہرا کو کہانی اور اسکرین پلے کی بہت اچھی سمجھ تھی خصوصاً ڈرامائی مناظر کو فلمانے میں انہیں ملکہ حاصل تھا۔ یش جی نے دیوار اور کبھی کبھی جیسی فلمیں بنائی تھیں جن میں کام کرکے مجھے بہت لطف آیا تھا، یہ دونوں موضوع بالکل مختلف تھے۔ دیوار 1975ء میں بنی تھی اور ''کبھی کبھی'' 1976ء لیکن انہوں نے دونوں فلموں کے ساتھ پورا انصاف کیا تھا۔ مجھے بھی اپنی یہ دونوں فلمیں بہت پسند ہیں۔ اور جہاں تک ہریش دا کا تعلق ہے، وہ تو تھے ہی ہریش دا۔ بمل رائے جیسے عظیم ہدایت کار کے اسسٹنٹ، ان کی فلموں کے موضوع بہت مضبوط اور پُرزور ہوتے تھے۔

سوال: ہندی فلموں میں آپ کس فلم کو کلاسیک فلم سمجھتے ہیں؟

امیتابھ: اس کی فہرست تو بہت طویل ہے۔ جب میں نے فلمی صنعت میں قدم رکھا اس وقت محبوب خان، راج کپور، بمل رائے، گورودت کا راج تھا۔ ان کے علاوہ دوسرے فلم سازوں اور ہدایت کاروں کی فلمیں بھی مجھے پسند ہیں۔

سوال: کیا آپ دلیپ کمار کے ساتھ فلم میں کام کرتے ہوئے اپنے پہلے شاٹ کے بارے میں کچھ بتائیں گے؟

امیتابھ: فلم شکتی میں جیل کا سین تھا، اس فلم میں دلیپ صاحب نے کمشنر کا کردار کیا تھا۔ وہ جیل میں اپنے گمراہ بیٹے سے ملنے آتے ہیں۔ دلیپ صاحب ایسے اداکار ہیں کہ وہ ہر شاٹ میں کوئی نئی بات اور خوبصورتی پیدا کردیتے ہیں۔ اگر

آپ ان کے ساتھ کام کرتے ہوئے ایک سو شاٹ بھی ری ٹیک کراتے ہیں تو ان کی اداکاری ہر شاٹ میں مختلف ہوگی اور یہ سب شاٹ ان کی طرف سے اوکے ہوں گے۔ اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہوگا کہ کون سا شاٹ فلم میں رکھا جائے۔ کیونکہ ہر شاٹ میں کوئی نئی بات ہوتی ہے۔ وہ اپنی اداکاری سے ہر شاٹ کو بہتر اور مختلف بنادیتے ہیں۔

دلیپ کمار اور امیتابھ بچن کے انٹرویوز کے بعد شاہ رخ خان کی باتیں بھی سن لیجیے۔ ان تینوں عظیم اداکاروں کو خاص طور پر ان انٹرویوز کے لیے یکجا کیا تھا اور اس ... فوٹو سیشن کے لیے ایک بہت بڑے فوٹوگرافر کی خدمات حاصل کی تھیں۔

شاہ رخ خان نے خاص طور پر کہا کہ جب اس کا لڑکپن تھا تو دلیپ صاحب اور امیتابھ بچن کی حکمرانی تھی۔ یہ دونوں اداکار ہمیشہ اس کے نوخیز ذہن میں موجود رہتے تھے۔ اس وقت اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ ایک دن وہ ان دونوں سے ملے گا اور ان کی تعریف کا مستحق قرار پائے گا۔

شاہ رخ خان جس فلم میں کام کرتا ہے، اس کے سوا کوئی بھی فلم میں نمایاں نظر نہیں آتا۔ وہ گزشتہ بیس سال سے سپر اسٹار کے تخت پر براجمان ہے۔ اگر دلیپ کمار ٹریجڈی کا بادشاہ ہے اور امیتابھ ناراض نوجوان کے روپ میں فلم بینوں کو مسحور کرتا رہا ہے تو شاہ رخ خان وہ اداکار ہے جو رومان کو دوبارہ فلموں میں لے آیا ہے۔ وہ جب اپنی مسحور کن آنکھوں سے محبت کا اظہار کرتا ہے تو ہم سب کو احساس ہوتا ہے کہ دنیا میں محبت ہی سب کچھ ہے۔ گزشتہ بیس سال میں اس نے ایک کے بعد ایک رکاوٹ عبور کی یہاں تک کہ منزل کو چھولیا۔ شاہ رخ خان شہرت اور مقبولیت کی اس بلند چوٹی پر بیٹھا ہے جہاں آج تک کوئی اور نہیں پہنچا۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ شاہ رخ خان وہ اداکار ہے جس نے انڈین فلموں کو دنیا کے نقشے پر اجاگر کردیا ہے۔ کون سا ملک ہے جہاں اس کے پرستار نہیں ہیں۔ مصر، جنوبی افریقا، انڈونیشیا، مراکش، ترکی، یورپ، جنوبی ایشیا ہر جگہ کے لوگ اس کو جانتے ہیں اور اس کے پرستار ہیں۔

سوال: دلیپ کمار کے بارے میں اپنے ذاتی تاثرات بتایئے۔

امیتابھ: دلیپ صاحب کی اداکاری کے بارے میں تو سب جانتے ہیں۔ وہ ہندوستان کے عظیم ترین ادکار ہیں لیکن ایک ہمدرد اور حساس انسان کی حیثیت سے بھی وہ انوکھے ہیں۔ میں آپ کو ایک واقعہ سناتا ہوں۔ میری فلم ''بلیک'' کی نمائش ہوئی تو میں سنیما گھر کے اندر موجود تھا۔ فلم ختم ہوئی تو اس کے موضوع اور اداکاری کو بہت سراہا گیا۔

جب میں سنیما گھر سے باہر نکلا تو یہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ دلیپ صاحب میرے انتظار میں کھڑے ہیں۔ میں بے اختیار ان کی طرف بڑھا۔ میں اپنی اس فلم کے لیے ان کی رائے جاننے کے لیے بے چین تھا۔

جب میں ان کے پاس پہنچا تو انہوں نے میرا ہاتھ تھام لیا اور دبایا۔ زبان سے کچھ نہیں بولے۔ مگر یہ ان کا اظہارِ پسندیدگی تھا۔

بے اختیار میرا دل بھر آیا اور آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ایک عظیم فن کار اپنے تاثرات کے اظہار کے لیے کچھ بولنے کا محتاج نہیں ہے۔ مگر ان کا یہ اظہار، یہ تاثر میں کبھی نہیں بھولوں گا۔ وہ دراصل میری حوصلہ افزائی کرنے کے لیے وہاں کھڑے ہوئے تھے۔ ایک اتنا بڑا اداکار حوصلہ افزائی اور تعریف کرنے کے لیے کھڑا رہے اور پھر اس طرح بولے بغیر اپنے جذبات کا اظہار کرے۔ یہ دلیپ صاحب ہی کرسکتے ہیں۔ یہ ان کی تعریف اور محبت کا خاموش اظہار تھا۔

☆☆☆

فلمی صنعت کی سوویں سالگرہ کے موقع پر شاہ رخ خان کے بارے میں معروف بھارتی فلمی صحافی راہول گنگوانی کی تحریر پیش ہے۔

دونوں باہیں پھیلائے ہوئے ہیروئن کی طرف اپنے مخصوص انداز میں بڑھتے ہوئے شاہ رخ خان نظر آتے ہیں تو فلم دیکھنے والے سحرزدہ رہ جاتے ہیں۔ اسکرین پر وہ سراپا محبت نظر آتے ہیں۔ پچھلے بیس سال سے ان کا یہ انداز اور فلم دیکھنے والوں کے تاثرات میں کوئی کمی واقع نہیں ہوئی ہے۔ اگر انڈین فلموں میں دلیپ کمار ٹریجڈی کے بادشاہ، امیتابھ بچن ناراض ہیرو کا تصور ہیں تو شاہ رخ خان محبت کے پیامبر ہیں۔ یہ فن کار ہماری زندگیوں میں محبت اور صرف محبت کے مختلف رنگ لے کر آیا۔ شاہ رخ خان نے ہماری زندگیوں میں ایک بار پھر محبت کے جذبات کو زندہ کردیا ہے۔ انہیں اسکرین پر دیکھ کر احساس ہوتا ہے کہ... محبت ہی زندگی کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ پچھلے بیس سالوں میں کامیابی کی ایک کے بعد ایک رکاوٹ عبور کرتے رہے اور پھر اس جگہ پہنچ گئے جہاں پہلے کوئی نہیں پہنچا تھا۔ انہوں

نے فلم بین کو محبت کی اہمیت کا قائل کرلیا ہے۔ انہیں بتایا کہ محبت ہی انسان کی سب سے اہم ضرورت ہے۔ شاہ رخ خان ہندوستان سے باہر کے ملکوں میں بھی مقبول ہے۔ اس کے ہنستے مسکراتے ہوئے چہرے اور شوخ آنکھوں سے سب بخوبی واقف ہیں۔ دنیا بھر کے لوگوں کے لیے انڈین سنیما کا مطلب ہے شاہ رخ خان۔

شاہ رخ خان فلم فیئر کے اس خصوصی شمارے کے لیے انٹرویو دینے اور تصاویر بنوانے کے لیے خاص طور پر آؤٹ ڈور شوٹنگ سے بذریعہ ہوائی جہاز آئے اور اپنا کام کرکے واپس چلے گئے۔ دلیپ کمار اور امیتابھ کے ساتھ اکٹھی تصویریں بنوانا ان کے لیے ایک دل کی دھڑکنیں تیز کرنے والا تجربہ تھا اور یہی لالچ انہیں بہت دور سے بمبئی کھینچ لایا۔ انڈیا کی فلمی صنعت کا ایک سو سال کا سفر خاصا طویل ہے۔ اس عرصے میں شاہ رخ خان نے کیا دیکھا اور کیا پسند کیا اور فلموں سے ان کی دلچسپی بلکہ دیوانگی کیا آج بھی باقی ہے۔ آیئے خود ان کی زبانی سنیے:

سوال: بچپن میں آپ کا فلمیں دیکھنے کا تجربہ کیا تھا؟

شاہ رخ خان: میں نے بچپن میں جو پہلی فلم دیکھی اس کا نام جوشیلا تھا۔ میری والدہ فلمیں دیکھنے کی شائق تھیں۔ ہمارے پاس رنگین ٹی وی نہیں تھا۔ گھر میں ہم وی سی آر پر فلمیں دیکھتے تھے۔ میری والدہ کی ٹانگوں میں تکلیف تھی۔ میں اور میری بہن لالہ رخ رات کو ان کے پیر دباتے تھے اور ساتھ ہی ہم فلمیں بھی دیکھتے تھے۔ یہ روزانہ کا معمول تھا۔ ہم ہر طرح کی فلمیں دیکھتے تھے۔ بسواجیت ہماری والدہ کا پسندیدہ ہیرو تھا۔ وہ دلیپ کمار کی پرستار تھیں۔ ہم سب دلیپ کمار سے محبت کرتے تھے۔ ماما کا خیال تھا کہ میری شکل دلیپ کمار سے ملتی ہے۔ میں سائیکل پر جا کر ٹکٹ خرید لاتا تھا اور ہم ساتھ جا کر ہال میں فلمیں دیکھتے تھے۔ میرے والد (تاج محمد خان) کو بھی فلمیں دیکھنے کا شوق تھا۔

سوال: کیا آپ نے کبھی سوچا تھا کہ کسی دن فلموں میں کام کریں گے؟

شاہ رخ خان: میں فلم ایکٹر نہیں بننا چاہتا تھا بلکہ کھلاڑی بننے کی خواہش تھی۔ لیکن ہمارے ایک فلمی فرینڈ ماما سے کہا کرتے تھے میں آپ کے بیٹے کو ایک دن ضرور ہیرو بناؤں گا۔ ماما نے ان کا فون نمبر دیوار پر لکھ رکھا تھا کیونکہ وہ مجھے اداکار دیکھنا چاہتی تھیں۔ سترہ اٹھارہ سال کا تھا جب میں نے تھیٹر میں کام کیا۔ لیکن ماما مجھے فلموں میں دیکھنا چاہتی تھیں۔ میرے ایک دوست نے میری ویڈیو بنائی اور کہا کہ تمہارا چہرہ فوٹو جینک ہے مگر میں فلموں میں کام نہیں کرنا چاہتا تھا۔ مگر جب ماما کا انتقال ہوگیا تو میرے لیے دہلی میں کوئی دلچسپی نہیں رہی۔ میں نے بوریا بستر باندھا اور بمبئی پہنچ گیا۔ اگر میں اداکار بنا تو صرف ماما کی خواہش پوری کرنے کے لیے۔ میں بمبئی ٹی وی میں کام کرنے کے لیے آیا تھا۔ میں نے ٹی وی میں چند دوستوں کی سفارش سے کام بھی کیا۔ مجھے اچھے خاصے پیسے مل جاتے تھے اس لیے میں نے بمبئی میں رہنا پسند کیا۔

سوال: آپ نے بچپن میں جو فلمیں دیکھی تھیں کیا آج کی فلمیں ان سے مختلف ہیں۔

شاہ رخ خان: میں جس طرح اس زمانے کی فلموں کو پسند کرتا تھا اسی طرح آج کی فلموں کو بھی پسند کرتا ہوں۔ مجھے ان میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا۔ مجھے اگر فلمیں اچھی لگتی ہیں تو میرے دوست بہت حیران ہوتے ہیں کہ یہ کس قسم کا آدمی ہے۔ میں فلموں کو جج کی طرح نہیں دیکھتا۔ مجھے فلمیں دیکھنا اچھا لگتا ہے۔ میں بچپن میں ماں کے پیر دباتے ہوئے فلمیں دیکھا کرتا تھا۔ اس زمانے میں دس روپے میں وی سی آر فلم کرایہ پر مل جاتی تھی مگر فلم دوسرے دن واپس کرنی ہوتی تھی۔ اگر دیر ہو جاتی تو کیسٹ والا دروازہ کھٹکھٹانے ...... آجاتا تھا کیونکہ دوسرے لوگ بھی تو اس فلم کو دیکھنے کے منتظر رہتے تھے۔ اس زمانے میں لوگوں کو فلمیں دیکھنے کی دیوانگی تھی۔ آج کل ایسا نہیں ہے۔ مجھے اپنے بچوں کے ساتھ فلم دیکھنا اچھا لگتا ہے۔ وہ فلموں پر جو تبصرے کرتے ہیں میں غور سے سنتا ہوں۔ یہ مجھے لگتا ہے ان کی رائے خالص ہوتی ہے۔

سوال: کس فلم نے آپ کو بہت زیادہ متاثر کیا۔

شاہ رخ خان: 1968ء میں پڑوسن مجھے اچھی لگی تھی۔ فلم جانے بھی دو یار، بھی مجھے پسند آئی تھی۔ میں نے اپنے بچوں کو فلم جانے بھی دو یار، کے بارے میں بتایا کہ یہ بہت مزاحیہ فلم ہے مگر یہ فلم دیکھ کر انہیں ہنسی نہیں آئی۔ بس پوپ کارن کھاتے اور فلم دیکھتے رہے۔ شاید وہ فلم کے مزاح کو سمجھ نہیں سکے۔ فلم شعلے نے بھی مجھے بہت متاثر کیا۔ یہ فلم میں نے کئی بار دیکھی۔ میرے والد کو مدھوبالا بہت پسند تھی۔ میں نے مدھوبالا کی بہت سی فلمیں دیکھیں۔ میں نے امیتابھ بچن کی ساری فلمیں دیکھی ہیں۔ فلم ناستک، مجھے بہت پسند تھی۔ ایک دن جب میں امیتابھ بچن کے ساتھ کھانا کھا رہا

تھا، میں نے ”ناستک، کا ذکر چھیڑ دیا۔ انہوں نے فوراً مجھے روک دیا۔ کہا کہ اس کی بات چھوڑ دو ورنہ میرے لنچ کا مزہ خراب ہو جائے گا۔

چلتی کا نام گاڑی، اور اس کے گانے بھی مجھے پسند ہیں۔ فلم کا ہیرو مجھے زیادہ متاثر کرتا ہے۔ میں نے فلموں میں دیکھا کہ راج کپور اور دیو آنند ہاتھوں سے اپنے بالوں کو بکھرا لیتے ہیں۔ مجھے یہ طریقہ اچھا لگا اور میں نے بھی اپنے بالوں کو بکھرانا شروع کر دیا۔ رومانی گانوں کا خیال آئے تو راجیش کھنہ یاد آجاتے ہیں۔ ان کی فلموں کی موسیقی بہت اچھی ہوتی تھی۔ ماما کو جوائے مکرجی، اور بسواجیت اچھے لگتے تھے اس لیے میں بھی انہیں پسند کرتا تھا۔ لیکن ان کے سب سے زیادہ پسندیدہ ہیرو دلیپ کمار رہے۔ وہ میرے بھی سب سے زیادہ پسندیدہ ہیرو ہیں۔ آج کل کی فلموں میں کہانی نہیں ہوتی یا بہت خراب کہانی ہوتی ہے۔ اس سے اچھی کہانیاں تو میری دادی ماں سنایا کرتی تھیں۔

سوال: آپ دلیپ کمار سے کتنے متاثر ہیں؟

شاہ رخ خان: دراصل میں بچپن سے ان کی فلمیں دیکھتا اور پسند کرتا آرہا ہوں، میرے والد انہیں دہلی سے جانتے تھے جہاں ہم ایک ہی گلی میں رہتے تھے۔ میں بچپن میں کئی بار دلیپ صاحب سے ملا ہوں۔ سائرہ جی کو شاید یاد نہ ہو مگر ان کے لیے دوائیاں میری پھوپی لندن سے انہیں بھیجا کرتی تھیں۔ کئی سال بعد ایک دن میں نے کیتن مہتا کے دفتر میں دلیپ صاحب کی تصویر لگی ہوئی دیکھی تو میں نے سوچا، ارے یہ تو میری تصویر ہے یا کم از کم مجھ سے مشابہت رکھتی ہے۔ دراصل دلیپ صاحب سے میرا تعلق فلموں کے علاوہ بھی ہے۔ دلیپ صاحب اور سائرہ جی مجھ سے بالکل اپنے بیٹوں جیسا سلوک کرتے ہیں۔

سوال: آپ نے 2000 میں فلم محبتیں میں امیتابھ بچن کے ساتھ کام کیا۔ یہ تجربہ کیسا رہا؟

شاہ رخ خان: دراصل فلم محبتیں، میں انہوں نے کافی عرصے بعد کام کیا تھا کیونکہ کافی عرصہ تک ان کی فلمیں کامیاب نہیں ہوئی تھیں اور وہ بیمار بھی رہے تھے اس لیے زیادہ پُراعتماد نظر نہیں آرہے تھے۔ فلم کے سیٹ پر ادیتیہ چوپڑا، کرن جوہر اور خود میں بھی ان کے بہت مداح تھے۔ مجھے یاد ہے کہ ایک سین میں وہ کہتے ہیں ”تم کیا سمجھتے ہو راج آریان، یہاں آکے تم محبت......“

جب ریہرسل ہوئی تو مجھے احساس ہوا کہ امیتابھ بچن کو

راج پنڈت

یہ سین اس طرح نہیں کرنا چاہیے۔ انہیں یہ سین مختلف انداز میں کرنا چاہیے۔ دراصل اس وقت میں انہیں ایک فلم بین کی نظر سے دیکھ رہا تھا۔ میں ان کا ساتھی اداکار نہیں اس وقت ایک فلم دیکھنے والا تھا۔ ان کے ساتھ کام کرنا بھی میرے لیے بہت خوشی اور گھبراہٹ کا سبب تھا۔ ان کے مقابلے میں بطور اداکار میری کیا حیثیت تھی۔ بس ہمت کرکے ان کے پاس گیا اور ان سے کہا کہ انہیں یہ سین کسی اور انداز میں کرنا چاہیے۔ وہ خاموشی سے میری بات سنتے رہے پھر انہوں نے میری تجویز کے مطابق سین کرنے کی کوشش کی۔ وہ میری بات بہت غور سے سنتے رہے۔ انہوں نے میری بات پوری توجہ سے سنی مگر سین اپنے انداز میں ہی کیا۔ انہوں نے مجھ سے کہا سین اس انداز سے کرنا چاہیے جیسے فلم بین پسند کرتے ہیں۔ اداکار کی ذاتی رائے کوئی معنی نہیں رکھتی۔

ایک بڑے اداکار ہونے کے باوجود وہ بہت انکسار سے بات کرتے ہیں وہ نئے اور نوجوان اداکاروں سے بات کرنے کے لیے بھی وقت نکال لیتے ہیں۔ میڈیا ان کو ایک سنجیدہ اور علیحدگی پسند اداکار کی حیثیت سے پیش کرتا ہے حالانکہ سیٹ پر ان کی موجودگی بہت دلچسپ ہوتی ہے اور وہ بے تکلف ہو کر ہنستے ہنساتے رہتے ہیں۔ وہ ہر نوجوان سے اس کی پسند کے موضوعات پر باتیں کرتے ہیں۔ وہ بہت جلد بے تکلف ہو کر ہنسی مذاق شروع کر دیتے ہیں۔ میں نے جب بھی ان کے ساتھ کام کیا بہت لطف اندوز ہوا۔ ان سے بات کرکے پتا چلتا ہے کہ وہ ایک صاحب مطالعہ اور بہت زیادہ معلومات رکھنے والے آدمی ہیں۔ میرا ان کے ساتھ بہت اچھا وقت گزرا۔ وہ اسکریبل کھیلنے کے شوقین ہیں اور ہر ایک کو ہرا دیتے ہیں۔ ان کی معلومات اور یادداشت حیرت انگیز ہے مثلاً اگر آپ ان سے پوچھیں 1972ء میں یوگنڈا کا صدر کون تھا وہ آپ کو فوراً بالکل صحیح جواب دے دیں گے۔ ان سے مل کر احساس ہوا ہے کہ مجھے بھی مطالعہ کرکے

زیادہ سے زیادہ علم حاصل کرنا چاہیے۔

سوال: آپ کی پسندیدہ ایکٹریس؟

شاہ رخ خان: میری پہلی پسند تو اداکارہ ممتاز ہیں جو کہ اب فلموں سے بے تعلق ہو چکی ہیں۔ ان میں جنسی کشش کے ساتھ خوبصورتی بھی تھی۔ فلم بزدن، میں وہ کتنی معصوم اور حسین نظر آتی ہیں۔ فلم جنگلی، اور کشمیر کی کلی میں ممتاز بہت پرکشش نظر آتی ہیں۔ ان کی فلم وکٹوریہ 203 میں انہوں نے بہت اچھے گانے فلمبند کرائے ہیں۔ ممتاز میں ایک انجانی کشش تھی جو مقناطیس کی طرح فلم دیکھنے والوں کو اپنی طرف کھینچ لیتی تھی۔

سوال: کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ہماری فلمیں بین الاقوامی فلموں کی سطح کی ہیں؟

شاہ رخ خان: ہمیں اپنی فلمی صنعت کو اتنا گیا گزرا ہوا بھی نہیں سمجھنا چاہیے۔ گانے اور ناچ ہماری فلموں کا لازمی حصہ ہوتے ہیں۔ ناچ اور گانا ہمارے کلچر کا بھی ایک حصہ ہیں۔ ہالی وڈ کے علاوہ صرف انڈیا میں اسٹار سسٹم موجود ہے۔ مغل اعظم، پاکیزہ، عامر خان کی فلمیں اور شعلے، بھی ہمارے کلچر کو دنیا کے سامنے پیش کرتی ہیں۔

ہماری فلموں میں ہر قسم کا مسالا ڈالنا ضروری ہے ورنہ فلم بین اس سے مطمئن نہیں ہوں گے۔ ہماری فلموں میں ایکشن ڈراما، ناچ ضرور ہوتا ہے جبکہ ہالی وڈ کی فلموں میں ہر قسم کا مسالا نہیں ڈالا جاتا۔ یہ ماننا پڑے گا کہ ہماری فلموں میں اب کہانی نظر نہیں آتی۔ میری پردادی اس سے زیادہ اچھی اور دلچسپ کہانیاں سنایا کرتی تھیں۔ ہم اپنے کلچر سے دور کیوں ہوتے جا رہے ہیں۔ کیونکہ محض ناچ گانا اور ڈراما ہی ہمارا کلچر نہیں ہے۔ ہمیں آج بھی گورودت جیسے ہدایت کاروں کی ضرورت ہے۔ ان کی فلم ''پیاسا'' ہمارے کلچر کی آئینہ دار تھی۔ اب ایسی فلمیں کیوں نہیں بنائی جاتیں۔ ہم ایک بھیڑ چال کا شکار ہو گئے ہیں، ساری فلم ایک جیسی۔ کہانیاں ایک جیسی۔ واقعات ایک جیسے۔ اس طرح تو ہم اپنی فلم انڈسٹری کو ہالی وڈ کی سطح پر نہیں لا سکتے۔ ہم ہالی وڈ کی فلموں سے مرعوب ہیں۔ ان کی دل کھول کر تعریف کرتے ہیں۔ واہ اسپائیڈر مین کی کیا بات ہے۔ فلم ڈائی ہارڈ، آپ نے دیکھی۔ یہ بھی زبردست فلم ہے۔ ہم اپنی فلموں کی اس طرح تعریف کیوں نہیں کرتے؟ اس لیے کہ ہم مرعوب ہیں۔ ہمیں مغرب اور ہالی وڈ سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ وہاں فلموں کو سیریس بزنس سمجھا جاتا ہے۔ وہ نئے آنے والوں کی بہت عزت اور حوصلہ افزائی کرتے ہیں۔ اگر فلم والے فلموں کو سیریس بزنس سمجھیں گے تو فلم دیکھنے والے بھی فلموں کو سنجیدگی سے دیکھا کریں گے۔

سوال: کیا آپ کا مطلب ہے کہ ہمارے فلم ساز فلم سازی کو سیریس بزنس نہیں سمجھتے؟

شاہ رخ خان: آپ بھی جانتے ہیں کہ ہماری زیادہ تر فلمیں سیریس، سوچ سمجھ کر نہیں بنائی جاتیں۔ فلم ساز کہتے ہیں ارے آج کل ایسی فلمیں چل رہی ہیں۔ ایسی فلمیں بناؤ اور پیسے کماؤ مجھے حیرت ہے کہ فلم بنانے والے فلم دیکھنے والوں کی ضرورت اور خواہشوں کو کیوں نظر انداز کر دیتے ہیں۔ سو سال گزر جانے کے بعد اب ہمیں بھی فلم دیکھنے والوں کی پسند ناپسند کے بارے میں سوچنا چاہیے۔ کاروباری طور پر ہماری فلمیں یوں تو ٹھیک ہیں مگر ان میں تخلیقی حسن کی کمی ہے۔ ہمیں تخلیقی فلم بنانے والوں کی ضرورت ہے۔

سوال: کیا آپ سمجھتے ہیں کہ بڑی بڑی کاروباری کارپوریشنوں کی فلمی صنعت میں آمد کی وجہ سے فلمی معیار گرا ہے؟

شاہ رخ خان: دیکھیے کاروبار پر زیادہ توجہ دینے کی وجہ سے سنیما کا حسن بگڑ گیا ہے فلموں کا مقصد تلخ حقائق کو بھلا کر تفریح حاصل کرنا ہے۔ فلم دیکھنے کا مقصد تلخ حقائق سے فرار حاصل کرنا ہے لیکن اب ایسا نہیں ہو رہا۔ بڑی کمپنیاں یہ حساب لگاتی رہتی ہیں کہ کس قسم کی فلم اور کس آرٹسٹ سے وہ کروڑوں کما سکتے ہیں۔ ان کی توجہ کا مرکز کروڑوں کا منافع ہے۔ عوام کی تفریح سے انہیں اتنی دلچسپی نہیں ہے۔ فلم بنانے والے اس قسم کے مسائل کے چکر میں پڑ چکے ہیں ''باجرہ کتنے کا آیا۔ دو سو روپے کا؟ کتنے کا گھر خریدا؟ فلم سے کتنا منافع ہوا؟ اس بار ہم چالیس کروڑ کمانے والی فلم بنائیں گے۔ سیٹلائٹ کے حقوق سے کتنا ملے گا۔ سنیماؤں سے کتنی آمدنی ہوگی۔ سب ملا کر ہمیں کتنی آمدنی ہوگی؟ کارپوریٹ سرمایہ کار اس انداز سے سوچتے ہیں۔ روپیہ گننے کے چکر میں پڑ جائیں تو اچھی تخلیقی فلم بنانے پر کون توجہ دے گا۔

سوال: کیا آپ فلم بنائیں تو اس طرح نہیں سوچیں گے؟

شاہ رخ خان: جب میری فلم فلاپ ہوتی ہے تو میں صرف تین دن اس کے بارے میں سوچتا ہوں کہ اس کے بعد بھلا کر نئی فلم کے بارے میں سوچنا شروع کر دیتا ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے انڈسٹری میں اتنا وقت گزارا ہے۔

روپے آنے پائی کا حساب لگانے کی جگہ پہلے سے بہتر فلم بنانے کی سوچتا ہوں۔ جب تک ٹیم اچھی نہیں ہوگی فلم اچھی نہیں بن سکتی۔ ٹیم کے لوگوں کو مطمئن اور مالی طور پر خوش رکھنا بھی ضروری ہے۔

سوال: کسی زمانے میں فلموں کی کامیابی کو سو ہفتے، پچاس ہفتے اور 25 ہفتے کے حساب سے گنا جاتا تھا۔ کیا یہ اچھا طریقہ تھا؟

شاہ رخ خان: یقیناً دیکھیے نا فلم جتنے زیادہ ہفتے چلتی ہے فلم ساز اور ہدایت کار کا اتنا ہی خون بڑھتا ہے۔ ڈائمنڈ جوبلی، سلور جوبلی، گولڈن جوبلی کے حوالے فلم بین بھی متاثر ہو کر فلم دیکھنے جاتے تھے۔

سوال: حال ہی میں ایک بہت بڑی کارپوریشن کے مالک نے کہا کہ آج کل فلموں کی کامیابی کا حساب سو کروڑ کی آمدنی سے لگایا جاتا ہے۔ یہ خواب ایک ہزار کروڑ بھی ہو سکتا ہے۔

شاہ رخ: اس کا یہ کہنا درست ہے لیکن انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ ایک ہزار کروڑ کمانے والی فلم کیسے بنائی جائے گی۔ یہ لوگ اب اس طرح کی فرمائشیں کرتے ہیں۔ اس فلم کو چالیس دن میں مکمل کر لو۔ اس میں ایک آئٹم سونگ بھی ہونا چاہیے۔ وہ یہ جانتا ہے کہ فلم کی مارکٹنگ کیسے ہوگی مگر فلم کیسے بنائی جائے یہ وہ نہیں جانتا۔

سوال: کیا ہماری فلموں میں اب صرف دماغ رہ گیا ہے۔ دل اور جذبات غائب ہو گئے۔

شاہ رخ: اچھی فلم بنانے کے لیے دونوں چیزیں ضروری ہیں۔ ایک تخلیقی انسان کاروبار نہیں جانتا۔ تخلیقی ذہن والے کاروبار نہیں کر سکتے۔

سوال: مگر آپ نے تو تخلیق اور بزنس دونوں پر قابو پا لیا۔

شاہ رخ: اگر مارکٹنگ کا ماہر کہا جائے تو مجھے افسوس ہوگا۔ ایک اچھے فلم ساز کی خواہش ہوتی ہے کہ ساری دنیا اس کی فلم دیکھے جو یہ کہے کہ میں مارکٹنگ میں ماہر ہوں تو مجھے دکھ ہوگا۔ جب لوگ مجھے تخلیق کے بجائے بزنس مین کے اعتبار سے سراہتے ہیں تو مجھے بالکل خوشی نہیں ہوتی۔

☆☆☆

بھارت کے فلمی نقاد اور معروف صحافی ویوک بھاٹیہ نے دلیپ کمار، امتیابھ بچن اور شاہ رخ خان کو یکجا ہو کر گفتگو کرتے ہوئے اپنے تاثرات کا اظہار ان الفاظ میں کیا ہے۔

یہ میرے لیے ایک خواب کی طرح تھا کہ دلیپ کمار، امیتابھ بچن اور شاہ رخ خان میرے سامنے تھے اور مختلف موضوعات پر گفتگو کر رہے تھے۔ یہ تینوں بڑے نام بھارت کی فلمی صنعت کی 100 ویں سالگرہ کے موقع پر یکجا ہوئے تھے۔ امیتابھ اور شاہ رخ خان بہت زیادہ مصروف تھے لیکن جب انہیں معلوم ہوا کہ سائرہ بانو نے اپنے گھر پر ان دونوں کو مدعو کیا ہے تاکہ دلیپ کمار کے ساتھ ایک یادگار ملاقات کی دیرینہ آرزو پوری ہو سکے تو سائرہ بانو نے انہیں جو تاریخ بتائی تھی وہ دونوں نے اس کے مطابق اپنی مصروفیات میں رد و بدل کر کے مقررہ تاریخ کو ممبئی پہنچ گئے۔ سائرہ بانو نے کہا تھا کہ یہ ملاقات ان کے بنگلے پر منعقد کرنے کی یہ وجہ تھی کہ اپنے بنگلے کے ماحول میں دلیپ کمار زیادہ پرسکون محسوس کریں گے۔

امیتابھ سب سے پہلے دلیپ کمار کے بنگلے پر پہنچے حالانکہ آج کل وہ بہت زیادہ مصروف ہیں۔ امیتابھ وقت کی پابندی رکھنے کے حوالے سے مشہور ہیں۔ چند منٹ بعد شاہ رخ خان بھی پہنچ گئے۔ دونوں اداکاروں نے اپنے ملبوسات پر بہت توجہ دی تھی۔ یہ دونوں بنگلے کے لاؤنج میں بیٹھ کر ہندوستان کے عظیم ترین اداکار کا انتظار کرتے رہے۔ اس دوران میں بات چیت کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ جیسے ہی دلیپ کمار سامنے ٹیرس پر نمودار ہوئے اچانک خاموشی چھا گئی، ایسا لگا جیسے کوئی شہنشاہ نمودار ہوا ہے۔ امیتابھ اور شاہ رخ دونوں آگے بڑھ کر ان سے ملے اور انہیں ڈرائنگ روم میں لے گئے جہاں یہ نشست جمنی تھی۔

دلیپ کمار نے امیتابھ کو دیکھا تو بے اختیار بولے۔ ''ارے۔ تو؟''

یہ کہتے ہوئے ان کی آنکھیں نمناک ہو گئیں۔ انڈین فلموں کا ٹریجک کنگ سچ مچ غمزدہ ہو گیا تھا۔ ان کی آواز بھرا گئی۔ لیکن جب فوٹو گرافر نے کہا کہ کیمرا اسٹارٹ ہونے والا ہے تو یہ غمگین ماحول تبدیل ہو گیا۔ امیتابھ بچن نے شاہ رخ خان کے منہ سے سگریٹ نکال کر اس کے رخسار پر چٹکی بھری اور کہا ''سگریٹ نوشی صحت کے لیے مضر ہے۔'' شاہ رخ خان نے فوراً سگریٹ ایش ٹرے میں مسل دیا۔ ''لیجیے، اب تو آپ خوش ہیں؟''

دلیپ کمار کی نظر شاہ رخ خان پر پڑی جو امیتابھ کے اشارے پر سگریٹ بجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ دلیپ کمار کی حیرت اور خوشی کو دیکھ کر خیال ہوا کہ شاید سائرہ بانو نے سرپرائز دینے کے لیے انہیں پہلے اس پروگرام سے آگاہ

نہیں کیا تھا۔ سیاہ سوٹ اور اپنے گورے رنگ کی وجہ سے وہ بہت باوقار لگ رہے تھے۔ دلیپ کمار کو غمزدہ دیکھ کر فوٹو گرافر نے ایتابھ کے اشارے پر ماحول بدلنے کے خیال سے کہا۔ ”آپ لوگ تیار ہو جائیں۔ فوٹو سیشن کے لیے میں کیمرا اسٹارٹ کرنے والا ہوں۔“

اس دوران میں شاہ رخ خان اپنی سگریٹ کو ایش ٹرے میں مسل چکے تھے۔ دلیپ کمار کے یوں اچانک نمودار ہونے کی وجہ سے انہیں منہ پھیر کر سگریٹ مسلنے میں دیر لگی تھی۔

”میں نے سگریٹ بجھادی۔ اب تو خوش ہو جایئے۔“

ایتابھ ان کی طرف دیکھ کر مسکرائے اور دھیمی آواز میں شفقت امانت علی خان کی گائی ہوئی غزل گنگنانے لگے۔ آنکھوں کے ساگر میں۔

یہ غزل بیک گراؤنڈ میں دھیمی آواز میں بج رہی تھی۔

سائرہ بانو کھانے کا بندوبست کرنے اور میز سجانے میں مصروف تھیں۔

”ارے آپ کیوں تکلیف کرتی ہیں؟“ شاہ رخ خان نے کہا۔

”تکلیف کیسی اپنے مہمانوں کا خیال رکھنا میرا فرض ہے۔“

میز پر پھول سجاتے ہوئے اچانک مڑ کر ہم لوگوں سے پوچھا سچ بتایئے۔ کیا میرے شوہر سے زیادہ خوبصورت کوئی اور ہے؟“

ہم سب نے ایک ساتھ جواب دیا۔ ”بالکل نہیں۔“

یہ بات کرتے ہوئے وہ خود بھی جذباتی ہو گئیں۔ ان کی نظریں دلیپ کمار پر جمی ہوئی تھیں جنہیں ایک کرسی پر بٹھا دیا گیا تھا۔ میک اپ مین ایتابھ اور شاہ رخ کا میک اپ درست کر رہا تھا اور دلیپ کمار دلچسپی سے یہ دیکھتے ہوئے زیر لب مسکرا رہے تھے۔

”آپ نے کبھی فلم کے لیے میک اپ کرایا ہے؟“ میں نے ان سے پوچھا۔

”نہیں بھئی، میں نے یہ جھنجٹ کبھی نہیں پالا۔“

سائرہ بانو پھر بول پڑیں۔ ”میرے شوہر کو میک اپ کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ قدرت نے میک اپ کر کے انہیں دنیا میں بھیجا ہے۔“

اس بات میں شک وشبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ دلیپ کمار کا چہرہ اور جلد اس عمر میں بھی سرخی مائل اور جگمگاتی ہوئی ہے۔

فوٹو گرافر نے تصویریں بنانی شروع کر دیں۔ تینوں عظیم اداکار کیمرے سے بے نیاز اپنی گفتگو میں مصروف رہے جس کی وجہ سے بالکل قدرتی ماحول پیدا ہو گیا تھا۔

میری زندگی کا یہ ایک انوکھا تجربہ تھا۔ میں کبھی نہیں بھولوں گا اور اپنے پوتا پوتی اور نواسہ نواسی کو بھی سناتا رہوں گا۔

اس دوران میں انٹرویو بھی کیے گئے۔ پہلے دلیپ صاحب سے اور اس کے بعد ایتابھ بچن اور شاہ رخ خان سے۔ یہ خالص گھریلو ماحول تھا۔ کسی کو احساس نہیں تھا کہ انٹرویو ہو رہا ہے۔ اپنی دانست میں وہ گپ شپ میں مصروف تھے۔ جوں جوں وقت گزرتا گیا ماحول میں گرمی اور بے تکلفی پیدا ہوتی رہی۔ میں نے محسوس کیا کہ کمرے میں موجود ہر شخص کی نظریں دلیپ صاحب پر ہی مرکوز تھیں ان کی موجودگی کے سامنے کسی اور کی طرف توجہ دینا ممکن نہیں ہے۔ اگرچہ وہ بیماری کی وجہ سے کم بولتے ہیں مگر جب بولتے ہیں تو سب کان لگا کر ان کی بات سنتے ہیں۔ اچانک سائرہ بانو کی آواز سنائی دی۔ ”کھانا بالکل تیار ہے۔ سارے کام چھوڑ کر کھانے پر توجہ دو۔“

اور سب اچھے کہنا ماننے والے بچوں کی طرح کھانے کی طرف متوجہ ہو گئے۔

☆☆☆

اب تو وہ زمانہ ہی بدل گیا ہے لیکن ایک زمانے میں جب ہندوستان میں گراموفون کا پہلی بار تعارف ہوا تھا تو لوگوں کے لیے یہ عجوبہ ہی تھا۔ یہ بہت بڑے سائز کا ہوتا تھا۔ تصویروں میں اس کے بھونپو کے سامنے ایک کتا بیٹھا ہوا نظر آتا تھا! جو یا تو موسیقی سے لطف اندوز ہوتا تھا یا پھر اس کو ناپسند کر کے غصے کا اظہار کرتا دکھتا تھا۔ ایک ریکارڈ پر سوئی رکھ کر اس کو بجایا جاتا تھا۔ اس کے بعد وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ گراموفون کی شکل وصورت میں تبدیلیاں پیدا ہو گئیں۔ صرف بہت شوقین اور صاحب حیثیت لوگ ہی گراموفون استعمال کرتے تھے لیکن ریکارڈوں کے ذریعے یہ گانے ہر ایک کو زبانی یاد ہو جاتے تھے۔ اب تو گراموفون ایک یادگار بن کر رہ گیا ہے۔ پہلے کیسٹ آئے پھر موسیقی سننے کے نت نئے طریقے ایجاد ہو گئے جس کی وجہ سے گراموفون کو آج کی نسل بھول ہی چکی ہے۔ اب یہ سجاوٹ اور نادر یادگار کے طور پر ہی استعمال کیا جاتا ہے لیکن یہ حقیقت ہے کہ برصغیر میں موسیقی کا رواج اور غزلوں، گیتوں اور گانوں کا ذوق شوق پیدا کرنے میں گراموفون کا بہت

بڑا ہاتھ ہے۔ اس کو اگر موسیقی کے آلات کا باوا آدم کہا جائے تو غلط نہ ہوگا۔

پہلی گراموفون کمپنی 1899 میں قائم ہوئی تھی جس کا نام ہز ماسٹرز وائس تھا۔ غالباً کتے کی تصویر کا مقصد یہی تھا کہ وہ اپنے مالک کی آواز سن کر لطف اندوز ہو رہا ہے۔ اس کے بعد اس کمپنی کو کولمبیا گراموفون کمپنی میں ضم کر لیا گیا یا دونوں کمپنیوں کا ملاپ ہو گیا۔ آغاز میں صرف انگریزی حکومت کی نوآبادیوں میں ہی گراموفون کو متعارف کرایا گیا تھا۔ ہندوستان میں 1901 میں آڈیو ریکارڈنگ شروع ہوئی تھی اس کی وجہ سے گھر گھر موسیقی کا چرچا ہو گیا۔ گراموفون کمپنی آف انڈیا 1946ء میں قائم ہوئی اور سارے برصغیر میں موسیقی کا چرچا ہو گیا۔ یہ کمپنی 1985ء تک قائم رہی۔ اس کی وجہ سے موسیقار گلوکار شاعر اور سازندوں کا جنم ہوا۔ فلمی موسیقی سے پہلے گراموفون کمپنی ...اپنے نغمات، گیت اور غزلیں بھی ریکارڈ کرتی تھی۔ اس طرح ہندوستان میں موسیقی کا رواج پیدا کرنے اور اس کو عام آدمی تک پہنچانے کا سہرا گراموفون ہی کے سر ہے۔ گراموفون کمپنی کے بعد ایک نیا ادارہ سامنے آیا جس کو ای ایم آئی کہتے ہیں اس کا مطلب ہے الیکٹرک اینڈ میوزیکل انڈسٹری، پاکستان میں ای ایم آئی نے بہت اچھا کام کیا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اس میں بیوروکریٹس کا دخل نہ تھا اور نہ ہی حکومت ان کے کاموں میں مداخلت کرتی تھی اس لیے اس کے ایم ڈی راشد لطیف نے موسیقی کے علاوہ دوسرے شعبوں میں بھی امداد فراہم کی۔ لیکن جب ہمارے بیوروکریٹس یا حکمرانوں نے اس کمپنی کے معاملات میں مداخلت شروع کر دی تو راشد لطیف اس سے کنارہ کش ہو گئے۔ انہوں نے شالیمار ریکارڈنگ کمپنی کے نام سے ایک نجی ادارہ قائم کر لیا جس نے پاکستان میں فلمی موسیقی اور دوسرے کاموں میں بہت اچھا کام کیا۔ انہوں نے پی ٹی وی کے منتخب ڈراموں کے ویڈیوز بنانے کا سلسلہ شروع کیا۔ یہ ایک مثالی ادارہ تھا۔ راشد لطیف کی ذہانت، ہنرمندی اور لیاقت دیکھ کر بے نظیر بھٹو نے انہیں وزیر اطلاعات مقرر کیا تھا۔ ہم نے تو ان سے کہا کہ وہ اس جھگڑے میں نہ پڑیں مگر ان کا جذبہ تھا کہ وہ حالات میں بہتری لائیں گے۔ مگر ان کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی اور وہ اس سرکاری عہدے سے مستعفی ہو گئے۔

اس کے بعد ٹیکنالوجی نے بہت ترقی کر لی۔ گراموفون کی جگہ جدید ترین آلات اور ٹیکنالوجی نے سنبھال لی۔ لیکن گراموفون کمپنیوں خصوصاً ای ایم آئی نے فلم، موسیقی، گلوکاروں، سازندوں اور دوسرے فن کاروں کو بہت خوبی سے متعارف کرایا۔ اس کا ہیڈ آفس تو کراچی میں تھا لیکن لاہور میں شاہدین بلڈنگ میں ان کا دفتر موسیقاروں، فلم سازوں، ہدایت کاروں اور دوسرے فنکاروں کی گرانقدر خدمات سرانجام دیتا رہا۔ ہماری موسیقی اور فن کاروں کی حوصلہ افزائی کرنے میں اس کا نمایاں ہاتھ ہے جن سے فلمی صنعت نے بھی فائدہ اٹھایا۔

یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ گراموفون نے موسیقی کے حوالے سے بہت ممتاز خدمات سرانجام دی ہیں۔ گراموفون کمپنیوں نے ماضی کی پرانی موسیقی کو زندہ کر دیا اور جدید موسیقی کو ترقی کے راستے دکھائے۔ گراموفون ایڈیسن نے ایجاد کیا تھا جس نے انقلاب پیدا کر دیا۔ تھامس ایڈیسن کا بنایا ہوا پہلا گراموفون 32 ہزار پونڈ میں فروخت ہوا تھا۔ اس ایجاد نے آنے والوں کے لیے نئے نئے راستے پیدا کیے۔ ابتدائی گراموفون کو ہاتھ سے چلایا جاتا تھا۔ آج کل...... دولت مندوں کے گھروں کی سجاوٹ کے لیے پرانا گراموفون پانچ سو سے تین سو پونڈ میں مل جاتا ہے۔

☆☆☆

اب موسیقی کا ذکر چل نکلا ہے تو اس پر مزید روشنی ڈالتے ہیں..... گیارہویں صدی میں حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے زمانے میں موسیقی کو عروج حاصل ہوا۔ وہ صوفیوں کے چشتی سلسلے سے تعلق رکھتے تھے۔ صوفی ازم کو ان کے زمانے میں برصغیر میں بہت زیادہ فروغ ملا۔ صوفیاء کا آغاز دراصل مشرقی وسطیٰ کے درویشوں سے ہوا تھا۔ پھر صوفیوں کے مختلف طبقات پیدا ہو گئے۔ عموماً موسیقی کو ہمارے علما جائز نہیں سمجھتے لیکن حضرت نظام الدین نے قوالی کو رواج دیا جو وہ بہت شوق سے سنتے تھے اور اس سے روحانی تسلی حاصل کرتے تھے۔ لیکن دراصل قوالی کو رنگ روپ حضرت امیر خسرو نے دیا تھا۔ وہ فلاسفر، صوفی، شاعر، موسیقار بھی کچھ تھے۔ انہوں نے قوالی اور موسیقی میں نت نئے تجربات کیے۔ گیتوں میں بھی نکھار پیدا کیا۔ کہاوتیں اور کہہ مکرنیاں ان ہی کی ایجاد کردہ ہیں۔ صوفیاء اور بزرگوں کے مزاروں پر قوالی نے بہت مقبولیت حاصل کر لی جسے کچھ لوگ لطف اور کچھ اللہ سے قربت کا ذریعہ سمجھتے تھے اور ان پر وجدانی کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔ قوالی میں صرف دو ساز استعمال کیے جاتے تھے۔ ایک ہارمونیم اور دوسرے قوال کے ساتھیوں کی

تالیاں جس سے وہ ردھم دیتے تھے۔

آج کل قوالی زیادہ مقبول نہیں رہی مگر یہ موسیقی کے لیے راستہ صاف کرنے کا ایک ذریعہ ضرور بن گئی۔ نصرت فتح علی خان جیسے قوالوں نے اس میں جدتیں پیدا کر کے اس کو یورپ امریکا میں بھی مقبول بنا دیا۔ اچھی قوالی کا آغاز اس کے بولوں یا شاعری پر ہوتا ہے۔

آج کل پاکستان میں استاد مہر علی خان اور استاد شیر علی خان قوالی کے حوالے سے بہت زیادہ مقبو ل اور پسندیدہ سمجھے جاتے ہیں۔ یہ دونوں آج بھی پرانی وضع کی روایتی قوالی پیش کرتے ہیں۔ لیکن نصرت فتح علی خان نے موسیقی کو ایک نیا انداز دیا جس کی وجہ سے قوالی یورپ امریکا بلکہ دنیا بھر میں مقبول ہوگئی۔ انگریز ان کی قوالی کے ردھم پر بے اختیار رقص کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ استاد مہر علی خان اور شیر علی خان کو داد دینا چاہیے کہ انہوں نے پرانی روایتی قوالی کو بھی مغربی دنیا میں نہ صرف متعارف کرایا بلکہ اس کو مقبول بھی کر دیا۔ انہوں نے پہلا عالمی دورہ 1988ء میں کیا تھا پھر جنوبی افریقا، انگلستان، بلجیم، لبنان، امریکا ملیشیا، جاپان، فرانس ترکی کے دورے کیے اور سننے والوں کو روایتی موسیقی کا شیدائی بنا دیا۔ بیرونی ملکوں میں قوالی کی مقبولیت دیکھ کر انہوں نے پچاس سے زائد کیسٹس تیار کر کے ان ملکوں میں عام کر دیا ہے۔

اب قوالی کے مختلف گروپ بن گئے ہیں۔ پاکستانی قوال عاقی بخش سلامت جیسے قوالوں نے غیر ممالک میں اس صنف کو ایک پسندیدہ چیز بنا دیا ہے۔ البتہ قوالی میں اب دوسرے ساز بھی استعمال کیے جا رہے ہیں۔ اس میں طبلے سے بھی مدد لی جاتی ہے۔ اس ردھم کے مغربی سامعین بھی دلدادہ ہیں۔ اس طرح قوالی کی مختلف اقسام کو ایک نئی زندگی مل رہی ہے۔ اس طرح دنیا میں ہماری تہذیب اور ثقافت کو بھی فروغ حاصل ہو رہا ہے۔

☆☆☆

ہندوستان کے ایک ننھے موسیقار کا حال سنیے۔ ان کا نام راج پنڈت ہے وہ ہندوستان کے میوزک ڈائریکٹر اے آر رحمٰن کے علاوہ مائیکل جیکسن اور میڈونا کو بھی پسند کرتے ہیں۔ راج پنڈت نوعمر ہیں لیکن وہ موسیقی ترتیب دے سکتے ہیں وہ معروف موسیقار اے آر رحمٰن سے متاثر ہو کر ''او میرے مولا'' جیسے نغموں کو بھی بہت خوبی سے پیش کرتے ہیں۔ وہ صوفیانہ موسیقی کو بھی پسند کرتے ہیں۔ راج پنڈت نے اس چھوٹی سی عمر میں اپنا ایک اسٹوڈیو بھی بنا لیا ہے۔ یہ اسٹوڈیو ان کے والد کے دفتر میں بنایا گیا ہے۔ اس اسٹوڈیو میں بیٹھ کر وہ نئی نئی دھنیں بناتے رہتے ہیں ان کے والد اشوک ایک فلم ساز ہیں اور والدہ نیرجا پنڈت ایک گلوکارہ ہیں۔ یعنی موسیقی کا ذوق انہیں اپنے والدین کی طرف سے ملا ہے۔ ان کی خواہش ہے کہ وہ بھی اے آر رحمٰن کی طرح ایک معروف موسیقار بنیں۔ انہوں نے صوفیانہ کلام کا ایک البم بھی بنایا ہے جس کے آٹھ گانے ان کی والدہ نے گائے ہیں۔ ایک گانا خود انہوں نے بھی گایا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ موسیقی کو عالمی ہونا چاہیے اسی وجہ سے وہ صوفیانہ موسیقی میں طبلہ اور ڈھولک استعمال نہیں کرتے .... اس چھوٹی عمر میں بھی انہیں نئے نئے تجربے کرنے کا شوق ہے۔ انہوں نے ''کشمیر کلب مکس'' کے عنوان سے ایک البم بنایا ہے جس میں کشمیر کے لوک گیت پیش کیے گئے ہیں۔ یہ سب گانے ان کی والدہ نے گائے ہیں۔ شاید یہ پہلا موقع ہے کہ ایک معروف گلوکارہ نے اپنے نوعمر بیٹے کے مرتب کیے ہوئے گانے گائے ہوں۔ وہ اکثر اپنی والدہ کے گائے ہوئے گانوں میں طبلہ بجاتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ میری خوش قسمتی ہے کہ مجھے میری والدہ جیسا سکھانے والا استاد ملا ہے۔ انہوں نے ایک کورس گانا بھی ترتیب دیا ہے جس کے بول ہیں

کیا کیا لفڑا ہوتا ہے

لفڑا ممبئی کی زبان میں گڑبڑ کو کہتے ہیں

راج پنڈت کو موسیقی کا بچپن ہی سے شوق ہے۔ انہوں نے آٹھ سال کی عمر میں موسیقی کی تربیت لینی شروع کر دی تھی۔ ان کا بنایا ہوا ایک گانا ''ٹریفک سگنل'' بھی بہت مقبول ہوا ہے۔ موسیقار توصیف اختر نے نہ صرف ان کی رہنمائی کی ہے بلکہ حوصلہ افزائی بھی کی ہے۔ راج کا اسٹوڈیو بنانے میں بھی توصیف اختر نے ان کی بہت مدد کی ہے۔ اب وہ اپنے اسٹوڈیو میں بیٹھ کر اپنی موسیقی ترتیب دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اے آر رحمٰن نے عامر خان کی فلم 'رنگ دے بسنتی' میں صرف گٹار استعمال کیا ہے لیکن اس کے باوجود یہ ایک پُراثر اور بھرپور گانا ہے۔

راج پنڈت کا رہنما اور استاد اے آر رحمٰن ہے حالانکہ اس کو ان سے صرف ایک بار ملنے کا موقع ملا ہے۔ یہ ان کی زندگی کا یادگار موقع تھا۔ راج کا کہنا ہے کہ انہوں نے مجھے دعا دی اور مسکراتے ہوئے کہا کہ تم بہت نام پیدا کرو گے۔ بظاہر تو یہ پیش گوئی صحیح معلوم ہوتی ہے۔

جاری ہے

عمر شریف

شکیل صدیقی

اس کے نام کا ڈنکا پوری دنیا میں بجتا تھا' اس جیسے اداکار تاریخ نے بہت کم پیدا کیے ہیں۔ ایک وقت وہ بھی تھا کہ وہ ہالی ووڈ کی فلم نگری کا بے تاج بادشاہ تھا۔

ہالی ووڈ کے ایک بڑے اداکار کا مختصر سا تعارف

شریف ہمارے ہاں بہت ہیں اور انہوں نے بہت نام کمایا ہے، مثلاً بابرا شریف، عمر شریف اور نواز شریف۔ اس کے علاوہ ہر کس و ناکس خود کو شریف ابن شریف کہلانے پر مصر رہتا ہے۔ یہاں جس عمر شریف کی سوانح آپ کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے وہ ہالی ووڈ کا فلمی اداکار ہے۔ خیر سے ایک ہمارے ہاں بھی عمر شریف ہیں جو اسٹیج ڈرامے، فلم اور ٹیلی ویژن کے فن کار ہیں۔ کس نے کس کا نام اپنا لیا اور کیوں، یہ دونوں شریفوں سے پوچھ لیجیے۔ ویسے ہالی ووڈ والے کی عمر خیر

WWW.PAKSOCIETY.COM

سے اب اسّی برس ہو چکی ہے۔

عمر شریف چونکہ مصری نژاد ہے اس لیے اس کے انگریزی بولنے کا اسٹائل سب سے جدا ہے۔ جن لوگوں نے اس کی فلمیں دیکھی ہیں انہیں اعتراف ہوگا کہ وہ اپنی اداکاری کے اعتبار سے ہالی ووڈ کے بہترین اداکاروں کی سطح پر کھڑا کیا جانے کے قابل ہے۔ میکا ناز گولڈ (سونے کی تلاش) میں اس کی اداکاری کو کون فراموش کر سکتا ہے، جس میں اس نے ویلن کولاریڈو کا کردار ادا کیا ہے۔ بہرحال اس کی وجہ شہرت لارنس آف عریبیا ہے جس کا ہدایت کار ڈیوڈ لین تھا۔ یہ فلم 1962ء میں ریلیز ہوئی تھی اور اس نے دنیا بھر میں تہلکہ مچا دیا تھا۔ اس کے بعد دوسری بڑی فلم 'ڈاکٹر ژواگو' تھی جو انقلاب روس کے پس منظر میں لکھے گئے ناول سے ماخوذ تھی اور جس کے مصنف بورس پیسترنک تھے۔ اس فلم کو بھی ڈیوڈ لین نے ڈائرکٹ کیا تھا۔ اس کی مشہور فلموں میں 'فرنچ کنکشن' اور 'برگلرز' بھی شامل ہیں۔ وہ مصر کے شہر الیگزینڈر میں 10 اپریل 1932ء میں پیدا ہوا۔ والدین نے اس کا نام مائیکل ڈیمٹری رکھا تھا۔ اس کا تعلق عیسائی گھرانے سے تھا۔ اس کے والدین رومن کیتھولک تھے۔ اس کے باپ کا نام جوزف شہلیاؤب تھا جو جنگل سے لکڑی کاٹ کر لاتا تھا اور اسے عمارتی مقاصد کے لیے بنا کر فروخت کر دیا کرتا تھا۔ اس کی ماں کا تعلق شام سے تھا۔ اس کے باپ کو اپنے کاروبار سے معقول آمدنی ہو جاتی تھی اور وہ عیش و آرام کے ساتھ اپنی زندگی گزار رہا تھا۔ اس کا خاندان خوش اور فارغ البال تھا۔ اس نے عمارتی لکڑی فراہم کرنے کے لیے ایک چھوٹی سی کمپنی بنائی ہوئی تھی۔

مائیکل نے اپنی تعلیم الیگزینڈریا کے وکٹوریا کالج میں حاصل کی اور جب وہ فارغ التحصیل ہو کر کالج سے نکلا تو قاہرہ یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا۔ قاہرہ یونیورسٹی سے اس نے طبیعیات اور ریاضی کی ڈگری حاصل کی۔ یہ ڈگری اس نے امتیازی نمبروں کے ساتھ حاصل کی تھی۔ گریجویشن کرنے کے بعد جب اسے کچھ نہ سوجھا تو اس نے اپنے باپ کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا اور خود بھی عمارتی لکڑیاں تیار کرنے والی کمپنی میں کام کرنے لگا۔ باپ کی کمپنی میں اس نے 1950ء میں کام شروع کیا تھا۔ وہ پانچ برس تک اس شغل میں مگن رہا۔

مصر کے انقلاب 1952ء سے پیشتر شاہ فاروق ان کے گھر آتا تھا اس لیے کہ اس کی ماں بھی برج کی اچھی کھلاڑی تھی۔ ان کے حالات بہتر تھے لیکن شاہ فاروق کے ان کے گھر آنے جانے سے حالات میں مزید بہتری آگئی۔ شریف ان دنوں کو یاد کرتے ہوئے کہتا ہے کہ وہ دن خراب اور واہیات تھے۔ شاہ ہمارے گھر کیوں آتا تھا؟

عمر شریف نے اپنے فلمی کیریئر کی ابتدا 1953ء میں مصری فلموں سے کی۔ اس کی پہلی فلم 'سرا فل وادی' (جلتا سورج) تھی جو 1954ء میں ریلیز ہوئی۔ اس کے مقابل مقبول مصری اداکارہ فتین ہمامہ نے کام کیا تھا۔ ہمامہ نے فلم میں اس کی بیوی کا کردار ادا کیا تھا۔ وہ ایک دوسرے سے متاثر ہو گئے اور انہوں نے 1955ء میں نکاح پڑھوا لیا۔ ہمامہ سے شادی کرنے کے لیے اس کا مسلمان ہونا ضروری تھا اس لیے اس نے اسلام قبول کر لیا اور اس کا نام تبدیل کر کے عمر الشریف رکھ دیا گیا۔ اس وقت عمر شریف کی عمر صرف اکیس برس تھی۔ ہمامہ پہلے سے شادی شدہ اور طلاق یافتہ تھی اور اس کی ایک بیٹی بھی تھی (عمر شریف اب تک اس سے بیٹیوں جیسا پیار کرتا ہے۔ وہ نیپلز یونی ورسٹی سے گریجویٹ کرنے والی ہے)

اس سے شادی کے بعد ہمامہ سے عمر شریف کا ایک بیٹا طارق شریف ہوا۔ طارق شادی کے دو سال کے بعد 1955ء میں ہوا تھا۔ ڈاکٹر ژواگو میں اس نے عمر شریف کے بچپن کا کردار آٹھ برس کی عمر میں ادا کیا ہے۔ جب اس کے بیٹے کی شادی ہوئی تو عمر شریف کا دل بہلانے کے لیے قدرت نے اسے دو پوتے عطا کیے۔ ان میں سے ایک کا نام عمر اور دوسرے کا نام کریم ہے۔ اس کا بیٹا طارق بھی اس کی طرح اداکار ہے۔

میاں بیوی نے 19 برس تک ساتھ نبھایا مگر اس کے بعد 1974ء میں ایک دوسرے سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اس تلخ تجربے کے بعد عمر شریف نے پھر کبھی شادی نہیں کی۔

اس کا کہنا ہے ہر چند اس نے اپنی عمر کا کافی بڑا حصہ یورپ اور امریکا میں گزارا اور بے حد حسین و جمیل دوشیزاؤں کا ساتھ رہا مگر اسے کسی سے محبت نہیں ہوئی۔ غالباً محبت زندگی میں ایک ہی بار ہوتی ہے اور دوسری محبت پہلی محبت کو بھلانے کے لیے ہوتی ہے۔ ویسے اس کا ایک ناجائز بیٹا بھی ہے جو ایک اطالوی صحافی سے تعلقات کے نتیجے میں عالم وجود میں آیا ہے۔ تاہم عمر شریف نے اس کا کبھی اعتراف نہیں کیا ہے۔

جمال ناصر کے انقلاب لانے کے بعد دولت مختلف گھرانوں میں تقسیم ہو گئی اور دولت مندوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا۔ چنانچہ مصر سے باہر آنے جانے پر پابندی عائد کر دی گئی۔ اس لیے عمر شریف کو بھی کئی بار فلموں کی شوٹنگ کے سلسلے میں جب امریکا یا یورپ کے ممالک جانا ہوتا تھا تو اسے

پریشانی اٹھانی پڑتی تھی۔ ان واقعات سے تنگ آ کر اس نے مستقل یورپ میں رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ بہرحال اس کے لیے ایک انوکھا تجربہ تھا اس لیے اس نے اپنی بیوی کو طلاق دینے تک خاندانی زندگی گزاری تھی لیکن یورپ میں اس نے ہوٹلوں اور جوئے خانوں میں گزر بسر کرنا شروع کر دی۔

عمر شریف ان دنوں کو یاد کرتے ہوئے کہتا ہے۔ "یہ بات وجہ طمانیت تھی کہ میں بڑے افراد کی طرح سے یورپ میں زندگی گزار رہا ہوں مگر میں تنہائی کا شکار ہو گیا۔ اس کے علاوہ میرا ملک، میرے لوگ اور میرے گلی کوچے مجھ سے جدا ہو گئے۔

اس کی پہلی فلم کامیابی سے ہمکنار ہوئی تو اسے دوسری فلموں میں کام ملنے لگا۔ چنانچہ اس نے تقریباً بیس فلموں میں کام کیا جن میں ایامنا ال حلوا، لا انا ما، سیدات ال کسر، اینا کرینا اور نہر ال حب شامل ہیں۔

اس نے 1961ء میں ہالی ووڈ جا کر قسمت آزمائی تو اسے ڈیوڈ لین نے 'لارنس آف عریبیا' میں ایک بڑا کردار دے دیا۔ اس سے پیشتر ایلین ڈیلون یا ہارسٹ بچولز کو یہ کردار دینے کے بارے میں سوچا گیا تھا۔ قسمت کی دیوی اس پر ابتدا ہی سے مہربان ہو گئی اور اسے معاون اداکار کی حیثیت سے اکیڈمی ایوارڈ کے لیے نامزد کیا گیا۔ اس کے علاوہ اس نے گولڈن گلوب ایوارڈ حاصل کیا۔ فلم کی کامیابی کے بعد اس کی شہرت چہار دانگ عالم میں پھیل گئی۔ اخبارات میں اس کی تصاویر اور اس کے بارے میں مضامین شائع ہونے لگے۔

اس نے بتایا کہ فلم کی شوٹنگ شروع ہوتے ہی احساس ہو گیا کہ ہم کسی بڑی فلم میں کام کر رہے ہیں۔ دراصل اس کے اسکرپٹ اور مکالموں نے مجھے متاثر کیا تھا۔ اس زمانے میں رابرٹ بولٹ کو لکھنے والوں پر فوقیت حاصل تھی۔ اسے اپنی تحریر پر عبور تھا۔ یہ تو تھا خاکہ جس پر فلم بننے جا رہی تھی۔ شوٹنگ کا احوال یہ ہے کہ ہدایت کار ڈیوڈ لین نے اسے بیس مہینوں میں ختم کیا۔ اتنے عرصے تک ریگستان میں پڑے رہنا معمولی بات نہیں ہے۔ ہر روز ایک جیسا لباس پہننا اکتاہٹ پیدا کر دیتا تھا۔ پھر ڈیوڈ لین ایسا ہدایت کار تھا کہ جب تک مطمئن نہ ہو جائے ہمیں رلاتا رہتا تھا۔ مثلاً ایک شاٹ لینا ہے مگر اس میں وہ بادل بھی آئے گا جو ابھی تین میل کے فاصلے پر ہے۔ اب اس بادل کا انتظار کیا جا رہا ہے کہ وہ اڑتا ہوا ہم تک پہنچے تو شوٹنگ شروع ہو۔ ان ہی باتوں سے تنگ آ کر مارلن برانڈو نے لارنس آف عریبیا میں کام کرنے سے انکار کر دیا تھا، ورنہ پیٹر اوٹول سے پیشتر اسے کرنل لارنس کے کردار کی پیشکش ہوئی تھی۔

ایک اچھی فلم کے لیے کیا کچھ ضروری ہے، یقیناً یہ ہم سے زیادہ ڈیوڈ لین کو معلوم تھا۔ فلمی تاریخ میں وہ دنیا کی مہنگی ترین فلم تھی اس پر اس زمانے میں 14 ملین ڈالر خرچ ہوئے تھے۔ آج کل کے لحاظ سے 200 ملین سمجھ لیجیے۔ (ایک ملین دس لاکھ کے برابر ہوتا ہے) فلم عربوں کے بارے میں تھی جس میں کوئی عورت نہیں تھی۔ بس اونٹ اِدھر سے اُدھر بھاگتے پھر رہے ہیں۔ کوئی محبت بھری داستان نہیں تھی۔ اگر آپ اس کے فلم ساز ہوتے تو پسینا آ جاتا۔ ہمارے تو دماغوں میں یہ سوال منڈلاتا رہتا تھا کہ فلم کی لاگت کیسے واپس آئے گی؟ کیا شائقین اسے دیکھنے کے لیے آئیں گے؟ فلم کی لمبائی بھی معمول سے زیادہ تھی۔ بہرحال ڈیوڈ لین اس سے پیشتر 'برج آن دی ریور کوائی' جیسی فلم بنا کر شہرت اور ناموری حاصل کر چکا تھا، اس لیے سب کو اس کی صلاحیتوں پر اعتماد تھا۔ فلم شروع ہوتے ہی سناٹا ہو جاتا ہے۔ بس دھول اور ریت اڑتی دکھائی دیتی ہے۔ ہم لوگ تو بور ہونے لگے تھے لیکن ڈیوڈ لین کا کہنا تھا کہ یہ ضروری ہے۔ میں دیکھنے والوں پر ماحول طاری کر رہا ہوں۔

کوئی ایک دو باتیں ہوں تو بتاؤں، سب باتیں بتانے بیٹھوں تو ایک ضخیم کتاب اسی پر تیار ہو جائے گی۔ ایک مرحلے پر شوٹنگ تین ماہ کے لیے رک گئی۔ ہوا یوں کہ رابرٹ بولٹ جس نے اس فلم کا منظر نامہ لکھا تھا، کرنل لارنس جو برطانوی انٹیلی جنس کا افسر تھا کے کردار کے بارے میں کہانی میں اضافہ کرنا چاہتا تھا جس نے قاہرہ میں رہتے ہوئے سلطنتِ عثمانیہ کے خلاف سازش کی تھی اور عربوں کو سلطنتِ عثمانیہ کے خلاف بھڑکایا تھا، لیکن بولٹ لندن میں گرفتار ہو گیا اور اسے تین ماہ کی سزا سنا دی گئی۔ اس لیے کہ وہ ایٹمی ہتھیاروں کے خلاف احتجاج کر رہا تھا۔ اگر وہ عدالت سے معافی مانگ لیتا تو چھوٹ جاتا مگر اس نے جیل جانا پسند کر لیا۔ آپ تو تین گھنٹوں میں فلم دیکھ کر اس کی اچھائی اور برائی کے بارے میں فیصلہ کر دیتے ہیں لیکن اس کی فلم بندی کرنے میں سیکڑوں... مراحل ایسے آتے ہیں جب محسوس ہوتا ہے کہ یہ فلم پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ پائے گی۔

عمر شریف کہتا ہے کہ وہ معمولی فلم نہیں تھی۔ اس نے میری زندگی کا رخ تبدیل کر کے رکھ دیا۔ پیٹر اوٹول نے مجھ سے ایک بار کہا، میں نے فلم میں کام تو کیا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی عربوں کے کلچر میں اضافہ کیا ہے۔ میں نے اس کی

طرف حیرت سے دیکھا تو اس نے وضاحت کی کہ عرب پہلے اونٹ پر سوار ہوتے وقت رسی کے نمدے رکھا کرتے تھے۔ ہدایت کار نے میرے لیے بھی اس کا بندوبست کیا۔ پہلی شوٹنگ کے بعد میری پیٹھ رسی کے نمدے سے چھل گئی۔ میں نے کہا میں اس پر نہیں بیٹھوں گا۔ سوال یہ پیدا ہوا کہ اس پر نہیں تو کس پر؟ میں نے اس کا حل خود ہی نکالا اور کہا میرے لیے ڈنلوپ کا ٹائر منگوایا جائے۔ اس ٹائر پر میں نے روئی کا ایک تکیہ رکھ لیا۔ پھر اس پر بیٹھ کر مزے سے شوٹنگ کی۔ یقین جانو کہ اس کے بعد عرب بھی رسی کے نمدے پر بیٹھنے کے بجائے ڈنلوپ کے ٹائر پر بیٹھنے لگے ہیں۔

ایک دل چسپ بات اور بتاؤں کہ پیٹر اوٹول مجھ سے پہلے ہی روز سے بے تکلف ہو گیا تھا۔ اس نے مجھ سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا کہ تمہارا نام عمر کیوں ہے؟

''کیوں!'' میں نے پوچھا تھا۔

وہ بولا کہ تمہارا نام تو فریڈ ہونا چاہیے۔ اس کے بعد ہم جب بھی ملتے ہیں تو وہ مجھے فریڈ کہہ کر پکارتا ہے۔

اردن کے شاہ حسین بھی اس فلم کی شوٹنگ دیکھنے آئے تھے۔ جب ڈیوڈ لین نے ان سے کہا کہ اسے کچھ سپاہیوں کی ضرورت ہے تاکہ وہ ایکسٹرا کی حیثیت سے انہیں استعمال کر سکے تو انہوں نے پورا ایک بریگیڈ شوٹنگ کے لیے بھیج دیا۔ اس طرح سے فلم میں دکھائے جانے والے بیشتر سپاہی 'اصلی' تھے۔

عمر شریف کو بہت سی فلموں میں کام ملا اور وہ اسٹار بن گیا۔ فلموں کے ساتھ ساتھ وہ ڈراموں میں بھی کام کرتا رہا۔ یقیناً اس سے اس کے فن میں اضافہ ہوا۔ 1964ء میں اس نے صوفیہ لارین کے مقابل 'دی فال آف دی رومن ایمپائر' میں کام کیا۔ جن فلموں نے اسے امر کر دیا ان میں 'بی ہولڈ اے پیل ہارس' بھی تھی جس کی کہانی اسپین کی خانہ جنگی پر مبنی تھی۔ جینگش خان (چنگیز خان) دی نائٹ آف دی جنرلز (1968ء) میں۔ اس فلم میں اس کے ساتھ پیٹر اوٹول بھی تھا۔ دونوں کی یکجائی لارنس آف عریبیا کے بعد ہوئی تھی۔ فلم کی کہانی کے مطابق دوسری جنگ عظیم میں پیٹر اوٹول جو نازی جنرل ہوتا ہے ایک آدمی کو قتل کر دیتا ہے۔ عمر شریف اس کا سراغ لگا لیتا ہے اور پیٹر اوٹول کو بتاتا ہے تو وہ خودکشی کر لیتا ہے۔

پیٹر اوٹول عظیم اداکاروں میں ہے۔ اسے آٹھ بار آسکر ایوارڈ کے لیے نامزد کیا گیا لیکن شومئی قسمت ایوارڈ ایک بار بھی نہیں ملا۔ چنانچہ ایوارڈ کمیٹی نے 2007ء میں ایک ایوارڈ اسے اعزازی طور پر دیا۔ جس کا وہ بجا طور پر مستحق تھا۔ اس نے 74 برس کی عمر میں فلموں میں کام کرنا ترک کر دیا۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ بہت تھک گیا ہے اور اب فلموں سے دور رہنا چاہتا ہے۔ تیز روشنیاں اب اسے پریشان کرتی ہیں۔

1966ء میں اسے ڈیوڈ لین نے پھر بلایا اور اسے ایک ناول 'ڈاکٹر ژواگو' دے کر کہا وہ اس پر فلم بنانے کا اور مرکزی کردار کے لیے عمر کا انتخاب کر چکا ہے۔ عمر نے ناول پڑھنے کے بعد ہامی بھر لی۔ اس کے مقابل جولی کرسٹی نے ہیروین کا کردار ادا کیا۔ فلم کی شوٹنگ اسپین اور فن لینڈ کے علاقوں میں ہوئی۔ برفیلے مناظر فن لینڈ میں فلم بند ہوئے تھے۔ بورس پیسٹرنک کے اس ناول پر روس میں پابندی عائد تھی۔ کیوں کہ یہ کمیونزم کے خلاف تھا۔ ناول کی کہانی رومانٹک تھی، لیکن پس منظر سیاسی تھا۔ یہ انقلاب روس کے پس منظر میں تھی۔ ڈاکٹر ژواگو جو ایک فزیشن اور شاعر ہے ایک خاتون کی محبت میں گرفتار ہو جاتا ہے لیکن اسے حاصل نہیں کر پاتا۔ فلم باکس آفس پر کامیاب ہوئی اور عمر کو لازوال شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی۔ اس فلم کا پروڈیوسر کارلو پونٹی تھا۔ فلم نے پانچ آسکر ایوارڈ حاصل کیے۔

چی گویرا کی سوانح حیات پر ایک ہدایت کار نے فلم بنانے کا اعلان کیا تو عمر شریف کو مرکزی کردار کے لیے منتخب کر لیا۔ فلم کا نام بے حد مختصر تھا۔ صرف 'چی' مگر باکس آفس پر یہ فلم اچھا بزنس نہ کر سکی۔ بہرحال اس ناکامی سے اس کی شہرت داغدار نہیں ہوئی اور اس کی مقبولیت کا ستارہ نہیں گہنایا۔

1971ء سے 1974ء تک اس کی فلمیں ناکامی سے دوچار ہوئیں۔ جن میں ہارس مین (عمر نے اس میں ایک افغانی کھلاڑی کا کردار ادا کیا ہے اس کے بعد بلیک ایڈورڈز کی رومانی فلم 'دی ٹیمرنڈ سیڈ' تھی اس میں عمر کے ساتھ جولی اینڈریوز نے کام کیا تھا۔ وہ امریکا اور روس کی سرد جنگ کے ہیرو ہیروئن تھے۔ مگر یہ فلم بھی بزنس کے اعتبار سے کم زور رہی۔

اس نے جب فنی گرل نامی فلم میں باربرا اسٹریسینڈ کے ساتھ کام کیا تو مصری حکومت نے برہمی کا اظہار کیا۔ اس لیے کہ باربرا اسرائیلی حکومت کی طرفدار تھی جب کہ مصر اسرائیل کے ساتھ حالتِ جنگ میں تھا۔ عمر شریف نے اس واقعہ کو کوئی اہمیت نہ دی اور مصری حکومت سے معافی نہیں مانگی تو حکومت نے اس کی شہریت منسوخ کر دی۔

مصری اخبارات نے اس پر سرخیاں جمائیں کہ یہ شخص غدار ہے، اس نے فلم میں ایک ایسی لڑکی کا بوسہ لیا ہے جس

نے اسرائیل کے لیے ایک بھاری رقم دی ہے اور چندہ بھی جمع کیا ہے۔ میں نے پریس کو جواب دیا کہ میں نہ تو پیشہ ورانہ طور پر اور نہ ذاتی حیثیت میں کسی لڑکی کا بوسہ لیتے وقت اس کی قومیت کے بارے میں کچھ پوچھتا ہوں۔ آپ میرے بیٹے کے بارے میں کیا کہیں گے جس نے تین شادیاں کی ہیں۔ اس نے پہلی شادی ایک یہودی لڑکی سے کی، دوسری شادی ایک عیسائی کیتھولک سے اور تیسری ایک مسلمان لڑکی سے۔ جس کے نتیجے میں میرا ایک پوتا یہودی ہے اور دوسرا مسلمان۔ دل چسپ بات یہ کہ دونوں آپس میں بھائی ہیں۔

جب پریس نے اس کے خلاف کافی واویلا مچایا تو اس نے خود ہی جلاوطنی اختیار کر لی۔ 1977ء میں جب مصر کے صدر انور السادات امریکا گئے تو صدر امریکا جیرالڈ فورڈ نے عمر شریف کو وہائٹ ہاؤس میں مدعو کیا۔ اس موقع پر انور السادات نے اسے گلے لگاتے ہوئے کہا۔ ''تم اپنے وطن واپس کیوں نہیں آتے؟ کیا کبھی کوئی مادرِ وطن سے ناراض ہوتا ہے؟''

پھر انہوں نے اپنے بیٹے کی شادی میں اسے مدعو کیا اور وعدہ لیا کہ وہ ضرور اس میں شرکت کرے گا۔ اس کے بعد مصر آتا اور جاتا رہا۔ مادرِ وطن سے اس کی ناراضی دور ہو گئی۔

بہرحال اسے مصر سے بے پناہ عشق ہے، یہاں کی سرزمین میں اس نے جنم لیا ہے۔ اس لیے وہ یہیں کا ہو کر رہ گیا ہے۔ اس کی فلموں کی شوٹنگ امریکا کے سوا یورپ میں بھی ہوتی ہے لیکن وہ لوٹ کر مصر آنے کو ترجیح دیتا ہے۔ اس نے اپنی زندگی کے تیس برس پیرس میں گزارے ہیں لیکن اب لوٹ کر پھر قاہرہ آ گیا ہے اور اس نے اب کہیں اور نہ جانے کا فیصلہ کر لیا ہے۔

فلم کے علاوہ اسے زبانیں سیکھنے کا بھی شوق ہے۔ وہ بچپن میں صرف فرانسیسی بولتا تھا۔ اس لیے اس نے انگریزی کے علاوہ عربی، اسپینی، یونانی اور اطالوی سیکھی۔ وہ ان میں روانی سے گفتگو کر سکتا ہے۔ اس کے علاوہ عمر شریف کو تاش کے کھیل برج سے شغف تھا جس میں اس نے مہارت حاصل کر لی۔ وہ 1970ء اور 1980ء میں شکاگو ٹریبون میں برج پر ایک کالم بھی لکھا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ کمپیوٹر کے ایک کھیل جس کا اس نے لائسنس حاصل کر لیا ہے، 'عمر شریف برج' کہلاتا ہے، جو 1992ء سے مارکیٹ میں آ چکا ہے۔

اسے دنیا کا بہترین برج کا کھلاڑی ہونے کا بھی اعزاز حاصل ہے۔ اس نے اس سلسلے میں 1967 میں 'عمر شریف برج سرکس' لے کر دنیا کا ٹور کیا اور شہرت و مقبولیت کی انتہا کو چھو لیا۔

اس وقت تک وہ سگریٹ پینے کا اتنا عادی تھا کہ روزانہ تقریباً 100 سگریٹ پی جایا کرتا تھا۔ جب اسے دل میں درد کی شکایت ہوئی تو وہ بغرض علاج ڈاکٹر کے پاس گیا جنہوں نے بتایا کہ اس کے دل کو جانے والی دو شریانیں بند ہو چکی ہیں' چنانچہ 1992ء میں اس کے تین بائی پاس آپریشن ہوئے اس کے باوجود اس نے سگریٹ پینا نہیں چھوڑی، لہٰذا اس کا دل پر اثر پڑا اور اس پر حملہ قلب ہوا۔ جس کے نتیجے میں 1994ء ڈاکٹروں نے اس کا ایک بائی پاس اور کیا۔ عمر شریف کو اسی میں عافیت نظر آئی کہ وہ سگریٹ چھوڑ دے۔ پھر اس نے سفید نلکی کو ہاتھ نہیں لگایا۔

وہ بین الاقوامی طور پر فلمی دنیا سے باہر نہیں ہوا۔ 1979ء میں اسے سڈنی شیلڈن کے ناول بلڈ لائن پر بننے والی فلم کے ہیرو کی حیثیت سے لیا گیا۔ اس نے اپنی اداکاری کے جوہر دکھا کر اس فلم کو کامیابی سے ہمکنار کر دیا۔ اس کے بعد اس نے 1984ء میں ایک مزاحیہ فلم 'ٹاپ سیکرٹ' میں کام کیا اور شائقین سے اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوا لیا۔ ناقدین نے بھی اس کے مزاحیہ کردار کی تعریف میں کالم لکھے۔

'حرم' نامی فلم 1986ء میں بنی جس میں اس نے ایک عیاش سلطان کا کردار ادا کر کے لوگوں کو حیران کر دیا۔ اسی زمانے میں اس نے لندن کے اسٹیج ڈرامے 'سلیپنگ پرنس' میں بھی کام کر کے ناظرین سے داد لی۔

پھر وہ مستقل طور پر قاہرہ آ گیا جس کا سبب وہ اپنے پوتے کو بتاتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ اس کی محبت میں گرفتار ہو چکا ہے اور اب اس سے علیحدہ نہیں ہو سکتا۔ فلم میں کام کرنا اس نے ترک نہیں کیا۔ 2003ء میں ''موسیو ابراہیم'' فلم میں کام کیا جس کی کہانی ایک فرانسیسی ڈرامے سے متاثر ہو کر لکھی گئی ہے۔ شریف نے اس میں ایک ترک دکان دار کا کردار ادا کیا ہے جو ایک بے ماں باپ کے بچے کو گود لے لیتا ہے اور اس کی پرورش کرتا ہے۔ فلم کو تنقیدی حلقوں نے بہت پسند کیا۔ اس فلم نے وینس کے فلمی میلے میں ایوارڈ حاصل کیا جو امریکا کے آسکر ایوارڈ کے برابر قدر و قیمت رکھتا ہے۔

ہڈالگو نامی فلم میں اس نے 2004ء میں کام کیا۔ اس میں اس نے ایک عرب کا کردار ادا کیا ہے جو امریکن کاؤبوائے سے گھوڑے بھگانے کا مقابلہ کرتا ہے اور اس میں جیت جاتا ہے۔ یہ فلم بھی عرب دنیا کو پسند آئی۔ وہ خاموش نہیں بیٹھا اور اس نے 2008ء میں 10000 بی سی میں کام کیا۔ وہ فلموں

میں کام کرتا ہے، چاہے فارغ بیٹھا رہتا ہے لیکن ہمیشہ اخبارات کی سرخیوں میں ہوتا ہے۔اس پر مضامین شائع ہوتے ہیں اور کوئی نہ کوئی اسکینڈل ضرور بنتا ہے۔

فلموں میں اس کی لازوال خدمات کے عوض..... 2005ء میں عالمی ادارہ برائے سائنس، ثقافت اور تعلیم (یونیسکو) نے اسے گولڈ میڈل سے نوازا ہے جو اس سے پہلے بہت کم افراد کو ملا تھا۔

وہ غصے کا تیز ہے اور بات بات پر ہاتھ چھوڑ دیتا ہے۔یہ 11 جون 2005ء کا واقعہ ہے کہ اس کے پاس امریکی کرنسی نہیں تھی اس لیے اس نے بیورلے ہلز، کیلیفورنیا کے پارکنگ لاٹ کے ملازم کو 20 یورو کا نوٹ تھما دیا جو یورپ کی کرنسی ہے۔ملازم نے اسے لینے سے انکار کر دیا۔چنانچہ شریف نے اسے تھپڑ مار دیا۔لوگ جمع ہونے لگے تو وہ تیز قدموں سے اپنے دوست کے گھر کی طرف چل دیا۔ملازم نے عدالت میں مقدمہ دائر کر دیا، جس کا فیصلہ دو سال بعد 13 فروری 2007ء کو ہوا، جرمانہ عائد کیا گیا۔شریف اس وقت عدالت میں موجود نہیں تھا۔جج صاحب نے اس پر 100 ڈالر کا جرمانہ عائد کیا۔

اسی طرح سے فرانس میں جب اس نے ایک کاسینو میں جولائی 2003ء میں ایک پولیس والے کو زدوکوب کیا تو اس پر مقدمہ قائم کر دیا گیا اور اسے عدالت میں پیش ہونا پڑا۔دو پیشیوں کے بعد اسے 5 اگست 2003ء میں جج صاحب نے ایک ماہ قید اور 1700 ڈالر جرمانے کی سزا دی۔

تیسرا واقعہ دوہا، قطر کے فلمی میلے میں پیش آیا جب عمر ایک خاتون کے ساتھ پوز کھنچوا رہا تھا۔دوسری خاتون بھی اس کی متمنی تھی کہ وہ بھی دنیا کے اس عظیم اداکار کے شانہ بہ شانہ کھڑی ہو کر پوز بنائے۔اس کوشش میں اس نے شریف کے کاندھے سے کاندھا ملا دیا۔شریف کو یہ ناگوار گزرا اس نے خاتون کو تھپڑ مار دیا۔وہ خاتون دھکا کھا کر ایک ستون سے جا ٹکرائی۔شریف نے کہا۔"میں تم سے کہہ رہا تھا کہ بس اس کے بعد تمہاری باری آجائے گی مگر تم نے بے تابی میں مجھے مشتعل کر دیا۔اگر تمہاری کھوپڑی میں مغز نام کی کوئی چیز نہیں ہے تو اس میں بکری کا بھیجا ڈلوالو۔"

اس خاتون کے ساتھ چند پوز کھنچوانے کے بعد اس نے دوسری خاتون سے نہ صرف یہ کہ معذرت کی بلکہ چند پوز بھی کھنچوائے اور اپنی اعلیٰ ظرفی کا ثبوت دیا۔

عمر شریف نے 2006ء میں ایک پریس کانفرنس کے دوران بتایا کہ اب وہ برج نہیں کھیلے گا۔اس نے وضاحت کی "مجھے یہ سوچ کر کوفت ہونے لگی ہے کہ میں اپنی خواہشات کا غلام ہو کر رہ گیا ہوں۔اب مجھے صرف اپنا کام کرنا چاہیے۔جہاں تک خواہشات کا تعلق ہے تو مجھے برج کے علاوہ گھوڑوں سے عشق ہے اور میں جوا کھیلنے کا بھی رسیا ہوں۔میں نے محسوس کیا کہ میں مختلف زندگی گزار رہا ہوں۔اب مجھے اپنے خاندان کے ساتھ بھی وقت گزارنا چاہیے۔میں نے عرصے سے انہیں وقت نہیں دیا ہے۔"

اس کے بیٹے کی شادی ہو چکی ہے اور وہ خود بھی دو بیٹوں کا باپ بن چکا ہے۔

جب اس سے پوچھا گیا کہ اس کی خواہشات کیا ہیں تو اس نے بتایا کہ اس کے دل میں ہے کہ وہ تھیٹر میں جان دار کردار ادا کرے۔اسے خراب فلموں میں کام کرنا پسند نہیں ہے، بلکہ اس کے بجائے وہ چاہے گا کہ کسی حسین دوشیزہ کے ساتھ برج کا ایک گیم کھیل لے۔

اس نے بتایا کہ وہ کافی عرصے تک امریکا میں رہا ہے اور اس نے یہ جان لیا ہے کہ صرف دس فی صد کے پاس پاسپورٹ ہے ورنہ نوے فی صد اس سے محروم ہیں۔اس کے باوجود وہ امریکا کا پیچھا نہیں چھوڑ رہے ہیں۔یہ لوگ کندۂ ناتراش ہیں اور کچھ نہیں جانتے۔البتہ مشرق وسطیٰ کے لوگ ذہین اور تعلیم یافتہ ہیں۔ان میں کام کرنے کی صلاحیت دوسروں سے زیادہ ہے۔بہرحال ان کے ملکوں میں وہ جمہوریت نہیں آسکتی جو امریکا میں ہے۔اس لیے کہ ان کے مزاج میں اکھڑپن شامل ہے۔

وہ کہتا ہے کہ میں نے فلمیں بنانا چھوڑ دی ہیں اس لیے کہ گزشتہ بیس برس سے میری فلموں کا معیار بہت گر چکا ہے۔جس کی بنا پر میں قرضوں میں گھرا رہتا ہوں۔یہ آپ بخوبی جانتے ہوں گے کہ میں جوا کھیلنے کا بھی شوقین ہوں جس کی بنا پر کئی بار قلاش ہو چکا ہوں۔ان قرضوں کو اتارنے کے چکر میں، میں کوئی نہ کوئی فلم بناتا رہتا تھا۔آپ خود سوچیں کہ ایسے میں فلم کا معیار کیا ہو سکتا ہے؟ میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اگر مجھے فنکار کی حیثیت سے زندہ رہنا ہے تو مجھے چاہیے کہ میں اب اسٹیج پر کام کروں اس لیے کہ اب میرا پوتا مذاق اڑانے لگا ہے وہ کہتا ہے کہ دادا آپ کی پچھلی فلم بہت وحشت ناک تھی لیکن ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اب جو فلم آئے گی وہ اس سے بھی بدتر ہوگی۔چنانچہ میں نے فلمیں نہ بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔

اب میں ذاتی پروڈکشن کے بجائے دوسروں کی فلموں

میں کام کرنا پسند کروں گا۔مجھے کسی بہترین کہانی کا انتظار ہے۔میں ایک تنہا شخص ہوں اور ہوٹلوں میں زندگی بسر کرتا ہوں۔جب کسی اجنبی جگہ پر جاتا ہوں تو کوفت محسوس ہوتی ہے۔چنانچہ میں کسی جوئے خانے کا رخ کرتا ہوں اس لیے کہ لوگ بہرحال مجھے شناخت کر لیتے ہیں اور ڈنر کرنے کے لیے اپنی میز پر بلا لیتے ہیں۔

میں چاہتا ہوں کہ ایک فنکار کی حیثیت سے میں ہمیشہ جانا جاؤں۔لوگ جس طرح پہلے میری حوصلہ افزائی کرتے تھے اور میری فلمیں دیکھ کر ستائشی جملے کہتے تھے۔ناقدین میرے بارے میں اچھی رائے رکھتے تھے۔میں چاہتا ہوں کہ جب اس دنیا سے جاؤں تب بھی وہ مجھے اچھے نام سے پکاریں۔

جن دنوں میں نے لارنس آف عریبیا میں کام کیا تھا ان دنوں یا اس سے پیشتر کسی عرب نے ہالی ووڈ کی فلموں میں کام نہیں کیا تھا۔میری شہرت دیکھ کر کولمبیا پکچرز نے مجھ سے پانچ برس کا معاہدہ کیا لیکن معاوضے کے طور پر ایک ڈالر بھی نہیں دیا۔تین سال کے بعد ڈاکٹر ژواگو بنی تو میری شہرت میں دو چند اضافہ ہو گیا۔اس وقت کولمبیا پکچرز نے مجھے ایم جی ایم کے ادارے کو پندرہ ہزار ڈالر میں فروخت کر دیا۔چنانچہ میں نے پندرہ ہزار ڈالر لے کر ایم جی ایم کی فلموں میں کام کیا۔میرے امریکی وکیل نے کہا کہ اس بات پر تو کولمبیا پکچرز پر مقدمہ قائم کیا جا سکتا ہے اور اس کا یقین ہے کہ آپ جیت بھی جائیں گے۔میں نے اسے ایسا کرنے سے منع کیا اور کہا کہ میں امریکا میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوانے آیا ہوں۔اس مرحلے پر یہ لوگ کہیں گے کہ اسے پیسے کی پروا ہے۔یہ حقیقی فنکار نہیں ہے۔

بہرحال میں نے ایسی فلموں میں بھی کام کر ڈالا جن میں، میں کام نہیں کرنا چاہتا تھا۔اس لیے کہ میں معاہدے کا پابند ہو چکا تھا۔

☆☆☆

لوگ مجھ سے میرے اعتقادات پوچھتے ہیں۔میں خدا پر اور مذہب پر یقین رکھتا ہوں لیکن جب دیکھتا ہوں کہ مذہبی دنیا اور لامذہبی دنیا میں ایک جنگ برپا ہے اور لوگ ایک دوسرے کو ہلاک کرنے سے باز ہی نہیں آرہے ہیں تو میرا ایمان ہر چیز سے اٹھ جاتا ہے۔نیکی اور بدی کی یہ جنگ آخر کب تک ہوتی رہے گی؟

نیک کون ہے اور بد کون اس کا فیصلہ ہونا ابھی یقیناً باقی ہے۔میرے نزدیک ایک بات بے حد مضحکہ خیز ہے کہ یہودی

محمد بن عبداللہ المہری نام، نفس ذکیہ کے لقب سے مشہور تھے۔امام حسینؑ کے پڑپوتے تھے۔عباسی خلیفہ ابوجعفر بن منصور کے زمانے میں علوی اور غیر علوی کا مسئلہ بہت زور پکڑ گیا۔منصور کے زمانے میں اسے چلانے والوں میں نفس ذکیہ اور ان کے بھائی ابراہیمؒ نے خفیہ طور پر اس مسلک پر کام شروع کیا۔بہت سے افراد نے خفیہ طور پر انہیں مہدی موعود سمجھ کر ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔منصور جب انہیں گرفتار نہ کر سکا تو اس نے تمام اولادِ حسن کو پابند سلاسل کر کے ایذا پہنچانے کا حکم دے دیا۔بہت سے افراد ان مصائب و مشکلات کے پہاڑ تلے جاں بحق ہو گئے۔اس موقع پر نفس ذکیہ کو ان کے جانثاروں نے میدان جنگ میں آنے پر مجبور کیا کہ خاندان بن ہاشم مصائب کا شکار ہے آپ ان کی مدد کریں۔چنانچہ رجب 145ھ میں ایک جمعیت کے ساتھ میدان میں آ کر آپ نے والئی مدینہ رباح کو گرفتار کر کے شہر پر قبضہ کر لیا۔مدینہ سے مکہ پہنچے وہاں کے لوگوں کو بھی ساتھ ملا لیا۔اس سے منصور کو بہت تشویش لاحق ہوئی۔نفس ذکیہ کو اس نے دو خطوط لکھے جن میں قرآنی آیات کا حوالہ دیتے ہوئے منصور نے اسے اپنی خلافت میں آجانے کو کہا۔جواب میں انہوں نے بھی قرآنی آیات کے حوالے دیئے اور کہا کہ اصلی خلیفہ میں ہوں۔خط و کتابت ناکام ہونے پر عباسی خلیفہ نے عیسیٰ بن موسیٰ اور محمد بن قحطبہ کی سرکردگی میں فوج کے دو گروہ بھیجے۔عیسیٰ بن موسیٰ کی نگرانی میں چھ ہزار فوج تھی۔جنگ سے قبل عیسیٰ بن موسیٰ نے آخری بار مطیع ہو جانے کو کہا۔مگر آپ نہ مانے۔پھر اس نے ذیل مدینہ سے ہٹ جانے کو کہا۔مگر پھر بھی ذکیہ اپنی جگہ ڈٹے رہے۔اس پر جنگ شروع ہو گئی۔نفس ذکیہ بڑی بہادری سے لڑے۔دو تیر کمر اور سینے میں پہلے لگے جن سے وہ زمین پر گر پڑے، محمد بن قحطبہ نے آگے بڑھ کر ان کا سر قلم کر کے منصور کو بھیج دیا۔یہ واقعہ دسمبر 762ء میں پیش آیا۔

مرسلہ: محمد سلطان اشرفی، ملتان

کہتے ہیں کہ وہ مرنے کے بعد جنت میں جائیں گے اور باقی لوگ جہنم کا ایندھن بنیں گے۔ جب کہ عیسائیوں کے خیالات بھی تقریباً ایسے ہی ہیں۔ اپنے سوا وہ دوسرے مذاہب کے لوگوں کو جہنم رسید کرنے کو تیار رہتے ہیں۔ مسلمانوں کا فلسفہ یہ ہے کہ وہ سیدھی اور سچی راہ پر ہیں اور باقی مذاہب کے ماننے والے گمراہ ہیں۔ چنانچہ جنت کے حقدار وہی ہیں۔

ہم سارے بندے تو خدا کی تخلیق ہیں۔ وہ سب کو جہنم میں کیوں ڈالنے لگا؟ اس لیے میں یہ کہتا ہوں کہ سب خرافات ہے۔۔۔ معاف کیجیے گا، میں کسی چیز کو خرافات میں شامل نہیں کر رہا، میرا مطلب ہے کہ لوگوں نے اسے خرافات بنا دیا ہے۔

کسی ملک کی امارت اور غربت کو دیکھنا ہو تو اس کا پیمانہ کوڑے دان کو بنا لیجیے۔ اگر کوڑے دان خالی ہو اور اس میں کوڑا کرکٹ نہ ہو تو سمجھ لیجیے کہ وہ ملک مالدار ہے۔ اگر کوڑے دان میں کوڑا ہو تو اوسط آمدنی والا ملک ہے۔ لیکن اگر کوڑے دان نہیں ہے اور کوڑا ایسے ہی گلی کوچوں میں بکھرا پڑا ہے تو وہ ملک غریب اور مفلس ہے۔

☆☆☆

اس کی فلم 'ڈاکٹر ژواگو' کے ناول کو ٹیلی ویژن کے لیے بھی فلم بند کیا گیا ہے۔ اس سے پوچھا گیا کہ فلم اور ٹیلی ویژن فلم میں کیا فرق ہے؟ اس نے جواب دیا کہ فلم ہال میں تاریکی ہوتی ہے اور آپ پردے پر ارتکاز کرتے ہیں۔ آپ کی ساری توجہ اسی کی طرف ہوتی ہے۔ جب فلم شروع ہوتی ہے تو آپ تھوڑی دیر بعد اس ماحول میں پہنچ جاتے ہیں جو ہدایت کار نے آپ کے لیے منتخب کیا ہے۔ اسی لیے اس کا ٹیمپو تیز ہوتا ہے۔ ہدایت کار کو ڈھائی گھنٹے میں اپنی بات مکمل کرنا ہوتی ہے۔ دوسری طرف ٹیلی ویژن آپ کے گھر میں رکھا ہوتا ہے۔ آپ ٹانگیں اوپر کر کے لیٹے یا بیٹھے ہوتے ہیں۔ چاروں طرف روشنی ہو رہی ہوتی ہے۔ آپ اپنے کام نمٹا رہے ہوتے ہیں اور ٹیلی ویژن بھی دیکھ رہے ہوتے ہیں۔ چنانچہ ٹیلی ویژن کا ٹیمپو سست ہونا چاہیے تاکہ بات سمجھ میں آجائے۔

فلم 'ڈاکٹر ژواگو' کے بارے میں آپ کو دلچسپ بات بتاؤں کہ ایم جی ایم کا ادارہ فلم کو جلد ریلیز کرنا چاہتا تھا اس لیے ہدایت کار ڈیوڈ لین پر دباؤ تھا کہ وہ اپنا کام جلد ختم کرے اور آسکر ایوارڈ کی تقریب سے پیشتر اسے ریلیز کرنے کی اجازت دے دے۔ ڈیوڈ لین جہاں زبردست ہدایت کار ہے وہاں ایک بے مثال فلم ایڈیٹر بھی ہے۔ اس نے فلم کو جلدی سے کاٹ چھانٹ دیا۔ فلم ریلیز ہوئی تو لوگوں کو پسند نہیں آئی۔ اس کے پریمیر پر ڈیوڈ لین بھی موجود تھا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ عمر شریف مجھ سے غلطی ہوگئی ہے۔ میں نے فلم کو غلط طریقے سے کاٹ چھانٹ دیا ہے۔ فلم کی رپورٹ غلط تھی۔ لین نے اسے اسٹوڈیو جا کر دوبارہ اسکرپٹ سے ملا کر جوڑا اور جوڑا پھر نیا پرنٹ نکلوا کر تھیٹرز میں بھیجا تو لوگوں کی رائے تبدیل ہوگئی۔ بتدریج دیکھنے والوں کا رش بڑھنے لگا۔ تنقید نگاروں نے اسے صدی کی بہترین فلم قرار دیا۔ آپ کسی بھی لمحے چوک جائیں تو صورتِ حال کچھ سے کچھ ہو جاتی ہے۔

☆☆☆

عمر شریف ایک تاریخ بن چکا ہے۔ اس نے تقریباً 60 فلموں، متعدد ٹیلی ویژن فلموں، تھیٹر ڈراموں اور اسٹیج شوز میں کام کیا ہے۔ اس کی فلموں میں 26 مصری اور 2 فرانسیسی فلمیں شامل ہیں۔ قاہرہ میں اس نے اپنی پروڈکشن بھی کی اور کئی فلمیں بنائیں لیکن ذاتی پروڈکشن میں فلاپ فلموں کی تعداد کامیاب فلموں سے زیادہ ہے۔

وہ جلد ہی ایک ایرانی فلم 'سینٹ پیٹرز برگ' میں کام کرے گا، جس کا ہدایت کار کمال تبریزی ہوگا۔ کمال اس سے پہلے کئی فلموں کی ہدایت دے چکا ہے اور ملک میں مشہور و مقبول ہے۔ فلم کا منظر نامہ پیمان قسمخانی نے لکھا ہے۔ اس کا ان دنوں انگریزی میں ترجمہ ہو رہا ہے جو عمر کو بھیجا جائے گا۔ یہ دھوکے بازوں کی کہانی ہے جو ایران کے خلاف سرگرم عمل ہیں۔ یہ فلم روس اور ایران کے اشتراک سے بنائی جائے گی۔

عمر کا کہنا ہے کہ ایرانیوں کے ساتھ کام کرنا میرے لیے کوئی نئی بات نہیں ہے۔ میں اس سے پہلے 1966ء میں رضا شاہ پہلوی کے عہد میں 'یو پی از آلسو اے فلاور' میں کام کر چکا ہوں۔ اس فلم کی شوٹنگ شیراز، اصفہان اور تہران میں کی گئی تھی۔ یہ فلم بین الاقوامی منشیات فروشی کے بارے میں بنائی گئی تھی۔

☆☆☆

نہ معلوم کس نے نیٹ سے یہ خبر اُڑا دی کہ دنیا کا سب سے زیادہ معاوضہ لینے والا فن کار عمر شریف 13 نومبر 2013ء کو انتقال کر چکا ہے۔ اس کے چاہنے والوں نے جب اس بارے میں استفسار کیا تو معلوم ہوا کہ یہ خبر غلط ہے۔ عمر شریف نے اس خبر پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ نیٹ اب بھروسے کے قابل نہیں رہا ہے۔

مجذوبِ اردو

وہ اردو کے بڑے ادیبوں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اس کے الفاظ گھنگرو کی طرح بجتے تھے مگر جراح کے نشتر کی طرح معاشرے کے زخموں کو ادھیڑتے بھی تھے۔ اس قلمکار کو خراجِ تحسین کی خاطر ایک مختصر سی تحریر۔

محمد ایاز راہی

منٹو کے فن کا مختصر سا جائزہ

گاڑی مختلف جگہوں سے سواریاں لیتی اتارتی لاہور شہر کی سڑکوں پہ اپنی چال چل رہی تھی لیکن میرا رہوارِ خیال تیز بہت تیز بگٹٹ بھاگ رہا تھا۔ تصورات کا بے پناہ ہجوم اشہبِ خیال کو بے طرح سراسیمہ کیے دے رہا تھا۔ دماغ بھنور میں پھنسی کشتی کی طرح چکرا رہا تھا۔

منٹو، تانگے پر بیٹھے سفر میں ہیں مگر توسنِ خیال و قلم سموچا ان کی مضبوط گرفت میں ہیں۔ مجال ہے جو ذرا سا بھی اِدھر اُدھر ہو پائیں۔ ہرگز نہیں۔ کسی بھی صورت نہیں۔ خامہ و تخیل پر اس قدر قدرت۔ ایسی دسترس ۔۔ وہ اقتدار کہ پاؤں پاؤں چلتا اردو افسانہ ایک ہی جست میں ثریٰ کی پستی سے ثریا کی بلندی تک جا پہنچتا ہے۔ اللہ اکبر، مورِ بے مایہ کو ہم دوشِ سلیمان کرنے کا معجزہ جنم لیتا ہے۔ تانگے کے مختصر سے سفر میں صدیوں پہ بھاری افسانہ منٹو تخلیق کرتے ہیں۔ اللہ اللہ! آمد سے بھرپور۔ فی البدیہہ افسانے بھی اس قدر مکمل۔ بہ قول ممتاز شیریں "ٹھنڈا گوشت" اتنا گتھا ہوا، چست اور مکمل افسانہ ہے کہ اس میں ایک لفظ بھی گھٹایا یا بڑھایا نہیں جاسکتا۔ زندگی، زندگی، زندگی۔ منٹو کے ہاں زندگی ہے اور زندگی منٹو کے ہاتھوں ڈھل کر افسانے بن جاتی ہے۔

میں 'بھٹکا ہوا راہی' تصور میں منٹو کا ہم راہی بنا اس تانگے کے پیچھے پیچھے بھاگ رہا تھا۔ سعادت حسن منٹو۔

جب اردو افسانے کے سر پر ہاتھ رکھتے ہیں (درحقیقت سر اور پر عطا کرتے ہیں) تو نہ صرف پہلے سے موجود لکھاری بے دست و پا ہو کے رہ جاتے ہیں بلکہ آیندہ آنے والے قلم کار بھی منٹو کے آگے سر جھکائے بے بس دکھائی دیتے ہیں۔ علامہ راشد الخیری سے لے کر پروفیسر حسن عسکری اور مستقبل کے تمام کہانی کار حیرت سے تصویر بنے نظر آتے ہیں۔ اوپندر ناتھ اشک بے سوچے سمجھے منٹو کے مقابل آتے ہیں اور منٹو کے رنگ میں لکھنے کی کوشش پر منہ کی کھاتے ہیں...... منٹو، جن کے سینے میں افسانہ نگاری کے تمام اسرار و رموز موج زن ہیں۔ اسی لیے تو ایک مباحثے کے دوران منٹو نے کہا تھا کہ ایک تاثر کا، خواہ وہ کسی کا ہو، اپنے اوپر مسلط کر کے اس انداز سے بیان کر دینا کہ وہ سننے یا پڑھنے والے پر بھی وہی اثر کرے افسانہ ہے۔ لاریب کہ منٹو جھوٹے افسانے کا سچا آدمی تھا تبھی تو اس کی انا بدنامِ زمانہ انا ٹھہری۔ مادے پر ذہن کی فتح یعنی فن کے ذریعے موت پر قابو پانا۔ سو، منٹو کی فنی عظمت کے آگے موت بھی شکست خوردہ اور روسیاہ نظر آتی ہے۔ منٹو اپنے اس دعوے پر پورا اترتے ہیں کہ سعادت حسن تو مر سکتا ہے منٹو نہیں۔

میرے اس موجودہ سفر کا اختتام لاہور میانی صاحب

کے قبرستان میں منٹو مرحوم کی تربت پہ ہونا تھا...... بہ قول منٹو ان کے کشمیری آباؤاجداد اتنے تخیر کہ ترازو (من ٹوؤو) کے ذریعے لوگوں میں سونا چاندی برابر تقسیم کرتے تھے اور سعادت حسن منٹو کا قلم معاشرے کے ناسور میں ترازو ہوتا ہے۔ ایک سچے معالج کے نشتر کی مانند جراحی کرتا ہے۔ اس کی تجربہ کار نظر ہمیشہ بیمار معاشرے کے پھوڑوں اور کوڑھ پر ہی پڑتی ہے کہ وہ مریض سے نفرت نہیں کرتا۔ چنانچہ اس کے بیشتر کردار معاشرے کے ٹھکرائے ہوئے مردود لوگ (طوائفیں اور دلال) ہی ہوتے ہیں۔ منٹو بہرحال ڈاکٹر نہیں ہے لہٰذا اس کا کام صرف مرض کی نشاندہی ہی ہوسکتا ہے۔ منٹو برے سے برے آدمی میں بھی نیکی کی رمق دیکھ اور محسوس کرلیتا ہے۔ سو اسی فطری نیکی (انسانیت) کو ابھارنے کا نمایاں کام کرتا ہے۔ منٹو مرحوم کی سب سے نمایاں اور سچی نقاد ممتاز شیریں مرحومہ کے بہ قول زندگی صرف حادثات، واقعات اور ٹھوس تجربات پر مشتمل نہیں ہوتی۔ کسی فرد کی حیاتیاتی اور ذہنی نشوونما، کردار اور رویّے میں غیر محسوس تبدیلی، سیاست اور دوسری تہذیبوں کا اثر، مذہب و اخلاق کا تصور، زندگی ان سب کا مرکب ہے۔ اس قول کی روشنی میں دیکھا جائے تو منٹو کے افسانے زندگی کی سچی اور منہ بولتی متحرک تصویریں دکھائی دیتی ہیں جو پڑھنے سے کہیں زیادہ محسوس کرنے کی چیزیں ہیں۔ جن میں ہر پڑھنے والے کو اپنی ہی خامیاں اور کمزوریاں کلبلاتی نظر آتی ہیں۔ اب یہ قاری اور معاشرے پر منحصر ہے کہ وہ اپنی خامیوں بلکہ رستے زخموں کا علاج کرتا ہے یا پھر جھوٹی لذت کے لیے چڑیا نوچن کا وتیرہ اپناتا ہے۔ منٹوؤو کا کام صرف نشاندہی کرنا ہے کہ وہ سچا ادیب اور زندگی کا عکاس ہے۔

میں چوبرجی اترا اور پاپیادہ گورستان میانی صاحب کی طرف چل پڑا۔

آہ! میانی صاحب کا قبرستان۔ اِک شہرِ خموشاں مگر میرے لیے یک شہرِ آرزو کہ میں یہاں کی بہت سی نادرِ روزگار شخصیات کو پھر سے زندہ دیکھنا اور سننا چاہتا تھا۔ ان ہونی کا خواہاں اور اربابِ علم وہنر کی دید کا تمنائی تھا۔ پہلو میں اک قطرۂ خوں، ذرے اتنا شوخ وشریر دل ربِّ ارِنی۔ ربِّ ارِنی جیسی رٹ لگائے مچل رہا تھا۔ میں نے اندر قدم رکھا تو دور تک پھیلے چھوٹے بڑے مزارات سیپیوں کی مانند لگ رہے تھے۔ اللہ رحمان ورحیم کی بے پایاں رحمت ہی میرا کل اثاثہ اور ایمان کی بنیاد ہے۔ سو ہر قبر مجھے جنت کا نمونہ دکھائی پڑتی تھی اور مجھے اس گوشۂ فردوس کی تلاش تھی جسے منٹو آباد کیے ہوئے تھے۔ دیر تک ڈھونڈا کیا، یہاں وہاں بھٹکا کیا لیکن کوئی سراغ نہ نشان نہ پتا۔ اک دکھ بھری حیرت تھی کہ بڑھتی ہی جارہی تھی یاللعجب۔ بے قدری اور غفلت کا یہ عالم۔ اہلِ اقتدار اور قوم کی بے رخی اس عبقری کے ساتھ کہ جس نے اردو ادب کو بامِ عروج پر پہنچایا، ہیشگی بخشی۔ میرا رب اسے تخلیقی نعمتوں سے مالا مال فرماتا ہے اور میرے ہم جنس اسے عمر بھر ٹھوکروں پہ رکھتے ہیں بعد از مرگ بھی اسے اس کا حق (پہچان) نہیں دیتے۔ اے دنیائے دوں، تفو بادبر فلکِ واژگوں۔ کیا کہوں کیا نہ کہوں کیا کوسوں کیا کہہ کر کوسوں؟ روحانی مزارات تو علم ودانش اور عقیدت مندوں میں گھرے لیکن ایک نابغہ روزگار (منٹو) کی تربت اندھی بیگانگی کی زد میں۔ جس کسی سے بھی پوچھا وہ خالی نظروں سے دائیں بائیں سر ہلا کے رہ گیا۔ ایک شخص نے جنازگاہ دفتر کی راہ بھائی۔ وہاں پہنچا تو آخر سراغ مل ہی گیا کہ پرانے قبرستان میں بڑا مکان جہاں گورکن بیٹھتے ہیں وہاں قریب ہی آپ کا مطلوبہ مزار ہے۔ مزید کچھ بھاگ دوڑ رنگ لائی۔ سعادت حسن منٹوؤو مرحوم ومغفور کا مزار سامنے تھا۔ حالانکہ دورانِ تلاش دو تین بار یہاں قریب سے میں گزر چکا تھا۔ ذہن قدرے یکسو ہوا تو السلام علیکم یا اہلِ القبور کے دعائیہ کلمات خود بہ خود ہونٹوں سے ادا ہوگئے۔ میں نے ادب واحترام کی عبا اوڑھی اور آہستہ آہستہ چلتا مزار کے پہلو میں جا کھڑا ہوا۔ میں دو بڑے تخلیق کاروں کے رُوبہ رُو تھا۔ ایک وہ جو ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا دوسرا وہ جو مختصر مدت کے لیے اس جہانِ رنگ وبو میں آیا اور ہمیشہ کے لیے اپنا رنگ جما کے چلا گیا۔ دیر تک مجھ پر بے خودی طاری رہی۔ آنکھیں بار بار نم ہوتی رہیں۔ ذہن اور دل عقیدت سے مملو رہے۔ آخرش میں نے دعا کے لیے ہاتھ بلند کیے تو یکبارگی دل پھر مچل اٹھا۔ قم باذنِ اللہ کی شوخ تکرار اور قم باذنی کی جراتِ رندانہ پر بہ ضد ہوا۔ نگاہ اٹھائی تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے موجود ہوتے ہوئے بھی یہ پاپی دل قم باذنِ اللہ کی برکت کا اہل نہ تھا اور دائیں بائیں شاہ شمس تبریزیؒ کی روح بھی قم باذنی کی تائید کے لیے موجود نہیں تھی۔

وصالِ یار فقط آرزو کی بات نہیں۔

قم باذنِ اللہ اور قم باذنی کے لیے تو اللہ کی کامل رضا شرطِ اولین ہے۔ اردو ادب کا مجذوب جس کی بظاہر فحش تحریریں دراصل بیمار معاشرے کی تن درستی اور خیر خواہی کا استعارہ ہیں۔

منٹو اور مزارِ منٹو کو واضح پہچان دینا ہم سب کا فرض بلکہ ناخن کا قرض ہے۔

اصلی ہیرو

شکیل ادریس

حادثات ہوتے ہیں، یہ زندگی کا حصہ ہیں۔ انہیں کوئی روک نہیں سکتا۔ اس کے علاقے میں بھی ایک حادثہ ہوا جس نے اسے شہرت کی بلندیوں پر پہنچادیا اس لیے کہ اس نے عزم وحوصلے کی بھرپور کوشش کی تھی۔ اس نے اپنی جان داؤ پر لگائی اور جلتے ہوئے ٹرالر میں گھس کر ایک کارنامہ سا انجام دیا۔

بھڑکتے شعلوں میں جان کی بازی لگانے والے کا تذکرہ

25 سالہ جم سینیز لکڑی کے گودام میں کام کرتا تھا۔ جب وہ ڈیوٹی سے آیا تو بچوں کے ساتھ کھانا کھا کر سو گیا۔ یہ نومبر 1988ء کی ایک سرد رات تھی۔ جم کی آنکھ نصف شب کے قریب کھل گئی تو اسے یاد آیا کہ اس نے اپنے کتے ہرکولیس کو اب تک اس کے "مکان" میں بند نہیں کیا، لہٰذا وہ بستر سے اٹھ گیا۔ ہرکولیس بستر کے نیچے ہی لیٹا ہوا تھا۔ آہٹ پاکر کوں کوں کرنے لگا۔ "آؤ اب میں تمہارے لیٹنے کا انتظام کردوں۔" وہ بڑبڑانے والے انداز

میں بولا۔ اس کی بیوی اور دونوں بچے برابر والے بستر پر محو خواب تھے۔

جم دروازہ کھول کر لان میں گیا اور گھنٹے کے مکان کے قریب پہنچا تو اس نے ایک تیز آواز سنی۔ جم نے اندازہ لگایا کہ وہ کوئی تیندوا ہو سکتا ہے، جو نزدیکی جوہڑ پر پانی پینے آیا ہوگا۔

وہ تذبذب میں مبتلا تھا کہ اس نے نصف میل کے فاصلے پر چند مکانات سے شعلے اٹھتے دیکھے۔ اس نے عجلت میں ہرکولیس کو اس کے مکان میں بند کیا اور دوڑ کر اندر گیا تاکہ اپنی بیوی ٹونی کو اس سے آگاہ کر سکے۔ اسے نیند سے بیدار کرنے کے بعد اس نے کہا۔ ”فائر ڈیپارٹمنٹ کو فون کرو اور انہیں بتاؤ کے مل ٹاؤن میں آگ لگ گئی ہے۔“

اس کے بعد چند ہی سیکنڈ میں جم نے کار پورچ میں پہنچ کر کار اسٹارٹ کی اور سڑک پر آ گیا۔ تھوڑی دیر بعد منظر اس کی آنکھوں کے سامنے آ گیا۔ شعلے گشتی مکانات (کاروان) کی طرف سے اٹھ رہے تھے۔ ایسے گشتی مکانات امریکا بھر میں سفر کرتے رہتے تھے اور جہاں مناسب سمجھتے تھے ٹھہر جاتے تھے۔ ان کے لیے علیحدہ پارکنگ کا باقاعدہ انتظام ہر ریاست میں تھا۔ انہیں بجلی اور سیوریج کی سہولت مہیا کی جاتی تھی، تاکہ شہر میں غلاظت پھیلنے کا احتمال نہ رہے۔

بھڑکنے والے شعلوں کی وجہ سے سڑک سرخ ہو رہی تھی۔ دھوئیں کے مرغولے چکراتے پھر رہے تھے۔ جم نے کار کو ایک مناسب جگہ پر کھڑا کیا اور دروازہ کھول کر اتر آیا۔ فضا میں پھیلے ہوئے دھوئیں کی بنا پر اسے کھانسی آنے لگی اور آنکھوں سے پانی بہنے لگا۔ جب وہ رومال سے آنکھیں صاف کرتا ہوا وہاں پہنچا تو اس نے 70 فٹ لمبے ایک گشتی مکان (کاروان) سے شعلے اٹھتے دیکھے۔ شعلے تقریباً تیس فٹ بلند تھے۔ مکان کے سامنے ایک عورت شب خوابی کے ملگجے لباس میں بدحواسی میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک دوڑ رہی تھی۔ اس کے چہرے پر اضطراب اور بے چینی تھی۔ وہ چیخ رہی تھی اور مدد کے لیے پکار رہی تھی، لیکن ابھی تک غالباً اس کی آواز کسی نے نہیں سنی تھی۔ جم نے دیکھا کہ وہ گشتی مکان کی کھڑکی توڑنے کی کوشش کر رہی ہے، تاکہ مکان کے اندر بھرا ہوا دھواں صاف ہو جائے اور اندر جو لوگ موجود ہیں ان کی جانیں بچ سکیں، لیکن اس تک اس کا ہاتھ نہیں پہنچ پا رہا تھا کیونکہ کھڑکی چھ فٹ بلند تھی۔ ”اے خدایا! رحم۔“ وہ گلوگیر آواز میں چیخنے لگی۔ ”میرا خاندان زندگی سے ہاتھ دھونے والا ہے۔“

جم خود بھی رنجیدہ تھا، اس لیے کہ وہاں دور تک کوئی نہیں تھا جو اس کے علاوہ اس عورت کے خاندان کی جان بچاتا۔ کاش کہ کوئی اور بھی ہوتا جو اس کی مدد کر سکتا۔ اس کا دل کانپ رہا تھا اس لیے کہ اس نے اپنی زندگی میں اتنی خوفناک آگ کبھی نہیں دیکھی تھی۔ اس نے محسوس کیا جیسے اس کی آنکھیں شعلوں کی حدت سے جل رہی ہوں۔

مکان کی آخری کھڑکی کا شیشہ ٹوٹا ہوا تھا اور دھوئیں کے مرغولے کمرے سے نکل کر آسمان کو چھونے کی کوشش کر رہے تھے۔ لکڑی جلنے سے چیخ رہی تھی۔ جم نے اس عورت کا بازو تھام کر اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرائی اور پوچھا۔ ”تمہارے خاندان کے افراد کہاں ہیں؟“

اس عورت کا نام سنڈی تھا۔ اس کے چہرے پر دہشت تھی اور وہ پسینے میں ڈوبی ہوئی تھی۔ اس نے بولنا چاہا، لیکن آواز اس کے حلق سے نہ نکل سکی۔ ہونٹ کپکپا کر رہ گئے۔ عذاب ناک لمحات گزر رہے تھے اور موت کا آہنی ہاتھ اس کے خاندان کو اپنی گرفت میں لینے کے لیے بے قرار تھا۔

”وہ لوگ کہاں ہیں؟“ جم نے ایک بار پھر اسے جھنجوڑ کر پوچھا۔

سنڈی نے اسے بتایا کہ جب آگ لگی تو وہ اپنی جان بچا کر خواب گاہ کی کھڑکی سے باہر نکل آئی۔ اس کا شوہر لیونارڈ اپنے دو بچوں کو بچانے کے لیے خواب گاہ کی طرف گیا، اسے خواب گاہ کی کھڑکی سے ان دونوں بچوں کو اس کے حوالے کرنا تھا، لیکن اس اثنا میں کچن میں آگ پھیل گئی اور ڈرائنگ روم کی کھڑکیوں تک جا پہنچی۔ معلوم نہیں کیا ہونے والا تھا۔ اتنا بتا کر سینڈی پھر آہ و بکا کرنے لگی۔

”اندازہ لگا کر بتاؤ کہ تمہارا شوہر اب کہاں ہوگا؟“ جم نے پوچھا۔

سنڈی نے مکان کے آخری حصے کی طرف اشارہ کیا جہاں سے کثیف دھوئیں کے مرغولے کھڑکی سے نکل کر..... فضا کو دھندلا رہے تھے۔

جم کو اچھی طرح سے یاد تھا کہ جب وہ اسپورٹس مین تھا تو وہ آسانی سے ہار نہیں مانتا تھا اور جیت حاصل کرنے کے لیے جدوجہد کیا کرتا تھا۔ اس نے قصبے کی چیمپئن شپ حاصل کرنے کے لیے کئی بار سرتوڑ کوشش کی تھی۔ اسی لیے قصبے کے لوگ اس کا احترام کیا کرتے تھے۔

ایک بار ہائی اسکول میں فٹ بال کھیلتے ہوئے جم کے بائیں گھٹنے میں ایسی چوٹ لگی تھی کہ ڈاکٹر نے کہہ دیا تھا کہ اس سال وہ کوئی میچ نہیں کھیل سکے گا۔ اس کے گھٹنے کا آپریشن ہوا

اور پھر اس نے فیزیوتھراپی بھی کرائی، اس کے بعد کھیل میں حصہ لیا اور چیمپئن شپ جیت کر لوگوں کا دل جیت لیا۔

اب وہ لوگوں میں ہیرو کی حیثیت سے جانا جاتا تھا۔ اس خوشی کے موقع پر اس کے باپ نے کہا تھا۔ ”خواہ مخواہ باتیں بنانے سے کوئی ہیرو نہیں بن جاتا، اس کے لیے عمل کی ضرورت ہوتی ہے۔ چنانچہ کوشش کرنا کبھی نہ ترک کرنا میرے بیٹے۔“

اپنے باپ کے الفاظ گویا جم کے دماغ میں منجمد ہو گئے۔ اب بھی وہی صورت حال تھی۔ اس کی قوت عمل بیدار ہو چکی تھی اور وہ اس چھوٹے سے خاندان کی زندگی بچانے کے لیے خود کو تیار کر چکا تھا۔ اس نے چھلانگ لگائی اور اس کھڑکی سے اندر چلا گیا، جس کا شیشہ ٹوٹا ہوا تھا۔

اندر بلا کی تاریکی تھی، اسے کچھ دکھائی نہ دیا۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اگلا قدم کیا اٹھانا چاہیے۔ اس نے سانس لینا چاہا، لیکن ہوا حلق کی نالی سے آگے نہ جا سکی۔ اس نے قوت لگا کر زور سے سانس اندر کو کھینچا تو کچھ ہوا اندر چلی گئی۔ اس نے ایک قدم آگے بڑھایا تو پاؤں اس شخص سے ٹکرائے جو کمرے کے وسط میں پڑا تھا۔ ”بچے! میرے بچے! خدایا مجھ پر رحم کر اور میرے بچوں کی جان بچا لے۔“ وہ اذیت ناک لہجے میں کراہا۔

اس کی التجا کے جواب میں بچوں کی دبی دبی سی آواز سنائی دی۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ کہیں نزدیک ہی ہیں۔

”تم لوگ کہاں ہو؟“ جم نے چیخ کر پوچھا۔

تاریکی میں آنکھیں پھاڑنے پر جم کو ایک سایہ حرکت کرتا دکھائی دیا۔ وہ جھک گیا تو کسی بچے نے اس کی گردن میں بانہیں ڈال دیں۔ جم نے اسے اٹھایا اور کھڑکی کی طرف جا کر اس کی ماں سنڈی کے حوالے کر دیا۔ بعد میں اس نے بتایا کہ اس لڑکے کا نام ریان ہے اور اس کی عمر صرف بائیس ماہ ہے۔

اب اسے انجیلا کو تلاش کرنا تھا جس کی عمر صرف ڈیڑھ ماہ تھی۔ اس کے بعد سنڈی کا شوہر لیونارڈ تھا۔

اس کمرے میں اس قدر کثافت پھیل چکی تھی کہ جم جب بھی سانس لیتا تو اسے زور لگانا پڑتا تھا۔ اپنے پھیپھڑوں پر اسے ناقابلِ بیان دباؤ برداشت کرنا پڑ رہا تھا۔ جم نے اپنی شرٹ اتار دی اور اسے منہ پر لپیٹ لیا۔ تاریکی اتنی بڑھ چکی تھی کہ اسے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ تاریکی میں اضافے کی وجہ کمرے میں بڑھتی ہوئی کثافت تھی۔ وہ بیٹھ گیا اور فرش کو ٹٹولنے لگا۔

تھوڑا آگے بڑھنے پر اس کے ہاتھ ایک شخص سے ٹکرائے، وہ نیم بے ہوش تھا اور گہرے گہرے سانس لے رہا تھا۔ جم نے اسے اٹھانے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ وہ شخص بہت بھاری تھا۔ پھر فرش سے براہِ راست کسی کو اٹھانا اور بھی دشوار ہوتا ہے۔ جم نے ہمت نہیں ہاری اور متعدد بار کوشش کی، لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ اس جدوجہد میں اس کے منہ پر بندھی ہوئی شرٹ کھل کر فرش پر گر پڑی۔

ایک بار پھر اس کا سانس حلق میں گھٹنے لگا۔ اس نے اندازہ لگا لیا کہ وہ بے ہوش ہو جائے گا، لہٰذا اس نے مڑ کر کھڑکی کا رخ کیا اور باہر چھلانگ لگا دی۔ تازہ ہوا کا جھونکا اس کے جسم سے ٹکرایا تو اسے اپنی توانائی لوٹتی محسوس ہوئی۔ پھیپھڑے اپنا کام کرنے لگے تھے۔ دماغ صاف ہو رہا تھا۔ سینے کی گھٹن دور ہو رہی تھی۔

بہرحال پریشانی اور مصائب پھر اسے اپنی طرف بلا رہے تھے۔ اسے دو جانوں کو سلامت رکھنے کے لیے کام کرنا تھا۔ نزدیکی مکان سے ایک شخص نکلا اور تیزی سے اس کی طرف آیا۔ اس نے لمحہ بھر میں صورتِ حال کا اندازہ لگا لیا اور کھڑکی کے راستے اندر چلا گیا، لیکن چند ہی ثانیوں بعد پھر اس کھڑکی سے واپس آ گیا۔ وہ بری طرح سے کھانس رہا تھا۔ کمرے میں بچی روتے روتے نڈھال ہو گئی تھی اور اب اس کی آواز آنا بند ہو چکی تھی۔

شعلے بدستور اٹھ رہے تھے اور دھوئیں نے فضا میں ایک چادر سی تان دی تھی، جس کے پار کوئی چیز نظر نہیں آ رہی تھی۔ جم کو وہ سناٹا بہت عجیب معلوم ہوا۔ اسے اپنی بیٹی اور بیٹا یاد آنے لگا۔ چار سالہ کرسٹل اور آٹھ ماہ کی اینا۔ وہ ایک لمحے کے لیے ہچکچایا۔ اس نے کان لگا کر اس بچی کی آواز سننا چاہی لیکن کوئی آواز اس کے پردۂ سماعت سے نہ ٹکرائی۔ البتہ اس کی ماں کی ہسٹریائی چیخیں اب بھی فضا میں گونج رہی تھیں۔

جم نے چند گہرے گہرے سانس لیے اور اس کھڑکی میں دوبارہ چھلانگ لگا کر کمرے میں چلا گیا۔ وہ ہاتھوں اور گھٹنوں کے بل گرا تھا۔ چند لمحوں کے لیے ساکت پڑا رہا اس کے بعد آگے سرکنے لگا۔ اس کے ہاتھ مختلف چیزوں سے ٹکرانے لگے۔ کپڑے لتے اور فرنیچر وغیرہ۔ اس کے بعد ان بچوں کا باپ لیونارڈ ٹکرایا۔ وہ بدستور بے ہوش تھا۔ جم کو رینگنے میں دقت محسوس ہو رہی تھی، اس لیے اس کا سانس پھر رکنے لگا تھا۔ وہ پلٹ کر کھڑکی کی طرف گیا اور لمبے لمبے سانس لیے اور پھیپھڑوں میں تازہ ہوا بھر کر واپس آ گیا۔

جم نے پھر چوپایوں کی طرح کمرے میں گھومنا شروع کر دیا اور ٹکرانا شروع کر دیا۔ وہ پاگلوں کی طرح اس بچی کو تلاش

کرر ہا تھا۔ "تم کہاں ہو انجیلا! کہاں ہو؟" وہ دل ہی دل میں کہہ رہا تھا۔ کشتی مکان میں حدت لحظہ بہ لحظہ بڑھتی جا رہی تھی۔ جم جانتا تھا کہ تھوڑی سی دیر کی بات ہے اس کے بعد وہ خود بھی ہوش و حواس سے بےگانہ ہوکر وہیں گر پڑے گا اور اس کے بعد بے رحم شعلے اس کشتی مکان کو اپنی لپیٹ میں لے لیں گے۔

وہ رینگتا ہوا لیونارڈ سے ٹکرایا تو اسے ٹٹولنے کے بعد پتا چلا کہ اس کی ٹانگیں ایک کرسی کے پایوں میں الجھی ہوئی ہیں۔ جم نے اس کی ٹانگیں کرسی کے پایوں سے نکال دیں۔ اب وہ پھر اسے کھڑکی کی طرف کھینچنے لگا۔ اس کے باپ کی ہدایت اس کی سماعت میں گونجنے لگی۔ "کسی بھی موقع پر ہمت نہ ہارنا۔ مسلسل جدوجہد سے ہی انسان کامیابی سے ہمکنار ہوتا ہے۔"

وہ سانس لینے کے لیے کھڑکی کی طرف آیا تو سنڈی نے اس کے ہاتھ میں ایک ٹارچ تھما دی۔ جم نے اس کی روشنی کمرے میں ڈالی تو لیونارڈ کے قریب ہی ایک بنڈل سا پڑا نظر آیا۔ وہ نزدیک گیا۔ اس بنڈل کو ٹٹولنے کے بعد معلوم ہوا کہ اس میں لیونارڈ کی بچی ہے۔ اس کا تنفس جاری تھا۔ "اوہ! یہ زندہ ہے۔" اس کے لبوں سے بے ساختہ نکلا۔

اس نے بنڈل کو اٹھا لیا اور کھڑکی کی طرف گیا جہاں ایک منٹ پیشتر ڈپٹی شیرف آچکا تھا۔ اس نے بچی اس کے حوالے کی اور پھر لیونارڈ کی طرف گیا۔ اس نے اندازہ لگا لیا تھا کہ یہی وہ لمحہ ہے جب اسے بچایا جا سکتا ہے، ورنہ پھر اس کی زندگی بچنے کا کوئی امکان باقی نہیں رہ جاتا تھا۔ اسی وقت ورنہ پھر کبھی نہیں۔

وہ لڑکھڑاتا ہوا لیونارڈ کے قریب گیا اور اس کی ٹانگیں پکڑ کر کھینچنے لگا۔ اس کا جسم گھسٹنے لگا۔ جم پسینے پسینے ہوگیا۔ جب وہ کھڑکی تک پہنچا تو ڈپٹی کے دو نائب بھی کمرے میں آچکے تھے۔ انہوں نے لیونارڈ کو تھام لیا اور سہارا دے کر کھڑکی سے باہر نکال دیا۔ اس کے بعد وہ سب باہر آگئے۔ جم سڑک پر لیٹ گیا۔ اس کا جسم پسینے سے شرابور تھا اور سر چکرا رہا تھا۔ اس نے گہرے گہرے سانس لیے تاکہ پھیپھڑوں میں گھسی ہوئی کثافت صاف ہو جائے۔ اس اثنا میں پولیس اور فائر بریگیڈ کی ایک اور گاڑی آگئی اور چند پولیس والے چیزوں کو ہٹانے لگے، تاکہ شعلے انہیں خاکستر نہ کردیں۔

سنڈی نے جم کے قریب پہنچ کر اس کا سر اٹھا کر اپنے زانوؤں پر رکھ لیا۔ "خدا تمہیں سلامت رکھے۔" اس نے کہا اور جم کی دائیں آنکھ کے قریب لگے ہوئے زخم کو صاف کرنے لگی۔

اس کے شوہر کو پولیس والوں نے اپنی گاڑی میں ڈال کر اسپتال لے جانے کی تیاری شروع کردی تھی۔ جم نے ایک گہرا سانس لیا اور اٹھ کر اپنی کار کی طرف بڑھنے لگا۔ اس کے پاؤں سڑک پر اچھی طرح سے نہیں پڑ رہے تھے۔ وہ لڑکھڑا رہا تھا۔ رات کے ساڑھے بارہ بج چکے تھے۔

اس کی کار کی ہیڈ لائٹس اور اگنیشن آن تھے۔ اس نے کار کو دھکیلا تو وہ اسٹارٹ ہوگئی۔ جم نے اسپتال کا رخ کیا تاکہ پھیپھڑوں کی صفائی کرا سکے۔ اسپتال میں اس کے زخموں پر بینڈیج باندھ دی گئی اور آکسیجن دے کر پھیپھڑے صاف کر دیے گئے۔ جب وہ ابتدائی طبی امداد لے کر گھر پہنچا تو اس وقت رات کے تین بج رہے تھے۔

سنڈی اور اس کے بچوں کو بھی اسپتال لے جایا گیا جب کہ اس کے شوہر کو ہیلی کاپٹر کے ذریعے ساٹھ میل دور واشنگٹن پہنچایا گیا۔

دوسرے دن کے اخبارات نے جم کے کارنامے کو سراہا اور اسے "ہیرو" قرار دیا۔ علاقائی ٹیلی وژن نے اس کا انٹرویو لیا اور ہر گھنٹے کے بعد اسے نشر کیا۔ قصبے کے لوگوں نے سوختہ خاندان کے لیے کھانے اور رہائش کا انتظام کیا۔ ایک مخیر شخص نے انہیں اپنا مکان رہائش کے لیے دے دیا تھا۔ لیونارڈ کے ساتھ کام کرنے والوں نے کرمس فنڈ میں سے اسے تیس ہزار ڈالر دیے۔

دو ہفتوں کے بعد لیونارڈ کی... حالت درست ہوگئی۔ اسے واضح طور دکھائی دینے لگا۔ اس کے پھیپھڑوں میں جو کثافت داخل ہو چکی تھی وہ بھی اسپتال والوں نے صاف کر دی۔ اب وہ آکسیجن ماسک کے بغیر سانس لینے پر قادر تھا۔ جب وہ صحت یاب ہوکر گھر آیا تو اس نے جم کے پاس جا کر اس کا شکریہ ادا کیا۔

ایک ماہ بعد اس واقعہ کی سادہ سی تقریب منائی گئی اور جم کو اس کے کارنامے پر شہری انتظامیہ کی طرف سے سونے کا تمغا عطا کیا گیا۔ اس موقع پر لیونارڈ اور اس کا خاندان بھی موجود تھا۔ اس نے جم کو ایک بار پھر سینے سے لگا کر اس کا شکریہ ادا کیا۔ جم نے اسے بتایا کہ وہ کوئی بڑا حوصلہ مند شخص نہیں ہے، یہ اس کے والد کی رہنمائی اور ہدایات تھیں جن کی روشنی میں آج وہ اس قابل ہو سکا کہ کسی کی جان بھی بچا سکے۔ یقیناً ان کی رہنمائی اور درس ساری زندگی اس کے لیے مشعلِ راہ بنی رہے گی۔

ترکی کے سفر کی دلچسپ روداد، سفر کہانی کی بارھویں کڑی

علی سفیان آفاقی

سرگزشت کا خاصہ ہے کہ دلچسپ اور انفرادیت کے حامل سفرنامے پیش کرتا ہے۔ جو صرف سفرنامہ نہیں معلومات کا خزانہ بھی ثابت ہوتا ہے۔ سرگزشت کے مستقل قلمکاروں میں علی سفیان آفاقی جیسے کہنہ مشق قلمکار بھی ہیں۔ عرصے سے قارئین اصرار کناں تھے کہ ان کے سفرنامے دوبارہ پیش کیے جائیں۔ پاک فلم نگری کو جب عروج حاصل تھا اور علی سفیان آفاقی فلم یونٹ کے ساتھ ملکوں ملکوں جایا کرتے تھے اس دور کے قصے تو وہ بیان کرہی چکے ہیں لیکن جب جب سفر برائے شوق کیا اس دور کے قصے بھی کم دلچسپ نہیں' وہی کچھ سنا رہے ہیں۔ الفاظ کی نشست وبرخواست، جملوں کی خوبصورت ادائیگی اور روانی بہت کچھ آپ اس سفر کہانی میں پائیں گے۔

اپنی چھتری پر آرام سے پیر پھیلائے بیٹھے ہوئے چھتری والے ترک سب کو مسکرا کر دیکھ رہے تھے، انہوں نے جہاز کے عرشے پر بیٹھے ہوئے تمام لوگوں کو خاصا متاثر کیا تھا۔

بٹ صاحب نے کہا۔ "یہ تو جادو کی چھتری معلوم ہوتی ہے۔"

بٹ صاحب نے مرزا مشرف سے کہا۔ "ان سے پوچھیے کیا اس کی مدد سے ہم سمندر میں تیر سکتے ہیں؟"

"جی نہیں۔ مگر آپ خطرے کی صورت میں اس کو

ہتھیار کے طور پر استعمال کرسکتے ہیں۔ اگر تھک گئے ہوں اور آس پاس بیٹھنے کے لیے کوئی جگہ نہ ہو تو اس چھڑی پر آپ آرام سے بیٹھ سکتے ہیں۔ یہ دیکھیے جس طرح میں بیٹھا ہوں۔ ایک چھڑی سے آپ اور کیا توقع کرسکتے ہیں؟ یہ چھڑی کئی ٹکڑوں میں ہے۔ اس لیے اس کو کھول کر مختلف انداز سے استعمال کیا جاسکتا ہے۔ اور یہ دیکھیے۔ اس میں ایک ٹارچ بھی ہے۔ جب آپ اس گولے کو گھمائیں گے تو یہ ٹارچ روشن ہوجائے گی۔" انہوں نے گولے کو گھما کر ٹارچ روشن کردی۔

ہم نے کہا "بھئی یہ تو بڑی مکینیکل چھڑی ہے۔ اس کا استعمال کرنے کے لیے کوئی سائنسدان ہی مناسب ہوگا۔ ہم جیسے اناڑیوں کے لیے تو یہ بہت پیچیدہ کام ہے۔"

ایک ترک خاتون چھڑی ساز سے دریافت کررہی تھیں کہ کیا اس چھڑی کو ہم سمندر میں تیرنے کے لیے استعمال کرسکتے ہیں؟" اگر میں یہ چھڑی لے کر سمندر میں کود جاؤں تو کیا ہوگا؟"

"آپ، ڈوب جائیں گی۔ اگر آپ کو تیرنا آتا ہے تو بچ جائیں گی مگر یہ چھڑی تیرنا نہیں جانتی سو ڈوب جائے گی۔"

اتنا کہنے کے بعد انہوں نے چھڑی فروخت کرنے کا اعلان کردیا۔ ہمارے ساتھیوں کو اس چھڑی میں کوئی دلچسپی نہیں تھی مگر ہم نے ایک چھڑی خرید لی۔ اور کچھ تو کر نہیں سکتے تھے مگر گولہ گھما کر دیکھا تو واقعی ٹارچ روشن ہوگئی۔ ہم نے سوچا کہ چھڑی فروش نے اس چھڑی کی جو خوبیاں بتائی ہیں وہ بھی شاید درست ہوں گی۔ دیکھتے ہی دیکھتے پندرہ بیس چھڑیاں فروخت ہوگئیں۔

ہم نے مرزا اشرف سے کہا۔ "ان سے کہیے کہ پرچہ ترکیب استعمال بھی اس کے ساتھ دینا چاہیے کیونکہ یہ خاصا مشکل کام ہے۔" ہمارا یہ مشورہ سن کر وہ مسکرائے اور بولے۔ "آپ اگر ایک بار اس کو استعمال کریں گے تو سب کچھ سمجھ جائیں گے۔"

ان صاحب نے چھڑی فروخت کرنے کے قصے میں کافی وقت ضائع کردیا جس کی وجہ سے ہم سمندر کی خوبصورتی سے لطف اندوز نہ ہوسکے۔ سمندر کے پرندے جنہیں سی گل کہا جاتا ہے ہمارے بجرے کے ساتھ ساتھ چل رہے تھے۔ کبھی وہ سمندر کی سطح پر بیٹھ کر آس پاس کا نظارہ کرتے۔ کبھی سمندر سے چند انچ اوپر پرواز کرتے اور کبھی اپنی چونچ سے سمندر کی کوئی چھوٹی سی مچھلی ہضم کرجاتے۔ سمندر اور سی گل لازم و ملزوم ہیں۔ یہ سمندر ہی کے گہرے نیلے رنگ کے سمندر کی سطح پر اترتے اور اٹھکیلیاں کرتے ہوئے یہ... پرندے سمندری سفر کا حسن ہیں۔ انہیں بحری جہاز کے گرد غوطے لگاتے ہوئے دیکھ کر ایک عجیب قسم کی مسرت اور سکون محسوس ہوتا ہے۔ ہم نے بہت کم مختصر سمندری سفر کیے ہیں اور پانی سے ڈرنے کے باوجود سمندر ہمارے لیے ہمیشہ خوشی کا سبب بنتے ہیں۔ حدِ نظر تک پھیلا ہوا سمندر اور اس پر بھیگی ہوئی ٹھنڈی ہوا، تھکے سے تھکے انسان کو بھی تازہ دم کردیتی ہے۔

بٹ صاحب بدستور اس فکر میں غرق تھے کہ جس شخص نے یہ چھڑی بنائی ہے وہ بہت سی دوسری کارآمد چیزیں بھی بنا سکتا ہے۔

"مثلاً کیا؟" خان صاحب نے سوال کیا۔

بولے "مثلاً پانی میں چلنے والی چھڑی۔"

خان صاحب نے انہیں چھیڑا۔ "تو یہ کام آپ خود کیوں نہیں کرتے۔ آپ کو بھی اللہ نے عقل دی ہے۔ آپ کو تو دوگنا عقل دی ہے۔"

"وہ کیسے؟"

"وہ ایسے کہ ایک عقل آپ کو کشمیری ہونے کی وجہ سے ملی ہے اور دوسری "بٹ" ہونے کی وجہ سے۔ آپ اپنی ان دونوں خوبیوں پر فخر کرتے ہیں نا؟"

"کیوں نہ کریں۔ دنیا میں کشمیری اور بٹ بہت تھوڑے ہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے انہیں بہت نوازا ہے۔"

ہم نے کھڑکی میں سے جھانک کر دیکھا۔ بجرے کی رفتار کم ہوگئی تھی اور کچھ فاصلے پر ایک جزیرہ نظر آرہا تھا۔

"لیجیے، ڈائمنڈ آئی لینڈ آگیا۔"

مرزا اشرف نے کہا۔ "یہ ڈائمنڈ آئی لینڈ نہیں ہے۔ وہ اس کے بعد آئے گا۔"

بجرا آہستگی سے رک گیا۔ سامنے ایک خوبصورت سفید رنگ کی عمارت نظر آرہی تھی۔ یہ بجرے سے ایک سو گز کے فاصلے پر تھی۔ جہاز میں سوار ہونے والوں اور جزیرے پر جانے والوں کے لیے درمیان میں پائپ کے ذریعے اس راستے کو تقسیم کردیا گیا تھا تاکہ آنے اور جانے والے ایک دوسرے سے علیحدہ رہیں۔ یہ ترکوں کے سلیقے اور نظم و ضبط کی ایک معمولی سی مثال تھی۔ ہمارے ملک میں منتظمین ان چھوٹی چھوٹی باتوں پر توجہ نہیں دیتے جس کی وجہ سے ایک ہڑبونگ

سی مچ جاتی ہے۔ آنے اور جانے والے ایک دوسرے کی راہ میں رکاوٹ بن جاتے ہیں۔

جن مسافروں کو پرنسز آئی لینڈ جانا تھا وہ بڑے سکون سے چلے گئے۔ بحری جہاز کے لیے اتنے ہی ٹکٹ جاری کیے جاتے ہیں جتنی کہ نشستیں خالی ہوتی ہیں۔ اہلکاروں کو علم ہوتا ہے کہ کون سے جزیرے پر کتنے مسافر اتریں گے۔ ہمارے ملک میں تو یہ واقعات عام ہیں کہ پی آئی اے کے مسافروں کو بارہا نشستوں سے زیادہ ٹکٹ جاری کردیے گئے جس کی وجہ سے ہنگامے برپا ہوتے رہتے ہیں اور مسافروں کے احتجاج کی وجہ سے پروازیں درہم برہم ہوجاتی ہیں۔

جب مسافر سوار ہوگئے تو ترکی زبان میں اعلان کیا گیا کہ اب ہم اگلی منزل کی طرف جارہے ہیں جو ڈائمنڈ آئی لینڈ ہے۔

پرنسز آئی لینڈ سے بارہ کے قریب مسافر جہاز میں سوار ہوئے تھے۔ ان میں دو خواتین تھیں اور دس مرد۔ یہ سب جوان تھے البتہ ایک درمیانی عمر کے ترک بھی ان میں شامل تھے۔ انہوں نے عرشے پر آتے ہی خالی سیٹ کے لیے چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔ ہم لوگ جہاں بیٹھے تھے وہاں تین چار سیٹیں خالی تھیں۔ انہوں نے ہمارے نزدیک بیٹھ کر ہم سب سے کہا۔ "السلام علیکم، اہلاً وسہلاً۔ جواب میں ہم سب نے وعلیکم السلام، مرحبا کہا۔

انہوں نے غور سے ہم چاروں کو دیکھا پھر انگریزی میں پوچھا۔ "کیا آپ انڈین ہیں؟"

ہم نے جواب میں کہا۔ "جی نہیں، ہم پاکستانی ہیں۔"

یہ سنتے ہی وہ خوش ہوکر "پاکستان" کہتے ہوئے پھر کھڑے ہوگئے اور ہم چاروں کو بڑی محبت سے گلے لگالیا۔ "مرحبا مرحبا۔"

ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ جواب میں کیا کہیں اس لیے خاموش رہے مگر وہ ہم لوگوں سے مل کر بہت گرمجوش نظر آرہے تھے۔

"آپ سیاحت کے لیے آئے ہیں؟" انہوں نے پوچھا۔

"جی ہاں۔"

"آپ کو پتا ہے؟ میں بھی پاکستان میں رہا ہوں اور اردو جانتا ہوں۔"

ہم نے خوش ہوکر کہا۔ "تو پھر ہم اردو ہی میں بات کیوں نہ کریں؟"

"ضرور۔ میری بھی پریکٹس ہوجائے گی ورنہ اردو بولنے والے ملتے کہاں ہیں، اس لیے بھول جانے کا بھی اندیشہ ہے۔"

ہم نے ان کا تعارف اپنے ساتھیوں سے کرایا۔ انہوں نے ہر ایک کو گلے لگایا۔ اہلاً وسہلاً کہا اور بہت خوشی کا اظہار کیا۔ ہم نے بھی جواب میں "مرحبا" کہا کیونکہ اس سے زیادہ ہم نہیں جانتے تھے کہ اس کے علاوہ اور کیا کہنا چاہیے۔

"آپ پاکستان کس سلسلے میں گئے تھے؟"

"میں ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں کام کرتا رہا ہوں۔ کمپنی کی طرف سے مجھے پاکستان بھیج دیا گیا اور کمپنی مجھے پاکستان بھیج کر بھول گئی۔"

"پاکستان آپ کو کیسا لگا؟ آپ تو بور ہوگئے ہوں گے؟"

"بالکل نہیں۔ پاکستان میں بور ہونا بہت مشکل ہے۔ وہاں میرے بہت سے دوست بن گئے تھے جن سے آج بھی رابطہ ہے۔"

"آپ نے اردو باقاعدہ اسکول یا کالج میں سیکھی یا بولنے سے آگئی۔"

"دیکھیے۔ کسی زبان کو سیکھنے کا بہترین طریقہ بات چیت ہے۔ میرے وہاں ایسے دوست بھی تھے جو کالجوں میں لیکچرر تھے۔ انہوں نے بھی مجھے اردو سکھانے میں بہت مدد کی۔"

"کیا آپ نے بھی انہیں ترکی زبان سکھائی۔"

"جی ہاں۔ میں نے انہیں ترکی سکھانے میں مدد کی۔ دراصل آپ جانتے ہوں گے کہ ترکی زبان میں بے شمار الفاظ ایسے ہیں جو اردو میں بھی استعمال ہوتے ہیں۔ صرف لکھنے میں رسم الخط سیکھنے کی ضرورت ہے ورنہ اردو اور ترکی زبان آپس میں بہن بھائی ہیں۔"

مرزا صاحب بولے۔ "ہم لوگ خوب ہیں۔ بات چیت اور دوستانہ شروع ہوگیا مگر ہمیں ایک دوسرے کا نام ہی معلوم نہیں ہے۔"

وہ مسکرائے۔ "آپ ٹھیک کہتے ہیں مگر نام جانے بغیر ہی ہم لوگ اسی طرح گھل مل گئے جیسے سالہا سال سے ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔"

"آپ کے نام کا معاملہ پھر رہ گیا۔"

وہ مسکرائے۔ "میرا نام عدنان سلجوق ہے۔ عدنان نام تو پاکستان میں بھی رکھا جاتا ہے۔ بلکہ بے شمار نام ایسے ہیں جو پاکستان اور ترکی میں کامن ہیں۔"

''آپ نے یہ نہیں بتایا کہ پاکستان میں آپ کے دن کیسے گزرے اور آپ کو پاکستان کیسا لگا؟''

''دیکھیے۔ یہ منہ دیکھے کی بات نہیں ہے۔ پاکستان بہت ہی خوبصورت ملک ہے۔ حسین مناظر، دریا، پہاڑ، وادیاں، چشمے، ہر طرح کا موسم، پھر پرانی یادگاریں دیکھنے کے قابل ہیں۔ مگر برا نہ مانیے۔ ان چیزوں کی دیکھ بھال، مرمت اور سجاوٹ پر کوئی توجہ نہیں دی جاتی جس کی وجہ سے شالیمار باغ اور شاہی قلعے جیسے عمارتیں بھی ٹوٹ پھوٹ رہی ہیں۔ یہ دیکھ کر مجھے بہت افسوس ہوا کہ آپ کے ملک میں ایسی خوبصورت پرانی یادگاریں برباد ہو رہی ہیں۔ میں نے پاکستان کے ہر علاقے کا سفر کیا ہے۔ آپ کا ملک تو جنت ہے مگر اس طرف بھی کوئی توجہ نہیں دی گئی۔ خوبصورت پہاڑی مقامات پر اچھے ہوٹل اور تفریح گاہیں نہیں ہیں۔ جھیل سیف الملوک دیکھ کر میں اس کے حسن کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ مگر افسوس یہ دیکھ کر دکھ ہوا کہ نہ تو جھیل کے آس پاس درخت اور سبزہ ہے اور نہ ہی اچھے ریستوران اور ہوٹل ہیں ورنہ پاکستان تو ٹورازم سے بہت زیادہ ڈالر کما سکتا ہے۔''

ہم نے بھی اس معاملے میں ان سے اتفاق کیا۔ وہ اتنی اچھی اردو بول رہے تھے کہ کوئی غیر ملکی نہیں لگتے تھے۔ اس کی وجہ انہوں نے یہ بتائی کہ وہ پاکستان میں اپنے دوستوں سے اردو ہی میں بات چیت کرتے تھے اور جب وہ آپس میں باتیں کرتے تھے تو میں غور سے سنتا تھا''اس طرح میں روزمرہ کی اردو زبان سیکھ گیا۔ ایک اور بات بھی میرے اردو سیکھنے کا سبب بنی۔''

''وہ کیا؟''

وہ ہنسنے لگے۔''جب میں اچھی اردو بولتا تو میرے پاکستانی دوست نہ صرف میری حوصلہ افزائی اور تعریف کرتے تھے بلکہ انعام بھی دیا کرتے تھے۔''

''کیا انعام؟''

''کبھی مجھے اچھے ریستوران میں ڈنر کھلا دیتے۔ کبھی مجھے قلم یا دوسری چھوٹی موٹی چیزیں انعام میں دیا کرتے تھے۔ کئی بار اردو کی کتابیں بھی مجھے تحفہ یا انعام میں دیتے تھے۔'' وہ مسکرائے۔

''وہ بہت اچھے دن تھے۔ بلکہ میری زندگی کے بہترین دن بھی کہہ سکتے ہیں۔ ہر وقت ہم لوگ ہنستے ہنساتے رہتے تھے۔ اللہ کی مہربانی سے مجھے بہت اچھے دوست مل گئے تھے۔''

''ویسے عدنان صاحب۔ عام پاکستانیوں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟''

''ارے کیا پوچھتے ہیں۔ اتنے مخلص اور محبت کرنے والے لوگ میں نے کسی اور ملک میں نہیں دیکھے۔ کوئی آپ کو جانتا ہو یا نہ جانتا ہو اگر آپ کو پریشانی یا مشکل میں دیکھے گا تو فوراً آپ کی مدد کے لیے پہنچ جائے گا اور آپ کی مشکل آسان کرنے کے بعد خدا حافظ کہہ کر چلا جائے گا۔ کئی بار سڑکوں پر میری کار خراب ہوگئی۔ میں تو کار کے انجن کے بارے میں کچھ نہیں جانتا مگر دیکھتے ہی دیکھتے دو تین راہ چلتے لوگ یا کار والے اپنی کار سے اتر کر آجاتے تھے اور میری مشکل آسان کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ یہ بات میں نے دنیا میں کسی اور ملک کے لوگوں میں نہیں دیکھی۔ ایک بار میں گلبرگ کے مین بولیوارڈ پر کار لے کر جا رہا تھا کہ اچانک انجن بند ہوگیا۔ میں بونٹ کھول کر کھڑا ہوگیا۔ جھانک کر انجن کو دیکھا مگر مجھے تو انجن کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں تھا...... ایک رکشے والا سڑک کے کنارے اپنا رکشا کھڑا کر کے آگیا اور مجھے مخاطب کیے بغیر انجن کو جانچتا رہا۔ اتنی دیر میں ایک ایک کر کے دو تین اور آدمی آگئے۔ جہاں گاڑی خراب ہوئی تھی، سڑک کے کنارے ایک بنگلے کا سیکورٹی گارڈ بھی آگیا۔ سب نے مل کر انجن کو ٹھیک کرنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہیں ہوئے۔ آخر انہوں نے فیصلہ دیا کہ کوئی مکینک ہی میری کار ٹھیک کر سکتا ہے۔

میں نے کہا۔''مکینک تو اب صبح کو ہی ملے گا۔ میں کار کو اپنے گھر کیسے لے جاؤں؟''

میری بات سن کر رکشے والے نے سیکورٹی گارڈ سے کچھ بات کی جسے سن کر وہ بھاگتا ہوا اپنے بنگلے کی طرف چلا گیا۔ چند منٹ بعد وہ ایک نائیلون کی مضبوط رسی لے کر آگیا رکشے والے نے اپنا رکشا میری کار کے سامنے کھڑا کردیا۔ رسی رکشے سے اور میری کار کے بونٹ سے باندھ دی گئی۔ میں حیران تھا کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔ رکشے والے نے مجھے بتایا کہ آپ کار میں اسٹیئرنگ پر بیٹھ جائیں اور اپنے بنگلے کا پتا مجھے بتائیں۔ میں کار کو ٹو کر کے آپ کے بنگلے تک لے چلوں گا۔ میں نے ایسا ہی کیا اور کار میں اسٹیئرنگ پر بیٹھ گیا۔ رکشا چل پڑا۔ ہم آہستہ آہستہ چلتے ہوئے بنگلے پر پہنچ گئے۔ رکشا والے نے میری کار میں بندھی ہوئی اپنی رسی کھول کر اپنے پاس رکھی اور''اچھا جی شکریہ'' کہہ کر رخصت ہونے لگا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اس کو کچھ روپے

دینے کی کوشش کی مگر وہ نہیں مانا۔''بس بابو صاحب۔ میرے لیے دعا کرنا۔ ابھی مجھے یہ رسی بھی اس کے مالک کو پہنچانی ہے۔'' اور خدا حافظ کہہ کر رخصت ہوگیا۔

میں حیران کھڑا رہ گیا۔ کسی اور ملک میں ایسا نہیں ہو سکتا۔ صرف پاکستان ہی میں ایسے معجزے ہو سکتے ہیں۔''

ہم خاموشی سے ان کی بات سنتے رہے۔ ان کا یہ تجربہ سو فیصد درست تھا کہ پاکستانی بہت پرخلوص اور محبت کرنے والے ہوتے ہیں۔ انھوں نے سڑک چلتے ان جان لوگوں کی بوقت ضرورت مدد کے لیے آنے کی جو بات سنائی وہ بھی درست ہے۔ خود ہمارے ساتھ کئی بار ایسا ہوا ہے کہ گاڑی کا پہیہ پنکچر ہوگیا تو ہم بونٹ کھول کر کھڑے ہوگئے۔ کیونکہ ہمیں ٹائر تبدیل کرنا نہیں آتا بلکہ گاڑی کا کوئی بھی کام نہیں آتا لیکن ہمیں کھلے بونٹ کے پاس کھڑا دیکھ کر فوراً دو تین آدمی مدد کے لیے آجاتے ہیں۔ ایک بار رکشے کے ذریعے رسی سے کھینچنے والا واقعہ ہمارے ساتھ بھی پیش آیا تھا۔ لیکن ہم نے رکشے والے کو معاوضہ دیا تھا جو اس نے شکریہ ادا کر کے رکھ لیا تھا۔ یہ بھی صحیح ہے کہ ہم لوگ صفائی پسند نہیں ہیں۔ اور ہماری انتظامیہ تو کوئی کام کرنا ہی نہیں چاہتی۔ انہیں اپنے فرض ادا کرنے سے کوئی غرض نہیں ہے۔ صرف لوٹنے اور کھانے سے مطلب ہے۔ اسی لیے ہمارے ادارے تباہ و برباد ہو رہے ہیں۔ سیاحتی مقامات پر سیاحوں کے لیے کوئی بندوبست نہ ہونا بھی درست ہے۔ دوسرے ملکوں میں سیاحتی مقامات کو مزید خوبصورت بنایا جاتا ہے لیکن ہمارے ہاں انہیں اجاڑ دیا جاتا ہے۔ تاریخی یادگار ہے تو وہ کھنڈر بن جاتی ہے حالانکہ بہت سے محکمے ہیں۔ بہت سے افسران بڑی بڑی تنخواہوں اور مراعات کے باوجود... اپنے کام پر اور فرائض پر کوئی توجہ نہیں دیتے۔ قومی خزانے کو وہ اپنے باپ کا مال سمجھتے ہیں۔ ان میں نہ قومی جذبہ ہے نہ انہیں اپنے کاموں سے کوئی دلچسپی ہے۔ کس قدر خود غرض قوم بن گئے ہیں ہم لوگ۔

''آپ کس لمبی سوچ میں پڑ گئے؟'' عدنان صاحب کی آواز نے ہمیں چونکا دیا۔

''ایسے ہی۔ پاکستان میں اپنے دوستوں کا خیال آگیا تھا۔''

''ہاں'' وہ ہنسا۔''یہی تو میں کہہ رہا تھا۔ پاکستانی بہت محبت کرنے والے ہوتے ہیں۔''

''اچھا۔ عدنان صاحب۔ ایک بات تو بتایئے۔''

''ہاں ہاں۔ پوچھیے۔''

''کیا یہ بات صحیح ہے کہ پہلا ترک بھیڑیے کا بچہ تھا۔''

''کیا مطلب۔'' وہ ہنسا۔''کیا میں آپ کو بھیڑیا نظر آتا ہوں۔''

''نہیں۔ میں نے کہیں پڑھا تھا۔ دراصل مجھے ترکوں سے بہت محبت ہے۔ میں ان کے بارے میں بہت کچھ جاننا چاہتا ہوں۔ ہم نے یہ بھی پڑھا تھا کہ ترکوں کا تعلق چنگیز خان سے ہے۔''

بٹ صاحب اتنی دیر میں کافی کے تین گلاس لے آئے تھے۔ ایک گلاس انہوں نے عدنان کو دیا۔ دوسرا ہمیں اور تیسرا مرزا اشرف کو۔ اور پھر لوٹ کر جانے لگے۔

''اب کہاں؟''

بولے''میرے دو ہی ہاتھ ہیں۔ ہندوؤں کی کالی دیوی کی طرح میرے دس بارہ ہاتھ تو ہیں نہیں۔ پھر بھی دو ہاتھوں میں کافی کے تین گلاس لے آیا۔ اب میں اپنے اور خان صاحب کے لیے کافی لینے جا رہا ہوں۔''

''آپ کتنے اچھے ہیں مسٹر بٹ۔'' عدنان نے کہا۔

خان صاحب بولے۔''کشمیری ہیں نا۔ کشمیری بہت اچھے لوگ ہوتے ہیں۔ چہرے کے بھی اور دل کے بھی۔''

بٹ صاحب کی خوشی سے باچھیں کھل گئیں اور وہ ہاتھ کے اشارے سے ہمارا شکریہ ادا کرتے ہوئے چلے گئے۔

عدنان نے کافی کا ایک گھونٹ لیا۔''بہت اچھی ہے۔''

خان صاحب نے فوراً چاروں طرف نظریں دوڑائیں۔''کون اچھی ہے، کہاں ہے؟''

ہم نے کہا۔''خان صاحب معلوم ہوتا ہے کہ بٹ صاحب کے ساتھ رہ کر آپ بھی عاشق مزاج ہوگئے ہیں۔''

عدنان نے کہا۔''میں تو کافی کی تعریف کر رہا تھا۔ آپ نہ جانے کیا سمجھے۔''

''خیر چھوڑیے۔ جسے بگڑنا ہوتا ہے وہ فرشتوں میں رہ کر بھی بگڑ جاتے ہیں۔ آپ ترکوں کے بارے میں کچھ بتا رہے تھے؟''

''یہ آپ نے صحیح پڑھا ہے کہ صحرائے گوبی میں جو جنگجو قبیلے تھے ان میں منگول اور ترک بھی تھے۔ یہ قبیلے پانی اور کھانے کی تلاش میں صحرا میں سفر کرتے رہتے تھے۔ یہ لوگ مویشی پالتے تھے۔ ان کے پاس ریت کے سوا اور کچھ نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ جب انہوں نے آبادیوں اور سرسبز علاقوں میں قدم رکھا تو خوشی سے پاگل ہوگئے اور انہوں نے

ان خوش نصیب قوموں اور آبادیوں کو خوب لوٹا۔ مارا، قتل کیا اور ان کے شہروں کو تباہ و برباد کردیا۔ انہیں شاید یہ غصہ تھا کہ ہم تو پانی کی بوند کو ترستے ہیں اور یہ لوگ عیش کرتے ہیں۔ چنگیز خان نے اس نئی دنیا میں آنے کے بعد بہت سے کام انتقام لینے کے لیے بھی کیے تھے۔"

"کس بات کا انتقام؟"

"اس بات کا کہ ہم تو ریگستان میں جانوروں کی طرح زندگی بسر کرتے رہے اور یہ لوگ اس طرح شہروں میں عیش سے رہتے ہیں۔ منگولوں کے ساتھ دوسرے قبائل بھی تھے جن میں ایک ترک نسل کا قبیلہ بھی تھا۔ یہ دوسرے قبیلوں سے مختلف تھے۔ ان کی زبان بھی الگ تھی۔ لفظ ترک 1300 قبل مسیح کی چینی کتابوں میں بھی ملتا ہے۔ دراصل یہ تمام منگول قبیلے چین سے لڑنے کے لیے تیار کیے جاتے تھے۔ اس وقت چین ہی ان کا سب سے بڑا دشمن تھا۔ ترکوں کی رزمیہ داستان میں ترکوں کے بارے میں کافی معلومات ملتی ہیں۔ اس داستان کا نام "دیدی کورکت" ہے۔ اس داستان سے معلوم ہوتا ہے کہ ترک دوسرے قبیلے کی لڑکی سے شادی کرتا تھا۔ اس قبیلے میں باپ یعنی مرد کی حاکمیت ہوتی تھی۔ اگر بیوی کے اولاد نہ ہو تو یہ اس بیوی سے بھی بہت اچھا سلوک کرتے تھے۔ دوسری بیوی رکھنے کا ان کے ہاں دستور نہیں تھا۔ تموجن یعنی چنگیز خان کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اس میں آدھا خون منگولوں کا اور آدھا ترکوں کا تھا، منگولوں کی طرح ترک بھی بہادر اور جنگجو تھے۔ بغداد کے عباسی خلفاء ان کی بہت قدر کرتے تھے۔ اپنی فوج میں وہ ترکوں کو بھرتی کرتے تھے۔ ان کا بہت خیال رکھتے تھے۔ جنگ میں یہ نیلام میں جو ترک حاصل کرتے تھے انہیں وہ بہت آرام اور محبت سے رکھتے تھے۔ ان کی قدر کرتے تھے۔ نویں صدی تک فوج میں فوجی کمانڈر ترک ہی ہوتے تھے۔ جب سلجوقوں کا زمانہ آیا تو وہ بھی اپنے خاص فوجی دستوں میں ترک ہی رکھا کرتے تھے۔ ان کو ترکمان غازی کہا جاتا تھا۔ بازنطینی دور میں بھی ترکوں کی بہت قدر کی جاتی تھی۔ ترکوں نے اس کے بعد جس طرح اپنی حکمرانی قائم کی وہ ایک الگ کہانی ہے۔"

"اب ہماری کہانی بھی سن لیجیے۔" خان صاحب نے اچانک بات کاٹ کر کہا۔

"تو سنائیے۔ اپنی داستانِ غم۔"

"داستان غم نہیں۔ میں یہ بتا رہا تھا کہ پھر ایک جزیرہ نظر آرہا ہے۔ شاید یہی ڈائمنڈ آئی لینڈ ہے۔"

عدنان اور مرزا اشرف کے بولنے سے پہلے [illegible] صاحب بول پڑے۔ "کتنا خوبصورت ہے۔ واقعی ایک [illegible] ہی لگتا ہے۔"

"ہیرے ایسے ہوتے ہیں۔" خان صاحب نے کہا۔ "کبھی ہیرا دیکھا بھی ہے آپ نے؟"

"بھئی ہم تو ہر خوبصورت اور چمکنے والی چیز کو ہیرا ہی سمجھتے ہیں۔ چلو بھئی۔ اپنا اپنا سامان اٹھاؤ۔ ہمارا [illegible] آگیا۔"

عدنان صاحب بولے۔ "اچھا دوستو، بھائیو، خدا حافظ۔"

"ارے ارے آپ کہاں جارہے ہیں۔"

"میری منزل ابھی نہیں آئی۔ اگلے آئی لینڈ پر پہنچنا ہے، ایک کام ہے۔ رات تک مجھے واپس بھی جانا ہے۔ آپ لوگوں کو چھوڑنے کو جی تو نہیں چاہتا مگر ڈیوٹی از ڈیوٹی۔" انہوں نے اپنے پرس سے چند وزیٹنگ کارڈ نکالے اور ہم سب میں بانٹ دیے۔" اگر وقت ملے اور ممکن ہو تو استنبول میں مجھ سے ضرور ملیے گا۔ ایک فون کریں گے اور میں الٰہ دین کے چراغ کے جن کی طرح آپ کے پاس پہنچ جاؤں گا۔"

ہم سب ایک دوسرے سے گلے ملے۔ بحری جہاز کی رفتار اب کم ہوگئی تھی۔ یہاں تک کہ وہ بندرگاہ یا پتن پر جا کر رک گیا۔ سامنے جو عمارت نظر آرہی تھی بالکل ویسی ہی تھی جیسی پرنسز آئی لینڈ کی تھی۔ جہاز سے اترنے اور جہاز پر چڑھنے والے مسافر بھی انتہائی مہذب تھے۔ عدنان صاحب ایک بار پھر گلے ملے اور جہاز سے اتر گئے۔ کھلی فضا میں ٹھنڈی، تازہ اور بھیگی ہوئی ہوا نے ہمیں خوش آمدید کہا۔ اس عمارت سے باہر نکل کر ہم نے چاروں طرف نظریں گھمائیں۔ ہر طرف حسن اور صفائی دیکھ کر ایمان تازہ ہوگیا۔ درختوں کے پتے صاف اور چمکدار، معلوم ہوا کہ جن مکانوں میں دکانوں کے سامنے درخت ہیں ان کی دیکھ بھال وہی لوگ کرتے ہیں جو گرمیوں میں ان درختوں کے سائے اور ان سے چھن کر آنے والی ہواؤں سے لطف اندوز ہوتے ہیں۔ ہمارے کراچی کے ساحل پر جاؤ تو گندگی کے ڈھیر دیکھ کر سمندر کی خوبصورتی بھی ماند پڑجاتی ہے۔ کوڑے کرکٹ، اونٹوں اور گھوڑوں کی غلاظت ہر طرف بکھری نظر آتی ہے۔ ہم نے دنیا کے بہت سے ملک دیکھے لیکن جو گندگی اور صفائی سے دشمنی پاکستان میں دیکھی وہ کسی اور ملک میں

نظر نہیں آئی۔ یوں لگتا ہے جیسے صفائی اور پاکیزگی سے ہم لاعلم ہیں۔ حکومت اور اس کے کارندے جو صفائی کرانے کے ذمہ دار ہیں وہ بھی کام چور، نااہل اور بے پروا ہیں۔ سنگاپور چھوٹا سا جزیرہ ہے مگر کیا مجال کہ کسی جگہ کاغذ کا ٹکڑا تک پڑا نظر آجائے۔ وجہ یہ ہے کہ حکومت نے سڑک یا عام جگہوں پر کاغذ کا ٹکڑا یا کسی قسم کا کوڑا پھینکنے پر پانچ سو پونڈ جرمانہ رکھا ہے اور یہ جرمانہ کھڑے کھڑے وصول بھی کرلیا جاتا ہے۔ بظاہر کوئی پولیس والا نظر نہیں آتا مگر کوڑا پھینکتے یا قانون کی خلاف ورزی کرتے ہی یہ کسی جن کی طرح اچانک نمودار ہوجاتا ہے اور بڑے اخلاق سے آپ کی توجہ آپ کی غلطی کی طرف مبذول کراکے پانچ سو کا چالان پیش کرکے فوراً ہی وصول بھی کرلیتا ہے۔ پھر مسکرا کر اور شکریہ ادا کرکے غائب ہوجاتا ہے۔ یہ جرمانہ دراصل غیر ملکی سیاحوں کے لیے عائد کیا گیا ہے۔ کیونکہ سنگاپور میں رہنے والے بذاتِ خود صفائی پسند اور ذمہ دار ہوتے ہیں۔

یہی حال ہم نے ترکی میں بھی دیکھا ہے۔ شہر کا پرانا علاقہ ہو یا خوبصورت جدید علاقہ، ہر جگہ صفائی نظر آتی ہے۔ ایسے ملکوں کے لوگ بذاتِ خود بھی صفائی پسند ہوتے ہیں۔ یہ کسی جرمانے یا قانون کی برکت نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ ہر مہذب ملک کا بچہ ہوش سنبھالتے ہی اپنے بڑوں کو صفائی کا خیال رکھنے اور قانون کی پاس داری کرتے ہوئے دیکھتا ہے اس لیے اس کو زبانی ہدایات دینے یا روکنے ٹوکنے کی ضرورت ہی نہیں ہوتی۔ کاش ہمارے ملک میں بھی یہی صفائی پسندی اور سلیقہ دیکھنے میں آئے۔ لیکن شاید یہ حسرتیں لے کر ہی چلے جائیں گے۔ غالب نے بھی شاید ہمارے لیے ہی کہا ہے۔

ہزاروں حسرتیں ایسی کہ ہر حسرت پر دم نکلے

آپ بھی سوچتے ہوں گے کہ عجب آدمی ہے۔ ہر جگہ وعظ و نصیحت شروع کردیتا ہے۔ یہ رونا دھونا چھوڑیے اور ڈائمنڈ آئی لینڈ کی سیر کرائیے۔ یہ ایک چھوٹا سا جزیرہ ہے۔ چاروں طرف سمندر کے نیلے پانی سے گھرا ہوا لیکن قدرت نے اس میں بہت دلکشی پیدا کی ہے اور کچھ یہاں کے رہنے والوں کی محنت کا بھی عمل ہے۔

ہمارے سامنے ایک پختہ سڑک تھی جو بل کھاتی ہوئی بلندی کی طرف جاتی نظر آرہی تھی۔ سڑک کو دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے ابھی اس کو کارپٹ کیا گیا ہے۔ کسی جگہ نہ گڑھا نہ ٹوٹ پھوٹ کے آثار۔ جزیرہ اونچے نیچے راستوں پر مشتمل ہے کیونکہ پہاڑی ہے اس لیے ہمارے سامنے والی سڑک بھی ڈھلوان تھی۔ اس چڑھائی پہ چڑھتے ہوئے آس پاس کے مناظر دیکھنے کو مل رہے تھے۔ استنبول جیسے ہی مکانات لیکن دو اور تین منزلہ، سفید عمارتیں، سرخ رنگ کی چھتیں۔ یہ بجائے خود ایک دلکش نظارہ ہے۔ سمندر کے ساتھ ساتھ ساحل پر یہ مکانات بنے ہوئے تھے۔ ان میں کچھ ہوٹل تھے اور کچھ رہائش گاہیں۔ زمین پتھریلی تھی مگر پہاڑ بھورے رنگ کے مگر صاف شفاف، ان ہوٹلوں میں سیاح ایک دو دن یا وقت میسر ہو تو زیادہ دن تک قیام کرتے ہیں۔ سامنے سمندر حدِ نظر تک پھیلا ہوا، دعوت نظارہ دیتا ہے۔ تھوڑے تھوڑے وقفے سے سیاحوں کو سیر کرانے والی بادبانی کشتیاں یا بڑے بحری جہاز گزرتے رہتے ہیں۔ نیلے سمندر پر کشتیوں کے سفید بادبان بہت بھلے لگتے ہیں۔ گرمی میں بھی ٹھنڈی ہوا چلتی رہتی ہے جو دیکھنے اور آس پاس رہنے والوں کو ہر دم تازہ دم رکھتی ہے۔ اسی ساحل پر مچھلی پکڑنے کے شوقین سمندر میں ڈور ڈالے کرسی یا کسی پتھر پر بیٹھے نظر آتے ہیں۔ ان میں خواتین بھی شامل ہوتی ہیں۔ مچھلی کے پھنسنے کے انتظار میں یہ لوگ مختلف دلچسپیوں میں مصروف نظر آتے ہیں۔ کوئی زمین پر چادر بچھائے نیم دراز کتاب پڑھ رہا ہے۔ کوئی کچھ لکھنے میں مصروف ہے۔ شاید گھر والوں کو خط لکھ رہا ہے۔ پلاسٹک کی ہلکی پھلکی خوش رنگ کرسیاں بھی ساحل پر بکھری نظر آتی ہیں۔ جو کرسی استعمال کرنا چاہے وہ معمولی سا کرایہ ادا کرکے کرسی پر بیٹھ جاتا ہے۔ زیادہ آرام طلب لوگ دو کرسیاں کرائے پر حاصل کرتے ہیں۔ ایک کرسی اپنے بیٹھنے کے لیے اور دوسری پیر پھیلانے کے لیے۔

مغربی سیاح خواتین وقت گزاری کے لیے ساحل پر اوندھی سیدھی لیٹی سن باتھ یعنی غسل آفتابی لیتی نظر آتی ہیں۔ کچھ خواتین مختصر لباس پہنے بیڈمنٹن کھیل رہی تھیں۔

بٹ صاحب تو یہ منظر دیکھ کر بے قرار ہوگئے اور مرزا مشرف سے کہنے لگے۔ "مرزا صاحب یہ تو بہت اچھی جگہ ہے۔ آپ ہمیں پہلے یہاں کیوں نہیں لائے؟"

مرزا صاحب بولے "اب تو لے آیا ہوں۔ اب تو آپ خوش ہیں؟"

بٹ صاحب "بہت خوش تھے۔" انہوں نے لمبی سانس لی۔ "کس قدر پرفضا مقام ہے۔"

ہم نے کہا۔ "مشرف صاحب اب تک یہ تو آپ جان

ہی گئے ہوں گے کہ مغربی خواتین اور ان کے مختصر بے لباس لباس بٹ صاحب کی کمزوری ہیں اور اگر وہ انہیں غسل آفتابی کرتے دیکھ لیں تو یہ سونے پہ سہاگہ ہے۔ یہاں ان کی پسندیدہ تمام چیزیں موجود ہیں۔ یعنی ساحل سمندر، غسل آفتابی کرتی ہوئی سیاح خواتین اور اسی مختصر لباس میں بیڈ منٹن کھیلتی ہوئی خواتین۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بٹ صاحب پسر گئے۔ کنارے ایک پتھر پر بیٹھ گئے اور بولے "میں تو بہت تھک گیا ہوں۔ کچھ دیر یہاں بیٹھ کر دم لوں گا اور تازہ ہوا کھاؤں گا۔ کرسیاں کہاں سے ملتی ہیں؟ مجھے ایک مچھلی پکڑنے والی ڈور کی بھی ضرورت ہوگی۔"

ہم سب نے حیران ہو کر بٹ صاحب کو دیکھا۔

"بٹ صاحب۔ ہوش و حواس قائم رکھیے اور جامے میں رہیے۔" ہم نے انہیں مشورہ دیا۔

"ہمیں تو حیرت ہے کہ اب آپ نے عریانی دیکھ کر لاحول پڑھنا بھی چھوڑ دیا ہے۔ آپ تو مکمل طور پر بگڑ چکے ہیں۔"

مرزا اشرف بولے "ابھی تو آپ لوگوں کو ڈائمنڈ آئی لینڈ کی سیر کرنی ہے۔ پھر آج ہی شام ہمیں واپس بھی جانا ہے۔"

خان صاحب نے کہا۔ "مرزا صاحب۔ آپ بٹ صاحب کی فکر نہ کیجیے۔ یہ تو ان کی عادت ہے۔ اگر یہ چاہیں تو یہاں بیٹھ کر مچھلیاں پکڑیں، سمندر میں تیراکی کریں یا بیڈ منٹن کھیلیں۔ انہیں ان کی مرضی پر چھوڑ دیجیے۔ انہیں ایسے دورے پڑتے ہیں۔"

جب بٹ صاحب نے ہمیں آگے جاتے ہوئے دیکھا تو پتھر پر سے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔

"مجھے معلوم تھا۔ آپ لوگ میری خوشی نہیں دیکھ سکتے مگر میں آپ لوگوں کو چھوڑ بھی نہیں سکتا۔ اس وقت مجھے منیر نیازی کا ایک گیت یاد آ گیا ہے۔

کیسے کیسے لوگ ہمارے
دل کو جلانے آ جاتے ہیں
اپنے اپنے غم کے فسانے
ہمیں سنانے آ جاتے ہیں
ان کے بنا میں رہ نہیں سکتا
اس بیدرد زمانے میں
یہ میری مجبوری مجھ کو
یاد دلانے آ جاتے ہیں

"یہ کیا ہے، بے موقع اور بے محل شعر پڑھا ہے آپ نے۔"

"میں تو یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہاتھی کے پاؤں میں سب کا پاؤں۔ جہاں آپ وہاں میں۔ میں اپنی خواہشوں کا گلا گھونٹ لوں گا۔ مگر آپ کا ساتھ نہیں چھوڑوں گا۔ آپ چاہے جہنم میں جائیں میں آپ کا ساتھ نہیں چھوڑوں گا۔ یہ تو جنم جنم کا ساتھ ہے۔ ہماری پرانی دوستی کبھی نہیں ٹوٹے گی۔ میں دوستی کی خاطر سب کچھ قربان کرنے کو تیار ہوں۔"

"واقعی اس سے بڑی قربانی کی مثال نہیں مل سکتی۔ لعنت بھیجیے ان بے حیا عورتوں پر اور ہمارے ساتھ آیئے۔"

ہم سب ڈھلوان سڑک پر چڑھتے ہوئے بالآخر جزیرے کی آبادی میں پہنچ گئے۔

"پہلے جزیرے کی سیر کریں گے یا کچھ کھائیں گے پئیں گے؟" مرزا صاحب نے پوچھا۔

"پہلے جزیرہ دیکھیں گے۔" سب نے ایک آواز ہو کر کہا۔

"تو پھر اس طرف آ جایئے۔" وہ دائیں جانب ایک سڑک پر مڑ گئے۔ چند قدم آگے بڑھے تو گھوڑوں کی لید کی بدبو نے ہمیں پریشان کر دیا۔

"بھئی یہ آپ ہمیں کہاں لے جا رہے ہیں۔" ہم نے مرزا صاحب سے دریافت کیا جو ہم سب کی رہنمائی کر رہے تھے۔

"بس چپ چاپ آ جایئے۔"

ہم سڑک سے گزر کر آگے بڑھے تو دیکھا کہ تیس چالیس تانگے وہاں مسافروں کے منتظر کھڑے ہیں۔ یہ تانگے تھے تو ہمارے ہی تانگوں کی طرح لیکن چوڑائی میں زیادہ کشادہ تھے۔ گھوڑے بہت تندرست اور چاق و چوبند نظر آ رہے تھے۔ منظر وہی تھا جو چند سال پہلے لاہور اور ہمارے دوسرے شہروں میں نظر آیا کرتا تھا۔ لاہور کے تانگے کسی زمانے میں سارے ملک میں مشہور تھے۔ تانگے والے اپنے تانگوں کو بہت سجا کر رکھتے تھے یہاں تک کہ چابک بھی لیوترے اور قدیم زمانے کے دروں کی طرح ہوتے تھے۔ تانگے والے بھی جوان اور خوبصورت رنگ برنگے ملبوسات میں مسافروں کو پکار پکار کر اپنی طرف متوجہ کیا کرتے تھے۔ یوں تو کوچوانوں کے لیے ایک مخصوص یونیفارم مقرر تھی لیکن اکثر کوچوان اس کے بجائے شلوار قمیص اور قمیص واسکٹ میں نظر آتے تھے۔ بعض کوچوانوں کا لباس ریشمی ہوتا تھا۔

خوبصورت جوان رعنا تانگوں میں سروں پر رنگین ٹوپیاں پہنے یا رنگین رومال یا پگڑیاں باندھے نظر آتے تھے۔ ان کے مختلف علاقوں میں اڈے تھے۔ ایک اڈا لکشمی چوک پر بھاٹی دروازے کی طرف جانے والے تانگوں کا ہوتا تھا۔ یہ بلند آواز میں پکارتے بھی رہتے تھے۔

بھاٹی دروازہ۔ دو آنے دو آنے۔

اس طرح ایک تانگے میں چار سواریاں بیٹھ جایا کرتی تھیں۔ اس طرح کوچوان کو تو وہی آٹھ آنے معاوضہ ملتا تھا مگر سواریوں کے لیے یہ آسان اور فائدہ مند طریقہ تھا۔ اگر پورا تانگہ کرائے پر حاصل کریں تو وہ آٹھ آنے۔ بارہ آنے اور ایک روپیہ ہوتا تھا۔ ایک روپیہ شاہ خرچ لوگ دیا کرتے تھے جس میں ٹپ بھی شامل ہوتی تھی۔ لاہور میں پشاوری تانگے بھی نظر آتے تھے مگر کرایہ سبھی تانگوں کا یکساں ہوتا تھا۔ اب تو خیر رفتہ رفتہ تانگے لاہور کی سڑکوں پر نظر ہی نہیں آتے۔ پہلے پہل مال روڈ اور آس پاس کے علاقے کی سڑکوں پر تانگوں کے داخلے پر پابندی لگائی گئی پھر دوسرے علاقے بھی اس پابندی کی زد میں آ گئے۔ اب تو رکشا موٹر سائیکل کاروں کی وجہ سے تانگے والے پہلے جیسے نہیں رہے۔ اب لاہور کی سڑکوں پر تانگے خال خال ہی نظر آتے ہیں۔ ایک تو بہت سی سڑکوں پر جانے پر پابندی، پھر زیادہ کرائے اور سب سے بڑھ کر سست رفتاری، جو فاصلہ تیز رفتار رکشا منٹوں میں طے کر لیتا ہے تانگا اسے زیادہ دیر میں طے کرتا ہے۔ لاہور میں کسی زمانے میں شوقین خوبصورت سجے ہوئے تانگے اور کلغی لگے گھوڑے والے تانگے میں پچھلی سیٹ پر ٹانگیں پھیلا کر بیٹھا کرتے تھے۔ پاکستان بننے کے دس بارہ سال بعد تک لاہور میں امراء کے پاس بگھیاں بھی تھیں۔ ایک تو چار سیٹوں والی دو منزلہ بگھی تھی جس پر کوچوان سامنے کی جانب اونچائی پر بیٹھتا تھا۔ جن لوگوں نے محبوب خان کی فلم "آن" دیکھی ہے اس میں ایک گانے میں دلیپ کمار کوچوان کی جگہ بیٹھے گانا گاتے اور مسکرا کر پچھلی سیٹ پر نظریں ڈالتے نظر آتے ہیں۔ بگھی میں راجکماری یعنی نادرہ غصے میں بل کھاتی بیٹھی نظر آتی ہیں۔ گانے کے بول یہ تھے۔

دل میں چھپا کے پیار کا طوفان لے چلے
ہم آپ اپنی موت کا سامان لے چلے

ایسی بگھیاں کسی زمانے میں تانگوں کی جگہ کراچی میں چلا کرتی تھیں جن میں سوار ہو کر میوا کھانا اور خصوصاً ساحل سمندر کے پاس سفر کرنا بہت بڑی تفریح ہوتی تھی۔ اب تو کراچی میں بھی ایسی بگھیاں نظر نہیں آتیں۔

ڈائمنڈ آئی لینڈ میں بگھی وغیرہ کا نام و نشان تک نہ تھا۔ صرف تانگوں کا ہجوم تھا۔ یہ سب تانگے ایک قطار میں کھڑے ہوئے تھے۔ ایک کے بعد دوسرے کی باری آ جاتی تھی۔ تانگوں کا مقصد سیاحوں کو جزیرے کا ایک پھیرا لگوانا تھا۔ جزیرہ ہی کتنا بڑا تھا۔ ایک سڑک تھی جو رہائشی علاقوں سے گزر کر پہاڑی راستے پر سے گزر کر پھر وہیں پہنچ جاتی تھی جہاں سے چلی تھی۔

ہم پہلے بھی بتا چکے ہیں کہ ان جزیروں پر تانگے اور سائیکل کے سوا کوئی اور سواری نظر نہیں آتی۔ موٹر سائیکل اور پیدل چلنا ہی یہاں کا دستور ہے۔

تانگوں کے گھوڑوں کو چڈھیاں پہنائی جاتی ہیں پھر بھی گھوڑوں کی گندگی زمین پر گر جاتی ہے جس کی وجہ سے بدبو پھیلتی ہے۔ عجب بات یہ ہے کہ گھوڑوں کی گندگی کی اس بدبو نے اٹلی میں بھی ہمارا پیچھا نہیں چھوڑا تھا۔ روم کے پرانے اندرونی علاقوں میں موٹر کاریں نہیں جا سکتیں۔ صرف تانگے یا بگھیاں ہی ذریعۂ سفر ہیں۔ اندرونی شہر کی سڑکیں پتھر کے ہموار اور یکساں سائز کے ٹکڑے جوڑ کر بنائی گئی ہیں۔ یورپ کے دوسرے شہروں میں بھی ایسی سڑکیں ہیں، یہاں تک کہ پیرس جیسے نازک اور خوبصورت شہر میں بھی بہت سے علاقوں میں پتھروں کی سڑکیں ہیں جو نہ صرف بہت مضبوط ہیں بلکہ ان پر زیادہ آمد و رفت کی وجہ سے یہ چکنی بھی ہو گئی ہیں۔

روم کے جس علاقے میں مشہور فوارہ ہے جس کے بارے میں مشہور ہے کہ جو اس فوارے میں ایک سکہ ڈالتا ہے وہ دوسری بار روم ضرور آتا ہے۔ ہر سیاح اس فوارے میں سکے ضرور ڈالتا ہے جو بچے نکال لیتے ہیں۔ یہ علاقہ پرانی عمارتوں کا ہے مگر تانگوں کی وجہ سے یہاں بدبو پھیلی رہتی ہے۔

ہم لوگ ابھی کھڑے سوچ ہی رہے تھے کہ ایک بڑے میاں تانگے والے کی باری آئی اور وہ اپنا تانگا لے کر ہم لوگوں کے سامنے آ کر تانگا سمیت کھڑے ہو گئے۔ کوچوان کو دیکھ کر ہم حیران بھی ہوئے اور بہت خوش بھی ہوئے۔ یہ ایک خالص ترک نظر آ رہے تھے۔ سرخ و سفید رنگت، بھورے بال، بھوری آنکھیں، تنی ہوئی گردن بھوری مگر گنجان مونچھیں۔ خاص بات یہ تھی کہ یہ سوٹ یعنی کوٹ

پتلون میں ملبوس تھے۔ گلے میں بوٹائی تھی۔ سر پر ایک فیلٹ ہیٹ رکھا تھا۔ ان کی شخصیت اتنی بارعب اور دلکش تھی کہ انہیں کوچوان سمجھنے میں مشکل پیش آرہی تھی۔

ہم لوگوں کے سامنے آکر انہوں نے تانگا روک دیا اور ہم لوگوں کا انتظار کرنے لگے۔ ہم سب انہیں دیکھ کر حیران ہو رہے تھے۔

اتنا شاندار خوش لباس شخص اور کوچوان؟ یقین نہیں آرہا تھا۔ ہم لوگ ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

وہ سمجھ گئے۔ تانگے سے اتر کر کھڑے ہوگئے اور ہاتھ سے اشارہ کیا کہ تانگے میں تشریف رکھیے۔ ہم لوگ جھجکتے ہوئے تانگے میں سوار ہوگئے مگر یہ ڈر تھا کہ کہیں ڈانٹ ہی نہ دیں۔ مگر وہ چپ چاپ کھڑے مسکراتے رہے۔

ہم سب کے تانگے میں سوار ہونے کے بعد وہ بھی اپنی جگہ چڑھ کر بیٹھ گئے اور تانگا چل پڑا۔ جب تانگوں کے اڈے سے باہر نکلے تو سامنے ایک صاف ستھری پختہ سڑک تھی جس کے دونوں طرف رہائشی بنگلے اور کوٹھیاں بنی ہوئی تھیں۔ کہیں کہیں سے موڑ مڑتے ہوئے سمندر کی جھلک بھی نظر آجاتی تھی تو بہت اچھا لگتا تھا۔

تانگے میں خاموشی تھی۔ آخر میں ہم نے بڑے صاحب سے دریافت کیا۔ ”یو اسپیک انگلش؟“

وہ مسکرائے ”یس، اسمال“ (یعنی تھوڑی بہت)

پھر وہ ہم سے مخاطب ہوئے۔ ”یو تورست۔“

”یس۔“

”ویئر یو کم؟“ (مطلب یہ کہ آپ کہاں سے آئے ہیں)

”فرام پاکستان۔“

”پاکستان!“ انہوں نے تانگا ایک سائیڈ میں کھڑا کیا اور کود کر تانگے سے اتر گئے۔ ہم سمجھے شاید غصے میں آگئے اور ہمیں یہیں چھوڑ کر چلے جائیں گے مگر اس کے برعکس وہ دونوں بازو پھیلا کر کھڑے ہوگئے۔ ”پاکستان کم کم“ یہ کہہ کر انہوں نے سب سے قریب بیٹھے مرزا صاحب کو ہاتھ پکڑ کر تانگے سے اتارا اور گلے لگالیا۔ یہ دیکھ کر ہم لوگوں کی بھی ہمت بندھی اور ہم سب تانگے سے اتر گئے۔

انہوں نے ”مرحبا، اہلاً و سہلاً“ کہہ کر ہم سب کو باری باری گلے لگایا۔ ”آئی لو پاکستان۔ ویری بریو پیپل“ میں پاکستان سے پیار کرتا ہوں کیونکہ وہ بہت بہادر ہوتے ہیں۔“

”وی ترک اینڈ یو پاکستان، برادر“ (ہم ترک اور آپ پاکستانی بھائی بھائی ہیں)

”تھینک یو مسٹر......“ خان صاحب نے کہا۔

”مائی نیم کریم۔ آغا کریم۔“

”یو آر ویری گڈ آغا کریم۔ وی لو ترکس۔ دے آر گریٹ...... وی آلویز لو خلیفہ۔“

”یس آئی نو۔“

ہم نے مرزا اشرف سے کہا۔ ”مرزا صاحب آپ کیا منہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھے ہیں۔“

مرزا اشرف اچانک ان کی طرف بات کا رخ بدلنے ہوئے حیران رہ گئے۔ ”بھئی میں نے کیا کہنا ہے۔ میں اپنے منہ سے گھنگھنیاں نکال کر کیا کروں؟“

”بھئی آپ تو کافی ترکی زبان جانتے ہیں۔ ہم لوگ جو آغا کے ساتھ اپنا سر پیٹ رہے ہیں تو آپ مترجم کیوں نہیں بن جاتے تاکہ ہم کھل کر بات تو کر سکیں۔ اب تو یس، نو، تھینک یو کے سوا ہم کچھ بات ہی نہیں کر سکتے۔“

”تم ٹھیک کہتے ہو۔ مگر بھائی آپ لوگوں نے مجھے بولنے کا موقع ہی کہاں دیا۔ خود ہی آغا سے بات کرنے پر تل گئے ہیں۔ ایک دوسرے کی بات ٹھیک سے سمجھتے نہیں پھر بھی بولے ہی چلے جارہے ہو۔“

یہ کہہ کر مرزا اشرف آغا کریم کی طرف مخاطب ہوئے۔ وہ ان کی زبان سے ترکی سن کر حیران پریشان رہ گئے۔ پھر انہوں نے ترکی زبان میں ایک لمبی سی ٹرین چلادی۔

وہ خاموش ہوئے تو ہم نے پوچھا۔ ”کیا کہہ رہے تھے۔“

”خوشی کا اظہار کر رہے تھے۔ انہوں نے تو ایک ہی سانس میں اتنی بہت سی باتیں کردیں۔ اب یہ ایک اور مشکل پڑ گئی ہے۔“

”کیسی مشکل؟“

”میرا سفر تو ترجمہ کرنے میں ہی گزر جائے گا۔“

”نہیں مرزا صاحب۔ ہم آپ سے زیادہ سوالات نہیں کریں گے۔“

مرزا صاحب نے آغا صاحب سے کہا (اب ہم آپ کو گفتگو کا ترجمہ کرکے ہی بتائیں گے) ”آئیے۔ اب چل کر ہمیں آئی لینڈ دکھایئے۔“

”کیوں نہیں۔ آپ لوگوں سے مل کر اور آپ کی زبان سے ترکی زبان سن کر مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے۔ میں شرمندہ ہوں کہ مجھے اردو نہیں آتی۔ مگر میں اب اردو ضرور سیکھوں گا اور اگلی بار آپ یہاں آئیں گے تو میں آپ سب سے اردو میں بات کروں گا۔“

ہم سب لوگ دوبارہ تانگے میں سوار ہوگئے۔ اب آغا کریم کی زبان قینچی کی طرح چلنے لگی تھی۔ وہ اپنی دھن میں آس پاس کے مقامات اور جزیرے کے بارے میں بتا رہے تھے جس کا ترجمہ مرزا صاحب ہمیں بڑی روانی سے بتا رہے تھے۔

ایک جگہ آغا صاحب نے ایک بنگلے کی طرف اشارہ کرکے کہا ”یہ جنرل پرویز مشرف کا گھر ہے؟“

”سچ۔ واقعی، کیا آپ نے کبھی اس گھر میں پرویز مشرف کو آتے ہوئے دیکھا ہے؟“

”نہیں۔ میں نے تو سنا ہے کہ جنرل مشرف جو پاکستان کے آرمی چیف ہیں۔ ان کا گھر ہے۔ جنرل مشرف بچپن میں ترکی میں ہی رہتے تھے اپنے والد کے ساتھ۔ آپ نے باسفورس کے کنارے ملٹری ٹریننگ کالج بھی دیکھا ہوگا۔ اس آرمی کالج میں بہت بڑے بڑے لوگوں نے تعلیم حاصل کی ہے۔ آپ کے جنرل پرویز مشرف اور لیبیا کے کرنل قذافی اسی کالج میں پڑھتے رہے ہیں۔“

”جی ہاں۔ کالج تو ہم نے دیکھا تھا مگر دور سے۔“

یہ جزیرہ زیادہ بڑا نہیں ہے۔ ایک ہی لمبی سی بل کھاتی ہوئی سڑک ہے جو جزیرے کے چاروں طرف چکر لگاتی ہوئی پھر تانگا اسٹینڈ پر پہنچ جاتی ہے۔ راستے میں مختلف نظارے ہیں۔ ایک طرف پہاڑی اور باغات یا مکانات اور دوسری طرف نیلا سمندر۔ بہت خوبصورت نظارہ ہے۔

ابھی ہم لوگوں کو تانگے میں سفر کرتے ہوئے نصف گھنٹا ہی ہوا ہوگا کہ ایک جانب آغا صاحب نے تانگا روک لیا۔

مرزا نے ان سے پوچھا ”آغا صاحب رک کیوں گئے؟“

”وہ سامنے دیکھئے۔ سڑک بن رہی ہے۔ کارپیٹنگ ہو رہی ہے۔“

سامنے تقریباً سو گز کے ٹکڑے پر کارپٹ کیا جا رہا تھا جس سڑک سے ہم آئے تھے وہ بھی تازہ تازہ کارپٹ ہوئی لگتی تھی۔ اس طرح قسطوں میں یہ سڑک بنتی جارہی تھی۔

”اب کیا ہوگا؟“ ہم نے پوچھا۔

آغا صاحب نے بتایا کہ اب ہمیں واپس جانا ہوگا اور پھر اسی سڑک پر دوبارہ چکر کھا کر یہیں آنا ہوگا۔

سامنے سولو ہیٹ اور قمیص پتلون پہنے ایک لمبے چوڑے ترک کھڑے نگرانی کر رہے تھے۔ تین چار مزدور سڑک کو کارپٹ کرنے میں مصروف تھے۔

آغا صاحب تانگے سے اتر کر انجینئر کے پاس چلے گئے۔ مرزا اشرف بھی ان کے ساتھ ساتھ گئے۔ آغا صاحب نے انجینئر سے کہا کہ وہ اگر واپس جائیں گے تو بہت لمبا چکر کاٹنا پڑے گا۔

انجینئر نے کہا۔ ”اس سڑک کے ایک حصے کو ابھی کارپٹ کیا جارہا ہے۔ یہ ابھی سوکھا نہیں ہے اگر اس پر سے تانگا گزرے گا تو سڑک پر گھوڑے کے نعل اور تانگے کے پہیوں کے نشان پڑ جائیں گے۔ اس لیے آپ واپس چلے جائیں۔“

آغا صاحب نے کہا ”آپ کو معلوم ہے میرے تانگے میں کون لوگ بیٹھے ہیں؟“

”مجھے نہیں معلوم۔ لیکن وہ کوئی بھی ہیں میں آپ کے تانگے کو اس سڑک سے گزرنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔“

آغا کریم نے مرزا اشرف کی طرف دیکھا اور کہا۔ ”یہ مرزا اشرف ہیں۔“

انجینئر نے السلام علیکم کہہ کر ان سے مصافحہ کیا۔

”یہ پاکستان سے آئے ہیں“ آغا کریم نے کہا۔

انجینئر کے چہرے پر خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ ”آپ، پاکستانی“ یہ کہہ کر انہوں نے مرزا اشرف کو گلے لگالیا۔

”تانگے میں جو لوگ بیٹھے ہیں یہ بھی پاکستان سے آئے ہیں۔“

انجینئر صاحب تانگے کی طرف آگئے اور بہت خوشی سے ہم لوگوں سے ملے۔ آغا صاحب کی ہدایت پر ہم سب لوگ بھی تانگے سے اتر کر نیچے کھڑے ہوگئے اور انجینئر صاحب سے بغلگیر ہوئے۔ وہ ہم لوگوں سے مل کر بہت خوش نظر آرہے تھے اور بار بار ”مرحبا مرحبا“ کہہ رہے تھے۔

انہوں نے سوال کیا کہ آپ لوگ کہاں سے آئے ہیں۔ لاہور کا نام سن کر وہ اور زیادہ خوش ہوئے کیونکہ انہوں نے لاہور کا دورہ کیا تھا اور لاہور سے بہت متاثر تھے۔ لاہور کے کھانوں اور لاہور کے لوگوں کی وہ بہت تعریف کرتے رہے۔ لاہور کے باغات اور تاریخی عمارتوں نے بھی انہیں

متاثر کیا تھا۔ ہم لوگوں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔

انہوں نے آغا کریم سے مخاطب ہو کر کہا ”ٹھیک ہے۔ آپ لوگ اپنا تانگا اس سڑک سے گزار لیں۔“

آغا صاحب نے کہا۔ ”مگر آپ کی سڑک اور کارپیٹ؟“

”کوئی بات نہیں۔ آپ اتنی دور سے ہمارے ملک میں آئے ہیں۔ کیا ہم اتنی سی سڑک دوبارہ نہیں بنا سکتے؟“

انہوں نے تانگے کو وہاں سے گزرنے کی اجازت دے دی اور ایک بار پھر ہم سب سے بہت گرمجوشی کے ساتھ ملے۔ ہم لوگ دوبارہ تانگے میں سوار ہو کر سفر پر روانہ ہو گئے۔ ادھر تانگا چلا، ادھر آغا کریم کی زبان چلنی شروع ہو گئی اور انہوں نے جزیرے کی تاریخ بیان کرنی شروع کر دی۔

یہ جزیرہ اس قدر پرسکون اور خوبصورت ہے کہ جی چاہتا تھا کہ ہم وہیں ساحل پر کوئی چھوٹا سا گھر لے کر رہنا شروع کر دیں۔

تانگا اسٹینڈ پر پہنچ کر ہم لوگوں نے مرزا اشرف کے ذریعے آغا کریم کا شکریہ ادا کیا اور ان سے رخصت کی اجازت طلب کی۔ مگر انہوں نے ہمیں روک دیا۔

”ایک منٹ۔ ذرا انتظار کیجیے۔“

یہ کہہ کر انہوں نے اپنے گھوڑے کی لگام ایک پائپ میں باندھ دی۔ یہ پائپ شاید اسی مقصد کے لیے لگایا گیا تھا کیونکہ کچھ اور گھوڑوں کی لگام بھی اس طویل پائپ میں بندھی ہوئی تھیں۔ آغا صاحب نے اپنے گھوڑے کے منہ پر بندھا ہوا توبڑا کھول کر اس کے سامنے چارے کی بالٹی اور پانی کی بالٹی رکھ دی۔ اس کام سے فارغ ہو کر انہوں نے دونوں ہاتھ جھاڑے اور بولے۔ ”آپ لوگوں نے تو پوچھا تک نہیں مگر مجھے بھی لنچ کرنا ہے۔“

”ہاں ہاں کیوں نہیں بہت شوق سے آپ ہمارے ساتھ لنچ کیجیے۔“

وہ مسکرائے ”ایسا موقع ہر بار تو نہیں ملتا کہ پاکستانیوں کے ساتھ لنچ کھانے کا موقع ملے۔ آیئے مارکیٹ چلتے ہیں۔ ایک ہی ریستوران ہے مگر بہت اچھا کھانا ملتا ہے وہاں کی کھڑکیوں سے سمندر بھی نظر آتا ہے۔“

ہم سب ان کے اور مرزا اشرف کے پیچھے پیچھے تانگا اسٹینڈ سے نکل کر باہر سڑک پر آ گئے۔ کچھ اور ڈھلوان سڑک پر چلنے کے بعد جزیرے کا مختصر بازار تھا۔ اندر داخل ہونے کے لیے ڈیوڑھی جیسا ایک بڑا سا دروازہ تھا جس کے درمیان سے ایک سڑک گزرتی تھی۔ بازار میں چھوٹی چھوٹی دکانیں تھیں جن میں چھوٹی موٹی اشیا کے علاوہ ترکی کی یادگار چیزیں بھی شامل تھیں۔ ایک چیز دیکھ کر ہم بہت حیران ہوئے۔ کی چینز Key Chains اور دوسری مختلف چیزوں میں چھوٹی چھوٹی آنکھیں لگی ہوئی تھیں۔ یہ ہار کی شکل میں بھی تھیں اور دوسری بہت سی اشیا کے ساتھ بھی موجود تھیں۔

مرزا مشرف نے بتایا کہ ترکوں کا خیال ہے کہ ان مصنوعی آنکھوں کی وجہ سے بری روحیں اور برے واقعات دور رہتے ہیں۔ ہر ترک کے گھر کے دروازے پر یا گھر کے اندر کسی نہ کسی جگہ آپ کو یہ آنکھیں نظر آتی ہیں۔ مغربی ملکوں کے سیاح اور خواتین کافی تعداد میں ان مصنوعی آنکھوں سے مرصع اشیا خرید رہی تھیں۔ ہم سب دکانوں میں یادگار چیزیں دیکھ رہے تھے اور بٹ صاحب سیاح خواتین کو دیکھنے میں مصروف تھے۔ انہوں نے چند چیزیں خریدیں مگر ان کی نظریں مسلسل خواتین پر لگی ہوئی تھیں۔

خان صاحب نے کہا ”بٹ صاحب۔ آپ دو چار درجن آنکھیں اور خرید لیں کیونکہ دو آنکھوں سے تو آپ ان میموں کو دیکھ نہیں سکتے۔ آپ کو تو بہت سی آنکھوں کی ضرورت ہے۔“

ان چھوٹی چھوٹی سجی ہوئی دکانوں کو دیکھتے ہوئے ہم آگے بڑھے۔ یہ ایک چھوٹا سا خوبصورت صاف ستھرا بازار تھا۔ بائیں جانب ایک ریستوران تھا۔

آغا صاحب کی قیادت میں ہم ایک کھڑکی کے نزدیک والی میز پر بیٹھ گئے۔ کھڑکی سے باہر سمندر اور سامنے سے گزرنے والی چھوٹے بڑے جہاز اور بجرے ایک خواب کی سی کیفیت پیدا کر رہے تھے۔

مرزا مشرف نے ہم سب کو چونکا دیا۔ ”سمندر بعد میں دیکھ لینا۔ پہلے آرڈر تو کرو۔ آپ لوگ اپنی اپنی پسند بتائیں۔“

ہم نے ڈونر کباب، شیش کباب اور شیورما بتا کر پھر کھڑکی سے باہر دیکھنا شروع کر دیا۔ کبھی زندگی میں ایسا حسین منظر بھی دیکھیں گے۔ کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ ہر چیز صاف ستھری۔ نکھری ہوئی ہوا، خوبصورت فضا اور اتنا اچھا ماحول۔ ہمارے چاروں طرف مہذب اور خوش اخلاق لوگ تھے جو آہستہ آواز میں باتیں کر رہے تھے۔ اتنے بہت سے

لوگوں کے ہوتے ہوئے بھی ریستوران میں کوئی ذرا سی اونچی آواز اور شور و غل نہیں تھا۔

سمندر سے دور بادبانی کشتیاں سفید بادبان لہراتی ہوئی گزریں۔ ہم اس منظر میں کھو گئے۔ یکایک ہمیں کسی نے کہنی ماری۔ دیکھا تو خان صاحب مسکرا رہے تھے۔ انہوں نے ہماری توجہ بٹ صاحب کی طرف مبذول کرائی۔ ہم یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ وہ کچھ فاصلے پر دوسری میز پر جا بیٹھے تھے جس پر بقول خان صاحب کے چار میمیں مختصر لباس پہنے بیٹھی ہوئی تھیں۔

بٹ صاحب ایک خوبرو خاتون کا ہاتھ تھامے ان کی ہتھیلی کا گہرا جائزہ لے رہے تھے۔ کافی عرصے بعد انہوں نے ہاتھ دیکھ کر قسمت کا حال بتانے والی ترکیب استعمال کی تھی۔ خان صاحب نے اس کا نام ”ترکیب نمبر 13“ رکھا تھا۔“

غالب نے کہا ہے

تقریب کچھ تو بہر ملاقات چاہیے۔

غالب کے ایسے اشعار بٹ صاحب نے یاد کر رکھے ہیں جو کہ ان کے لیے کارآمد ہیں۔ وہ انہیں استعمال بھی کرتے ہیں۔ خواتین کے ہاتھ دیکھنا بھی ایک ملنے ملانے کا بہترین بہانہ ہے کیونکہ ہر انسان خصوصاً خواتین بہت وہمی ہوتی ہیں اور اپنی قسمت اور مستقبل کے بارے میں بے شمار معلومات حاصل کرنا چاہتی ہیں۔

آغا کریم کی بھی ان پر نظر پڑ گئی۔ انہوں نے پوچھا ”یہ وہاں کیا کر رہے ہیں؟“

”جی، قسمت کا حال بتا رہے ہیں۔“

وہ حیران رہ گئے۔ ”کیا یہ قسمت کا حال جانتے ہیں کہ زندگی میں آیندہ کیا ہوگا؟“

”جی ہاں۔ وہ یہی کہتے ہیں۔“

”استغفراللہ۔ ایک مسلمان کو ان فضول باتوں پر یقین نہیں کرنا چاہیے۔“

”یہ خود بھی اس پر یقین نہیں رکھتے۔“

”تو پھر اس خاتون کا ہاتھ کیوں دیکھ رہے ہیں؟“

”دراصل یہ اس خاتون سے بلکہ اس کے ساتھ کی تمام خواتین سے فلرٹ کر رہے ہیں۔“

”اوہ!“ کریم آغا نے اپنی آنکھیں گھمائیں۔ ”کتنا اچھا طریقہ ہے۔ افسوس کہ جوانی میں ہمیں یہ بات کسی نے نہیں بتائی۔“

نقشبندیہ

نقشبندیہ کے معنی ”مصور“ روح اسلام کا عکاس کرنے والا۔ صوفی درویشوں کا ایک سلسلہ۔ یہ لوگ حضرت اویس قرنیؓ کی طریقت سے زیادہ مشابہ ہیں۔ محمد بہاؤالدین بخاریؒ نقشبند کے نام سے مشہور ہوئے۔ بعد میں ان کے مریدوں کے لیے بھی یہی لقب استعمال ہوا۔ ان کے اہم بزرگوں میں حضرت علاؤالدین عطارؒ، حضرت مجدد الف ثانی حضرت محمد معصوم، حضرت نقشبند ثانی، شاہ قطب الدین، شاہ عیسیٰ ولی، حضرت بابا نور محمد نیز ہی، خواجہ محمد زبیر، حضرت یعقوب چرخی وغیرہ شامل ہیں۔ ابتداً اس سلسلہ نے وسط ایشیا، ترکستان اور بخارا میں بہت ترقی کی۔ اس کے بعد پاک وہند اور دوسرے مقامات میں پھیل گیا۔ پاکستان کے مختلف مقامات پر نقشبندیوں کے مراکز موجود ہیں۔

مرسلہ: اکرم شیخ، چنوٹ

بات ہنسی میں اڑ گئی مگر خان صاحب بہت بے چین تھے اور بار بار پہلو بدل رہے تھے بالآخر انہوں نے ہم نے کہا ”آفاقی صاحب، انہیں واپس بلائیں۔“

ہم نے کہا ”خان صاحب۔ وہ جو کام کر رہے ہیں اسے چھوڑ کر کسی قیمت پر نہیں آئیں گے جب تک کہ آخری خاتون کا ہاتھ بھی نہ دیکھ لیں۔“ پھر بھی آنکھ بچا کر ہم نے بٹ صاحب کو اشارہ کیا کہ واپس آ جاؤ۔ انہوں نے ہمیں اور ہمارے اشارے کو یکسر نظر انداز کر دیا۔

”چھوڑیے۔ ہم اپنی باتیں کرتے ہیں۔“ ہم نے کہا۔

”یہ سب سے بہتر ہے۔“ چنانچہ ہم لوگوں نے دوسری باتیں شروع کر دیں۔

ہم نے آغا کریم سے کہا۔ ”آغا صاحب۔ ہم نے ترکی کے بارے میں بہت پڑھا اور سنا ہے لیکن ہماری خواہش ہے کہ اگر آپ کو اپنے ملک کی تاریخ اور روایات کے بارے میں معلومات حاصل ہیں تو آپ سے کچھ پوچھیں۔“

وہ مسکرائے۔ ”ضرور پوچھیے۔ میں تاریخ کا طالب علم اور استاد رہا ہوں۔ مجھے تاریخ سے بہت دلچسپی ہے۔ میں جامع محمد الفاتح میں پڑھاتا بھی رہا ہوں۔“

”اس جامع کے بارے میں کچھ بتایئے۔“

"یہ ترکی کی مشہور یونیورسٹی ہے جس میں آرٹس اور سائنس کے بہت سے شعبے ہیں یہاں ماسٹر یعنی ایم اے تک تعلیم حاصل کرنے کی بہت سہولتیں ہیں۔ یہاں ایک دارالترجمہ ہے جس نے ہر مضمون کی اصطلاحات کا ترکی میں ترجمہ کیا ہے۔ یہاں مختلف ملکوں کے طلباء پڑھنے آتے ہیں۔ یونیورسٹی کے پچھلے حصے میں مسجد سلطان اور عمر ہوٹل ہے۔ اس ہوٹل میں طلباء اور اساتذہ کے علاوہ علماء کو بھی چوتھائی رعایت پر کھانا مل جاتا ہے۔ یہ بڑی بدقسمتی ہے کہ سائنس کے علوم میں مسلمانوں نے مغربی اور دوسرے ترقی یافتہ ملکوں جیسی ترقی نہیں کی۔"

"یہ آپ صحیح کہہ رہے ہیں۔ کوئی اسلامی ملک سائنس کی نئی ایجادات میں مغربی ملکوں کا مقابلہ نہیں کرسکتا۔ یہاں تک کہ چین جیسے ملک نے بھی سائنس میں بہت ترقی کی ہے جس کی وجہ سے امریکا پریشان ہے۔ یہ شاید آپ کو معلوم نہیں ہے کہ دنیا میں عوامی کتب خانوں (جسے ہندوستان اور پاکستان میں آنہ لائبریری کہا جاتا تھا) کا نظام سب سے پہلے ترکی میں ہی قائم کیا گیا تھا۔ اس سے اندازہ لگائیے کہ صرف استنبول شہر میں ایسے 185 کتب خانے تھے لیکن اب یہ صرف گیارہ تک محدود رہ گئے ہیں۔"

اتنی دیر میں بٹ صاحب بھی بہت خوش وخرم اور مسکراتے ہوئے آگئے۔

"معافی چاہتا ہوں۔ دراصل وہ خواتین بے چاری اپنے مستقبل کے بارے میں بہت پریشان تھیں۔"

خان صاحب نے پوچھا۔ "آپ نے ان کی پریشانی دور کردی، بہت اچھا کیا۔ مگر یہ بتائیے کہ ان بے چاری خواتین کو یہ پتا کیسے چلا کہ آپ دست شناسی میں ماہر ہیں؟"

بٹ صاحب سٹپٹا گئے اور کوئی جواب نہیں دیا۔ ہم لوگوں نے بھی انہیں سب کے سامنے شرمندہ کرنا مناسب نہیں سمجھا۔

ہم نے پوچھا "کیا یہ صحیح ہے کہ استنبول شہر سات پہاڑیوں پر آباد ہے۔"

"جی ہاں۔ یہ درست ہے۔"

بٹ صاحب نے کہا۔ "مگر وہ پہاڑ نظر نہیں آتے۔ ویسے تو یہ سارا شہر ہی نشیب وفراز کا نمونہ ہے مگر وہ پہاڑیاں نظر نہیں آتیں۔ ہمیں تو کسی طرف بھی یہ پہاڑیاں نظر نہیں آئیں۔"

"اب یہ پہاڑیاں عمارتوں کے نیچے گم ہوگئی ہیں۔"

ہم نے پوچھا۔ "استنبول اور ترکی پر مختلف قوموں نے حکومت کی ہے۔"

"جی ہاں، یہ صحیح ہے۔ یونانی، بازنطینی، منگول سب اس ملک پر حکومت کرتے رہے ہیں۔ تیمور لنگ نے بھی استنبول کو فتح کرکے یہاں حکومت کی ہے۔ تیمور لنگ کا زرہ بکتر توپ کاپی میوزیم میں موجود ہے۔ مختلف قوموں کے جھنڈے بھی محفوظ کیے گئے ہیں بلکہ عثمانیہ سلطنت نے جن ممالک کو فتح کیا تھا ان کے جھنڈے بھی توپ کاپی کے میوزیم میں آپ دیکھ سکتے ہیں۔ حضرت علیؓ کا جھنڈا بھی بہت احترام اور حفاظت سے رکھا گیا ہے۔ سلطان محمد نے قسطنطنیہ کی تلواریں اور دوسرا اسلحہ بھی حفاظت سے رکھا ہے۔"

"یہ تو ہم جانتے ہیں کہ شہنشاہ قسطنطین کے نام پر اس شہر کو قسطنطنیہ کہا جاتا تھا۔ لیکن اس شہر کو استنبول کیوں نام دیا گیا ہے؟"

"1833ء تک اس شہر کو قسطنطنیہ ہی کہا جاتا تھا۔ استنبول نام کی وجہ یہ بتائی جاتی ہے کہ اس کو اسلامبول بھی کہا جاتا ہے۔ کبھی اس کو آستانہ بول کا نام دیا گیا جو رفتہ رفتہ استنبول بن گیا۔"

"کیا یہ بہت تاریخی شہر ہے؟"

"اس شہر کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ یہ 128 بادشاہوں کا پایہ تخت رہا ہے ان میں دس رومی شہنشاہ، 82 بازنطینی اور 36 عثمانیہ خلیفہ تھے۔ ترکوں نے شہر کو کبھی تباہ وبرباد نہیں کیا۔ ترک فوجیں جہاں سے گزرتی تھیں وہ تو ڈرتے رہتے تھے یا شہر خالی کرکے چلے جاتے تھے لیکن فوجیوں کو سختی سے ہدایت دی جاتی تھی کہ شہروں میں لوٹ مار نہ کریں اور نہ پرامن شہریوں کو قتل کریں۔ خود عیسائی مورخ بھی تسلیم کرتے ہیں کہ عیسائی افواج خود عیسائیوں کو لوٹ لیتے تھے۔ قتل عام کرتے تھے اور خوبصورت عورتوں کو اٹھا کر ساتھ لے جاتے تھے مگر عثمانی فوجوں کو سختی سے روک دیا گیا تھا۔ ترک حکمران انصاف پسند بھی ہوتے تھے۔ خود عیسائی باشندے اپنے مقدمات مسلمان بادشاہوں کے پاس لے کر جاتے تھے۔ اور مسلمانوں پہ انہیں پورا اعتماد تھا کہ قاضی سے انہیں انصاف ملے گا۔"

گرم گرم کھانا آچکا تھا...... سب لوگ کھانے میں مصروف ہوگئے۔ کھانا بہت لذیذ تھا۔

(جاری ہے)

اپریل

منظر امام

عیسوی سن کے اس چوتھے مہینے میں کئی ایسے واقعات بھی رونما ہوئے ہیں جو کئی معنوں میں اہم ہیں، معلومات میں اضافے کی خاطر ایسی تحریریں ضرور پڑھیں۔

باذوق قارئین کے لیے توشۂ خاص

اپریل جارجین اور جولین کیلنڈر کے مطابق سال کا چوتھا مہینا ہوتا ہے۔ یہ عام طور پر موسم بہار کا زمانہ ہوتا ہے۔ جب ہر طرف دل کش پھول کھل جاتے ہیں۔ دل چسپ بات یہ ہے کہ اپریل کا آغاز ہر سال اسی دن سے ہوتا ہے جس دن سے جولائی کا ہوتا ہے۔

جیسے 2014ء میں پہلی اپریل منگل کو ہوگی۔ اسی طرح 2014 کی پہلی جولائی بھی منگل کو ہوگی۔ رومن نے اس مہینے کو Aprilis کا نام دیا تھا۔

اپریل کو مغرب میں سیاہ یعنی نحوست زدہ مہینا خیال کیا جاتا ہے۔ یہ اتفاق ہے کہ اس مہینے مختلف اوقات میں دنیا میں ایسے بہت سے واقعات رونما ہوئے ہیں جن میں لاکھوں افراد کی جانیں چلی گئیں۔ جیسے 12 اپریل 1861ء کو سول وار کا آغاز ہوا۔

14 اپریل 1865ء میں امریکا کے مقبول اور ہر دل عزیز صدر ابراہام لنکن کا قتل ہوا۔

20 اپریل 1889ء میں ہٹلر کی پیدائش ہوئی۔ ممکن ہے کہ بہت سے حلقوں میں اسے کچھ اور سمجھتے ہوں۔ لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس شخص کے جنون کی وجہ سے لاکھوں افراد مارے گئے تھے۔

15 اپریل 1912ء میں دنیا کا سب سے بڑا مسافر بردار جہاز ٹائٹانک ڈوب گیا تھا۔ یہ جہاز اب ایک افسانوں کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ اس جہاز کے حوالے سے لاتعداد کہانیاں لکھی گئی ہیں اور ایک بہت زبردست فلم بھی اسی نام سے بنائی گئی ہے۔

4 اپریل 1992ء میں بوسنیا میں جنگ کا آغاز ہوا۔ جس میں کئی لاکھ مسلمان شہید کیے گئے۔

18 اپریل 1906 میں سان فرانسسکو میں بدترین زلزلہ آیا تھا۔

ہوسکتا ہے کہ یہ سب تو ہم ہی ہو۔ لیکن اپریل کو ایسا ہی سمجھا جاتا ہے۔ جبکہ اسلامی نقطہ نظر سے سارے مہینے اور سارے دن اللہ کے بنائے ہوئے ہیں۔

اپریل کے اس مختصر سے تعارف کے بعد اب ہم تاریخ وار واقعات کا جائزہ لیتے ہیں۔

اپریل میں اقوام متحدہ کی طرف سے ایک دن منایا جاتا ہے۔ Autism Awareness Day کہا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ جاز Jazz ڈے بھی ہوتا ہے۔

Jazz ڈانس کی ایک شکل یا اسٹائل ہے۔ اس رقص کو موجودہ رنگ 1950 میں دیا گیا تھا۔ اس کا تھیم افریقی رقص سے لیا گیا ہے۔ یہ گروپ ڈانس ہوا کرتا ہے۔

پہلی اپریل:

پہلی اپریل 1933ء میں جان وہال کی پیدائش ہوئی تھی۔ اسی تاریخ کو 1989 میں جرمن کے فران ہوفر Fraun Hofer نے MP3 آڈیو فارمیٹ متعارف کروایا تھا۔ جس کے بعد آڈیو موسیقی کو ایک نئی جہت مل گئی۔

پہلی اپریل 1578 برطانوی فزیشن ولیم ہاروے کی پیدائش کی تاریخ ہے۔ اس نے دورانِ خون معلوم کیا تھا۔

1865 میں جرمنی کے کیمسٹ رچرڈ موئڈی کی پیدائش ہوئی۔ اس نے 1925 میں نوبل پرائز حاصل کیا۔ یہ تاریخ 1922ء میں امریکی سائنس دان ایلان پریس کی پیدائش کی بھی تاریخ ہے۔

اس تاریخ کو ...... اپریل فول بھی منایا جاتا ہے جو شاید پوری دنیا میں رائج ہے۔ اس تاریخ کو پوری دنیا میں مذاق کے طور پر ایک دوسرے کو بے وقوف بنایا جاتا ہے۔ فرانس، بیلجیم اور اٹلی وغیرہ میں کاغذ کی مچھلیاں بنا کر کسی کی پشت سے چپکا کر شور مچاتے ہیں۔ اپریل فش اپریل فش۔ یہ یورپی اور مغرب کا فیسٹول ہے۔ اس کی ابتدا ایک قدیم رومی تہوار Hilaria سے ہوتا ہے۔ جو پہلے 25 مارچ کو منایا جاتا تھا۔ اسپینی بولنے والے علاقوں میں آج بھی اسی انداز سے مناتے ہیں۔ اپریل فول کی طرح دنیا کے اور بھی علاقوں میں کچھ اسی قسم کے تہوار مختلف ناموں سے بے وقوف بنانے کے لیے منائے جاتے ہیں۔ جیسے ڈنمارک میں پہلی مئی کو May -Cat ڈے، اسی تاریخ کو یہ دن سوئڈن اور 28 دسمبر کو اسپین میں منایا جاتا ہے۔

پہلی اپریل (پہلی جمادی الثانی) حضرت سلطان باہوؒ کا عرس منایا جائے گا۔ سلطان باہوؒ کا زمانہ 1641-1628 کا ہے۔ آپ کے بارے میں ہمیں ایک کتاب مناقب سلطان سے پتا چلتا ہے کہ آپ ایک مشہور بزرگ تھے۔ آپ نے قادری صوفی سلسلہ شروع کیا۔ آپ بے مثال شاعر اور مصنف بھی تھے۔

آپ کی کافیاں بہت مشہور ہیں۔ آپ کی لکھی ہوئی چند کتابوں کے نام یہ ہیں۔ بیات باہو، رسالہ روحی، عقل بے دار، اورنگ شاہی وغیرہ۔ آپ کا مقبرہ پاکستان میں جھنگ کے مقام پر ہے۔

2 اپریل:

دو اپریل 1618ء میں ریاضی دان فریسٹ کی پیدائش ہوئی جس نے روشنی کی تقسیم کا نظریہ پیش کیا۔

1875ء میں والٹر کرائسلر کی پیدائش ہوئی جس نے مشہور کمپنی کرائسلر کی بنیاد رکھی۔

دو اپریل 1922ء میں روسی ایٹمی سائنس دان کی پیدائش ہوئی جس نے 1964ء میں نوبل پرائز حاصل کیا۔ ان کے علاوہ اسی تاریخ کو 1805ء میں مشہور مصنف ہانس اینڈرسن کی پیدائش ہوئی۔ ہانس اینڈرسن ...... ہالینڈ کا شاعر، ادیب، ڈراما اور ناول نگار تھا۔ کئی سفرنامے بھی تحریر کیے۔ اینڈرسن کو بچوں کی کہانیوں کی وجہ سے ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ اس کی Fairy Tales بچوں کے علاوہ بڑوں میں بھی مقبول ہے۔ اس کی تحریروں کے متراجم دنیا کی 125 زبانوں میں ہو چکے ہیں۔ اس کی چند کتابوں کے نام یہ ہیں۔

The old House, The angel, The Happy Family.The Bell. The swon Queen وغیرہ۔

اس تاریخ کو دنیا بھر میں انٹرنیشنل چلڈرن بک ڈے منایا جاتا ہے۔

ایجادات کے سلسلے میں دو اپریل 1889ء میں چارلس ہال نے ایک ایسا طریقہ پیٹنٹ کروایا جس کی مدد سے الومنیم کی پیداوار میں تجارتی لحاظ سے اضافہ کیا جاسکتا تھا۔

تین اپریل:

تین اپریل 1837ء کو مصنف جان بروس کی پیدائش ہوئی۔ جس کے نام پر بروس ایوارڈ دیا جاتا ہے۔

اس تاریخ کو Find a Rainbow ڈے یعنی دھنک کو تلاش کرنے کا دن منایا جاتا ہے۔

تین اپریل 1860ء میں پونی ایکسپریس کا آغاز ہوا۔ یہ ایک ڈاک سروس تھی۔ اس زمانے میں خطوط اور اخبارات وغیرہ گھوڑا گاڑیوں کے ذریعے ایک جگہ سے دوسری جگہ بھیجے جاتے تھے۔

اس کی ابتدا میسوری نوارا وغیرہ کے علاقوں میں ہوئی۔ پوسٹ آفس کے طور پر خوبصورت گھر ہوا کرتے جہاں تازہ دم گھوڑے دست یاب ہوتے تھے۔

تین اپریل 1973 میں فرانس ڈبلو ڈوریل نے پہلی بار دودھار والا ریزر متعارف کروایا تھا۔

تین اپریل 2010ء میں امریکا میں پہلا I-Pad فروخت ہوا تھا۔

چار اپریل:

چار اپریل 1818ء میں امریکا کا جھنڈا منظور ہوا۔

اسی تاریخ کو 1968ء میں مارٹن لوتھر کنگ جونیئر کا قتل ہوا۔

چار اپریل 1809ء میں امریکی سائنس دان بنجامن پائرس پیدا ہوا۔

چار اپریل 1823 کارل ولیم کی پیدائش کی تاریخ ہے۔ اس شخص نے پہلی بار سمندر میں کیبل بچھایا تھا۔

1826ء میں Tnao Phile کی پیدائش ہوئی۔ الیکٹرک موٹر کا موجد۔

1933ء برطانوی موجد روبن فلپ نے ہینڈ ڈرائر بنایا۔

چار اپریل 1979ء پاکستان کے لیے ایک اہم تاریخ ہے۔ اس تاریخ کو ذوالفقار بھٹو کو پھانسی ہوئی تھی۔

پانچ اپریل:

National Read A Road Map ڈے منایا جاتا ہے۔ اسی تاریخ کو 1858ء میں ایک ماہرِ تعلیم بوکرٹی واشنگٹن کی پیدائش ہوئی تھی۔ پانچ اپریل 1752 میں Substean Eraro نام کے ایک شخص کی بھی پیدائش ہوئی جس نے پیانو کی موجودہ شکل دی۔

پانچ اپریل کو جلال پور میں غلام حیدر شاہ کا عرس منایا جائے گا۔ اتفاق سے یہ جمادی الثانی کی بھی پانچ تاریخ ہوگی۔

چھ اپریل:

چھ اپریل 1920ء سوئس سائنس دان ایڈمنڈ فشر کی پیدائش ہوئی۔ اس نے دو اور سائنس دانوں کے ساتھ مل کر 1922ء میں نوبل پرائز حاصل کیا تھا۔

1928ء میں کیمسٹ جیمز ڈی رائس کی پیدائش ہوئی۔ اس نے Dna کا اسٹرکچر دریافت کیا تھا۔ چھ اپریل 1869ء میں آئی ساک نے رولر اسکیٹ متعارف کروایا۔

6 اپریل 1898ء کو نارتھ پول دریافت ہوا۔ نارتھ پول گرین لینڈ کے شمال میں 750 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ Arctic ocean (بحیرہ آرکٹک) کے درمیان واقع ہے۔

اس کی گہرائی 4087 میٹر ہے۔ یہاں کی ایک خاص بات یہ ہے کہ یہاں چھ مہینے رات رہتی ہے اور چھ مہینے دن۔

ماتھیو ہینسن Mathew honson اپنے ساتھی رابرٹ پیرن کے ساتھ یہاں پہنچا تھا۔ اس تاریخ یعنی 6 اپریل کا دوسرا اہم واقعہ یہ ہے کہ 1917 میں امریکا جنگ عظیم میں شامل ہوا تھا۔ پہلی جنگ عظیم انسانی تاریخ کی ایک بھیانک اور خوں ریز جنگ ہے۔ جس میں نوے لاکھ افراد ہلاک ہوئے تھے۔ اس جنگ کا آغاز یورپ

سے 28 جولائی 1914ء کو ہوا اور اس کا خاتمہ گیارہ نومبر 1918 کو ہوا۔ اس دوران زمین پر آگ اور خون کی بارش ہوتی رہی تھی۔

ایک طرف اتحادی قوتیں تھیں تو دوسری طرف سینٹرل پاور۔ اتحادیوں میں فرانس، برطانیہ، آسٹریلیا، کینیڈا، نیوزی لینڈ، ساؤتھ افریقا، روس، امریکا اور جاپان وغیرہ تھے۔ تو دوسری طرف سینٹرل پاور میں جرمنی، جوریا، پروشیا، آسٹریا، ہنگری، بلغاریہ اور ترکی وغیرہ تھے، ترکی میں اس وقت سلطنتِ عثمانیہ تھی۔

اس جنگ کا نتیجہ یہ نکلا کہ جرمنی، روس اور سلطنتِ عثمانیہ میں شہنشاہیت کا خاتمہ ہوگیا۔ یورپ اور مشرق وسطیٰ کے درمیان نئے تعلقات قائم ہوئے۔ معاہدے ہوئے اور لیگ آف نیشن کا قیام عمل میں آیا۔

پاکستان میں 1970ء میں غازی پور میں پاکستان کی پہلی آرڈیننس فیکٹری قائم ہوئی۔ 6 اپریل 1978ء کو ترقی اردو بورڈ اردو لغت کا پہلا والیوم لے آئی۔

6 اپریل 2000 میں نواز شریف کو قید کی سزا ہوئی۔ اور 6 اپریل 2006ء کو پرویز مشرف نے دیامیر بھاشا ڈیم کا سنگ بنیاد رکھا۔

سات اپریل:

سات اپریل کو No house work day منایا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ ورلڈ ہیلتھ ڈے بھی اسی تاریخ کو ہوتا ہے۔ اس کا آغاز 1948ء میں ہوا تھا۔

سات اپریل 1896ء کو ایک بہت اہم ایجاد سامنے آئی۔ ٹالبرٹ نے مونوٹائپ پرنٹنگ مشین متعارف کروادی۔

سات اپریل 1859ء کو والٹر کیمو پیدا ہوا تھا۔ اس آدمی کو امریکن فٹ بال کا فادر کہا جاتا ہے۔ اس نے امریکن فٹ بال کے قوانین بنائے تھے۔

سات اپریل 1860ء کو امریکی ماہر غذائیات Will keth پیدا ہوا تھا۔ اس نے جو سے سیریل کارن فلیکس وغیرہ بنائے جو پوری دنیا میں شوق سے استعمال ہوتے ہیں اور غذائیت حاصل کرنے کا بہترین ذریعہ سمجھے جاتے ہیں۔

پاکستان میں سات اپریل 1984ء میں احمدیوں پر پابندی عائد کردی گئی تھی۔

سات اپریل کو لاہور میں بی بی پاک دامن کا عرس منایا جائے گا۔ جمادی الثانی کی بھی یہ سات تاریخ ہوگی۔

بی بی پاک دامن کا مزار لاہور میں گڑھی شاہو اور ریلوے اسٹیشن کے درمیان ہے۔ آپ کے بارے میں کئی روایات ہیں۔

مزار شریف کے احاطے میں چھ اور قبریں ہیں۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ چھ خواتین ہیں جو اہلِ بیت سے تھیں اور کربلا کے سانحے کے بعد (یہ واقعہ اکتوبر 680 عیسوی) ہندوستان کی طرف تشریف لے آئی تھیں۔

بی بی پاک دامن کا نام رقیہ بنت علی تھا۔ آپ کے بارے میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آپ حضرت عباس کی سگی بہن تھیں... اور حضرت مسلم بن عقیل سے بھی رشتہ تھا۔ بہرحال کوئی روایت مصدقہ تو نہیں ہے لیکن اتنا ضرور ہے کہ حضرت داتا گنج بخش جیسے ولی نے آپ کے مزار پر حاضری دی ہے۔

آٹھ اپریل:

آٹھ اپریل: 1939ء میں ٹرانا شارٹ کی پیدائش ہوئی۔ ٹرانا فلاڈلفیا میں پیدا ہوئی۔ اس کی وفات 19 نومبر 2004ء کو ہوئی ہے۔

یہ وہ خاتون ہے جس نے بچوں کے لیے بہت کام کیا۔ تصویری کہانیاں بنائیں اور پریوں کی خیالی تصویریں بنائیں۔ آج جو ہم پریوں کو خوبصورت پروں اور خوبصورت لباسوں کے ساتھ دیکھا کرتے ہیں، یہ سب ٹرانا شارٹ کے تخیل ہی کا کارنامہ ہے۔

آٹھ اپریل 1766ء کو آگ لگنے کی صورت میں کسی عمارت سے نکلنے کی سیڑھی (Fire Ascape) متعارف ہوئی۔

8 اپریل 1869ء امریکن نیورو سرجن ہاروے کی پیدائش کی تاریخ ہے۔ اس شخص نے بلڈ پریشر جانچنے کا طریقہ متعارف کروایا۔

پاکستان میں 8 اپریل 1950 میں لیاقت علی خان اور پنڈت جواہر لال نہرو کے درمیان ایک معاہدہ ہوا۔

8 اپریل 1976ء میں بلوچستان میں سرداری سسٹم کے خاتمے کا اعلان کیا گیا۔

یہ تاریخ امریکی کیمسٹ میل ول کالون کی پیدائش کی تاریخ ہے۔ یہ کیمسٹ 1911ء میں پیدا ہوا تھا اور 1961 میں نوبل پرائز حاصل کیا۔

نو اپریل:

نو اپریل 1830ء کو ایڈورڈ مابرج کی پیدائش

ہوئی۔ اس نے موشن فوٹو گرافی کی تعلیم کی بنیاد رکھی تھی۔

1919ء میں جان پر سپر ایڈکرٹ کی پیدائش ہوئی۔ اس نے اپنے دوساتھیوں کے ساتھ مل کر پہلا الیکٹرک کمپیوٹر متعارف کروایا جسے Ewica کا نام دیا گیا۔

9 اپریل 1977ء کو ایک اہم اور ضروری ایجاد سامنے آئی جب نیل بروکس نے ڈسپوزایبل سرنج متعارف کروائی۔

اس سرنج سے ایک دوسرے کی بیماریاں ایک دوسرے کو لگنے کا خدشہ ختم ہوگیا۔ ورنہ پہلے یہی ہوتا تھا کہ ایک سرنج ہوتی تھی جس کو بہت دیر تک پانی میں ابالنے کے بعد مریض کو انجکشن لگایا جاتا تھا۔

یہاں بات محسوس کرنے اور صحیح اپروچ کی ہے کہ انسان کسی کی بھلائی کے لیے کس کس پہلو سے سوچا کرتا ہے۔

دس اپریل:

اس تاریخ کو پہلی بار امریکا میں 1790 میں پینٹ سسٹم متعارف ہوا۔ یعنی جو کچھ آپ نے بنایا ہے اسے کوئی اور اپنے نام سے استعمال نہ کرسکے۔

10 اپریل 1849ء میں والٹر ہنیٹ نے پہلا سیفٹی پن ایجاد کیا۔

1755 میں اس تاریخ کو ایک ایسے آدمی کی پیدائش ہوئی جس نے طب کی دنیا میں انقلاب برپا کردیا۔ جرمنی کے اس شخص کا نام ہنی مین تھا۔ اس نے مشہور زمانہ ہومیوپیتھی سسٹم متعارف کروایا۔ 1917ء رابرٹ برنس کی پیدائش کی تاریخ ہے۔ اس نے 1965ء میں نوبل پرائز حاصل کیا تھا۔ پاکستان میں دس اپریل 1973ء کو قومی اسمبلی میں پاکستانی آئین Enacted ہوگیا۔ اور دس اپریل 1975ء کو مشہور دانشور اسکالر ڈاکٹر محمود حسین کا انتقال ہوا۔

دس اپریل 1988ء کو پاکستان میں ایک زبردست سانحہ رونما ہوا۔ یہ سانحہ راولپنڈی کے اوجھڑی کیمپ کے سانحے کے طور پر یاد کیا جاتا ہے۔ جب بارود اور اسلحے کے ذخیرے میں آگ لگ گئی تھی۔ اس میں سو سے زیادہ افراد ہلاک ہوئے تھے۔

گیارہ اپریل:

گیارہ اپریل 1964ء صدر جانسن نے ہیومن رائٹ ایکٹ پر دستخط کیے۔

گیارہ اپریل 1971ء میں اطالوی انجینئر ایڈریانو پیدا ہوا۔ اس نے ٹائپ رائٹر بنایا جس سے پوری دنیا میں ایک طویل عرصے تک مسودے ٹائپ ہوتے رہے (اب اس کی جگہ کمپیوٹر کمپوزنگ نے لے لی ہے)

گیارہ اپریل 1899ء میں کیسٹ پرنس ایلبے جولیان پیدا ہوا۔ اس شخص نے ایک موذی مرض Arthritis کا علاج دریافت کیا۔

بارہ اپریل:

بارہ اپریل 1916 مصنف باورلے کلیری کی تاریخ پیدائش۔ اسی تاریخ کو Bavarly امریکی مصنفہ اور یکن (امریکا) میں پیدا ہوئی۔ اس نے بچوں اور بڑوں کے لیے تیس سے زائد کتابیں لکھیں۔ اس کی کتابوں کے 91 ملین نسخے فروخت ہوچکے ہیں۔

12 اپریل 1884 جرمنی ماہر نفسیات اوٹو کی پیدائش کی بھی تاریخ ہے۔ اس نے 1912 میں نوبل پرائز حاصل کیا تھا۔ اسی تاریخ کو امریکا نے خلائی مشن کولمبیا خلا میں روانہ کیا تھا۔

تیرہ اپریل،

13 اپریل 1743 امریکا کے تیسرے صدر جیفرسن کی پیدائش کی تاریخ ہے۔ 13 اپریل 1899 الفریڈ موسئر کی پیدائش کی بھی تاریخ ہے۔ اس شخص نے آگے چل کر ایک مشہور گیم اسکرابیل بنایا تھا جس میں حروف جوڑ کر لفظ بنائے جاتے ہیں۔

13 اپریل 1973ء کو انسانی تاریخ میں سائنس کی ایک اور کامیابی کا دروازہ کھلا۔ اسٹینلے کوہن اور ہربرٹ مائر نے Dna کلوننگ کے ذریعے جوڑا پیدا کرنے کی کوشش کی۔ یہ جینیٹک انجینئرنگ کی پہلی کوشش تھی۔

اس تاریخ کو 1992 میں مجازٹرل فلم متعارف ہوئی جو پوری دنیا کے بچوں کا پسندیدہ کردار ہے۔

چودہ اپریل:

یہ یہودیوں کے ایک تہوار Pass over کی تاریخ ہے۔

یہ یہودی کلینڈر کا ایک اہم تہوار ہے جو آٹھ دنوں تک چلتا رہتا ہے۔ یہ تہوار بنی اسرائیل کی مصر سے آزادی کی یاد میں منایا جاتا ہے۔ یہ عموماً بہار کے موسم میں مناتے ہیں۔

توریت میں بھی اس تہوار کو منانے کا حکم دیا گیا ہے۔ (اور تم یاد رکھو کہ تم مصریوں کے غلام تھے) کتاب خروج۔

جب یہ حکم ملا تو لوگ جس حالت میں تھے اسی حالت میں اٹھ کر چل دیے۔ بہت سی عورتیں آٹا گوندھ کر روٹیاں

بنا رہی تھیں۔ جلدی جلدی میں بہت پتلی پتلی روٹیاں بنیں۔ اس تہوار کو اسی قسم کی روٹیاں بنائی جاتی ہیں۔

14 اپریل 1994ء میں پاکستان کے ایک مشہور دانشور اور سائنس دان جناب سلیم الزماں صدیقی کا انتقال ہوا۔

پندرہ اپریل:

پندرہ اپریل کو انکم ٹیکس ڈے منایا جاتا ہے۔

2013 میں بوسٹن کے میراتھن پر حملہ ہوا تھا۔ یہ حملہ پریشر کوکر بم کا تھا جس میں صرف پانچ افراد ہلاک ہوئے (اس کی جگہ ہم اگر اپنے آپ کو لیتے ہیں تو نہ جانے کتنے بم دھماکے ہو چکے ہیں۔ کتنے لوگ ہلاک ہو چکے ہیں۔ جبکہ وہاں صرف پانچ ہلاکتوں کے لیے پوری تاریخ بنادی گئی)

پندرہ اپریل 1452 میں دنیا کے ایک بہت بڑے آرٹسٹ کی پیدائش ہوئی تھی۔ اور وہ تھا اٹلی کا شہرۂ آفاق مصور، انجینئر، مجسمہ ساز لیونارڈو ڈاونچی۔

ڈاونچی کے جوہر بارہ برس کی عمر میں ہی سامنے آنے لگے تھے۔ اس کی ڈرائنگ شاندار تھی۔ اس کا ذہن ایجادات کی تکمیل راہیں تلاش کیا کرتا۔ اس کے بے شمار کارناموں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ بہت چھوٹی عمر میں اس نے ایک مشین بنائی تھی جس میں پہیے لگے ہوئے تھے۔

اس کے باپ نے اس کے شوق کو دیکھتے ہوئے اسے انسٹیٹیوٹ میں داخلہ دلادیا۔ جہاں اس کی صلاحیتیں اور نکھر آئیں۔ ڈاونچی بعد میں ملٹری انجینئر بھی ہو گیا تھا۔

فلورنس میں گھوم پھر کر اس نے فلورنس شہر کے نقشے بنائے اور اسے خوبصورت ترین مجسموں سے سجادیا۔ اس کے تعارف کے لیے اس کی خوبصورت ترین پینٹنگ مونالیزا ہی کافی ہے۔

پاکستان نے 15 اپریل 1994ء کو شاہین میزائل کا تجربہ کیا تھا۔

سولہ اپریل:

سولہ اپریل 1867ء ہوا باز ولبر رائٹ کی پیدائش ہوئی تھی۔ یہ دو بھائی تھے۔ تاریخ میں پہلی دفعہ انہوں نے اپنی بنائی ہوئی مشین کے ذریعے پرواز کی کوشش کی تھی۔ انہیں رائٹ برادرز کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔

سترہ اپریل:

سترہ اپریل 1875ء کو دنیا ایک نئے کھیل سے متعارف ہوئی۔ یہ کھیل اسنوکر تھا جو آج پوری دنیا میں کھیلا جاتا ہے۔ اس کو سر چیمبرلین نے متعارف کروایا تھا۔

سترہ اپریل 1953 میں پاکستان میں محمد علی بوگرہ نے پاکستان کے وزیراعظم کا حلف اٹھایا۔

اٹھارہ اپریل:

اٹھارہ اپریل 1906ء کو سان فرانسسکو میں ایک بہت بڑا زلزلہ آیا تھا۔ یہ زلزلہ علی الصباح 12-5 منٹ پر آیا تھا۔ اس میں بے شمار لوگ ہلاک ہوئے تھے۔ اس کا سب سے بھیانک پہلو یہ تھا کہ زلزلے کے بعد بھیانک آگ بھڑک اٹھی تھی جس نے آدھے شہر کو تباہ کر دیا تھا۔

پاکستان میں اٹھارہ اپریل 1959ء کو حکومت نے دو روزناموں اور ایک ہفت روزہ کو اپنے کنٹرول میں لے لیا تھا۔

یہ روزنامے تھے۔ پاکستان ٹائمز اور امروز۔ اور ہفت روزہ تھا۔ لیل و نہار۔

18 اپریل 1993 کو پاکستان میں ایک اور اہم واقعہ رونما ہوا۔ اس وقت کے صدر غلام اسحاق خان نے اسمبلی تحلیل کر کے نواز شریف کو ہٹادیا تھا۔ اور بلخ شیر مزاری نگراں وزیراعظم بنے تھے۔

انیس اپریل:

امریکی کیمسٹ گلین سی بورگ کی پیدائش ہوئی جس نے پلاٹینم دریافت کیا۔ 1951ء میں نوبل پرائز حاصل کیا تھا۔

انیس اپریل کو اچ شریف میں سید جلال الدین سرخ بخاری کا عرس منایا جائے گا۔

سید جلال الدین کا زمانہ 1199 سے 1291 تک کا ہے۔ انہیں جلال الدین سرخ پوش بخاری کہا جاتا ہے۔

حضرت بہاء الدین ذکریاؒ کے عقیدت مندوں میں سے تھے۔ سفر میں زندگی گزاری۔ روایت ہے کہ آپ کی ملاقات چنگیز خان سے بھی ہوئی تھی۔ آپ نے چنگیز خان کو اسلام کی طرف راغب کرنے کی کوشش کی۔ جس پر ناراض ہو کر اس نے آپ کو آگ میں ڈال دینے کا حکم دیا لیکن آگ کے شعلے سرد ہو گئے تھے۔

بیس اپریل:

بیس اپریل 1745 فلپ پائنل کی پیدائش کی تاریخ ہے۔ اس شخص کو سائیکاٹری کا بانی کہا جاتا ہے۔

بیس اپریل عیسائیوں کے مذہبی تہوار ایسٹر کی تاریخ ہے۔

ایسٹر کا مشہور تہوار گڈ فرائی ڈے سے پہلے حضرت عیسٰی کے زندہ ہونے کی یاد میں منایا جاتا ہے۔ اس کی تاریخ

میں اختلاف ہے۔ لیکن مغرب میں 22 مارچ سے لے کر 25 اپریل تک کسی بھی تاریخ میں منایا جاتا ہے۔ قدیم روایت کے مطابق ایسٹر موسم بہار کی دیوی کا نام ہے۔ یہ جشن ایک طرح سے بہار کا جشن بھی ہے۔ جبکہ ایران میں جشن بہار 21 مارچ کو ہوتا ہے اور اسے نوروز کہتے ہیں۔ مگر ایرانی اسے حضرت علیؓ کی خلافت کا آغاز کا دن قرار دیتے ہیں اور اس خوشی میں جشن بہاراں مناتے ہیں۔

ایسٹر میں عیسائی حضرات رات بھر عبادتیں کرتے ہیں ایک دوسرے کو تحائف دیتے ہیں۔ رنگین انڈے سجائے جاتے ہیں۔

پاکستان کے جہانگیر خان بیس اپریل 1988 کو اسکواش میں ساتویں بار ورلڈ چیمپئن بنے۔

اکیس اپریل:

اکیس اپریل 1828 کو نوح ویسٹر نے پہلی امریکن ڈکشنری شائع کی۔

اکیس اپریل کو مشہور ذریعہ تعلیم کنڈر گارٹن ڈے منایا جاتا ہے۔ اس تاریخ کو 1782 میں جرمنی کے ماہر تعلیم فریڈرک فروبل کی پیدائش ہوئی تھی۔ اسی شخص نے کنڈر گارٹن سسٹم متعارف کروایا تھا۔ اسی لیے اس کی یاد میں یہ دن منایا جاتا ہے۔

اکیس اپریل علامہ اقبال کی وفات کی تاریخ بھی ہے۔

بائیس اپریل:

بائیس اپریل 1799 Jean Poise کی پیدائش کی تاریخ ہے۔ اس شخص نے بلڈ پریشر جانچنے کا سسٹم متعارف کروایا۔

1853 فرانس کے الفانسے کی پیدائش ہوئی۔ اس نے کرائم ID سسٹم متعارف کروایا۔ بائیس اپریل 1864 میں امریکا کا پہلا سکہ جاری ہوا۔ جس پر لکھا تھا اے خدا ہم تجھ پر بھروسا کرتے ہیں۔

بائیس اپریل 1961 میں پاکستان میں فلم ایوارڈ کا اجرا ہوا۔

1962 میں اے کے فضل الحق انتقال کر گئے۔

تیئس اپریل

تیئس اپریل 1564 دنیا کے قد آور شاعر اور ڈراما نگار شیکسپیئر کی پیدائش کی تاریخ ہے۔

23 اپریل 1964 میں ایک اور مشہور ڈراما نگار شاعر دانشور برناڈ شا کے ڈرامے My Fair lady پر ایک خوبصورت فلم بنی تھی۔

تیئس اپریل 1985 میں کوکا کولا کا تجارتی راز نیو کوک سامنے آیا۔

چوبیس اپریل

چوبیس اپریل 1800 میں امریکا میں لائبریری آف کانگریس کی تشکیل ہوئی تھی۔

چوبیس اپریل 1743 انگلینڈ کے ایڈمنڈ کارٹ کی پیدائش کی تاریخ ہے۔ اس شخص نے پاور لوم بنایا تھا۔

چوبیس اپریل 1620 وہ تاریخ ہے جب جان گرانٹ نے ڈیموگرافی کی بنیاد رکھی۔ اس تاریخ کو 1914 میں جیٹسن ولسن پیدا ہوا۔ جس نے پوٹاٹو چپس متعارف کروایا۔ جو آج پوری دنیا میں شوق سے کھایا جاتا ہے۔

پچیس اپریل

25 اپریل 1990 میں Habble کا ٹیلی اسکوپ سامنے آیا۔ جس سے ستاروں کا مشاہدہ بہت واضح ہو گیا۔

25 اپریل 1961 میں رابرٹ فرائس نے "چپ Chip" متعارف کروائی۔ جس نے آج پوری دنیا کی معلومات کو سمیٹ کر رکھ دیا ہے۔

پچیس اپریل .... 1874 کو مارکونی کی پیدائش ہوئی۔ جس نے پوری دنیا کو ریڈیو کا تحفہ دیا۔ مارکونی کو 1909 میں نوبل پرائز سے نوازا گیا تھا۔

25 اپریل 1995 میں پاکستان میں جی ایم سید کا انتقال ہوا تھا اور اسی تاریخ کو 1996 عمران خان نے تحریک انصاف کی بنیاد رکھی تھی۔

ستائیس اپریل:

ستائیس اپریل 1791 کو سموئیل فن لے کی پیدائش ہوئی تھی۔ اس شخص نے دنیا کو ٹیلی گراف اور مورس کوڈ دیا تھا۔

اندازہ لگائیں کہ آج کی سائنسی ترقی کے پیچھے کتنے برسوں کی جدوجہد پوشیدہ ہے۔ قومیں اس طرح آگے بڑھتی ہیں۔

27 اپریل 1896ء کو ویلس ہیوم پیدا ہوا تھا۔ اس نے نائلون بنایا۔

اس تاریخ کو (عیسوی کیلنڈر) لاہور میں حضرت عنایت قادری اور پنڈی میں عرس تخی زمان ہوگا۔

تیس اپریل

قومی ایمانداری کا دن، پاکستان میں پرویز مشرف کی ریفرنڈم میں کامیابی۔

سراب

راوی : شہباز ملک

تحریر: کاشف زبیر

قسط: 84

وہ پیدائشی مہم جو تھا۔ بلند وبالا پہاڑ، سنگلاخ چٹانیں، برف پوش چوٹیاں اور نگاہ کی حدوں سے آگے کی بلندیاں اسے پیاری تھیں۔ اسے ان میں ایک کشش اور ایک للکارسی ابھرتی محسوس ہوتی کہ آؤ ہمیں دیکھو، مسخر کرو اور ہمارے سحر میں مسحور ہو کر اپنا آپ مٹا ڈالو۔ اسے یہ سب حقیقت لگتا مگر کیا واقعی یہ حقیقت تھا یا محض سراب...... ایسا سراب جو آنکھوں کے راستے ذہن ودل کو بھٹکاتا ہے، جذبوں کو مہمیز دیتا ہے مگر آسودگی اور اطمینان چھین لیتا ہے۔ سیرابی لمحوں کے فاصلے پر دکھائی دیتی ہے مگر وہ لمحہ حقیقت میں کبھی نہیں آتا۔ اس کی زندگی بھی سرابوں کے ایسے دائروں میں گزری اور گزرتی رہی۔ وقت کے گرداب میں ڈوبتے ہوئے نوجوان کی سنسنی خیز اور ولولہ انگیز داستان حیات۔

بلند حوصلوں اور بے مثال ولولوں سے گندھی ایک تہلکہ خیز کہانی

(گذشتہ اقساط کا خلاصہ)

بابا کا اصرار تھا کہ مجھے کیڈٹ کالج بھیج دیا جائے جبکہ میں آرمی میں جانا نہیں چاہتا تھا۔ میری محبت سویرا میرے بھائی کا مقدر بنادی گئی تو میں ہمیشہ کے لیے حویلی سے نکل آیا۔ اسی دوران نادر علی سے ٹکراؤ ہو گیا پھر یہ ٹکراؤ ذاتی انا میں بدل گیا۔ ایک طرف مرشد علی، فتح خان اور ڈیوڈ شا جیسے دشمن تھے تو

دوسری طرف سفیر، ندیم اور وسیم جیسے جاں نثار دوست۔ پھر ہنگاموں کا ایک طویل سلسلہ شروع ہوگیا جس کی کڑیاں سرحد پار تک چلی گئیں۔ میں لوٹا تو فتح خان سے ٹکراؤ ہوگیا۔ اس کے آدمیوں کو شکست دے کر میں اندرونِ ملک آگیا۔ آتے وقت میرے ہاتھ حکومت چین کا ایک بریف کیس شہلا کے ہاتھ لگ گیا۔ شہلا کو راضی کیا کہ وہ مجھے بینک کے لاکر تک پہنچا دے تاکہ میں چائنیز بریف کیس حاصل کرلوں۔ ہم بینک میں سیف سے نکال چکے تھے کہ شہلا نے فتح خان کے آدمیوں کو بلالیا تھا۔ وہ مجھے یرغمال بنا کر فتح خان کے گھر میں لے آئی۔ فتح خان نے مجھے مجبور کردیا کہ ... کرنے کے لیے مجھے ڈیوڈ شا کے ہیرے تلاش کرنے ہوں گے، میں ہیروں کی تلاش میں نکل پڑا۔ فتح خان، برٹ شا کو لے آیا جو پاگل ہوچکا تھا ... نے میری طرف سے ای میل بھیج کر ایمن کو بھی بلوالیا۔ برٹ شا نے میرے پستول سے فتح خان کو نشانے پر لیا تھا کہ اس کے آدمی نے برٹ شا کو گولی ... مرتے وقت برٹ شا بڑبڑایا "نارتھ...... ہکسٹ" دم توڑتے برٹ شا کی آواز صرف میں نے سنی تھی، تھوڑی دیر میں اندازہ ہوگیا کہ فتح خان نے اندر ... ہے کہ اس پوری کارروائی میں میرا ہاتھ ہے، تبھی مائیک سے اعلان ہوا کہ جو بھی ہے، وہ ہاتھ اٹھا کر باہر آجائے۔ وہ راجا صاحب کے آدمی تھے۔ ... میں محل میں آیا۔ وہاں ایمن بھی موجود تھی۔ اگلے دن ہم پنڈی جانے کے لیے نکلے۔ راستے میں فتح خان نے گھیر کر بے بس کردیا اور ایمن کو خودکش جیکٹ پہنادی جسے اتارنے کی کوشش کی جاتی تو دھماکا ہوجاتا۔ ہم عبداللہ کی کوٹھی میں ٹھہرے تھے اطلاع ملی کہ شہلا کا فون آیا تھا۔ میں شہلا کے گھر کی تلاش میں ... تو باہر سے گیس بم پھینک کر مجھے بے ہوش کردیا گیا۔ ہوش آنے کے بعد میں نے خود کو انڈین آرمی کے تحویل میں پایا مگر میں ان کو ان کی اوقات ... بھاگا۔ جیپ تک پہنچا تھا کہ فتح خان نے گھیر لیا۔ ابھی زیادہ وقت نہیں گزرا تھا کہ کرنل زوروسکی نے ہم دونوں کو پکڑ لیا۔ وہ مجھے پھر سے انڈین آرمی کی تحویل میں دینا چاہتا تھا۔ میں نے کرنل کو زخمی کرکے بساط اپنے حق میں کرلی۔ میں دوستوں کے درمیان آکر ٹی وی دیکھ رہا تھا کہ ایک خبر نظر آئی کہ ایک کوٹھی میں ... کوٹھی نادر علی کی تھی جسے کسی نے تباہ کیا تھا۔ مرشد نے بھائی کو راستے سے ہٹانے کی کوشش کی تھی۔ مجھے شہلا کی تلاش تھی۔ اس لیے نادر کی کوٹھی کی جانب ... تبھی خبر ملی کہ شہلا کسی صابر نامی شخص سے ملنے جارہی ہے۔ میں دوستوں کے ساتھ اس کی تلاش میں نکل پڑا۔ کچھ کے ذمے کام یہ لگایا کہ وہ صابر کو پکڑلیں۔ صابر تو پکڑ میں آگیا مگر شہلا نکل گئی۔ ہم اس گھر سے نکل کر مانسہرہ کی طرف بڑھنے لگے۔ وہاں وسیم کے ایک دوست کے گھر میں ٹھہرے۔ اس دوست کے بیٹے نے ایک خانہ بدوش لڑکی کو پناہ دی تھی وہ لڑکی مہرو تھی۔ وہ ہمیں بریف کیس تک لے گئی مگر وہاں بریف کیس نہ تھا۔ کرنل زوروسکی بریف کیس لے بھاگا تھا۔ ہم اس کا پیچھا کرتے ہوئے چلے تو دیکھا کہ کچھ لوگ ایک گاڑی پر فائرنگ کررہے ہیں۔ ہم نے حملہ آوروں کو بھگا دیا۔ اس گاڑی سے کرنل زوروسکی ملا۔ وہ زخمی تھا۔ ہم نے بریف کیس لے کر اسے اسپتال پہنچانے کا انتظام کردیا اور بریف کیس کو ایک گڑھے میں چھپا دیا۔ واپس آیا تو فتح خان نے مجھ پر قابو پالیا۔ پستول کے زور پر وہ مجھے اس گڑھے تک لے گیا مگر میں نے جب گڑھے میں ہاتھ ڈالا تو وہاں بریف کیس نہیں تھا۔ اتنے میں میری امداد کو ... جنس والے پہنچ گئے۔ انہوں نے فتح خان پر فائرنگ کردی اور میں نے ان کے ساتھ جا کر بریف کیس حاصل کرلیا۔ وہ بریف کیس لے کر چلے گئے۔ ... واپس عبداللہ کی کوٹھی پر آگئے۔ سفیر کو دبئی بھیجنا تھا اسے ائرپورٹ سے سی آف کرکے آرہے تھے کہ راستے میں ایک چھوٹا سا ایکسیڈنٹ ہوگیا۔ وہ گاڑی ممتاز حسن نامی سیاست داں کی بیٹی کی تھی میں نے ایک بار اس کی مدد کی تھی وہ زبردستی ہمیں اپنی کوٹھی میں لے آئی۔ وہاں پہنچ کر احساس ہوا کہ ہم قید ہوچکے ہیں۔ ممتاز حسن ہمیں کسی سے ملوانا چاہتا تھا۔ ہیلی کاپٹر پر جو شخص آیا اسے دیکھ کر میں چونک اٹھا۔ وہ میرے بدترین دشمنوں میں سے ایک تھا۔ وہ راج کنور تھا۔ پاکستان میں اس گھر تک کس طرح آیا اس سے میں بہت کچھ سمجھ گیا۔ اس نے مجبور کیا کہ میں ہر روز نصف لیٹر خون اسے دوں۔ بحالت مجبوری میں راضی ہوگیا لیکن ایک روز ان کی چالاکی کو پکڑ لیا کہ وہ زیادہ خون نکال رہے تھے۔ میں نے ڈاکٹر پر حملہ کیا تو نرس مجھ سے چمٹ گئی پھر میرے سر پر وار ہوا اور میں بے ہوش ہوگیا۔ ہوش آیا تو میں انڈیا میں تھا۔ بانو بھی اغوا ہوکر پہنچ چکی تھی۔ وہ لوگ ہمیں گاڑی میں بٹھا کر لے جارہے تھے راستے میں بی ایس ایف والوں نے رکنے کا اشارہ کیا۔ حیات اتر گیا اور کچھ ایسا کہا کہ وہ لوگ واپس چلے گئے۔ مجھے راج کنور کی حویلی میں پہنچایا گیا۔ وہاں اندرونی سازش عروج پر تھی۔ چھوٹے کنور نے سازش کرکے بانو کو اپنے بیڈ روم میں بے ہوشی کی حالت میں بلوالیا اور مجھ سے کہا کہ اگر تم نے اوشا کے ساتھ رات گزار لی تو بانو رہا ہوجائے گی۔ میں نے رامن پر حملہ کردیا۔ وہ مجھ پر قابو پاتا کہ کشی دل آگیا اور اس نے رامن کو پستول کے نشانے پر لے کر اپنے ساتھ چلنے کو کہا۔ بانو کو میرے پاس بھیج دیا گیا۔ کئی روز کے بعد مجھے کھانے میں بے ہوشی کی دوا دی گئی جس کا اثر نہیں ہوا۔ نائیک اور رامن اندر آئے۔ میں نے ان پر قابو پالیا پھر راج کنور پر قابو پایا لیکن جب دروازہ کھولا تو باہر بڑا کنور کھڑا کہہ رہا تھا "شہباز ہتھیار پھینک کر باہر آجاؤ۔" میں نے بروقت راج کنور کے ہاتھ پر ہماری پستول نکال کر دور جا گرا پھر وہاں سے نکل کر راستے میں شیام ... کی گاڑی پر قبضہ کیا اور راج کنور کو گاڑی میں ڈال کر بھاگ نکلا۔ شملہ پہنچ کر راجا صاحب سے بات کی۔ انہوں نے ہوٹل میں کمرا دلوادیا۔ میں راج کنور کو یرغمال بنا کر پاکستان پہنچنے کی تیاری کررہا تھا۔ اسپتال جہاں کنور کو رکھا گیا تھا وہاں سے نکل رہا تھا کہ پستول کی نال میری گردن پر آگئی اور رامن کی آواز ابھری۔ "ہلنا مت شہباز۔" میں نے اسے گھونسے مار کر بے ہوش کیا اور عقبی گلی سے نکل آیا، ہوٹل پہنچ کر اسکائپ کے ذریعہ تمام دوستوں اور اپنے گھر والوں سے بات کی۔ میں نے پلان بنایا تھا کہ کنور کو اغوا کرکے ہیلی کاپٹر کے ذریعہ بارڈر کراس کرلوں گا۔ اسے اغوا کرنے اسپتال پہنچا اور جیسے ہی اندر داخل ہوا ڈاکٹر امرت سنگھ سامنے آگیا۔ اس کے ہاتھ میں سرجیکل نائف تھی۔ اس نے چونک کر پوچھا آپ یہاں کیا کررہے ہیں۔ اسے میں نے قابو کرلیا۔ اس نے بتایا کہ رامن راج کنور کو نکال لے گیا ہے۔ میں نے فوراً پلان بنایا کہ ہیلی کاپٹر سے راج کنور کا پیچھا کروں گا اور اسے اغوا کرکے پاکستان لے جاؤں گا۔ کامیابی مل گئی اور میں راج کنور کو لے کر سرحد پار کرگیا۔ مگر جب اپنی سرزمین پر اترا تو خبر ملی کہ سعدیہ کو اغوا کرلیا گیا ہے اور اسے واپس انڈیا لے جایا جارہا ہے۔ میں نے واپسی کے لیے ہیلی کاپٹر لانے کو کہا۔ سنکاری جب ہیلی کاپٹر واپس لا رہا تھا کہ میزائل پھٹ گیا اور ہمارا ذہن تاریک ہوگیا۔ دھماکے سے ہیلی کاپٹر پانی پر گرا تھا مگر ہم سب محفوظ رہے، میں نے سڑک پر پہنچ کر ایک ٹرک کو روکا اور اس پر سوار ہوکر چلا تو بی ایس ایف کے کچھ سپاہیوں نے ہمیں گھیر لیا۔ ان کو ٹھکانے لگا کر ہم آگے بڑھے اور ایک طیارہ کرایہ پر لے کر سفر پر چل پڑے۔ شملہ پہنچے پھر وہاں سے راج کنور کے محل

کی ناکابندی کرنے جا پہنچے۔ میرا خیال تھا کہ جب سعدیہ کو لایا جائے گا تو راستے میں گاڑی کو روک لیں گے۔ کچھ دیر بعد ہائی وے پر ایک گاڑی کی ہیڈ لائٹس چمکیں۔ چیتو نے سڑک پر نوکیلی کیلیں بچھادی تھیں۔ گاڑی نزدیک پہنچتے ہی دھماکا سا ہوا۔ گاڑی سے فائر ہوا جو چیتو کے شانے میں لگا۔ ہم نے گولی چلانے والے کو ختم کردیا۔ گاڑی کی تلاشی لی مگر وہاں سعدی کی بجائے کنور تھا۔ ہم محل کی طرف دوڑے کہ ایک ہیلی کاپٹر اتر رہا تھا۔ اس سے سعدی اتری اور اندر چلی گئی۔ چیتو کو لے کر ڈاکٹر گپتا کے پاس پہنچا۔ اس نے طبی امداد دے کر ٹھہرنے کے لیے اپنی بہن سیتا کے گھر بھیج دیا۔ سیتا کا شوہر ارون اسے حراساں کررہا تھا اسے میں نے موت کی گود میں بھیج دیا پھر آگے بڑھا تھا کہ ہماری گاڑی کو دو طرف سے گھیر لیا گیا۔

(اب آگے پڑھیں)

جب سے میں نے سنا تھا کہ فتح خان انڈیا میں موجود ہے تب سے میرے ذہن کے کسی گوشے میں موجود تھا کہ کسی وقت بھی اس سے سامنا ہوسکتا ہے۔ اس سے پہلے بھی فتح خان متعدد بار ڈرامائی انداز میں میرے سامنے آچکا تھا مگر گزشتہ کچھ عرصے سے اس کا منحوس سایہ مجھے اپنے آس پاس نظر نہیں آیا تھا۔ کبھی کبھی مجھے لگتا کہ اب فتح خان سے میری جان چھوٹ گئی ہے کیونکہ گم شدہ ہیروں کی تلاش میں، میں اس کی مدد نہیں کرسکا تھا اور شاید وہ سمجھ گیا تھا کہ میں مدد کر بھی نہیں سکتا تھا۔ مگر اس وقت فتح خان کی صورت دیکھ کر میری ساری خوش فہمی دور ہوگئی تھی۔ فاکس ویگن سے اترنے والا فتح خان ہی تھا۔ اس نے صدری نما لباس پہن رکھا تھا اور بہ ظاہر خالی ہاتھ تھا لیکن مجھے یقین تھا اس کے اِس ڈھیلے لباس میں کئی طرح کا اسلحہ روپوش ہوگا اور وہ سیکنڈ کے نوٹس پر اسے نکالنے اور استعمال کرنے پر قادر ہوگا۔ اسے دیکھتے ہی چیتو نے پستول نکالنا چاہا لیکن میں نے روک دیا۔

"نہیں..... ہم گھرے ہوئے ہیں کوئی غیر ضروری حرکت مت کرنا۔"

"شوبی ہم ان کے ہاتھ نہیں آئے گا۔" چیتو غصے سے بولا۔ "یہ کتے کا بچہ ہمارا پیچھا کیوں نہیں چھوڑتا۔"

"کیونکہ یہ کتے کا بچہ ہے۔" میں نے تائید کی۔

فتح خان نیچے اتر کر کھڑا ہوگیا تھا۔ وہ خاموش تھا یعنی اس نے کوئی بکواس نہیں کی تھی۔ میں بھی خاموش بیٹھا رہا۔ البتہ میرا پستول میرے ہاتھ کی گرفت میں تھا۔ راج کنور ذرا حیران تھا۔ اس نے تجسس سے پوچھا۔ "شہباز، یہ کون ہیں؟"

"میرے دشمن۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "لیکن تم کسی خوش فہمی میں مت رہنا اگر کوئی غلط حرکت کی تو میں تمہیں ضرور شوٹ کردوں گا۔"

اس نے پاؤں کی طرف اشارہ کیا۔ "اس کے ساتھ میں کوئی غلط حرکت کیسے کرسکتا ہوں؟"

فتح خان خاموشی سے غالباً میری بے بسی سے لطف اندوز ہورہا تھا۔ اتنا تو وہ بھی سمجھتا تھا کہ اگر میں نے کچھ کرنا ہوتا تو اب تک کرچکا ہوتا۔ جیپ کا انجن اسٹارٹ تھا۔ چیتو نے آہستہ سے کہا۔ "شوبی ہم ریورس کرکے ویگن کو ٹکر مارتا ہے اسے راستے سے ہٹا کر ہم یہاں سے نکل سکتا ہے۔"

میں نے چیتو کی تجویز پر غور کیا اور فوراً مجھے محسوس ہوا کہ یہ بہت رسکی تجویز ہے۔ اول تو ہمارے سامنے چھ سے سات مسلح افراد تھے۔ جیپ کے حرکت میں آتے ہی ان کی خودکار گنوں کے دہانے بھی کھل جاتے۔ اتنے ہتھیاروں کے خلاف سامنے سے ہمیں کوئی تحفظ حاصل نہیں تھا۔ دوسرے اگر جیپ ویگن سے ٹکراتی تب بھی لازمی نہیں تھا کہ وہ راستے سے ہٹ جاتی۔ پھر پیچھے فتح خان اور اس کے چند ساتھی اور بھی تھے وہ بھی مزاحمت کرتے۔ اس کے بعد بھی ہم ریورس میں پیچھے جاتے تو بہت دور تک جیپ موڑنے کی کوئی جگہ نہیں تھی اتنی دیر میں سامنے موجود دونوں جیپیں ہمیں آلیتیں۔ اس لیے میں نے چیتو کی تجویز مسترد کردی۔ "یہ بہت خطرناک ہے۔ اگر ہم بچ بھی گئے تب بھی فرار مشکل ہے، یہ آسانی سے ہماری گاڑی ناکارہ بنا سکتے ہیں۔"

چیتو نے مایوسی سے سر ہلایا۔ "شوبی تو کیا خود کو اسے حوالے کردے؟"

"حالات کے مطابق فیصلہ کرنا ہوگا۔" میں نے کہا۔ "فی الحال صبر بہتر رہے گا۔" میں نے کہتے ہوئے بایاں ہاتھ باہر نکال کر بلند کیا اور بولا۔ "فتح خان میں نیچے آرہا ہوں اپنے کتوں کو پٹا ڈال کر رکھو۔"

"فکر مت کرو شہباز خاناں پٹا ڈلا ہوا ہے، ہمارا کتا میری مرضی کے بغیر بھونکتا بھی نہیں ہے۔"

سامنے موجود افراد کے چہرے ساکت رہے یعنی انہیں اس پر کوئی اعتراض نہیں تھا کہ میں اور فتح خان انہیں کتا قرار دے رہے تھے۔ یقیناً انہیں چوں نہ کرنے اور دم ہلاتے رہنے کا بہت بھاری معاوضہ دیا گیا ہوگا۔ میں نیچے اتر آیا اور نپے تلے قدموں سے فتح خان کی طرف بڑھا۔ وہ

چوکنا ہوگیا تھا۔ جب میں دس قدم دور تھا تو اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ ''بس شہباز خان وہیں رک جاؤ۔''

''اتنی گنوں کے ہوتے ہوئے بھی تم خوفزدہ ہو۔'' میرا لہجہ ہلکا سا استہزائیہ ہوگیا۔

''ہاں.... فتح خان نے اپنی حفاظت کے لیے کبھی دوسرے کا گن پر اعتبار نہیں کیا۔'' اس نے صاف گوئی سے کہا۔ ''یہ تمہارے واسطے ہے ہمارے واسطے نہیں۔''

میں ٹھہر گیا اور ٹھہرے ہوئے لہجے میں ہی بولا۔ ''فتح خان تم کیا چاہتے ہو؟ کیوں بار بار میرے راستے میں آتے ہو۔ میں نے تم سے کیا کہا تھا کہ اب تم میرے سامنے آئے تو مروت اور لحاظ کا ہر رشتہ ختم ہوجائے گا۔''

''ہم کو یاد ہے۔'' اس نے اپنی سفید ہوجانے والی خشخشی داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ ''یقین کرو شہباز خان ہم بھی ہر بار یہی سوچتا ہے کہ اب تمہارا سامنا نہیں کرے گا۔ ہم خطرناک دشمن پالنے کا قائل نہیں ہے یا تو اسے ماردیتا ہے اور مار نہ سکے تو اس سے دور رہتا ہے۔ پر تم سے ہمارا استارہ ملتا ہے۔ کوئی نہ کوئی ایسا سبب ہوجاتا ہے کہ تم سے ملنا پڑتا ہے۔''

''اب ایسا کیا سبب ہوگیا؟''

فتح خان نے پھر اپنی خشخشی داڑھی پر ہاتھ پھیرا۔ ''پرانا سبب ہے، تم جانتا ہے ڈیوڈ شا تم سے کیا چاہتا ہے۔''

یہ پہلا موقع تھا کہ فتح خان کھل کر بات کررہا تھا۔ میں نے سرہلایا۔ ''جانتا ہوں لیکن وہ حماقت کررہا ہے۔ میں نہیں سمجھتا کہ ایک ایسا انگریز جو جدید دنیا کا پروردہ ہے ایسی احمقانہ بات کا اتنی سنجیدگی سے قائل ہوجائے گا۔''

''معاملہ اُدھر کا نہیں اِدھر کا ہے۔'' فتح خان نے دماغ کے ساتھ دل کی طرف اشارہ کیا۔ ''اِدھر کوئی بات منطق سے نہیں آتا ہے اس لیے منطق سے کیسے نکالا جاسکتا ہے۔'' ان پڑھ اور بہ ظاہر جاہل نظر آنے والے فتح خان نے دانشوروں کی سی بات کی تھی اور وہ یقیناً ہمارے ان بہت سے نام نہاد دانشوروں سے بہتر ہے جن کی ساری دانشوری ان کے نظریات کے تابع ہوتی ہے۔ میں نے سرہلایا۔

''میں سمجھتا ہوں لیکن ڈیوڈ شا سے اس سلسلے میں میری جتنی بار بات ہوئی اور جو طے ہوا وہ ویسا نہیں کرسکا۔ تب وہ مجھے کس طرح مجبور کرسکتا ہے کہ میں اس کے ساتھ کسی احمقانہ ایڈونچر میں شامل ہوجاؤں۔''

''وہ تم سے ایک اور آخری بار بات کرنا چاہتا ہے۔'' فتح خان نے داڑھی پر ہاتھ پھیرنا چھوڑ کر تاخن سے دانتوں میں خلال شروع کردیا۔ ''جہاں تک مجبوری کا بات ہے تو اتنا آدمی کس واسطے لایا ہے تم ان کا مقابلہ کرسکتا ہے کیا تم مجبور نہیں ہے؟''

میں نے دل میں تسلیم کیا' میں مجبور تھا اتنے مسلح لوگوں سے صرف سپر مین لڑسکتا تھا کیونکہ اس پر گولیاں اثر نہیں کرتی ہیں لیکن میں گوشت پوست سے بنا انسان ہوں جسے ایک گولی سفر آخرا اختیار کرنے پر مجبور کرسکتی ہے اس لیے میں زندہ رہنے کے لیے مجبور تھا۔ البتہ ضروری نہیں تھا کہ میں فتح خان کے سامنے اس کا اقرار بھی کرتا۔ ''تم جانتے ہو میں نے کبھی خود کو بے بس نہیں سمجھا۔''

اس نے دانت نکالے۔ ''ہم جانتا ہے، اس لیے پورا بندوبست کرکے آیا ہے۔ ہم یہ بھی کرسکتا تھا کہ دو بندے لاتا اور وہ تم کو اور تمہارے ساتھی کو بے ہوشی والا بلٹ مارتا اور ہم تم کو آرام سے ڈھو کر لے جاتا۔ ہم پہلے بھی کئی بار یہ کام کیا پر اب ہم کو اچھا نہیں لگتا ہے تم اچھا اور معزز آدمی ہے اس لیے ہم تم کو معزز آدمی کی طرح لے جانا چاہتا ہے۔''

میں نے اس کی بات پر غور کیا اس بار اس کے لہجے میں شرارت نہیں تھی۔ وہ بالکل سنجیدگی سے بات کررہا تھا۔ ''معزز آدمی کی طرح جانے کی کیا صورت ہے؟''

''تم اپنا اور اپنے ساتھی کا سارا ہتھیار ہمارے حوالے کرے گا۔ کوئی موبائل یا رابطے کا چیز تمہارے پاس نہیں رہے گا۔ اس کے علاوہ ہم کچھ نہیں لے گا۔''

''تو باقی کیا بچا.... بس کچھ رقم اور یہ گھڑی۔'' میں نے استہزائیہ لہجے میں کہا۔ ''فتح خان ہتھیار تم کو دے کر کیا میں خالی ہاتھ رہ جاؤں۔ اس کے بعد تم میرے ساتھ جو چاہے کرو۔''

''نہیں ہم وعدہ کرتا ہے۔ اپنی مری ماں کی قسم کھاتا ہے تمہارے ساتھ کوئی غلط سلوک نہیں کرے گا۔'' فتح خان نے بات کرتے ہوئے اپنی گھڑی دیکھی۔ ''شہباز خان فیصلہ ذرا جلدی کرو ابھی تم کو لے کر جانا بھی ہے۔''

''ڈیوڈ شا کہاں ہے؟''

''شملہ میں ہے۔'' اس بار بھی اس نے صاف گوئی سے جواب دیا۔

''فرض کرو یہ غلط سلوک ڈیوڈ شا نے کرنے کا فیصلہ کرلیا تو تمہاری مری ماں کی قسم ٹوٹ نہیں جائے گی؟''

''ایسا نہیں ہوگا۔'' وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔ ''تم جانتا

ہے ڈیوڈ شا ٹھنڈے دماغ کا آدمی ہے۔''

''ہاں وہ کھانا کھاتے ہوئے کسی کو ٹھنڈے دماغ سے قتل کرکے اپنا کھانا مکمل کرسکتا ہے۔''

''شہباز خان تم جانتا ہے وہ تم سے کام لینا چاہتا ہے تمہارا جان لینا ہوتا تو اس کے لیے بہت مواقع آیا تھا پر اس نے ایسا نہیں کیا۔ کیا میں غلط کہہ رہا ہے؟''

میں نے دل میں تسلیم کیا کہ وہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔ ''میں اس وقت ایک بہت ضروری کام سے جارہا ہوں اور وہ میرے لیے ہر کام سے بڑھ کر ہے' اس صورت میں میں ڈیوڈ شا کے کام آنے سے انکار کروں گا تو اس کا ردعمل کیا ہوگا؟''

''میں جانتا ہے تم کس کام سے جارہا ہے۔'' فتح خان نے کہا اور ذرا آگے آکر آہستہ سے بولا۔ ''تم چاہے تو ڈیوڈ شا تمہارے کام آسکتا ہے۔ کنور پیلس سے کسی کو نکالنا بہت مشکل کام ہے کم سے کم تم دو افراد کے بس کا نہیں ہے۔ اس کے لیے درجنوں مسلح اور تربیت یافتہ افراد اور بہت سارا جدید اسلحہ چاہیے۔''

''جو صرف تم اور ڈیوڈ شا مہیا کرسکتے ہو۔''

''وہی کرسکتا ہے ہمارا اتنا اوقات نہیں ہے۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔ میں گفتگو کو بلاوجہ طول نہیں دے رہا تھا میں فتح خان اور اس کے باس کے عزائم جاننے اور اندازہ لگانے کی کوشش کررہا تھا مجھے محسوس ہوا کہ فتح خان مجھے ترغیب دے رہا ہے کہ میں شرافت سے اس کے ساتھ چلا چلوں اور اسے ہنگامہ آرائی نہ کرنی پڑی۔ اس کے پاس مجھے مجبور کرنے کے لیے تمام تر قوت تھی لیکن وہ اس کا استعمال نہیں چاہتا تھا ایک بار گولیاں چلنا شروع ہوجائیں تو کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ کون بچے گا اور کون مارا جائے گا۔ اس وقت زیادہ امکان تو میرا اور بیتو کا تھا۔ ہم دو تھے اور ہمارے مقابلے پر کم سے کم دس افراد تھے۔ فتح خان مجھے غور سے دیکھ رہا تھا' میں نے کہا۔

''تم نے کیسے پتا چلایا کہ میں یہاں ہوں۔''

''جیسے ہی مجھے پتا چلا کہ سعدیہ یہاں آگیا ہے میں نے ادھر جال بچھا دیا۔ مجھے معلوم تھا تم ادھر آئے گا اور تم آیا۔''

میں نے اللہ کا شکر ادا کیا کہ یہ بات بھارتی ایجنسیوں کی عقل میں نہیں آئی یا ممکن ہے انہیں سعدیہ کی واپسی کا علم ہی نہ ہو۔ میں نے فتح خان سے مطالبہ کیا۔ ''میں ایک بار ڈیوڈ شا سے بات کرتا ہوں۔''

''تم کو اس سے بات کرانے کے واسطے تو لے جارہا ہے۔'' فتح خان نے عیاری سے کہا اور گھڑی دیکھ کر بولا ''شہباز خاناں وقت ختم ہوگیا۔ اب فیصلہ کرلے، ہوش میں جاتا ہے یا ہم تم کو بوری کی طرح اٹھا کر لے جائے۔''

فاکس ویگن کے کھلے دروازے سے ایک نال نمودار ہوئی جس کا کیلی بر کسی عام نال سے بڑا تھا، یہ تقریباً پون انچ قطر کی تھی۔ یقیناً اس سے بے ہوش کرنے والے ڈارٹ فائر کیے جاتے ہوں گے۔ میں نے ہاتھ اوپر کیا۔ ''اوکے ....اوکے....''

''لڑکے کو نیچے بلالو۔''

میں نے بیتو کو آواز دی۔ ''نیچے آجاؤ۔''

وہ نیچے اتر آیا اور فتح خان کے سامنے جاکر بولا۔ ''ہمارا نام لڑکا نہیں بیتو ہے۔''

فتح خان نے معنی خیز انداز میں کہا۔ ''بڑا کرنٹ ہے تیرے میں، کبھی آزما کر دیکھے گا۔''

''فتح خان کام کی بات کرو۔''

''اب تم اپنا سارا ہتھیار نیچے ڈال دو۔''

میرے اور بیتو کے پاس پستول تھے، وہ ہم نے نیچے ڈال دیئے۔ فتح خان نے ہمیں پیچھے ہٹنے اور دونوں ہاتھ گردن پر رکھ کر گھٹنوں کے بل بیٹھنے کا حکم دیا۔ میں نے اعتراض کیا۔ ''یہ کس خوشی میں جب ہم اپنے ہتھیار پھینک چکے ہیں؟''

''تمہارا تلاشی ہوگا۔'' فتح خان نے کہا۔

''ضرور۔'' میں نے کہا۔ ''میرے پاس موبائل ہے میں وہ نکال رہا ہوں۔''

اس سے پہلے کہ فتح خان مجھے روکتا۔ میں نے موبائل نکالا اور اچانک ہی ہاتھ گھما کر اسے نیچے کھائی میں پھینک دیا۔ کھائی اچھی خاصی گہری تھی اور اب فتح خان اپنے آدمیوں کو بھیج بھی دیتا تو یہ بھوسے میں سوئی تلاش کرنے کے مترادف ہوتا۔ موبائل میں سفیر، عبداللہ اور وسیم کے نمبرز اور خاصی معلومات تھیں جو کسی صورت فتح خان کے ہاتھ نہیں لگنی چاہئیں تھیں اس نے کھا جانے والی نظروں سے مجھے دیکھا۔ ''یہ تم نے اچھا نہیں کیا۔''

''میں اکثر اچھا نہیں کرتا ہوں۔'' میں نے بے پروائی سے کہا اور گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہوئے دونوں ہاتھ گردن پر رکھ لیے۔ بیتو تیار نہیں تھا لیکن میرے اشارے پر مجبوراً وہ

گردن پر ہاتھ رکھ کر گھٹنوں کے بل بیٹھ گیا۔ فتح خان کے اشارے پر اس کے آدمیوں نے ہمیں گھیر لیا تھا اور متعدد گنوں کے دہانے ہماری طرف تھے۔ تلاشی لے کر انہوں نے میرے پاس سے چاقو اور رقم نکال لی تھی۔ اصل رقم لیپ ٹاپ والے بیگ میں تھی لیکن اس وقت رقم کے بجائے مجھے اپنی اور بیتو کی فکر تھی۔ فتح خان نے چاقو اور رقم رکھ لی۔ میں نے اروِن کا آئی فون اس کھائی میں پھینک دیا تھا جس میں اس نے چھلانگ لگائی تھی۔ اسے اپنے پاس رکھنا قتل کا ثبوت لیے پھرنے کے مترادف تھا۔ فتح خان کی بات سے میں نے اطمینان محسوس کیا کہ وہ بیتا کے بارے میں بے خبر تھا۔ اس آئی فون کی مدد سے وہ بہت کچھ جان سکتا تھا۔ جب اروِن کی لاش ملتی تو اس سے میرا تعلق ثابت ہو جاتا۔ ہماری مکمل تلاشی لے کر ہمارے ہاتھوں میں نائلون کی ہتھکڑیاں لگا دی گئی تھیں۔

میں نے فتح خان کی طرف دیکھا۔ ''میں اس وقت خود کو خاصا معزز محسوس کر رہا ہوں۔''

''ایسا ہوتا ہے، یہ جتنا بڑا لیڈر لوگ ہے پہلے اسی طرح جیل جاتا ہے پھر معزز بنتا ہے۔''

''تم مجھے معزز بنا رہے ہو یا گالیاں دے رہے ہو۔ اللہ نہ کرے جو میں اس قسم کا لیڈر بنوں جیسے آج کل ہمارے لیڈر ہیں۔''

''قائداعظم کا دوران کے ساتھ ختم ہو گیا تھا۔'' فتح خان نے بے پروائی سے کہا اور ہمیں وین میں ڈالنے کا اشارہ کیا۔ ہمیں دھکیل کر وین میں بٹھا دیا گیا۔ اس میں آمنے سامنے چوڑی نشستیں تھیں۔ فتح خان اپنے ایک آدمی کے ساتھ اندر آیا۔

''یہ گاڑی، اس کا سامان اور اس میں بیٹھا ہوا آدمی تمہارے پاس میری امانت ہے اس میں سے ایک چیز بھی کم ہوئی تو تمہیں حساب دینا ہوگا۔'' میں نے کہا۔

''شہباز خان فکر نہ کرو سب پورا ملے گا۔'' اس نے کہا اور سلائیڈنگ ڈور بند کر دیا۔ یہ حصہ بالکل پیک تھا۔ کھڑکیوں اور عقبی شیشے گہرے سرمئی رنگ کے تھے اور باہر کا منظر دیکھنا ممکن نہیں تھا۔ دروازہ بند کرتے ہی وین حرکت میں آئی۔ اس نے موڑ کاٹا اور واپس روانہ ہو گئی۔ دوسری گاڑیوں اور ہماری جیپ کا پتا نہیں تھا لیکن امکان تھا کہ وہ پیچھے آ رہے ہوں گے۔ فتح خان کے ساتھ بیٹھا ہوا دوسرا شخص خاموش اور بہ ظاہر خالی ہاتھ تھا۔ مگر یہاں اس کی موجودگی کا مقصد یقیناً ہمیں قابو میں رکھنا تھا۔ شملہ تک خاصا طویل [illegible] تھا۔

''کیا ہمیں پورا راستہ اسی طرح بندھے ہاتھوں [illegible] بیٹھنا پڑے گا؟'' میں نے فتح خان سے کہا۔

اس نے ایک بار پھر گھڑی دیکھی اور بولا۔ ''[illegible] کچھ دیر صبر کرو پھر تم شا کے سامنے ہوگا۔''

''یہ کچھ دیر کئی گھنٹوں پر مشتمل ہو سکتے ہیں۔'' میں نے اسے آگاہ کیا۔ ''مجھے معلوم ہے شملہ یہاں سے [illegible] دور ہے۔''

''میرے کو بھی معلوم ہے۔'' وہ بولا۔ اسی لمحے وین کی رفتار کم ہوئی اور وہ کسی کچے راستے پر آ گئی تھی۔ وہ ہائی وے سے ہٹ گئی تھی اور کسی قدر بلندی کی طرف جا رہی تھی۔ فتح خان نے میری طرف دیکھا۔ ''شہباز خان تم نے ادھر بہت کارنامہ انجام دیا ہے۔ پورا انڈین گورنمنٹ پریشان ہے۔''

''وہ میری تلاش میں ہیں اور اگر راستے میں انہوں نے روک لیا تو میرے ساتھ تم بھی لپیٹ میں آ جاؤ گے۔''

''کسی کا باپ بھی ہم کو نہیں روک سکتا۔'' اس نے بے پروائی سے کہا۔ اسی لمحے وین رک گئی۔ فتح خان نے اس کا دروازہ کھولا اور نیچے اتر گیا۔ پھر اس نے مجھے اور بیتو کو نیچے آنے کو کہا۔ ہم بھی وین سے اتر آئے۔ یہ جگہ سڑک سے ہٹ کر ایک کسی قدر گول ہموار سطح والی پہاڑی پر تھی اور خاص بات یہاں موجود ایک چھوٹا ہیلی کاپٹر تھا۔ اب میری سمجھ میں آیا کہ فتح خان کچھ دیر میں ہمیں ڈیوڈ شا کے سامنے پیش کرنے کی بات کیوں کہہ رہا تھا؟ ہمیں باقی سفر یقیناً اسی ہیلی کاپٹر سے کرنا تھا۔ فتح خان نے پستول نکال لیا تھا اور بہت چوکنا ہو رہا تھا۔ یہاں تک صرف وین آئی تھی اور باقی گاڑیاں یقیناً ہائی وے پر محوِ سفر تھیں ویسے بھی ہیلی کاپٹر میں پائلٹ کے علاوہ چار افراد کی گنجائش تھی۔ مجھے اور بیتو کو درمیان میں اس طرح جگہ ملی کہ فتح خان کا ساتھی درمیان میں آیا تھا۔ خود فتح خان پائلٹ کے ساتھ والی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ کیونکہ ہمارے ہاتھ پشت پر بندھے ہوئے تھے اس لیے فتح خان کے ساتھی نے میری اور بیتو کی سیٹ بیلٹس باندھی تھیں۔

ہمارے بیٹھتے ہی پائلٹ نے انجن چلا دیا تھا اور ایک منٹ سے بھی پہلے ہیلی کاپٹر کے پنکھے پوری رفتار سے گردش کرنے لگے تھے۔ میں نے دیکھا وین واپس جا رہی تھی اور

اسی لمحے ہیلی کاپٹر ایک دھچکے سے اوپر اٹھ گیا۔ چند منٹ میں ہیلی کاپٹر خاصا بلند ہو کر جنوب کا رخ کر رہا تھا۔ دس بج رہے تھے اور سورج خاصا بلند ہو رہا تھا۔ بیتو خاصا مایوس تھا اس نے چلا کر میرے کان میں کہا۔ ''شوبی یہ کیا ہے ہم پھر پکڑا گیا۔''

''یہ ہمارا نصیب ہے۔'' میں نے سرد آہ بھری۔ ''ہر کچھ عرصے بعد یہ مشق دُہرائی جاتی ہے۔''

''پر شوبی ہر بار ہم بچ جاتا ہے۔''

''کیونکہ ہم زندہ رہنے کی کوشش کرتے ہیں۔'' میں نے کہا۔ ہیلی کاپٹر نے رفتار پکڑ لی تھی۔ اس چھوٹے لیکن جدید ہیلی کاپٹر کا انجن طاقت ور تھا اور یہ سنگاری کے ہیلی کاپٹر سے کہیں تیز تھا۔ مشکل سے بیس منٹ گزرے ہوں گے کہ شملہ کے آثار نمایاں ہونے لگے۔ اگرچہ ہم نے ہیڈ فون نہیں لگا رکھے تھے اس کے باوجود اندر شور کم تھا۔ ورنہ اب تک جن ہیلی کاپٹرز میں سفر کیا تھا ان کا شور دماغ خراب کرنے کے لیے کافی ہوتا تھا۔ مزید چند منٹ بعد ہم ایک پہاڑی کے اوپری حصے میں بنے خوب صورت مینشن کے ہیلی پیڈ پر اتر رہے تھے۔ تمام پہاڑی مقامات کی طرح شملہ میں بھی آبادیاں مختلف پہاڑی ڈھلانوں پر ہیں۔ کہیں کہیں عام افراد کی آبادیاں تھیں۔ یہاں قریب قریب کھلونوں کی طرح مکانات تھے۔ طرزِ تعمیر بس گزارے لائق تھا۔ کہیں درمیانے درجے کی آبادیاں تھیں جن میں صاف ستھری اور خوب صورت کئی کئی منزلہ عمارات، بازار اور چھوٹے بنگلے بنے ہوئے تھے۔

چند ایک آبادیاں امرا کی تھیں جن میں اعلیٰ تعمیراتی ذوق کی حامل عمارات تھیں۔ ان کی شان و شوکت ان کی وسعت سے ظاہر تھی، یہ پہاڑی بھی امرا کے لیے مخصوص تھی۔ یہاں صاف ستھری کشادہ سڑکیں جن کے ساتھ گرین بیلٹ بھی تھی۔ ڈھلان پر جا بہ جا اونچے اور خوب صورت پہاڑی درختوں کے چھوٹے چھوٹے جنگل، سڑکوں کے علاوہ پیدل آمد و رفت کے لیے جگہ جگہ پتھر اور لکڑی سے بنی سیڑھیاں تھیں جن کے دائیں بائیں ریلنگ بھی لگائی گئی تھی۔ ہیلی کاپٹر سے یہ سب صاف نظر آ رہا تھا۔ ہم جس مینشن کے ہیلی پیڈ پر اتر رہے تھے اس میں کئی عمارتیں تھیں۔ کئی سطحوں پر بنے باغات تھے۔ ایک بڑا کار پورچ تھا جس میں نصف درجن قیمتی گاڑیاں پارک تھیں اور اس سے کہیں زیادہ گاڑیاں پارک ہو سکتی تھیں۔ تمام عمارتوں کے اوپر گلابی کھپریل کی چھت تھی اور عمارتوں پر دودھیا گلابی رنگ تھا۔ ہیلی کاپٹر ہلکے سے دھچکے کے ساتھ ہیلی پیڈ پر اتر گیا۔ پائلٹ نے انجن بند کیا اور سیٹ بیلٹ کھولتا ہوا نیچے اتر گیا۔

فتح خان کے ساتھی نے ہماری سیٹ بیلٹس کھولیں۔ اس دوران میں فتح خان بھی نیچے اتر گیا تھا اس نے میری طرف کا دروازہ کھولا اور میں نیچے اتر آیا۔ فتح خان مسکرایا۔ ''دیکھا تم کو گھنٹے سے بھی پہلے ادھر لے آیا ہے۔''

''تمہاری مہربانی۔'' میں نے چاروں طرف دیکھا۔ ''یہ کون سی جگہ ہے۔''

''اسے پنک مینشن کہتے ہیں۔'' فتح خان نے بتایا۔ ''راجستھان کے ایک ٹھاکر کی ملکیت ہے۔''

''اوہ' اسی مناسبت سے پنک ہے۔'' میں نے کہا۔ بیتو اور فتح خان کا ساتھی بھی اتر آئے تھے۔ فتح خان نے کہا۔

''آؤ میرے ساتھ۔''

وہ ایک چھوٹی عمارت کی طرف بڑھا۔ دروازے پر ایک راجپوت گارڈ موجود تھا۔ اس نے سوالیہ نظروں سے فتح خان کی طرف دیکھا تو اس نے اسے ایک طرف دھکیل دیا۔ ''ہٹو راستے سے خانہ خراب۔''

گارڈ جس نے راجپوتی پگڑی باندھ رکھی تھی خونخوار نظروں سے فتح خان کو دیکھا جو اس کی طرف دیکھے بغیر اندر جا چکا تھا۔ مگر وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ میں اور بیتو فتح خان کے پیچھے تھے اور فتح خان کا آدمی ہمارے پیچھے تھا۔ فتح خان ہمیں ایک نشست گاہ میں لایا۔ یہاں فرش پر قالین اور چند گدیوں والے صوفے تھے۔ دیواریں سادہ اور ایک طرف آتش دان تھا۔ فتح خان نے صوفے پر براجمان ہوتے ہوئے اپنے آدمی کو حکم دیا۔ ''ان کے ہاتھ کھول دو۔''

اس نے چاقو نکالا اور نائلون کی ہتھکڑی کاٹ دی۔ میرا ہاتھ آزاد ہوتے ہی فتح خان نے پستول نکال کر اس کا رخ بیتو کی طرف کر دیا۔ میں نے پوچھا۔ ''یہ کس لیے فتح خان؟''

''حفظِ ماتقدم۔'' وہ مکاری سے بولا۔

''تمہاری اردو خاصی بہتر ہو گئی ہے۔'' میں نے تلخ لہجے میں کہا اور اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ میری کلائیوں پر نشان پڑ گئے تھے لیکن میں نے فتح خان کے سامنے

انہیں سہلانے سے گریز کیا۔ بیتو آزاد ہو کر میرے ساتھ بیٹھا تھا کہ فتح خان نے حکم دیا۔

''اسے لے جاؤ یہاں سے۔''

''یہ یہیں رہے گا۔'' میں نے کہا۔ ''تم نے جو بات کرنی ہے اس کے سامنے کرو ورنہ چپ رہو۔''

میرے دوٹوک لہجے پر فتح خان کا رنگ بدلا تھا مگر وہ چالاک آدمی تھا۔ اس نے بات بدل دی۔ ''ٹھیک ہے کوئی خاص بات نہیں ہے۔ اصل میں ڈیوڈ شا سے صرف تمہاری ملاقات ہوگی۔''

''تب کی تب دیکھی جائے گی، ویسے ڈیوڈ شا کہاں ہے؟''

فتح خان نے شانے اچکائے۔ ''وہ باس ہے، میں کیا کہہ سکتا ہے لیکن اس کو پتا چل گیا ہوگا تم ادھر آگیا ہے، وہ تم سے ملے گا۔ تم کو کسی چیز کی ضرورت ہے؟''

''ہاں کوئی گرم چیز مل جائے تو اچھا ہے۔ گرم چیز سے مراد چائے کافی ہے۔''

فتح خان نے میز پر رکھی گھنٹی کا بٹن دبایا اور مترنم آواز گونجی فوراً ہی دروازے کھلا اور ایک نوعمر خادمہ اندر آئی۔ اس کی عمر شاید سولہ سترہ برس تھی لیکن وہ لڑکی نہیں رہی تھی۔ ایک خاص قسم کی تجربے کاری اس کے چہرے اور تاثرات سے جھلک رہی تھی۔ اس نے ساڑی باندھ رکھی تھی۔ وہ اندر آکر دونوں ہاتھ جوڑ کے کھڑی ہوگئی۔ فتح خان نے اسے حکم دیا۔ ''چائے اور کافی کے ساتھ کچھ کھانے کو لاؤ... پر خیال رکھنا ادھر سب مسلمان ہے کوئی حرام یا جھٹکے والا چیز مت لانا۔''

خادمہ کے جانے کے بعد میں نے فتح خان سے پوچھا۔ ''کیا تمہیں ایسی چیزوں سے فرق پڑتا ہے؟''

''کلمہ شریف تو میں بھی پڑھا ہے۔'' وہ بے پروائی سے بولا۔ اس نے اب پستول گود میں رکھ لیا تھا مگر اس کے دستے پر اس کی گرفت موجود تھی۔ ایسا لگ رہا تھا وہ میری طرف سے کچھ زیادہ ہی چوکنا تھا۔ شاید ڈیوڈ شا نے اسے وارننگ دی تھی کہ کسی گڑبڑ کی صورت میں ذمے دار اسے قرار دیا جائے گا۔ حالانکہ ہم یہاں آگئے تھے تو اب یہاں سے فرار تقریباً ناممکن حد تک مشکل تھا۔ جس جگہ ڈیوڈ شا تھا وہاں کی حفاظت میں کوئی سقم مشکل سے پایا جا سکتا تھا۔ میں نے راج کنور کے بارے میں پوچھا۔ ''وہ کہاں ہے؟''

''راستے میں ہے۔''

''وہ یہاں آئے گا؟''

''نہیں، وہ کہیں اور جائے گا۔''

''میری گاڑی اور سامان؟''

''گاڑی نہیں آئے گی سامان آجائے گا۔'' فتح خان نے صاف گوئی سے کہا۔

''تب ہو سکے تو ایک کام کرو، گاڑی کو شملہ میں کہیں لاوارث چھوڑ دو۔ پولیس اسے خود اس کے مالک تک پہنچا دے گی۔''

فتح خان نے سر ہلایا۔ ''میرے آدمی ایسا ہی کریں گے۔''

میں صوفے پر ذرا اچھل کر بیٹھ گیا۔ ''تمہارے دماغ سے ہیروں کا خناس نکل گیا ہے یا ابھی باقی ہے؟''

''ابھی ہم اس پر نہیں سوچ رہا۔'' اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

''اس کا مطلب ہے خناس باقی ہے۔'' میں نے کہا۔ ''فتح خان تم نے جتنا وقت، رقم اور قوت ان ہیروں کے چکر میں ضائع کی ہے، کسی اور کام میں لگاتے تو ان ہیروں کی مالیت سے زیادہ ہی حاصل کر سکتے تھے۔''

''کبھی کبھی ہم بھی سوچتا ہے۔'' اس نے اپنی شیو کھجائی۔ ''پر کوئی اور ایسا کام ملا ہی نہیں۔''

''حالانکہ جو کام تم ڈیوڈ شا کے لیے کر رہے ہو یہی کر لیتے۔ اس خطے میں اسلحے اور منشیات کی اسمگلنگ سے زیادہ نفع بخش کاروبار اور کوئی نہیں۔ انسانوں کی اسمگلنگ بھی اب اربوں کا بزنس بن چکا ہے۔ اگر اس سے نیچے کا کوئی کام کرنا چاہتے ہو تو وطن عزیز میں زمینوں پر قبضہ بھی ایک اچھا بزنس ہے۔ اسی طرح ایک لائن لگی ہے تمہارے مطلب کے کاموں کی۔''

''بات وہی ہے میں نے توجہ نہیں دیا۔'' اس نے ٹھنڈی سانس لی۔

''اب اپنے باس سے بات کر لو وہ تمہیں یورپ لے جائے وہاں اس کام میں بہت پیسا ہے یعنی کرائے کے فوجی وہاں بہت کماتے ہیں۔''

''میں سوچے گا۔'' فتح خان نے بیزاری سے کہا۔ ''پہلے ایک کام تو کر دے۔''

''اگر تمہارا اشارہ میری طرف ہے تو تم یہ کام کر چکے ہو۔''

''ہاں مگر اصل کام باقی ہے بتم کو ڈیوڈ شا کا کام کرنے پر راضی کرنا۔''

''یہ تمہارا نہیں اُس کا کام ہے۔''

فتح خان نے جواب نہیں دیا۔ وہ کسی سوچ میں گم تھا اور میں نے محسوس کیا کہ وہ کچھ پریشان بھی تھا حالانکہ اس نے اپنا مشن کامیابی سے مکمل کر لیا تھا۔ کچھ دیر بعد خادمہ ایک ٹرالی پر چائے اور کافی کے لوازمات کے ساتھ کھانے پینے کو بھی اچھا خاصا لے آئی۔ اس میں سموسے، سینڈوچز، ترکاری اور روٹی سی بنی پوریاں تھیں۔ اس کے ساتھ مختلف طرح کی چٹنیاں تھیں۔ ان کے متوازی کوکیز، بسکٹس اور کیک پیس کی انگلش ریفرشمنٹ بھی تھی۔ وہ سب سے پوچھ پوچھ کر چیزیں نکال کر سرو کرنے لگی۔ بیتو نے بلاتکلف سب نکلوا لیا۔ میں نے سموسے اور پوری لی ایک کٹوری میں املی کی چٹنی بھی تھی۔ فتح خان نے بھی سموسے لیے تھے۔ ابھی اس نے کھانا شروع کیا تھا کہ موبائل نے بیل دی۔ اس نے پلیٹ رکھ کر موبائل نکالا اور اسے دیکھ کر کھڑا ہو گیا اس نے نظروں میں اپنے آدمی کو کوئی اشارہ کیا اور کال ریسیو کرتا ہوا باہر چلا گیا۔ میں نے صرف اتنا سنا۔

''یس سر....''

فتح خان کے جاتے ہی میں نے حرکت میں آنے کا فیصلہ کیا تھا۔ میں نے برابر میں بیٹھے بیتو کو کہنی ماری تو اس نے کن انکھیوں سے میری طرف دیکھا اور میں نے سر ہلایا تو وہ سمجھ گیا۔ فتح خان کا آدمی ہمارے دائیں طرف موجود تھا۔ وہ دروازے کے پاس کھڑا تھا۔ میں نے سرخ مرچوں کی چٹنی کی پلیٹ اٹھائی اور اسے اپنی طرف کھینچا اور پھر بجلی کی سی تیزی سے اس پر کھینچ مارا۔ ابھی پلیٹ راستے میں تھی کہ میں اپنی جگہ سے کھڑا ہو گیا۔ میں نے اس کی طرف دیکھا میرا خیال تھا کہ چٹنی کی پلیٹ اس کے منہ نہیں تو جسم پر ضرور لگی ہوگی مگر حیرت انگیز پھرتی کے ساتھ وہ ایک طرف کھسک کر پلیٹ اور چٹنی سے بچ گیا۔ پلیٹ دروازے سے ٹکرا کر ٹکڑوں میں بٹ گئی اور چٹنی نے دروازے اور دیوار پر نئے ڈیزائن بنائے تھے۔ فتح خان کا آدمی بچ گیا بس چٹنی کے چند چھینٹے اس پر آئے تھے۔

میں کافی کی تام چینی کی کیتلی اٹھاتے ہوئے اس کی طرف جھپٹا اور گھما کر اسے کیتلی ماری۔ اس بار بھی وہ حیرت انگیز پھرتی سے بچ نکلا تھا اس نے غوطہ مارا اور ایک طرف جا گرا اگلا وار بیتو نے کیا اس نے چائے کی کیتلی اٹھا کر ماری۔ میرا خیال تھا کہ وہ اب نہیں بچ سکے گا مگر وہ تو شاید بجلی کا بنا ہوا تھا اٹھتے اٹھتے وہ واپس گرا اور چائے دانی اس کے اوپر سے گزر دیوار سے ٹکرائی اور بکھر گئی لیکن اس سے پہلے کہ کھولتی چائے اس پر گرتی اس نے سانپ کی طرف کروٹ لی اور دیوار سے دور ہو گیا۔ چٹنی کی پلیٹ کی پرواز کے ساتھ ہی خادمہ چیخ مار کر مخالف کونے میں چلی گئی تھی۔ مسلسل تین وار سے بچ کر اس نے ثابت کر دیا تھا کہ فتح خان ایسے ہی اسے ہم پر مسلط کر کے نہیں گیا تھا۔ میں یک دم محتاط ہو گیا۔ میں نے اس پر نظر جماتے ہوئے بیتو سے کہا۔ ''خادمہ کے پاس چلے جاؤ اسے قابو رکھو۔ درمیان میں مداخلت مت کرنا یہ میرا حکم ہے۔''

بیتو زخمی تھا اور اس کا زخم ابھی پورا طرح نہیں بھرا نہیں تھا اس لیے میں اسے اس شخص سے دور رکھنا چاہتا تھا۔ بیتو ویسے بھی جسمانی لڑائی کا ماہر نہیں تھا۔ عام آدمی کو آسانی سے قابو کر سکتا تھا لیکن یہ یقیناً عام شخص نہیں تھا۔ وہ قالین سے اٹھا اور مسکرایا تو اس کے چوڑے اور سفید دانت نمایاں ہوئے تھے۔ نقوش سے وہ مقامی لگ رہا تھا۔ شاید اس کی رگوں میں ملی جلی نسلوں کا خون تھا۔ اس میں تبتیوں کی جھلک بھی تھی۔ سر گھٹا ہوا تھا اور جسم گٹھا ہوا تھا۔ کسی قدر لوز پتلون اور ڈریس شرٹ میں اتنا پتا نہیں چل رہا تھا۔ اس نے نرم لہجے اور انگریزی میں کہا۔ ''مسٹر شہباز .... پلیز کم ڈاؤن ....''

جواب میں میں نے اس کے مشورے کے برعکس کیا اور اس بار دوسری چٹنی کی پلیٹ اس پر ماری اور ساتھ ہی خود بھی جھپٹا میرا نشانہ اس کا جبڑا تھا لیکن میرا مکا جب اس مقام پر پہنچا جہاں اس کا جبڑا ہونا چاہیے تھا تو وہاں مجھے خلا ملا۔ وار میں بہت قوت تھی اور اس قوت نے مجھے گھمایا۔ اس نے نیچے بیٹھتے ہوئے کک گھمائی اور میں جو پہلے ہی غیر متوازن تھا دھڑام سے نیچے گرا۔ دبیز قالین نے کسی چوٹ سے محروم رکھا۔ مگر ناکامی کا صدمہ بھی کم نہیں تھا۔ میں نے دونوں ٹانگیں گھمائیں اور وہ پھرتی سے پیچھے ہٹ گیا۔ میں کھڑا ہو گیا۔ اس نے ہاتھ اوپر کرتے ہوئے کہا۔

''مسٹر شہباز مجھے تسلیم ہے تم ایک اچھے فائیٹر ہو لیکن اس وقت تم بیکار کی مشق کر رہے ہو، ممکن ہے تم مجھ پر قابو پالو لیکن تم یہاں سے نکل نہیں سکتے۔''

''یہ میں تم پر قابو پانے کے بعد سوچوں گا۔'' میں نے اس کے قریب ہونے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔

''تم میری بات نہیں سمجھ رہے ہو، ذرا اپنے ساتھی کی

طرف دیکھو۔"

میں نے اس پر سے نظر نہیں ہٹائی اور بیتو سے پوچھا۔"تم ٹھیک ہو؟"

"نہیں شوبی۔" وہ مرجھائے لہجے میں بولا۔"ہم ٹریپ ہوگیا ہے۔"

میں نے اس بار اس کی طرف دیکھا۔ بجائے اس کے وہ خادمہ کو قابو کرتا الٹا خادمہ نے اسے قابو کر رکھا تھا۔ اس نے نہ جانے کہاں سے ایک چھوٹا سا چاقو نکال کر بیتو کی گردن سے اس کی نوک لگا رکھی تھی۔ میں نے گہری سانس لی اور دونوں ہاتھ اٹھالیے۔"اوکے میچ ڈرا...."

اسی لمحے فتح خان اندر آیا اور اس نے سرسری سے انداز سے کمرے کا جائزہ لیا اور سوالیہ نظروں سے اپنے آدمی کی طرف دیکھا اس نے کہا۔"مسٹر شہباز ایک میچ چاہ رہے تھے۔"

اس نے ناگواری سے میری طرف دیکھا۔"تم باز نہیں آؤ گے۔"

میں نے مسکرا کر کہا۔"میں باز آگیا....تمہاری چند پلیٹوں اور کیتلیوں کا نقصان ہوا ہے، وہ اس رقم سے کاٹ لینا جو تم نے مجھ سے قبضے میں لی تھی۔"

فتح خان نے پستول نکال لیا اور اپنے آدمی سے کہا۔"اسے لے جاؤ۔" اس کا اشارہ بیتو کی طرف تھا۔

"یہ نہیں جائے گا۔" میں نے کہا۔

"ٹھیک ہے۔" فتح خان بے پروائی سے بولا اور اس نے خادمہ کی طرف دیکھا۔"اس کا ایک کان کاٹ دو۔"

خادمہ نے بیتو کا کان پکڑا تھا کہ میں نے ہتھیار ڈال دیے۔"اوکے اسے لے جاؤ لیکن اسے کوئی نقصان نہیں ہونا چاہیے۔"

فتح خان کے اشارے پر اس کے آدمی نے بیتو کا بازو پکڑا اور اسے وہاں سے لے گیا۔ فتح خان نے ملازمہ کو صفائی اور دوسری چیزیں لانے کا حکم دیا۔ میرا اندازہ اس کے بارے میں غلط نکلا تھا۔ وہ صرف ایک معاملے میں ہی نہیں بلکہ دوسرے کئی معاملات میں خاصی تجربے کار تھی۔ اس نے بیتو کو مہارت سے قابو کر رکھا تھا۔ اس نے پلیٹوں اور کیتلیوں کے ٹکڑے ٹرالی میں جمع کیے اور وہاں سے چلی گئی۔ میں اور فتح خان ایک بار پھر آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ خادمہ صفائی کا سامان لائی اور اس نے تیزی سے دیواروں اور قالین سے صفائی کی اور چلی گئی۔ فتح خان نے سرد لہجے میں کہا۔"تم بلا وجہ یہ سب کر رہے ہو، تم کسی صورت یہاں سے باہر نہیں نکل سکتے ہو، تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ یہاں کیسی سیکیورٹی ہے۔"

"اور تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ انسان کے اندر آزادی کی کیسی تڑپ ہوتی ہے۔"

"یہاں سے صرف تمہاری روح آزاد ہو کر جا سکتی ہے۔"

"ممکن ہے۔" میں نے بے پروائی سے کہا۔"لیکن یہ دھمکی مجھے کوشش کرنے سے باز نہیں رکھ سکتی ہے فتح خان یہ بات تم بھی جانتے ہو۔"

"میں دھمکی نہیں دے رہا سچ کہہ رہا ہوں یہاں خود کار اسنائپر گن لگا ہوا ہے اس کا کمپیوٹر کسی بھی غیر متعلقہ آدمی کو دیکھتے ہی شوٹ کر دیتا ہے۔ تم یہاں سے باہر جاؤ گے اور مارا جائے گا۔"

"کمپیوٹر یہ فیصلہ کیسے کرتا ہے کہ کون متعلقہ ہے اور کون نہیں ہے؟"

"یہ میں نہیں جانتا لیکن میں دیکھ چکا ہے یہاں کچھ جگہیں ہیں جہاں کوئی نہیں جاتا ہے اور اگر کوئی چلا جائے تو مارا جاتا ہے۔ یہاں زمین اور دیوار میں پھندے ہیں جو آدمی کو پکڑ لیتے ہیں۔ پچھلے دنوں ایک آدمی نشے میں اس حصے میں چلا گیا اور گن نے اسے شوٹ کر دیا۔ وہ خود گارڈ تھا۔"

میں حیران ہوا۔"سیکیورٹی اس مینشن کی ہے یا خاص طور سے ڈیوڈ شا کے لیے کی گئی ہے؟"

"میرا خیال ہے اسنائپر گن ڈیوڈ شا کی ہے۔" فتح خان نے کہا۔"باقی سیکیورٹی پہلے سے ہے۔ ٹریپ بنانا چند دن کا کام نہیں ہے۔"

وہ ٹھیک کہہ رہا تھا ڈیوڈ شا جدید الیکٹرانک سیکیورٹی پر بہت انحصار کرتا تھا کیونکہ اس میں آدمی کم ہوتے ہیں اور ایکوریسی زیادہ ہوتی ہے، اسے دھوکا دینا بھی مشکل کام ہوتا ہے۔ آدمی بک جاتے ہیں یا اپنی کمزوری کی وجہ سے ناکام ہوجاتے ہیں جب کہ آلات نہ تو بکتے ہیں اور نہ ہی ان میں کمزوری ہوتی ہے۔ فتح خان نے مجھے سب آرام سے بتا دیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا وہ خود بھی ڈیوڈ شا کے لیے دل سے کام نہیں کر رہا تھا اس کا رویہ کسی قدر باغیانہ لگ رہا تھا۔ میں نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔"کیا بات ہے تم ڈیوڈ شا سے فرنٹ لگ رہے ہو؟"

اس نے گہری سانس لی اور پھر اچانک ہونٹوں پر انگلی رکھی۔ وہ منہ سے بولا تو اس کا لہجہ نارمل تھا۔"تمہیں غلط فہمی ہوا ہے۔ میں شا کے لیے ہی کام کر رہا ہے۔"

"پھر تم مجھے سب اتنی آسانی سے کیوں بتا رہے ہو؟"

اس نے شانے اچکائے۔"اس بار شا نے مجھ کو منع نہیں کیا۔ اس لیے بتا رہا ہے۔"

"کیا ڈیوڈ شا میرا اعتماد حاصل کرنا چاہتا ہے؟"

"یہ تو وہی جانتا ہے۔" فتح خان نے مطمئن انداز میں سر ہلایا جیسے میں بالکل درست بات کر رہا ہوں۔"پر وہ مجھ کو ہر بار مکمل ہدایت دیتا ہے اس بار ایسا نہیں دیا۔ وہ جانتا ہے میں دماغ کا آدمی نہیں ہے۔ میں تو عمل کرنا جانتا ہے۔"

"بیتو کہاں ہے؟"

"فکر مت کرو وہ ادھر ہی ہے۔"

"اگر تم یا ڈیوڈ شا سمجھ رہے ہو کہ مجھے یا میرے کسی ساتھی کو یرغمال بنا کر کام پر آمادہ کر لو گے تو یہ تمہاری خوش فہمی ہے۔"

"مجھ کو کوئی خوش فہمی نہیں ہے۔" فتح خان نے کہا۔"یہ فیصلہ شا نے کرنا ہے۔"

شاید بیتو کو مجھ سے الگ کرنے کا فیصلہ پہلے ہی کر لیا گیا تھا تاکہ میرے ہاتھ پاؤں بندھے رہیں اور میری حرکت کو جواز بنا کر اس پر عمل کیا گیا۔ میں نے محسوس کیا کہ فتح خان اور ڈیوڈ شا مجھے کم سے کم یہ تاثر دینا چاہتے تھے کہ وہ مجھ پر کوئی جبر کر رہے ہیں۔ خادمہ نئے سرے سے ٹرالی سجا کر لے آئی تھی لیکن اب میرا موڈ نہیں تھا میں نے صرف کافی طلب کی جو اس نے نزاکت اور سلیقے سے بنا کر پیش کی۔ اس وقت یہ یقین کرنا مشکل تھا کہ اسی لڑکی نے کچھ دیر پہلے بیتو کو قابو کر لیا تھا۔ میں نے کافی کا سپ لیا اور فتح خان کی طرف دیکھا۔"بے شک تم لوگوں نے مجھے قابو کر لیا ہے لیکن تم جانتے ہو اور میں بھی جانتا ہوں ڈیوڈ شا کا ایک مقصد ہے۔ وہ مجھ سے تعاون چاہتا ہے۔ دوسری طرف میرے ساتھی مشکل میں ہیں۔ سعدیہ اپنے ہی بھائی کی قید میں ہے۔ مجھے بہر صورت اسے وہاں سے نکالنا ہے۔"

"میں سمجھ رہا ہے۔"

"تم نہیں سمجھ رہے، ڈیوڈ شا سے کہو کہ اگر وہ مجھ سے تعاون چاہتا ہے تو میرا وقت ضائع نہ کرے۔ جتنا وقت گزرتا جائے گا میرے ساتھیوں کا اضطراب بڑھے گا اور جب میں ان سے رابطہ نہیں کروں گا تو وہ یہاں آنے کی سوچیں گے اور میں نہیں چاہتا کہ وہ یہاں آئیں۔ اس لیے ڈیوڈ شا جلد مجھ سے بات کرے اور مجھے میرے ساتھیوں سے رابطے کی سہولت دی جائے۔"

فتح خان سوچ میں پڑ گیا تھا۔ پھر اس نے سر ہلایا۔"شا کو بتاتا ہے۔ وہی فیصلہ کرے گا۔"

"اسے بتا دینا تاخیر سے صرف مجھے ہی نہیں اسے بھی نقصان ہوگا۔ اس لیے جو کرنا ہے جلد کرے۔" میں نے خبردار کرنے کے انداز میں کہا۔

فتح خان کمرے سے نکل گیا۔ خادمہ وہیں تھی اور وہ فتح خان کے جانے کے بعد چوکنا ہوگئی۔ میں نے مسکرا کر کہا۔ "فکر مت کرو، میں عورتوں پر ہاتھ اٹھانے کا قائل نہیں ہوں۔"

"اگر آپ ایسا کرتے ہیں تو اس سے کوئی فرق نہیں پڑے گا کیونکہ میری حیثیت ایک خادمہ سے زیادہ نہیں ہے۔"

"ہر انسان کی ایک حیثیت ہوتی ہے بہرحال تم جن لوگوں کے لیے کام کرتی ہو وہ اپنے سوا کسی کو انسان سمجھتے ہی کہاں ہیں؟....اینی وے تمہارا کوئی نام ہوگا؟"

اس نے سر ہلایا اور سپاٹ لہجے میں بولی۔"مجھے پوجا کہتے ہیں سر۔"

پوجا کسی قدر بھرے جسم کی اور چھوٹے قد کی لڑکی تھی۔ خادمہ ہوتے ہوئے بھی وہ نک سک سے تیار تھی اور اس نے مکمل میک اپ کر رکھا تھا۔ حد یہ کہ آنکھوں کا میک اپ بھی تھا۔ میں نے کافی کا مگ میز پر رکھا۔"خوب صورت نام ہے۔"

"سر میں خود بھی خوب صورت ہوں۔ اگر آپ کو میری کسی اور خدمت کی ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں۔"

اس کا اشارہ واضح تھا۔ میں نے نفی میں سر ہلایا۔"تمہارے آقا جنہوں نے مجھے یہاں قید کیا ہے اور تمہاری صورت میں ایک حسین نگران مقرر کیا ہے وہ میرے بارے میں اچھی طرح جانتے ہیں، میں پھول کو کھلا دیکھ کر خوش ہونے والوں میں سے ہوں اسے شاخ سے توڑنے اور مسلنے کا مجھے قطعی شوق نہیں ہے۔"

"سر اور کافی پیش کروں؟"

"ضرور، یہاں سردی کچھ زیادہ نہیں ہے اور وہ بھی اس موسم میں؟"

"یہ جگہ سات ہزار چار سو فٹ بلند ہے سر اور کل رات

بارش بھی ہوتی ہے اس لیے سردی بڑھ گئی ہے۔"

سردی کی صرف یہی ایک وجہ نہیں تھی بلکہ شملہ کا یہ حصہ برف پوش پہاڑوں کی قربت میں تھا اس وجہ سے بھی یہاں سردی زیادہ تھی۔ ورنہ طول البلد میں شملہ لاہور سے بھی نیچے ہے۔ میں نے سرسری سے انداز میں پوچھا۔ "ٹھاکر یہیں ہوتا ہے؟"

"نہیں ٹھاکر جی بہت کم یہاں آتے ہیں۔" اس نے مختصر اور غیر واضح جواب دیا۔

"کوئی نام ہوگا ٹھاکر جی کا؟"

"جی ٹھاکر گھمبیر سنگھ..... راجھستان اسمبلی کے ممبر بھی ہیں۔"

"گویا خیر سے نیتا جی بھی ہیں۔" میں نے کہا۔ اس وقت بارہ بج رہے تھے۔ میری گزشتہ روز ہی پاکستان بات ہوئی تھی کم سے کم آج کا دن انہیں ٹینشن نہیں ہوتی لیکن جب میں مزید ایک دن اور رابطہ نہ کرتا تو میرے ساتھی پریشان ہو جاتے اور مزید ایک دو دن بعد وہ یہاں آنے کی تیاری شروع کر دیتے۔ کم سے کم وسیم کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ وہ رہ نہیں سکے گا، میرے ساتھ اسے سعدیہ کی فکر بھی ہوگی۔ درحقیقت میں اپنے ساتھیوں کے بغیر خود کو ادھورا اور کمزور محسوس کر رہا تھا اور ایسا بہت کم ہوا تھا ورنہ میں دشمن اور حوادث کے سامنے اکیلا ہو کر خود کو زیادہ مضبوط محسوس کرتا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میرے ساتھی کسی مشکل میں پڑیں یا ان کی وجہ سے میں کہیں مجبور ہو جاؤں۔ لیکن بعض مقامات ایسے آتے ہیں جب انسان کو دوسروں کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ معاملہ ایسا ہی تھا۔ میں اور جیتو اس سے نمٹنے کے لیے ناکافی تھے مگر میں نہیں چاہتا تھا کہ میرا مزید کوئی ساتھی اس جہنم میں آکر پھنسے جہاں پاکستانی ہونا سب سے بڑا جرم تھا۔ بلکہ اب تو میں اور جیتو بھی پھنس گئے تھے۔ پونے ایک بجے دروازہ کھلا اور فتح خان اندر آیا۔

"شا کھانے کی ٹیبل پر تمہارا انتظار کر رہا ہے۔"

میں کھڑا ہو گیا۔ "لیکن پہلے میں واش روم جاؤں گا۔"

"آؤ میرے ساتھ۔" فتح خان نے کہا اور مجھے ایک آراستہ پیراستہ واش روم تک لے آیا۔ "جلدی کرنا لنچ ایک بجے شروع ہو جاتا ہے۔"

"پتا ہے مجھے انگریزوں کا، ان کا بس چلے تو مرنے کا وقت بھی خود طے کریں اور پھر اسی وقت پر مریں۔" میں کہتے ہوئے واش روم میں آگیا۔ ضروریات سے فارغ ہو کر میں نے منہ ہاتھ دھوئے اور خود کو تازہ دم کیا۔ بال درست کیے۔ میری شیو بڑھی ہوئی تھی لیکن اس نے باقاعدہ داڑھی کی صورت اختیار نہیں کی تھی۔ سر کے بال بھی مناسب تھے۔ میں بُرا نہیں لگ رہا تھا۔ واش روم سے نکل کر فتح خان کے ساتھ روانہ ہوا۔ ہم باہر آئے، مینشن کی مرکزی عمارت کی طرف بڑھے۔ یہاں بڑے ڈائننگ ہال میں کم سے کم پچاس افراد کے لیے مخصوص میز پر ڈیوڈ شا اکیلا موجود تھا۔ فتح خان مجھے یہاں چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ ڈیوڈ شا سربراہ والی کرسی پر براجمان تھا۔ اس نے مجھے دیکھا اور بغیر کسی تاثر کے بولا۔

"شہباز ملک..... تمہیں دوبارہ دیکھ کر خوشی ہوئی۔"

میرا دل چاہا کہ کہوں اسے دیکھ کر مجھے کوفت ہوئی ہے لیکن اس کے بجائے میں کرسی کھینچ کر بیٹھ گیا اور بولا۔ "میرا خیال ہے شروع کیا جائے، مجھے بھوک لگ رہی ہے۔"

ڈیوڈ شا نے سر ہلایا۔ وہاں موجود دو خادماؤں نے سرونگ شروع کر دی۔ یہ مغربی انداز کا کھانا تھا جس میں ایک ایک چیز سامنے لائی جاتی تھی اور جب وہ کھالی جاتی تو دوسری چیز پیش کی جاتی تھی۔ تمام ڈشز اعلیٰ معیار کی تھیں۔ کھانا مکمل خاموشی سے کھایا گیا اور اس کے بعد سیاہ چائے پیش کی گئی۔ چائے کے بعد ڈیوڈ شا نیپکن سے منہ صاف کرتا ہوا کھڑا ہو گیا۔ "شہباز میرے ساتھ آؤ۔"

ہم اسی عمارت کی ایک شاندار نشست گاہ میں آئے۔ اس کا رخ شمال کی طرف تھا اور اس طرف پوری دیوار ایک ہی شیشے سے بنی تھی۔ شیشہ یقیناً کئی سو کلوگرام وزنی ہوگا اور اسے دیوار میں فکس کرنا ہی مہارت کا کام تھا۔ شیشے کے پار شملہ کا قدرتی حسن، اس کے پہاڑ اور دور برف پوش پہاڑیاں کسی سینری کی طرح دکھائی دے رہی تھیں۔ جدید ترین لیدر کے صوفے نیم دائرے میں اس طرح رکھے تھے کہ ان پر بیٹھنے والا ہر فرد یکساں طور پر اس منظر سے لطف اندوز ہو سکتا تھا۔ صوفوں کے درمیان نیم دائرہ نما ماربل ٹاپ میز تھی۔ ڈیوڈ شا نے مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود شیشے والی دیوار کے ساتھ ٹہلنے لگا۔ وہ ہمیشہ کی طرح صحت مند اور تروتازہ لگ رہا تھا۔ دیکھنے میں وہ ایک مہذب انگلش جنٹل مین لگتا تھا لیکن اس کا دکھاوا کسی خوب صورت سانپ جیسا تھا جس کے اندر مہلک زہر چھپا ہوتا ہے۔ میں آرام سے ذرا پھیل کر بیٹھ گیا۔ میں نے اپنی طرف سے کوئی بات کرنے کی

کوشش نہیں کی تھی۔ مجھے یقین تھا کہ میں نے فتح خان سے کہا تھا وہ اس تک پہنچ گیا تھا۔ ٹہلتے ہوئے اس نے اچانک رک کر کہا۔ "شہباز تم کیا چاہتے ہو؟"

"یہ سوال تو مجھے کرنا چاہیے مجھے تم نے زبردستی بلوایا ہے۔"

"تمہیں پتا ہے میں کیا چاہتا ہوں اور اس کی ہر قیمت ادا کر سکتا ہوں۔"

"ڈیوڈ شا احمقانہ دعوے مت کرو۔" میں نے ناگواری سے کہا۔ "تم نے پہلے بھی مجھ سے ایک معاہدہ کیا تھا لیکن کیا ہوا تمہارا مرید یعنی مرشد اور ایک معمولی ملازم تمہاری ضمانت کو جوتے کی نوک پر رکھ گئے۔"

"مارشل کی لاش بغیر کھال کے ایک نامعلوم قبر میں پڑی ہے اس کی کھال میں بھس بھروا کر میں نے اسے اپنے گھر میں سجا لیا ہے اور جہاں تک مرشد کی بات ہے جلد اسے بھی اپنے کیے کا حساب دینا....."

"مجھے مرشد سے نمٹنے کے لیے تمہاری یا کسی کی مدد کی بھی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ "تم اس وقت اپنی بات کرو۔"

"میں بتا چکا ہوں کہ میں تم سے کیا چاہتا ہوں اور اسی لیے تم سے پوچھ رہا ہوں۔ تم جو کہو گے میں مانوں گا۔"

"کیا تم سعدیہ کو بڑے کنور کے چنگل سے نکلوا سکتے ہو؟" میں نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

"ہاں نکلوا سکتا ہوں۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔

میں نے حیرت سے اسے دیکھا۔ "تم جانتے ہو وہ کیا ہے اور اس کے پیلس کی حفاظت کس طرح کی جاتی ہے؟"

"ہاں میں جانتا ہوں لیکن کوئی کام ناممکن نہیں ہوتا ہے۔ اگر پلاننگ اچھی ہو تو یہ کیا جا سکتا ہے۔" اس نے سر ہلایا۔ "تم سودا کر رہے ہو کہ میں سعدیہ کو بڑے کنور کے چنگل سے نکلوا کر دوبارہ پاکستان بھیج دوں تو تم میرے لیے کام کرو گے۔"

میں نے یہ بات طنزاً کہی تھی اور مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ڈیوڈ شا اتنی تیزی سے مان جائے گا۔ اگرچہ فتح خان سے بھی میری اس موضوع پر بات ہوئی تھی اس کے باوجود مجھے خیال نہیں تھا۔ کنور پیلس پر حملہ معمولی بات نہیں تھی۔ بڑے کنور کا بھارتی حکومت پر اثر و رسوخ مسلم تھا اور اس کی ایک فریاد پر بھارتی حکومت کی ساری مشینری حرکت میں آجاتی۔ ڈیوڈ شا بین الاقوامی طور پر کتنا ہی طاقتور سہی لیکن وہ غیر ملک میں تھا اور یقیناً اس کے جوتے چاٹنے والوں کے لیے بھی یہ کام آسان نہیں ہوتا۔ وہ کھل کر اس کا ساتھ نہیں دے سکتے تھے۔ دوسری طرف ڈیوڈ شا کا انداز بتا رہا تھا کہ یہ اس کے لیے بہت مشکل یا ناممکن کام نہیں تھا۔ شاید اس لیے کہ اس میں خطرہ دوسرے لوگوں کے لیے تھا۔ جو ڈیوڈ شا کے آدمی ہوتے ان کے مرنے سے بھی اسے فرق نہیں پڑتا اور کنور پیلس کے گارڈز اور لوگ تو تھے ہی دشمن۔ ڈیوڈ شا کے پاس دولت کی کمی نہیں تھی۔ میں خاموش تھا۔ اس نے غور سے مجھے دیکھا۔

"اگر تم چاہو تو تم سوچ بھی سکتے لیکن تم ہی نے کہا تھا کہ تمہیں اس معاملے میں جلدی ہے۔"

"ہاں مجھ پر ایک ایک لمحہ بھاری ہے۔" میں نے اعتراف کیا۔

"شہباز میری ایک آفر ہے میں تمہیں فری ہینڈ دیتا ہوں۔ تمہیں آدمی، اسلحہ اور جو آلات درکار ہوں میں مہیا کروں گا۔ تم پلاننگ کرو اور سعدیہ کو وہاں سے نکال لو۔ اگر تمہیں یہ قبول نہیں ہے تو سب مجھ پر چھوڑ دو اور میں سعدیہ کو وہاں سے نکال لاؤں گا۔ بولو کیا کہتے ہو؟"

اس بار میں سچ مچ سوچ میں پڑ گیا۔ میں نے ہچکچا کر کہا۔ "میں غور کرنا چاہوں گا۔"

"ضرور کرو۔" اس نے کہا۔ "لیکن شہباز، جیسے تمہارے پاس وقت کم ہے اسی طرح میرے پاس بھی وقت کم ہے۔ آج انیس جون ہے اور اگست کے آخر تک وادی والے خطے میں موسم خراب ہونے لگتا ہے۔ وہاں جانے والی کسی بھی مہم کو بیس اگست سے پہلے واپس آنا ہوتا ہے ورنہ برف باری کے ساتھ طوفان آنے لگتے ہیں اور راستے بند ہو جاتے ہیں۔"

"میں بہت وقت نہیں لوں گا۔" میں نے کہا۔ "مجھے آج شام تک سوچنے کی مہلت دو اور ہاں میں اپنے ساتھیوں سے رابطہ چاہتا ہوں میری گاڑی میں میرا لیپ ٹاپ والا بیگ تھا مجھے وہ چاہیے۔"

ڈیوڈ شا نے اپنے کوٹ کی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک چھوٹا سا واکی ٹاکی نکالا اور کسی کو وہ بیگ لانے کا حکم دیا۔ اس کا مطلب تھا کہ گاڑی کا سامان یہاں آچکا تھا۔ میں نے راج کنور کے بارے میں پوچھا۔ "وہ کہاں ہے؟"

"وہ بیکار تھا۔" ڈیوڈ شا نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

میں نے حیرت سے کہا۔ "تم نے اسے مار دیا۔"

"نہیں، میں نے اسے چھوڑ دیا۔"
میں اچھل پڑا تھا۔ "میں نے فتح خان سے کہا تھا وہ میرا قیدی ہے پھر اسے کیوں چھوڑا۔"

"اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے تم بلاوجہ اسے لیے لیے پھر رہے تھے۔ وہ صرف بوجھ تھا جسے زمین میں اتارنا ہی مناسب ہے لیکن تم اس کے خون سے کیوں ہاتھ رنگتے یہ کام اس کے بھائی کو کرنے دو جیسے مرشد نے اپنے بھائی کے ساتھ کیا ہے؟"

"مرشد نے نادر کو مار دیا ہے؟" میں نے اس کی بات سمجھتے ہوئے کہا۔ ڈیوڈ شا نے سر ہلایا۔

"چند گھنٹے پہلے مرشد ہاؤس سے اعلامیہ جاری ہوا کہ نادر علی طویل علالت کے بعد دنیا سے رخصت ہو گیا ہے۔"

"ہو گیا ہے یا کر دیا گیا ہے؟" میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

"وہ بوجھ ہو گیا تھا۔ مرشد نے اس سے چھٹکارا حاصل کر لیا۔ اب اس کے اور تمہارے درمیان دشمنی کا اصل سبب ختم ہو گیا ہے۔"

"نادر کا کہنا تھا کہ مرشد نے اسے چڑھایا تھا۔ اگر یہ سچ ہے تو اصل سبب تو خود مرشد ہوا۔"

"ہو سکتا ہے۔" ڈیوڈ شا نے کہا۔ "اسی طرح راج کنور اپنے بھائی کے ہاتھوں مارا جائے تو تمہارا ایک اور درد سر کم ہو جائے گا۔"

"میں نے کبھی اس طرح سے سوچا نہیں۔" میں نے جواب دیا۔ "میں نے ہمیشہ اپنے زور بازو پر بھروسا کیا ہے۔"

"لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تم مدد کی پیشکش ٹھکرا دو۔"

"تم مدد نہیں سودا کر رہے ہو۔" میں نے کہا۔ "راج کنور میرا قیدی تھا۔ اس کے بارے میں فیصلہ کرنے کا حق بھی مجھے ہے۔ ڈیوڈ شا تم نے بات کا آغاز غلط انداز میں کیا ہے۔"

"اگر تم چاہتے ہو کہ وہ واپس آجائے تو یہ بھی ممکن ہے۔"

"اب وہ تمہارے ہاتھ کہاں آئے گا؟"

"وہ میری پہنچ سے دور نہیں ہے۔" ڈیوڈ شا نے کہا۔ "میں تمہیں دکھاتا ہوں۔" اس نے ایک کونے میں رکھا لیپ ٹاپ کھول کر آن کیا اور چند بٹن دبائے۔

اسکرین پر ایک نقشہ ابھر آیا۔ میں نے غور کیا تو یہ ہماچل پردیش کا نقشہ تھا۔ میں مستقل اسے دیکھتا آیا تھا اس لیے آسانی سے پہچان لیا۔ ڈیوڈ شا نے ایک بٹن دبایا تو اسکرین پر ایک نقطہ بلنک کرنے لگا۔ اس نے انگلی سے اشارہ کیا۔ "یہ راج کنور ہے۔"

"او تو تم نے اسے ٹریپ لگایا ہے۔"

"میں نے اسے چپ لگا دی ہے؟"

"ہاں اور وہ اتنی چھوٹی ہے کہ اس کے کان میں پلانٹ کی گئی ہے اور اسے احساس بھی نہیں ہوا اور نہ ہی اب اسے پتا ہوگا۔ وہ جہاں جائے گا مجھے پتا چلتا رہے گا۔ چپ کا سگنل سیٹلائیٹ ریسیو کر رہا ہے۔ یہ کہیں بھی چلا جائے میری نظر سے نہیں بچ سکے گا۔"

یہ حیرت انگیز چیز تھی۔ مغرب جدید ٹیکنالوجی میں بہت آگے جا چکا تھا۔ مستقبل کی ٹیکنالوجی وہ صرف اپنے مقصد کے لیے استعمال کر رہا ہے اور باقی دنیا کو موبائل اور اسی طرح کے کھلونے دے کر مصروف رکھے ہوئے ہے۔ بلکہ اسے بھی اپنے مقصد کے لیے استعمال کر رہا ہے۔ اب انکشاف ہو رہا ہے کہ موبائل اور انٹرنیٹ کا سسٹم پوری طرح ان کے نظروں میں ہے۔ وہ ہر کال سن سکتا ہے اور انٹرنیٹ کی ہر سرگرمی کی نگرانی کر سکتا ہے۔ مقصد دنیا پر مکمل غلبے کا جنون ہے جو کبھی نوآبادیاتی نظام کی صورت میں سامنے آتا ہے اور کبھی نیو ورلڈ آرڈر کی صورت میں۔ مغربی دنیا ٹیکنالوجی کے ساتھ ساتھ معاشی نظام اور تجارت کو بھی اس مقصد کے لیے استعمال کر رہی ہے اور میڈیا اس کا سب سے موثر ہتھیار ہے۔ اس کی مدد سے مغرب اپنی ہر پالیسی اور ہر قدم کو درست قرار دلواتا ہے اور مخالفوں کو غلط ثابت کرتا ہے۔ میں نے پوچھا۔ "یہ وہی ٹیکنالوجی ہے جو ڈرون طیاروں سے فائر کیے جانے والے میزائلوں کی رہنمائی میں استعمال ہوتی ہے۔"

ڈیوڈ شا نے سر ہلایا۔ "تم اس بات کو سمجھتے ہو۔ یہ بالکل وہی ٹیکنالوجی ہے۔ چپ کو آدمی یا کسی جگہ پلانٹ کیا جاتا ہے۔"

ڈیوڈ شا سے جنگ کی اخلاقیات پر بحث بیکار تھی کیونکہ مغرب نے پہلے ہی اس سلسلے میں ایک جملہ تیار کر لیا کہ محبت اور جنگ میں سب جائز ہے۔ کیونکہ محبت کے معاملے میں وہ جائز ناجائز کی حد صدیوں پہلے ختم کر چکے تھے اس لیے اب اس کا اطلاق صرف جنگ پر رہ جاتا

"ٹھیک ہے اس سے معلوم ہو رہا ہے کہ راج کنور کہاں ہے لیکن اگر وہ بڑے کنور کے ہتھے چڑھ گیا تو اسے کنور پیلس سے کون نکالے گا۔"

ڈیوڈ شا نے میری طرف دیکھا۔ "شہباز اگر تم چاہ رہے ہو کہ میں اسے اپنی غلطی تسلیم کرتے ہوئے سوری کر لوں تو میں اس کے لیے بھی تیار ہوں۔ بہرحال میں نے اسے کسی وجہ سے رہا نہیں کیا۔ چپ بھی میں نے احتیاطاً پلانٹ کی ہے۔ اب یہ احتیاط کام آرہی ہے۔"

ڈیوڈ شا کے الفاظ پر اعتبار مشکل تھا کہ اس نے بنا کسی وجہ کے راج کنور جیسے اہم آدمی کو چھوڑ دیا تھا۔ میں نے محسوس کیا کہ اب اس بات پر زور دینا مناسب نہیں تھا۔ اس بحث میں پڑنے کے بجائے مجھے یہ فکر کرنی چاہیے تھی کہ ڈیوڈ شا کا مقصد کیا تھا؟ وہ اس لحاظ سے درست کہہ رہا تھا کہ راج کنور بیکار ثابت ہوا تھا اور میں اسے محض بوجھ کی طرح اٹھائے گھوم رہا تھا۔ یہ ایسا ہی تھا کہ میں نے ایک زہریلے سانپ کو گردن سے پکڑ رکھا تھا اور اسے چھوڑتے ہوئے ڈر رہا تھا کہ وہ پلٹ کر وار نہ کر دے۔ ڈیوڈ شا نے اسے چھوڑ کر ایک طرح سے میرا بوجھ ہلکا کیا تھا اور وہ بڑے کنور کے ہاتھ آجاتا تو وہ اسے جہنم رسید کر کے اس بوجھ کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیتا۔ نادر علی کی موت کا سن کر مجھے ایسا لگا تھا کہ ایک بوجھ کم ہوا تھا۔ میں نے اسکرین پر جلتے بجھتے نقطے پر غور کیا۔ وہ اس وقت شملہ کے پاس کہیں تھا۔ میں نے پوچھا۔ "کچھ اندازہ ہے یہ کتنی دیر سے یہاں ہے؟"

"اسے بارہ بجے چھوڑ دیا گیا تھا۔" ڈیوڈ شا نے کی بورڈ پر انگلیاں چلاتے ہوئے کہا۔ یہ لینکس آپریٹنگ سسٹم تھا جس میں زیادہ تر کی بورڈ کمانڈز دی جاتی ہیں۔ "یہ گزشتہ آدھے گھنٹے سے یہاں ہے۔"

"کیا اس کی پن پوائنٹ نشان دہی کی جاسکتی ہے کہ یہ کہاں ہے؟"

"بالکل۔" ڈیوڈ شا نے پھر کچھ بٹن دبائے اور اسکرین زوم ہونے لگی ذرا دیر بعد اس علاقے کا نقشہ مکانوں اور گلیوں کی حد تک واضح ہو گیا۔ نقشے پر ہر جگہ کا نام درج تھا۔ یہ دھرم شالہ روڈ تھی۔ اس کی چوتھی گلی کے ایک مکان میں راج کنور موجود تھا۔ میں حیران ہوا تھا۔

"یہ تو گوگل ارتھ کی طرح واضح ہے۔"

"یہ چپ اور اس کی ڈیوائس گوگل ارتھ سے ہی منسلک ہے۔"

"کیا تمہارے آدمی عملی طور پر اس کے پیچھے ہیں؟"

ڈیوڈ شا نے سوچا اور پھر سر ہلایا۔ "ہاں میرے آدمی اس کی نگرانی کر رہے ہیں۔"

"ڈیوڈ شا مجھے تمہارا اور فتح خان دونوں کا رویہ عجیب لگ رہا ہے۔ تم دونوں مجھے سب کچھ کھل کر بتا رہے ہو جب کہ تمہیں اس کی ضرورت نہیں ہے تم نہیں بھی بتاؤ گے تو مجھے پتا نہیں چلے گا۔"

"تم ٹھیک کہہ رہے ہو، میرا مقصد تمہارا اعتماد حاصل کرنا ہے۔ تمہیں اس طرح بلانا میری مجبوری تھی کیونکہ تم کسی صورت مجھ پر اعتماد نہ کرتے۔"

"اب بھی نہیں کر رہا ہوں۔" میں نے اسے آگاہ کیا۔

"میں جانتا ہوں اور میں تمہارا اعتماد حاصل کرنے کی کوشش کر رہا ہوں اسی لیے تمہیں سب بتا رہا ہوں۔ اپنے تعاون کی پیشکش کر چکا ہوں۔"

"فرض کرو میں تمہاری بات ماننے سے انکار کر دوں؟"

اس نے سرد نظروں سے مجھے دیکھا۔ "امید ہے تم ایسی بے وقوفی نہیں کرو گے۔ تم اپنی پوزیشن پر غور کرو۔ تم چاروں طرف سے اپنے دشمنوں میں گھرے ہوئے ہو۔ تمہارے ساتھ صرف ایک مخلص ساتھی ہے۔ تمہیں سعدیہ کو واپس حاصل کرنا ہے اور تم خود کہہ چکے ہو۔ کنور پیلس میں گھسنا آسان کام نہیں ہے۔ فرض کرو میں تمہیں چھوڑ دیتا ہوں اور تم سے کوئی تعرض بھی نہیں کرتا تب بھی تمہارے خیال میں کیا تم دو افراد کچھ کر سکو گے۔"

"تم نے فرض کی بات کی ہے یعنی تمہارا چھوڑنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔" میں نے غور کیا۔ "ابھی تم کہہ رہے تھے کہ تم کھل کر بات کر رہے ہو لیکن اس وقت تم نے ذو معنی بات کی ہے۔"

"اوکے۔" اس نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔ "میں صاف بات کروں گا، میں تمہیں ایسے نہیں چھوڑ سکتا۔ تمہیں فیصلہ کرنا ہوگا کہ تم مجھے کس صف میں شامل کرتے ہو دشمنوں کی یا دوستوں کی۔"

میں ہنسا۔ "یہ تو تم نے صدر بش والی بات کی ہے کہ جو ہمارا دوست نہیں ہے وہ دشمن ہے۔"

"یوں ہی سمجھ لو۔" اس نے کہا۔ ایک شخص جس نے خالص راجھستانی لباس پہن رکھا تھا اندر آیا اور اس نے ڈیوڈ

شا کے اشارے پر میرا لیپ ٹاپ والا بیگ میز پر رکھ دیا اور سر جھکا کر واپس چلا گیا۔ ”تم چیک کر لو تمہاری کوئی چیز کم تو نہیں ہے۔“

میں نے بیگ کھول کر دیکھا اس میں نہ صرف لیپ ٹاپ، یو ایس بی انٹرنیٹ ڈیوائس اور وہ رقم تھی جو میں نے اس میں رکھی تھی بلکہ وہ رقم بھی تھی جو فتح خان نے میرے پاس سے برآمد کی تھی۔ میں نے سر ہلایا۔ ”سب کچھ ہے ایک بات اور کہ بیتو کہاں ہے وہ مجھ سے الگ کیا گیا ہے۔“

”تمہیں اسی کے پاس بھیج رہا ہوں۔“ ڈیوڈ شا نے کہا۔ ”تم رات تک سوچ لو اب تم سے ڈنر پر ملاقات ہو گی۔“

ڈیوڈ شا کی بات مکمل ہونے سے پہلے وہاں فتح خان آ گیا اور میں اس کے ساتھ روانہ ہوا۔ ہم واپس اسی چھوٹی عمارت میں آئے۔ بیتو ایک آراستہ پیراستہ کمرے میں ٹھاٹ سے جہازی سائز بستر پر دراز سامنے بڑے سائز کے ایل سی ڈی ٹی وی پر کوئی فلم دیکھ رہا تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ خوش ہو گیا۔ ”شوبی یہاں تو بہت آرام ہے۔“

”پھر کیا خیال ہے؟“ میں اس کے برابر میں بستر پر گر گیا۔ ”یہیں نہ رہا جائے۔“

بیتو کھسک کر میرے پاس آیا اس نے آہستہ سے کہا۔ ”شوبی یہاں ہمارے ساتھ بہت اچھا کیا جا رہا ہے۔ ابھی ہم کو یہاں آنے کے بعد کا سب سے اچھا کھانا ملا ہے۔“

”ٹھیک ہے میں نے بھی ابھی شاندار لنچ کیا ہے۔“ میں نے اس کی بات پر غور کیا۔ ”آگے کہو۔“

”شوبی دشمن بلاوجہ ایسا سلوک نہیں کرتا ہے، اس سے پتا چلتا ہے اس کو آپ سے کوئی بڑا غرض ہے تو شوبی اس کا فائدہ اٹھاؤ نا۔“

”وہ کیسے؟“ میں سمجھ رہا تھا لیکن ذرا انجان بن کر پوچھا۔

”شوبی جب ہم آپ کے ساتھ کنور پیلس جا رہا تھا تب بھی ہم کو یقین نہیں تھا کہ ہم دو آدمی کچھ کر سکے گا پر آپ کا فیصلہ تھا اس لیے ہم خاموش رہا، شوبی ہم نے دیکھا ہے کنور پیلس بہت محفوظ جگہ ہے وہاں سے کسی کو نکالنا تو ایک طرف رہا اندر گھسنا بھی بہت مشکل کام ہے۔ شوبی ڈیوڈ شا طاقتور آدمی ہے۔ اسے آپ سے کام ہے۔ تو آپ اس سے کام کیوں نہیں لیتا؟“

”تم نے ٹھیک سوچا ہے۔“ میں نے اس کا [illegible] تھپکا۔ ”لیکن میں اکیلے اس کا فیصلہ نہیں کر سکتا ہوں [illegible] دوسروں سے بھی بات کرنا ہو گی۔“

بیتو نے پہلی بار لیپ ٹاپ والا بیگ دیکھا [illegible] بولا۔ ”یہ آپ کو واپس مل گیا۔“

”ہاں سوائے اسلحے، گاڑی اور راج کنور کے [illegible] واپس مل گیا ہے۔“

وہ چونکا۔ ”راج کہاں ہے؟“

”ڈیوڈ شا نے اسے سگنل دینے والی چپ لگا کر [illegible] دیا لیکن اپنا مقصد نہیں بتایا۔“

”شوبی ڈیوڈ شا بہت مکار آدمی ہے، وہ کبھی سیدھی بات نہیں کرے گا۔ اگر وہ سیدھی بات کرے گا تو اس میں بھی کوئی چکر ہو گا۔“

میں ہنسا۔ ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو، ڈیوڈ شا تم نے سن لیا ہو گا کہ میرا ساتھی تمہارے بارے میں کیا رائے رکھتا ہے؟“

”وہ سن رہا ہے؟“ بیتو نے شک سے پوچھا۔

”ظاہر ہے ہم اس کی قید میں ہیں اس نے نگرانی کا پورا بندوبست کیا ہو گا۔“

”ٹھیک ہے سنتا ہے تو سن لے۔“

”اس نے تمہاری تجویز بھی سن لی ہو گی۔“

”ابھی وہ آپ کا اور باقی سب کا بات بھی تو سنے گا۔“ بیتو نے ڈھٹائی سے کہا۔

”یہ تو ہے۔“ میں نے بیگ سے لیپ ٹاپ نکال کر آن کیا اور یو ایس بی ڈیوائس اس سے لگائی۔ انٹرنیٹ کنکشن آن ہوتے ہی میں نے اسکائپ آن کر کے پہلے عبداللہ کو کال کی۔ رابطہ ہوتے ہی میں نے کہا۔

”میں ہوں اسکائپ پر آؤ۔“

میں نے کال کاٹ دی اور عبداللہ یا سفیر کے لاگ آن ہونے کا انتظار کرنے لگا۔ ایک منٹ بعد سفیر لاگ آن ہوا۔ اس نے ویڈیو آن کی ہوئی تھی۔ میری ویڈیو بھی آن تھی اس لیے سفیر نے دیکھ لیا کہ میں کہاں بیٹھا ہوں۔ اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔ ”بیٹے کیا واپس کنور پیلس پہنچ گئے ہو؟“

”نہیں دوست لیکن اس سے ملتا جلتا سمجھو۔“ میں نے سرد آہ بھری۔ ”میں اس وقت ڈیوڈ شا کا مہمان ہوں۔“

”یہ شا صاحب کہاں سے ٹپک پڑے اور تو ان کا مہمان کیوں ہے اور سب سے بڑی بات تجھے اتنی چھوٹ

کیوں ملی کہ ہم سے اسکائپ پر رابطہ کر سکے۔“

”یار یہی سب بتانے کے لیے کال کی ہے سب کو بلا لے اگر دور ہیں تو ان کو کال کر کے بلا۔ میری مراد عبداللہ اور وسیم سے ہے۔“

”دونوں آ رہے ہیں۔“ سفیر نے مطلع کیا۔ ”ایک خبر ہے۔“

”نادر کے انتقال بے ملال کی؟..... وہ پہلے ہی مجھ تک پہنچ گئی ہے۔“

”ہاں جناب حضرت اعلیٰ کے مہمان جو ہیں۔“ سفیر نے سرد آہ بھری۔ ”ایک ہم ہیں میر پھرتے ہیں خوار کوئی پوچھتا نہیں۔“

”سوتا بھی نہیں؟“

”ہائے ہائے کیا یاد دلایا۔“ سفیر نے بلبلا کر کہا۔

”اتنا ہائے ہائے کرنے کی کیا ضرورت ہے جا کر مل آ۔“

”نہیں یار..... سعدیہ والے واقعے کے بعد ہم سب بہت محتاط ہیں کوئی بلا ضرورت باہر نہیں نکلتا ہے اور حویلی کی سیکیورٹی میں بھی اضافہ کر دیا گیا ہے۔“

”حویلی کے ذکر پر مجھے بھی کچھ یاد آ رہا ہے۔“ میں نے بھی سرد آہ بھری۔ ”لیکن مجبوری ہے میں یہاں سے رابطہ نہیں کرنا چاہتا۔“

”بہتر ہے تو محتاط ہی رہ۔“ سفیر نے کہا۔ ”مرشد کا کچھ پتا نہیں ہے عین ممکن ہے وہ نادر کی موت کا الزام ہم پر رکھ کر اپنے رشتے داروں اور مریدوں کے غم و غصے کا رخ ہماری طرف موڑ دے۔“

”اگر وہ محاذ آرائی برقرار رکھنا چاہتا ہے تو ایسا ضرور کرے گا ویسے حضرت اعلیٰ اس کے علاج کا ارادہ فرما رہے ہیں۔“

”حالانکہ کہ حضرت اعلیٰ خود بہت بڑا روگ ہیں۔“ سفیر نے کہا۔ ”یہ لوگ پتا نہیں پیدل آ رہے ہیں۔“

”تو بہت بے چین ہو رہا ہے لیکن میں ایک ہی بار بات کروں گا۔“ میں نے سفیر سے کہا۔

”بیتو کہاں ہے اس کے ساتھ رہ کر تیرا دماغ خراب نہیں ہوا۔“

”وہ آپ کا خراب ہے۔“ بیتو جو سن رہا تھا تڑپ کر بولا۔ ”آپ کے ساتھ رہنے والے کا دماغ ہی نہیں بچتا۔“

”تمہارا تو ملا نہیں تھا۔“ سفیر نے اسے چھیڑا۔ ”ہاں کچھ بھوسا بھرا ہوا ہے۔ سنا ہے تم بھی انگلی کٹا کر شہیدوں میں شامل ہو گئے ہو۔“

”ہم نے انگلی نہیں کٹایا۔ سینے پر گولی کھایا۔“ بیتو نے فخر سے کہا۔

دونوں کی نوک جھونک اس وقت تک چلتی رہی جب تک وسیم اور عبداللہ نہیں آ گئے۔ وہ یہ جان کر پریشان ہوئے تھے کہ میں ڈیوڈ شا کے قبضے میں ہوں۔ پہلے میں نے انہیں حالات سے آگاہ کیا کہ کس طرح فتح خان نے درمیان میں کود کر میری منزل کو کھوٹا کیا اور پھر بتایا کہ ڈیوڈ شا مجھ سے کیا چاہتا تھا اور اس کے بدلے کیا کرنے کے لیے تیار تھا۔ ”دوستو! میں تم سے مشورہ چاہتا ہوں۔ میرا اور بیتو کا خیال ہے یہ پیشکش اچھی ہے اور ہمیں اسے قبول کر لینا چاہیے کیونکہ کنور پیلس میں گھسنا صرف دو افراد کے بس کی بات نہیں ہے اور پھر وہاں سے سادی کو بھی لانا ہے۔ صرف کنور پیلس سے نکالنا مسئلہ نہیں ہے اس کے بعد ہمارا واپس آنا بھی اتنا بڑا مسئلہ ہو گا۔“

”آپ کا خیال ہے ڈیوڈ شا ہمارے یہ دونوں مسئلے حل کر سکتا ہے؟“ عبداللہ نے پوچھا۔

”اس کا کہنا یہی ہے وہ فری ہینڈ دے رہا ہے۔ میں آدمی اور ہر چیز خود منتخب کروں۔ پلان خود بناؤں اور کمانڈ بھی خود کروں۔ اگر میں ایسا نہیں کرتا تو دوسری صورت یہ ہے کہ ذمے داری اسے دے دوں اور وہ پھر جیسے چاہے یہ کام کرے۔“

وسیم سن رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ”اس کے بدلے آپ ڈیوڈ شا کے ساتھ اس وادی تک جائیں گے؟“

”اس کی اول و آخر شرط یہی ہے۔“

”جب آپ اسے وادی تک لے جائیں گے اور اس کا کام نکل جائے گا تب آپ کے خیال میں اس کا رویہ کیا ہو گا؟“

”میں نے اس بارے میں نہیں سوچا۔“ میں نے صاف گوئی سے کہا۔ ”میرے لیے یہ بہت دور کی بات ہے۔“

”ڈیوڈ شا اس بار پہلے آپ کا مسئلہ حل کر رہا ہے کیا اس کے ذہن میں نہیں ہو گا کہ کام نکلنے کے بعد اس کے کام آنے سے انکار کر سکتے ہیں یا اس کے کام میں رکاوٹ بن سکتے ہیں۔“

”اس نے یقیناً اس کا حل سوچا ہوگا۔ پہلے بھی اس نے بہت چالاکی سے مجھے جکڑا تھا اور مجھ سے قرآن کریم پر قسم لی تھی۔ وہ تو مرشد اور اس کے آدمی مارشل نے دھوکا کیا اور میں قسم سے آزاد ہوگیا۔ وہ اس بار بھی ایسی کوئی حرکت کرے گا۔“

وسیم ایک بار پھر سوچنے میں معروف تھا۔ چند منٹ بعد اس نے کہا۔ ”جناب ایسا کریں آپ دو گھنٹے بعد رابطہ کریں۔ تب تک ہم آپس میں ذرا بات کرلیں۔“

آپس میں بات کرنے کی کوئی تک نہیں تھی کیونکہ میرے بعد وسیم تھا اس کا فیصلہ مانا جاتا تھا۔ وہ اصل میں سوچنے کی مہلت لے رہا تھا۔ میں نے کہا۔ ”ٹھیک ہے میں دو گھنٹے بعد کال کرتا ہوں۔“

لیپ ٹاپ بند کرکے میں لیٹ گیا۔ بیتو پہلے ہی لیٹا ہوا سرہانے موجود خشک میوہ جات سے شغل کررہا تھا۔ اس نے اخروٹ گری، بادام اور کاجو میرے سامنے رکھے۔ ”شوبی کھاؤ دشمن کا مال ہے۔“

”ہاں یار پر پیٹ تو اپنا ہے۔“

”آپ جانتا ہے ہمارا پیٹ کیسا ہے؟“ اس نے اپنا پیٹ بجایا۔ ”سب ہضم کرلیتا ہے۔“

”تم سب کھا رہے ہو یہ بتاؤ دوا بھی لی ہے؟“

”صبح بھی لیا تھا ابھی بھی لیا ہے۔“ بیتو نے کہا۔ ”شوبی اگر آپ نے کنور پیلس پر حملے کا فیصلہ کیا تو ہم بھی اس میں شامل ہوگا۔“

میں نے انکار کیا۔ ”تم پوری طرح فٹ نہیں ہوا ابھی تمہارا زخم بھرنے میں کم سے کم تین دن اور لگ سکتے ہیں۔“

”شوبی، اوپر سے بالکل ٹھیک ہوگیا ہے، اب ہم کو بازو ہلاتے یا کوئی چیز اٹھاتے ہوئے معمولی سا درد ہوتا ہے۔“

”دیکھیں گے۔“ میں نے کہا۔ ”ابھی تو فیصلہ بھی نہیں ہوا ہے۔“

”شوبی اگر وسیم بھائی لوگ نے منع کیا تو آپ منع ہو جائے گا۔“

”صرف اس صورت میں کہ وہ وجہ بتائیں اور متبادل طریقہ سامنے رکھیں۔“ میں نے کہا۔ ”میں کسی صورت سادی کے بغیر یہاں سے نہیں جاسکتا۔“

جب فتح خان ہمیں یہاں لایا تھا تب یہ بات میرے ذہن میں نہیں تھی کہ ڈیوڈ شا میرے اس طرح سے کام آسکتا ہے لیکن جیسے جیسے میں سوچ رہا تھا مجھے یہ آپشن بہتر لگ رہا تھا۔ اس سے میرے بہت سے مسائل حل ہوجاتے۔ دوسری صورت میں سب غیر یقینی تھا۔ ہمارا کنور پیلس تک رسائی حاصل کرنا، وہاں سے سادی کو نکالنا اور پھر انڈیا سے بہ حفاظت نکل جانا۔ اس کے بدلے مجھے ڈیوڈ شا کی شرط پوری کرنی تھی۔ اگر بات میری ذات کی ہوتی تو میں ایک بار پھر انکار کردیتا لیکن معاملہ میرے ساتھیوں اور خاص طور سے سادی اور وسیم کا تھا۔ ان کے لیے میں ہر خطرہ مول لینے کے لیے تیار تھا۔ اب تک میں جن بحرانوں سے گزرتا آیا، وادی تک جانے کی مہم میں خطرہ یقیناً اس کے مقابلے میں کم ہوتا۔ اب تک گریز کی وجہ یہی تھی کہ مجھے یہ خیال احمقانہ لگتا تھا۔ ٹھیک ہے ہمالیہ کی یہ وادی ایک حقیقت کی طرح موجود تھی مگر ضروری تو نہیں تھا کہ اسے اساطیری داستانوں جیسی ماورائی دنیا بنا کر پیش کیا جائے۔

راجا عمر دراز اور ڈیوڈ شا جیسے تجربے کار، جہاندیدہ اور عقل مند انسان وہاں جانے کی مجنونانہ کوشش کررہے تھے۔ اس کے لیے ہر قیمت ادا کرنے کے لیے تھے۔ وہ اپنی اور دوسروں کی جانیں خطرے میں ڈال رہے تھے۔ دونوں برف میں رہنے والے ایک بوڑھے انسان کی بات کو حرف آخر سمجھ کر کوشاں تھے میں ان کے ساتھ وادی تک چلوں کیونکہ وادی میں اترنے کی اجازت اسے ہی ملتی جو مجھے لے کر وہاں جاتا۔ گویا میں وادی میں داخلے کا اجازت نامہ تھا۔ راجا عمر دراز کی حد تک یہ بات سمجھ میں آتی تھی کہ وہ وادی تک جاچکا تھا اور وہاں کے عجائبات دیکھ چکا تھا۔ وہ دو بار برف والے سے ملاقات کرچکا تھا۔ پھر وہ وضعدار مشرقی آدمی تھا۔ اس کے لیے یہ سب بہت اہم تھا۔ وہ روایات سے انحراف نہیں کرسکتا تھا لیکن ڈیوڈ شا جدید دنیا کا آدمی تھا۔ اس کے دادا نے یہ وادی دریافت کی تھی۔ اس کے پاس ذرائع تھے۔ وہ چاہتا تھا تو جدید ہتھیاروں سے لیس فوج لے کر وہاں جاسکتا تھا اور یقیناً کوئی اسے نہیں روک سکتا تھا مگر وہ بھی برف والے کی بات کو سینے سے لگائے گزشتہ کچھ عرصے سے میرے پیچھے پڑا ہوا تھا کہ میں اس کے ساتھ وادی تک چلوں۔ گویا اسے بھی یقین تھا کہ میرے بغیر وادی میں داخلہ ناممکن ہے۔ اسے ذرا بھی شک ہوتا تو وہ خود کوشش کرتا اور شاید ناکامی کے بعد مجھے لے جانے کی کوشش کرتا مگر وہ ایک بار برف والے کی بات سن کر اس پر ایمان لے آیا تھا۔ دو گھنٹے بعد میں نے دوبارہ اسکائپ آن کیا۔ سفیر

آن لائن تھا اس نے کال کی۔ بٹن دباتے ہی وسیم نمودار ہوا۔

”جناب ہم نے سوچ لیا ہے آپ شا سے بات کریں اگر وہ سادی کو واپس پاکستان پہنچانے کی ضمانت لیتا ہے تو دوسرے وادی کی طرف صرف آپ نہیں جائیں گے بلکہ آپ کے ساتھ میں اور عبداللہ بھی ہوں گے۔“

”میں بھی۔“ سفیر نے درمیان میں ٹانگ اڑائی۔

”ہم تو پہلے ہی ساتھ ہے۔“ بیتو نے بھی بولنا ضروری سمجھا۔

”کیا پوری پارٹی جائے گی؟“

”بالکل ہم صرف آپ کو اس کے ساتھ جانے کی اجازت نہیں دیں گے۔ صرف ہم تین نہیں بلکہ ہم اگر چند اپنے اعتماد کے افراد بھی ساتھ لے جانا چاہیں تو ڈیوڈ شا اعتراض نہیں کرے گا۔“

”اعتراض تو نہیں کرے گا لیکن اس برات کا مقصد ضرور پوچھے گا؟“

”آپ کی باحفاظت واپسی۔“ وسیم نے جواب دیا۔ ”آپ کی حفاظت کے معاملے میں ہم اس کی ضمانت پر اعتبار نہیں کرسکتے ہیں۔“

”اگر ڈیوڈ شا مان جاتا ہے؟“

”تب آپ اسے زبان دے سکتے ہیں کہ سادی کی باحفاظت واپسی کے بعد آپ اس کے ساتھ جائیں گے۔“

وسیم تجربے کار آدمی تھا اور اس نے بہت سوچ سمجھ کر یہ شرط رکھی تھی۔ مجھے نہیں لگ رہا تھا کہ ڈیوڈ شا یہ بات مانے گا۔ ”سادی کو وہاں سے رہا کرانے کی ذمے داری کے بارے میں کیا سوچا ہے؟“

”یہ ذمے داری ڈیوڈ شا یا اس کے آدمیوں کی ہوگی۔ آپ اس میں عملی حصہ نہیں لیں گے لیکن ان کے ساتھ ضرور ہوں گے۔ سادی کو آزاد کراتے ہی آپ اسے اپنی تحویل لیں گے اور وہ اس وقت تک آپ کے ساتھ رہے گی جب تک اس کی واپسی کا انتظام نہیں ہوجاتا۔“

وسیم بہت ہوشیاری سے ہر بات پر غور کرکے تجویز پیش کررہا تھا۔ میں نے تائید کی۔ ”تم ٹھیک سوچ رہے ہو۔“

اچانک وسیم نے اشارہ کیا کہ وہ ایک لکھا ہوا پیغام بھیج رہا ہے میں ریسیو کروں۔ میں نے پیغام ریسیو کیا۔ وسیم نے لکھا تھا۔ ”بڑے اور راج کنور کو کسی صورت مت چھوڑیے گا ورنہ یہ مسئلہ ہمیشہ ابھار رہے گا۔ آپ متفق ہیں تو اثبات میں سر ہلائیے۔“

میں نے اثبات میں سر ہلانے کے بجائے جوابی پیغام لکھا۔ ”یار سادی کے سامنے اس قسم کا کام مشکل ہوگا۔“

”میں سمجھتا ہوں لیکن اگر وہ منظر پر نہ ہو تو آپ دل کڑا کرکے یہ کام کرگزریے گا۔ راج کنور تو ہے ہی ایک نمبر کا حرامی۔ بڑے کنور نے بھی اپنی اصلیت دکھادی ہے۔ یہ دونوں ناسور ہیں جن کا ختم کردینا ہی بہتر ہے۔“

”میں تم سے متفق ہوں۔“

”بہتر ہوگا آپ یہ کام بیتو کے سپرد کردیں۔ یہ اس کا

احکام اللہ کے تابع نفس، مطمئن نفس، بری باتوں سے پاک، اس کا ذکر سورہ فجر کی آخری آیتوں میں یوں آیا ہے۔ ”اے اطمینان پانے والی روح (نفس مطمئنہ) اپنے پروردگار کی طرف لوٹ چل تو اس سے راضی اور وہ تجھ سے راضی“ باقی دو کوئی خاص نہیں یہ نفس مرضیہ اور راضیہ ہیں۔ ابتدائی طور پر اس سے مراد شخصیت لی جاتی تھی جبکہ روح سے مراد سانس وزندگی وغیرہ تھی۔ قرآن پاک میں اس سے مراد روح ہے۔ اس سے مراد سانس بھی ہے یعنی۔ ”لوگوں کو دیکھو اس وقت جب موت کی سختیوں میں مبتلا ہوں اور فرشتے ان کی طرف عذاب کے لیے ہاتھ بڑھا رہے ہوں کہ نکالو اپنی جانیں۔ (انعام آیات 93)

بعض نے نفس کو پندرہ میں معنوں میں استعمال کیا ہے اور اس کے معنی کو خون، جسم، روح، نگاہ بد، خواہش، مخصوص حقیقت، مقصد، لب لباب، وغیرہ وغیرہ۔

نزول قرآن سے قبل عیسائیت میں یہ روح وغیرہ کے معنوں میں آتا تھا۔ افلاطون کا بھی یہی نظریہ تھا۔ قرآن وافلاطون وعیسائیت کے مطابق روح ایک ابدی چیز ہے جسے فنا نہیں۔ قرآن میں آیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تخلیق آدم کے بعد اس میں روح پھونکی۔ نیز مرنے کے بعد روحیں آسمان کی جانب پرواز کرجاتی ہیں۔

مرسلہ: یمامہ حسن شیرازی، کوئٹہ

حق بھی ہے۔ یہی دو بھائی اس کے پورے قبیلے اور خاندان کی بربادی کے ذمے دار ہیں۔" وسیم نے مشورہ دیا۔ "وہ بالکل نہیں ہچکچائے گا۔"

"ہچکچاہٹ تو مجھے بھی نہیں ہے صرف ساوی کا خیال ہے۔"

"اس کا دل مضبوط ہے اور وہ بھی جان گئی ہے کہ اس کے بھائی موذی ہیں اس لیے اسے پتا چل بھی گیا تو وہ ہمیں غلط نہیں سمجھے گی، وہ ہماری مجبوری جانتی ہے۔"

بیتو پاس بیٹھا ہوا تھا لیکن وہ انگریزی سے ناواقف تھا اور ہم احتیاطاً رومن اردو میں لکھ رہے تھے۔ اس سے تو بیتو قطعی ناواقف تھا اس لیے اسے خبر نہیں ہوئی کہ اس کے بارے میں کیا بات ہو رہی ہے۔ وہ متجسس لیکن خاموش تھا۔ میں نے کہا۔ "اوکے میں ڈیوڈ شا سے ان دو نقاط پر بات کرتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے پھر کب رابطہ کریں گے؟"

"ممکن ہے آج رات ہی۔" میں نے کہا اور اسکائپ بند کر دیا پھر انٹرنیٹ ڈیوائس نکال لی۔ مانی نے بتایا تھا کہ اس کے سگنل کی مدد سے میرا سراغ لگایا جا سکتا تھا۔ بے شک میں کسی سیاست دان کی رہائش گاہ میں ڈیوڈ شا کے ساتھ موجود تھا لیکن یہ دونوں بہرحال بھارتی سرکار سے زیادہ طاقتور نہیں تھے۔ اگر بھارتی ایجنسیاں میرا سراغ لگا لیتیں تو یہ مجھے نہیں بچا سکتے تھے بلکہ عین ممکن تھا خود زیرِ عتاب آ جاتے۔ میں نے اشارے سے بیتو سے کہا کہ وہ اس بارے میں ابھی کوئی بات نہ کرے۔ وہ سمجھ گیا اور دوبارہ بستر پر دراز ہو گیا۔ میں نے اس کے زخم پر موجود پٹی ہٹا کر دیکھی۔ باہر سے زخم تقریباً بھر گیا تھا اور کھرنڈ کی سرخی اب سیاہی میں بدل رہی تھی۔ اندر سے بھی زخم کی حالت اچھی تھی کیونکہ بیتو آرام سے اپنا بازو گھما رہا تھا اور اسے تکلیف نہیں ہو رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔

"شوبی ہم نہا لے؟"

"میرا خیال ہے کل تک اور صبر کر لو۔ ابھی پانی لگانا مناسب نہیں ہے اور اب میں چاہتا ہوں تم جلد از جلد ٹھیک ہو جاؤ۔"

بیتو سمجھ گیا کیونکہ اس کا چہرہ چمکنے لگا تھا۔ اس نے چہک کر کہا۔ "اب تو ہم پورا ہفتہ نہائے بغیر رہ سکتا ہے۔"

"لیکن اس کے بعد تمہارے ساتھ کون رہے گا۔" میں ہنسا۔

اسی لمحے دروازے پر دستک ہوئی اور میں نے بلند آواز سے کہا۔ "یس کم ان۔"

وہی خادمہ اندر آئی اور اس نے پوچھا۔ "سر آپ کو کسی چیز کی ضرورت ہے؟"

"فی الحال تو کسی چیز کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن اگر کسی چیز کی ضرورت ہو یا کوئی بات کہنی ہو تو تمہیں کیسے طلب کیا جائے؟"

اس نے بیڈ کے برابر میں سائیڈ دراز پر رکھے ریموٹ نما آلے کی طرف اشارہ کیا۔ "اس کا زیرو نمبر دبایئے گا میں آ جاؤں گی۔"

"یعنی یہ تمہارا ریموٹ ہے۔" میں نے اس کا معائنہ کیا اور صفر دبایا تو خادمہ کے پاس سے ہلکی سی بیپ کی آواز آئی۔ اس کا ریسیور اس کے لباس میں پوشیدہ تھا۔ "ٹھیک ہے جب تمہاری ضرورت ہوگی تو بلا لوں گا۔"

بیتو اسے کینہ توز نظروں سے دیکھ رہا تھا کیونکہ اس نے بیتو کو قابو کر لیا تھا اور یہ اس کی بے عزتی تھی۔ اس نے خادمہ کے جانے کے بعد کہا۔ "شوبی ہم کو اس کا صورت سے نفرت ہے، کیا کوئی اور عورت نہیں آ سکتا۔"

"آ سکتا ہے لیکن اس میں کیا برائی ہے۔" میں نے انجان بن کر پوچھا۔ "اچھی خاصی خوب صورت ہے۔"

"ہم کو اس کا صورت نہیں اس کا حرکت برا لگا۔" بیتو نے منہ بنایا۔

"ہوا کیا تھا میں اس وقت اس آدمی کی طرف متوجہ تھا۔"

بیتو جھینپا پھر اس نے بتایا کہ وہ اس کے پاس گیا تھا اور آسان طریقہ یہی لگا کہ اسے بالوں سے پکڑ کر قابو کر لے لیکن ادھر اس نے خادمہ کے بال پکڑے اور وہ بل کھا کر اس کی پشت پر آئی اور بہت تیزی سے چاقو کی نوک بیتو کی گردن سے لگا دی۔ "ہم تو سمجھا کہ گیا، وہ ہمارا گردن کاٹ دے گا۔"

"شاید اسی لیے اسے یہاں لگایا گیا ہے۔ ہم جیسے قیدیوں کی خاطر مدارت کے لیے کیونکہ اسے خاطر مدارت کا دوسرا طریقہ بھی آتا ہے۔"

"ہم اس سے بدلہ لے گا۔" بیتو نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔

"چھوڑو یار کیسی سہی، ہے تو عورت نا۔ مرد عورت سے بدلہ لے تو بھی یہ اسی کی شکست ہوتی ہے۔"

"تب کیا کرے ہم کو غصہ آ رہا ہے۔"

"پی جاؤ....." میں نے مشورہ دیا اور جیکٹ اتارتے ہوئے پنجوں کے بل اچھلنے لگا۔ جوتے میں نے پہلے ہی اتار دیے تھے۔ جسم گرم ہوا تو ایک ایک کر کے سارا اوپری لباس اتار دیا۔ کچھ دیر بعد میں صرف پتلون میں ایکسرسائز کر رہا تھا۔ ایک گھنٹے کی مشقت سے جسم پسینے میں شرابور ہو گیا تھا۔ ویسے بھی اندر اتنی ٹھنڈ نہیں تھی۔ ایکسرسائز کر کے میں نے واش روم کا رخ کیا جہاں ہر چیز موجود تھی۔ حد یہ کہ باتھ روب بھی تھے۔ میں نے ٹب میں پانی بھرا، اس میں یوڈی کلون اور جھاگ کے لیے جل شامل کیا اور باقی ماندہ کپڑے اتار کر اس میں بیٹھ گیا۔ ایک گھنٹے میں گرم خوشبودار پانی نے میل کے ساتھ ساری تھکن بھی اتار دی تھی اور جسم ہلکا پھلکا ہو گیا۔ میں باتھ روب پہن کر باہر آیا تو بیتو نے حسرت سے مجھے دیکھا۔

"شوبی آپ نہا آیا۔"

مجھے خیال آیا۔ "ٹب میں تو تم بھی نہا سکتے ہو۔ زخم پانی سے محفوظ رہے گا۔"

"یہ ٹھیک ہے پر یہ پرانا کپڑا پہنے گا کیا؟"

"شاید ہمارا کپڑوں والا بیگ بھی یہاں آیا ہے، ایک منٹ۔" میں نے ریموٹ کا بٹن دبا کر خادمہ کو بلایا اور اسے بیگ کے بارے میں بتایا۔ "یہ بیگ چاہیے۔ اگر بیگ نہیں مل سکتا تو اس میں موجود کپڑے لے آؤ۔"

"اگر کپڑے بھی نہ ہوں تو آپ کو ہر قسم کے کپڑے فراہم کیے جا سکتے ہیں۔"

"پہلے بیگ دیکھ لو۔" میں نے کہا۔ وہ سر جھکا کر چلی گئی۔ عام حالات میں وہ مسکین اور دبی ہوئی خادمہ نظر آتی تھی جس کی زندگی کا واحد مقصد اپنے آقا کے مہمانوں کی تن من سے خدمت کرنا تھا۔ مگر اس کی مستعدی اور مہارت میں اور بیتو دیکھ چکے تھے۔ میں نے آئینے میں دیکھ کر بال بنائے تو مجھے خیال آیا۔ پندرہ منٹ بعد خادمہ ہمارے کپڑے بیگ سمیت لے آئی تھی۔ میں نے اس سے کہا۔

"مجھے باربر کی ضرورت ہے۔"

"یہیں کمرے میں یا پھر سیلون میں؟"

"سیلون کہاں ہے؟"

"مینشن میں ہے۔" اس نے بتایا۔

"میں سیلون چلوں گا۔" میں نے کہا اور واش روم کا دروازہ ناک کر کے بیتو کو مطلع کیا کہ میں جا رہا ہوں تاکہ وہ پریشان نہ ہو۔ پھر میں خادمہ کے ساتھ روانہ ہوا۔ سیلون اسی عمارت کے عقب میں واقع ایک چھوٹی عمارت میں تھا جو اسی قسم کے کاموں کے لیے مخصوص تھی کیونکہ وہاں ایک چھوٹا سا کلینک بھی تھا اور لانڈری بھی تھی۔ سیلون جدید ترین تھا اور وہاں ایک ماہر باربر خادمہ بھی موجود تھی۔ اس نے پہلے میری ہدایت کے مطابق بال تراشے۔ اس سے پہلے چاروں طرف سے یکساں بڑھے ہوئے تھے اس نے سائیڈوں سے چھوٹے کر کے اوپر کے بال لمبے چھوڑ دیے۔ پھر اس نے قلموں کو کسی قدر دراز رکھتے ہوئے میری شیو بنائی۔ آخر میں اس نے میرے بالوں کو نیچرل کلر سے رنگ دیا۔ میرے بالوں کا قدرتی رنگ لائٹ براؤن تھا لیکن اب یہ ڈارک براؤن شیڈ میں آ گئے تھے۔ نفاست سے بنی ہوئی مونچھیں اچھی لگ رہی تھیں لیکن یہ سب میں نے اچھا لگنے کے لیے نہیں بلکہ مختلف لگنے کے لیے کیا تھا۔ جب تک کلر پکا ہوتا رہا اس نے میرا چہرہ صاف کیا اور اسے بھی چمکا دیا۔ آخر میں اس نے بال دھوئے۔ میں نے اس کے کام کی تعریف کی تو وہ خوش ہو گئی تھی۔ میں واپس آیا تو بیتو نہا دھو کر نکل آیا تھا۔ اس نے شانے پر لگی گولی کے زخم کو بچاتے ہوئے سر بھی دھو لیا تھا۔

"شوبی آپ تو چمک رہا ہے۔"

"چاہو تو تم بھی چمک جاؤ۔" میں نے اس کا معائنہ کیا۔ "تمہارے بھی بال بے ترتیب ہیں اور چہرے پر رواں آ گیا ہے۔"

اس بار خادمہ اسے لے گئی اور بیتو بادل ناخواستہ اس کے ساتھ گیا تھا۔ میں نے دوسرے کپڑے پہنے۔ پہلے والے بھی صاف ستھرے تھے لیکن نہا دھو کر انہیں پہننے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ بیتو ایک گھنٹے بعد واپس آیا تو وہ بھی چمک رہا تھا۔ بال ترشوا کر اور شیو کے بعد صفائی سے اس کی سانولی رنگت نکھر آئی تھی۔ اس نے لباس پہلے ہی تبدیل کر لیا تھا۔ واپس آتے ہی اس نے پوچھا۔ "شوبی کیسا لگ رہا ہے؟"

"ایسا لگ رہا ہے کہ اب کوئی چھین جانا بھی چاہے تو نہ جائے۔" میں نے ہنس کر کہا تو وہ جھینپ گیا۔

"شوبی آپ بھی چھیڑتا ہے۔"

"ہاں یار سب چھیڑتے ہیں تو کیا میرا حق نہیں ہے۔"

"کیوں نہیں شوبی آپ کا تو سب سے زیادہ حق ہے۔" وہ چہکا اور پھر بولا۔ "شوبی ایک مزے کا چیز

دکھائے۔"

میں سمجھا شاید وہ کوئی سچ مچ کی چیز دکھائے گا۔ "ہاں دکھاؤ۔"

بیتو نے خادمہ سے کہا۔ "ناچ کر دکھاؤ۔"

میں بیتو کی بات پر حیران ہوا تھا اور جب خادمہ نے سچ مچ رقص شروع کیا تو میں دنگ ہی رہ گیا۔ بیتو نے فخر سے کہا۔ "یہ ہمارا ہر حکم مانتا ہے۔ اے ڈانس بند کرو اب ایک پاؤں پر کھڑا ہو جاؤ۔"

اس نے حکم کی تعمیل کی اور یوگا اسٹائل میں دونوں ہاتھ جوڑ کر کھڑی ہو گئی۔ میں نے بیتو کی طرف دیکھا۔ "یہ کیا بچکانا پن ہے۔"

"شوبی ہم کو مزہ آ رہا ہے اس نے بھی ہم کو چاقو لگایا تھا۔"

"وہ دوسری بات تھی لیکن اس وقت یہ خادمہ ہے ہم اسے غلط استعمال نہیں کر سکتے۔"

بیتو مرجھا گیا۔ "اچھا ہم نے غلط کیا سوری۔"

"تم جاؤ اور چائے کے ساتھ کچھ ریفریشمنٹ لے آؤ۔" میں نے خادمہ سے کہا۔ اس نے پاؤں نیچے کیا اور رخصت ہو گئی۔ اس دوران میں وہ سب نہایت سنجیدگی سے کرتی رہی اس کے چہرے پر ذرا بھی تاثر نہیں آیا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے بیتو سے کہا۔ "یار وہ دشمن نہیں ہے اس نے اپنا فرض پورا کیا۔"

"شوبی آپ کو برا لگا ہے سوری۔"

"کوئی بات نہیں۔" میں نے اس کا شانہ تھپکا۔

مگر وہ اداس ہو گیا تھا۔ "شوبی ہم کو دیدی یاد آ رہا ہے۔ وہ پتا نہیں کس حال میں ہوگا۔"

مجھے بھی سادی کا خیال آ رہا تھا۔ یہ امید تو نہیں تھی کہ اس پر کوئی جسمانی جبر ہوگا لیکن وہ قید میں تھی اور وسیم سے دور تھی اس کے لیے یہی سب سے بڑی تکلیف ہوگی۔ پھر وہ ماں بننے والی تھی ایسے میں تو عورت اور بھی حساس ہو جاتی ہے۔ "فکر مت کرو اللہ نے چاہا تو وہ جلد واپس اپنوں میں ہوگی۔"

"شوبی ہمارا تین بہن تھا ہم اچھا بھائی نہیں ہے کبھی ان کا خیال نہیں رکھا پر ان سے محبت کرتا تھا کبھی ان کو تکلیف دینے کا سوچ بھی نہیں سکتا تھا یہ کنور کیسا بھائی ہے؟"

"دنیا میں ہر طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ مجھے بھی ماں جی کے بعد گھر میں سب سے زیادہ محبت صغراں آپا سے ہے۔"

"وہ بہت اچھا ہے ہم کو چھوٹا بھائی بنایا۔ شمی ہم کو چھوٹا ماموں کہہ کر چھیڑتا تھا۔"

بیتو نے ذکر چھیڑا تو میں حویلی پہنچ گیا جہاں میرے پیارے تھے۔ ماں جی، بابا، آپا، شمی، بھائی، بھابی، ان کے بچے اور سویرا۔ بیتو ان کے بارے میں بتا رہا تھا اور میں سن رہا تھا۔ کبھی میں اسے بتاتا اپنے ماضی کے بارے میں۔ پہلی بار بیتو کو بتایا کہ میں کیسے گھر سے نکلا تھا؟ بابا نے مجھ پر اور سویرا پر کیا ظلم کیا تھا؟ بیتو بھی دکھی ہو گیا۔ "کاش ایسا نہ ہوتا بابا اس وقت سمجھ جاتا۔"

"بس یار یہ نصیب کی بات ہے۔ انسان کے مقدر میں اوپر والے نے جو لکھ دیا وہ ہوتا ہے۔"

"پر اب بابا بالکل بدل گیا ہے۔ کسی پر ذرا بھی غصہ نہیں کرتا۔ سب کا بہت خیال رکھتا ہے۔ کبھی ہمارے ساتھ ہوتا تو آپ کا بہت بات کرتا تھا۔"

میں نے سر ہلایا۔ "میں جانتا ہوں بابا اولاد سے چھپی محبت کرتے ہیں، خاص طور سے بیٹوں سے۔ بس وہ آپا کے لیے اپنی محبت نہیں چھپا پاتے۔"

"شمی کا ہونے والا دلہا بھی آیا تھا ہم کو اچھا لگا۔ دونوں کا جوڑی اچھا ہے۔"

ماضی کی یادیں اتنی ہوتی ہیں کہ کبھی ختم نہیں ہوتی ہیں۔ دروازے پر دستک ہوئی تو میں سمجھا کہ خادمہ آئی ہے لیکن جب اجازت دی تو اس کے بجائے فتح خان اندر آیا۔ مجھے دیکھ کر وہ چونکا مگر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ "کیا حال ہیں شہباز خان؟"

"قید میں دشمن کا حال پوچھتے ہو؟" میں نے مسکرا کر کہا۔ "درحقیقت مجھے تمہارا حال اچھا نہیں لگ رہا ہے۔"

وہ چونکا۔ "کیا مطلب؟"

"فتح خان اس بار تم مجھے کچھ بے بس سے لگ رہے ہو۔ پہلے جیسی کمانڈ نہیں ہے تمہارے پاس۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "ہمارے پاس کمانڈ کبھی نہیں ہوتا کیونکہ ہمیں روپیا دیا جاتا ہے۔"

"پھر کیا بات ہے؟"

وہ صوفے پر گر گیا۔ "اس بار ہم خوشی سے نہیں کر رہا ہے۔"

"مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تم خوشی سے کر رہے ہو یا ناخوش ہو کر..... کیونکہ تمہیں جو ڈیوٹی میرے

خلاف دی گئی وہ تم نے ادا کر دی ہے۔"

"کیونکہ مجھ کو اس کا معاوضہ دیا گیا ہے۔"

میں نے اسے ٹٹولنے والی نظروں سے دیکھا۔ "فتح خان تمہارا کام ختم ہو گیا ہے۔"

"ابھی باقی ہے جب تک شا یہاں ہے میرے کو اس کے ساتھ رہنا ہے۔"

"یہاں اس کے نمک خواروں اور اس کے ایک اشارے پر دم ہلانے والوں کی کوئی کمی نہیں ہے پھر تمہاری کیا ضرورت ہے؟"

"یہ نہیں بتا سکتا۔" اس نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "تمہارا اپنے ساتھیوں سے بات ہو گیا۔"

"تم جانتے تو ہو بلا وجہ کیوں پوچھ رہے ہو۔" میں نے کہا۔

"میں باہر تھا ابھی آیا ہوں۔"

"ہاں ہوئی ہے اور اب مجھے ڈیوڈ شا سے بات کرنی ہے۔"

"ٹھیک ہے میرا خواہش ہے کہ یہ کام جلد ہو جائے۔" اس نے میری طرف یوں ہاتھ بڑھایا جیسے مصافحہ کرنا چاہ رہا ہو حالانکہ اسے معلوم تھا کہ میں اس سے ہاتھ نہیں ملاؤں گا۔ میں اسے انکار کرنے والا تھا کہ میری نظر اس کی ہتھیلی پر گئی۔ اس پر کچھ تحریر تھا۔ میں نے غور کیا اس نے لکھا ہوا تھا۔

"شا سے اپنی بات منوانا، وہ مانے گا ضرور مانے گا۔"

میں نے پڑھ کر سپاٹ لہجے میں کہا۔ "میری بھی یہی خواہش ہے۔"

فتح خان نے مطمئن ہو کر سر ہلایا اور باہر چلا گیا۔ بیتو اس کے ہاتھ کی تحریر نہیں دیکھ سکا تھا۔ اس لیے حیران تھا اس نے کہنا چاہا تو میں نے غیر محسوس انداز میں نفی میں سر ہلایا یہ بات یقینی تھی کہ یہاں ہمیں دیکھنے کا بندوبست بھی تھا۔ ورنہ فتح خان یوں ایکٹ نہ کرتا۔ بیتو چپ ہو گیا۔ چند منٹ بعد خادمہ چائے اور دوسری چیزیں لے آئی۔ سرد موسم اور پھر پہاڑوں کے معدنی پانی کی وجہ سے یہاں کھایا پیا آسانی سے ہضم ہو جاتا تھا اور آدمی کسی بھی وقت کھانے کے لیے تیار ہوتا تھا۔ میں نے ورزش کی تھی اور غسل کے بعد بھوک کھل گئی تھی۔ ہم نے چائے اور اس کے لوازمات سے پورا انصاف کیا۔ اس وقت چھ بج رہے تھے۔ میرا اندازہ تھا کہ ڈنر یہاں آٹھ یا ساڑھے آٹھ تک ہوگا کیونکہ انگریز کے لیے اس کے بعد رات ہو جاتی ہے۔ رات نو بجے کے بعد انگریز دنیا جہان کی شرابیں پی سکتا ہے لیکن ایک لقمہ کھانا بھی صحت کے لیے مضر سمجھتا ہے۔ یہ میں کسٹیلیق انگریزوں کی بات کر رہا ہوں جو گھڑی کے پابند ہوتے ہیں۔ ڈیوڈ شا ایسا ہی انگریز تھا۔ ریفریشمنٹ کے بعد میں ٹی وی دیکھ کر وقت گزارتا رہا۔ ٹھیک آٹھ بجے خادمہ نمودار ہوئی۔

"ساڑھے آٹھ بجے مسٹر شا ڈنر ٹیبل پر منتظر ہوں گے۔ آپ آٹھ بیس تک تیار رہیے گا۔"

مجھے دل میں ہنسی آئی۔ میں اور بیتو یہاں قیدی تھے لیکن ڈیوڈ شا اور اس کے آدمی یوں ظاہر کر رہے تھے جیسے ہم بہت معزز مہمان ہیں۔ پورا رکھ رکھاؤ کیا جا رہا تھا۔ ہم بھی مہمان بنے ہوئے تھے۔ بہر حال جلد سب کھل کر اپنی اصلیت پر آ جاتے۔ آٹھ بج کر بیس منٹ پر پوجا آئی اور ہمیں ساتھ لے گئی۔ اس بار بھی ڈنر اسی بڑے سے ہال میں تھا دوپہر میں وہاں میں اور ڈیوڈ شا اکیلے تھے۔ اب فرق یہ تھا کہ میرے ساتھ بیتو تھا اور ڈیوڈ شا کے بائیں طرف ایک طویل قامت اور مضبوط جسامت کا سفید فام موجود تھا۔ اس نے آرمی جیکٹ پہن رکھی تھی اور چھوٹے بالوں سے وہ آرمی مین ہی لگ رہا تھا۔ ڈیوڈ شا نے اس کا تعارف کرایا۔ "ایکس آرمی آفیسر کرنل جیمو بیکسٹر۔"

"شہباز ملک۔" میں نے اس کا بڑھا ہوا ہاتھ تھام لیا۔ اس کی گرفت میں مضبوطی تھی لیکن سختی نہیں تھی اس لیے میں نے بھی ہاتھ ڈھیلا رکھا پھر بیتو کا تعارف کرایا۔ اس نے بیتو سے بھی ہاتھ ملایا تھا۔ ہم آمنے سامنے آ گئے۔ ڈنر اس بار بھی کئی کورس کا تھا اور تقریباً فائیو اسٹار تھا۔ کھانا خاموشی سے کھایا گیا اور کھانے کے بعد قہوہ بھی خاموشی سے پیا گیا۔ ڈیوڈ شا نیپکن سے منہ صاف کرتا ہوا اٹھا۔

"شہباز ملک میرا خیال ہے تم نے فیصلہ کر لیا ہے۔"

میں نے سر ہلایا اور بیتو کی طرف دیکھا وہ میرا اشارہ سمجھ گیا اس نے کہا۔ "ہم دوا لے کر آرام کرے گا۔"

بیتو پوجا کے ساتھ چلا گیا۔ میں، ڈیوڈ شا اور کرنل جیمو اسی کمرے میں آ گئے۔ اب شیشے کی دیوار کے پار تاریکی تھی اور دور برف پوش پہاڑیاں ہیولوں کی صورت میں تھیں۔ آسمان پر بادل تھے اس لیے چاند نکلا ہوا تھا بھی تو نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہم صوفوں پر آمنے سامنے آ گئے۔ ڈیوڈ شا اور کرنل نے وہسکی کی بوتل سنبھال لی تھی اور

میرے لیے کافی کا آرڈر کیا۔ میں نے محسوس کیا کہ ڈیوڈ شا بہ ظاہر بے پروا اور سرد تھا لیکن اندر سے وہ مضطرب تھا۔ کرنل جیمز کی موجودگی بھی معنی خیز تھی۔ گویا فتح خان کی بات درست تھی اور ڈیوڈ شا ہر قیمت پر میرا تعاون حاصل کرنے پر تل گیا تھا اس لیے میں نے فیصلہ کیا کہ شرائط میں کچھ اضافہ کرلیا جائے تو اس میں حرج نہیں ہے زیادہ سے زیادہ ڈیوڈ شا ماننے سے انکار کردے گا لیکن وسیم کی بتائی شرائط لازمی منوانی تھیں۔ اندر سے میں بھی مضطرب تھا لیکن اپنا ظاہر میں نے بھی سرد رکھا ہوا تھا۔ اب معلوم نہیں کہ ڈیوڈ شا میرے اضطراب سے واقف تھا یا نہیں۔ میں خاموش تھا اور منتظر تھا کہ وہ پہل کرے۔ مگر وہ بھی خاموش تھا اس لیے پہل کرنل جیمز نے کی۔

”میرا خیال ہے ہم یہاں بات کرنے آئے ہیں۔“

”میرا بھی یہی خیال ہے اور میں منتظر ہوں کہ مسٹر ڈیوڈ شا اس کا آغاز کرتے ہیں۔“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”میں اپنی بات تم تک پہنچا چکا ہوں تم نے جو مطالبہ کیا میں نے وہ پورا کیا، اس لیے اب تم بات کرو تمہیں میری بات منظور ہے یا نہیں۔“

”میں نے اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا ہے۔“ میں نے کسی قدر ڈرامائی انداز میں کہا اور یہ جملہ بول کر چپ ہوگیا۔ اس پر دونوں نے بے چینی سے پہلو بدلا۔ ڈیوڈ شا سے رہا نہیں گیا اس نے بے تابی سے پوچھا۔

”تب تم نے کیا سوچا؟“

”میں راضی ہوں لیکن میری کچھ شرائط ہیں۔“

میری بات پر ڈیوڈ شا کے چہرے پر جو تاثرات اور اطمینان آیا تھا اس سے مجھے مزید یقین ہوگیا کہ وہ میرا تعاون حاصل کرنے کے لیے سب مان جائے گا۔ مگر اس نے فوراً خود پر قابو پالیا اور سرد لہجے میں بولا۔ ”کیسی شرائط؟“

”پہلی شرط سادی کی با حفاظت کنور پیلس سے رہائی اور اس کے بعد اسے پاکستان پہنچانا۔“

اس نے سر ہلایا۔ ”اس کی آفر میں تمہیں پہلے ہی کر چکا ہوں اور تمہیں فری ہینڈ بھی دے چکا ہوں۔“

”یہ کام تمہارے آدمیوں کو کرنا ہوگا۔“ میں نے کہا۔ ”لیکن میں ساتھ رہوں گا اور سادی میری تحویل میں آئے گی۔“

”جیسا تم کہو گے۔“ اس نے گویا شرط مان لی۔

”دوسری شرط یہ ہے کہ میں وادی کی طرف تمہارے ساتھ اکیلا نہیں جاؤں گا میرے دو ساتھی اور کچھ آدمی بھی ساتھ ہوں گے۔“

اس بار وہ کچھ مضطرب ہوا تھا۔ ”اس کی کیا ضرورت ہے؟“

”یہ میری حفاظت کے لیے لازمی ہے۔“ میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔ ”مجھے خطرہ ہے کہ اس سفر کے بعد میں تمہارے لیے غیر ضروری ہو جاؤں گا۔“

”تمہیں مجھ پر اعتبار کرنا چاہیے کیونکہ میں تم پر اعتبار کر رہا ہوں۔“

میں نے نفی میں سر ہلایا۔ ”تم میں اور مجھ میں فرق ہے۔ تم با اختیار ہو اور میں بے اختیار ہوں۔ اس لیے مجھے تحفظ کی ضرورت ہے۔“

”مسئلہ یہ نہیں ہے میں مختصر پارٹی لے کر جاؤں گا۔ اول تو بڑی پارٹی کی اجازت نہیں ملے گی۔ دوسرے بڑی پارٹی کی صورت میں رازداری مشکل ہو جائے گی۔“

”ڈیوڈ شا اجازت اور رازداری تمہارے لیے مسئلہ نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”اسے لازمی سمجھو اس کے بغیر بات آگے نہیں بڑھے گی۔“

اس نے چند لمحے سوچا۔ ”اوکے میں تمہارے دو ساتھیوں کی حد تک مان لیتا ہوں۔“

”یوں سمجھو کہ ہم تمہارے اتحادی ہوں گے ہمارے پاس اپنی حفاظت کا بندوبست ہوگا۔ ہم اس معاملے میں تمہارے محتاج نہیں ہوں گے۔“

”اسلحہ مشکل ہے لیکن دیکھیں گے؟“

”نہیں ڈیوڈ شا یہ ابھی طے ہوگا۔“

”مجھے اعتراض نہیں ہے۔“ ڈیوڈ شا نے کہا۔ ”لیکن اس سے اعتماد کی فضا متاثر ہوگی۔“

”نہیں ہوگی میں اس کی ضمانت دوں گا۔“

”اوکے اٹ از ڈن ناؤ۔“ ڈیوڈ شا نے بد مزگی سے کہا۔

”تیسرے میں چاہتا ہوں تم مرشد کا کوئی مستقل بندوبست کرو تاکہ اس کے بعد وہ میرے لیے کوئی مسئلہ نہ بن سکے۔ میں اور میرے ساتھی سکون سے عام انسانوں جیسی زندگی گزاریں، بغیر کسی خوف و خطر کے۔“

”میں اسے دیکھوں گا۔“ اس بار اس نے واضح جواب نہیں دیا۔ ”میں تمہاری مرشد سے صلح کرا سکتا ہوں

لیکن صلح دو طرفہ ہوتی ہے۔“

”بات صلح کی نہیں مرشد کی طرف سے دشمنی کا باب ختم کرنے کی ہے۔ میری اطلاعات کے مطابق وہ نادر کے بعد اس کی موت کا ملبا ڈال کر میرے اور میرے ساتھیوں کے خلاف نئی مہم شروع کرنے والا ہے۔ اس کا مقصد اپنے خاندان والوں اور مریدوں کو مطمئن کرنا ہے۔“

”مرشد سے کچھ حساب میں نے بھی لینا ہے اس لیے تم اسے شرط مت بناؤ مجھے پوری امید ہے میں اس مسئلے کو حل کرلوں گا۔“

مجھے پہلے بھی یقین نہیں تھا کہ ڈیوڈ شا مرشد کے بارے میں کوئی ضمانت دے گا اس لیے میں نے اس پر زیادہ زور نہیں دیا۔ ”ٹھیک ہے یہاں میں تم پر بھروسا کر رہا ہوں۔ اب یہ بتاؤ کہ سعدیہ کو کنور پیلس سے کیسے اور کب نکالا جائے گا؟“

”یہ تم اور کرنل جیمز مل کر طے کرو گے۔“ ڈیوڈ شا نے کہا۔ ”کرنل سیکیورٹی کا ماہر ہے۔ رٹی کرنے کا بھی اور اسے بریک کرنے کا بھی۔“

میں نے کرنل کی طرف دیکھا۔ ”تم کیا کر سکو گے؟“

”ہم پروفیشنل انداز میں کام کریں گے۔“ اس نے جواب دیا۔ ”ہر اسٹیپ کی پلاننگ کریں گے۔ اس کے مطابق عمل کریں گے۔“

”پلاننگ کا اولین مرحلہ کنور پیلس کی سیکیورٹی کے بارے میں مکمل معلومات حاصل کرنا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”یہ بات اندر کا کوئی آدمی ہی بتا سکتا ہے۔“

کرنل نے مسکرا کر کہا۔ ”خوش قسمتی سے ہمارے پاس اندر کا ایک آدمی ہے۔“

”وہ آدمی کہاں ہے؟“

”ابھی یہاں نہیں ہے لیکن کل تک آجائے گا۔“ کرنل نے کہا۔ ”وہ کچھ کارآمد معلومات لے کر آئے گا اور اس کی مدد سے ہم اپنے منصوبے کو حتمی صورت دیں گے۔“

”وہ لالچ میں کام آرہا ہے؟“

”ہاں لالچ بھی ہے لیکن اصل میں اسے بڑے کنور سے بدلہ لینا ہے اس لیے وہ ہمارے ساتھ ہے۔“

”یہ اچھی خبر ہے ورنہ جو شخص رقم کے بدلے بکے وہ قابل اعتماد نہیں ہوتا۔ وہ ایک کو دھوکا دیتا ہے تو دوسرے کو بھی دھوکا دے سکتا ہے۔“

”تم فکر مت کرو مسٹر شہباز ہم ہر پہلو پر نظر رکھیں گے۔“

میں نے ڈیوڈ شا کی طرف دیکھا۔ ”سادی کو کنور پیلس سے آزاد کرانا تمہاری ذمے داری ہے لیکن میں ساتھ ہوں گا اور بعض معاملات میں فیصلے میں کروں گا۔“

”کن معاملات میں؟“

”یہ میں وہیں بتاؤں گا۔“ میں نے کہا اور کرنل کی طرف دیکھا۔ ”گارڈز کے ساتھ تم جو چاہے سلوک کرو لیکن عام ملازموں اور کنور خاندان کے افراد کو کچھ نہیں ہونا چاہیے۔“

اس نے سر ہلایا۔ ”میں بھی عام آدمیوں کو نہ چھیڑنے کا قائل ہوں۔“

میں نے ایک بار پھر محسوس کیا کہ میری اس بات سے ڈیوڈ شا متفکر ہوگیا تھا۔ البتہ اس نے پہلے سوال کے بعد اس معاملے پر مزید کچھ نہیں کہا۔ البتہ اس کے اور کرنل کے درمیان معنی خیز نگاہوں کا تبادلہ ہوا تھا۔ میں سوچ میں پڑ گیا۔ کیا اس کارروائی کے پس پشت ڈیوڈ شا کا بھی کوئی مفاد تھا؟ کیونکہ بہ ظاہر تو ڈیوڈ شا کا اس معاملے میں کوئی مفاد نہیں تھا اور وہ یہ سب صرف مجھے راضی کرنے کے لیے کر رہا تھا۔ مجھے اپنی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ سی محسوس ہوئی جیسے کسی سنسنی خیز کھیل کا آغاز ہوگیا ہو۔ میں اس کھیل کا ایک حصہ تھا اور کھیل کے کچھ حصے یقیناً میری نظروں سے اوجھل تھے۔ اسی طرح کچھ حصے دوسرے حصے داروں کی نظروں سے بھی اوجھل تھے۔ سب اپنا اپنا کھیل کھیل رہے تھے اور اپنا مفاد حاصل کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ ڈیوڈ شا سے کام کی بات ہوگئی تھی اس لیے وہ کھڑا ہوگیا اور میری طرف دیکھا۔

”اب تم آرام کرو۔“

اس نے صرف مجھے کہا تھا اور کرنل اپنی جگہ موجود رہا تھا یعنی وہ رہتا اور ڈیوڈ شا اس سے بات کرنا چاہتا تھا۔ فوراً ہی فتح خان نمودار ہوا جیسے اسے کوئی نادیدہ اشارہ ملا ہو اور میں اس کے ساتھ اپنے کمرے کی طرف روانہ ہوگیا۔ میں نے راستے میں پوچھا۔ ”کیا میں اور بیتو اپنے کمرے میں قید ہوں گے؟“

”نہیں لیکن اس عمارت سے باہر جانے پر پابندی ہوگی اور کمرے سے باہر تم نظروں میں رہو گے۔“

”مجھے تو یقین ہے کمرے میں بھی میں تم لوگوں کی نظروں سے محفوظ نہیں ہوں اس لیے احتیاطاً واش روم میں

کپڑے بدلے تھے۔ یقین تو وہاں کے بارے میں بھی نہیں ہے لیکن مجبوری ہے وہی آخری جگہ بچتی ہے جہاں انسان کسی کی نگاہوں سے بچ سکتا ہے۔"

میں اندر آیا تو بیتو خراٹے لے رہا تھا اور یہ خاصے خوفناک خراٹے تھے۔ میں نے سر پر ہاتھ مارا۔ آج رات کالی ہوتی نظر آ رہی تھی۔ میں نے گرم پانی سے شاور لیا اور پھر لیٹا تو جلد نیند آ گئی اور پھر بیتو کے خراٹوں نے پریشان نہیں کیا تھا۔ میری آنکھ کھلی تو بیتو اٹھ گیا تھا اور آئینے کے سامنے کھڑا اپنے زخم کا معائنہ کر رہا تھا۔ اس پر کھرنڈ کی سرخی ختم ہو چکی تھی اور اب یہ براؤن ہو رہا تھا اس نے خوش ہو کر مجھے آگاہ کیا۔ "شوبی اب ہم بالکل ٹھیک ہے۔"

"لیکن دوا دو دن اور کھانی ہوگی۔" میں نے اٹھ کر واش روم کا رخ کیا۔

"شوبی ناشتے کا کہہ دے؟" عقب سے بیتو نے پوچھا۔

"نیکی اور پوچھ پوچھ۔" میں نے دروازہ بند کر کے کہا۔ فارغ ہو کر باہر آیا تو بیتو پوچا کو ناشتے کا بتا رہا تھا۔ یہ خاصا بھاری بھرکم اور لمبا چوڑا ناشتا تھا مگر میں نے ٹوکا نہیں تھا البتہ اس میں انگریزی کے تازہ اخبارات کا اضافہ کر دیا۔ پھر ٹی وی ریموٹ سے آن کیا۔ یہ کوئی سیٹلائیٹ ٹی وی سسٹم تھا اور اس میں کئی سو چینلز تھے مگر زیادہ تر مقامی بھارتی چینلز تھے اور باقی انٹرنیشنل چینلز تھے۔ میں پاکستان بات کرنا چاہ رہا تھا لیکن یہ کام میں نے ناشتے کے بعد کے لیے اٹھا رکھا تھا۔ وقت گزاری کے لیے چینل گھما رہا تھا کہ اچانک ایک چینل پر میرا ہاتھ رک گیا۔ یہ ماحولیاتی چینل تھا اور اس پر ایمن کا پروگرام آ رہا تھا۔ بیتو اسے دیکھ کر چونکا۔

"شوبی یہ تو وہی ہے نا؟"

"ہاں یہ ایمن ہے۔" میں نے کہا اور آواز تیز کی۔ ایمن ہمالیہ کے پس منظر میں ایک ڈاکومینٹری پیش کر رہی تھی مجھے یاد تھا جب آخری بار اس سے بات ہوئی تھی تو اس نے ذکر کیا تھا کہ وہ اس مقصد کے لیے انڈیا اور نیپال آئے گی۔ پروگرام کے ساتھ کوئی تاریخ نہیں آ رہی تھی جس سے پتا چلتا کہ یہ کب بنا تھا۔ مگر موسم گرما کا لگ رہا تھا کیونکہ ماؤنٹ ایورسٹ کے نیچے دور سے ہی سبزہ نمایاں تھا۔ خود ایمن ایک گل رنگ وادی میں کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے جینز پر مقامی انداز کا کرتا پہن رکھا تھا اور یہ اس پر جچ رہا تھا۔ وہ بتا رہی تھی کہ ہمالیہ پہاڑوں کے دیوتاؤں کا گھر تھا یہاں دنیا کی سو بلند ترین چوٹیاں تھیں اور ہمالیہ سے باہر بلند ترین چوٹی کا نمبر سو کے بعد آتا تھا۔ آدھے گھنٹے کے اس پروگرام میں سوائے ہمالیہ کے تعارف کے اور کچھ نہیں تھا۔

اس دوران میں ناشتا آ گیا اور میں ناشتے کے دوران ہی پروگرام دیکھتا رہا۔ پروگرام کے بعد جب ناموں کی سلائیڈ چلتی ہے تب میں نے دیکھا۔ پروگرام اسی مہینے کی نو تاریخ کا ریکارڈ ہوا تھا یعنی آج سے گیارہ دن پہلے کا تھا اس کا مطلب تھا کہ ایمن اس خطے میں ہو سکتی تھی۔ لیکن اس وقت اس کا یہاں ہونا میرے لیے مشکلات کھڑی کر سکتا تھا۔ ڈیوڈ شا ایک بار پہلے بھی اس کے حوالے سے مجھے بلیک میل کر چکا تھا اور اس سے کچھ بعید نہیں تھا۔ وہ ایک بار پھر ایمن کی مدد سے مجھ پر دباؤ ڈالنے کی کوشش کرتا۔ میں نے دل ہی دل خواہش کی کہ وہ یہاں سے جا چکی ہو۔ ناشتے کے بعد میں نے اسکائپ پر رابطہ کیا۔ عبداللہ آن لائن تھا۔ سفیر سو رہا تھا کل رات اس کا موڈ خراب تھا اور اس نے وسیم سے جھگڑا کیا تھا کہ وہ کیوں نہیں جا رہا۔ میں نے عبداللہ سے کہا۔

"میری خواہش ہے کہ تم دونوں بھی نہ چلو کیونکہ بہرحال اس مہم میں بھی خطرہ ہے۔"

"ایسا نہیں ہو سکتا۔" عبداللہ نے دوٹوک انداز میں کہا۔ "ڈیوڈ شا نے کیا کہا ہے۔"

"میرے دو ساتھیوں کے بارے میں مان گیا ہے۔ ہم اپنی حفاظت کے خود ذمے دار ہوں گے لیکن مزید لوگ لے جانے سے ہچکچا رہا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ پارٹی ایک حد سے زیادہ بڑی نہیں ہو سکتی۔"

"بیتو آپ کے ساتھ ہے۔ ایک آدمی اور لے سکتے ہیں۔" عبداللہ نے کہا۔ "ڈیوڈ شا جیسے شخص کے لیے پارٹی چھوٹی بڑی ہونا مسئلہ نہیں ہو سکتا ہے۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے وہ بلا وجہ ہچکچا رہا ہے۔" میں نے کہا اسی دوران میں وسیم آ گیا وہ تولیے سے سر رگڑ رہا تھا۔

"کیسے ہیں آپ کیا ہو رہا ہے؟"

میں نے اسے تفصیل سے اپنے اور ڈیوڈ شا کے مذاکرات کے بارے میں بتایا اور کرنل جیمو کے بارے میں بتایا تو وسیم چونک گیا۔ "میرا خیال ہے میں اسے جانتا ہوں۔ کسی وقت یہ افغانستان میں برطانوی فوج کا حصہ تھا۔ پھر ایک لڑائی میں شدید زخمی ہوا تو فوج سے ریٹائر ہو گیا۔ میں

جس افغانی سے اسلحہ اور دوسرا سامان لیتا تھا اس نے اس لڑائی میں شرکت کی تھی اور اس کا کہنا تھا کہ کرنل جیمو نے زخمی ہونے کے باوجود نہایت بہادری کا مظاہرہ کیا اور اپنے دو درجن ساتھیوں کی جان بچانے میں بنیادی کردار ادا کیا ورنہ وہ سب مارے جاتے۔"

"اس کا مطلب ہے کرنل جیمو پیشہ ور سپاہی ہے۔"

"بالکل اگر یہ وہی کرنل جیمو ہے تو بہت اچھا کمانڈر اور سپاہی ہے۔" وسیم نے تائید کی۔

"ڈیوڈ شا نے کنور پیلس کے اندر کا ایک آدمی بھی تلاش کر لیا ہے وہ اندر کی سیکیورٹی کے بارے میں بتائے گا۔"

"یہ ضروری تھا اس کے بغیر کامیابی مشکوک اور بہت زیادہ قوت اور قتل و غارت گری کے بعد ہی ممکن ہوتی۔"

"وہ آج آئے گا اس کے بعد پلان تیار کیا جائے گا۔"

وسیم نے کہا۔ "مانی نے کنور پیلس کا تھری ڈی نقشہ دکھایا ہے اس جگہ حملہ کرنا بہت مشکل ہے اور حملہ آوروں کو پوری طرح تربیت یافتہ اور مسلح ہونا ضروری ہے۔ غیر روایتی ہتھیار لازمی ہوں۔ جیسے گیس اور دھوئیں کے بم، راستے صاف کرنے کے لیے دھماکا خیز مواد اور اس کے استعمال کا ماہر بھی ہو۔"

"میرا خیال ہے کرنل جیمو کے ذہن میں یہ سب ہوگا پلان پر بات کر کے میں ایک بار پھر سب تمہارے سامنے رکھوں گا۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں، یہ سب اب عام ہو گیا۔ بلٹ پروف، رابطے کے جدید آلات، رات کی تاریکی میں دیکھنے والی عینکیں اور لیزر کی مدد سے ایکوریٹ نشانہ لینے والی گنیں۔"

عبداللہ نے کہا۔ "جناب میرے ذہن میں ایک خیال اور آ رہا ہے۔ اوشا بھی تو اسی جگہ رہی ہے اور وہاں سے اچھی طرح واقف ہوگی۔"

میں چونکا۔ "اوشا.... لیکن وہ رانا دیاس کے پاس ہے۔"

"اسے وہاں سے بلایا جا سکتا ہے۔" عبداللہ نے اصرار کیا۔ "وہ خاص کنور فیملی کے حصے میں ہوتی تھی اور ہمیں وہیں تک جانا ہے سادی وہیں ہوگی۔"

"یہ ٹھیک کہہ رہا ہے۔" وسیم نے عبداللہ کی تائید کی۔

میں سوچ میں پڑ گیا پھر میں نے کہا۔ "اسے آپشنل رکھو اگر کنور پیلس کا بھیدی مجھے مطمئن نہ کر سکا تو پھر ہم اوشا کو بھی بلوا سکتے ہیں۔"

عبداللہ ہنسا۔ "آپ اس سے ڈرتے ہیں۔"

"یہ پوچھیں کہ یہ کس سے ڈرتا ہے؟" وسیم نے شرارت سے کہا۔

"کوئی نہیں ڈرتا۔" عبداللہ جلدی سے بولا۔

"یہ کس کا ذکر ہو رہا ہے؟"

"اسی گل بانو کا جو آپ نے بھیجی تھی۔" وسیم کے لہجے کی شرارت بڑھ گئی۔ "خاتون نے گھر کا نظام ایسے سنبھال لیا ہے کہ اب یہ ہر کام اس سے پوچھ کر کرتا ہے۔"

"بانو۔" میں نے سر پر ہاتھ مارا۔ "اسے تو میں بھول گیا کیسی ہے وہ؟"

"وہ آپ سے خفا ہے کہ آپ نے اتنی بار بات کی اور ایک بار بھی اس سے بات نہیں کی۔"

"یار یہ غلطی ہوئی اسے بلاؤ۔"

عبداللہ بلانے گیا اور ایک منٹ بعد بانو اسکائپ پر تھی۔ اس نے حسب معمول فراک سوٹ پہن رکھا تھا اور وہ کچھ نازک اندام ہو چکی تھی، اس لیے یہ لباس اس پر اچھا لگ رہا تھا۔ اس نے آتے ہی شکوہ کیا۔ "کیسے ہیں آپ مجھے تو بھول ہی گئے۔"

"سوری۔" میں نے جلدی سے معذرت کی۔ "تمہیں واپس بھیجنے کے بعد ایک منٹ بھی چین سے بیٹھنے کا موقع نہیں ملا۔ اب دشمن کی قید میں ہوں تو ذرا سکون ہے۔"

وہ پریشان ہو گئی۔ "کیا بڑے کنور نے...."

"نہیں یہ ڈیوڈ شا ہے، بہرحال میری جان کا دشمن نہیں ہے۔" میں نے اسے بتایا تو اس نے سکون کا سانس لیا۔ "تم کیسی ہو یہاں کوئی تکلیف تو نہیں ہے۔"

"نہیں میں بہت آرام سے ہوں ہاں۔ یہ لوگ مجھ سے تنگ ہیں۔" بانو نے ترچھی نظروں سے دائیں طرف دیکھا۔ اس کی نظروں کا نشانہ عبداللہ تھا۔ اس نے جلدی سے کہا۔

"ایسی کوئی بات نہیں ہے جناب۔"

"میرا خیال ہے تم نے ان لوگوں کو ٹائٹ کر دیا ہے ویسے یہ ہیں اسی قابل۔"

"میں پہلے ہی ٹائٹ ہوں۔" وسیم نے سرد آہ

بھری۔ ''نٹ بولٹ سب پوری طرح ٹائٹ ہوگئے ہیں البتہ یہ عبداللہ.....''

''شوبی میں نے بریانی دم پر لگائی ہے۔'' بانو اٹھتے ہوئے بولی۔ ''وہ دیکھ کر آتی ہوں۔''

بانو کے جانے کے بعد وسیم ہنس رہا تھا اور عبداللہ جھینپ رہا تھا۔ کہانی سمجھ میں آرہی تھی لیکن میں نے انجان بن کر پوچھا۔ ''یہ کیا چکر ہے برادرز؟''

وسیم بولا۔ ''آپ انجان نہ بنیں..... یہ اپنے عبداللہ بھائی.....''

''آپ اس کی باتوں میں مت آیئے گا۔'' عبداللہ اس کی بات کاٹ کر بولا۔ ''یہ فارغ ہے نا اس لیے صرف دماغ استعمال کررہا ہے۔''

وسیم ہنس رہا تھا اور عبداللہ جھینپ رہا تھا لیکن میں سنجیدہ ہوگیا۔ ''یار یہ سب مذاق ہے یا اس میں کچھ حقیقت بھی ہے۔''

''میں تو سمجھ رہا ہوں کہ یہ حقیقت ہے لیکن یہ نہیں مان رہا۔'' وسیم نے عبداللہ کی طرف اشارہ کیا۔

''تم کیا کہتے ہو عبداللہ؟''

میرے لہجے سے عبداللہ بھانپ گیا تھا اس لیے وہ بھی سنجیدہ ہوگیا۔ ''آپ مجھے جانتے ہیں اور میرے خیالات بھی۔ ان دونوں نے بلاوجہ میرا پیچھا لیا اور پھر بانو کو بھی چھیڑنے لگے۔ یہ ٹھیک ہے، وہ اچھی لڑکی ہے اور مجھے اچھی بھی لگتی ہے۔'' عبداللہ کہتے ہوئے شرمایا۔ ''لیکن جناب اس کے دل میں کیا ہے مجھے نہیں معلوم۔''

''بیٹے وہ تم سے جس طرح گریز کرتی ہے لیکن ساتھ ہی جیسے خیال رکھتی ہے اس سے اس کے دل کا حال معلوم ہے۔''

''اس کے دل کا حال معلوم کیا جاسکتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''عبداللہ اگر وہ تمہیں پسند کرے تو تم کیا کروگے۔''

''نکاح جناب۔'' وسیم پھر شرارت سے بولا۔ ''اور کیا کرنا ہے اس نے۔''

''جناب میں سنجیدہ ہوں۔'' عبداللہ نے دوسرے لفظوں میں کہا۔

''ٹھیک ہے یہ میری ذمے داری ہے لیکن مہربانی کرکے تم لوگ ذرا ہاتھ ہلکا رکھو۔ وہ بہت حساس لڑکی ہے۔ اس کا دنیا میں کوئی نہیں ہے۔''

''ساری بے چاریوں کا ٹھیکہ ہمارے پاس ہے،

ایک اور سہی۔'' یہ سفیر تھا جو اچانک نازل ہوا تھا۔

''آغاز تیری زوجہ سے ہوا تھا۔'' میں نے تائید کی۔ ''بہرحال بانو مونا اور سادی سے مختلف ہے۔''

''وہ کیسے؟'' وسیم اور سفیر نے بیک وقت اعتراض کیا۔

''وہ ایسے کہ وہ صرف زبان ہی نہیں ہاتھ پاؤں چلانا بھی جانتی ہے۔ اگر اس کا دماغ گھوما تو وہ سب کا دماغ درست کرسکتی ہے اس لیے سب حد میں رہیں۔''

''پہلے کیوں نہیں بتایا تھا۔'' سفیر نے کہا۔ ''اب میں ایک ذرا فاصلے پر رہ کر مذاق کروں گا۔''

''تب بہتر ہے میں اسے بھی حویلی بھیج دوں۔''

''یعنی سیف ڈیپازٹ میں جمع کرادو۔'' سفیر نے ٹھنڈی سانس لی۔ ''ہماری کائنات میں جو تھوڑا بہت رنگ ہے وہ بھی چلا جائے گا۔''

''تو رنگ کے پیچھے کیوں پڑتے ہو؟'' میں نے بھنا کر کہا۔ ''اس صنف کو آس پاس پاکر آپے سے باہر کیوں ہو جاتے ہو؟''

سفیر بدمعاشی کررہا تھا۔ وہ چھیڑ کر مجھے اشتعال دلا رہا تھا۔ مجھے احساس ہوا تو میں نے خود پر قابو پایا ورنہ میں نے اسے سنا دی تھیں جس پر سفیر سمیت سب ہنس رہے تھے۔ میں نے لیپ ٹاپ بیتو کے حوالے کردیا اور وہ سفیر سے لڑنے لگا کہ شوبی پہلے یہاں پریشان ہے اور تم لوگ اسے اور پریشان کررہا ہے۔ وہ بے چارہ ان بدمعاشوں کو کہاں قابو کرتا۔ غصے میں اس نے لیپ ٹاپ بند کردیا اور مجھ سے کہا۔ ''شوبی یہ لوگ ناقابل علاج ہوگیا ہے۔''

''بیٹے ان کا علاج ہے مگران کی ڈاکٹرز دور ہیں ناوہ ہوتیں تو پھر دیکھتے ان کی بولتی کیسے بند ہوتی ہے۔''

بیتو نے سر ہلایا۔ ''آپ ٹھیک کہتا مونا اور سادی دیدی کے سامنے دونوں ایسے شریف بن کر رہتا ہے۔''

''بس تو وہ واپس آکر ان سے سارے بدلے لیں گی اور تب ہم ہنسیں گے۔''

''جیسے ابھی یہ لوگ ہنستا ہے۔'' بیتو نے کہا اور پھر پوچھا۔ ''شوبی اس کمرے سے باہر نہیں جاسکتا دروازہ تو کھلا ہوا ہے؟''

''کمرے سے جاسکتے ہیں عمارت سے باہر نہیں جا سکتے۔''

''تب ہم مٹرگشت کرکے آتا ہے۔ آج زیادہ کھالیا

ہے۔'' اس نے ... دودھ سے اینٹی بایوٹک کیپسول نگلتے ہوئے کہا۔ ''بس اب دو وقت کا دوارہ گیا ہے۔''

''وہ بھی لازمی کھانا..... میرا خیال ہے تم بھی میرے ساتھ چلوگے لیکن اس کے لیے ضروری ہے تم بالکل فٹ ہو۔''

''ہم بالکل فٹ ہے۔'' اس نے سر ہلایا اور کمرے سے نکل گیا۔ پوجا ناشتے کی ٹرالی لے جاچکی تھی۔ میں نے ریموٹ کا بٹن دبا کر اسے طلب کیا اور کافی کا کہا۔ میں سوچنا چاہتا تھا اور یہ موقع تھا ورنہ بیتو ہوتا تو وہ آسانی سے سوچنے نہیں دیتا۔ میں سوچ رہا تھا کہ کنور پیلس پر ہونے والے حملے میں میرا کیا کردار ہوگا اور مجھے کن معاملات کے لیے پہلے سے تیار رہنا چاہیے۔ کچھ دیر غور کے بعد میں نے محسوس کیا کہ میری صرف نگران کی حیثیت سے موجودگی کافی نہیں تھی۔ اپنی کمانڈ قائم کرنے کے لیے مجھے اس حملے میں عملی طور پر حصہ لینا ہوگا۔ کمرے میں ایک طرف چھوٹی رائٹنگ ٹیبل اور اس پر لکھنے کے لوازمات تھے۔ میں نے پین اور رف پیڈ اٹھایا اور اس پر کنور پیلس کا نقشہ کھینچا۔ تقریباً نصف مربع کلومیٹرز پر پھیلا ہوا پیلس کئی عمارتوں پر مشتمل تھا۔ میں نقشے میں ان عمارتوں کو واضح کرنے لگا۔

مرکزی پیلس جس میں کنور خاندان کی رہائش تھی۔ کسی قدر عقب میں تھا۔ اس کے پیچھے صرف دو عمارات تھیں ایک جس میں کلینک اور دوسری سہولیات تھیں۔ یہ کسی قدر عقب میں دائیں طرف تھی۔ جب کہ ملازموں کے لیے مخصوص عمارت بالکل عقب میں تھی۔ فرنٹ پر ایک بڑی ہال نما عمارت تھی جو یقیناً تقریبات کے لیے مخصوص تھی، جب کہ بائیں طرف کی عمارات میں کیا تھا یہ مجھے نہیں معلوم تھا۔ سیکورٹی کے نقطہ نظر سے پورے پیلس کو مختلف سطحوں میں تقسیم کیا ہوا تھا اور ان کی درمیان میں اونچی دیواریں تھیں۔ میں ان دیواروں کو واضح کررہا تھا کہ مجھے خیال آیا اور میں نے پین رکھ دیا۔ جب انٹرنیٹ موجود تھا تو میں اتنی زحمت کیوں کررہا تھا۔ میں نے گوگل ارتھ پر کنور پیلس کی تصویر نکالی۔ اس تصویر میں نہ صرف پیلس کی تمام عمارات واضح تھیں بلکہ اس میں پیمائشیں بھی دی ہوئی تھیں۔ پوجا کافی لے کر آئی تو میں نے اس سے کہا۔

''مجھے ایک اچھا پرنٹر چاہیے۔''

''کچھ دیر میں آجائے گا۔'' اس نے کہا اور چلی گئی۔ میں کافی پیتے ہوئے پیلس کے مختلف حصے واضح کرکے دیکھتا رہا۔ دس منٹ بعد ایک ملازم جدید ترین کلر پرنٹر لے آیا۔ اس نے اسے پلگ کیا اور پھر اس کی پورٹ لیپ ٹاپ سے اٹیچ کردی۔ پرنٹ کا طریقہ کار مجھے آتا تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں کنور پیلس کی تصاویر پرنٹ کرنے لگا۔ یہ مختلف سائز کی تھیں اور ہر عمارت اور ہر حصے کی الگ الگ تصاویر پرنٹ کیں۔ گوگل ارتھ میں یہ مسئلہ ہوتا ہے کہ تصویر خلا سے لی جاتی ہے اس لیے ٹو ڈی ہوتی ہے۔ عمارتوں اور مختلف سطحوں کی اونچائی اور دیواروں کی اونچائی کا اندازہ دشوار تھا۔ مانی کے پاس تھری ڈی گوگل ارتھ تھا جس میں ان عمارتوں کو کسی بھی زاویے سے دیکھا جاسکتا تھا۔ مگر مجھے مانی سے لینے کی ضرورت نہیں تھی۔ مجھے یقین تھا کہ کرنل جیمز اور ڈیوڈ شا کے پاس اس سے بھی آگے کی معلومات ہوں گی اور وہ میں ان سے لے سکتا تھا۔ تصاویر پرنٹ کرکے میں انہیں بستر پر پھیلا کر دیکھنے لگا۔ بیتو اندر آیا۔ اس نے دل چسپی سے دیکھا۔

''شوبی یہ کیا کرتا ہے؟''

''کنور پیلس کا نقشہ ہے۔''

''گوگل ارتھ سے لیا ہے مانی نے ہم کو بتایا تھا۔'' بیتو نے سر ہلایا۔

''یہ مرکزی عمارت ہے۔'' میں نے ایک تصویر پر ہاتھ رکھا۔ ''کنور فیملی یہیں رہتی ہے۔ قبائلیوں کے حملے میں یہ عمارت جل کر تباہ ہوگئی تھی۔ سادی بھی یہیں ہوگی۔''

بیتو غور کرنے لگا۔ میرے کسی بھی ساتھی کی نسبت میدان عمل میں اس نے میرے ساتھ سب سے زیادہ وقت گزارا تھا۔ وہ ذہین بھی تھا اور اس نے سب بہت تیزی سے سیکھا تھا۔ اس نے کہا۔ ''شوبی ادھر حملہ کرنا آسان نہیں ہوگا اور اس جگہ تک جانا تو بہت ہی مشکل کام ہوگا۔''

''تمہارا مطلب ہے اگر کھل کر حملہ کیا جائے تو یہ کام بہت مشکل ہے؟''

''ہم کو لگ رہا ہے۔ پہلے باہر سے کچھ کرنا ہوگا۔''

''کیا کرنا ہوگا؟''

''یہ تو ہم کو نہیں پتا پر پہلے سامنے آئے بغیر کچھ کرنا ہوگا جب یہ الجھ جائے تب اندر گھسے ورنہ بہت نقصان ہوگا۔ اندر گھسنے کے لیے پورا فوج چاہیے ہوگا۔ ہمارا قبائلی بھی ایسے ہی گھسا تھا اسے اندر سے مدد ملا تھا۔ پھر بھی بہت نقصان ہوا تھا۔''

''وہ مدد ایک جال تھا جس میں قبائلی پھنس گئے اور

پھر سرکار نے آپریشن کر کے تمہارے پورے قبیلے کو نابود کر دیا۔"

پیتو نے سر ہلایا۔ "حملہ کرنے والا پانچ چھ سو بندہ تھا۔"

"یہاں پانچ چھ سو بندے مشکل ہیں۔" میں نے سوچتے ہوئے کہا اور پھر پین اور رف پیڈ لے کر کچھ نکات نوٹ کرنے لگا۔ دوپہر تک میں ان ہی کاموں میں لگا رہا۔ ایک بجے یوجانے لنچ کا بتایا لیکن اس بار لنچ اسی عمارت میں تھا۔ کھانے کی ٹرالی کے ساتھ وہ کرنل جیمز کا پیغام لائی۔

"وہ آپ سے ملنا چاہتا ہے۔"

لنچ کے بعد میری کرنل جیمز سے اسی عمارت کی نشست گاہ میں ملاقات ہوئی۔ وہ تقریباً چالیس بیالیس برس کا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا۔ "تم افغانستان میں لڑ چکے ہو؟"

اس نے سر ہلایا۔ "سات سال پہلے.... پھر میں زخمی ہوا اور ریٹائرمنٹ لے لی۔"

"تب سے پرائیویٹ کام کر رہے ہو؟"

"پانچ سال سے.... ایک سال تو میں اسپتال میں رہا میرے سولہ آپریشن ہوئے تھے۔ کئی بار موت کے منہ سے واپس آیا۔ ڈاکٹر میرے بچنے پر حیران تھے۔"

"حالانکہ اس میں حیرت کی کوئی بات نہیں ہے، موت سے پہلے آدمی مر نہیں سکتا ہے۔"

"میرا بھی یہی خیال ہے۔" وہ بولا اور پھر اس نے اپنے سامنے رکھے ایک بڑے لفافے سے کچھ تصاویر نکال کر میرے سامنے رکھ دیں۔ یہ کنور پیلس کی تصاویر تھیں۔ یہ بھی گوگل ارتھ سے تھیں مگر یہ بہت واضح اور تھری ڈی تھیں۔ جب تک میں تصویریں دیکھ رہا تھا کرنل نے ایک بڑا رنگین نقشہ پھیلایا۔ اس نقشے میں تمام سیکیورٹی پوائنٹس واضح تھے۔ اسی طرح جہاں گارڈز گشت کرتے تھے وہ جگہیں بھی واضح تھیں۔ عمارتوں کے نقشے آرکی ٹیکٹ کے لحاظ سے تھے یعنی ان کے اندر کمرے اور دیواریں بھی واضح تھیں۔ دروازوں اور کھڑکیوں کی نشان دہی بھی تھی۔ کرنل نے کہا۔ "ایک ماہر اس کا کمپیوٹر پر تھری ڈی نقشہ بنا رہا ہے۔"

"اس عمارت کی حد تک اس کی ضرورت نہیں ہے۔" میں نے مرکزی عمارت کی طرف اشارہ کیا۔ "میں اس سے واقف ہوں اور یہاں گھسنا میری ذمے داری ہوگی۔"

اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔ "کیا تم بھی حصہ لوگے؟"

"ہاں میں نے فیصلہ کیا ہے کہ اس عمارت پر حملہ میں کروں گا اور میرے ساتھ موجود تمام افراد میرے حکم کے پابند ہوں گے۔"

"ٹھیک ہے لیکن ان لوگوں کو سمجھانے کے لیے نقشے کی تیاری لازمی ہے۔"

میں نے سر ہلایا۔ "کنور پیلس سے تعلق رکھنے والا شخص آگیا؟"

کرنل نے گھڑی دیکھی۔ "ایک گھنٹے میں آرہا ہے۔" اس نے کہتے ہوئے واکی ٹاکی پر کسی شخص سے رابطہ کیا۔ "نقشہ تیار ہوگیا؟.... اوکے میں آرہا ہوں۔" وہ واکی ٹاکی جیب میں رکھ کر کھڑا ہوگیا۔ "مسٹر شہباز میرے ساتھ آؤ۔"

ہم اس عمارت سے نکلتے ہوئے سبزہ زاروں کے درمیان پختہ روش سے گزرنے لگے۔ کرنل نے خبردار کیا۔ "راستے سے مت اترنا، یہاں آٹومیٹک اسنائپر گن لگی ہے۔"

"کیا یہ خطرناک نہیں ہے یہاں بہت سے لوگ ہیں کوئی غلطی سے اتر جائے۔"

"تو مارا جائے گا۔" کرنل نے سرد لہجے میں کہا۔ "ویسے سب کو اچھی طرح سمجھا دیا گیا ہے۔ ایک شخص اپنی حماقت سے مارا گیا جو نشے میں تھا اور لان پر نکل آیا تھا۔"

میں نے چاروں طرف دیکھا تو دو اسنائپر گنیں میری نظر میں آگئیں۔ ایک اس عمارت پر سامنے کی طرف تھی جس میں ہم قید تھے اور دوسری اس عمارت کے اوپر تھی جس میں ڈیوڈ شا سے ملاقات ہوئی تھی۔ مگر ہم ایک تیسری عمارت میں پہنچے۔ یہ چھوٹی اور ایک منزلہ تھی۔ اس کے اوپر ترچھی سبز رنگ کی چھت تھی۔ اندر ایک کمرا کمپیوٹرز اور اس کے متعلقہ آلات سے سجا ہوا تھا۔ وہاں تین افراد موجود تھے اور یہ سب سفید فام تھے۔ کرنل نے تعارف کی ضرورت محسوس نہیں کی یعنی وہ سب نچلے درجے کے لوگ تھے۔ اسے دیکھتے ہی الرٹ ہوگئے۔ کرنل نے ایک نوجوان سے پوچھا۔

"کارل...."

"نقشہ تیار ہے سر۔" اس نے کہا اور اپنے سامنے رکھے کی بورڈ پر انگلیاں چلانے لگا۔ فوراً ہی تیس انچ کے ایل سی ڈی مانیٹر پر کنور پیلس کا تھری ڈی نقشہ نمودار ہوا۔ کرنل نے مرکزی عمارت کی طرف اشارہ کیا۔

"اس کے اندر چلو۔"

کارل جوائے اسٹک استعمال کرنے لگا۔ کنور پیلس کی مرکزی عمارت ہو بہو ایسی ہی تھی۔ دروازے سے اندر داخل ہوئے اور مختلف راہداریوں میں گھومنے لگے۔ کرنل نے میری طرف دیکھا۔ "غالباً تمہیں اس نقشے کی ضرورت نہیں ہے۔" اس کے لہجے میں ہلکا سا طنز تھا۔

"ہاں لیکن میں اسے آزمانا چاہوں گا۔" میں نے جواب دیا۔ "کارل واپس داخلی دروازے پر آؤ۔"

کارل نے کرنل کی طرف دیکھا اور اس سے اشارہ پا کر میرے کہنے پر عمل کیا۔ میں اسے بتانے لگا کہ اسے کہاں جانا تھا میں راج کنور کے عشرت کدے کی طرف لے جا رہا تھا مگر جب عقبی راستے سے وہاں جانا چاہتا تو نقشے میں دیوار آگئی۔ میں نے کرنل کی طرف دیکھا۔ "نقشہ مکمل نہیں ہے۔ یہاں ایک دروازہ ہے جو ایک راہداری میں کھلتا ہے اور اس کے دونوں طرف پانچ پانچ کمرے ہیں۔"

"کمرے موجود ہیں۔" کارل نے کی بورڈ پر انگلیاں چلاتے ہوئے کہا۔ "لیکن ہمیں جو مینول نقشہ دیا گیا اس میں یہ دروازہ موجود نہیں ہے۔"

"دروازہ ہے تم اپنا نقشہ درست کرلو۔" کارل نقشہ درست کرنے میں لگ گیا۔ میں نے کرنل سے پوچھا۔ "تمہارے آدمی اس نقشے کو کیسے استعمال کریں گے؟"

"ان کے پاس ڈیجیٹل ڈیوائس ہوں گی۔" اس نے جواب دیا۔ اس کے واکی ٹاکی نے بپ دی۔ کرنل نے واکی ٹاکی نکالا اور بٹن دباتے ہوئے بولا۔ "یس....؟ لے آؤ.... نمبر فور میں۔" اس نے واکی ٹاکی رکھا اور میری طرف دیکھا۔ "کنور پیلس والا آدمی آگیا ہے، آؤ میرے ساتھ۔"

ہم ایک چھوٹے کمرے میں آئے یہاں ایک میز کے گرد کچھ کرسیاں تھیں۔ کرنل میز کے پیچھے بیٹھ گیا۔ میں سوچ رہا تھا کہ ان لوگوں نے کسی معمولی درجے کے ملازم کو توڑ لیا ہوگا وہ پیلس کے اندر کا احوال تو بیان کرسکتا تھا لیکن اس کے رازوں سے واقف نہیں ہوسکتا تھا۔ اس معاملے میں کنور خاندان بہت محتاط تھا۔ انہوں نے آنے جانے کا خفیہ راستہ بس چند افراد تک محدود رکھا تھا۔ کچھ دیر بعد دروازہ پر دستک ہوئی اور ایک شخص کے پیچھے جو شخص نمودار ہوا اسے دیکھ کر میں حیران ہوا اور وہ مجھے دیکھ کر دنگ رہ گیا تھا۔ پھر میں نے سنبھل کر کہا۔

"منشی دل جی...."

"شہباز جی آپ....؟" اس نے مخصوص لہجے میں کہا۔

کرنل نے مجھے دیکھا۔ "تم اسے جانتے ہو؟"

"بہت اچھی طرح.... تم لوگوں نے بالکل ٹھیک آدمی تلاش کیا ہے۔ یہ گھر کے بھیدی سے بھی بڑھ کر کچھ ہے۔"

منشی اندر آیا اور مجھ سے ذرا دور والی کرسی پر بیٹھ گیا۔ اس نے کرنل کی طرف دیکھا۔ "مجھے بتایا نہیں تھا کہ شہباز جی بھی اس معاملے میں شامل ہیں۔"

"یہ اصل میں شہباز کا معاملہ ہے۔" کرنل نے جلدی سے کہا۔ "ہمیں وہاں سے ایک عورت کو نکالنا ہے۔"

"عورت۔" منشی دل جی چونکا۔

"کیا آپ یہ بات نہیں جانتے ہیں؟"

"نہیں مجھے اس کا علم نہیں تھا۔" منشی دل جی سنبھل کر بولا۔ "میں تو کنوروں سے انتقام لینا چاہتا ہوں۔"

"حالانکہ تم خود بھی کنور ہو۔"

کرنل چونکا۔ "تم کنور خاندان سے ہو۔"

"اس کا مطلب ہے تم منشی دل جی کے بارے میں پوری طرح سے نہیں جانتے۔ یہ اس جاگیر کے وارثوں میں سے ہیں۔"

"شاہ جی یہ بات جانتے ہیں۔" منشی دل جی نے سپاٹ لہجے میں کہا۔

"یعنی کرنل جیمز کا جاننا اتنا ضروری نہیں ہے۔" میں نے ہنس کر کہا۔ اس پر منشی دل جی نے ناگواری سے مجھے دیکھا۔

"شہباز جی آپ غیر ضروری بات کر رہے ہیں۔"

"منشی جی آپ اس کارِ خیر میں شامل ہوئے ہیں تو آپ کا کچھ مقصد تو ہوگا؟"

"میں کنوروں کو تباہ کرنا چاہتا ہوں۔" اس نے جذباتی لہجے میں کہا۔ مگر میں نے محسوس کیا کہ اس کا لہجہ جعلی تھا۔ وہ بہت ٹھنڈے انداز میں بات کرنے والا شخص تھا جس پر گربہ مسکین کا لفظ بالکل فٹ آتا تھا۔ میں نے کبھی اسے اس انداز میں بات کرتے نہیں دیکھا تھا۔

"صرف تباہ کرنا چاہتے ہیں؟" میرا لہجہ زیادہ معنی خیز ہوگیا۔

"اگر آپ کا اشارہ جاگیر کی طرف ہے تو وہ بعد میں مجھے ہی ملے گی۔"

"لیکن یہ بڑے اور راج کنور کی زندگی میں ممکن نہیں

ہے پھران کی بہنیں بھی زندہ ہیں۔“

”جلد دونوں کنور باقی نہیں رہیں گے۔“ منشی دل جی نے اپنی کٹاری مونچھوں کو تاؤ دیا۔ ”دونوں بہنوں کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ وہ پہلے ہی جاگیر سے دست بردار ہو چکی ہیں۔“

میں نے سر ہلایا۔ ”گویا آپ نے پہلے سے سوچ لیا ہے۔“

”شہباز جی وہ عورت کون ہے جسے آپ وہاں سے نکالنا چاہتے ہیں۔“

”آپ اسے اچھی طرح جانتے ہیں۔“ میں نے معنی خیز انداز میں کہا تو وہ چونکا۔

”آپ بانو کی بات کررہے ہیں۔“

میں نے جواب دینے کے بجائے کہا۔ ”منشی جی میں نے ڈیوڈ شا سے ایک بات طے کرلی ہے بڑے کنور اور اس کے خاندان کے لوگوں پر میرا اختیار ہو گیا۔“

وہ پھر چونکا۔ ”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ ان کی زندگی اور موت کے بارے میں فیصلے کا اختیار صرف مجھے ہوگا۔“

اس نے نفی سر ہلایا۔ ”ایسا نہیں ہوسکتا۔ میں اسی شرط پر تم لوگوں کے ساتھ ہوں کہ یہ دونوں بھائی زندہ نہ رہیں ورنہ مجھے تم لوگوں سے کیا؟“

میں نے کرنل کی طرف دیکھا۔ ”یہ تو مسئلہ ہو گیا ہے اب اس کا کوئی حل نکالنا ہوگا۔“

اس نے شانے اچکائے۔ ”اس کا حل تو ڈیوڈ شا ہی نکال سکتا ہے۔“

”اس سے بات کرو کیونکہ یہ طے ہوئے بغیر معاملہ آگے نہیں بڑھے گا۔“

کرنل نے واکی ٹاکی پر ڈیوڈ شا سے رابطہ کیا۔ ”سر میں ہوں، دل جی اور مسٹر شہباز میں کچھ کونفلیکٹ ہو گیا ہے۔ آپ سے بات کرنی ہے..... یس سر۔“ اس نے واکی ٹاکی بند کیا۔ ”مسٹر شا خود آرہا ہے۔“

دس منٹ بعد ڈیوڈ شا اندر آیا تو کرنل جیمو نے اس کے لیے اپنی نشست چھوڑ دی۔ ڈیوڈ شا کسی سے ہاتھ نہیں ملاتا تھا اس لیے اس نے دل جی کے ساتھ بھی ہاتھ نہیں ملایا اور بلا تمہید بولا۔ ”مسئلہ کیا ہے؟“

میں نے منشی دل جی کو بولنے کا موقع دیا اور وہ پھٹ پڑا تھا۔ وہ بولتا رہا اور میں بے نیازی سے پیپر ویٹ سے کھیلتا رہا۔ ڈیوڈ شا سپاٹ چہرے کے ساتھ سن رہا تھا۔ جب منشی دل جی بات کرچکا تو اس نے کہا۔ ”اس میں مسئلہ کیا ہے؟“

”شہباز جی کا کہنا ہے کہ بڑے کنور اور دوسرے لوگوں کا انجام اس کی مرضی سے ہوگا یعنی یہ چاہے تو انہیں زندہ بھی چھوڑ سکتا ہے۔“

”اس میں بھی کوئی مسئلہ نہیں۔“

”مسئلہ کیسے نہیں ہے؟ وہ زندہ رہیں گے تو جاگیر میرے ہاتھ کیسے آئے گی؟“

ڈیوڈ شا نے میری طرف دیکھا۔ ”شہباز ملک..... کیا تم بڑے کنور اور راج کنور کو اپنے قبضے میں کرنا چاہتے ہو؟“

میں نے انکار کیا۔ ”میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔“

”یعنی وہ بعد میں مرجاتے ہیں تو تمہیں کوئی فرق نہیں پڑے گا؟“

میں نے اس کے الفاظ پر غور کیا۔ ”ظاہر ہے بعد میں ان کے ساتھ کچھ ہوتا ہے تو میں اعتراض کرنے والا کون ہوتا ہوں۔“

اب ڈیوڈ شا نے منشی جی کی طرف دیکھا۔ ”میرا خیال ہے تم مطمئن ہو گئے ہوگے۔ وہ اگر اس حملے میں بچ گئے تو بعد میں مارے جائیں گے میں اپنا وعدہ پورا کروں گا۔“

منشی دل جی کے انداز سے لگ رہا تھا کہ وہ مطمئن نہیں تھا وہ کچھ کہنے والا تھا کہ کرنل جیمو نے کہا۔ ”اب تمہیں مان جانا چاہیے۔ مسٹر ڈیوڈ شا زبان کے پابند ہیں۔“

میں دل ہی دل میں مسکرایا میں جانتا تھا کہ وہ زبان کا کتنا پابند تھا اور مجھے ایک بار پھر شبہ ہونے لگا کہ منشی دل جی اور ڈیوڈ شا کے گٹھ جوڑ کے پیچھے کوئی اور کہانی بھی تھی ورنہ ان لوگوں کو کنور پیلس پر حملے کے لیے کسی اندر کے آدمی کی اتنی بھی ضرورت نہیں تھی۔ بہر حال جو بھی تھا جلد سامنے آجاتا۔ میں نے کرنل کی طرف دیکھا۔ ”اب ہمیں وقت ضائع کیے بغیر پلان پر کام شروع کردینا چاہیے۔“

”میں تیار ہوں۔“ اس نے کہا تو ڈیوڈ شا کھڑا ہو گیا۔ اس نے کہا۔

”میرا خیال ہے اب میری ضرورت نہیں ہے۔“

”یس سر اب ہم سب دیکھ لیں گے۔“ کرنل نے کہا۔

ڈیوڈ شا چلا گیا اور کرنل واپس اپنی نشست پر آگیا۔ میں نے پوچھا۔ ”افرادی قوت کیا ہے؟“

”میرے ساتھ ایک درجن تربیت یافتہ کمانڈوز ہیں۔ وہ ہر ہتھیار اور آلے کے استعمال کے ماہر ہیں۔ چھ افراد فتح خان کے ساتھ ہیں۔“

”یہ ہوئے بیس افراد اس میں تم اور فتح خان بھی شامل ہو۔ میں اور میرا ساتھی ہوئے۔ یہ ہوئے بائیس افراد ..... کیا اتنے لوگ کافی ہوں گے؟“

کرنل نے نفی میں سر ہلایا۔ ”دو درجن مقامی افراد بھی ہوں گے۔“

”ایکس آرمی مین؟“ میں نے پوچھا۔

کرنل ہچکچایا پھر نفی میں سر ہلایا۔ ”نہیں وہ عام جرائم پیشہ ہیں مسٹر دل جی فراہم کرے گا۔“

میں نے انکار کیا۔ ”مقامی اور جرائم پیشہ لوگوں پر کسی صورت اعتبار نہیں کیا جاسکتا ہے۔ کیا تمہیں معلوم ہے کنور پیلس کے گارڈز کی تعداد ڈیڑھ سو ہے جن میں پچاس انتہائی تربیت یافتہ اور خطرناک گورکھے بھی ہیں۔ ان سے نمٹنا آسان نہیں ہوگا۔“

”مزید تربیت یافتہ افراد کا بندوبست کیا جاسکتا ہے لیکن اس میں وقت لگے گا۔“

”کتنا وقت لگے گا اور ناکام حملے کی نسبت ذرا دیر سے سہی لیکن ایسا حملہ کیا جائے جس کی کامیابی کا زیادہ امکان ہو۔“

”ایسا کرو پاکستان سے منگوالو۔“ کہتے ہوئے منشی دل جی کے لہجے میں زہر آگیا تھا۔

”اگر ممکن ہوتا تو میں ایسا ہی کرتا اور تم لوگوں کو دکھا بھی دیتا لیکن میں اس جہنم میں مزید اپنے کسی ساتھی کو دیکھنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔“ میں نے جواب دیا تو منشی دل جی کا چہرہ بگڑ گیا تھا۔

”پلیز۔“ کرنل نے ہاتھ اوپر کیا۔ ”موضوع سے نہ بھٹکیں۔“

”کرنل تم کتنے دن میں مزید اتنے ہی آدمیوں کا بندوبست کرسکتے ہو؟“

”تین دن لگ سکتے ہیں۔“ اس نے کہا۔ ”میرے کچھ آدمی سنگاپور میں ہیں وہ یہاں آسکتے ہیں۔“

”کتنے ہیں؟“

”سات افراد ہیں اور سب تربیت یافتہ ہیں۔ اسی طرح چھ افراد یوکرائن میں ہیں وہ بھی دو دن میں آسکتے ہیں۔“

”بس تو ان کو بلالو۔“ میں نے کہا۔ ”پینتیس افراد ٹھیک ہیں ہم کسی مقامی فرد کو اندر کی کارروائی کے لیے استعمال نہیں کریں۔ ان سے صرف باہر کام لیا جائے گا۔“

”وہ اندر بھی ہوں گے۔“ منشی دل جی نے کہا۔

”کوئی مقامی آدمی اندر نہیں جائے گا۔ وہ صرف کور دیں گے۔“ میں نے ایک ایک لفظ پر زور دے کر کہا۔

کرنل نے سر ہلایا۔ ”اوکے..... باہر کا کوئی آدمی اندر کارروائی میں حصہ نہیں لے گا۔“

منشی دل جی نے تیز لہجے میں کہا۔ ”کرنل تم یہ فیصلہ نہیں کرسکتے۔“

”میں کرسکتا ہوں میں اس مشن کا انچارج ہوں۔“ وہ غرایا۔

منشی دل جی خاموش ہو گیا لیکن اس کے چہرے سے کینہ ٹپک رہا تھا۔ کرنل نے میری طرف دیکھا۔ ”مسٹر شہباز..... اس جگہ دو طریقے سے اٹیک ممکن ہے۔ ایک فضا سے اور دوسرا زمین سے۔“

”ہمیں دونوں طریقوں سے کام لینا ہوگا۔“

”اس کے لیے ہمیں ہیلی کاپٹر درکار ہوگا۔“

”صرف ہیلی کاپٹر ہی نہیں کم سے کم دو سے تین آرمرڈ وہیکل بھی ہوں۔ جو پارٹی دروازے سے گھسے گی اسے صرف آرمرڈ کار ہی بچاسکتی ہے۔“ میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

کرنل نے غور سے مجھے دیکھا۔ ”مسٹر شہباز تمہارے ذہن میں کوئی پلان ہے؟“

”نہیں یہ تمہارا کام ہے۔“ میں نے انکار کیا حالانکہ میرے ذہن میں ایک منصوبہ واضح ہورہا تھا مگر میں منشی دل جی کے سامنے اس پر بات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ کنور خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور میں اس پر کسی صورت اعتبار نہیں کرسکتا تھا۔ ویسے بھی جو منصوبہ تھا وہ بہت خام سا تھا۔ میں اس پر وسیم سے بات کرنا چاہتا تھا۔ اگر کرنل اکیلے میں ملتا تو اس سے بھی بات کرلیتا۔ میں کھڑا ہو گیا۔ ”تم اپنے آدمیوں کو بلوالو۔ ہتھیار تو تمہارے پاس ہوں گے۔ اس مقصد کے لیے ہیلی کاپٹر اور بکتر بند کا بھی بندوبست کرنا تمہارے لیے یا ڈیوڈ شا کے لیے مشکل نہیں ہوگا۔“

”سب ہے۔ ہاں ان چیزوں کا بندوبست کرنا پڑے گا لیکن ہو جائے گا۔“

”جب ہو جائے تب مجھے بتانا۔“ میں اس کے دفتر

اور پھر اس عمارت سے نکل آیا۔ روشوں سے ہوتا ہوا میں واپس اسی عمارت میں آ گیا۔ راستے میں کسی نے مجھے روکنے یا نگرانی کے لیے میرے ساتھ ہونے کی کوشش نہیں کی۔ اس کا مطلب تھا کہ ڈیوڈ شا کی طرف سے مجھے اتنی چھوٹ دی گئی تھی۔ البتہ اتنا مجھے یقین تھا کہ کسی اور ذریعے سے میری نگرانی کا عمل جاری ہوگا۔ مجھے بالکل ہی چھوٹ نہیں دی جا سکتی تھی۔ سات بجے سورج ڈوبنے والا تھا اور شام کی خنکی آسمان سے اتر رہی تھی۔ بیتو میرا منتظر تھا اس نے شکوہ کیا۔

"شوبی آپ کہاں چلا جاتا ہے؟"

"کرنل مجھے اپنے ساتھ لے گیا تھا۔" میں صوفے پر بیٹھ گیا۔ "تم کیا کر رہے تھے۔"

"ہم ٹی وی دیکھ رہا تھا اور بور ہو رہا تھا۔"

"کچھ دیر بعد ڈنر ہے اور تمہاری ساری بوریت دور ہو جائے گی۔"

ساڑھے سات بجے دروازے پر دستک ہوئی میرا خیال تھا یوجا ہو گی لیکن وہ کرنل تھا۔ وہ اندر نہیں آیا دروازے سے بولا۔ "شہباز میں تم سے بات کرنے آیا ہوں۔"

"اندر ہی آ جاؤ۔" میں نے کہا تو وہ اندر آ گیا۔ "بیٹھو۔"

کرنل نے اپنا بیگ میز پر رکھا اور بیتو کو دیکھا پھر مجھ سے کہا۔ "تمہارا ساتھی مقامی ہے؟"

"ہاں اس کا تعلق اسی علاقے سے ہے لیکن یہ میرا ساتھی ہے تم اسے میرا جیسا سمجھ سکتے ہو۔"

اس نے سر ہلایا۔ "اب ہم بات کریں گے.... مجھے یقین ہے تم دل جی کے سامنے بات نہیں کرنا چاہتے تھے۔"

"یہ درست ہے، وہ ناقابل اعتماد شخص ہے۔ کم سے کم میں اس شخص پر اعتماد نہیں کر سکتا اور تمہیں بھی یہی مشورہ ہے۔ اس سے یوں ہوشیار رہو جیسے آدمی کوبرا سانپ سے ہوشیار ہوتا ہے۔"

"تم فکر مت کرو وہ ہمیں دھوکا نہیں دے سکتا ہے۔" کرنل نے اعتماد سے کہا۔

میں نے گہری سانس لی۔ "ٹھیک ہے.... اب ہم بات کرتے ہیں۔"

"تمہارے ذہن میں کیا ہے؟"

"دیکھو میں اس چیز کا ماہر نہیں ہوں لیکن میں نے کچھ عرصے میدان جنگ میں گزارا ہے۔"

"تمہیں بتانے کی ضرورت نہیں ہے، مسٹر شا کے پاس تمہاری فائل ہے جس میں تمہارے بارے میں بہت کچھ لکھا ہے۔"

"ہمیں بیک وقت فضا اور زمین دونوں سے کارروائی کرنا ہوگی۔" میں نے کہا۔ "اپنا نقشہ نکالو۔"

کرنل نے پلاسٹک نقشہ نکال کر میز پر بچھا دیا۔ میں نے اصل پیلس کی عمارت کے آس پاس کی تمام عمارتوں کو نشان زدہ کیا۔ "ہمیں باہر سے انہیں نشانہ بنانا ہوگا۔"

"وہ کیسے؟"

"راکٹ یا چھوٹے گائیڈڈ میزائلوں کی مدد سے۔"

کرنل نے سر ہلایا اس کا مطلب تھا کہ وہ گائیڈڈ میزائل فراہم کر سکتا تھا۔ "ٹھیک ہے آگے کہو....."

"اس کے ساتھ مختلف جگہوں پر دھوئیں کے گولے پھینکے جائیں گے۔"

"میں سمجھ گیا آگے چلو....."

اس کے بعد چار سے پانچ اسنائپر دور مار رائفلوں سے باہر آنے والے گارڈز کو نشانہ بنانا شروع کریں۔ مارنے کے بجائے کوشش کریں کہ زیادہ سے زیادہ گارڈز ناکارہ ہو جائیں۔"

"عمارتوں کو براہ راست نشانہ بنانا ہوگا۔"

"نہیں کیونکہ ہم نہیں کہہ سکتے کہ مطلوبہ عورت کسی اور عمارت میں نہ ہو اسے نقصان نہیں ہونا چاہیے۔" میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ "اس لیے براہ راست کسی عمارت کو نشانہ نہ بنایا جائے، کوشش کی جائے ان کے داخلی حصوں کو نشانہ بنایا جائے۔"

"ٹھیک ہے اندر والوں کو اندر محصور کر دیا جائے اور باہر والوں کو نشانہ بنایا جائے؟"

"بالکل ایسا ہی ہو۔" میں نے سر ہلایا۔ "تین باتیں طے ہیں۔ اول عمارتوں کو نشانہ بنانا، دوسرے دھواں پھیلانا اور تیسرے باہر موجود گارڈز کو نشانہ بنانا۔"

"یہ تینوں باتیں میرے ذہن میں بھی تھیں۔ اب ہم آتے ہیں بجلی کا پٹر اور آرمرڈ وہیکلز کے استعمال پر۔"

"نہیں ایک حصہ باقی ہے۔ پانچ اسنائپر اپنا کام مستقل جاری رکھیں گے۔ وہ جتنے زیادہ گارڈز گرائیں گے اندر جانے والوں کو اتنی کم مزاحمت کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اس لیے اندر جانے والوں کا حلیہ ایسا ہونا چاہیے کہ اسنائپر کسی صورت دھوکا نہ کھائیں۔"

"گڈ یہ اچھا آئیڈیا ہے۔" کرنل نے سر ہلایا۔ "لیکن اس سے پہلے ہمیں ایک کام اور کرنا ہوگا۔ پیلس کا باقی دنیا سے رابطہ کاٹنا ہوگا۔ پیلس میں لائن فون کے علاوہ موبائل فون اور وائرلیس انٹرنیٹ اور سیٹلائیٹ فونز کی موجودگی عین ممکن ہے۔ اس لیے سب سے پہلے ہم لائنیں کاٹیں گے۔ اس کے بعد موبائل ٹاور اڑا دیں گے۔ آخر میں ایک جامر کی مدد سے ہر قسم کی ریڈیائی لہروں کو ناکارہ کر دیں گے۔"

"یہ بات میرے ذہن میں نہیں آئی۔ لیکن کیا تمہارے پاس مطلوبہ صلاحیت موجود ہے؟"

"بالکل.... جو بجلی کا پٹر وہاں جائے گا اس میں ریڈیو جامنگ کی صلاحیت بھی ہے۔"

"گڈ وہ پولیس یا انتظامیہ سے مدد نہیں لے سکیں گے۔"

"اس کے بعد ہم پیلس میں داخل ہوں گے۔ پہلے آرمرڈ کاریں اندر جائیں گی۔ ان میں آدمی بھی ہوں گے۔ ان کے اوپر بھاری مشین گنیں لگی ہوں گی جو راستہ صاف کرنے میں معاون ہوں گی۔"

مجھے خیال آیا۔ "تمہارے پاس جو خودکار اسنائپر گنیں ہیں کیا وہ آرمرڈ کاروں پر نہیں لگ سکتیں؟"

کرنل سوچ میں پڑ گیا پھر اس نے سر ہلایا۔ "میں معلوم کرتا ہوں شاید ہو سکتا ہے۔ اس طرح کسی کی جان خطرے میں نہیں پڑے گی۔"

"دوسرے جس میں اسنائپر رائفل ہے کیا اس میں مشین گن لگ سکتی ہے۔ تیسری بات کیا اسے دور سے ریموٹ کنٹرول کیا جا سکتا ہے۔"

"میں معلوم کرتا ہوں۔"

"ان کے اندر گھسنے کی صورت میں یہ مرکزی عمارت کے آس پاس کا علاقہ کلیئر کریں گے تاکہ بجلی کا پٹر سے اس پر دوسرا دستہ اتر سکے۔"

کرنل سوچ میں پڑ گیا تھا۔ اس نے سر ہلایا۔ "بہ ظاہر یہ بہت اچھا منصوبہ لگ رہا ہے۔ مگر اس کو ریفائن کی ضرورت ہے۔"

"بالکل ہے۔" میں نے کہا۔ "میں نے کنور پیلس کے آس پاس کے پہاڑ اچھی طرح دیکھے ہیں۔ اس کے بائیں طرف اور سامنے پہاڑ پر کئی ایسی جگہیں ہیں جہاں

نظام الدین اولیاء

636ھ_725ھ

سلطان المشائخ اولیائے کرام میں سے ہیں۔ "محبوب الٰہی" کے لقب سے یاد کیے جاتے ہیں۔ آپ کا ایک اور لقب "شمس الملک" ہے جو غیاث الدین بلبن نے دیا تھا۔ اسم مبارک محمد ہے اور سلسلہ نسب حضرت علیؓ تک پہنچتا ہے۔ آپ کا خاندان بخارا سے ہجرت کرکے لاہور آیا، پھر آپ کے دادا خواجہ علی اور نانا خواجہ عرب اپنے اہل دعیال سمیت بدایوں تشریف لے گئے۔ وہیں آپ کی پیدائش مبارک 27 صفر 636 ہجری کو ہوئی۔ پانچ برس کے ہوئے تو شفقت پدری سے محروم ہو گئے۔ چنانچہ پرورش والدہ ماجدہ کے ہاتھوں میں ہوئی۔ اسی دوران مولانا علاؤ الدین اصولی سے قدوری پڑھی۔ اس کے بعد قرآن پاک ختم کیا اور کتب متداولہ پڑھنا شروع کیں پھر علم نعت میں مشق حاصل کی۔ مزید تحصیل علم کے شوق میں سولہ برس کی عمر میں والدہ ماجدہ کے ہمراہ دہلی پہنچے۔ یہاں مولانا شمس الدین کی شاگردی میں چلے گئے۔ یہاں ان سے حریری کے چالیس مقامات پڑھے۔ دہلی ہی کے ایک اور متقی بزرگ مولانا کمال الدین سے حدیث پڑھی۔ کہا جاتا ہے کہ آپ نے حدیث مولانا کمال کے علاوہ مولانا احمد تبریزی سے بھی سیکھی، جنہوں نے سند بھی دی تھی۔ تحصیل حدیث کے بعد مختلف مشاہیر سے فقہ اصل، تفسیر، ہندسہ اور ہیت وغیرہ پڑھی۔ پھر بابا فرید گنج شکرؒ سے ملنے پاک پتن شریف پہنچے۔ اس وقت آپ کی عمر بیس برس کی تھی۔ بابا فریدؒ نے آپ کو پہلے ہی دن خلیفہ مقرر کر دیا۔ آپ ان کے پاس 15 رجب 655ھ کو پہنچے اور 3 ربیع الاول 656ھ تک رہے۔ آپ کی بزرگی و خدا ترسی نے پورے ملک میں ہمہ گیر اخلاقی و اصلاحی انقلاب بپا کر دیا تھا۔ لوگ جوق در جوق آپ کے ہاتھ پر بیعت کرتے، ان کی تعداد روزانہ سیکڑوں میں ہوتی۔ سلطان وقت نے جو آپ کا مرید تھا سود، ذخیرہ اندوزی ختم کرواتے ہوئے احکام شرعی نافذ کیے۔ اس کے بعد قطب الدین نے آپ سے یکطرفہ عداوت رکھی۔ آپ کے بہت سے شاگردوں میں امیر خسرو، رفیع الدین ہارون، سید حسین کرمانی، سید محمد امام اور امیر حسن سنجری کو آپ پیار رکھتے تھے۔ فوائد الفوائد، فضل فواد، راحت المحبین اور سید الاولیا آپ کی چار تصانیف ہیں۔ فوائد الفوائد آپ کے خلیفہ خواجہ حسن سنجری نے مرتب کی جس میں سماع کا بار بار ذکر آیا تھا۔

مرسلہ: صاحب خان، کوئٹہ

آسانی سے مورچہ لگایا جا سکتا ہے۔ ان جگہوں سے تقریباً پورا پیلس نظر آتا ہے اور رینج بھی ایک کلومیٹر کے اندر ہے۔"

"میزائلوں یا راکٹوں کا مسئلہ نہیں ہے لیکن نارمل اسنائپر رائفلوں کے لیے یہ فاصلہ زیادہ ہے۔ ایسی رائفلیں ایک کلومیٹر کے اندر کام کرتی ہیں۔ اس سے زیادہ دور تک کام کرنے والے گن بھاری ہوتی ہے اور اسے چلانے کا ماہر بھی الگ ہوتا ہے۔"

"اس کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ بائیں طرف اور فرنٹ سے بھی فاصلہ زیادہ سے زیادہ آٹھ سو میٹرز ہوگا۔"

"اتنی رینج ٹھیک ہے۔"

مجھے ایک خیال اور آیا۔ "پیلس میں ایک ہیلی کاپٹر بھی ہے اسے سب سے پہلے تباہ کرنا ہوگا ورنہ عین ممکن ہے بڑا کنور اس عورت کو لے کر وہاں سے نکلنے کی کوشش کرے۔ عورت کی ہیلی کاپٹر میں موجودگی کی صورت میں ہم اسے تباہ بھی نہیں کر سکیں گے۔"

کرنل نے سر ہلایا۔ "بات کلیئر ہو رہی ہے۔ واپسی کا کیا ہوگا؟"

"میں ہیلی کاپٹر سے جاؤں گا اور عورت ہمارے ساتھ واپس آئے گی۔ میرے ساتھ چھ افراد ہوں گے۔ ہیلی کاپٹر اتنا بڑا ہو کہ یہ تمام افراد اس میں آ سکیں۔"

"ہیلی کاپٹر اتنا ہی بڑا ہے۔" کرنل نے سر ہلایا۔ "باقی پارٹی جس طرح جائے گی اسی طرح واپس آجائے گی۔"

"اس میں خطرہ ہوگا راستے میں انہیں روکا جا سکتا ہے۔"

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ "دونوں آرمرڈ کاریں دو کنٹینرز میں جائیں گی اور پیلس کے قریب انہیں اتار دیا جائے گا۔ واپسی بھی اسی طرح ہوگی۔ کنٹینرز سیل ہوں گے اور بلاوجہ کوئی چیک نہیں کرے گا۔"

کرنل جیمز بچ پلان کو واضح کر رہا تھا۔ کچھ باتیں اور تھیں لیکن ابھی میں نے ان پر بات نہیں کی۔ ایک بات یہ بھی تھی کہ مارے جانے یا شدید زخمی ہونے والوں کا کیا کرنا تھا کیونکہ انہیں پیچھے چھوڑ کر آنے کا مطلب تھا کہ پولیس یا ایجنسیوں کو اپنا نشان دینا۔ کرنل میرے پاس سے روانہ ہوا تو میں مطمئن تھا اگر پلان پر ٹھیک سے عمل ہوتا تو سادی کو پیلس سے باحفاظت نکالنا اتنا مشکل ثابت نہیں ہوتا۔ ابھی کرنل نے منشی دل جی سے پیلس کے اندر کے حفاظتی انتظامات کا معلوم کرنا تھا۔ یہ اس کا کام تھا اور میں نے تھا کہ اس میں دخل اندازی کی ضرورت نہیں تھی۔ بیتو بھی اور کرنل کی گفتگو سن رہا تھا اس کے جاتے ہی اس نے سوال کیا۔ "شوبی ہم بھی جائے گا نا؟"

"اب امکان ہے کیونکہ مزید تین دن لگ سکتے ہیں۔ کرنل کے کچھ آدمی بیرون ملک سے آ رہے ہیں۔"

"شوبی اگر ہم شامل ہوا اور کامیاب رہا تو راج کنور اور بڑے کنور کو ہمارے حوالے کرنا۔"

میں نے سر ہلایا۔ "وہ تمہارے مجرم ہیں اور میرے ذہن میں بھی یہی بات ہے لیکن یہاں ایک مسئلہ ہو گیا ہے۔" میں نے اسے منشی دل جی کے بارے میں بتایا۔ "یہ شخص کنور خاندان سے ہے اور کسی طرح بڑے کنور یا راج کنور سے کم خطرناک نہیں ہے۔ جاگیر پر قبضے کے لیے وہ ان دونوں بھائیوں کا خاتمہ چاہتا ہے۔"

بیتو نے غور کیا۔ "شوبی ہم کو اس سے کیا؟ ہمیں تو اپنا کام کرنا ہے۔ سادی کو نکالنا ہے اور ان دونوں کو ٹھکانے لگانا ہے۔"

"تم اس شخص کو نہیں جانتے جب یہ ان کی جگہ لے گا تو یہ ہمارے لیے اتنا ہی خطرناک ہو جائے گا کیونکہ اسے دولت اور اختیارات مل جائیں گے۔ کنوروں کی دو بہنیں بھی ہیں اور وہ ان کے درپے ہو جائے گا ان میں سے ایک ہمارے پاس ہوگی۔"

اب بیتو کی سمجھ میں آگیا۔ اس نے میری طرف دیکھا۔ "آپ ٹھیک کہتا ہے یہ تو بہت ڈینجرس ہے۔ اس کا کچھ کرنا پڑے گا۔"

"ابھی ہم اس کے خلاف کچھ نہیں کر سکتے کیونکہ وہ ڈیوڈ شا کے ساتھ ہے اور اس مشن کی حد تک وہ ہمارا ساتھی بھی ہے۔"

بیتو مزید کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن میں نے اسے روک دیا۔ میں نے موضوع بدل دیا تھا۔ "اسے بعد میں دیکھیں گے ابھی تو میں چاہتا ہوں تمہارا معائنہ ہو جائے۔"

"کیسا معائنہ؟"

"زخم کا۔" میں نے کہا۔ پوجا کو طلب کیا اور اسے بیتو کے زخم کا معائنہ کرانے کو کہا وہ بیتو کو لے کر چلی گئی۔ میں مشن کے بارے میں سوچ بچار میں لگ گیا۔ اپنے ذہن میں منصوبے کو بار بار چیک کر رہا تھا۔ ایسا کرنا بہت ضروری تھا کیونکہ ناکامی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اگر میں سادی کو

حاصل کرنے میں ناکام رہتا تو پھر یہ کام بہت ہی مشکل ہو جاتا۔ دوسرا خطرہ یہ تھا کہ حملے میں سادی کو نقصان نہ ہو۔ اگرچہ ننانوے فیصد امکان تھا کہ وہ مرکزی عمارت میں ہوگی لیکن ایک فیصد امکان یہ بھی تھا کہ اسے کسی اور عمارت میں رکھا گیا ہو۔ اگرچہ کرنل سے طے ہو گیا تھا کہ عمارتوں کو زیادہ نقصان نہیں پہنچایا جائے گا مگر جب میزائل اور راکٹ چلتے ہیں تو اپنے پرائے کی پروا کہاں کرتے ہیں۔ میں نے بہتر سمجھا کہ وسیم سے مشورہ کرلوں۔ میں نے اسکائپ آن کیا مگر ان میں سے کوئی آن لائن نہیں تھا اس لیے پہلے عبداللہ کو کال کی اور پھر وہ آن لائن آیا۔

"وسیم کہاں ہے؟"

"کوٹھی میں ہی ہے میں اسے بلاتا ہوں۔" عبداللہ نے کہا اور چلا گیا چند منٹ بعد وہ وسیم اور سفیر دونوں کے ساتھ آیا۔ میں نے ان کے سامنے صورتِ حال اور اپنے خدشات رکھے تھے۔ وسیم نے سر ہلایا۔

"یہ خطرہ تو ہے لیکن ہم اس سلسلے میں کیا کر سکتے ہیں؟"

"ایک کام ہو سکتا ہے۔" سفیر نے کہا۔ "ہمارے پاس کنور پیلس کے نمبرز ہیں ہم سادی سے بات کر سکتے ہیں۔"

"بہ شرط کہ بڑے کنور نے اجازت دی۔" وسیم بولا۔

"اس کا باپ بھی اجازت دے گا۔" سفیر بولا۔ "وہ شہباز کے لیے مرا جا رہا ہے۔"

"ٹھیک ہے بات کر کے دیکھو لیکن بہت ہوشیاری سے کال سنی جا رہی ہوگی اور سننے والوں کو کوئی شک نہ ہو۔"

"ہم بچے نہیں ہیں یار۔" سفیر نے کہا۔ "آن لائن رہ۔"

کال سفیر نے کی۔ اس نے اپنے موبائل کی ریکارڈنگ اور اسپیکر آن کر لیے تھے۔ چند بیلز کے بعد کسی نے کال ریسیو کی اور بولا۔ "دس از کنور پیلس ہو آر یو؟"

"بڑے کنور سے بات کراؤ۔" سفیر نے کہا۔ "اسے کہو پاکستان سے فون ہے۔"

ایک منٹ سے بھی پہلے بڑا کنور لائن پر تھا۔ "شہباز.... تم شہباز ہو؟"

"نہیں میں اس کا دوست ہوں۔" سفیر نے نام بتانے سے گریز کیا۔

"شہباز کہاں ہے؟" بڑا کنور اب ذرا سرد لہجے میں

بولا ورنہ پہلے وہ مضطرب تھا۔ ”اس سے کہو مجھ سے رابطہ کرے۔“

”وہ وہیں ہے اور کہاں ہے اس سے ہم بھی لاعلم ہیں سرحد پار کرنے کے بعد سے اس سے صرف ایک بار رابطہ ہوا ہے اور پھر وہ غائب ہے۔ ہمیں شک ہے وہ تمہارے ہاتھ لگ گیا ہے۔“

”نہیں وہ میرے پاس نہیں ہے۔“

”لیکن سعدیہ تو تمہارے پاس ہے۔“

”ہاں وہ میرے پاس ہے اگر شہباز ہوتا تب بھی مجھے بتانے میں کوئی تامل نہ ہوتا۔ لیکن وہ نہیں ہے۔“

”تم نے کہا تھا کہ جب سعدیہ تمہارے پاس آئے گی تو تم ہم سے بات کراؤ گے لیکن تم نے اب تک وعدہ پورا نہیں کیا ہے۔“

”تم میں سے کسی نے رابطہ نہیں کیا۔“ بڑے کنور نے ہوشیاری دکھائی تو سفیر نے تلخ لہجے میں کہا۔

”جھوٹ مت بولو، کیا سعدیہ کے پاس ہمارے نمبرز نہیں ہیں اور کیا اس نے تم سے نہیں کہا ہوگا لیکن تم نے بات نہیں کرائی۔“

بڑا کنور کچھ دیر کے لیے چپ ہوا تھا پھر اس نے کہا۔ ”میں نے اپنی خوشی سے یہ سب نہیں کیا ہے۔“

”میں سعدیہ سے بات کرنا چاہتا ہوں مجھے اس کی فکر ہے۔“

”کیا اس کا شوہر پاس ہے؟“

سفیر نے وسیم کو اشارہ کیا تو اس نے نفی میں سر ہلایا۔ سفیر نے کہا۔ ”نہیں وہ پاس نہیں ہے میں اس کا بھائی ہوں اس لحاظ سے سعدیہ میری بھابی ہوئی۔“

”ٹھیک ہے میں تمہاری بات کراتا ہوں۔“ بڑے کنور نے خلاف توقع زیادہ حجت نہیں کی تھی اور وہ مان گیا تھا چند منٹ بعد سادی لائن پر تھی۔

”ہیلو۔“ اس نے کمزور سی آواز میں کہا تو وسیم کے چہرے پر زلزلے جیسے تاثرات نمودار ہوئے تھے اور وہ یک دم اٹھ کر کمرے سے نکل گیا۔ عبداللہ اس کے پیچھے گیا تھا۔ سفیر بھی تڑپ گیا تھا۔

”سادی میں ہوں۔“

”سفیر بھائی۔“ وہ رونے لگی۔ ”آپ لوگ کہاں ہیں۔ میں آپ سے بہت دور ہوں، وسیم کہاں ہے؟“

”وہ گھر میں نہیں ہے۔“ سفیر نے اپنا جھوٹ نبھایا۔ ”تم ٹھیک ہونا..... سب تمہیں بہت یاد کرتے ہیں... جلد تمہیں واپس لے آئیں گے۔“

”میں ٹھیک ہوں مجھے یہاں کوئی تکلیف نہیں ہے۔“ وہ بولی مگر اس کی سسکیاں جاری تھیں اور وہ سفیر کے دل پر گرم قطروں کی طرح لگ رہی تھیں۔

”رو مت گڑیا..... تم ہماری بہن ہو..... ہمارا مان ہو..... آنسو تمہیں زیب نہیں دیتے ہیں۔“

”سفیر بھائی یہاں آنے کے بعد یہ میرے پہلے آنسو ہیں جو آپ کی آواز سن کر نکل آئے ورنہ مجھے خود بھی کسی کے سامنے رونا اچھا نہیں لگتا ہے۔ شوبی کہاں ہیں؟“

”وہ وہیں ہے تمہارے غائب ہونے کا سن کر وہ واپس چلا گیا تھا۔“

سادی پریشان ہو گئی۔ ”کیا شوبی جا کر واپس آ گئے ہیں ...کیوں آئے ہیں؟ یہاں ان کے لیے بہت خطرہ ہے.... ان سے کہیں وہ فوراً واپس جائیں۔“

”وہ تمہیں لیے بغیر واپس نہیں آئے گا۔ ہم میں سے کسی کو چین نہیں آئے گا۔“

”نہیں مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں میرے لیے کوئی خود کو خطرے میں نہ ڈالے۔“

”احمقانہ باتیں مت کرو۔“ سفیر نے اسے ڈانٹا۔ ”تم ہماری عزت بھی ہو اور ہم تمہیں کہیں نہیں چھوڑ سکتے چاہے وہ تمہارے بھائی کا گھر ہی کیوں نہ ہو۔“

”سفی بھائی سمجھنے کی کوشش کریں یہاں کوئی نہیں گھس سکتا ہے۔ میں نہیں چاہتی کہ میرے لیے کسی کی جان خطرے میں پڑے۔“

”تم فکر مت کرو۔“ سفیر نے موضوع بدل دیا۔ ”یہ بتاؤ کہ تم ٹھیک ہونا.... تمہارے ساتھ کوئی غلط سلوک تو نہیں ہوا ہے۔ تمہیں کسی جگہ قید تو نہیں کیا گیا ہے؟“

”میں ٹھیک ہوں یہاں میرا بہت خیال رکھا جا رہا ہے صرف میرے لیے ایک لیڈی ڈاکٹر بلوائی گئی ہے وہ میرا خیال رکھتی ہے۔ میں قید نہیں ہوں میں اسی کمرے میں ہوں جو کبھی میرا ہوتا تھا۔“

میں نے دل ہی دل میں سفیر کو خراج تحسین پیش کیا۔ وہ بالکل درست انداز میں بات کر رہا تھا۔ اس نے بنا کسی شک کے سادی سے اگلوا لیا تھا کہ وہ مرکزی پیلس میں تھی اور اب ہمارا کام آسان ہو گیا تھا۔ سفیر نے کچھ دیر اس سے اور بات کی۔ سادی نے کہا کہ اس کے کمرے میں بھی فون

ہے اور وہ وسیم سے بات کرنا چاہتی تھی۔ سفیر نے وعدہ کیا کہ وہ جلد اس سے بات کرائے گا۔ اس نے کال ختم کی تو وہ اداس تھا۔ اس دوران میں وسیم اور عبداللہ آ گئے تھے۔ وسیم نے سفیر کی بات سن کر کہا۔ ”میں اس سے بات نہیں کروں گا ورنہ بڑے کنور کو دباؤ ڈالنے کا ایک موقع مل جائے گا۔“

”یار اس نے دباؤ شوبی پر ڈالنا ہے۔ اس کا خون چاہیے اور تیرے خون میں ویسے ہی فساد ہے۔“

مگر وسیم سنجیدہ رہا تھا۔ ”تم ان معاملات کو نہیں سمجھو گے۔ یہ ٹیکٹکز ہیں۔ سادی صبر کر رہی ہے۔ مجھ سے بات کر کے اس کا حوصلہ جواب دے گیا تو ہم سب کے لیے بہت مشکل ہو جائے گا۔ مجھے یقین ہے اسے کوئی خطرہ ہوا تو شہباز صاحب خود بڑے کنور کے سامنے چلے جائیں گے۔“

”میرا خیال ہے وسیم ٹھیک کہہ رہا ہے۔ سادی کی بہادری ہم سے جڑی ہے، اگر وہ کمزور ہوئی تو ہم کمزور ہو جائیں گے۔ اس نے خود کہا کہ وہ اب تک روئی نہیں تھی سفیر کی آواز سن کر روئی ہے۔“ میں نے وسیم کی تائید کی۔ ”ابھی اسے چھیڑنے سے گریز کرنا چاہیے۔“

”اور جو میں نے وعدہ کیا ہے۔“ سفیر نے یاد دلایا۔ ”وہ واپس آ کر مجھے معاف کرے گی۔“

”کوئی بات نہیں تو پہلے ہی خواتین سے سننے کا عادی ہے۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”تو نے وقت کی قید نہیں لگائی تھی اور نہ ہی قسم کھائی ہے جس کا کفارہ ادا کرنا پڑے۔“

میں بات کر رہا تھا کہ بیتو آ گیا اور وہ بہت خوش تھا۔ اس نے آتے ہی بتایا۔ ”شوبی ہمارا زخم اندر سے بھی بھر گیا ہے بس تھوڑا کسر رہ گیا ہے۔ ڈاکٹر کہہ رہا تھا دو دن میں وہ بھی پورا ہو جائے گا۔“

”لیکن جو خلا تمہارے دماغ میں ہے وہ کبھی پر نہیں ہو گا۔“ سفیر نے پنگا لیا مگر بیتو ہنستا رہا۔

”آج آپ بول لو.... ہم برا نہیں مانے گا۔ ہو سکتا ہے پھر آپ کو موقع نہ ملے۔“

”بیٹا اتنی جلدی تمہاری جان چھوڑنے کا ارادہ نہیں ہے۔“ سفیر نے کہا۔ بیتو کو پتا چلا کہ سادی سے بات ہوئی ہے تو وہ بیتاب ہو گیا۔

”ہم کو کیوں نہیں بتایا ہم بھی بات کرتا۔“

”لو بات کر دی نا احمقانہ۔“ سفیر نے کہا۔ ”بھائی میں نے پاکستان سے بات کی ہے، تم کہاں سے بات کرتے اور کرتے تو کچھ دیر بعد کنوروں کے کرگے یا پولیس والے آ کر تمہیں لے جاتے۔“

”پہلے ہم زخمی تھا پر اب ہم ٹھیک ہے۔“ بیتو نے سینہ تان کر کہا۔ ”کوئی مائی کا لال ہم کو ہاتھ نہیں لگا سکتا۔“

وسیم خاموش بیٹھا تھا۔ اس کے چہرے پر تفکر تھا۔ میں نے اسے تسلی دی۔ ”پریشان کیوں ہوتا ہے یار، اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک ہوگا سادی تیرے پاس ہوگی۔“

وہ سنبھل گیا۔ ”میں پریشان نہیں ہوں۔“

”مجھے جو خطرہ تھا وہ اب نہیں ہے اور میں خود اس دستے کی کمانڈ کروں گا جو مرکزی عمارت میں گھسے گا۔ پلان تقریباً مکمل ہے بس نوک پلک درست کرنا باقی رہ گیا ہے۔“

”اب مجھے اطمینان ہے۔“ وسیم نے کہا۔ ”یہ اچھی بات ہے کہ اس کی لوکیشن کا علم ہو گیا ہے۔ اب ہم تحمل کر کارروائی کر سکتے ہیں۔“

”نہیں ہم اس معاملے میں پوائنٹ ون پرسنٹ کا رسک بھی نہیں لے سکتے، کیونکہ ابھی حملے میں بہت دن ہیں اور کچھ پتا نہیں ہے بڑا کنور سادی کو کب کہاں منتقل کر دے۔ ہمیں بہت زیادہ تباہی پھیلانے سے بچنا ہوگا۔“ میں نے کہا۔

”جیسا آپ مناسب سمجھیں۔“

”دو تین دن بعد کا مطلب ہے کہ فی الحال کرنے کو کچھ نہیں ہے۔“ سفیر نے کہا۔ ”اتنے دن تو کیا کرے گا؟“

”ہم عیش کرے گا۔“ بیتو نے جواب دیا۔ ”اور آپ جلے گا۔“

”بیٹے یہاں ایک ماہر کک خاتون آ گئی ہے اور آج کل ہم تینوں وقت گھر کا کھا رہے ہیں۔“ سفیر بولا۔

”مرشد کی طرف سے کوئی اپ ڈیٹ ہوئی ہے؟“

”نہیں.... لیکن وہ اندرون خانہ ہمارے خلاف کچھ کر رہا ہے تو اس کی خبر نہیں ہے۔“ وسیم نے کہا۔

”وہ کتے کی دم ہے اتنی آسانی سے سیدھا نہیں ہوگا۔“

”اسی لیے میں نے سوچا ہے کہ سادی کے واپس آتے ہی وسیم، سفیر، سادی اور مونا واپس دبئی جائیں گے۔“

”ہمارا ایسا کوئی ارادہ نہیں ہے۔“

”یار میں بھی آؤں گا۔“ میں نے کہا۔

”اور مجھے چھوڑ جائیں گے۔“ عبداللہ بولا۔

”نہیں تم بھی ہمارے ساتھ ہی ہو گے۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”جب تک ہمیں یقین نہیں ہو جائے گا کہ

مرشد کے شر سے محفوظ ہو گئے ہیں تب تک ہمیں اس سے دور رہنا ہو گا۔ ملک میں ہم صرف چھپ کر بچ سکتے ہیں اور ظاہر ہے کوئی ساری عمر نہیں چھپ سکتا ہے۔"

"ویسے دبئی اور باقی یو اے ای کو پاکستان ہی سمجھو وہاں ہر دوسرا بندہ پاکستانی ملتا ہے اور فارن کے مزے الگ ہیں۔" سفیر نے کہا۔ "دبئی تو سمجھو یورپ کا ملک لگتا ہے اگر موسم نظر انداز کر دو۔"

"موسم بھی بنایا ہوا ہے ہر جگہ اے سی ہے۔" وسیم نے تائید کی۔ "سارے سال کمبل لے کر سونا پڑتا ہے۔"

"تیرا خیال نہ ہوتا تو آج وہیں مزے سے رہ رہے ہوتے۔" سفیر نے سرد آہ بھری۔

"اسی لیے میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تم چاروں وہیں رہو گے۔ باقی بھی موقع پا کر وہاں آجائیں گے۔ میں اپنے کسی ساتھی کو پیچھے نہیں چھوڑوں گا۔"

"چل پہلے ساوی آجائے پھر دیکھتے ہیں۔" سفیر نے کہا۔ "ویسے اس کا پاکستانی پاسپورٹ بن گیا ہے۔"

"ڈیوڈ شامان گیا؟" وسیم نے پوچھا۔

"ہاں تم اور عبداللہ میرے ساتھ ہو گے۔ مگر وہ مزید کسی اور کو لے جانے کو تیار نہیں ہے۔ بیتو بھی ہے۔"

"چار افراد بھی کافی ہیں۔" وسیم نے کہا۔ "لیکن ہم وہاں کیسے پہنچیں گے؟"

"یہ بھی ڈیوڈ شا کی ذمے داری ہو گی۔ اس مہم کی شروع سے آخر تک ذمے داری اسی کی ہے۔"

"اس طرح تو ہم اس کے رحم و کرم پر آجائیں گے۔"

"اتنی آسانی سے نہیں۔" وسیم نے عبداللہ کا اعتراض رد کر دیا۔ "ابھی ہمارے پاس وقت ہے اور ہم اس معاملے میں مزید سوچ بچار کر سکتے ہیں۔"

دروازے پر دستک ہوئی۔ بیتو نے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ پوجا اندر آئی۔ "سر آپ ڈنر کمرے میں کریں گے یا ڈائننگ روم میں؟"

پوجا کی مراد یقیناً اس عمارت کے ڈائننگ روم سے تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ ڈیوڈ شا آج رات میزبان کا کردار ادا کرنے کے موڈ میں نہیں تھا اور شاید اسے ضرورت بھی نہیں تھی کیونکہ وہ مجھے رضامند کر چکا تھا۔ میں نے پوجا سے کہا۔ "یہیں لے آؤ۔"

"سر ڈنر کتنے بجے پسند کریں گے؟"

ساڑھے آٹھ بج رہے تھے اس لیے میں نے نو بجے کا کہہ دیا اس طرح مجھے مزید گفتگو کے لیے وقت مل جاتا۔ پوجا رخصت ہو گئی۔ اس کے جانے کے بعد سفیر نے رشک سے کہا۔ "کیا ٹھاٹ ہیں تیرے، کتنے سریلے لہجے میں پوچھ رہی تھی، اتنی تابعدار تو آج کل کی بیویاں بھی نہیں ہوتی ہیں۔"

"ہاں کیونکہ تابعداری کا کام زن مرید شوہروں نے سنبھال لیا ہے۔" میں نے تائید کی۔ "ویسے اس کے سریلے لہجے پر مت جاؤ.... خطرناک چیز ہے۔" میں نے بیتو کو قابو کرنے والا واقعہ سنایا۔ اس پر ان سب کو ایک نیا موضوع مل گیا اور بیتو کی شامت آگئی۔ جب وہ حد سے بڑھنے لگے تو بیتو نے غصے میں آکر لیپ ٹاپ بند کر دیا اور مجھ سے کہا۔

"اچھا ہے یہ لوگ یہاں نہیں ہے ورنہ ہر وقت ہمارا دل جلاتا۔"

"تم توجہ کیوں دیتے ہو۔" میں نے مسکرا کر کہا۔ "ابھی تو میں نے یہ نہیں بتایا تھا کہ تم نے اس سے بدلہ کیسے لیا؟"

آدھے گھنٹے بعد پوجا بڑی سی ٹرالی کے ساتھ نمودار ہوئی، اس کی تین منزلوں پر کئی طرح کی ڈشیں سجی تھیں۔ کیونکہ صوفوں کے ساتھ رکھی میز مختصر تھی اور اس پر ساری ڈشیں نہیں سما سکتی تھیں اس لیے پوجا وہیں رہی اور ہم سے پوچھ کر سرو کرنا شروع کر دیا۔ شام کو اچھی خاصی ریفریشمنٹ لی تھی اس کے باوجود پھر بھوک لگ رہی تھی اس لیے میں نے اور بیتو نے تمام ڈشوں کے ساتھ انصاف کیا۔ آخر میں میٹھے سے کھانے کا خاتمہ کیا۔ پوجا برتن ترتیب سے رکھ رہی تھی۔ اچانک اس کے لباس سے بپ کی آواز آئی اور اس نے اوپر سے ہی کچھ کیا اور بولی۔

"یس سر....."

اس کے لباس سے ایک تار نکل کر اس کے کان تک جا رہا تھا جس میں یقیناً ایئرفون اور مائیک تھا۔ مگر اچانک ہی اس کے لباس میں موجود آلے سے آواز آئی اور جب تک وہ پھرتی سے بٹن دبا کر اس کا اسپیکر بند کرتی میں نے ایک جملہ سن لیا تھا۔ بولنے والا فشی دل جی تھا اور وہ ڈیوڈ شا سے مخاطب تھا اس نے کہا۔ "شاجی.... شہباز ملک کس عورت کو چھڑانے کے لیے یہ سب کر رہا ہے؟"

میں ڈیوڈ شا کا جواب نہیں سن سکا تھا کیونکہ اسی وقت پوجا نے آلے کا اسپیکر بند کر دیا تھا۔

جاری ہے

بیت بازی

قارئین

(زاہدہ انجم نوشہرہ کا جواب)

احمد شفیق.........حاصل پور

تھام لیں اس نے وقت کی نبضیں
ٹھہر گیا دن ڈھلتے ڈھلتے

ضیاالدین.........شیخوپورہ

تمہاری بزم میں جو شادمان رہتے ہیں
ہے ان کے سینے میں کیا غم کسی کو کیا معلوم

زاہد حیات خان.........ملتان

توہمات کی پُر ہول بدلیوں میں شمیم
اٹھو حقائق نور سحر تلاش کرو

عظمت علی خان.........خیرپور میرس

تم دل کی پوجا کرتے کرتے سنگ نگر میں آبیٹھے
یاں سنگ زنی ہی ہوتی ہے اور دل کے پارے ہوتے ہیں

(نرجس افروز روہیلہ کراچی کا جواب)

شفیق پراچہ.........کراچی

زخم سینے میں خلش دل میں لبوں پر آہیں
یہ خلاصہ ہے مرے زیست کے افسانے کا

ناہید بٹ.........لاہور

زندگی میں درس عبرت لے ثباتِ گل سے تو
شب کو چٹکا صبح مہکا دن ڈھلے مرجھا گیا

(ناصر حیات ملتان کا جواب)

افسر خان.........کوئٹہ

ابھی کچھ نا مکمل ہے کمالِ آبلہ پائی
کہ ان کے کوچۂ در کی ابھی ہے جستجو جاری

نرجس افروز روہیلہ.........کراچی

اپنے ہزار ظلم و تغافل کے ساتھ ساتھ
مہر و وفا کے باب کا عنوان لیے ہوئے

زاہد حیات.........ملتان

اے چاند کہاں جا کے چھپا دُور افق میں
تاریک سا تاریک مرا قلب حزیں ہے

(نوشین عارف میرپور (اے کے) کا جواب)

انجم سلمان.........میرپور (اے کے)

اب کیا کہیں یہ سنگ دلی ہے کہ بے حسی
دل ہے غموں کی زد پہ مگر آنکھ نم نہیں

انصار حسین نقوی.........مانچسٹر (یوکے)

اٹھ خدا کے واسطے اے دخترِ اسلام اٹھ
یہ سکوتِ موت کب تک ہائے یہ خواب گراں

سلطانِ عمر.........حیدرآباد

اے قمر یہ چوٹ کی تاثیر ہے
ورنہ پتھر میں کہاں چنگاریاں

فوزیہ اختر.........کراچی

انتظارِ دوست کتنا اشتہا انگیز ہے
جانبِ در دیکھتے آنکھیں میری پتھرا گئیں

(احمد جان ترمذی کا جواب)

فہیم الدین.........ملتان

چھوڑ دوں دامنِ توبہ جو کوئی یہ کہہ دے
پھر گھٹا جھوم کے لہرا کے آئی ہے

رعنا اختر.........لاہور

چند بیتے ہوئے دنوں کی یاد
حاصل زندگی نہیں ہوتی

(رباب نقوی ملتان کا جواب)

احسان اللہ خان.........وینہ

میں حالِ دل پوچھتی رہ گئی تیرا
اور تو نسیم صبح کی طرح گزر گئی

لائق حسین.........ملتان

ملا کرتی تھی جن سے زندگی کو روح بالیدہ
وہی قدریں اٹھا کے ہم نے رکھ دیں طاقِ نسیاں میں

نغمانہ الیاس.........میرپور خاص

مایوس نگاہوں سے سمجھ لیجے حالت
ٹوٹے ہوئے دل کی ہیں یہ خاموش صدائیں

(زاہد علی طوری پارہ چنار کا جواب)

امجد علی خان.........لاہور

دھوپ کے ساتھ سائے ڈھلتے ہیں
اب کیسے کوئی آسرا سمجھے

سرور امجدی.........حیدر آباد

دل کی نگری کھنڈر بنی ہے
ہولے ہولے آتے جاؤ

ناہید بٹ.........لاہور

دل ہے ویراں مثال کنج و قفس
آؤ سرو و سمن کی بات کریں

(نثار علی خان میاں چنوں کا جواب)

اشرف ممتاز.........کراچی

نثار کر کے مرے آنسوؤں کے نجم و گہر
بساطِ ارضِ وطن کو سلام کہہ دینا

ضمیر الحسن.........پشاور

نہ نظر کو کیف بخشیں نہ ابھی مجھے بلائیں
ابھی لطف تشنگی ہے ابھی سامنے نہ آئیں

فہد خان.........کراچی

نازک لطیف سانچے میں دل میرا ڈھال کے
آماجگاہ رنج و الم کیوں بنا دیا

(افسر خان کوئٹہ کا جواب)

حسین علی زکی.........پشاور

جو موت سے ڈرتے ہیں وہ مرتے ہیں ہمیشہ
جینے کا اگر شوق ہے تو روز مرا کر

خاقان عباسی.........لاڑکانہ

جو احساس قلبی سے بھاری تھے ان کو
میں روداد غم کیوں سنانے چلی تھی

امجد حسین.........میر پور

جتنا چاہا اسے عذرا وہ گریزاں ہی رہا
کیا کوئی یوں بھی وفاؤں کا صلہ دیتا ہے

(محمد عقیل چٹھہ حافظ آباد کا جواب)

نسیمہ فرحت شازی.........ملتان

اشک باری ہے آہ و زاری ہے
زندگی کیا ہے بے قراری ہے

ماہ رخ.........لطیف آباد

اس سے پہلے کہ خاک ہو جاتا
میں زمانے پہ خاک ڈال آیا

عین الرضا رضوی.........کراچی

ایک لمحے نے روک رکھا ہے
سالہا سال سے نہ سال آیا

اصغر حیدری.........سکھر

اک تبسم ہزار شکووں کا
کتنا پیارا جواب ہوتا ہے

منشی محمد عزیز مے لڈن.........وہاڑی

اک عمر سے میں دھوپ کے صحرا میں رواں ہوں
وہ زلف نظر آئے تو ستائے میرا جسم

(محمد عمران جونانی کراچی کا جواب)

شاہد جہانگیر شاہد.........پشاور

رنج و فراق یار میں رسوا نہیں ہوا
اتنا میں چپ ہوا کہ تماشا نہیں ہوا

(نگار لاہور کا جواب)

فاخرہ بتول.........شیخوپورہ

نوعِ بشر کو عزت عظمت قوت دینے والے ہیں
جن چہروں پہ ہے گرد جمی ہے جن ہاتھوں پہ چھالے ہیں

(سلیم کامریڈ کھاتاں کا جواب)

بشیر احمد بھٹی.........بہاولپور

نہ الزام دو ذوق تخلیق کو ستم کا
یاد کرو تم نے دانہ کھایا تھا گندم کا

نازش غزل.........کراچی

نمو کی خواہشیں رکھ کر گلاب کاشت کرو
پھر اس کے بعد نیا آفتاب کاشت کرو

بیت بازی کا اصول ہے جس حرف پر شعر ختم ہو رہا ہے اسی لفظ سے شروع ہونے والا شعر ارسال کریں۔ اکثر قارئین اس اصول کو نظر انداز کر رہے ہیں۔ نتیجتاً ان کے شعر تلف کر دیے جاتے ہیں۔ اس اصول کو مدنظر رکھ کر ہی شعر ارسال کریں۔

علمی آزمائش
101
30 اپریل 2014ء

میرے خیال سے اس مرتبہ دریافت کی گئی شخصیت کا نام.................................ہے۔

نام:.................................

پتا:.................................

انعام یافتہ ہونے کی صورت میں مجھے جاسوسی ☐ سسپنس ☐ پاکیزہ ☐ سرگزشت ☐ بھجوایا جائے
کسی ایک پر ☑ کیجیے۔

کوپن کے ہمراہ اپنے جوابات مورخہ 30 اپریل 2014ء تک علمی آزمائش 101 پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200 پر ارسال کریں۔

علمی آزمائش۔ 101

ادارہ

ماہنامہ سرگزشت کا منفرد انعامی سلسلہ

علمی آزمائش کے اس منفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کر کے ہمیں بھجوائیے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماہنامہ سرگزشت، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماہنامہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔

ماہنامہ سرگزشت کے قاری "یک علمی سرگزشت" کے عنوان تلے منفرد انداز میں زندگی کے مختلف شعبوں میں نمایاں مقام رکھنے والی کسی معروف شخصیت کا تعارف پڑھتے رہے ہیں۔ اسی طرز پر مرتب کی گئی اس آزمائش میں دریافت کردہ فرد کی شخصیت اور اس کی زندگی کا خاکہ لکھ دیا گیا ہے۔ اس کی مدد سے آپ اس شخصیت کو بوجھنے کی کوشش کریں۔ پڑھیے اور پھر سوچیے کہ اس خاکے کے پیچھے کون چھپا ہوا ہے۔ اس کے بعد جو شخصیت آپ کے ذہن میں ابھرے اسے اس آزمائش کے آخر میں دیے گئے کوپن پر درج کر کے اس طرح سپرد ڈاک کیجیے کہ آپ کا جواب ہمیں 30 اپریل 2014ء تک موصول ہو جائے۔ درست جواب دینے والے قارئین انعام کے مستحق قرار پائیں گے۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

صوبہ پنجاب میں دریائے چناب کے بائیں کنارے پر ایک شہر آباد ہے جو ازمنہ قدیم میں چینیوں کی آبادی تھی۔ زمانہ قدیم میں ایک حسین دوشیزہ جو حکمران کی لاڈلی بیٹی تھی۔ اس کا نام چندن تھا اس نے علاقے کو شکارگاہ بنایا تھا۔ اسی نے وہ شہر بسایا جو آج لکڑیوں کی نقاشی کے لیے پوری دنیا میں شہرت رکھتا ہے۔

علمی آزمائش 99 کا جواب

سر ظفر اللہ خان 6 فروری 1893ء کو سیالکوٹ میں پیدا ہوئے۔ ساڑھے 14 سال کی عمر میں احمدی بن گئے۔ حکومت پاکستان کے کئی اہم عہدوں پر فائز رہے۔ 76 سال کی عمر میں انتقال کیا۔

انعام یافتگان

1- ارشد نیاز، لاہور 2- ظہیر خان، لاہور 3- شاہین، میاں چنو

4- صالح حامد، شیخوپورہ 5- ظہیر الاسلام، جہلم

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

کراچی سے اکرام اللہ خان، امجد خان، رضا خان، ناہید میر، سید عزیز الدین، شمیم احمد، سید عباس رضا، رضوی تنویر، شرف معروف حمیدی، نسیم علی، سید ناصر، تحریم، امیر السلام، جمیل عثمانی، واحد خان، عبدالوہاب صدیقی، اختر بلقیس، کوکب ہما بخاری، آفتاب منصور، اقبال احمد چشتی، اختر حسین، نوشین ملک، احسن خان اچکزئی، اقبال احمد چشتی، انوار علی شاہ، اختر عباس، طارق حبیب، نعیم اختر، اقبال قریشی، واحد شاہ، نعمت مرزا، جاوید اقبال، فیضان انصاری، فیض مسیح ہما بوکی۔ لاہور سے شگفتہ مشتاق، فہیم بٹ، ثنا ارسل، کمال حسن، مسز نادر شاہ، سلمان زیدی، سلیم درانی، شاہینہ بتول، چوہدری نیاز مسلم خان، زینت انصاری، نذیر مرزا، ماسٹر فیض محمد، انور کلیم شاہ، فلک شیر ہما بخاری، کوکب گردیزی، فیض ملک، بہادر خان، شہباز خان، ثاقب خان، انوار شاہ، یوسف جمان، ابراہیم شاہ، محمد پہلوان اختر، نگار ملک، بیگم زوار شاہ، نوشین ملک، فیض الحسن، مرزا یوسف بیگ۔ ملتان سے منشی فضل اللہ، عقیل احسن، حبیب الرحمن۔ لندن سے منشی محمد عزیز، محمد معین چشتی، شہروز، اصغر خان۔ پشاور سے زاہد خان، احسان خان، بشیر فاروقی، قاسم جان، احمد مجاہد، مرتضیٰ زیدی، فہیم عباس، مصیب بٹ۔ شیخوپورہ سے ندا امتیاز، ثریا فاطمہ، ممتاز خان، عقیل فیضان۔ ڈیرہ غازی خان سے غالب علی، ناصر حسن، محمود نیاز، خان محمد خان، قیم الدین۔ ڈیرہ اسماعیل خان سے زوریز عالم خان، ارشد آفاق، شہباز خان، ملک فیروز، پروین سلطان، نعمان الحسن، عبادت حسن، قیام الدین خان۔ جہلم سے ابرار شاہ، ابرار شیخ، جاوید محمد خان، تقی عثمان، نیاز حسن، حلیم اللہ خان، محمد فراز، محمد ندیم، کاظم بیگم، فرحت اللہ، ارتضیٰ حسین، فہیم حسن، عباس۔ حیدرآباد سے ماہ رخ (لطیف آباد) بہاولنگر سے نوشین خٹک۔ بہاولپور سے

وقار احمد، فراز احسن فاروقی۔ میانوالی سے سہاب خان، ملک انور۔ لیہ سے خاقان الحسن۔ مظفر گڑھ سے نیب الرحمن، فیضان عثمانی، عقیل سید، عبادت حسن، قیصر خان، عطا خان، فیروز حسن، اصغر محمود، امجد ملکانی، شبیر خان، فہیم وٹو، ماہم حسن۔ بھکر سے فقیر غلام حسین ضیائی۔ اسلام آباد سے جاوید محسن ملک، مرزا احمد ریاض راحیل، مسعود خلیل، حیا علی، ذیشان شاہ، سنجیدہ شاہ، اعظم بٹ، ہما شاہنواز، انوار یوسفزئی، زاہد خان، ذوالقرنین، فصاحت مرزا، بلال مصطفیٰ، سلام خان، شریف الحسن، نادر خان، صلاح الدین، مرید علی خاکوانی، اسلم خان، بیگم امتیاز علی دستوری، مہر خان، اصغر عباس۔ راولپنڈی سے مظفر اسماعیل، ڈاکٹر سعادت علی خان، ملک نوریز، فتح الدین، قیصر خان، عدنان سعیدی، غضنفر عباس، ابرار الحسن، شریف شاہ، حق نواز، صاحب جان، بشیر کمال، فیض خان، صالح الرحمن، سید عباس زیدی، عباس کاظمی، قاسم جان۔ گوجرانوالہ سے منزہ ہاشمی، احسان الحق بھٹی، محمد اسلم کھوکھر ایڈووکیٹ۔ میرپور خاص سے عمیرہ، صنوبر، مجاہد علی، ایس بستی۔ کوئٹہ سے سلطان شاہ، نور الحسن زیدی، نور، فرید خان، ارباب خان، محمد فیضیاب، مستقیم اللہ، متقی کاظمی، نور فاطمہ، ارباب چنگیزی، فرحت بابر، خاقان عباس، عنایت، اچکزئی، فیاض ناصری، سید شاہد حسین، انعام اللہ، مغنی فیض۔ فیصل آباد سے سید خرم کرمانی۔ منڈی بہاؤ الدین سے زاہد علی، تاثیر حسین، فرحت خان، ندا علی، ناصر کیانی، احمد جاوید، سعید مصطفیٰ۔ ساہیوال سے محمد افضل خان۔ کھلابٹ سے قاضی محمد صابر۔ سیالکوٹ سے نوید شہزاد، خواجہ منظر خان، حسن عالم، ارشد حسین، ندا آفاق، جاوید مظفر۔ درویش خان، محمد مظہر، سید محمد میثم رضوی، فرحت حسین باقری، فیاض محمد، اکبر خان۔ سرگودھا سے اطہر یونس، ہما شاہ اللہ، فتح باری، آفتاب خان، نوید ہاشمی، آفتاب محمد خان، رانا ظفر اقبال، نوشین فاطمہ، کلیم خان، عباس اختر، منظر حسین، نصیر عباس، عظمت اللہ، نصیر عباس، نصرت افروز، امجد خان، نعیم خان، حکیم اللہ، ارباز خان۔ کوہاٹ سے فدا حسین۔ رحیم یار خان سے افضال میو، امجد اقبال، فصاحت خان، نیاز حسن، نسیم احمد، ملک فیروز الدین، ارشد محمود، ہما بتول، فہیم شاہ، محمد سراج الدین، اختر عباس، عمر مقصود، ایم اے شاہد، علی عباس، خادم حسین، فیض شاہ، فیض بلوچ۔ نگار جہاں، محمد خواجہ، سید احترام حسین رضوی، مریم ریاض، سید عزیز الدین، بختاور شاہ، عارضہ سلطان، کہکشاں تسلیم، وجاہت علی، ابرار احمد، عنایت مسیح، کاوش اختر، علی احمد، نجم الدین حیدر، تنویر حسین زیدی، کلیم اللہ فہمی، رجب علی مرزا، نوازش علی شاہ، منور علی، نجم الدین حیدر، ناصر افروز، ملک سرفراز گوندل، نصرت فاروقی، ممتاز الحسن، کاشف حیدر، فہیم احمد، وجاہت ایثار، جاوید علی، انعام خان، انصار حسین، مظفر محسن، سیام فاروقی، خالد عثمانی، افتخار احسن، قائم علی، ناظم پاشا، کائنات فاطمہ، منذر علی برمانی۔ لاہور سے سرت اسلم، ارشاد علی، تابش عطاری، احمد علی مشرقی، نیاز احمد ملک، ممتاز الحسن، برق ضیائی، خالد علی، عقیل سندھو، احمد بشیر بٹ، نعمان اشرف، فہیم مرزا، ارباز خان، حدیقہ اشرف، گل زیب، اکرم صدیقی، پروین ضیائی، ملک واحد الحق، نعمان اشرف، نثار اختر، ابرار احمد انعام، نازش خان، ہما جبیں، حمیرا خاتون، تابش اطہر، نازش حسین، زبیر اسلم، ممتاز الحق۔ راولپنڈی سے نرجس علی، زویا بخاری، بخت خان، کائنات بانو، سید محمد تقی، زبیر شاہ اشرفی، تنویر الحسن، رانا فتح یاب، صفدر شیرازی، نسرین اشرف، زاہد عباسی، خاقان خان، محمد رفیق خان۔ کوئٹہ سے راؤ رشید، ارباز خان، فیض اللہ خان، تقی چنگیزی، عقیل سید پوری، نگار بٹ، صالح بشیر، خاقان عمران، نصرت چنگیزی۔ سرگودھا سے نادر شاہ، حیات خان، فصیح الزمان، عظمیٰ اکمل نونہ، خلیق الحق، خضر حیات۔ ملتان سے قدوس بخش، سعیدہ جلال، فاضل خان اچکزئی، لبنیٰ ظہیر، نصیر الدین واصف، اقبال حمیدی، فاروق ابرار، صلاح الدین احمد، رضوانہ اختر، اللہ دتہ، محمد عتیق، فرزانہ ملک، زینب چوہان، قدوس بخش، محمد احمد۔ جہانیاں سے محمد سہیل انجم، رانا وجدانی، اصغر میتھو، نصیر الدین، کاشف زیدی، زبیر ملک، فرہاد اصغر، نوشین سلطان۔ کوٹ ادو سے ممتاز احمد، فرخ بشیر، احمد توحید، نعمان بشیر، احمد یار خان، ناصر رند، فیاض چونالہ، الہ ڈینو، آفاق سعید۔ حسن ابدال سے سید محمد رضا، کرم الٰہی، ارشاد خان، نیاز احسن، ذوالفقار، مرتضیٰ حسن، شہزاد خان۔ چونالہ سے چوہدری بشیر ملک، نثار احمد، نثار مضطر، رفیق احمد مغل، احمد سلیم، عباس خان، کمال فیاضی۔ پاک پتن سے نواب علی، سدرہ شفیق، ذریاب خان، نرجس زیدی، ذریاب خان، عطا المصطفیٰ، محمد فاروق، سلطان قادری۔ جھنگ سے زویا رفیق، امتیاز حسن، عجب گل، زاہد ملک، ملک سرفراز، احباب زیدی، ناصر ترمذی۔ سکھر سے ارشاد بھٹو، نعمان شیخ، رام جینہ ملکھانی، خالد مغل، تصویر فاطمہ، علی اکبر، ذیشان حسن۔ مانسہرہ سے عباس خان، رفیق لاہوری، زاہد خاور، نسیم ارشاد۔ پارہ چنار سے زاہد علی طوری، فائق مانسہروی، لیاقت علی، حسن بخش، زاہد خان۔ اوکاڑہ سے اظہر الدین، سید احسن محمود، نعمان بشیر، صاحب خان، راجا احسن، ملک صفدر، اظہر الدین۔ سیالکوٹ سے نوید شہزاد، خواجہ آصف ملک، اقرار الحسن، مہ جبین جھنگ، نصرت مرزا، محمد رضا، احتشام الاسلام الدین، ارباز ملک، لیاقت علی، ضامن رند، ظہیر فرقانی۔ شجاع آباد سے سید عباس علی، ارباز خان، زوار حسین زیدی، نسیم اختر نیازی، فتح ملک۔ اٹک سے خالد چوہدری، زبیر اللہ خان، فیض اختر، ہما جبران، خورشید اختر، زبیر اللہ مروت، فاطمہ ملک، سرفراز گل، ہما شاہ اللہ، فرحت بابر زمان، سعید بھٹی، نثار فراز، سید اختر، سعید خان، فتح شاہ، زبیر اللہ مروت، اکرم خان۔ حافظ آباد سے نعمان حسن خان، فرحت جان، الہ جاوید، شیریں فاطمہ، نسرین رانا۔ نواب شاہ سے عزیز حسن، ارحم شاہ، عزیز الدین۔ شہر سلطان سے سنجیدہ احمد، بازق بخاری، ارشد حسن، نوید انصاری، عباس علی، ارباب خان، راجا یونس۔ میرپور آزاد کشمیر سے کاشف حسین، نعمان سلطان، کمال احد کمال، احسن بھٹ، نصرت خان، یونس ایاز، چوہدری محمد مبشر نذیر (سمبو بھیرہ، پونچھ)۔ میانوالی سے احمد علی فوقی، ایاز علی رند، ملک سرفراز، خیر الدین کھرہ، ضامن خان اشرفی، عبد اخلاق (کالا باغ)۔ بھکر سے حسن چنگیزی، غازی شاہ، شاہد حسن خان، نیاز احسن، زاہد اسلم چٹھہ، ملک سرفراز، منگیر، زبیر شاہ، تقی بخش۔ منڈی آدم سے فاطمہ عباسی، نیاز ملکانی، خالد خان چونالہ، ناصر بھکھو، نیاز عباس۔ کمالیہ سے محمد کمال، ذیشان مجاہد، ناصر ملک، فہد حسن، ابرار الحق، نثار علی، فہیم عثمانی، فردوس بشیر، ابرار خان اعظم، ظہیر الدین۔ لیہ سے شباب الاسلام، شجاعت خان، راجا ابرار، سردار توفیق، انصار حسین، مالک حسن ملک۔ کولارچی سے ارشد خان۔ شاہ جمال سے فہد مشتاق۔ نارووال سے انعام احسن کمالی۔ مردان سے ابرار خان۔ تربیلہ ڈیم سے حسن بیگ، فہیم اللہ فاروقی۔ ڈیرہ اسماعیل خان سے سرفراز احسان، صفدر حسن، خالد خان، ناصر فہم، ابرار حسن زئی۔ ڈیرہ غازی خان سے احمد علی، واصف احمد۔ پشاور سے غازی توفیق، مالک اسلم، فرید ملک، نسیم نیاز احمد، خالد کنول، وقار احمد، قیصر حسن، توفیق الاسلام، افضل میو، شاہ وقار، نہال زیدی، ابہام رضا خان، نعیم شیرازی، فخر اسلام، سردار علی مینگل، فرقان اختر، نسیم اچکزئی، بینش ملک، نسیم فردوس، ارہام خان، جویریہ، گلشن خان، نعیم الحسن، فرقان اختر، شیر نواز، اطہر نواز، فہیم فاروقی، ضیاء الحق، اطہر شاہ، ضیاء الحق، جمال شاہ، فراست خان، نوید فہیم، اصغر طوری، بخش محمود اچکزئی، فرزانہ شاہ، ارباب خان، دردانہ شاہ، نسیم نیازی۔ چشتیاں سے معظم علی۔ ممالک غیر سے محمد اشفاق یاسین (مانچسٹر یو کے)، ممتاز جہاں (العین یو اے ای) ظہیر خان، نصرت جاوا (جدہ سعودیہ) فوزیہ ملک (قم ایران)، فہد فاروق (ٹوکیو، جاپان)۔ صاحبزادہ فضل اللہ (ٹورنٹو کینیڈا) انعام اللہ، فصاحت خان (العین)۔ آغا مسعود (فرینکفورٹ)

بزدل کون؟

محترم ایڈیٹر
السلام علیکم

انسان خوش فہمی میں خود اپنے پیروں پر کلہاڑی مارتا ہے۔ عرفان بھائی کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا۔ کیونکہ وہ اور ان کی بیگم بہت زیادہ خوش فہم تھے۔ ایسی غلطی پھر کوئی نہ کرے اسی لیے یہ واقعہ لکھ رہا ہوں۔

وسیم
(کراچی)

میری شادی کو مشکل سے دو ماہ ہی گزرے تھے کہ میرا تبادلہ کراچی سے میرپورخاص کر دیا گیا۔ میں نے بہت شور مچایا، حکامِ بالا کو تبادلہ روکنے کی درخواستیں دیں لیکن سب بے سود! میری ایک نہ سنی گئی اور مجھے میرپورخاص کے لیے رختِ سفر باندھنا ہی پڑا۔

میں ٹیلی فون و ٹیلی گراف کے محکمے ٹی این ٹی میں ملازم تھا۔ اس محکمے کو عرفِ عام میں ڈاک و تار کا محکمہ کہا جاتا تھا۔ اس وقت تک ٹیلی کمیونکیشن کارپوریشن کا وجود عمل میں نہیں آیا تھا۔

میری تنخواہ بہت زیادہ نہیں تو اتنی کم بھی نہیں تھی، میں چھٹی کے بعد ایک پرائیویٹ کمپنی میں جزوقتی ملازمت بھی کرتا تھا، یوں ہاتھ کبھی تنگ نہیں ہوا۔ پھر میں قناعت پسند ہوں اور وہ دور بھی قناعت پسندی کا تھا۔ میں نے کمیٹیاں ڈال کر ایک موٹرسائیکل بھی خرید لی تھی۔ اس دور میں جس کے پاس موٹرسائیکل ہو، اسے صاحبِ ثروت سمجھا جاتا تھا۔ میری بیوی نسرین بہت پُرکشش تھی، سرخ و سفید رنگت، سیاہ لمبے اور گھنے بال اور میری طرح دراز قد۔

نسرین نے انٹر تک تعلیم حاصل کی تھی اور خود کو بہت نڈر اور پُراعتماد سمجھتی تھی۔ اکثر وہ اکیلی ہی خریداری کے لیے طارق روڈ اور صدر چلی جاتی تھی۔

بات ہو رہی تھی میرے تبادلے کی۔ اگر میری شادی نہ ہوئی ہوتی تو مجھے اس تبادلے پر بالکل اعتراض نہ ہوتا۔ آپ خود ہی سوچیے، کون اپنی نئی نویلی اور خوبصورت بیوی سے جدا ہونا چاہے گا۔ دفتر کے ساتھیوں نے تسلی دی کہ یار، میرپورخاص کوئی گاؤں نہیں ہے، اچھا خاصا شہر ہے۔ مکان کا بندوبست کر کے بھابی کو بھی بلا لینا۔ مجھے اماں کی بھی فکر تھی لیکن نسرین کی موجودگی کی وجہ سے کچھ تسلی تھی۔

میں نسرین کو ڈھیروں ہدایات دے کر اور اماں کی دعائیں لے کر میرپورخاص روانہ ہو گیا۔ میں نے اماں سے کہا تھا کہ ہر ہفتے کراچی آیا کروں گا لیکن اماں نے منع کر دیا کہ ہر ہفتے کرائے میں پیسے ضائع کرنے کی ضرورت نہیں ہے، بس پندرہ دن میں ایک دفعہ کراچی کا چکر لگا لینا۔

میرپورخاص دیکھ کر مجھے بہت مایوسی ہوئی۔ یہاں ہمارے محکمے کی کالونی بالکل الگ تھلگ تھی۔ گنتی کے چند سرکاری مکان تھے جن میں سے زیادہ تر محکمے کے افسران کے قبضے میں تھے، صرف دو مکان ہمارے حصے میں آئے تھے اور ایک ایک مکان میں محکمے کے دو دو آدمی مقیم تھے۔ مکان دیکھ کر نسرین کو وہاں بلانے کا ارادہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا۔ اس مکان میں کمرے ہی صرف دو تھے۔ ایک کمرا مجھے مل گیا۔ دوسرے کمرے میں ہمارے محکمے ہی کا ایک آدمی مقیم تھا۔ اس کا نام عرفان تھا۔ وہ خاصا خوش گفتار اور خوش لباس آدمی تھا۔ بات بات پہ قہقہے لگانا اس کی عادت تھی۔ اس کے پاس لطیفوں کا گویا ذخیرہ تھا۔ جس طرح کچھ لوگ موقع محل کے لحاظ سے شعر پڑھتے ہیں، اس طرح عرفان ہر موقع پر کوئی نہ کوئی لطیفہ سنایا کرتا تھا۔

وہ مجھ سے عمر میں بھی بڑا تھا اور عہدے میں بھی لیکن

اس کی باتیں اتنی دلچسپ ہوتی تھیں کہ عمر اور عہدے کا فرق مٹ گیا تھا۔ وہ بھی میری طرح کراچی ہی سے آیا تھا۔ وہ کراچی میں ملیر کے علاقے میں رہتا تھا۔ میرا قیام فیڈرل بی ایریا میں تھا۔

عرفان کی شادی کو سات آٹھ سال ہو چکے تھے لیکن آج بھی وہ اپنی بیوی کا دیوانہ تھا اور رات کو دیر تک ٹیلی فون پر اس سے بات کرتا تھا۔ محکمہ ٹیلی فون والوں کو اس دور میں ٹیلی فون جیسی نعمت میسر تھی۔ ہمارے گھروں میں بھی ٹیلی فون تھے۔ مگر عام لوگوں کے لیے ٹیلی فون کی سہولت عنقا تھی۔ اکثر میں بھی رات کو ٹیلی فون کر لیا کرتا تھا اس طرح نسرین سے دو باتیں ہو جاتی تھیں۔ کبھی عرفان موجود نہ ہوتا تو میں نسرین سے کھل کے بات کر لیا کرتا تھا مگر وہ اللہ کی بندی اب تک ٹیلی فون پر بھی مجھ سے شرماتی تھی۔

میں جب بھی زیادہ رومینٹک اور جذباتی ہوتا، وہ جھٹ کہہ دیتی۔ ”اماں آ رہی ہیں۔“

”تو اماں کیا تمہیں رنگے ہاتھوں پکڑ لیں گی؟“ میں جھنجلا کر کہتا۔ ”بھئی تم کسی بوائے فرینڈ سے نہیں بلکہ اپنے شوہر سے بات کر رہی ہو۔“

میرا موڈ خراب ہو جاتا تو وہ مجھے منا لیتی۔ میں تو شاید ایک ہفتے بعد ہی کراچی کا چکر لگا لیتا لیکن میں نے یہاں آنے کے لیے اچھی خاصی شاپنگ کر لی تھی، اس لیے اب کراچی جانے کے پیسے ہی نہیں تھے۔ کھانے پکانے کا سامان بھی عرفان ہی لا رہا تھا۔ اس نے بہت تحکمانہ انداز میں مجھ سے کہا تھا۔ ”وسیم! جب تک تمہیں تنخواہ نہیں مل جاتی، تم میرے ساتھ کھانا کھاؤ گے۔ اگر تمہیں اس پہ اعتراض ہے تو اپنا بندوبست کہیں اور کر لو۔“

اس نے کچھ اس انداز سے یہ بات کہی کہ میں مجبور ہو گیا۔ عرفان کھانے بھی بہت مزے دار بناتا تھا۔ گھر کی صفائی اور برتن وغیرہ دھونا میں نے اپنے ذمے لے لیا۔

ہم دونوں کبھی شام کو شہر کی طرف بھی نکل جاتے، پھر رات کا کھانا کھا کر اور فلم دیکھ کر رات گئے لوٹتے۔ شہر کا علاقہ ہماری کالونی سے دو تین میل کے فاصلے پر تھا۔

اس دن میرے سر میں شدید درد تھا اس لیے دفتر سے دوپہر ہی میں گھر آ گیا تھا۔ میں نے گرماگرم چائے کے ساتھ سر درد دور کرنے کے لیے ایک گولی کھائی اور چادر لپیٹ کر لیٹ گیا۔ ان دنوں سردی تو نہیں تھی لیکن اچھی خاصی

خنکی تھی۔ جلد ہی میری آنکھ لگ گئی اور میں گہری نیند سو گیا۔

میری آنکھ کسی کے گدگدانے سے کھلی۔ اس کے ساتھ ہی چوڑیوں کی کھنکھناہٹ اور مسحور کن خوشبو کا جھونکا آیا اور میں بری طرح گھبرا گیا کہ اس ویرانے میں کسی عورت کا کیا کام؟

وہ زیر لب کچھ گنگنا رہی تھی۔ آواز بھی اچھی تھی اور وہ خاصے سحر میں تھی۔

مجھے ٹھنڈے ٹھنڈے پسینے آنے لگے۔ دل میں ہزار قسم کے واہمے سر ابھار رہے تھے کہ ہو نہ ہو یہ کوئی چڑیل ہے۔ دفتر کے لوگوں نے اور خود عرفان نے بھی مجھے بتایا تھا کہ اس علاقے میں بھوت پریت گھومتے پھرتے ہیں۔ میں دانستہ گردن گھما کر اس کی طرف دیکھنے سے پرہیز کر رہا تھا۔

اچانک مجھے ایسا لگا جیسے کوئی میرے بالوں میں انگلیاں پھیر رہا ہو۔ مسحور کن خوشبو کا ایک زبردست جھونکا آیا، چوڑیاں کھنکھنائیں، پھر ایک مترنم آواز سنائی دی۔ ”کیا بات ہے عرفان! طبیعت تو ٹھیک ہے کہ تم میرے آنے پر بھی نہیں اٹھ رہے ہو؟“

اس کے منہ سے عرفان کا نام سن کر میں نے چادر چہرے سے ہٹائی اور گردن موڑ کر اسے دیکھا۔

وہ یوں اچھل کر پیچھے ہٹی جیسے اس کے پاؤں جلتے ہوئے انگارے پہ پڑ گئے ہوں وہ ہکلا کر بولی۔ ”کک...... کون ہیں...... آپ؟“

”آپ کون ہیں اور یہاں کیا کر رہی ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”میں مسز عرفان ہوں اور......“

”ارے بھابی آپ؟“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”میں نے عرفان سے آپ کا بہت تذکرہ سنا ہے۔ میرا نام وسیم ہے اور میں......“

”اچھا اچھا وسیم بھائی۔ وہ اب کافی حد تک سنبھل گئی تھی۔ ”عرفان آپ کے بارے میں بھی اکثر بتاتے رہتے ہیں۔ میں بالکل بھول گئی کہ اب عرفان کے ساتھ آپ بھی رہتے ہیں۔“

”آج میری طبیعت کچھ خراب تھی اس لیے دفتر سے جلدی آ گیا تھا۔“ میں نے کہا۔

”سوری وسیم بھائی!“ اس نے کہا۔ ”میں نے فضول میں آپ کو ڈسٹرب کر دیا۔ اصل میں اس سے پہلے جب بھی میں یہاں آئی تھی تو عرفان اکیلے ہی یہاں رہتے تھے۔“ پھر وہ مسکرا کر بولی۔ ”آپ آرام کریں، میں آپ کے لیے چائے بنا کر لاتی ہوں۔“

”ارے، آپ بیٹھیں سعدیہ بھابی! آپ تھکی ہوئی ہوں گی۔ میں آپ کے لیے چائے بناتا ہوں۔“

میری بات سن کر وہ ہنسنے لگی۔ ”کیسی تھکن وسیم بھائی! میں نے کون سا کراچی سے یہاں تک پیدل سفر کیا ہے۔ میں چائے لاتی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ چھپاک سے باہر نکل گئی۔

مجھے یہ خوف بھی تھا کہ عرفان مجھے اپنی بیوی کے ساتھ دیکھے گا تو کیا سوچے گا؟

اس وقت غیر متوقع طور پر عرفان بھی آ گیا اور آتے ہی بولا۔ ”یار وسیم! سعدیہ یہاں پہنچ گئی؟“ پھر اچانک اس کی نظر سعدیہ کے ہینڈ بیگ اور چھوٹے سے سوٹ کیس پہ پڑی تو وہ ہنس کر بولا۔ ”گویا خاتون تشریف لا چکی ہیں۔“

سعدیہ چائے کی ٹرے لے کر کمرے میں داخل ہوئی تو اس کی آنکھیں خوشی سے چمکنے لگیں۔ ”عرفان! آپ آ گئے۔“ اس نے خوشی سے لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ ”میں چائے کا ایک کپ اور لے کر آتی ہوں۔“

”چلو، میں بھی چلتا ہوں۔“ عرفان نے چائے کی ٹرے اس کے ہاتھ سے لے کر رکھی اور اسے شانوں سے پکڑ کر باورچی خانے کی طرف لے گیا۔ اس کی چاہت میں عجیب دیوانگی تھی۔ بالکل نوجوان لڑکوں جیسی حرکتیں کر رہا تھا۔ اس وقت تو کسی غیر کے سامنے بیوی کا ہاتھ تک پکڑنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ لوگ اتنے آزاد خیال نہیں تھے جتنے آج ہیں۔

باہر سے سعدیہ کی کھنک دار ہنسی کی دبی دبی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ چند منٹ بعد سعدیہ ایک اور کپ لے کر آ گئی۔ چائے پیتے ہوئے اس نے مزے لے لے کر عرفان کو مجھ سے ملاقات کا واقعہ سنایا۔

میرا خیال تھا کہ عرفان کو یہ بات ناگوار گزرے گی لیکن وہ اس پر قہقہہ مار کے ہنس دیا اور بولا۔ ”یار وسیم! برا مت ماننا، سعدیہ......“

”کیسی باتیں کرتے ہو؟“ میں نے منہ بنا کر کہا۔ ”میں بھلا کیوں برا مانوں گا۔“

عرفان سعدیہ کی طرف گھوم کر بولا۔ ”سعدیہ! تم جلدی سے نہا دھو کر فریش ہو جاؤ، میں کھانا گرم کرتا ہوں۔“

”جی نہیں۔“ سعدیہ نے کہا۔ ”جب تک میں یہاں ہوں، آپ کچن کا رخ بھی نہیں کریں گے۔ یوں بھی میں اپنے ساتھ بہت سا کھانا لے کر آئی ہوں۔ ٹھنڈا موسم ہے اس لیے کھانا کل تک خراب نہیں ہوگا۔“ سعدیہ نے سوٹ کیس سے تولیا اور کپڑوں کا ایک جوڑا نکالا اور غسل خانے کی طرف بڑھ گئی۔

وہ نہا دھو کر نکھری سی لگ رہی تھی۔ میں نے بغور اس کا جائزہ لیا۔ وہ دو بچوں کی ماں تھی لیکن دیکھنے میں بالکل لڑکی لگ رہی تھی۔ اس کا رنگ گندمی تھا، متناسب جسم اور چہرے پہ بلا کی کشش تھی۔ میں نے نسرین اور سعدیہ کا موازنہ کیا تو نسرین مجھے اس کے مقابلے میں زیادہ خوب صورت لگی۔ سعدیہ کے انداز میں ایک بے باکی تھی جو مجھے اچھی نہیں لگی۔

ہم لوگ کھانے کے لیے بیٹھے تو میں نے سعدیہ سے پوچھا۔ ”بھابی! آپ کس کے ساتھ آئی ہیں؟“

”مجھے بھلا کسی کے ساتھ کی کیا ضرورت ہے؟“ سعدیہ نے ہنس کر کہا۔ ”کراچی سے بس میں بیٹھی اور سیدھی میرپور خاص پہنچ گئی۔“

مجھے حیرت ہوئی کہ وہ کس بے خوفی سے یہاں تک آ گئی تھی۔ اس کے جسم پہ اچھا خاصا زیور بھی تھا۔ گلے میں ہار تھا، کانوں میں اچھے خاصے وزن کے جھمکے تھے اور دونوں ہاتھوں میں سونے کی چار چار چوڑیاں تھیں۔ مجھے یہ بے خوفی اور خود اعتمادی نہیں بلکہ سراسر حماقت لگ رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ سعدیہ کے جانے کے بعد عرفان کو سمجھاؤں گا۔ اس وقت تو مجھے اپنی فکر تھی۔ سعدیہ نہ جانے کتنے دن کے لیے آئی تھی۔ اس کی موجودگی میں میرا یہاں رہنا مناسب نہیں تھا۔

جب سعدیہ برتن لے کر کچن کی طرف گئی تو میں نے عرفان سے کہا۔ ”یار، میں سوچ رہا ہوں کہ کچھ دنوں کے لیے میں چاچا غلام رسول کے کوارٹر میں رہ لوں۔“

”کیوں؟“ عرفان چونک کر بولا۔

”یار اب بھابی بھی آ گئی ہیں۔ اس صورت میں میرا یہاں رہنا......“

”بس کر یار!“ عرفان برا مان کر بولا۔ ”تجھے تو میں اپنے چھوٹے بھائیوں کی طرح سمجھتا ہوں اور تو غیروں والی بات کر رہا ہے۔ ویسے بھی اس مکان میں دو کمرے ہیں۔ ہمیں کوئی پریشانی نہیں ہوگی۔“

”لیکن عرفان......“

”عرفان ٹھیک کہہ رہے ہیں۔“ سعدیہ نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے کہا۔ آپ کوئی غیر ہیں جو اس قسم کی باتیں کر رہے ہیں۔ پھر کون سا میں دو چار مہینے کے لیے آئی ہوں۔ دو دن بعد واپس چلی جاؤں گی۔“

میں خاموش ہو گیا، بولتا بھی کیا؟

میں کراچی سے آتے ہوئے اپنی موٹر سائیکل بھی لیتا آیا تھا۔ یہاں اس کی وجہ سے بہت آرام تھا۔ شہر سے ہماری کالونی کا فاصلہ اچھا خاصا تھا اور تانگے والا دگنے پیسے مانگتا تھا کیونکہ واپسی میں اسے خالی جانا پڑتا تھا۔ رہا سوال سینما جانے کا تو وہ بھی خاصا بڑا اسفر تھا۔ کوئی تانگے والا شاذ و نادر ہی جانے کے لیے ملتا تھا۔

میں نے اپنی موٹر سائیکل عرفان کے حوالے کر دی۔ وہ دونوں میاں بیوی اس پہ خوب گھومتے پھرے۔ سعدیہ کہتی تھی کہ اس دفعہ تو واقعی میرپور خاص آنے کا مزہ آ گیا۔

دو دن بعد جب وہ جانے کے لیے تیار ہوئی تو حسب معمول جدید فیشن کے قیمتی کپڑوں میں ملبوس تھی اور زیور بھی پہن رکھا تھا۔ میں نے کہا۔ ”سعدیہ بھابی اتنا زیور پہن کر جانا مناسب نہیں ہے۔ پھر اتنا زیور پہننے کی ضرورت بھی کیا ہے؟“

سعدیہ کھلکھلا کر ہنس پڑی اور بولی۔ ”آپ تو بالکل میری ساس کی طرح باتیں کر رہے ہیں وسیم بھائی!“

عرفان بھی ہنس کر بولا۔ ”یار وسیم! تمہیں اندازہ نہیں ہے کہ سعدیہ کتنی نڈر ہے۔ یہ تو سرِ بازار کئی بدمعاشوں اور اوباش لوگوں کی پٹائی بھی کر چکی ہے۔“ اس کے انداز میں فخر بھی تھا۔

”عرفان!“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”کسی بھری پری سڑک اور بارونق بازار میں اوباش لڑکوں کی پٹائی کرنا کوئی بہادری نہیں ہے۔ اگر وہی بدمعاش سعدیہ بھابی کو کسی ویرانے میں یا سنسان سڑک پر ملیں گے تو اتنی آسانی سے مار نہیں کھائیں گے۔“

”وسیم بھائی! میں نے تو ایک آدمی کو سنسان سڑک پہ اتنا مارا تھا کہ وہ آج تک یاد کرتا ہوگا۔“

وہ عرفان کے ساتھ چلی گئی۔ عرفان اسے میری موٹر سائیکل پر بس اسٹاپ تک چھوڑنے گیا تھا۔

پھر جب تک کراچی پہنچ کر سعدیہ بھابی کا ٹیلی فون نہیں آیا، میں تشویش میں مبتلا رہا۔ عرفان تو یوں آرام سے بیٹھا تھا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ عجیب میاں بیوی تھے۔

عرفان ایک طرف تو اپنی بیوی کا دیوانہ تھا اور دوسری طرف وہ بیوی کی طرف سے اتنا بے پروا تھا۔

چاچا غلام رسول نے ایک دفعہ مجھے بتایا تھا کہ جب عرفان نیا نیا کراچی سے میرپورخاص آیا تھا تو ہر دو دن بعد کراچی چلا جاتا تھا۔ اس نے اتنی چھٹیاں کیں کہ اس کی ملازمت خطرے میں پڑ گئی تھی۔ وہ تو اللہ بھلا کرے بڑے بابو کا، انہوں نے عرفان کی بہت مدد کی، پھر ہم سب نے مل کر عرفان کو سمجھایا کہ اگر یوں ہی چھٹیاں کرو گے تو تمہاری ملازمت جاتی رہے گی۔ بڑے بابو بھی آخر کب تک تمہاری مدد کریں گے؟ اس کا حل عرفان نے یہ نکالا کہ اپنی بیوی کو ہر ہفتے میرپورخاص بلانے لگا۔ اب عرفان مہینے میں ایک دفعہ کراچی جاتا ہے اور اپنے بچوں اور ماں سے مل کر آجاتا ہے۔ واپسی میں اکثر بیوی بھی اس کے ساتھ ہوتی ہے۔

''لیکن چاچا!'' میں نے کہا۔ ''آپ نے عرفان کو سمجھایا نہیں کہ ایک جوان اور خوبصورت عورت کو یوں تنہا سفر کرنے کی اجازت دینا اچھا نہیں ہے، پھر اس کی بیوی کے جسم پر تو زیورات بھی خوب ہوتے ہیں۔''

''بہت سمجھایا تھا بیٹا!'' چاچا غلام رسول نے کہا۔ ''لیکن عرفان ہنس کر کہتا ہے کہ میری بیوی بہت نڈر ہے۔ وہ عام عورتوں سے بہت مختلف ہے۔''

واقعی سعدیہ بھابی عام عورتوں سے بہت مختلف تھیں۔ نہ جانے انہیں یہ خوش گمانی کب اور کیسے ہو گئی کہ وہ ہر قسم کے حالات کا مقابلہ کر سکتی ہیں۔ میں نے عرفان کو بارہا سمجھایا کہ سعدیہ بھابی کو اکیلے آنے سے منع کرو۔ تمہاری شادی کو آٹھ نو سال ہو چکے ہیں اور ابھی تک تم نئے نویلے دولہا بنے ہوئے ہو۔ مجھے دیکھو، میری شادی تو دو مہینے پہلے ہی ہوئی ہے مگر مجھے تو کراچی جانے کی ایسی ہڑک نہیں ہے۔

''یار میں تمہیں کیسے بتاؤں کہ سعدیہ کے بغیر میں وقت کیسے گزارتا ہوں؟ پھر سعدیہ میں اور نسرین بھابی میں بہت فرق ہے۔ میں تو کہتا ہوں تم بھی بھابی نسرین کو اکیلے سفر کرنے کی عادت ڈالو۔ ابتدا میں تو انہیں تھوڑی سی جھجک ہو گی، پھر وہ بھی سعدیہ کی طرح حالات کا مقابلہ کرنا سیکھ لیں گی۔''

خدا خدا کر کے وہ مہینا گزرا اور تنخواہ ملتے ہی میں نے دو دن کی چھٹی کی درخواست دے دی۔ عرفان تو مجھ سے پہلے ہی اپنی چھٹی منظور کرا چکا تھا۔ بڑے بابو واقعی بہت نیک دل آدمی تھے۔ انہوں نے صرف اتنا کہا۔ ''وسیم صاحب! آپ کو بھی چھٹی چاہیے؟ عرفان صاحب بھی چھٹی لے کر جا رہے ہیں۔ دو آدمی ایک ساتھ چھٹی پر چلے جائیں گے تو کام کیسے ہوگا؟''

''سر، اگر ممکن نہیں ہے تو رہنے دیں، میں عرفان صاحب کے آنے کے بعد چلا جاؤں گا۔'' میں نے بجھے دل کے ساتھ کہا۔

بڑے بابو کچھ دیر سوچتے رہے، پھر بولے۔ ''ٹھیک ہے، آپ بھی چلے جائیں لیکن تیسرے دن ہر حالت میں لوٹ آئیے گا۔ عرفان صاحب کی طرح مت کیجیے گا کہ دو دن کے چار دن بنا دیں۔''

''نہیں سر!'' میں نے جلدی سے کہا۔ ''آپ کو مجھ سے کبھی ایسی شکایت نہیں ہوگی۔''

میں گھر پہنچا تو عرفان پہلے سے تیار بیٹھا تھا۔

سہراب گوٹھ تک ہم دونوں ساتھ ہی آئے، پھر عرفان ملیر جانے کے لیے سہراب گوٹھ پر اتر گیا اور میں سیدھا نکل گیا۔

دو دن تک نہ میں نے عرفان کی خبر لی، نہ اس نے میری۔ ''اتنا وقت ہی نہیں تھا۔ میں نسرین کو سعدیہ کے بارے میں ٹیلی فون پر تفصیل سے بتا چکا تھا۔ وہ بھی اس سے ملنے کی مشتاق تھی۔

''سعدیہ بھابی کراچی ہی میں تو رہتی ہیں، کسی وقت بھی جا کر ان سے مل لینا۔''

''میں...... اکیلی......''

''سعدیہ بھابی تو میرپورخاص تک تنہا چلی جاتی ہیں اور تمہیں ملیر جاتے ہوئے ڈر لگ رہا ہے۔''

''یہ بزدلی نہیں ہے وسیم!'' نسرین نے کہا۔ ''احتیاط ہے۔ سعدیہ بھابی کو شکر ادا کرنا چاہیے کہ اب تک وہ محفوظ ہیں لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ ایک خوبصورت، تنہا عورت ہمیشہ محفوظ ہی رہے گی؟''

نسرین واقعی درست کہہ رہی تھی۔ وہ اسکول اور کالج بھی جاتی تھی تو ایک دو لڑکیاں ساتھ ہوتی تھیں یا پھر اس کے بھائی کالج چھوڑ کر آتے تھے۔

ویسے سعدیہ بھابی بہت خوش مزاج اور ہنس مکھ تھیں۔ وہ دو دن کے لیے میرپورخاص آجاتیں تو گویا گھر میں رونق سی ہو جاتی۔

انہیں دیکھ دیکھ کر اب میرا بھی دل چاہنے لگا تھا کہ نسرین بھی سعدیہ ہی کے ساتھ میرپورخاص آجائے لیکن

اماں نے سختی سے منع کردیا۔

سعدیہ بھابی پہلے تو بسوں سے آتی تھیں پھر وہ حیدر آباد سے میرپور خاص تک ٹیکسی میں آنے لگیں۔ وہ کہتی تھیں کہ بس والا حیدر آباد پہ رکتا ہے تو پھر چلنے کا نام نہیں لیتا۔ فضول میں ایک ڈیڑھ گھنٹا ضائع ہو جاتا ہے۔ میں بھی کبھار نسرین کو بھی اپنے ساتھ میرپور خاص لے آتا تھا۔ عرفان اسے بھی سمجھاتا تھا کہ تم بھی ذرا ہمت کرو۔ تم میاں بیوی دونوں ہی بزدل ہو۔ میاں صاحب یہاں اکیلے پڑے سڑتے رہتے ہیں اور کراچی جانے کے لیے انگلیوں پہ دن گنتے رہتے ہیں۔

اس کی باتوں سے نسرین بھی اکیلے میرپور خاص آنے پر تیار ہو گئی اور مجھ سے ضد کرنے لگی کہ اگلے ہفتے میں بھی اکیلی یہاں آؤں گی۔ بس آپ اماں کو سمجھا دیجیے گا۔ آخر ہرج ہی کیا ہے؟"

میں نے جھنجلا کر کہا۔ "نسرین، تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟ عرفان نے تمہیں پٹی پڑھا دی اور تم تیار ہو گئیں۔ آج کل کے حالات دیکھ رہی ہو، موت سڑکوں پہ ناچ رہی ہے، ڈاکو اور لٹیرے دن رات گھروں میں گھس رہے ہیں۔"

کراچی کے حالات ان دنوں ایسے ہی تھے۔ ان ہی دنوں علیگڑھ کالونی اور قصبہ کالونی کا سانحہ ہوا تھا۔ یوں بھی کراچی ان دنوں میں تعصب کی آگ میں جل رہا تھا اور جس حریف کا داؤ لگتا، وہ وہیں دو چار لوگوں کو گولیوں سے چھلنی کر دیتا۔

"لیکن سعدیہ بھابی تو......"

"سعدیہ بھابی نہ جانے کس خوش گمانی میں مبتلا ہیں۔ اگر وہ کسی خطرے سے دوچار نہیں ہوئی ہیں تو یہ ان کی خوش قسمتی ہے۔ خدانخواستہ بری گھڑی آ گئی تو وہ کیا بہادری دکھائیں گی؟"

سعدیہ منہ بنا کر رہ گئی۔

وقت اسی طرح گزرتا رہا اور سعدیہ بھابی اسی طرح آتی رہیں۔ کبھی کبھی تو میں بھی یہ سوچنے لگتا تھا کہ میں ناحق تنہائی کا عذاب جھیل رہا ہوں۔ آخر نسرین کو میرپور خاص بلانے میں ہرج ہی کیا ہے۔ اتنے عرصے سے سعدیہ بھابی بس اور ٹیکسی کے ذریعے یہاں آ رہی ہیں۔ اب تک تو انہیں کوئی خطرہ پیش نہیں آیا لیکن پھر اماں کے بارے میں سوچ کر خاموش ہو جاتا۔

ان ہی دنوں عرفان کی شادی کی سالگرہ آ گئی۔

عرفان ان دنوں کچھ زیادہ ہی خوش تھا۔ میں اس کا شوق اور وارفتگی دیکھ دیکھ کر حیران ہوتا رہتا تھا۔ وہ سالگرہ کی تیاریاں یوں کر رہا تھا جیسے شادی کی پہلی سالگرہ ہو۔

جانے سے کئی دن پہلے اس نے مجھے بتایا۔ "وسیم میں نے سالگرہ کے لیے دو ہزار روپے بچا رکھے ہیں۔"

ان دنوں دو ہزار تو ہمارے پورے مہینے کی تنخواہ ہوتی تھی۔

"میں سالگرہ والے دن کراچی جاؤں گا، پھر سعدیہ کے ساتھ جا کر اس کی پسند کا تحفہ خریدوں گا۔ پھر ہم کلفٹن کے ایک اعلیٰ ریسٹورنٹ میں سالگرہ کا کیک کاٹیں گے اور بہترین قسم کا ڈنر کریں گے۔ اس کے بعد کوئی اچھی سی انگلش فلم دیکھیں گے۔"

"یار، کیوں مجھے للچا رہے ہو؟" میں نے ہنس کر کہا۔ "شادی کی سالگرہ تو اگلے ماہ میری بھی ہے۔ وہ بھی پہلی سالگرہ! میں نے تو اس بارے میں سوچا ہی نہیں۔ نہ کوئی رقم پس انداز کی۔"

"ارے فکر کیوں کرتے ہو یار!" عرفان ہنس کر بولا۔ "پانچ سات سو روپے تو میرے پاس بھی نکل آئیں گے۔ کچھ پیسے چاچا غلام رسول سے قرض لے لینا۔"

چاچا غلام رسول چھڑا چھانٹ آدمی تھا۔ اس کا اپنا کوئی خاص خرچہ بھی نہیں تھا۔ وہ اپنی تنخواہ کا زیادہ حصہ ڈاک خانے میں جمع کرا دیتا تھا۔ پھر وقتِ ضرورت لوگوں کو کھلے دل سے قرض دے دیا کرتا تھا۔

"نہیں یار۔" میں نے کہا۔ "اس طرح تو میں مقروض ہو جاؤں گا اور میرے ذہن پہ ایک بوجھ رہے گا۔ کچھ نہ کچھ پیسے تو اماں کے پاس بھی ہوں گے، کچھ نسرین نے بھی پس انداز کیے ہوں گے۔ ہم بھی سالگرہ منا ہی لیں گے۔"

سالگرہ سے دو دن پہلے عرفان کو معلوم ہوا کہ اسے فی الحال چھٹی نہیں مل سکتی بلکہ آئندہ ایک ہفتے تک نہیں مل سکتی۔

میں نے ایک ہفتہ پہلے ہی چھٹی کی درخواست دی تھی جو منظور ہو چکی تھی۔

"وسیم اگر تم چھٹی پر نہ جاؤ تو مجھے چھٹی مل سکتی ہے۔" عرفان نے خوشامدانہ انداز میں کہا۔

"یار، اگر یہ بات ہے تو ابھی میرے ساتھ بڑے بابو کے پاس چلو۔ میں اپنی چھٹی کینسل کرا دیتا ہوں۔"

عرفان خوش ہو گیا۔ ہم دونوں بڑے بابو کے پاس

پہنچ گئے۔

"جی وسیم صاحب، کیسے آنا ہوا؟ عرفان صاحب؟ آپ خیریت سے ہیں؟"

"سر میں چاہتا ہوں کہ آپ میری چھٹی کینسل کر دیں۔" میں نے کہا۔

"کیوں بھئی کیا بیگم سے لڑائی ہو گئی؟" انہوں نے ہنس کر پوچھا۔

"سر، ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ اصل میں عرفان صاحب کا جانا بہت ضروری ہے۔ آپ میرے بجائے انہیں چھٹی دے دیں۔"

"وسیم صاحب آپ نے یہ کیسے سمجھ لیا کہ آپ کے جانے کی وجہ سے عرفان صاحب کو چھٹی نہیں مل رہی ہے؟ یہ گزشتہ چھ ماہ میں اتنی چھٹیاں کر چکے ہیں کہ انہیں فوری طور پر چھٹی نہیں مل سکتی۔ میں تو شاید اپنی ذمے داری پر چھٹی دے بھی دیتا لیکن بات اب بڑے صاحب تک پہنچ گئی ہے۔ انہوں نے عرفان صاحب کی چھٹی کی درخواست مسترد کر دی ہے۔ اب بتائیے میں انہیں کیسے چھٹی دے دوں؟"

بڑے صاحب بہت بااصول اور مزاج کے بہت سخت تھے۔ جب چھٹی انہوں نے مسترد کر دی تھی تو اب عرفان کے جانے کا سوال بھی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ وہ صرف ایک صورت ہی جا سکتا تھا کہ ملازمت سے استعفیٰ دے دے۔

میں جب کراچی کے لیے نکل رہا تھا تو عرفان نے مجھ سے کہا۔ "وسیم! تم سعدیہ سے کہنا کہ عرفان کو چھٹی نہیں مل سکتی۔ وہ خود میرپور خاص آ جائے بلکہ تم سعدیہ کو اپنے ساتھ ہی یہاں لے آنا اور ہو سکے تو بھابی نسرین کو بھی لانے کی کوشش کرنا۔ ہم یہیں شادی کی سالگرہ کا جشن منا لیں گے۔"

میں کراچی پہنچنے کے بعد اسی دن ملیر جا کر سعدیہ بھابی سے ملا، انہیں عرفان کا پیغام دیا اور ان سے کہا۔ "بھابی، آپ پرسوں تیار رہیے گا۔ میں پرسوں میرپور خاص واپس جاؤں گا۔ اس دن تو آپ کی شادی کی سالگرہ بھی ہے۔ میں نسرین کو بھی ساتھ لے لوں گا۔"

سعدیہ بھابی نے گھور کر مجھے دیکھا اور بولیں۔ "میں تو وہاں نہیں جا رہی، عرفان نے مجھ سے کراچی آنے کا وعدہ کیا تھا تو اسے پورا بھی کریں۔"

"بھابی! آپ کو دفتری معاملات کا علم نہیں ہے۔ عرفان نے تو چھٹی کی بہت کوشش کی لیکن اسے چھٹی نہیں ملی۔ آپ کیا چاہتی ہیں، عرفان ملازمت چھوڑ کر یہاں آ جائے؟"

"میں کچھ نہیں جانتی۔" سعدیہ بھابی نے سرد لہجے میں کہا۔ "بس میں وہاں نہیں جاؤں گی۔"

میں وہاں سے واپس آ گیا۔ مجھے سعدیہ بھابی کے رویے پر حیرت بھی تھی۔ وہ اچھی خاصی سمجھدار خاتون ہو کر ایسی باتیں کر رہی تھیں۔

جب انہوں نے جانے سے انکار کر دیا تو میں نے نسرین کو لے جانے کا ارادہ بھی ملتوی کر دیا کہ وہ اکیلی وہاں جا کر کیا کرے گی؟ پھر مجھے جمعے سے پہلے چھٹی نہیں مل سکتی تھی۔ نسرین اتنے دن وہاں کیسے رہے گی، پھر یہاں اماں بھی اکیلی ہوں گی۔

میں نے نسرین سے اس بات کا ذکر بھی نہیں کیا ورنہ وہ میرے ساتھ جانے کی ضد کرتی۔ میں دو دن کی چھٹی گزار کر میرپور خاص واپس آ گیا۔

میں نے عرفان کو سعدیہ بھابی کے نہ آنے کے بارے میں بتایا تو وہ بہت افسردہ ہو گیا۔ اسے سعدیہ بھابی سے ایسی امید نہیں تھی۔ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ "یار وسیم! شادی کے اتنے برس گزرنے کے بعد پہلی دفعہ ایسا ہوا ہے کہ سعدیہ مجھ سے ناراض ہو گئی ہے۔ میں کوشش کرتا ہوں کہ مجھے صرف آج ہی کی چھٹی مل جائے۔ میں کراچی جا کر سعدیہ سے ملنے کے بعد فوراً ہی واپس آ جاؤں گا لیکن اسے چھٹی نہ ملی۔

وہ اس دن غیر شعوری طور پر سعدیہ کا انتظار کرتا رہا۔ ہر آہٹ پر وہ چونک اٹھتا۔ دروازے کے قریب کوئی گاڑی یا تانگا رکتا تو وہ بے تاب ہو کر دروازے کی طرف لپکتا لیکن سعدیہ بھابی نہ آئیں۔

جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا، عرفان کی بے چینی اور بے قراری میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑا رہا تھا۔ "سعدیہ! تم اتنی سی بات پہ مجھ سے روٹھ گئیں۔ تمہیں ایک لمحے کو بھی میری مجبوری کا خیال نہیں آیا۔" پھر وہ مجھ سے بولا۔ "وسیم! میں ابھی اور اسی وقت کراچی جا رہا ہوں۔ بڑے بابو یا کوئی اور پوچھے تو بتا دینا کہ عرفان بہت ایمرجنسی میں کراچی گیا ہے، اب ملازمت رہے یا جائے۔"

"کیسی پاگل پن کی باتیں کر رہے ہو یار! سرکاری ملازمت ہے اور اب تم خاصے سینئر بھی ہو چکے ہو۔ تم اچھی

طرح جانتے ہو کہ سرکاری ملازمت کتنی مشکل سے ملتی ہے۔ پھر تمہیں فوراً ہی کوئی دوسری ملازمت تو ملنے سے رہی۔ اس صورت میں تم بھابی کو کیا خاک خوش رکھو گے؟"

"یار، تو پھر میں کیا کروں؟" عرفان نے جھنجلا کر کہا۔

"صبر کرو اور آنے والے وقت کا انتظار کرو۔ سالگرہ کا جشن تم ایک ہفتہ بعد بھی منا سکتے ہو۔"

"لیکن سعدیہ تو مجھ سے ناراض ہو گئی نا!" اس نے خود کلامی کے انداز میں کہا۔ "کوئی بات نہیں، میں اس مرتبہ پورے ایک ہفتے کی چھٹی لے کر جاؤں گا اور اسے منالوں گا۔ پھر ہم خوب سیر و تفریح کریں گے۔" ایسا لگ رہا تھا جیسے عرفان خود اپنے آپ کو تسلی دے رہا ہو۔

بعد میں معلوم ہوا کہ سعدیہ بھابی نے بھی شادی کی سالگرہ کا خصوصی اہتمام کیا تھا۔ انہوں نے اس موقع کے لیے انتہائی خوب صورت اور قیمتی جوڑا بنایا تھا۔ وہ کھاتے پیتے گھر کی تھیں اس لیے میکے والے بھی فراخ دلی سے انہیں پیسے دیا کرتے تھے۔ انہوں نے ٹیلی فون پر نسرین کو اپنی تیاریوں کے بارے میں بھی بتایا تھا۔ عرفان کی والدہ نے بتایا کہ سعدیہ اس دن عرفان کے نہ آنے سے بہت غصے میں تھی، پھر آپ ہی آپ مسکرانے لگی اور بولی۔ "امی! میں اچانک میر پور خاص جا کر عرفان کو سرپرائز دوں گی۔"

سعدیہ بھابی بج دھج کر اور ہمیشہ سے زیادہ زیور پہن کر میر پور خاص جانے کو نکلیں تو عرفان کی والدہ خوفزدہ ہو گئیں اور بولیں۔ "سعدیہ بیٹی ایسا کرو کہ تم اپنے زیورات اور یہ قیمتی کپڑے اپنے بیگ میں رکھ لو۔ وہیں جا کر پہن لینا۔ بیٹا حالات بہت خراب ہیں۔ کراچی میں تو ویسے ہی ہنگامے ہو رہے ہیں۔ تم اتنی بج دھج کر جاؤ گی ہر کسی کی نظر تم پر پڑے گی۔ خدانخواستہ کچھ ہو نہ جائے۔ بری گھڑی پوچھ کر نہیں آتی۔"

سعدیہ بھابی ان کی بات پہ بھڑک اٹھیں اور ناراض ہو کر اپنی ساس سے بولیں۔ "امی! آج تک تو کسی کی ہمت نہیں ہوئی کہ مجھے کچھ کہے۔ میں کوئی بزدل عورت نہیں ہوں۔ مجھے کسی سے ڈر نہیں لگتا ہے اور نہ مجھے کسی کی پروا ہے۔" یہ کہہ کر وہ گھر سے نکل کر رکشا میں بیٹھ گئیں۔

تھوڑی دیر بعد وہ بچوں کو اسکول سے لے کر آئیں، پھر اسی رکشا میں حیدر آباد جانے والی بس کے اسٹاپ کی طرف جانے لگیں تو ان کی ساس نے انہیں پھر آواز دی لیکن وہ اس طرف دیکھے بغیر چلی گئیں۔

عرفان کو پورے ہفتے چھٹی نہیں مل سکی۔ اس کے بچے اور ماں یہی سمجھتے رہے کہ سعدیہ بھابی، عرفان کے پاس ہیں کیونکہ وہ اکثر اسی طرح آجاتی تھیں۔

اس دوران میں عرفان نے کئی دفعہ گھر ٹیلی فون کرنے کی کوشش کی لیکن اس کے گھر کا ٹیلی فون غالباً خراب تھا۔

اس نے بھنا کر کہا۔ "یار، عجیب ستم ظریفی ہے۔ میں ٹیلی فون ڈپارٹمنٹ میں ہوں اور میرے ہی گھر کا ٹیلی فون خراب ہے!"

"او بھائی مجنوں!" میں نے ہنس کر کہا۔ "بات اس میں یہ ہے کہ تم ہر بات کچھ زیادہ ہی محسوس کرنے لگتے ہو۔ میرا اور تمہارا ٹیلی فون اکثر خراب ہو جاتا ہے۔ اس میں اتنے جھنجلانے کی کیا بات ہے۔"

چھٹی نہ ملنے کی وجہ سے عرفان شدید پریشان اور اضطراب میں تھا۔ وہ نہ ٹھیک طرح کھا رہا تھا، نہ پی رہا تھا۔ غم سے اس کا برا حال تھا۔ وہ بار بار یہی کہتا تھا۔ "سعدیہ بغیر کسی وجہ کے رک ہی نہیں سکتی۔ آخر ایسی کیا بات ہوئی کہ وہ مجھ سے اتنی شدید ناراض ہو گئی۔ پھر خود کلامی کے انداز میں کہتا۔ "میں بھی ایک دفعہ کراچی پہنچ جاؤں، پھر میں اسے منالوں گا۔ منالوں گا اسے۔"

خدا خدا کر کے جمعرات کا دن آیا۔ ہم دونوں میر پور خاص سے ساتھ ہی نکلے۔

کراچی پہنچنے تک عرفان پر شدید ہیجانی کیفیت طاری رہی۔ ہم کراچی پہنچے تو میں حسب معمول سہراب گوٹھ پر اترنے لگا۔ عرفان نے مجھے روک لیا اور بولا۔ "وسیم! پلیز تم میرے ساتھ چلو۔ اگر سعدیہ کچھ زیادہ ناراض ہوئی تو تم کم از کم میری مجبوری کی گواہی تو دے سکو گے۔ پھر تمہاری موجودگی میں وہ زیادہ غصہ بھی نہیں کرے گی۔"

"یار، تم عجیب احمق آدمی ہو۔" میں نے جھنجلا کر کہا۔ "اللہ کے بندے، تم گھر جا کر سعدیہ بھابی کو مناؤ۔ وہ مان جائیں گی۔ میری گواہی کی ضرورت نہیں ہے۔ کیا وہ تم پر اعتبار نہیں کرتی ہیں۔ میں تمہاری طرح واویلا نہیں مچاتا لیکن کیا مجھے اپنی بیوی یاد نہیں آتی۔ مجھے بھی گھر جانے کی اتنی ہی جلدی ہے، مجھے بھی نسرین سے اتنی ہی محبت ہے جتنی تمہیں سعدیہ بھابی سے ہے۔"

عرفان نے میری ایک نہ سنی اور زبردستی مجھے اپنے

ساتھ گھر لے گیا۔

عرفان کی امی اس وقت کچن میں تھیں، عرفان کے بچے بھی نظر نہیں آرہے تھے۔ وہ شاید پڑوس میں ہیں یا ان کے ماموں آکر انہیں لے گئے تھے۔ وہ لوگ ہر جمعرات کو نانی کے گھر جایا کرتے تھے۔

عرفان نے پہلے کچن میں جھانکا۔ ماں سے سلام دعا کی۔

اتنے عرصے میں، میں بھی ان کے گھر کے ایک فرد کی طرح ہو گیا تھا۔ میں عرفان کی امی کو خالہ کہتا تھا۔

مجھے دیکھ کر وہ کچن سے نکل آئیں اور حال چال پوچھنے لگیں۔

اس دوران میں عرفان نے پورے گھر میں چکر لگا لیا۔ جب سعدیہ بھابی اسے نظر نہ آئیں تو وہ ماں سے بولا۔ "امی! یہ سعدیہ کہاں ہے؟ نظر نہیں آرہی۔"

خالہ مجھ سے باتوں میں مصروف تھیں۔ بے دھیانی میں بولیں۔ "ابھی تو مجھے بھی نظر نہیں آئی۔ آتے ہی اپنے کمرے میں گھس گئی ہوگی۔"

"اور بچے؟" عرفان نے پوچھا۔ "وہ کہاں ہیں؟"

"بچے پڑوس میں ہیں۔ بس اب آتے ہی ہوں گے۔" پھر آہستہ سے بولیں۔ "بیٹا عرفان! برا مت ماننا۔ اب میری بوڑھی ہڈیوں میں اتنا دم نہیں رہا کہ میں گھر کے سارے کام بھی کروں اور بچوں کو بھی سنبھالوں۔ بچے بھی اتنے شرارتی ہو گئے ہیں کہ ایک لمحہ نچلا نہیں بیٹھتے۔ دن بھر مجھے دوڑاتے ہیں۔ انہیں تو ایک دن کے لیے بھی سنبھالنا مشکل ہے۔ ہفتہ بھر میں تو میں ہلکان ہو جاتی ہوں۔"

عرفان نے سر ہلایا اور میری طرف دیکھ کر بولا۔ "یار وسیم! میں نہ کہتا تھا کہ کوئی خاص بات ضرور ہے۔ امی ہی نے سعدیہ کو جانے سے روکا ہوگا۔" پھر وہ ماں سے لپٹ گیا اور بولا۔

"میری پیاری امی! آخر کو بن گئیں نا ساس! کہاں ہے سعدیہ، میں اسے سمجھاتا ہوں۔ وہ میری بات ضرور سمجھ جائے گی۔ میں ابھی اسے لے کر آتا ہوں۔" یہ کہہ کر عرفان کمرے میں گھس گیا۔

خالہ کچھ نہ سمجھنے والے انداز میں کبھی مجھے دیکھ رہی تھیں اور کبھی سعدیہ بھابی کے کمرے کی طرف۔

اسی وقت عرفان کے دونوں بچے آگئے۔ ہمارے سامان پر نظر پڑی تو وہ خوشی سے چلّائے۔ "امی آگئیں۔ امی آگئیں۔"

بچوں کی آواز سن کر عرفان جلدی سے کمرے سے باہر نکلا اور بولا۔

"کہاں آ گئیں بیٹا! کہاں ہیں امی؟"

دونوں بچے دوڑ کر عرفان سے لپٹ گئے اور بولے۔ "ابو امی کہاں ہیں؟"

"یار، تمہاری امی کو...... ہم بھی ڈھونڈ رہے ہیں۔" عرفان نے بچوں کو پیار کرتے ہوئے کہا۔

خالہ نے جھلا کر کہا۔ "ارے عرفان یہ لڑکی آتے ہی کہاں چلی گئی؟ ایسی بے مروت ہے، اب تک مجھ سے بھی نہیں ملی۔"

خالہ کی یہ بات سن کر میں بری طرح چونک اٹھا اور بولا۔ "خالہ کہاں سے آئی ہیں؟" میرا دل کسی انجانے خوف سے بری طرح دھڑک رہا تھا۔

"ارے بیٹا، میر پور خاص سے اور کہاں سے؟" خالہ نے جھنجلا کر کہا۔ "ہفتہ بھر وہاں رہ کر آئی ہے اور آتے ہی نہ جانے کہاں کونوں کھدروں میں گھس گئی؟" پھر وہ چونک کر بولیں۔ "سعدیہ کہیں باتھ روم میں نہ ہو، تم لوگ بس سے آئے ہو گے نا! بس کے سفر میں تو...... دھول مٹی میں اٹ جاتے ہیں۔ سعدیہ کو تو صفائی کا جنون ہے۔ آتے ہی باتھ روم میں گھس گئی ہوگی۔ ہاتھ منہ دھو رہی ہوگی۔" خالہ نے قدرے ناگواری سے کہا۔

"ہم ان سے نہیں بولیں گے۔ امی خود تو ایک ہفتے تک آپ کے پاس رہیں اور ہمیں یہیں چھوڑ گئیں۔ کہہ رہی تھیں میں پرسوں تک آ جاؤں گی۔" بچے عرفان سے لپٹے لپٹے بولے۔

"خالہ...... آپ کا مطلب ہے...... یعنی...... آپ کا خیال ہے کہ سعدیہ بھابی ہمارے ساتھ آئی ہیں؟" میں اپنے خدشے کا اظہار نہیں کر پا رہا تھا۔

"لو بھلا اس میں خیال کی کیا بات ہے؟" خالہ جھنجلا کر بولیں۔ "بس عرفان، بہت ہو چکا ڈراما، اب جلدی سے سعدیہ کو بلاؤ۔ تم نے سوچا ہوگا کہ چھپ کر ذرا ان کو پریشان کریں گے۔"

عرفان نے آہستگی سے بچوں کو خود سے علیحدہ کیا اور بہ غور خالہ کا چہرہ دیکھنے لگا۔ وہ یقین اور بے یقینی کی عجیب کیفیت میں مبتلا تھا۔ اس کے چہرے پر شدید پریشانی کے تاثرات تھے۔ اس نے بوکھلا کر کہا۔ "امی! کیا مطلب ہے آپ کا؟ سعدیہ گھر میں نہیں ہے یا اس نے خود آپ کو ایسا سنگین مذاق کرنے کو کہا ہے کہ مجھے اس طرح پریشان کیا جائے؟"

امی نے پہلے میری طرف دیکھا، پھر عرفان کی طرف اور چیخ کر بولیں۔ "کیا کہہ رہے ہو بیٹا! سعدیہ تمہارے ساتھ واپس نہیں آئی، ہفتہ بھر سے تو سعدیہ تمہارے پاس میر پور خاص گئی ہوئی ہے۔"

عرفان کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔ اس نے بوکھلا کر کہا۔ "امی! وہ تو میر پور خاص نہیں پہنچی؟"

"کیا؟" خالہ نے بدحواس ہو کر کہا۔ "وہ تو ایک ہفتہ پہلے یہاں سے میر پور خاص کے لیے نکلی تھی۔"

"ہاں ابو!" بڑے بچے نے کہا۔ اس کی عمر سات سال تھی۔ "وہ ہمیں رکشے میں اسکول سے لے کر گھر آ گئیں، پھر اسی رکشے میں ہی اسٹاپ کی طرف چلی گئیں۔"

یہ سن کر عرفان کی حالت غیر ہو گئی۔ وہ کھڑے قد سے فرش پر دھڑام سے گرا اور بے ہوش ہو گیا۔ خود میری حالت بھی غیر ہو رہی تھی اور زمین پیروں تلے کھسکتی معلوم ہو رہی تھی۔

"بیٹا! آپ نے اس رکشے کا نمبر نوٹ کیا تھا؟ ڈرائیور کی شکل یاد ہے، اسے پہچان لیں گے؟" میں نے بچے سے پوچھا۔

بچے نے نفی میں سر ہلایا اور بولا۔ "انکل! نمبر تو مجھے یاد نہیں، نہ میں نوٹ کیا تھا۔ ڈرائیور نے بھی سردی کی وجہ سے منہ پر مفلر لپیٹ رکھا تھا۔"

آناً فاناً یہ خبر جنگل کی آگ کی طرح ہر طرف پھیل گئی کہ سعدیہ کو کسی نے اغوا کر لیا۔ جو یہ خبر سنتا تھا، افسوس کرتا تھا۔ کچھ لوگوں نے دبے لفظوں میں اور کچھ نے بلند آواز سے کہا کہ سعدیہ کو اتنا زیور پہن کر اور بن ٹھن کر باہر نکلنے کی اجازت ہی کیوں دی گئی؟ آج کل تو سب کی موجودگی میں بیٹیاں چھین لی جاتی ہیں، گھروں سے اٹھالی جاتی ہیں تو پھر ایک اکیلی لڑکی کیسے محفوظ رہ سکتی ہے؟

یہ خبر سن کر سعدیہ بھابی کے والد اور بھائی بھی آ پہنچے۔ سعدیہ کے والد نے آتے ہی عرفان سے کہا۔ "اگر سعدیہ وہاں نہیں پہنچی تھی تو تم کم از کم ٹیلی فون ہی کر لیتے۔"

"پاپا! میں نے تو بہت کوشش کی لیکن گھر کا تو ٹیلی فون ہی ڈیڈ پڑا ہے۔"

"گھر کا ٹیلی فون ڈیڈ ہے تو کیا ہوا ہمارا ٹیلی فون تو ٹھیک ہے۔" سعدیہ کے والد نے افسردہ لہجے میں کہا۔

"پاپا! دراصل میرا خیال تھا کہ سعدیہ میرے نہ آنے سے ناراض ہو گئی ہے۔ میں تو یہ سوچ کر رہ گیا کہ کراچی جا کر اس کی ناراضی دور کر دوں گا۔"

وہ لوگ خاصے اثر رسوخ والے تھے، پھر ان کا ایک بھتیجا کرائم برانچ میں ایس ایس پی تھا۔ سعدیہ کے والد نے اسی وقت اس سے رابطہ کیا۔ یہ خبر سن کر وہ بھی دوڑا چلا آیا۔

ایس ایس پی نے بھی بچوں سے وہی سوالات کیے جو اس سے پہلے میں کر چکا تھا۔ ان سے مایوس ہو کر اس نے اپنے ماتحتوں سے کہا کہ تم میں سے ایک آدمی رکشا ڈرائیور کو تلاش کرنے کی کوشش کرے، ایک آدمی بسوں کے اڈے پر جا کر معلومات حاصل کرے اور ایک آدمی کراچی کے مختلف اسپتالوں میں سعدیہ کو تلاش کرے۔ ممکن ہے اس کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آ گیا ہو اور وہ اسپتال میں ہو۔ اس کے ساتھ ہی اس نے وائرلیس پر کراچی کے ہر تھانے کو سعدیہ کے بارے میں الرٹ کر دیا۔

عرفان اپنے طور پہ بھی سعدیہ کو تلاش کر رہا تھا۔ وہ اس کا حلیہ بتا کر اس علاقے میں چلنے والے رکشا ڈرائیوروں سے یہ معلوم کرنے کی کوشش کر رہا تھا کہ انہوں نے اس حلیے کی لڑکی کو دیکھا ہے؟

اسے ہر طرف سے جواب نفی میں مل رہا تھا۔ ایس ایس پی کی بھی ساری کوششیں رائگاں گئیں اور سعدیہ کا کہیں سراغ نہ ملا۔

عام آدمی تو یہی سمجھتا کہ پولیس والے اس کیس میں دلچسپی نہیں لے رہے اور ٹال مٹول سے کام لے رہے ہیں لیکن وہ تو سعدیہ کا چچازاد تھا، اپنی سی ہر ممکن کوشش کر رہا تھا۔

کراچی سے مایوس ہو کر اس نے ایک پولیس پارٹی حیدرآباد اور میر پور خاص بھیجی کہ ممکن ہے وہاں سے سعدیہ کا کوئی سراغ مل جائے لیکن ایسا لگتا تھا کہ سعدیہ کو زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا۔ ایس ایس پی امجد نے کنوؤں میں بانس ڈلوا دیے لیکن سعدیہ کا کوئی سراغ نہ ملا۔

اس نے کراچی کے مختلف علاقوں کے جرائم پیشہ افراد کو بلا کر ان سے بھی پوچھ گچھ کی لیکن کسی کو کچھ معلوم نہیں تھا۔ اس نے شہر بھر کے رکشا ڈرائیوروں کی شناخت پریڈ کرائی، اسکول کے چوکی دار اور اردگرد کے ان دکانداروں سے پوچھ گچھ کی جہاں سے سعدیہ نے رکشا لیا تھا، کراچی کے ہر چھوٹے بڑے اسپتال کا ریکارڈ چیک کیا کہ ممکن ہے حادثے میں سعدیہ کو کوئی دماغی چوٹ آئی ہو اور وہ بے ہوش ہو۔ امجد نے تو اسپتالوں کے مردہ خانے تک کھنگال ڈالے لیکن سعدیہ کو نہ ملنا تھا، نہ ملی۔

جب عرفان کو یہ یقین آ گیا کہ سعدیہ اب نہیں مل سکتی تو وہ بالکل ہی ٹوٹ کر رہ گیا۔

مجھے رہ رہ کر خیال آتا تھا کہ کہیں سعدیہ کسی اغوا کرنے والے کی قید میں نہ ہو۔ وہ بہت حسین عورت تھی اور اسے دیکھ کر کسی کا بھی دل آ سکتا تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ کسی پیشہ ور گروہ نے سعدیہ کو اغوا کیا ہو، زیورات کے ساتھ ساتھ اس کی عزت بھی پامال کی ہو اور پھر اسے خلیج کی کسی ریاست میں مہنگے داموں بیچ دیا ہو، انسانی اسمگلنگ اور خرید و فروخت کا کاروبار تو آج کل عروج پر ہے۔

آخر ہم بھی تھک ہار کر بیٹھ گئے۔

عرفان تو نیم پاگل ہو رہا تھا۔ وہ تو اپنے حواس ہی میں نہیں تھا۔ نہ کھاتا تھا، نہ بات کرتا۔ جس دن سے سعدیہ کے گم ہونے کی اطلاع ملی تھی، اس نے کپڑے تک تبدیل نہیں کیے تھے، اس کا شیو بڑھ گیا تھا، بال بکھرے بکھرے رہتے تھے اور چہرے پر عجیب طرح کی وحشت رہتی تھی۔

وہ رہ رہ کر سعدیہ کو پکارتا تھا اور کہتا تھا۔ "یہ میری ہی غلطی تھی، ہر شخص نے مجھے سمجھایا لیکن میری سمجھ میں نہ آیا۔ میں تو سعدیہ کو بہادر سمجھتا تھا لیکن وسیم ٹھیک ہی کہتا تھا کہ یہ بہادری نہیں بلکہ حماقت ہے۔ کاش...... کاش میں وسیم ہی کی بات مان لیتا۔ کاش!" وہ بار بار اپنا سر پیٹتا تھا۔

میں نے عرفان کی طرف سے بیماری کی درخواست لکھ کر آفس میں دے دی اور خود ڈیوٹی پر چلا گیا۔ اس سانحے کی وجہ سے مجھے بھی دس دن کی چھٹی کرنا پڑی تھی۔

میں ایک ہفتے بعد کراچی آیا تو سب سے پہلے عرفان سے ملنے چلا گیا۔ اس کے چہرے پر پہلی سی وحشت تو نہیں تھی لیکن ذہنی حالت درست نہیں تھی۔ البتہ اس کے جسم پر صاف ستھرا لباس تھا اور سر کے بال بھی پہلے کی طرح الجھے الجھے اور میلے نہیں تھے۔

مجھے دیکھ کر وہ جلدی سے بولا۔ "کیا ہوا وسیم کیا سعدیہ ملی؟" میری خاموشی پر خود ہی بولا۔ "ابھی تک نہیں ملی۔ سعدیہ نے تو مجھے نہ آنے کی بہت کڑی سزا دی ہے یار! اس سے کہنا کہ اب تو اپنی ناراضی ختم کر دے...... اب تو مجھے معاف کر دے۔"

"عرفان!" میں نے اس کا شانہ تھپکتے ہوئے کہا۔ "تم اپنا نہیں تو کچھ بچوں ہی کا خیال کر لو۔ بچوں نے اپنی ماں کو تو گنوا دیا ہے، کیا تم بھی ان سے دور

ہو جاؤ گے؟"

"نہیں...... نہیں نہیں یار، بچے تو میری سعدیہ کی نشانی ہیں۔" پھر وہ معصومیت سے بولا۔ "یار، کم سے کم اس کی ڈیڈ باڈی ہی مل جاتی تو مجھے صبر آجاتا۔ اب تو میں عجیب کشمکش میں مبتلا ہوں کہ نہ جانے سعدیہ زندہ بھی ہے یا نہیں۔"

اچانک سعدیہ کا چچازاد اولیس ایس پی ... گھر میں داخل ہوا اور بولا۔ "عرفان بھائی آپ ذرا میرے ساتھ چلیے۔"

"کہاں؟" عرفان نے الجھ کر پوچھا۔

"آپ چلیے تو سہی۔" امجد نے کہا اس کے چہرے پر گہری افسردگی کے تاثرات تھے۔

"وسیم، تم بھی ہمارے ساتھ چلو۔" عرفان نے بچوں کی طرح کہا۔

"ہاں وسیم صاحب!" امجد نے کہا۔ "آپ بھی ساتھ چلیں تو بہتر ہے۔"

"امجد صاحب خیریت تو ہے، آپ عرفان کو کہاں لے جا رہے ہیں؟"

"ہمیں حیدر آباد اور میر پور خاص کے درمیان گھنی جھاڑیوں سے بوری میں بند ایک جلی ہوئی لاش ملی ہے۔ لاش کا چہرہ بری طرح مسخ ہو چکا ہے، جسم پر موجود لباس بھی جل چکا ہے، شناخت کا کوئی ذریعہ نہیں ممکن ہے عرفان بھائی اس لاش کو شناخت کرلیں۔"

آپ کا مطلب ہے کہ وہ لاش......"

"ہاں...... میرا یہی مطلب ہے کہ وہ لاش سعدیہ کی بھی ہو سکتی ہے۔"

"نہیں، وہ لاش سعدیہ کی نہیں ہوگی۔" عرفان ہذیانی انداز میں بولا۔

دو گھنٹے بعد ہم حیدر آباد پہنچ گئے۔ پولیس لاش کو حیدر آباد کے پولیس اسٹیشن میں لے آئی تھی۔

ہم نے لاش کو بہت غور سے دیکھا لیکن وہ تو جل کر بالکل بھسم ہو چکی تھی۔ سعدیہ بھابی کی انگلی میں ہمیشہ سونے کی ایک انگوٹھی رہتی تھی لیکن لاش کی انگلی میں وہ انگوٹھی بھی نہیں تھی۔ بھلا اغوا کرنے والے اس سونے کی انگوٹھی کو کیوں چھوڑتے۔

اچانک عرفان چیخا۔ "امجد اس کے دانتوں میں کچھ ہے۔"

میں نے بھی غور سے دیکھا۔ واقعی اس سوختہ ڈھانچے کے منہ میں کچھ تھا۔ تھوڑی کوشش کے بعد امجد نے وہ چیز اس کے منہ سے نکال لی۔ وہ کپڑے کا ایک ٹکڑا تھا جو لاش کے منہ میں ہونے کی وجہ سے جلنے سے محفوظ رہا تھا۔

عرفان کپڑے کا وہ ٹکڑا لے کر بھاگا بھاگا گھر آیا اور خالہ سے بولا۔ "امی! کیا سعدیہ کے پاس ایسے کوئی کپڑے تھے؟"

خالہ نے چشمہ لگا کر اس ٹکڑے کو دیکھا پھر بری طرح رونے لگیں، روتے ہوئے بولیں۔ "اسی کپڑے کا سوٹ تو سعدیہ پہن کر نکلی تھی۔" پھر تیزی سے الماری کی طرف بڑھیں اور بولیں۔ "اس میں سے کچھ کپڑا بچ گیا تھا۔ سعدیہ نے کہا تھا کہ اس کپڑے میں منی فراک بن جائے گا۔ اسے سنبھال کر رکھ لیں۔"

جب امجد نے انہیں حقیقت بتائی تو وہ غش کھا کر گر پڑیں۔ امجد کی آنکھوں میں بھی آنسو تھے اور پھر میری آنکھوں سے بھی آنسو بہہ رہے تھے۔

یہ حقیقت مان کر کہ کوئلے کا یہ ڈھیر ہنستی بولتی زندگی سے بھرپور اس خوب صورت عورت کا ہے جو عرفان کی رگوں میں خون بن کر دوڑتی تھی۔ جو دل کی دھڑکن بن کر عرفان کے زندہ رہنے کا سبب تھی، عرفان کہیں کا نہیں رہا۔

اس واقعے کو کئی برس بیت چکے ہیں۔ عرفان اب تک اپنے حواس میں نہیں ہے۔ پولیس آج تک قاتل کا سراغ نہیں لگا سکی۔

جب عورت کی قمیص کا کپڑا اس کے منہ سے نکلے تو اس پر ہونے والے ظلم کی داستان خود بہ خود سمجھ میں آجاتی ہے۔ شاید ظلم کی یہی کہانی عرفان کو پریشان رکھتی ہے۔ وہ یہ بھی سوچ سوچ کر غصے سے کھولتا رہتا ہے کہ سعدیہ پر نہ جانے کتنا ظلم کیا گیا ہوگا؟ اور کس کس طرح ذلیل کیا گیا ہوگا؟ وہ یہی سوچ کر جنون میں چلاتا ہے۔ اتنے برس گزرنے کے باوجود وہ ہوش کی دنیا میں واپس نہیں آیا۔

اس کے بچے جوان ہو چکے ہیں۔ خالہ کا انتقال ہو چکا ہے۔ سعدیہ کے بھائی عرفان کی اور بچوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں لیکن ایک بات ہے، عرفان لاکھ ہوش و حواس سے بیگانہ سہی، وہ اپنی جوان بیٹی سمیرہ کو کہیں بھی اکیلا نہیں جانے دیتا۔ وہ بھی سعدیہ بھابی کی طرح خوبصورت ہے۔ عرفان سائے کی طرح اس کے ساتھ ہوتا ہے۔

میں یہ سوچ رہا ہوں کہ بزدل کون ہے، میں یا عرفان؟

سانحہ

جناب ایڈیٹر سرگزشت
السلام وعلیکم!
کچھ سانحات ایسے ہوتے ہیں جن کے زخم تا عمر ٹیس دیتے ہیں۔ میری زندگی میں بھی ایک سانحہ رونما ہوا ہے جو میرے ضمیر پر بوجھ ہے۔ میں آج اس سانحہ کو سرگزشت پڑھنے والوں سے شیئر کرنا چاہتا ہوں تاکہ ضمیر کے کچوکے ہلکے ہوجائیں۔ نادانستگی میں ہی میں ایک معصوم لڑکی کا قاتل بن گیا ہوں۔ وہ سانحہ کیسے رونما ہوا ملاحظہ کریں۔

آفتاب احمد
(کراچی)

شہر میں اچانک ہی ہنگامے پھوٹ پڑے تھے، انتظامیہ نے کراچی کے سترہ تھانوں کی حدود میں کرفیو نافذ کر دیا تھا۔ یہ تو غنیمت تھا کہ میں اس دن دفتر سے کچھ پہلے ہی اٹھ گیا تھا ورنہ میں بھی آفس میں پھنس کر رہ جاتا۔ میرا گھر اور دفتر دونوں ہی کرفیو زدہ علاقے میں تھے۔

میں یوں گھر میں مقید رہنے کا عادی نہیں تھا اس لیے یہ قید مجھے بہت کھل رہی تھی۔ اب سے پچیس سال پہلے بھی کراچی میں آگ اور خون کا یہی کھیل ہوا تھا۔ میرے اس

ہنستے بولتے، پررونق اور روشنیوں کے شہر کو نہ جانے کس کی نظر لگ گئی ہے، کون سا آسیب چمٹ گیا ہے کہ وہ دو دہائیاں گزرنے کے بعد بھی اس بدقسمت شہر اور اس کے مکینوں کا پیچھا نہیں چھوڑتا۔

میں مطالعے کا شوقین ہوں، گھر میں بہت سی کتابیں بھی ہیں اس لیے میں مطالعہ کر کے وقت گزارنے لگا۔

میں اخبار بھی باقاعدگی سے پڑھتا تھا۔ ان دنوں تو خاص طور پر اخبار کا مطالعہ کرتا تھا۔

اس دن بھی میں ناشتے کے بعد اخبار لے کر برآمدے میں جا بیٹھا۔ اخبار پڑھتے پڑھتے میری نظر ایک کالم کی چھوٹی سی خبر پر جم کر رہ گئی۔ ”گیس لیک کرنے سے چولہا پھٹ گیا، نوجوان لڑکی بُری طرح جھلس گئی۔ اسے تشویشناک حالت میں اسپتال پہنچایا گیا لیکن وہ جانبر نہ ہو سکی اور اس نے دم توڑ دیا۔“

خبر پڑھ کر میں کچھ دیر کو سکتے میں رہ گیا، ایسی خبریں آپ نے بھی بہت پڑھی ہوں گی لیکن ان پر دھیان دیے بغیر دوسری خبروں کی طرف متوجہ ہو گئے ہوں گے۔

میں دیر تک اس مرنے والی کے بارے میں سوچنے لگا۔ کیا واقعی وہ حادثاتی موت کا شکار ہوئی تھی یا پھر کسی کی بے وفائی اور بے اعتنائی سے دلبرداشتہ ہو کر اس نے موت کو خود گلے لگایا تھا...... یا پھر اس نے اپنے باپ بھائی کی عزت بچانے کو اپنی جان قربان کر دی تھی۔

میرے ذہن میں آندھیاں سی چل رہی تھیں۔ کرفیو...... گیس کا چولہا...... لڑکی...... تمام چیزیں میرے ذہن میں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔

☆☆☆

جب ہم اس کالونی میں آئے تھے تو وہاں آبادی بہت کم تھی۔ بے شمار پلاٹ خالی پڑے تھے۔ میری عمر ان دنوں مشکل سے پندرہ سولہ سال رہی ہوگی۔ میں اپنے ہم عمر بچوں کے ساتھ شام کو کرکٹ کھیلتا۔ اکثر اوقات لڑکوں کو پتنگ اڑانے کا جنون چڑھتا تو خوب پتنگ بازی ہوتی۔

بس یوں ہی دن گزر رہے تھے۔ محلے کی مختصر آبادی میں لوگ ہمیشہ ایک دوسرے کے دکھ درد میں شریک رہتے۔ کسی کو پریشانی ہوتی تو پورا محلہ اس کی مدد کرنے کو تیار ہو جاتا۔ کسی تقریب کے موقع پر محلے کے لڑکے سارا انتظام خود سنبھال لیتے تھے۔

بہت اچھا اور خوش گوار ماحول تھا۔ بزرگ بچوں کے ساتھ شفقت سے پیش آتے تھے اور بچے بزرگوں کا احترام کرتے تھے۔

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ کھیل کے دوران میں اگر ہماری نظر کسی بزرگ پر پڑ جاتی تو ہم اپنا کھیل چھوڑ کر اِدھر اُدھر منتشر ہو جاتے۔

اماں تو یوں بھی دوسروں کے کام کر کے خوش ہوتی تھیں۔ وہ ہر ایک کی مدد کرنے میں پیش پیش رہتیں۔ کوئی بیمار ہے تو اس کی خدمت یوں کرتیں جیسے وہ شخص ان کا بہت قریبی رشتے دار ہو۔ محلے کے لوگ اکثر اماں کے پاس اپنے مسائل لے کر آتے رہتے تھے اور اماں حتی المقدور انہیں حل کرنے کی کوشش کرتی تھیں۔

میں اکثر ان کے اس ”سوشل ورک“ سے چڑ جایا کرتا تھا اور اماں سے کہتا۔ ”اماں، میرا بھی آپ پر کچھ حق ہے۔ آپ تو سارا دن محلے کے لوگوں کے مسائل حل کرتی رہتی ہیں۔ یہ سوشل ورک......“

”آفتاب!“ اماں میری بات کاٹ دیتیں۔ ”ایسے نہیں کہتے بیٹا، اللہ کو برا لگتا ہے۔ تم یہ بتاؤ، کبھی تمہارے کسی کام میں مجھ سے کوتاہی ہوئی ہے؟ دوسروں کا بھی ہم پہ اتنا ہی حق ہے بیٹا!“

میں ..... خاموش ہو جاتا۔ ان سے زیادہ بحث بھی نہیں کر سکتا تھا۔ ابو کے انتقال کے بعد وہ بہت زودرنج ہو گئی تھیں۔ میں انہیں مزید تکلیف نہیں پہنچانا چاہتا تھا۔ میری دیکھا دیکھی پورا محلہ اماں کو اماں کہنے لگا۔ میں انہیں ”ہمدرد دواخانہ“ کہتا تھا۔

دیکھتے ہی دیکھتے کئی برس بیت گئے۔ میں اسکول سے کالج، پھر یونیورسٹی میں پہنچ گیا۔ معاشی طور پر ہمیں کوئی پریشانی نہیں تھی۔ میرپورخاص میں ہماری اچھی خاصی زرعی زمین تھی جو ابو نے ٹھیکے پر دے رکھی تھی۔ زمینوں کا ٹھیکا ابو کے ایک پرانے دوست محمد انکل کے پاس تھا۔ وہ انتہائی ایماندار آدمی تھے۔ انہوں نے کبھی ایک پیسے کا ہیر پھیر نہیں کیا۔ اماں ان کے کام سے مطمئن تھیں۔ میرپورخاص میں ہمارا آموں کا ایک بہت بڑا باغ بھی تھا۔ میں گرمی کی چھٹیوں میں اکثر میرپورخاص چلا آتا۔ وہاں دل بھر کے گھومتا، سوئمنگ کرتا، شکار کھیلتا اور سیر ہو کر آم کھاتا۔ اماں شروع میں تو ایک آدھ دفعہ میرپورخاص گئی تھیں لیکن جب میں بڑا ہو گیا تو انہوں نے میرے ساتھ جانا چھوڑ دیا تھا۔ انہیں اس سیر و تفریح سے زیادہ اپنے محلے کے لوگ عزیز تھے۔

میں ان دنوں یونیورسٹی سے ایم بی اے کر رہا تھا۔ میں صبح یونیورسٹی جاتا، وہاں سے واپس آکے کھانا کھا کر سو جاتا۔ پھر شام کو اٹھ کر نہانے دھونے کے بعد اپنے دوستوں میں نکل جاتا۔ اماں جانتی تھیں کہ میرے تمام دوست اچھی فیملیز سے تعلق رکھتے ہیں اور پڑھنے والے بچے ہیں اس لیے انہوں نے کبھی میرے باہر رہنے پر اعتراض نہیں کیا۔

میں مغرب کے بعد گھر میں آتا، کھانا کھاتا، دو تین گھنٹے پڑھتا، پھر سو جاتا۔

اب اماں گھر میں بچوں اور بچیوں کو روز صبح قرآن مجید پڑھایا کرتی تھیں۔ انہوں نے مجھ سے بھی کہا کہ تم دوستوں میں ضرور جاؤ لیکن شام کو کچھ وقت نکال کر محلے کے بچوں کو پڑھا دیا کرو۔ بہت ثواب کا کام ہے۔

یوں اماں کے بار بار کے اصرار پہ میں شام کو کچھ دیر بچوں کو پڑھانے لگا۔ اماں کی وجہ سے محلے میں ہماری بہت عزت تھی۔

وقت یوں ہی گزرتا رہا۔ اس دوران میں اس آبادی میں بہت سے نئے مکان تعمیر ہو گئے اور ان میں لوگ آباد ہو گئے۔

ان ..... نئے آنے والوں میں سعید صاحب کا گھرانا بھی تھا۔ وہ انتہائی سادہ اور شفیق انسان تھے اور کسی غیر ملکی بینک میں بہت اچھے عہدے پر فائز تھے لیکن ان میں غرور اور تکبر نام کو بھی نہ تھا۔

اس دور میں جس کے پاس موٹر سائیکل ہوتی تھی تو وہ کھاتے پیتے لوگوں میں شمار ہوتا تھا۔ سعید صاحب کے پاس تو گاڑی تھی۔

اب اس آبادی میں چھوٹا سا ایک بازار بھی بن گیا تھا۔ میں ایک دن بازار سے سودا سلف خرید رہا تھا تو مجھے سعید صاحب نظر آئے۔ وہ کسی پلمبر سے بحث کر رہے تھے۔ ”حد ہو گئی یار!“ وہ بولے۔ ”تم صرف تین ٹونٹیاں بدلنے کے سو روپے مانگ رہے ہو؟“

”بڑے صاحب، کام بھی تو دیکھیں۔ ٹونٹیوں کا کھولنا، پھر ان کی جگہ نئی ٹونٹیاں لگانا۔ بہت مشکل کام ہے بڑے صاحب!“

”کیا تم ان ہی پیسوں میں سے نئی ٹونٹیاں بھی لاؤ گے؟“ میں فضول میں اس بحث میں کود پڑا۔

”نئی ٹونٹیاں بھی اگر میں خریدوں گا تو مجھے بچے گا ہی کیا؟“

”تمہیں اس کے باوجود کم سے کم پچاس روپے بچیں گے۔“ میں نے کہا۔

”تو ٹھیک ہے، اتنے پیسوں میں اگر کوئی دوسرا پلمبر مل جائے تو اس سے کرا لیں۔“ اس نے بے نیازی سے کہا اور آگے بڑھ گیا۔

”سر، آپ کو صرف ٹونٹیاں ہی تبدیل کرنا ہے نا!“ میں نے پوچھا۔ انہوں نے اثبات میں سر ہلایا تو میں نے کہا۔ ”آپ ایسا کریں، پہلے تین ٹونٹیاں لے آئیں۔“

”وہ تو میں کل ہی لے آیا تھا۔“ انہوں نے جواب دیا۔

”پھر آپ گھر چلیں، میں اپنے اوزار لے کر آتا ہوں۔“

”اوزار لے کر!“ انہوں نے حیرت سے کہا ”تو کیا آپ کو پلمبنگ کا کام آتا ہے؟“

”مجھے تو الیکٹرک کا کام بھی آتا ہے، وہائٹ واش بھی کر لیتا ہوں، اور اس کے ساتھ ساتھ بہترین کک بھی ہوں۔“ میں نے ہنس کر کہا۔

”اچھا!“ سعید صاحب نے کہا۔ ”پیسے کتنے لو گے؟“

”پیسوں کو چھوڑیں۔“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”آپ گھر پہنچیں، میں ابھی آتا ہوں۔“

”پھر بھی کچھ تو بولو۔“ سعید صاحب الجھ کر بولے۔ ”دیکھو میاں، پیسے تو تمہیں لینا پڑیں گے۔ پلمبر اور الیکٹریشن تو اپنی ایک پائی بھی نہیں چھوڑتے ہیں، تم کیسے پلمبر ہو؟ بغیر کسی معاوضے کے کام کرنا چاہتے ہو؟“

”میں پلمبر یا الیکٹریشن تو سرے سے ہوں ہی نہیں۔“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”میں کراچی یونیورسٹی میں ایم بی اے کا طالب علم ہوں۔ یہ کام تو میں اپنے شوق کی وجہ سے کرتا ہوں، پھر آپ نے دیکھ ہی لیا، پلمبروں کے کیسے نخرے ہوتے ہیں۔ اسی وجہ سے میں پلمبنگ اور الیکٹریشن کے اوزار لے آیا ہوں۔“

سعید صاحب بہت دلچسپی سے مجھے دیکھ رہے تھے، پھر وہ ہنس کر بولے۔ ”تم کس گھر میں رہتے ہو؟“

”آپ نے محلے میں اماں کا نام تو سنا ہوگا؟“ میں نے کہا۔

”ہاں، وہ تو انتہائی شفیق اور رحم دل خاتون ہیں۔

ایک دفعہ ہمارے گھر بھی آچکی ہیں۔"

"میں ان ہی کا بیٹا آفتاب ہوں۔"

میں انہیں حیران چھوڑ کر گھر آیا۔ پلمبنگ کے اوزاروں کا تھیلا اٹھایا اور ان کے گھر پہنچ گیا۔

یہ سعید صاحب سے میری پہلی ملاقات تھی۔ پھر آہستہ آہستہ یہ ملاقاتیں بڑھتی گئیں۔ میں ان کا بہت احترام کرتا تھا۔ وہ بھی مجھ سے بہت محبت کرنے لگے تھے اور مجھے اپنا چھوٹا بھائی سمجھتے تھے۔

سعید بھائی کی فیملی بہت مختصر تھی۔ وہ، ان کی بیگم سعدیہ اور سالی نورین۔ اللہ نے انہیں ابھی تک اولاد کی نعمت سے نوازا نہیں تھا۔

سعید بھائی کو شطرنج کھیلنے کا شوق تھا۔ میں بھی شطرنج کا دیوانہ تھا۔ اس کے علاوہ انہیں اردو ادب اور تاریخ سے بھی بہت لگاؤ تھا۔ میں بھی اردو ادب اور تاریخ کو پسند کرتا تھا۔ یوں ہم دونوں کے شوق مشترک تھے۔

میں کبھی کبھار کوئی کالم یا افسانہ بھی لکھ لیتا تھا لیکن کبھی کوئی افسانہ یا کالم چھپنے کے لیے نہیں بھیجا۔

سعید بھائی سے گھنٹوں اردو ادب پہ گفتگو ہوتی تھی۔ ادب اور تاریخ دونوں میں ان کی معلومات قابلِ رشک تھیں۔

اب میں نے شام کو دوستوں میں اٹھنا بیٹھنا چھوڑ دیا تھا اور شام کا سارا وقت سعید بھائی کے گھر گزرتا تھا۔

اکثر سعدیہ بھابی بھی ہمارے ساتھ ہوتی تھیں لیکن وہ جلد ہی بور ہو کر اٹھ جاتیں۔

میں نے اب تک ان کی سالی کو نہیں دیکھا تھا۔ شاید وہ خود ہی میرے سامنے آنا نہیں چاہتی تھیں یا پھر سعید بھائی اور سعدیہ بھابی کو اس کی موجودگی پسند نہ ہو۔

میری کوئی بہن نہیں تھی، صرف ایک چھوٹا بھائی تھا۔ میں شروع ہی سے بہن کے پیار کو ترسا ہوا تھا۔ مجھے سعدیہ بھابی کی محبت اور توجہ ملی تو میں مزید ان کا دیوانہ ہو گیا۔ وہ بھی میرے ساتھ بالکل چھوٹے بھائیوں والا سلوک کرتی تھیں۔ اب مجھے کچھ کھانے کی خواہش ہوتی تو میں اماں کے بجائے سعدیہ بھابی سے کہتا۔ وہ بے چاری فوراً میری فرمائش پوری کرنے میں لگ جاتیں۔ یوں سمجھ لیں کہ اب میں سعید بھائی کے گھر کے ایک فرد کی طرح ہو گیا تھا۔

یہ سب کچھ تھا لیکن میں نے اب تک بھابی کی بہن نورین کو نہیں دیکھا تھا۔ مجھے ایک تجسس تھا کہ کسی دن نورین کو دیکھوں۔ میں نے سعدیہ بھابی سے کئی بار پوچھنا چاہا مگر یہ سوچ کر خود کو روک لیا کہ مبادا سعدیہ بھابی میری بات کا برا مان جائیں۔ انہیں اگر نورین سے ملوانا ہوتا تو اب تک ملاقات کرا چکی ہوتیں۔

اس دن ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ موسم انتہائی خوش گوار تھا۔ اس دن میں نے یونیورسٹی سے چھٹی کر لی اور اپنا ٹیپ ریکارڈر لے کر ٹیرس میں جا بیٹھا۔

اچانک مجھے خیال آیا کہ اس بھیگے بھیگے موسم میں پکوڑے اور سموسے کھانے کا تو مزہ ہی اور ہے۔ میں نے ٹیپ ریکارڈ بند کیا اور نیچے اتر کے اماں کو تلاش کرنے لگا۔ اماں حسب معمول "سوشل ورک" پر نکلی ہوئی تھیں۔ مجھے شدید کوفت ہوئی، سوچا کہ گرما گرم پکوڑے بازار سے لے آؤں لیکن بازار کے پکوڑوں میں وہ بات کہاں جو گھر کے پکوڑوں میں ہوتی تھی۔ پھر میں نے سوچا کہ میں خود ہی پکوڑے تل لوں لیکن مجھے پکوڑے تلنے کا کوئی تجربہ نہیں تھا۔

میں جھنجلا کر ایک مرتبہ پھر ٹیرس میں آ گیا۔

بارش پہلے کے مقابلے میں کچھ اور تیز ہو گئی تھی، اس سے موسم کی خوبصورتی میں مزید اضافہ ہو گیا تھا۔

اچانک مجھے بھابی کا خیال آیا تو میں نے خود کو ملامت کی کہ اب تک مجھے ان کا خیال کیوں نہیں آیا۔

بارش اب کافی تیز ہو گئی تھی۔ سعید بھائی کے گھر جاتے جاتے میرے کپڑے، پانی میں شرابور ہو جاتے لیکن بارش میں نہ بھیگنا بھی تو کفرانِ نعمت تھا۔

میں سعید بھائی کے گھر پہنچا تو بھیگ کر چوہا بن چکا تھا۔ بھابی مجھے اس ہیئت میں دیکھ کر ہنسنے لگیں۔

میں نے ان سے کہا۔ "بھابی! اس وقت موسم کی مناسبت سے میں سموسے اور پکوڑے کھانے آیا ہوں۔"

"ارے، وہ بھی مل جائیں گے، پہلے تم یہ گیلے کپڑے تو اتارو۔"

"کیسی باتیں کر رہی ہیں بھابی!" میں نے کہا۔ "میں...... میں...... کپڑے اتار دوں۔" میں نے جان بوجھ کر تجاہل کا مظاہرہ کیا۔

"احمق لڑکے!" بھابی نے کہا۔ "میں کپڑے بدلنے کو کہہ رہی ہوں۔ تم سعید کا کوئی جوڑا پہن لو اور ڈرائنگ روم میں بیٹھو۔ میں ابھی پکوڑے اور سموسے لے کر آتی ہوں۔" انہوں نے مجھے تولیہ اور سعید بھائی کا ایک جوڑا دیتے ہوئے کہا۔

میں نے کپڑے بدلے اور ڈرائنگ روم میں بیٹھ کر کھڑکی سے بارش کا نظارہ کرنے لگا۔ بارش اب بھی اسی زور و شور سے ہو رہی تھی۔

باہر بچے بارش میں نہا رہے تھے اور چیخ پکار کر رہے تھے۔ سامنے والی چھت پہ کچھ لڑکیاں بارش میں نہا رہی تھیں اور بات بے بات ہنس رہی تھیں، چیخ رہی تھیں۔

میری یہ محویت "ٹھک ٹھک" کی آواز سے ختم ہو گئی۔

ٹھک ٹھک کی آواز ڈرائنگ روم کے دروازے کے پاس آ کر رک گئی۔ میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو گڑبڑا گیا۔ دروازے میں انتہائی پرکشش بلکہ حسین و جمیل لڑکی کھڑی تھی۔ اس کے گھنے سیاہ بال کمر تک بکھرے ہوئے تھے۔ خوبصورت چہرہ میک اپ سے بے نیاز تھا۔ اس کا جسم بھی انتہائی قیامت خیز تھا۔

میں اسے دیکھنے میں اتنا محو تھا کہ اسے اندر آنے کو بھی نہ کہہ سکا، پھر میں نے ہمت کر کے اپنی نظریں اس کی دلکش چہرے سے ہٹائیں اور اس سے بولا۔ "آیئے، تشریف لایئے۔"

لڑکی کے چہرے پر انتہائی دلآویز مسکراہٹ نمودار ہوئی اور وہ بیساکھی کا سہارا لے کر "ٹھک ٹھک" کرتی کمرے میں داخل ہوئی۔

مجھے ایک دھچکا سا لگا کہ اتنی خوبصورت لڑکی اور بیساکھی؟ میں بولا کچھ نہیں، بس ندیدوں کی طرح اسے گھورتا رہا۔

یہ بات نہیں ہے کہ اس سے قبل مجھے کوئی خوبصورت لڑکی دکھائی ہی نہیں دی تھی۔ میں جب کالج میں پڑھتا تھا تو بہت سی لڑکیاں میرے نام کی مالا جپتی تھیں، پھر اب یونیورسٹی میں بھی ایک سے بڑھ کر ایک خوبصورت لڑکی تھی لیکن نورین کے حسن میں عجیب سی کشش تھی۔ اس کے چہرے پر بھولپن اور معصومیت تھی۔ وہ میں نے کسی بھی لڑکی میں نہیں دیکھی تھی۔

میں نے جھجکتے ہوئے اس سے پوچھا "آ...... آپ...... کون ہیں...... کس سے ملنا ہے آپ کو؟"

وہ میرا سوال سن کر بے اختیار کھلکھلا کر ہنس دی۔ "میں نورین ہوں...... سعدیہ باجی کی چھوٹی بہن!" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"اوہ!" میرے منہ سے بے اختیار نکلا اور میری نظریں اس کے سراپا سے ہوتی ہوئی اس کی بیساکھی پر

نسی

قدیم زمانے میں اہل عرب کا قاعدہ، اس کے قاعدے کے مطابق اگر وہ کسی سے انتقام لینے کے لیے یا غارت گری کے لیے جنگ چھیڑنا چاہتے تو کسی حرام مہینے میں اس پر چھاپہ مار دیتے، پھر اس مہینے کی جگہ کسی اور دوسرے حلال مہینے کو حرام قرار دے دیتے اور اس ماہ میں جنگ و جدل کرتے جبکہ مسلمان اس تقدس کے پیش نظر کچھ کرنے سے قاصر تھے۔ تب اللہ تعالیٰ نے سورہ بقرہ میں یہ آیت فرمائی کہ مسلمان بھی ماہ حرام میں بدلہ لینے کے مجاز ہیں۔ (آیت 194)

جا ٹکیں۔ یہ نورین سے میری پہلی ملاقات تھی۔ اللہ تعالیٰ نے دل کھول کر اسے حسن کی دولت سے مالا مال کیا تھا لیکن قدرت نے ایک ٹانگ سے معذور کر کے اس پہ بہت ظلم کیا تھا۔

"کہاں کھو گئے جناب؟" وہ چہک کر بولی۔ "آپ یقیناً آفتاب صاحب ہیں۔"

میں نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔ "جی ہاں، میں ہی آفتاب ہوں۔"

"لگتا ہے آپ نے میری معذوری کا زیادہ ہی اثر لے لیا ہے، شاید آپ کو یہ بیساکھی پسند نہیں آئی۔ مجھے دیکھیں، اس معذوری کا مجھے تو ذرا بھی ملال نہیں ہے بلکہ میں خود کو معذور سمجھتی ہی نہیں ہوں۔"

"ایسی تو کوئی بات نہیں ہے نورین!" میں نے ہنس کر کہا۔ "آپ کو میری کس بات سے محسوس ہوا کہ میں افسردہ ہوں۔"

"آپ کے چہرے کے تاثرات سے۔" وہ ہنس کر بولی۔ "میں چہرے پڑھنے میں بھی ماہر ہوں۔" وہ پھر کھلکھلا کر ہنسی۔

میرے دل میں آیا کہ اس سے پوچھوں، آپ نے کبھی اپنا خوبصورت چہرہ بھی پڑھنے کی کوشش کی ہے؟ لیکن میں پہلی ملاقات میں یہ سب کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ بس میں چاہتا تھا کہ وہ بولتی رہے اور میں سنتا رہوں۔

میں اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرتا رہا۔ مجھے احساس

ہوا کہ وہ خود بھی اپنی معذوری پر رنجیدہ ہے لیکن ظاہر یہ کرتی ہے کہ اسے اس معذوری کی کوئی پروا نہیں۔ ”میں اس وقت دس سال کی تھی۔“ نورین نے خلاؤں میں تکتے ہوئے کہا۔ ”جب مجھ پہ یہ قیامت ٹوٹی۔“ وہ خود ہی مجھے اپنی معذوری کے بارے میں بتانے لگی تھی۔ ”چاند رات کو میں سعدیہ باجی اور دوسری کزنز کے ساتھ مل کر شاپنگ کے لیے گئی تھی۔ مارکیٹ میں میلے کا سا سماں تھا۔ ہر شخص مسرور تھا، ہر چہرے پر خوشی رقص کر رہی تھی۔

سعدیہ باجی اور دوسری کزنز سڑک پار کر کے دوسری طرف چلی گئیں۔ میں شوکیس میں سجی چیزیں دیکھنے میں اتنی محو تھی کہ مجھے ان لوگوں کے جانے کا احساس نہیں ہوا۔ میں نے گھوم کر دیکھا تو وہاں سعدیہ باجی نہیں تھیں۔ میں گھبرا گئی۔ اس بھرے بڑے بازار میں اچانک میں خود کو تنہا تنہا محسوس کرنے لگی۔ پھر میری نظر سڑک کی دوسری طرف سعدیہ باجی اور دوسرے لوگوں پر پڑی۔ میں نے انہیں پوری قوت سے آواز دی۔ ”سعدیہ باجی!“

لیکن شاید میری آواز ان تک نہیں پہنچ سکی اور وہ آگے بڑھ گئیں۔

میں نے ایک مرتبہ پھر انہیں حلق پھاڑ کر آواز دی اور دیوانہ وار ان کی طرف بھاگی۔

پھر اچانک یہ قیامت ٹوٹ پڑی۔ مخالف سمت سے آتی ہوئی ایک گاڑی کی لپیٹ میں آ گئی۔ اس حادثے نے مجھے ایک ٹانگ سے معذور کر دیا۔ میری ٹانگ اس بری طرح سے کچل گئی تھی کہ اسے گھٹنے کے نیچے سے کاٹنا پڑا۔“ اس نے سسکی لیتے ہوئے کہا۔

کمرے کا ماحول بوجھل سا ہو گیا۔ میں نے موضوع بدلنے کو کہا۔ ”نورین! آپ پڑھتی ہیں؟“

”جی ہاں، میں نے پرائیویٹ طور پر بی اے کیا ہے، اب میں ایم اے ماس کمیونیکیشن کرنا چاہتی ہوں لیکن اس کے لیے یونیورسٹی جانا ضروری ہے۔“

”تو کیا ہوا۔“ میں نے کہا۔ ”آپ یونیورسٹی میں داخلہ لے لیں اور اپنی تعلیم مکمل کریں۔“

”لیکن...... میری...... معذوری......“

”ابھی تو آپ کہہ رہی تھیں کہ آپ کو اس معذوری کی پروا نہیں ہے۔ یونیورسٹی میں میرے ساتھ ایک لڑکا پڑھتا ہے۔ وہ بیچارا دونوں ٹانگوں سے معذور ہے اور وہیل چیئر پر یونیورسٹی آتا ہے۔ وہ نصابی اور غیر نصابی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتا ہے۔ یونیورسٹی کے اساتذہ اور لڑکے لڑکیاں سبھی اس کا احترام کرتے ہیں، عزت کرتے ہیں۔“

میں نے اپنی باتوں سے اسے قائل کر لیا کہ اسے یونیورسٹی میں ضرور داخلہ لینا چاہیے۔

اس وقت بھابی پکوڑے، سموسے اور چٹنی وغیرہ لے کر آ گئیں اور ہماری گفتگو کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔

میں نورین سے مل کر بہت متاثر ہوا تھا۔ سعدیہ بھابی کے برعکس اسے ادب سے بہت لگاؤ تھا۔ اب میرے اور سعید بھائی کے ساتھ نورین بھی ہماری گفتگو میں شریک ہونے لگی۔ اس کی گفتگو سے مجھے اندازہ ہوا کہ اس کا ادبی ذوق بہت اچھا ہے۔ اسے میر، غالب، فیض اور دوسرے بڑے شعراء کے بے شمار اشعار ازبر تھے اور وہ گفتگو کے دوران ان کا حوالہ بھی دیتی تھی۔

اب میں جب بھی سعید بھائی کے گھر جاتا، نورین مجھے منتظر ملتی۔

ایک دن میں نے سعید بھائی سے کہا۔ ”سعید بھائی! اب تو نورین کو اس بیساکھی کے بوجھ سے نجات دلا دیں۔“

”کیا مطلب؟“ سعید بھائی چونک کر بولے۔

”مطلب یہ کہ اب تو مصنوعی ہاتھ پاؤں بھی اتنے بہترین بنتے ہیں کہ بالکل اصل لگتے ہیں۔ اگر آپ نورین کے بھی مصنوعی پاؤں بنوا دیں تو وہ بھی ایک نارمل لڑکی کی طرح چل پھر سکے گی۔ اسے اپنے احساس کمتری سے بھی نجات مل جائے گی اور وہ زندگی کی خوشیوں کو بھرپور انداز میں انجوائے کر سکے گی۔“

سعید بھائی کی سمجھ میں میری بات آ گئی۔ انہوں نے دوسرے ہی دن اس سلسلے میں بھاگ دوڑ شروع کر دی۔ ایک ہفتے کے اندر اندر نورین کا مصنوعی پاؤں بن کر تیار ہو گیا۔

میں نے اسے مصنوعی پاؤں کے ساتھ چلنے کی پریکٹس کرا دی۔ اب وہ بہت اعتماد کے ساتھ دونوں پیروں پہ چلتی تھی۔

جس دن نورین نے یونیورسٹی میں ایڈمیشن لیا، اس دن وہ بہت خوش تھی، اب وہ ہم سے گفتگو بھی کرتی تو اس کے لہجے میں ایک اعتماد ہوتا تھا۔

ایک دن میں اور سعید بھائی اردو کے افسانوی ادب پر بات کر رہے تھے۔ پھر بات خواتین کے ناولوں اور ڈائجسٹوں تک جا پہنچی۔ نورین بھی موجود تھی لیکن شاید وہ اس وقت بحث کرنے کے موڈ میں نہیں تھی۔

سعید بھائی نے کہا۔ ”اصل میں یہ خواتین جو کچھ لکھتی ہیں، وہ حقیقت سے بہت دور ہوتا ہے۔ مثلاً یہ افسانہ۔“ انہوں نے ایک ڈائجسٹ کھول کر میری طرف بڑھایا۔

میں نے افسانے پر سرسری نظر ڈالی۔

سعید بھائی بولے۔ ”اس افسانے میں مصنفہ نے لڑکی کو مافوق الفطرت بنا کر پیش کیا ہے۔ وہ حسین اتنی ہے کہ جنت کی حوریں بھی شرمائیں۔ اس میں انسانی اوصاف کم اور فرشتوں کے اوصاف زیادہ ہیں۔ ہر حال میں سچ بولتی ہے، ظلم برداشت کرتی ہے لیکن ظلم کرنے والوں کے ساتھ بھی ہمیشہ اچھا سلوک کرتی ہے۔ بہترین مقررہ ہے، گلوکارہ ہے، شاعری بھی کر لیتی ہے۔ اب ایسی لڑکی دنیا میں کہاں ہوتی ہے؟“ سعید بھائی نے مضحکہ خیز لہجے میں کہا۔ ”تم نے اگر ایسی کوئی لڑکی دیکھی ہو تو مجھے بتاؤ۔“

مجھے ان کے انداز پہ بے ساختہ ہنسی آ گئی اور میں زور زور سے ہنسنے لگا۔ ہنستے ہنستے میں نے نورین کو دیکھا، وہ غصے میں تلملا رہی تھی، اپنے ہونٹ چبا رہی تھی۔ میں نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ ”نورین! تمہیں اتنا برا کیوں لگ رہا ہے؟“

”یار، اصل بات تو میں تمہیں بتانا ہی بھول گیا۔“ سعید بھائی نے کہا۔ ”اصل میں اس افسانے کی مصنفہ محترمہ نورین احمد ہیں۔ یہ کومل کے قلمی نام سے لکھتی ہیں۔“

”ایسی لڑکی دنیا میں کیوں نہیں ہو سکتی؟“ نورین نے کہا۔ ”یہ لڑکی تو ایک اشارہ ہے خواتین کے لیے۔ میں چاہتی ہوں کہ ایسی خواتین کا حقیقت میں بھی وجود ہو۔“ پھر وہ طنزیہ لہجے میں بولی۔ ”یہ جو مردوں کے ہیرو ہوتے ہیں۔ یہ کیا مافوق الفطرت نہیں ہوتے۔ ایک اکیلا آدمی پچاس آدمیوں کو زیر کر لیتا ہے۔ مردانہ وجاہت کا چکر، لڑکیاں اس پر آسمان سے برستی ہیں۔ یہ بھی تو مرد لکھنے والوں کی ناآسودہ خواہشات ہی ہیں۔“

اس سے پہلے کہ بات مزید بڑھتی، سعدیہ بھابی نے کھانا لگنے کا اعلان کر کے سیز فائر کرا دیا۔

اب میں اکثر سعید بھائی کی غیر موجودگی میں بھی ان کے گھر جانے لگا تھا۔ مجھے نورین کی باتیں اچھی لگتی تھیں۔ اس کی بولتی ہوئی آنکھیں اور کھنکتی ہوئی ہنسی اچھی لگتی تھی۔ میں نے خود سے سوال کیا۔ ”آفتاب! کہیں تم نورین سے محبت تو نہیں کرنے لگے؟“

”نہیں...... یا شاید ہاں۔“ میں نے خود کو جواب دیا۔

مجھے نورین سے اپنائیت تو محسوس ہوتی تھی لیکن میں اس جذبے کو کوئی نام نہیں دے سکتا تھا۔

ان ہی دنوں مجھے ایک دوست کی شادی میں لاہور جانا پڑا۔ یونیورسٹی کی چھٹیاں تھیں، کوئی خاص مصروفیت بھی نہ تھی اس لیے میں نے جانے کی ہامی بھر لی۔

میں گیا تو صرف تین دن کے لیے تھا لیکن اکرم اور اس کی امی نے اصرار کر کے مجھے روک لیا اور واپسی میں مجھے پورے پندرہ دن لگ گئے۔ ان پندرہ دنوں میں میری کیفیت عجیب ہو گئی۔ میں واپس گھر پہنچا تو اماں نے آڑے ہاتھوں لیا۔ ”آفتاب! تم تو صرف تین دن کے لیے گئے تھے، پھر......“

”اماں! میں نے تو آنے کی بہت کوشش کی لیکن اکرم نے آنے ہی نہیں دیا۔“ میں نے جواب دیا۔ میں آتے ہی سعید بھائی کے گھر پہنچا۔ گھر میں بالکل سناٹا تھا۔

”بھابی!...... کہاں ہیں آپ؟“

جواب میں نورین اپنے کمرے سے نکلی اور بولی۔ ”باجی، شاپنگ کے لیے گئی ہیں۔“

یہ کہہ کر وہ اپنے کمرے میں جانے لگی۔ میں نے اچانک اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ وہ کچھ کسمسائی اور بولی۔ ”میرا ہاتھ چھوڑ دیں آفتاب صاحب!“

”میں اتنے دن بعد آیا ہوں نورین، اور تم تو ایسا بیگانوں والا سلوک کر رہی ہو؟“

”یہ تو...... آپ...... اپنے دل سے پوچھیں۔“ نورین کی آنکھوں میں شکوہ تھا۔ ”آپ وہاں گئے تو جا کر ہی بیٹھ گئے۔“

اس لمحے مجھے پہلی دفعہ محسوس ہوا کہ میں نورین سے محبت کرنے لگا ہوں اور اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔ میں نے جذباتی انداز میں کہا۔ ”نورین، تمہیں کیا معلوم کہ میں نے ہر ہر سانس میں تمہیں یاد کیا ہے۔ تمہارے بغیر میری زندگی پھیکی اور بے رنگ تھی۔“

”مجھے...... بھی...... آپ کے بغیر ایک...... پل چین...... نہیں آتا تھا آفتاب!“

”اس سے پہلے کہ میں مزید جذباتی ہوتا، سعدیہ بھابی گھر میں داخل ہو گئیں مجھے دیکھ کر وہ بھی خوش ہو گئیں اور بولیں۔ ”تم تو لاہور جا کر وہیں کے ہو گئے!“

”بھابی...... میں کچھ ایسا مجبور ہو گیا کہ......“

''اچھا بس رہنے دو۔'' بھابی نے شکایتی لہجے میں کہا۔ پھر وہ نورین سے بولیں۔ ''بھئی، آفتاب صاحب کی کچھ خاطر مدارات کرو۔ آخر یہ لاہور سے آئے ہیں، مہمان ہیں ہمارے۔''

بھابی کے انداز پہ مجھے ہنسی آگئی۔ پھر وہ خود ہی چائے کے ساتھ انڈوں کا حلوہ لے آئیں۔ وہ جانتی تھیں کہ مجھے انڈوں کا حلوہ بہت پسند ہے۔

اب تو میرے شب و روز ہی بدل گئے۔ میں اپنی ذات پر پہلے سے زیادہ توجہ دینے لگا۔ پہلے میں لباس کے سلسلے میں اتنا اہتمام نہیں کرتا تھا۔ اب ہر وقت بنا سنورا رہنے لگا۔ مجھے لگتا تھا کہ میری شخصیت میں کچھ کمی تھی جو نورین کی محبت نے پوری کردی۔

یونیورسٹی کی چھٹیاں تھیں اس لیے اب میں گھنٹوں سعید بھائی کے گھر میں رہتا۔ میں اور نورین دنیا زمانے کی باتیں کرتے۔ ہماری ذہنی ہم آہنگی دیکھ کر سعدیہ بھابی خود ہی ہمیں مل بیٹھنے کے مواقع فراہم کرتیں۔ نورین بھی ان دنوں پہلے سے کچھ زیادہ ہی پرکشش اور خوبصورت ہوگئی تھی۔ وہ بھی لباس کے سلسلے میں خصوصی اہتمام کرنے لگی تھی۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو چھوٹے موٹے گفٹ بھی دیتے رہتے تھے۔ یہ گفٹ میری طرف سے تو چھوٹے موٹے ہی ہوتے تھے لیکن نورین مجھے خاصے قیمتی پرفیوم، کف لنکس، شرٹس وغیرہ دیتی رہتی تھی۔ اب ہم ادب پر کم اور اپنے مستقبل پہ زیادہ بات کرتے تھے۔

پھر یونیورسٹی کا آخری سیمسٹر شروع ہوگیا۔ میں بھی دن رات پڑھائی میں مصروف ہوگیا۔ میں کبھی کسی دوست کے ساتھ کمبائنڈ اسٹڈی کے لیے اس کے گھر چلا جاتا، کبھی کوئی دوست میرے گھر آجاتا تھا۔ ایسے میں نورین سے ملاقات بھی بہت کم ہوتی تھی۔

ایک دن میں سعید بھائی کے گھر گیا تو سعید بھائی نے خوش دلی سے میرا استقبال کیا۔ بھابی نے میرے نہ آنے کی شکایت کی تو مجھ سے پہلے سعید بھائی بولے۔ ''بھئی، آفتاب کا آخری سیمسٹر ہے۔ ایم بی اے کی پڑھائی یوں بھی شدید محنت طلب ہوتی ہے۔ وہ اگر یہ وقت ملنے ملانے میں ضائع کردے گا تو پاس کیسے ہوگا۔''

نورین منہ پھلائے بیٹھی تھی۔ سعید بھائی کی بات سن کر اس کے چہرے کی کشیدگی بھی دور ہوگئی۔

تنہائی کا موقع ملتے ہی میں نے نورین سے کہا۔ ''نورین! تم مجھ سے ناراض ہو؟''

''نہیں تو۔'' نورین نے کہا۔ ''میں پہلے ناراض تھی لیکن پھر آپ کی پڑھائی کا خیال آیا تو مجھے آپ سے ہمدردی محسوس ہوئی۔''

''شکر ہے، تمہیں مجھ سے ہمدردی تو محسوس ہوئی۔ بس ایک مہینے کی بات ہے۔ پھر اس پڑھائی سے میری جان چھوٹ جائے گی۔ اس کے بعد ہم لوگ خوب گھومیں گے، تفریح کریں گے، لانگ ڈرائیو پر جائیں گے۔'' میں اسے بچوں کی طرح بہلا رہا تھا۔

کھانے کی میز پر سعید بھائی نے مجھے بتایا کہ ''میں نے ایک ملٹی نیشنل کمپنی میں تمہاری ملازمت کی بات کرلی ہے۔ وہاں سیلری بھی اچھی ہے اور اس کے ساتھ ساتھ کمپنی کی طرف سے تمہیں گاڑی بھی ملے گی۔ رزلٹ آتے ہی تمہیں جاب مل جائے گی۔''

''آپ تو یوں کہہ رہے ہیں جیسے جاب آپ کے ہاتھ میں ہے۔'' بھابی نے کہا۔

''میرے ہاتھ میں ہی سمجھو۔ اس کمپنی کا ڈائریکٹر میرا بہت اچھا دوست ہے۔ وہ مجھے کبھی انکار نہیں کرسکتا۔''

پھر میرے پیپر شروع ہوگئے اور میں ان سے کٹ کر رہ گیا۔ بس میں تھا اور میری کتابیں تھیں۔ دن رات کی محنت کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب میں آخری پیپر دے کر آیا تو بخار میں جل رہا تھا۔ میں کپڑے بدلے بغیر ہی بستر پر گر گیا۔

ابھی میں لیٹا ہی تھا کہ سعدیہ بھابی آگئیں اور بولیں۔ ''آفتاب! آج تمہارا آخری پیپر تھا۔ اب تو تم فارغ ہوگئے ہو۔''

''ہاں بھابی!'' میں نے مختصر جواب دیا۔

''میں اور سعید ایک عزیز کی شادی میں جارہے ہیں۔ تم ذرا نورین اور گھر کا خیال رکھنا۔'' بھابی نے کہا۔ ''ہمیں واپسی میں کچھ دیر ہوجائے گی۔'' وہ میرے جواب کا انتظار کیے بغیر چلی گئیں۔

بخار کی شدت سے میرا برا حال تھا۔ میں نے دو ٹیبلٹس کھائیں اور دوبارہ بستر پر لیٹ گیا۔ راتوں کو جاگنے کی وجہ سے سر بھی بری طرح چکرا رہا تھا۔ پھر نہ جانے کب مجھے نیند آگئی۔

میری آنکھ کھلی تو گھڑی میں رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ گویا میں سات گھنٹے تک گھوڑے بیچ کر سوتا رہا تھا۔ میرے منہ کا ذائقہ عجیب سا ہو رہا تھا لیکن اب مجھے چکر نہیں آرہے تھے۔ میں واش روم میں گھس گیا۔

نہا دھو کر باہر نکلا تو جسم بہت ہلکا پھلکا محسوس ہو رہا تھا۔

مجھے چائے کی شدید طلب محسوس ہو رہی تھی۔ میں نے اماں کو دو بار آوازیں دیں لیکن اماں تو حسبِ معمول ''سوشل ورک'' میں مصروف ہوں گی۔

اچانک نورین آگئی۔ وہ کچھ گھبرائی ہوئی سی تھی۔

''خیریت تو ہے نورین؟'' میں نے پوچھا۔

''باجی اور سعید بھائی آج رات نہیں آئیں گے۔'' اس نے جواب دیا۔

''آج رات نہیں آئیں گے؟'' میں نے حیرت سے پوچھا۔ ''کیوں؟''

''کراچی کے حالات ایک دم خراب ہوگئے ہیں اور شہر کے کئی علاقوں میں کرفیو لگا دیا گیا ہے۔ باجی اور سعید بھائی جس علاقے میں ہیں، وہ بھی کرفیو کی زد میں آگیا ہے۔''

''ارے یار تو پریشانی کی کیا بات ہے؟'' میں نے اسے تسلی دی۔ ''کرفیو میں نرمی ہوتے ہی وہ لوگ آجائیں گے۔ تم گھر جا کر آرام سے سو جاؤ۔''

''مجھے...... اکیلے میں ڈر لگتا ہے آفتاب!''

''اچھا، میں اماں کو تمہارے ساتھ بھیج دیتا ہوں۔''

''اماں گھر میں موجود نہیں ہیں۔'' نورین نے کہا۔

''اماں محلے میں کہیں گئی ہوں گی۔ ابھی آجائیں گی۔'' پھر میں ہنس کر بولا۔ ''تم آئی ہو تو مجھے ایک کپ چائے پلادو۔ اس وقت تک اماں بھی آجائیں گی۔''

نورین چائے بنانے چلی گئی۔

اچانک مجھے پھر بخار نے آلیا۔ یہ شاید میری بے احتیاطی کا نتیجہ تھا۔ میں نے رات کو ٹھنڈے پانی سے نہا لیا تھا۔

جب تک نورین چائے لے کر آئی میں پھر بخار میں جلنے لگا۔

میں چائے پی ہی رہا تھا کہ میرا چھوٹا بھائی شہاب آگیا اور آتے ہی بولا۔ ''بھیا! اب کیسی طبیعت ہے؟ آپ تو ایسے گھوڑے بیچ کر سوئے کہ اب اٹھے ہیں؟''

''میری طبیعت اب ٹھیک ہے۔'' میں نے لہجے میں بشاشت پیدا کرتے ہوئے کہا۔ ''تم یہ بتاؤ کہ اماں کہاں گئی ہیں؟''

''وہ غوری صاحب کے گھر گئی ہیں۔ ان کی بہو کی

نعمان رضی اللہ عنہ بن بشیر

صحابی بشیر بن سعد کے بیٹے نعمانؓ بن بشیر تھے۔ ان کا نام نعمان تھا اور کنیت ابوعبداللہ قبیلہ خزرج، والدہ صحابی عبداللہ بن رواحہ کی ہمشیرہ تھیں، ہجرت کے بعد انصار میں سب سے پہلے پیدا ہوئے۔ ان کی ولادت کے چھ ماہ بعد عبداللہؓ بن زبیر پیدا ہوئے۔ ماں کو اتنی محبت تھی کہ باقی اولاد کو چھوڑ کر ساری جائداد ان کے نام کردی۔ امیر معاویہ کی طرف سے حضرت علی کے خلاف جنگ کی اس لیے امیر معاویہؓ نے انہیں پہلے دمشق کا قاضی اور پھر حاکم یمن بنایا۔ اپنے آخری ایام 59ھ میں معاویہؓ نے انہیں کوفہ کا والی مقرر کیا۔ تقریباً نو ماہ اس عہدے پر کام کرتے رہے۔ یزید نے معزول کردیا۔ وہاں سے شام چلے گئے۔ بعدازاں یزید نے حمص کا امیر مقرر کیا۔ وفات تک اس عہدے پر فائز رہے۔ خلیفہ مروان کے عہد میں عبداللہ بن زبیر کی طرفداری کے جرم میں قتل ہوئے۔ آپ کی زوجہ و دیگر اہل و عیال گرفتار ہوئے۔

مرسلہ: نعمان اشرف، حیدرآباد

سلطان غیاث الدین کے عہد کے مشہور بزرگ سید میر عطا اللہ کے بیٹے نعمت اللہ ولی تھے۔ آپ کی پیدائش سے قبل والد وفات پاچکے تھے۔ آپ کی پرورش راجو خان کی اہلیہ نے کی۔ جلد ہی شمشیرزنی و فنون سپہ گری میں طاق ہوگئے۔ آہستہ آہستہ شوق عبادت دل میں گھر کرتا گیا اور اسی فکر میں دنیا ترک کردی۔ یہ اس قرآن پاک کا اثر تھا جو آپ نے چار برس اور 4 ماہ کی عمر میں ختم کیا۔ آپ کی بہت سی کرامات مشہور ہیں، کہا جاتا ہے کہ ایک روز آپ جنگل میں جارہے تھے کہ سامنے ایک شیر دکھائی دیا۔ آپ ٹھہر گئے اور فرمایا ''یار عزیز، اگر مشیت خداوندی میں ہے تو فقیر حاضر ہے۔ حکم کے مطابق عمل کر اور اگر ابھی حکم نہیں تو اپنی راہ لے، اور مجھ کو راستہ دے۔'' شیر یہ سن کر ایک طرف کو چلا گیا۔ فیروز پور میں آپ نے خانقاہ بنوائی اور خدمت اسلام میں مصروف ہوئے۔ اللہ کا یہ خوش اخلاق، انسان دوست، اسلام دوست 834ھ میں راہی ملک عدم ہوا۔

مرسلہ: سلطان شیخ، چنیوٹ

ڈلیوری ہونے والی ہے۔"
"تو کیا اماں آج......"
"جی نہیں، اماں آج رات نہیں آئیں گی۔" یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔
"آفتاب! اب...... کیا ہوگا...... میں۔"
"تم پریشان کیوں ہوتی ہو نورین؟" میں نے کہا۔ "آج رات تم یہیں سو جاؤ۔"
"نہیں آفتاب! باجی اور سعید بھائی رات میں کسی وقت مجھے ٹیلی فون کریں گے تو پریشان ہو جائیں گے۔ میرا گھر میں رہنا ضروری ہے۔"
"اچھا...... چلو میں...... چلتا ہوں۔" میں نے اٹھتے ہوئے کہا۔
میں نورین کے ساتھ باہر نکلا تو اچانک بارش شروع ہوگئی۔ سعید بھائی کے گھر تک پہنچتے پہنچتے میرے کپڑے پانی میں شرابور ہو چکے تھے اور میں بری طرح کانپ رہا تھا۔
سعدیہ نے فوراً سعید بھائی کا ایک جوڑا مجھے نکال کر دیا اور بولی۔ "جلدی سے کپڑے بدل لیں آفتاب ورنہ آپ کی طبیعت مزید خراب ہو جائے گی۔"
میں نے جیسے تیسے کپڑے بدلے اور بیڈ پر ڈھیر ہوگیا۔
تھوڑی دیر بعد مجھے نورین نے اٹھایا۔ وہ میرے لیے گرم دودھ لے کر آئی تھی۔
میں دودھ پی رہا تھا کہ بارش اچانک تیز ہوگئی۔ زور سے بادل گرجے، پھر بجلی کی کڑک سنائی دی۔ اور اچانک لائٹ چلی گئی۔
نورین ہلکی سی چیخ مار کے مجھ سے لپٹ گئی۔
بخار کی حدت، نورین کا جلتا ہوا وجود اور تنہائی، پھر اپنا ہوش نہ رہا اور میرا پورا وجود ایک ان دیکھے طوفان میں خس و خاشاک کی طرح بہہ گیا۔
لائٹ آئی تو میں شرمندگی کے باعث نورین سے آنکھیں نہیں ملا رہا تھا۔ نورین ایک طرف بیٹھی آنسو بہا رہی تھی۔
"دیکھو نورین......"
"پلیز آفتاب صاحب!" اس نے میری بات کاٹ دی۔ "اس وقت میں آپ کی کوئی بات نہیں سنوں گی۔"
بستر پر لیٹنا میرے لیے دوبھر ہوگیا۔ میں ٹہلتا ہوا ڈرائنگ روم میں آگیا اور بقیہ رات میں نے آنکھوں میں کاٹ دی۔ میں جانتا تھا کہ نورین بھی جاگ رہی ہوگی لیکن میں چاہنے کے باوجود اس سے کچھ کہنے کے قابل نہیں تھا۔
دن نکلتے ہی میں گھر آیا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ اماں کو اگلے ہی ہفتے رشتے کے لیے سعید بھائی کے گھر بھیجوں گا۔
اس دن یونیورسٹی کے کچھ دوست آگئے اور مجھ سے کہا کہ ہماری کلاس پاکستان ٹور پر جا رہی ہے۔ تم نے ابھی تک کوئی تیاری بھی نہیں کی۔ پھر میں نے لاکھ انکار کیا لیکن وہ لوگ مجھے اپنے ساتھ لے ہی گئے۔
پاکستان کا یہ ٹور ایک مہینے میں پورا ہوا۔ مجھے ہر وقت، ہر لمحے نورین ہی کا خیال رہتا تھا۔ میں نے سوچ لیا تھا کہ گھر جاتے ہی اماں کو سعید بھائی کے گھر بھیجوں گا۔
میں گھر واپس پہنچا تو وہاں حسبِ معمول سناٹا تھا۔ اماں اپنے معمول کے مطابق گھر سے باہر خدمتِ خلق میں گئی ہوں گی۔
میں نے یہ سوچ کر اماں کو آواز دی کہ ممکن ہے اماں کچن میں ہوں۔
میری آواز کے جواب میں شہاب اپنے کمرے سے نکل آیا۔ اس نے بتایا کہ اماں سعید بھائی کے گھر گئی ہوئی ہیں۔
"سعید بھائی کے گھر؟" میں نے پوچھا۔ "کیوں؟"
"بھیا، وہ آج نورین باجی کا سوئم ہے نا!" اس نے بتایا۔
"کیا؟" میں نے چیخ کر کہا۔ "کیا نورین مر گئی؟ کیسے...... کب؟" میرے منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔
"نورین باجی کچن میں تھیں کہ اچانک گیس لیک ہونے کی وجہ سے چولہا بھڑک گیا۔ ان کے کپڑوں میں فوراً ہی آگ لگ گئی اور وہ بہت بری طرح جھلس گئیں۔ اسپتال پہنچنے سے پہلے ہی انہوں نے دم توڑ دیا۔"
میں سکتے میں شہاب کی باتیں سن رہا تھا۔ مجھے نہ جانے کیوں یقین تھا کہ یہ حادثہ نہیں تھا بلکہ میری بے اعتنائی اور سفاکی سے دلبرداشتہ ہو کے نورین نے موت کو گلے لگایا تھا۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں چیخ چیخ کر کہوں کہ نورین کسی حادثے کا شکار نہیں ہوئی بلکہ اس کا قاتل میں ہوں...... میں نے ہی اس خوبصورت اور نازک اندام لڑکی کی جان لی ہے۔ میں نے مار تو اسے بہت پہلے دیا تھا۔ یہ تو اس کی چلتی پھرتی لاش تھی جو جھلس گئی تھی...... اب صرف اور صرف پچھتاوے میرا مقدر ہیں...... مجھے کسی پل سکون نہیں ملتا......

شارٹ کٹ

جناب مدیر اعلیٰ
السلام علیکم!
میں ایک سلگتے موضوع پر اپنی سرگزشت کے ساتھ حاضر ہوا ہوں۔ امید ہے یہ "سرگزشت" ہمارے پیارے رسالے ماہنامہ سرگزشت کے تمام ریڈرز کو پسند آئے گی۔

رمیز انصاری
(کراچی)

جمعے کی نماز کے لیے محلے کی مسجد کی طرف جاتے ہوئے میں نے اس بچے کو کچرا چنتے دیکھا تھا۔ میلی کچیلی شلوار قمیص میں اس کے پاؤں جوتے یا چپل سے بے نیاز تھے۔ اس نے صبح شاید منہ بھی نہیں دھویا تھا۔ اس کے باوجود اس کا سرخ و سفید رنگ دمک رہا تھا۔ ماتھے پر دائیں طرف بالوں سے ذرا نیچے انگوٹھے کے نشان کے برابر کا ایک سرخی مائل دھبا تھا۔ یہ چوٹ کا نشان نہیں تھا بلکہ پیدائشی تھا۔ سنہری مائل بھورے بال بہت چھوٹے تھے۔ اس نے مشین

پھروائی ہوئی تھی۔ کچرا چننے اور ننگے پاؤں پھرنے کی وجہ سے اس کے ہاتھ پاؤں میلے ہو رہے تھے۔ نقوش اور آنکھیں خوب صورت اور معصومانہ تھیں۔ اس کی عمر شاید دس گیارہ سال تھی لیکن جسم بھرا ہوا اور صحت مند تھا۔ اس جیسے سیکڑوں بچے ہمارے آس پاس کچرے کے ڈھیر سے کارآمد چیزیں چنتے نظر آتے ہیں۔ یہ بھی ان میں سے ایک تھا۔ میں نے آج تک کسی ایسے بچے پر توجہ نہیں دی تھی لیکن اس میں نہ جانے کیا بات تھی، میں ٹھٹک گیا۔ اس نے ایک تھیلا پکڑ رکھا تھا اور اپنے کام کی ہر چیز وہ کچرے سے چن کر اس میں ڈال رہا تھا۔ کچھ دیر بعد اس نے محسوس کر لیا کہ میں اسے دیکھ رہا ہوں۔

''جی صاحب... کوئی کام ہے؟'' اس نے مخصوص لہجے میں اردو بولتے ہوئے کہا۔

''نہیں بیٹا.... تمہارا نام کیا ہے؟''

''سلطان۔'' اس نے کہا۔

''تم یہ کام کرتے ہو، کیا پڑھتے بھی ہو؟''

اس نے صرف نفی میں سر ہلایا۔ ظاہر ہے صبح سے شام تک کچرا چننے والا کہاں سے پڑھتا؟ میں نے اگلا سوال کیا۔

''تمہارے گھر والے ہیں؟''

اس نے پھر نفی میں سر ہلایا۔ ''پہلے تھا پر پہلے ماں مرا پھر باپ بھی مر گیا۔ دو بڑا بھائی ہے، وہ ملک واپس چلا گیا۔ اس کا بھی پتا نہیں ہے۔''

''کون سا ملک؟''

''ادھر قندھار.... میرا باپ ادھر سے آیا تھا۔'' اس نے بتایا تو میرے اندازے کی تصدیق ہو گئی۔ وہ افغانی تھا۔ ان لاکھوں افغان بچوں کی طرح جو ہمارے گلی کوچوں میں پھرتے ہیں۔

''بیٹا تم نماز پڑھتے ہو؟''

''جب نماز کے وقت مسجد پاس ہو اور اندر جانے دے تو پڑھ لیتا ہے۔'' اس نے سادگی سے کہا۔ اس کا مطلب تھا کہ اس کے گندے حلیے کی وجہ سے اکثر اسے مسجد میں جانے سے روک دیا جاتا ہوگا.... پھر وہ کام کے لیے پھرتا تھا تو اکثر نماز کے وقت مسجد سے دور ہوتا ہوگا۔ مگر وہ پڑھتا تھا۔ اس سے بات کر کے میں آگے بڑھ گیا۔ جمعے کا وقت قریب تھا۔ میں اس کے بارے میں سوچتا اور افسوس کرتا رہا۔ اتنا پیارا بچہ تھا۔ اگر کسی اچھے خاندان کا ہوتا تو اس وقت صاف ستھرے کپڑے پہن کر نماز پڑھنے جا رہا ہوتا۔

واپسی پر ماں اسے کھانا دیتی، وہ اسکول جاتا، دوستوں کے ساتھ شام کو کھیلتا، گھر والوں کے ساتھ خوش و خرم زندگی گزارتا۔ لیکن اس کے پاس تو کچھ نہیں تھا۔ شاید اپنا گھر تک نہیں تھا۔ کوئی رشتہ نہیں تھا۔ وہ نہ جانے کہاں سوتا ہوگا اور کن لوگوں کے ساتھ اٹھتا بیٹھتا ہوگا۔

میں مسجد میں بیٹھا اس کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ میں ایک دفتر میں کام کرتا ہوں اور عام طور سے جمعہ اسی دفتر کے پاس کی مسجد میں پڑھتا ہوں لیکن آج ہالی ڈے تھا اس لیے گھر میں تھا اور اپنی محلے کی مسجد میں نماز پڑھنے کا موقع ملا تھا۔ اس مسجد کے امام صاحب سے میری اچھی واقفیت اور سلام دعا تھی۔ ایک تو وہ نہایت سلجھی ہوئی سوچ کے مالک تھے۔ دوسرے باعلم ہی نہیں باعمل بھی تھے۔ میں نے جب بھی ان سے جمعے کی نماز کا خطبہ سنا انہوں نے کوئی نہ کوئی کام کی بات بتائی جس کا ہم مسلمانوں کو عملی زندگی میں مظاہرہ کرنا چاہیے۔ انہوں نے کبھی فرقہ واریت یا مذہبی تصادم پر بات نہیں کی اور نہ ہی قصے کہانیاں سنانے کی کوشش کی۔ ان کا سب سے زیادہ زور اسلام کی عملی اخلاقیات پر ہوتا تھا جسے چھوڑ کر آج ہم مسلمان پستی کی انتہا کو پہنچ چکے ہیں اور غیر مسلم ان ہی اخلاقیات کو اپنا کر آسمان کی بلندیوں کو چھو رہے ہیں۔

اتفاق کی بات ہے، اس دن امام صاحب یتیم بچوں کے موضوع پر بات کر رہے تھے۔ وہ قرآن کریم اور حدیث مبارکہ کی رُو سے یتیم بچوں کی پرورش، کفالت اور ان کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کے فضائل بیان کر رہے تھے۔ انہوں نے کہا۔ ''میرے بھائیو.... ہم بہت گناہ گار ہیں، ہماری عبادات بھی ریاکاری سے خالی نہیں ہیں۔ نماز میں دنیا کا خیال اور روزے میں افطاری کے منصوبے اور حج میں شاپنگ کا ارادہ ہوتا۔ ایسے میں کیا منہ لے کر اللہ کے سامنے جائیں گے۔ ہم مسلمان تن آسان ہو گئے ہیں۔ ہر چیز کا شارٹ کٹ تلاش کرتے ہیں۔ تو بھائیوں جنت کا شارٹ کٹ بھی ہے۔ اگر سچے دل سے عبادت نہیں کر سکتے تو کسی انسان کے ساتھ ایسی نیکی کر لیں کہ اللہ اس کے واسطے ہمیں معاف کر دے۔ قربان جایئے اس رب کے جو بندوں کو جنت دینے کے بہانے تلاش کرتا ہے اور افسوس ہے ان لوگوں پر جو جنت نہ لینے کے بہانے کرتے ہیں۔ میرے بھائیو... جنت کما لو.... عبادت سے نہ سہی اخلاق سے کما لو۔ لمبے راستے سے نہ سہی شارٹ کٹ سے پہنچ جاؤ۔''

امام صاحب کی یہ بات میرے دل کو لگی تھی۔ واقعی ہم

ایک عجیب سی زندگی گزار رہے ہیں جس میں عبادات بھی خالص نہیں ہیں۔ ان میں بھی ریاکاری اور دنیا دکھاوا شامل ہو گیا ہے۔ ایسے میں ہمیں ایسی ہی نیکیوں کی ضرورت ہے۔ کچھ دیر بعد جمعے کی نماز شروع ہو گئی۔ نماز پڑھ کر اکثر لوگ بغیر دعا میں شریک ہوئے عجلت میں باہر نکلنے لگے۔ اچانک باہر سے شور بلند ہوا۔ کسی کے چلّانے کی آواز آئی اور پھر شور بڑھتا چلا گیا۔ امام صاحب نے دعا روک دی تھی۔ لوگ باہر نکل کر دیکھ رہے تھے کہ کیا بات ہے۔ اکثر تو گھبرا گئے تھے۔ جب سے مسجدوں اور عبادت گاہوں میں بم دھماکے اور حملے شروع ہوئے ہیں، لوگ ڈرنے لگے ہیں۔ سچی بات ہے مجھے بھی ڈر لگتا ہے۔ میں باہر کی طرف آیا تو اس بار کسی بچے کے رونے کی آواز آئی۔ ایک آدمی زور زور سے بول رہا تھا اور کچھ لوگ اسے سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔ رش کم ہوا تو منظر دکھائی دیا اور میں نے اسی کچرا چننے والے بچے سلطان کو دیکھا وہ رو رہا تھا اور اس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ میں بے قرار ہو کر اس کے پاس پہنچا۔

''کیا ہوا تمہیں کس نے مارا ہے؟''

''لو آ گئے ان بھک منگوں کے حمایتی۔'' اسی آدمی نے کہا۔ ''پتا نہیں انہیں مسجد میں آنے کی اجازت کیوں ہے۔''

''بھائی مسجد اللہ کا گھر ہے آپ کا نہیں۔'' میں نے غصہ ضبط کرتے ہوئے نرم لہجے میں کہا۔ ''یہاں کسی کلمہ گو کو آنے سے نہیں روکا جا سکتا۔''

''اس جیسے بھک منگوں کو روکنا ہوگا ورنہ یہ مسجد کو بھی کچرے کا ڈھیر بنا دیں گے۔ دیکھو اپنا بورا تک یہاں لے آیا ہے۔''

اس آدمی نے سلطان کو بے دردی سے مارا تھا۔ اس کے چہرے پر نشان تھے اور ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ میں اسے وضو والے حصے میں لایا اور اس کی ناک پر پانی ڈالا تاکہ خون رک جائے۔ وہ چپ ہو گیا تھا۔ اب کچھ لوگوں نے ان صاحب کو سنانا شروع کر دی تھی اس لیے انہوں نے وہاں سے رخصت ہو جانا مناسب سمجھا۔ ہوا یہ تھا کہ جمعے کے وقت سلطان نماز کے لیے اندر آیا اور اسے مشکل سے جگہ ملی تو وہ ان صاحب کے ساتھ کھڑا ہو گیا۔ اس کا گندہ لباس ان کے صاف ستھرے لباس سے لگا تو انہیں غصہ آ گیا اور وہ سلام پھیرتے ہی اس پر برس پڑے اور پھر اسے مارا تھا۔ حالانکہ یہ اتنا بڑا قصور نہیں تھا۔ میں نے سلطان سے کہا۔

''میرے ساتھ چلو۔''

''ابھی کام کرتا ہے۔'' اس نے کہا۔

''کام کر لینا، کھانا میرے گھر کھا لو پھر کام پر چلے جانا۔''

امام صاحب نے دعا کرا دی تھی اور اس چکر میں، میں شرکت سے رہ گیا تھا۔ بہرحال سلطان کو لے کر گھر روانہ ہوا۔ آج چھٹی کا دن تھا اس لیے حنا نے میری پسندیدہ بریانی اور مٹر قیمہ بنایا تھا۔ حنا میری بیوی ہے۔ یوں تو بہت سلیقہ مند ہے۔ گھر کو آئینے کی طرح چمکا کر رکھتی ہے لیکن کھانا ایسا لاجواب بناتی ہے کہ کھانے والا انگلیاں چاٹتا رہ جائے۔ میں اس سے کہتا ہوں کہ اس کے ہاتھ میں بہت ذائقہ ہے تو وہ ہنستی ہے۔ ''جی نہیں اصل بات یہ ہے کہ میں پوری توجہ اور محنت سے کھانا بناتی ہوں، یہ ہاتھ کے ذائقے والی بات گپ ہے۔ اگر ہاتھ میں ذائقہ ہو تو بھلا محنت کرنے کی کیا ضرورت ہے، جیسا چاہے پکا کر رکھ دو۔''

''یہ تو ہے۔'' میں کہتا۔ ''پر ہمارے ہاں تصور تو یہی کیا جاتا ہے۔''

شادی کے دس سال بعد بھی اللہ نے ہمیں اولاد کی نعمت نہیں دی تھی۔ کوئی جسمانی مسئلہ نہیں تھا۔ میں اور حنا دونوں ہی ٹھیک تھے۔ پھر بھی بہت جتن کیے، علاج کرایا، ٹوٹکے استعمال کیے۔ اللہ سے دعائیں مانگیں۔ بس پیروں فقیروں کے پاس جانے کی کسر رہ گئی تھی لیکن میں اور حنا دونوں ہی اس کے قائل نہیں تھے۔ میں تو اللہ سے بھی اس کی رحمت کے ساتھ مانگتا تھا کیونکہ جو چیز اللہ سے ضد کر کے مانگی جائے اس کے ساتھ آزمائش بھی آتی ہے۔ میرے چچا کی سات بیٹیاں ہیں اور چچا چچی دونوں کو بیٹے کی اشد خواہش تھی۔ انہوں نے بیٹے کے لیے وہ سب بھی کیا جو ہم اولاد کے لیے نہیں کر سکے تھے۔ پھر اللہ نے ان کی خواہش پوری کی اور بیٹا دیا۔ مگر وہی بیٹا آج ان کے لیے باعثِ آزار بنا ہوا ہے۔ حد درجے لاڈ پیار نے اسے بگاڑ دیا۔ تعلیم اس نے اسکول کے زمانے میں خیرباد کہہ دی تھی اور بعد میں غلط صحبت میں پڑ گیا، نشہ کرنے لگا، جرائم کرنے لگا۔ آئے دن پولیس کچہری کے چکر لگتے تھے۔ اب وہ پچھتاتے تھے کہ بیٹا کیوں مانگا۔ اس کی جگہ بھی بیٹی ہو جاتی تو اچھا تھا۔ حالانکہ یہ بھی ٹھیک نہیں ہے۔ اولاد اللہ کی دین ہے۔ ہمارے ہاں لوگ لڑکے کو ترجیح دیتے ہیں اور بعض لڑکیوں کو اچھا سمجھتے ہیں۔ یہ دونوں باتیں ٹھیک نہیں ہیں۔

اولاد کے لیے کوشش کرکے ناکامی کے بعد ہم نے اسے اللہ پر چھوڑ دیا کہ ہماری نصیب میں ہوئی تو ملے گی اور نہیں ہوئی تو کچھ بھی کرلیں نہیں ملے گی۔ تین سال پہلے امی دنیا سے گزر گئیں تب سے بس ہم دونوں میاں بیوی تھے۔ ابو کا میری شادی سے پہلے انتقال ہوگیا تھا۔ باقی سب بہن بھائی شادی شدہ اور اپنے گھر والے ہیں۔ امی میرے ساتھ رہتی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ میری اولاد نہیں ہے اس لیے وہ میرے ساتھ رہیں گی تاکہ حنا کو اکیلا پن کم محسوس ہو۔ امی کے بعد یچ مچ ہمیں بہت اکیلا پن محسوس ہوا تھا۔ اس لیے کبھی کبھی ہم سوچتے کہ کوئی بچہ اڈاپٹ کرلیں مگر اس میں بھی بہت سے مسئلے مسائل تھے۔ میرا اور حنا کا خاندان خاصا بڑا ہے۔ میرے چھ بہن بھائی ہیں اور حنا کے سات بہن بھائی تھے۔ سب بال بچوں والے تھے اور ہم سوچتے کہ ان ڈھیروں بچوں میں ہمارے لیے ہوئے بچے کی کیا اہمیت ہو گی۔ پھر لڑکے اور لڑکی کے حوالے سے بعض مسائل تھے۔ بس ان ہی وجوہات کی بنا پر ہم رہ گئے ورنہ بعض اوقات تو ہم بچہ اڈاپٹ کرنے کے پاس بھی پہنچ گئے تھے۔

میں ایک نجی کمپنی میں کام کرتا تھا۔ اس لیے عام دفتری اوقات سے زیادہ وقت دینا پڑتا تھا۔ اکثر دفتر سے آتے ہوئے سات آٹھ بج جاتے تھے اور حنا کو اکیلے رہنا پڑتا تھا۔ ہم دو ہی افراد تھے اور گھر بھی چھوٹا سا تھا۔ سارا کام چند گھنٹوں میں نمٹ جاتا تھا اور اس کے بعد حنا ٹی وی دیکھ کر اور مطالعہ میں وقت گزارتی تھی۔ چھٹی کے دن ہم کہیں نہ کہیں مدعو ہوتے تھے یا ہمارے گھر کوئی آجاتا تھا۔ اس ایک دن کے سوا حنا کے لیے باقی چھ دن مشکل ہوتے تھے۔ میں نے اس سے کئی بار کہا کہ وہ کوئی مصروفیت تلاش کرلے۔ وہ گریجویٹ تھی چاہتی تو کسی اسکول میں پڑھا سکتی تھی مگر اس نے انکار کردیا۔ ”بچوں کو دیکھ کر مجھے اپنی محرومی کا اور احساس ہوگا۔“

حنا اور میری بچوں کے لیے تڑپ دیکھتے ہوئے اس کے اور میرے بہن بھائیوں نے کئی بار کوشش کی کہ اپنا بچہ ہمیں دے دیں۔ مگر مجھے لگتا تھا کہ ماں باپ کے ہوتے ہوئے کسی بچے کو اڈاپٹ کرنا اس کے ساتھ ظلم ہوگا کیونکہ جو محبت اور توجہ اسے ماں باپ دے سکتے وہ کوئی اور نہیں دے سکتا ہے اس لیے بچہ اس فطری محبت اور توجہ سے محروم ہو جائے گا جو اس کا حق بنتا ہے۔ یوں ہم اس لحاظ سے بھی رہ گئے تھے۔ مگر اب خیال آتا ہے اگر ہم لے لیتے تو شاید ہمارا گھر اتنا سونا نہ ہوتا۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہم ناخوش یا غیر مطمئن تھے۔ اللہ کا شکر ہے میرے اور حنا کے درمیان وہ مکمل محبت اور اعتماد ہے جو میاں بیوی کے درمیان ہونا چاہیے۔ ہم ایک دوسرے کا بڑھ چڑھ کر خیال رکھتے ہیں۔ میں نے حنا کو کبھی کوئی کمی ہونے نہیں دی۔ اسی طرح اس نے کبھی مجھے میری حیثیت سے بڑھ کر پریشان نہیں کیا۔ وہ ہر چیز لیتی تھی لیکن ایک حد میں رہ کر۔

میں نے کال بیل بجائی تو حنا نے دروازہ کھولا۔ ”آپ نے دیر کردی میں کال کرنے والی....“ وہ بولتے بولتے رک گئی۔ اس نے سلطان کو دیکھ لیا تھا۔ ”رمیز یہ کون ہے؟“

”یہ سلطان ہے۔“ میں نے تعارف کرایا۔ ”مجھے مسجد میں ملا تھا۔ آج یہ دوپہر کا کھانا ہمارے ساتھ کھائے گا۔“

حنا کچھ کہنے والی تھی کہ میری آنکھ کا اشارہ دیکھ کر رک گئی۔ ”اسے اندر لے آئیں۔“

”آجاؤ بیٹا۔“ میں نے سلطان سے کہا۔

”ہم یہ بھی لے آئے۔“ اس نے بورے کی طرف اشارہ کیا جس سے بہت زیادہ بو اٹھ رہی تھی۔

”نہیں اسے یہیں رکھ دو کوئی نہیں چھیڑے گا۔“ میں نے کہا۔ ”اگر کسی نے چھیڑا اور تمہارا نقصان ہوا تو میں پورا کروں گا۔“

اس نے بورا رکھا اور اندر آگیا۔ گھر کے صاف ستھرے ماحول میں آنے کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ وہ کتنا گندہ ہو رہا تھا۔ کپڑوں سے لے کر اس کے ہاتھ پاؤں تک سب غلیظ ہو رہے تھے۔ گھر میں بس میرے ناپ کے سوٹ تھے جو اسے بہت بڑے ہوتے ورنہ میں اسے اپنے کپڑے دے دیتا۔ بہرحال میں اسے واش روم میں لایا۔ ”تم اچھی طرح منہ ہاتھ دھولو.... جب تک کھانا لگ رہا ہے۔“

اس نے سر ہلایا۔ میں نے اسے صابن دیا اور باہر آگیا۔ تقریباً دس منٹ بعد وہ باہر آیا تو اس نے سچ مچ خود کو بہت حد تک صاف کرلیا تھا۔ کم سے کم ہاتھ پیر چمک گئے تھے۔ مگر کپڑوں کا کچھ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ حنا نے ہمارے لیے دسترخوان لگا دیا تھا۔ خود وہ شامل نہیں ہوئی تھی۔ میں نے کہا بھی نہیں، مجھے اندازہ تھا کہ سلطان کے کپڑوں سے آتی بدبو اس سے برداشت نہیں ہوگی۔ خود میں مشکل سے برداشت کر رہا تھا۔ سلطان بہت بھوکا تھا۔ کھانا سامنے آتے ہی وہ ٹوٹ پڑا تھا۔ اس نے پلیٹ میں مٹر قیمہ نکالا اور بڑے بڑے نوالے لے کر کھانے لگا۔ میں نے اسے ٹوکا نہیں۔ وہ تربیت یافتہ بچہ نہیں تھا۔ اس سے توقع نہیں کرسکتے تھے کہ وہ تمیز اور سلیقے سے کھائے گا۔ اسے ٹوکتا تو شاید وہ پھر اس طرح نہ کھاتا۔ میں نے اپنی پلیٹ میں نکالا اور کھانے لگا۔ کچھ دیر بعد اس کی بھوک کم ہوئی اور اس نے دیکھا کہ میں کیسے کھا رہا ہوں تو وہ کچھ شرمندہ ہوا تھا اس نے رک رک کر کہا۔ ”صاحب.... ہم ایسے.... ہی کھاتا ہے۔“

”صاحب نہیں انکل بولو.... یا چچا بولو.... اور تم اپنے طریقے سے کھاؤ۔“ میں نے اسے تسلی دی۔ وہ خوش ہوگیا۔

”ٹھیک چاچا.... کھانا بہت مزے کا ہے۔“

”یہ بریانی بھی لو.... یہ بھی اچھی بنی ہے۔“

وہ بریانی کھانے لگا۔ عمر کے قطع نظر اس کی خوراک اچھی خاصی تھی۔ وہ سارا دن گھومنے اور محنت کرنے والا بچہ تھا۔ ورنہ ہمارے خاندان میں اتنے بڑے بچے کھانے میں نخرے کرتے ہیں اور مارے باندھے تھوڑا بہت کھا لیتے ہیں۔ ان کا زیادہ زور باہر کی چیزوں پر ہوتا ہے۔ ان کی صحت بھی سلطان کے مقابلے میں معمولی سی ہے۔ حالانکہ ماں باپ دنیا جہاں کی نعمتیں ان کے آگے رکھتے ہیں اور سلطان کے بارے میں مجھے یقین تھا کہ اسے ڈھنگ سے دو وقت کا کھانا بھی نہیں ملتا ہوگا۔ اس کے باوجود اس کی صحت بہت اچھی تھی۔ اس نے پیٹ بھر کر تقریباً میرے برابر کھایا تھا۔ پھر اس نے ہاتھ روک لیا۔ میں نے اور لینے کو کہا تو وہ بولا۔ ”بس چاچا.... پیٹ بھر گیا ہے۔“

حنا میٹھا لے آئی تھی۔ اس نے گاجر کا حلوا بنایا تھا۔ وہ بھی اس نے شوق سے کھایا۔ اس دوران میں میں نے اس سے انٹرویو کیا۔

”تم جو کچرے سے چنتے ہو اس کا کیا کرتے ہو؟“

”ہم اسے لے جا کر الگ الگ کرتا ہے۔ دھات الگ، پلاسٹک الگ، شیشہ الگ اور کپڑا کاغذ الگ۔ پھر کباڑی تولتا ہے اور سب کا الگ الگ حساب کرکے پیسا دیتا ہے۔“

”دن کا کتنا کما لیتے ہو؟“

”کبھی سو روپے.... کبھی پچاس روپے اور کبھی نوے روپے۔“

”رہتے کہاں ہو؟“

”ادھر کباڑی نے جگہ دیا ہوا ہے۔ ہمارے ساتھ اور بچہ بھی ہے۔“

”کھاتے پیتے کہاں ہو؟“

”پاس ہوٹل ہے ادھر صبح کا ناشتا کرتا ہے اور شام کو کھانا کھاتا ہے۔“

”دن میں نہیں کھاتے؟“

”دن میں کھائے گا تو کام کیسے کرے گا۔“ اس نے کہا۔ ”پھر اتنا پیسا بھی نہیں ہوتا۔ ناشتے اور رات کے کھانے میں ہی پچاس روپیا لگ جاتا ہے۔“

”تم اس سے زیادہ کماتے ہو تو باقی رقم کہاں خرچ کرتے ہو۔“

”باقی ہم جمع کر رہا ہے جب ذرا بڑا ہوگا تو اپنا کام کرے گا۔ خود کباڑی بن جائے گا پھر دوسرا لوگ ہمارے لیے کام کرے گا۔“

مجھے اس کی سمجھ بوجھ اور مستقبل کی پلاننگ پر تعجب ہوا۔ اس نے ابھی سے سوچ لیا تھا کہ اسے کیا کرنا تھا۔ حالانکہ وہ تعلیم یافتہ نہیں تھا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ تعلیم یافتہ ہونے کا فائدہ نہیں ہے لیکن جس طرح ہماری نئی نسل تعلیم حاصل کرکے بھی اپنے مستقبل سے بے پروا ہے ان سے اچھا تو یہ ان پڑھ بچہ تھا جس نے اپنے مستقبل کا ابھی سے تعین کر لیا تھا۔ میں نے پوچھا۔ ”رقم کسی کے پاس جمع کراتے ہو؟“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”ہم چھپا کر رکھتا ہے.... کسی کو دے گا اور وہ بعد کو مکر گیا تو ہم کیا کرے گا۔“

اس معاملے میں بھی وہ بہت ہوشیار تھا۔ مجھے لگا اگر اسے باقاعدہ تعلیم مل جاتی تو وہ یقیناً بہت آگے جاتا۔ اس کے پاس ایک خاص سمجھ بوجھ تھی۔ وہ تقریباً ایک گھنٹا میرے پاس رہا پھر کھڑا ہوگیا۔ ”اب ہم جائے گا آج کم چیز ملے گا۔“

”کوئی بات نہیں کل تم کو زیادہ بھی مل سکتا ہے۔“

”جتنا وقت لگائے گا اتنا زیادہ ملے گا۔“ اس نے حقیقت بیان کی۔ میں اسے باہر تک چھوڑنے آیا۔ اس نے بورا اٹھانے سے پہلے مجھ سے ہاتھ ملایا۔ ”چاچا.... تمہارا شکریہ اتنا اچھا کھانا کھلایا.... چاچی کو بھی شکریہ کہنا اس نے بہت اچھا بنایا ہے۔“

میں خوش ہوا۔ ”شکریے کی ضرورت نہیں ہے بیٹا.... تم نے میرا گھر دیکھ لیا ہے، کوئی مسئلہ ہو یا ضرورت ہو تو آجانا.... میرے بس میں جو ہوا تمہارے لیے کروں گا۔“

میں واپس اندر آیا تو حنا منتظر تھی۔ ”رمیز یہ کون تھا؟“

"بتاتا ہوں۔" میں نے کہا پھر اسے سلطان کے بارے میں بتایا۔ وہ بھی حیران ہوئی تھی۔

"اتنا سا بچہ اور آگے کا بھی سوچ کر رکھا ہے۔"

"ہاں نام کا بھی اثر ہے اس پر۔" میں نے کہا۔ "اکثر سلطان کہلانے والے حکمران اسی طرح بہت نیچے سے اٹھ کر اوپر تک گئے تھے۔ شاید یہ بھی اسی طرح آگے جائے۔ نہ صرف سمجھدار ہے بلکہ تمیز والا بھی ہے، جاتے ہوئے میرا اور تمہارا شکریہ ادا کر کے گیا ہے۔"

"لیکن گندہ کتنا تھا۔" حنا نے کہا۔ "شکر ہے آپ نے مجھے کھانے پر آنے کو نہیں کہا۔"

"مجھے اندازہ تھا اسی لیے نہیں کہا۔"

اس دن ہم سلطان کی باتیں کرتے رہے۔ میں نے حنا کو امام صاحب کے آج کے خطبے کا بتایا۔ وہ بھی متاثر ہوئی تھی۔ "ٹھیک کہا انہوں نے، ہماری عبادات بھی کھوکھلی رہ گئی ہیں۔ دوسروں کے ساتھ کی ہوئی نیکی ہی ہمیں بخشوا سکتی ہے۔"

"یہ سوچ کر میں اس بچے کو لایا۔ وہ یتیم ہے اور خود دار بھی ہے۔ ورنہ بھیک مانگنا تو زیادہ آسان کام ہے مگر وہ سارا دن ننگے پاؤں کچرے کے ڈھیروں سے چیزیں تلاش کرتا ہے۔ پھر یہ بوجھ اٹھا کر میلوں چلتا ہے۔ ذرا سوچو ہمارے جاننے والوں کے جو بچے ہیں وہ اتنے نازک مزاج ہیں کہ ان کے کھانے پینے کے شاپرز تک ان کے باپ اٹھا کر لاتے ہیں۔"

"یہ سخت جان ہوتے ہیں، انہیں بچپن سے کام پر لگا دیا جاتا ہے۔" حنا نے کہا۔ "پھر ان کو پتا ہوتا ہے انہیں اپنی زندگی خود ہی بنانی ہے اس لیے یہ جدوجہد بھی کرتے ہیں۔"

"حنا اگر شادی کے بعد ہمارا بیٹا ہوتا تو شاید وہ بھی اتنا ہی بڑا ہوتا۔" میں نے ٹھنڈی سانس لی۔ "شاید ایسا ہی ہوتا۔"

"ایسا نہیں ہوتا۔" حنا ہنسی۔ "میں سانولی ہوں اور آپ تو زیادہ سانولے ہیں، ہمارے بچے بھی ایسے ہی ہوتے۔ ایسے سرخ و سفید بچے تو خاندان میں ان کے بھی نہیں ہیں جو خود گورے چٹے ہیں۔"

وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ اس وقت مجھے خیال نہیں آیا لیکن رات جب سونے کے لیے لیٹے تو مجھے اچانک خیال آیا اور میں چونک گیا۔ حنا مجھے دیکھ رہی تھی اس نے پوچھا۔ "کیا ہوا رمیز آپ چونکے کیوں؟"

"ابھی مجھے بڑا عجیب سا خیال آیا ہے۔"

"کیسا خیال؟"

میں ہچکچایا پھر میں نے کہا۔ "حنا اگر ہم اس بچے کو رکھ لیں تو....؟"

وہ بھی چونک گئی۔ "یہ خیال آپ کو کیوں آیا؟"

"ذہن میں پہلے سے تھا لیکن واضح اب ہوا ہے۔ جب سے میں نے امام صاحب سے یہ بات سنی ہے کہ کسی یتیم بچے کے سر پر ہاتھ رکھیں، اسے گھر کی پناہ دیں یا اس کے ساتھ اچھا سلوک کریں تب بات ہے۔"

"ہم اسے اڈاپٹ نہیں کر سکتے۔" حنا نے کہا۔ "وہ دس گیارہ سال کا ہے۔"

"ہاں وہ سمجھدار ہے ہم اسے اڈاپٹ نہیں کر سکتے لیکن اسے ایک گھر دے سکتے ہیں۔ وہ سارا دن کچرا چنتا ہے۔ اس کے بجائے وہ اسکول جائے گا تو اس کی فطری ذہانت اور کھلے گی۔ پڑھ لکھ کر وہ اچھا مقام حاصل کر سکے گا۔"

"یہ تو ہے، تعلیم ہی انسان کو اور اس کی سوچ کو سنوارتی ہے۔" حنا بولی۔ "لیکن کیا یہ مناسب ہوگا؟"

"تمہارا کیا خیال ہے، یہ کس لحاظ سے نامناسب ہو سکتا ہے۔"

"دوسروں کے لحاظ سے۔" وہ بولی۔

"ہم اسے اڈاپٹ نہیں کر رہے اور نہ ہی اس کی شناخت اس سے چھینیں گے۔ وہ ہمارے ساتھ رہے گا، جب تک اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے قابل نہیں ہو جاتا۔ اس میں دوسروں کا مسئلہ کہاں سے آ گیا؟"

"دوسروں کو مسئلہ ہونا تو نہیں چاہیے لیکن ہوتا ہے۔" حنا نے گہری سانس لی۔ "اب لوگ ایک دوسرے کے معاملات میں دخل دینا اپنا فرض سمجھتے ہیں اور خاص طور سے اس قسم کے معاملات میں۔"

میں نے محسوس کیا کہ حنا دل سے تیار نہیں تھی اور یہ تو معاملہ ہی دل سے تیار ہونے کا تھا ورنہ ہم اس یتیم بچے سے اچھا سلوک نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے میں نے بات وہیں ختم کر دی۔ "زیادہ سوچنے کی ضرورت نہیں ہے، میرے ذہن میں ایسے ہی خیال آ گیا تھا۔"

حنا نے سر ہلایا اور ہم سونے کے لیے لیٹ گئے۔ آنے والے ایک دو دن مجھے سلطان کا خیال آتا رہا مگر پھر دفتر اور زندگی کی مصروفیت میں ذہن سے نکل گیا۔ ہم شہر کے

جس علاقے میں رہتے تھے یہاں مارکیٹیں کم اور دور تھیں اس لیے حنا کے بجائے میں ہی سودا سلف لاتا تھا۔ اتوار والے دن صبح ناشتے کے بعد میں سودے کی فہرست کی پرچی اور ٹوکری پکڑ کر نکل جاتا تھا۔ اس دن بھی صبح نکل رہا تھا کہ کال بیل بجی۔ عام طور سے اتنی صبح کوئی نہیں آتا تھا اور اگر آتا تو بتا کر آتا، میرا خیال تھا کہ کوئی پڑوسی ہوگا کسی کام سے آیا ہوگا مگر جب دروازہ کھولا تو سلطان کو سامنے پایا۔ وہ صاف ستھرے لباس اور حلیے میں سامنے کھڑا ہوا تھا اور اس نے ایک شاپر تھام رکھا تھا۔ میں نے خوشی سے کہا۔ "سلطان تم....."

سلام دعا کے بعد اس نے شاپر میری طرف بڑھایا۔ "چاچا یہ میں تمہارے اور چاچی کے لیے لایا ہے۔"

"یہ کیا ہے؟" میں نے شاپر تھام لیا۔ "آؤ اندر آؤ۔"

"نہیں ہم جائے گا بس یہ دینے آیا تھا۔ اُدھر وطن سے منگوایا ہے خاص آپ کے لیے.....خشک میوہ ہے۔"

وہ آ نہیں رہا تھا مگر میں اسے اندر لے ہی آیا۔ حنا سے چائے بنوائی اس نے ناشتے سے انکار کر دیا تھا۔ پہلی بار حنا نے اس سے بات کی۔ وہ اس کے صاف ستھرے حلیے سے متاثر ہوئی تھی۔ حنا نے اس سے رہائش کا پوچھا تو اس نے بتایا کہ وہ سہراب گوٹھ سے آگے ایک کچی بستی میں رہتا ہے جو سپر ہائی وے کے ساتھ ساتھ ہے۔"

ہم میاں بیوی حیران ہوئے تھے۔ "تم اتنی دور سے آتے ہو اور وہ بھی پیدل....؟"

"صبح بس کی چھت پر بیٹھ کر آتا ہے، شام کو سفورا چوک سے کباڑی کا گاڑی آ کر لے جاتا ہے۔"

سفورا چوک بھی یہاں سے بہت دور تھا اور پھر وہ سارا دن چلتا رہتا تھا۔ ہمیں اس کی ہمت پر رشک آیا تھا۔ میرا یہ حال تھا کہ نصف کلومیٹر دور مارکیٹ سے سودا لا کر تھک جاتا تھا۔ سلطان اتنی دور سے آتا اور جاتا تھا۔ وہ بھی تقریباً بیس تیس کلوگرام بوجھ کے ساتھ۔ وہ چائے پی کر چلا گیا۔ اس نے دوپہر کے کھانے تک رکنے سے انکار کیا تھا۔ "چاچا یہ بھی تمہارے لیے وقت نکال کر آیا ہے۔ ابھی کام پر واپس جائے گا۔ آدھا دن کام کرے گا تو آدھا پیسا ملے گا۔"

"تمہارا شکریہ بیٹے۔" میں نے کہا حنا نے بھی اس کا شکریہ ادا کیا۔ وہ خوش ہو کر گیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد حنا نے شاپر کھولا تو اس میں آدھا آدھا کلوگرام کے چلغوزے، کاجو، بادام اور اخروٹ گری کے پیکٹ تھے۔ اس نے حیرت سے کہا۔ "رمیز یہ تو ہزاروں کا ہے۔"

اس وقت چلغوزے ہی پندرہ سو روپے کلو مل رہے تھے۔ کاجو، بادام اور اخروٹ گری بھی ہزار کے آس پاس فی کلوگرام تھے اور یہ سب بہت اعلیٰ درجے کا ڈرائی فروٹ تھا۔ اس چھوٹے سے بچے کی اس حرکت نے ہمیں ششدر کر دیا تھا۔ ہم نے کیا کیا تھا، ایک وقت کا کھانا کھلایا تھا اور اس سے اچھی طرح پیش آئے تھے مگر اس نے تو بہت زیادہ کر دیا تھا۔ یہ اس کا خلوص اور محبت کے ساتھ ادا کیا جانے والا شکریہ تھا۔ اس نے ہمارے دل موہ لیے تھے۔ حنا نے بے چین ہو کر کہا۔ "رمیز ہمیں اس کے لیے کچھ کرنا چاہیے۔"

"مثلاً کیا؟"

"ہم اس کے لیے کچھ لیتے ہیں۔ جیسے اچھا سا شلوار سوٹ، اسے چپل کی ضرورت بھی ہوگی۔"

"آج اس نے اچھا سوٹ پہنا تھا اور اس کے پیروں میں اچھی چپل بھی تھی۔" میں نے کہا۔ "اگر ہم بدلے میں کچھ کریں گے تو یہ اس کے تحفے کی توہین ہوگی۔ ہاں دل سے کچھ کریں تو الگ بات ہے۔ اس دن ہم نے جو کیا تھا، وہ دل سے کیا تھا اور آج اس نے جو کیا وہ دل سے کیا۔ دل سے کی جانے والی مہربانیوں کا صلہ نہیں دیا جاتا۔"

حنا نے سوچا اور قائل ہو گئی۔ "آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں پر میں اس کے لیے کچھ کرنا چاہتی ہوں۔"

"تو کرو پر دل سے کرو۔"

حنا نے سوچا اور پھر دل سے اس نے یہ کیا کہ خود جا کر اس کے لیے کپڑا لے آئی۔ درزی کو ناپ بتا کر سلوایا۔ اس کے لیے اچھی سی سینڈل لی اور پھر آنے والے اتوار کو مجھ سے کہا۔ "یہ آپ اسے دے کر آئیں گے۔"

"میں اسے تلاش کیسے کروں گا؟"

"اس نے پتا بتایا تھا، مجھے یاد ہے سپر ہائی وے پر شیل کے پمپ سے آگے جو کچی بستی ہے وہ وہاں رہتا ہے۔ نیاز خان کے ہوٹل میں کھاتا ہے۔ وہاں سے آپ کو پتا چل جائے گا۔"

"چلو ٹھیک ہے۔"

اس دن حنا کی ایک بہن کے گھر ہماری دعوت تھی۔ وہ سپر ہائی وے پر آباد ایک پوش سوسائٹی میں رہتی تھی۔ حال ہی میں یہاں اپنا گھر بنایا تھا۔ وہ جگہ جس کا پتا سلطان نے مجھے

بتایا تھا اس جگہ سے کچھ ہی دور تھی۔ میں شام کے وقت سالی کے گھر سے نکلا اور وہاں پہنچ گیا۔ پیٹرول پمپ سے آگے دور تک خیمے اور کچی جھونپڑیوں سے آباد یہ بستی خاصی بڑی تھی۔ وہاں عجیب وغریب حلیوں والے لوگ گھوم رہے تھے اور کئی کے پاس مجھے اسلحہ بھی نظر آیا۔ میں سب سے الگ نظر آ رہا تھا اس لیے لوگ مجھے گھور تو رہے تھے لیکن کسی نے کچھ کہا نہیں اور نہ ہی پاس آنے کی کوشش کی۔ میں خود پوچھتا ہوا نیاز خان کے ہوٹل پہنچ گیا۔ وہاں کاؤنٹر پر موجود نیاز خان سے سلطان کا پوچھا۔ ماتھے پر سرخ نشان سے وہ پہچان گیا۔

''وہ ابھی ادر آئے گا رات کا کھانا ادر ہی کھاتا ہے۔''

''میرے پاس زیادہ وقت نہیں ہے، کیا تمہیں اس کی رہائش کا پتا ہے۔ وہ کسی کباڑی کے احاطے میں رہتا ہے، اس کے ساتھ کام بھی کرتا ہے۔''

''ام نہیں جانتا۔'' نیاز خان نے کہا اور اپنے کام میں لگ گیا۔ یہ جھونپڑپٹی ہوٹل تھا۔ چند میزیں اور ان کے گرد لکڑی کی بنچیں تھیں۔ مجبوراً میں وہاں بیٹھ گیا۔ نزدیک کچھ بچے آپس میں کھیل کم اور لڑ زیادہ رہے تھے مگر یہ ان کا کھیل ہی تھا کیونکہ وہ ہنس بھی رہے تھے۔ بے تکلفی سے ایک دوسرے کو مٹی میں گرا رہے تھے۔ ان کے کپڑے پہلے ہی اتنے گندے تھے کہ ان کو کوئی فرق نہیں پڑ رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ اس ماحول میں رہنے اور پلنے بڑھنے والا بچہ کیا سیکھے گا؟ سلطان آدھے گھنٹے بعد ہوٹل میں داخل ہوا۔ اس نے مجھے دیکھ لیا تھا کیونکہ وہ سیدھا میری طرف آیا تھا۔ وہ صاف ستھرے حلیے میں تھا یعنی کام سے فارغ ہو کر، وہ صاف ہو کر اس حلیے میں آ جاتا تھا۔

''چاچا تم اِدھر.....'' اس نے حیرانی سے کہا۔

''ہاں تمہاری چاچی نے کچھ بھجوایا ہے وہ دینے آیا تھا۔'' میں نے پیکٹ اس کے حوالے کیا۔

''بہت شکریہ چاچا پر تم کو اِدھر نہیں آنا چاہیے تھا۔ یہ جگہ ٹھیک نہیں ہے۔''

یہ بات میں بھی محسوس کر رہا تھا کہ جتنی دیر میں وہاں بیٹھا رہا مشکوک صورتوں اور حرکات والے افراد وہاں منڈلاتے رہے تھے اور ان کی ساری توجہ مجھ پر تھی۔ ''بس یار مجھے نہیں معلوم تھا تم اتنی خطرناک جگہ رہتے ہو۔''

سلطان نے میرے لیے چائے منگوائی۔ میں اسے منع کرتا رہ گیا تھا۔ چائے کے بعد وہ مجھے باہر تک چھوڑنے آیا تھا۔ وہ اکیلے جانے کی اجازت نہیں دے رہا تھا۔ شاید اس کی وجہ سے کسی نے مجھ سے تعرض نہیں کیا۔ وہاں سے نکل کر میں نے سکون کا سانس لیا۔ مگر حنا کو نہیں بتایا کہ میں کیسی خطرناک جگہ سے ہو کر آ رہا ہوں۔ میں نے اس تک سلطان کا شکریہ پہنچا دیا تھا۔ اس ملاقات کے بعد مجھے سلطان اور بھی اچھا لگا تھا۔ اس کی مثال ایسی تھی جیسے کوئلے کی کان میں ہیرا ہوتا ہے یا جیسے گدڑی میں لعل ہو۔ اس نے پوچھا نہیں اور میں نے اسے بتایا نہیں کہ پیکٹ میں کیا ہے؟ حنا نے پیکٹ میں گاجر کا حلوا بھی بھیجا تھا کیونکہ اس دن سلطان نے شوق سے کھایا تھا۔

میرا اندازہ تھا کہ سلطان روز نہیں لیکن ہر دوسرے تیسرے دن ہمارے علاقے میں کچرا چننے آتا ہوگا لیکن اس اتوار کے علاوہ وہ کبھی ہمارے گھر نہیں آیا۔ یہ بھی اس کی سمجھداری اور تمیز کی علامت تھی۔ اسے ہمارا اسٹیٹس معلوم تھا اور وہ جانتا تھا کہ کوئی کچرا چننے والا بچہ ہمارا دروازہ بجائے گا تو اس سے محلے والوں پر اچھا اثر نہیں ہوگا۔ اگر میں اسے لے کر آیا تو پھر اس کی ذمے داری نہیں تھی کہ محلے والے کیا سوچتے ہیں۔ میں صبح دفتر جاتا اور تقریباً رات کے وقت واپس آتا تھا اس لیے سلطان اگر ہمارے علاقے میں ہوتا تب بھی اس سے اتفاقیہ ملاقات کا سوال پیدا نہیں ہوتا تھا۔ اتوار والے دن جب میں باہر جاتا تو وہ نظر نہیں آتا شاید اتوار والے دن وہ یہاں نہیں آتا تھا۔ جب کئی ہفتے تک وہ نظر نہیں آیا تو رفتہ رفتہ اس کا ذکر بھی کم ہونے لگا۔ جب میں حنا سے اس کے بارے میں بات کرتا تو وہ چپ ہونے کے بعد جیسے سوچ میں پڑ جاتی تھی۔ شاید وہ سلطان کے بارے میں سوچتی تھی۔ ایک رات ہم ٹی وی دیکھ رہے تھے۔ کوئی خاص پروگرام نہیں تھا ایک نیوز چینل لگا یا ہوا تھا جس پر عام سی خبریں آ رہی تھیں۔ حنا نے اچانک پوچھا۔

''رمیز اگر ہم سلطان کو رکھنا چاہیں تو کیا وہ راضی ہو جائے گا؟''

میں نے گہری سانس لی۔ ''ابھی سے کیا کہہ سکتے ہیں..... ہو سکتا ہے مان جائے اور ہو سکتا ہے اسے اپنی یہی زندگی پسند ہو جس میں وہ آزاد ہے اور کسی کو جواب دہ نہیں ہے۔''

''لیکن مجھے لگتا ہے وہ ہمارے ساتھ رہنا پسند کرے گا۔''

میں نے حنا کی طرف دیکھا۔ ''کیا تم آمادہ ہو؟'' وہ ہچکچائی۔ ''سو فیصد نہیں..... ابھی کچھ خدشات

ہیں..... یوں سمجھ لیں کہ ستر فیصد راضی ہوں۔ آپ کیا کہتے ہیں؟''

''میں سو فیصد راضی ہوں۔'' میں نے یقین سے کہا۔ ''اگر میں اسے اپنے گھر میں رکھوں گا تو ہر ایک کا سامنا کر سکتا ہوں۔ وہ اس گھر میں ایک فرد کی حیثیت سے رہے گا۔ مجھے یقین ہے وہ مجھے مایوس نہیں کرے گا۔''

''وہ بالکل ان پڑھ ہے اور اسکول میں بچوں کے ساتھ ان فٹ ہوگا۔''

''اس مسئلے کا حل بھی نکالا جا سکتا ہے، ہم اسے ایک ڈیڑھ سال گھر پر پڑھا کر اس قابل کر دیں گے کہ اسے تیسری کلاس میں داخلہ مل جائے۔ اس کے بعد وہ جمپ کرے گا تو زیادہ سے زیادہ سترہ اٹھارہ سال میں میٹرک کر لے گا اور یہ آج کل میٹرک کے لیے نارمل ایج بن گئی ہے۔''

''افضر اٹھارہ کا ہو گیا ہے اور اس سال میٹرک کا امتحان دے گا۔'' حنا نے اپنے بڑے بھتیجے کا ذکر کیا۔

''اس طرح وہ بھی کر سکتا ہے۔ وہ ذہین ہے، مجھے یقین ہے وہ بہت جلد پک کرے گا۔ اگر وہ دس بارہ سال ہمارے پاس رہے گا تو اس کی زندگی بن جائے گی۔ اگر وہ پڑھنے میں غیر معمولی ہوا تو ہم اسے پروفیشنل ڈگری کے لیے بھی پڑھا سکتے ہیں۔''

''آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں، مجھے بھی یقین ہے ایسا ہی ہوگا۔''

''پھر تم کیوں ہچکچا رہی ہو؟''

''آپ جانتے ہیں آپ کے بہن بھائیوں اور میرے بہن بھائیوں نے کئی بار ہمیں بچہ دینے کی پیشکش کی لیکن ہم نے ہمیشہ انکار کیا۔ اب اگر ہم ایک غیر بچے کو اپنے گھر میں رکھتے ہیں تو یہ بات یقیناً ان لوگوں کو اچھی نہیں لگے گی اس پر باتیں ہوں گی۔ بس مجھے اسی سے خوف آ رہا ہے۔''

''باتیں تو اس وقت بھی ہوتیں جب ہم خاندان سے کوئی بچہ اڈاپٹ کر لیتے۔ جس کا نہیں کرتے وہی بات کرتا۔''

''وہ الگ بات ہوتی، بچہ بہرحال خاندان کا ہوتا اس لیے زبانیں کبھی نہ کبھی بند ہو جاتیں مگر یہاں ایسا ہوتا نظر نہیں آ رہا ہے ہمیں بہت کچھ سننے کو ملے گا اور مستقل ملتا رہے گا۔ ہمیں بار بار بتایا جائے گا کہ پرایا خون پرایا ہوتا ہے، پھر وہ جس نسل سے ہے اس کے بارے میں بھی لوگوں کی رائے

نکاح

مرد وعورت کو ازدواجی زندگی میں بندھ جانے کو نکاح کہتے ہیں۔ بموقع نکاح دو مرد یا ایک مرد دو عورتیں علاوہ نکاح پڑھانے والے کے بطور گواہ موجود ہونا لازمی ہیں۔ دونوں میں سے کسی ایک کے بھی نابالغ ہونے کی صورت اس کے ولی کی موجودگی لازمی ہو جاتی ہے۔ مہر کا تعین لازمی ہے۔ اکثر ممالک میں بوقت نکاح دولہا دولہن اکٹھے نہیں بیٹھتے۔ بلکہ وکیل کی مدد سے عورت کی رضا حاصل کی جاتی ہے۔ پاکستان میں عائلی قوانین کے ذریعے نابالغ کے نکاح کو ناجائز قرار دے دیا گیا ہے۔ شرعاً ایک بیوی کی موجودگی میں دوسری بیویاں بھی ہوتی ہیں قرآن مجید میں سورہ احزاب سورہ بقرہ اور سورہ النساء میں واضح طور پر نکاح کے بارے میں بہت بحث کی گئی ہے۔ عربی زبان میں نکاح کے اصل معنی پر اختلاف ہے۔ اک گروہ کہتا ہے کہ یہ لفظ وطی اور عقد کے درمیان لفظاً مشترک ہے۔ دوسری رائے میں یہ معناً مشترک ہے، تیسری رائے میں اس کے اصل معنی عقد تزویج کے ہیں اور وطی کے لیے یہ مجازاً مستعمل ہے۔ راغب اصفہانی نے دعویٰ کیا ہے کہ اس کے اصل معنی عقد ہیں۔ مولانا مودودی تحریر فرماتے ہیں۔ قرآن وسنت میں نکاح اک اصطلاحی لفظ ہے۔ جس سے مراد یا تو مجرد عقد تھے یا وطی بعد عقد لیکن وطی بلا عقد کے لیے اس کو کبھی بھی استعمال نہیں کیا گیا۔ اس طرح کے وطی کو تو قرآن وسنت زنا وسفاح کہتے ہیں نہ کہ نکاح۔ سورہ بقر میں مشرک عورتوں سے نکاح اور عدت کی مدت گزرنے سے قبل نکاح کا فیصلہ اور ماں بہن بھائی بیٹا بیٹی پھوپی، خالہ، بھتیجی اور بھائی سے نکاح حرام ہے۔ چار سے زائد نکاح بھی حرام ہیں۔ قرآن پاک میں بیواؤں، غلاموں اور لونڈیوں کے نکاح کرانے کا حکم ہے۔

مرسلہ: زرین شمسی، کراچی

اچھی نہیں۔ جب ہمیں کہا جائے گا تو کہیں نہ کہیں سلطان کو بھی سننے کو ملیں گی۔ اگر اسے بچانا چاہیں گے تو ہم باقی خاندان سے کٹ جائیں گے۔"

حنا ٹھیک کہہ رہی تھی۔ یہ ممکن نہیں تھا کہ ہم اسے گھر کا ایک فرد بناتے اور اس کے بعد اسے کہیں آتے جاتے ساتھ نہ رکھتے اور اگر دل پر جبر کرکے کہیں جاتے ہوئے گھر چھوڑ جاتے تب بھی دوسرے تو ہمارے گھر آتے اور تب ہم اسے کہیں اور بھیج بھی نہیں سکتے تھے۔ اس کا ہمارے خاندان... سے آمنا سامنا ہوتا اور ہم دوسروں کی زبانیں نہیں روک سکتے تھے۔ ہم نیکی کا سوچ کر یہ کرتے مگر لوگ اسے ہماری نیکی بھی نہ رہنے دیتے۔ میں نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا۔ "تم ٹھیک کہہ رہی ہو..... جب تک تم اس بات سے مطمئن نہیں ہو جاتیں ہم کوئی قدم نہیں اٹھائیں گے۔"

"میں جانتی ہوں وہ آپ کو بہت اچھا لگا ہے۔ میری دعا ہے کہ اللہ میرے دل سے یہ خوف اور وسوسے نکال دے۔"

"تم ذہن پر بوجھ مت لو..... اللہ یقیناً بہتر کرے گا۔" میں نے اسے تسلی دی۔ مگر دو دن بعد چھٹی کے دن میں حسبِ معمول سودا لینے جا رہا تھا کہ سلطان مجھے کچرا کنڈی کے پاس دکھائی دیا۔ اس نے بھی مجھے دیکھ لیا مگر خود میری طرف نہیں آیا۔ یہ معروف راہ گزر تھی اور لوگ آ جا رہے تھے۔ شاید اسی لیے اس نے خود میری طرف آنا مناسب نہیں سمجھا تھا۔ میں اس کی طرف بڑھا۔ "کیسے ہو سلطان؟"

"میں ٹھیک ہے چاچا۔" اس نے خوش ہو کر کہا۔ "تم کیسا ہے؟"

"بالکل ٹھیک....." میں نے کہا۔ "کل ہی میں اور تمہاری چاچی تمہارے بارے میں بات کر رہے تھے۔"

"میرے بارے میں کیا بات کر رہا تھا؟" اس نے بورا ایک طرف کرتے ہوئے پوچھا۔ آج بھی اس نے وہی میلا کچیلا لباس پہنا ہوا تھا۔ شاید یہ اس کا یونیفارم تھا اور اسے دھونے کا بھی فائدہ نہیں تھا کیونکہ اگلے دن ویسا ہی ہو جانا ہوتا تھا اس لیے وہ ایک ہی لباس مستقل پہنتا تھا۔ جب وہ پھٹ جاتا ہوگا تو کوئی دوسرا لباس یونیفارم بنا لیتا ہوگا۔ سلطان کے سوال پر میں ہچکچایا۔ جب تک حنا کی طرف سے مکمل رضامندی نہ ہوتی میں اس سے یہ بات نہیں کر سکتا تھا۔ مگر میں اس کا عندیہ تو لے سکتا تھا یہ سوچ کر میں نے اس سے پوچھا۔

"سلطان میں تمہیں کیسا لگتا ہوں۔"

"آپ بہت اچھے ہو۔" اس نے یقین سے کہا۔ "میں نے آپ جیسا کسی کو نہیں دیکھا۔"

"اور چاچی.....؟"

"وہ بھی بہت اچھا ہے۔ اس نے اتنا اچھا سوٹ اور چپل دیا۔"

"سلطان تمہیں ہمارا گھر کیسا لگا؟"

"بہت اچھا۔" اس نے اس بار ہچکچا کر کہا۔ "چاچا یہ سب کیوں پوچھ رہا ہے؟"

"سلطان تم نے دیکھا ہمارے گھر کوئی بچہ نہیں ہے۔ اللہ نے ہمیں دیا نہیں ہے اس لیے ہم نے سوچا ہے کہ کسی بچے کو اپنے ساتھ رکھ لیں، کسی ایسے بچے کو جس کا کوئی نہ ہو اور جو ہمارے ساتھ رہے۔ ہم اسے پڑھائیں لکھائیں اور اسے اچھا انسان بنائیں۔"

سلطان کے چہرے پر تغیر نمودار ہوا تھا۔ وہ بیک وقت خوش بھی تھا اور متذبذب بھی کہ میں جو کہہ رہا ہوں اس کا یہی مطلب ہے جو وہ سمجھ رہا ہے۔ اس نے کہا۔ "چاچا یہ تو اچھا ہے..... کسی کا زندگی سنور جائے گا..... اللہ آپ سے خوش ہوگا۔"

"بیٹا ہم اسی کی خوشنودی کے لیے کریں گے۔" میں نے کہا۔ "ایسا کرو تم اگلے ہفتے ہمارے گھر آؤ۔"

سلطان کے چہرے پر خوشی بڑھ گئی تھی۔ "چاچا ہم آئے گا ضرور آئے گا۔ صاف ستھرا ہو کر آئے گا۔"

"ہم تمہارا انتظار کریں گے۔" میں نے کہا اور اس کے سر پر ہاتھ پھیر کر آگے بڑھ گیا۔ سلطان سے بات کر کے میں بہت خوش تھا۔ واپسی پر میں نے حنا کو بتایا کہ سلطان سے ملاقات ہوئی تھی لیکن اسے یہ نہیں بتایا کہ میں نے اسے اگلے اتوار اپنے گھر بلایا ہے۔ میں اتوار کو ہی بتاتا لیکن میں نے محسوس کیا کہ سلطان کا سن کر وہ بھی خوش ہوئی تھی۔ مجھے امید تھی کہ اسے سلطان کے بارے میں فیصلہ کرنے میں زیادہ وقت نہیں لگے گا۔ اس کی ہچکچاہٹ دور ہو جائے گی اور بالآخر وہ میرے ساتھ متفق ہو جائے گی۔ مگر آنے والے اتوار سے ایک رات پہلے حنا کی امی کی طبیعت اچانک خراب ہوئی اور گھر والے انہیں نزدیکی اسپتال لے گئے۔ وہاں پہنچ کر پتا چلا کہ انہیں ہارٹ اٹیک ہوا ہے اور انہیں کارڈیو لے جانے کا مشورہ دیا۔ ہم کارڈیو لے گئے۔ ڈاکٹروں نے انہیں آئی سی یو میں داخل کر لیا۔ اگلے دن دوپہر میں ان کی

حالت بہتر ہوئی تو حنا کو ہوش آیا۔ میں اس کے ساتھ ہی تھا۔ تب مجھے خیال آیا اور میں نے حنا کو بتایا۔ "آج سلطان نے آنا تھا اب تو وہ آ کر چلا بھی گیا ہو گا۔"

"اوہ....!" حنا کو افسوس ہوا۔ "آپ اسے پھر بلا لیجیے گا۔ آپ بتا دیتے تو میں آپ کو گھر بھیج دیتی۔ بے چارہ بچہ اتنی دور سے آ کر واپس چلا گیا۔"

"کوئی بات نہیں، میں نے اس کی رہائش دیکھ لی ہے، اگر وہ نہیں آیا تو میں اس سے مل لوں گا۔" میں نے حنا کو تسلی دی۔ میں نے حنا کو یہ بھی بتایا کہ میں نے اشاروں میں سلطان سے ...... بات کی تو وہ بہت خوش ہو گیا تھا۔

حنا اپنی امی سے بہت اٹیچ تھی۔ اسے ان کے پاس چھوڑ کر میں گھر آ گیا۔ پھر آنے والے ایک ہفتے تک حنا بس دوبار چند گھنٹے کے لیے گھر آئی تاکہ چینج کرلے اور ضرورت کی کچھ چیزیں لے جائے۔ میں صبح دفتر جاتا اور شام کو سسرال چلا جاتا۔ کچھ دیر وہاں رک کر گھر آ جاتا۔ ان دنوں کھانا پینا باہر سے چل رہا تھا۔ رات کا کھانا سسرال میں کھاتا تھا۔ ایک ہفتے بعد میری ساس کی طبیعت سنبھلی تو حنا گھر آ گئی تھی۔ اتفاق سے یہ بھی اتوار کا دن تھا میں صبح اسے لینے گیا تو وہاں روک لیا اور پھر ہم رات کو واپس آئے تھے...... ہم گھر کے سامنے رکے۔ میں گاڑی کے لیے گیٹ کھول رہا تھا کہ پڑوسی شریف صاحب نکلے۔ انہوں نے آواز دی۔ "رمیز صاحب..... آج دوپہر میں ایک بچہ آپ کے گھر کی کال بیل بجا رہا تھا۔"

مجھے سلطان کا خیال آیا۔ میں نے حلیہ پوچھا تو وہ سلطان ہی تھا۔ وہ بے چارہ آج پھر آیا تھا اور ہم آج بھی اسے گھر پر نہیں ملے تھے۔ مجھے شدید افسوس ہوا۔ حنا کو پتا چلا تو اسے بھی افسوس ہوا تھا۔ "وہ مسلسل دو ہفتے سے آ رہا ہے اور ہم گھر پر نہیں ہوتے، وہ کیا سوچے گا کہ ہم نے اسے بلایا اور خود غائب ہو گئے۔"

"اب میں خود جا کر اس سے ملوں گا۔" میں نے حنا کو تسلی دی۔ مگر اس آنے والے پورے ہفتے دفتر میں ایسی مصروفیات رہیں کہ میں صبح جاتا اور رات دس بجے سے پہلے واپسی نہیں ہوتی تھی۔ میں سوچتا تھا کہ دفتر سے سلطان کے پاس چلا جاؤں مگر اس کا موقع نہیں ملا اور پھر اتوار آ گیا۔ میں نے سوچ لیا کہ آج وہ دن میں نہیں آیا تو شام کو میں خود اس کی بستی چلا جاؤں گا۔ حنا نے بھی میری تائید کی۔ ہم سارا دن

منتظر رہے۔ ہر کال بیل اور دستک پر بے تابی سے گیٹ پر جاتے تھے مگر وہ نہیں ہوتا تھا اس کی جگہ کوئی اور آیا ہوتا تھا۔ شام ہوئی تو میں جانے کے لیے تیار ہوا۔ حنا کچھ سوچ رہی تھی، میں نکلنے لگا تو اس نے کہا۔ "رمیز میں نے فیصلہ کر لیا ہے۔"

"کیسا فیصلہ؟"

"یہی کہ ہم سلطان کو اپنے پاس رکھیں گے اور اسے اچھا انسان بنانے کی کوشش کریں گے۔"

میں خوش ہو گیا۔ "رئیلی؟..... دل سے کیا ہے؟"

"ہاں ورنہ آپ سے کیوں کہتی۔" اس نے سر ہلایا۔ "آپ اسے لیتے آیئے گا اب وہ ہمارے پاس رہے گا۔"

"میں اسے لے آؤں گا۔" میں نے کہا اور روانہ ہو گیا۔ کچی بستی میں نیاز خان کے ہوٹل پہنچا اور سلطان کا انتظار کرنے لگا۔ نیاز خان مجھے پہچان گیا تھا۔ اس نے رسمی علیک سلیک کیا۔ میں نے اس سے سلطان کا پوچھا۔

"ابی آئے گا۔" اس نے بتایا۔ میں سلطان کا انتظار کرنے لگا۔ پہلے میں مغرب کے بعد آیا تھا اور سلطان کچھ دیر بعد آ گیا تھا۔ مگر اب عشا کی اذان ہو گئی تھی جب کہ دن بھی بڑھ گیا تھا مگر سلطان نہیں آیا۔ دوسرے لوگ آئے تھے اور ان میں بچے بھی تھے۔ میں ان سے سلطان کے بارے میں پوچھنے لگا۔ اکثر نے صاف انکار کر دیا کہ وہ کسی سلطان کو نہیں جانتے۔ پھر ایک بچے نے اقرار کیا کہ وہ سلطان کو جانتا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ کہاں رہتا ہے۔ اس پر بچے نے اس کباڑی کے احاطے کے بارے میں بتایا جہاں سلطان دوسرے بچوں کے ساتھ رہتا تھا۔ یہ علاقہ عجیب تھا اور یہاں زیادہ تر جرائم پیشہ بستے تھے لیکن میں ہمت کر کے سلطان کی رہائش کی تلاش میں نکل آیا۔ گلیوں سے گھومتا اور لوگوں سے پوچھتا ہوا بالآخر میں ایک احاطے تک پہنچا جہاں کباڑ خانے میں چند افراد تولنے اور اشیا کو الگ کرنے کا کام کر رہے تھے۔ میں نے ان سے سلطان کے بارے میں پوچھا تو ایک شخص آگے آیا۔ اس نے مجھ سے ہاتھ ملایا۔

"سلطان ادھر کام کرتا تھا پر اب چلا گیا ہے۔"

"کہاں چلا گیا ہے؟"

"اپنے ملک۔" اس نے شانے ہلائے۔ "اس کا رشتے دار لوگ آیا تھا اسے ساتھ لے گیا۔"

یہ سن کر میرا دل ڈوب گیا تھا کہ سلطان اب یہاں نہیں تھا۔ وہ واپس افغانستان چلا گیا تھا۔ مگر یہ سن کر مجھے تسلی ہوئی کہ اس کے رشتے دار اسے لے گئے تھے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

میں نے پھر بھی کباڑی سے تسلی کی۔ "تمہیں یقین ہے وہ اس کے رشتے دار تھے؟"

اس نے پھر شانے اچکائے۔ "سلطان تو یہی بولا تھا۔ جب وہ بولا تو میں نے مان لیا۔"

سلطان اس کے پاس کام کرتا تھا اس کی ذمّے داری نہیں تھا اس لیے اس کی بلا سے سلطان کہیں بھی جائے اور کسی کے ساتھ جائے۔ اگر وہ کچھ افراد کو اپنا رشتے دار بتا رہا تھا تو تصدیق کرنا اس کا کام نہیں تھا۔ میں نے کباڑی رزاق خان سے اس کا موبائل نمبر لیا اور اسے اپنا موبائل نمبر دیا۔ "اگر سلطان آئے یا اس کے بارے میں کوئی خبر آئے تو تم مجھے ضرور بتانا۔ تمہاری بہت مہربانی ہوگی۔"

"ہم بتائے گا۔" اس نے یقین دلایا۔ "پر تم کون ہے سلطان کو کیسے جانتا ہے؟"

"وہ میرے علاقے میں کچرا چنتا ہے۔ مجھے اچھا لگتا ہے میں اس کا خیال رکھتا ہوں اسے چیزیں دیتا رہتا ہوں۔"

"ٹھیک ہے ہم خیال رکھے گا۔"

میں مایوس لوٹ آیا۔ جب میں اکیلا گاڑی سے اترا تو گیٹ پر موجود حنا کا چہرہ بھی بجھ گیا تھا۔ اندر آ کر میں نے اسے تفصیل سے بتایا۔ اس نے گہری سانس لی۔ "رمیز ہم نے موقع گنوا دیا ہے۔"

"نہیں وہ آئے گا۔" میں نے امید و یاس کے درمیان میں کہا۔ "اسی لیے میں کباڑی کو اپنا نمبر دے کر آیا ہوں۔"

مگر حنا کا خیال نہیں بدلا تھا۔ "وہ ہم سے مایوس ہو کر گیا ہے اب وہ کبھی واپس نہیں آئے گا۔"

"حنا امید پر دنیا قائم ہے اور ہماری نیت نیک تھی۔ اللہ دیکھ رہا ہے اور وہی ہمارے لیے بہتر کرے گا۔"

سچی بات ہے میں خود بہت مایوس تھا اور مجھے رہ رہ کر خیال آ رہا تھا کہ سلطان ہم سے مایوس ہو کر گیا ہے۔ اب وہ شاید کبھی واپس نہ آئے۔ اس معاملے میں بس ایک یہی بات اچھی تھی کہ وہ اپنے رشتے داروں میں واپس گیا ہے اور جو اتنی دور سے لینے آئے تھے تو وہ یقیناً اس کی اچھی دیکھ بھال کرتے ورنہ انہیں آنے کی کوئی ضرورت نہیں تھی۔ چند دن یہ اداسی ہم پر طاری رہی اور پھر ہم کسی قدر نارمل ہو گئے۔

یہ ایک مہینے بعد کی بات ہے۔ میں دفتر سے آیا تو حنا کی طبعیت ٹھیک نہیں تھی۔ اس نے بتایا کہ اسے صبح سے چکر آ رہے تھے۔ میں فکر مند ہو گیا۔ "تم مجھے کال کر دیتیں۔"

"بس کبھی کبھی چکر آتے تھے۔" اس نے مجھے تسلی دینا چاہی۔ لیکن میں مطمئن نہیں تھا۔ اسی وقت اسے نزدیکی اسپتال لے گیا۔ وہاں ایمرجنسی میں چیک اپ کے بعد اسے لیڈی ڈاکٹر کے پاس بھیج دیا۔ میں ویٹنگ روم میں بیٹھ گیا۔ وقت گزاری کے لیے وہاں موجود اخبار اٹھا لیا۔ یہ شام کو شائع ہونے والا اخبار تھا جو اپنی چٹ پٹی خبروں اور رنگین تصاویر کی وجہ سے فروخت ہوتا تھا۔ میں نے فرنٹ پیج لیا۔ اس پر گزشتہ دنوں ہونے والے ایک خودکش حملے کی تفصیلات تھیں۔ ایک خودکش حملہ آور نے پولیس کی گاڑی کے پاس خود کو اڑا لیا تھا۔ اس دھماکے میں تین پولیس والے بھی ہلاک ہوئے تھے۔ اس حملے کی رنگین فوٹیج بھی دی گئی تھیں اور یہ خاصی خوفناک تھیں۔ ادھڑی لاشیں اور ہر طرف پھیلے انسانی اعضا تھے۔ ایک تصویر خودکش حملہ آور کی بھی تھی جس کی عمر تیرہ چودہ سال بتائی گئی تھی۔ میں نے تصویر دیکھی تو مجھے شبہ ہوا لیکن جب غور کیا تو یقین ہو گیا۔ میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا آ گیا تھا۔ وہ سلطان تھا۔ چہرے پر زخموں کے نشانات تھے جس کی وجہ سے شناخت کرنا ذرا مشکل تھا۔ لیکن ماتھے پر بالوں کے نیچے سرخ نشان واضح تھا۔

مجھے امام صاحب کی بات یاد آئی کہ لوگو، جنت کمالو شارٹ کٹ سے ہی سہی۔ میں نے دھندلائی آنکھوں سے سلطان کا چہرہ دیکھا۔ اس معصوم کو شارٹ کٹ کی کیا ضرورت تھی۔ میں سوچ رہا تھا کہ کسی نے میرا شانہ ہلایا۔ وہ نرس تھی۔

"سوری، میں نے آپ کو کئی بار آواز دی۔"

میں نے جلدی سے اپنی آنکھیں صاف کیں۔

"فرمائیے۔"

"رمیز انصاری آپ ہی ہیں؟"

"جی میں ہی ہوں۔"

"آپ کو ڈاکٹر بلا رہی ہیں میرے ساتھ آیئے۔"

وہ مجھے لیڈی ڈاکٹر کے کمرے میں لائی جہاں حنا موجود تھی اور اس کا چہرہ چمک رہا تھا۔ لیڈی ڈاکٹر نے مسکراتے ہوئے مجھ سے کہا۔ "مبارک ہو آپ دونوں ماں باپ بننے والے ہیں، شی از ناؤ پریگنینٹ۔"

اس بار میری آنکھوں میں آنسو کسی اور وجہ سے آئے تھے۔ حنا کی آنکھیں بھی بھیگ رہی تھیں۔ یہ خوشی کے آنسو تھے۔ میں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ اسے سلطان کے بارے میں نہیں بتاؤں گا۔

اپنا خون

محترم ومکرم معراج رسول صاحب

السلام علیکم!

میں ایک اسکول ٹیچر ہوں۔ تعلیم کے شعبہ سے وابستہ ہونے کی وجہ سے معلوماتی کتب بینی کا شوق ہے اسی لیے میں سرگزشت کو پسند کرتا ہوں۔ یہ ایک واقعہ میں صرف اس لیے بھیج رہا ہوں کہ لوگ پڑھ کر سبق حاصل کریں۔

نیاز بٹ

(لاہور)

فولاد خان نے مسکرا کر میری طرف دیکھا اور اپنے بچے کو پیار کرتے ہوئے کمرے سے باہر چلا گیا۔

اس کے بچے کا نام ندیم تھا۔ پانچ چھ برس کا ایک ذہین بچہ جو میرے ہی اسکول میں پڑھا کرتا تھا، میرا مطلب ہے اس اسکول میں جہاں میں پڑھایا کرتا تھا۔

اس کہانی کی ابتدا اب سے چھ سات ماہ پہلے ہوئی تھی۔

میں بس کے انتظار میں کھڑا تھا۔ مجھے نیو کراچی سے ٹاور کی طرف جانا تھا۔ کراچی کے رہنے والے جانتے ہیں کہ دونوں کے درمیان اچھا خاصا فاصلہ ہے۔

کچھ دیر بعد اس روٹ کی ایک بس آ گئی اور میں خود کو سنبھال کر بس میں سوار ہو گیا۔ میں بس کے حالات اور اس کی پریشانیوں کے بارے میں بتا کر بور نہیں کرنا چاہتا۔

بس اتنا سمجھ لیں کہ مجھے ایسا لگا جیسے میں کسی بس میں نہیں بلکہ کسی طوفان پر سوار ہو گیا ہوں۔ ڈرائیور کا دماغ ہی خراب معلوم ہوتا تھا۔ وہ اتنے خوفناک انداز میں بس چلا رہا تھا کہ عورتیں چیخنے لگی تھیں لیکن اس بے حس شخص کو کسی کی پروا نہیں تھی۔ ایک عورت کو اپنے دو بچوں کے ساتھ کسی اسٹاپ پر اترنا تھا، اس نے سڑک کے درمیان گاڑی روک کر شور کرنا شروع کر دیا۔ ''اوئے جلدی اترو مائی، جلدی کرو۔''

ایک دو آدمیوں نے کمزور سا احتجاج بھی کیا، لیکن اس نے دھیان ہی نہیں دیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس عورت کا ایک بچہ بری طرح گر گیا تھا۔

لوگ شور مچاتے رہے لیکن اس نے اسی طوفانی انداز میں گاڑی آگے بڑھا دی تھی۔

یہ شہر اس قسم کے لوگوں سے بھرا ہوا ہے۔ ان کے نزدیک کسی کی زندگی کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی۔ یہ نیم وحشی قسم کے انسان ہوتے ہیں۔

خدا خدا کر کے میرا اسٹاپ آیا اور میں نے کسی طرح بس سے چھلانگ لگا دی۔ اس کے بعد توبہ کر لی کہ میں اس بس پر تو آئندہ نہیں بیٹھوں گا۔

میں یہ بتا چکا ہوں کہ ایک اسکول میں ٹیچر ہوں۔ اس معاشرے میں ٹیچرز کو بسوں ہی میں دھکے کھانے پڑتے ہیں جبکہ دنیا کے دوسرے ملکوں میں سب سے زیادہ احترام اور پیسے استادوں ہی کے پاس ہوتے ہیں۔ خیر یہ اپنی اپنی قسمت ہے۔

اسکول میں ندیم نام کا ایک بچہ مجھے بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ ایک ذہین بچہ تھا اور میری خواہش ہوتی تھی کہ اس کی زندگی شاندار گزرے۔ اس کا مستقبل بہتر ہو کیونکہ میں نے اس میں اس قسم کے جراثیم دیکھ لیے تھے۔

یہ ایک عام سی بات ہے۔ پسندیدہ شاگرد ہوا کرتے ہیں جن کی ذہانت اور علم کی لگن استادوں کو اپنی طرف متوجہ کر لیتی ہے۔

بہر حال کچھ استاد ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو شاگرد کا بیک گراؤنڈ اپنی طرف متوجہ کرتا ہے۔ وہ ان کے گھر بھاری معاوضے پر ٹیوشنز دیا کرتے ہیں۔

لیکن میری کیٹیگری کچھ اور تھی، میں محض علم پھیلانے کے نقطۂ نظر سے طالب علموں کو دیکھا کرتا تھا اسی لیے ندیم مجھے اچھا لگتا تھا۔

وہ ہر سبجیکٹ میں بہت اچھا تھا سوائے اردو کے۔

اس کی اردو بہت کمزور تھی میں نے ایک دن اس سے کہا۔ ''ندیم بیٹے تم اردو کی طرف دھیان کیوں نہیں دیتے؟''

''دھیان تو دیتا ہوں سر لیکن بات نہیں بنتی۔''

''تم اپنے ابو یا امی سے اردو پڑھ لیا کرو۔''

''امی کو پڑھنا نہیں آتا۔'' اس نے دھیرے سے جواب دیا۔ شاید وہ دل میں شرمندگی بھی محسوس کر رہا ہو، اس وقت مجھے اپنے رسولؐ کا فرمان یاد آنے لگا کہ ایک مرد کی تعلیم اس کی اپنی تعلیم ہوتی ہے لیکن ایک عورت کی تعلیم پورے خاندان کی تعلیم ہوتی ہے۔

سبحان اللہ کیا بلاغت ہے اس فرمان میں۔

''اور ابو...... اُن سے پڑھ لیا کرو۔''

''اُن کے پاس فرصت نہیں ہوتی سر۔'' ندیم نے جواب دیا۔

پھر ایک بات میرے ذہن میں آئی، میں نے اس سے کہا۔ ''ایسا کرو میں تمہارے گھر آ کر تمہیں پڑھایا کروں گا۔ تم اپنے امی اور ابو سے پوچھ کر مجھے بتا دو۔''

اس نے دوسرے ہی دن گھر والوں سے اجازت لے کر مجھے بتا دیا تھا۔ میں نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ میں اس ٹیوشن کا کوئی معاوضہ نہیں لوں گا۔ اس کے گھر والے اس بات سے خوش تھے۔

بہر حال میں اس کا ایڈریس معلوم کر کے اس کے گھر پہنچ گیا۔

گھر کیا ایک چھوٹا سا کوارٹر تھا جس میں صرف دو کمرے تھے اور ایک آنگن یا صحن نما چیز تھی۔ ساز و سامان بھی بہت معمولی سا تھا یعنی وہ غریب لوگ تھے۔

ندیم نے مجھے بیٹھک میں لے جا کر بٹھایا تھا۔

دو چار کرسیاں، ایک میز، ایک طرف چارپائی اور ندیم ہی کی کتابیں پھیلی ہوئی تھیں۔ ندیم بہت خوش تھا۔ اس نے بتایا کہ ابو آ رہے ہیں۔

پھر اس کا باپ کمرے میں داخل ہوا اور میں اسے دیکھ کر دنگ رہ گیا، یہ وہی ڈرائیور تھا، وہی بے رحم قسم کا جسے انسانی زندگی کی کوئی پروا نہیں تھی، جو آندھی طوفان کی رفتار سے گاڑی چلایا کرتا۔

میں نے صرف ایک بار اس کو دیکھا تھا لیکن اس کا بے رحم چہرہ میرے ذہن پر نقش ہو کر رہ گیا تھا۔ اس نے بڑی گرم

جوشی سے مجھ سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہا۔ ''میرا نام فولاد خان ہے جی، میرے لیے یہ بہت خوشی کی بات ہے کہ آپ میرے بچے کو پڑھانے آ رہے ہو۔''

''فولاد خان، تمہارا بچہ بہت ذہین ہے۔'' میں نے بتایا۔ ''اس کی بہت اچھی تربیت کرنا، اچھی تعلیم دلانا اس کو۔''

''ہاں یہ تو میری جان ہے، میرے دل کا ٹکڑا ہے، اس کے بغیر میری زندگی کچھ نہیں۔ میں اپنی جیب میں ہر وقت اس کی تصویر رکھتا ہوں جی، یہ دیکھو۔'' اس نے اپنے پرس سے ایک پاسپورٹ سائز تصویر نکال کر مجھے دکھائی۔ ''اس کی تصویر دیکھ لیتا ہوں تو سکون مل جاتا ہے۔''

''فولاد خان، یہ بہت خوشی کی بات ہے۔'' میں نے کہا۔ ''یہ اچھی بات ہے کہ تم اپنے بیٹے سے اتنی محبت کرتے ہو۔''

''ہاں جی۔ یہ تو کوئی پوچھنے والی بات ہی نہیں۔''

کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد وہ اپنی ڈیوٹی پر چلا گیا تھا۔

میں نے ندیم کو پڑھانا شروع کر دیا۔

میں ہر شام اس کے پاس چلا جاتا۔ میرے لیے چائے پہلے سے تیار ہوتی۔ اس کی ماں ایک سیدھی سادی عورت تھی اسے صرف یہ معلوم تھا کہ اس کا بیٹا پڑھ رہا ہے اور وہ جوان ہو کر ... ایک بڑا آدمی بنے گا۔ بس اس سے زیادہ وہ کچھ نہیں جانتی تھی۔

میں ندیم کے یہاں جاتا رہا چونکہ وہ ایک ذہین بچہ تھا اسی لیے اسے سمجھانے اور پڑھانے میں زیادہ دشواری پیش نہیں آتی تھی۔ ایک دن میں نے اخبار میں ایک خبر پڑھی کہ ایک تیز رفتار بس نے ایک موٹر سائیکل سوار کو کچل دیا۔

خبر کے مطابق ڈرائیور کو موقعے پر ہی گرفتار کر لیا گیا تھا۔ میرے ذہن میں فولاد خان آ گیا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ وہی ہو، اسی شام میرے اس اندیشے کی تصدیق بھی ہو گئی۔

میں جب ندیم کو پڑھانے کے لیے پہنچا تو اس نے بتایا کہ اس کے باپ کو پولیس نے گرفتار کر لیا ہے کیونکہ اس سے ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔

ندیم بے چارہ بہت پریشان اور اداس تھا۔ اس سے ٹھیک سے پڑھائی بھی نہیں ہو پا رہی تھی۔

دو دنوں کے بعد ندیم ہی نے بتایا کہ اس کا باپ چھوٹ کر آ گیا ہے کیونکہ بس کا مالک ایک دولت مند اور طاقت ور انسان تھا۔ اس کی ہدایت کے مطابق پولیس نے

نعت

رسولؐ کی شان میں نظم، اس بارے میں خدا نے سورہ الاحزاب میں واضح ہدایت فرمائی ہے۔ خدا اور اس کے فرشتے پیغمبر پر درود بھیجتے ہیں، سو تم بھی پیغمبر پر درود و سلام بھیجا کرو۔ (آیت 56) اس آیت سے نعت کی قدر و قیمت واضح ہو جاتی ہے۔ نعت میں صداقت ضروری ہے۔ ہنگامہ و شور کی بجائے جوش ایمان و آشفتگی اور ایقان۔ نعت کے یہ اصول صحابہ کرام نے واضح کیے ہیں۔ ہجرت مدینہ کے وقت انصار مدینہ بھی نعت پڑھ رہے تھے۔ حضرت حسان بن ثابت، حضرت کعب بن زبیر، حضرت عبداللہ بن رواحہ سمیت بڑے بڑے صحابہ کرامؓ نعت گوئی کرتے رہے ہیں۔ حضرت حسان بن ثابت نے ایک بار آپ کے سامنے یہ نعت پڑھی۔ (ترجمہ) ''اس دنیا میں آنے سے پہلے آپ سایہ خاص میں تھے اور اس دنیا میں جہاں پتوں سے تن ڈھانپے گئے۔ پھر آپؐ اس جنت سے اترے اور زمینوں میں پہنچے حالانکہ ابھی آپؐ نہ تو بشر تھے نہ مضغہ گوشت۔ نہ لہو کی بوند۔ بلکہ وہ ...... ماء منظر جو کشتیوں پر سوار تھا، پانی کی مد میں پہاڑوں کی چوٹیاں چوم رہی تھیں۔ باشندگان زمین ڈوب چکے تھے۔ یہ ماء منظر صلب سے رحم کی طرف منتقل ہوتا رہا۔ ایک عالم گزر جانے کے بعد سطح زمین ابھری اور وہ احوال پیدا ہوئے جن میں جماعتوں نے ظہور پایا۔ آپؐ نار خلیل میں بھی اترے، نہاں نہاں، ان کے صلب میں آپؐ ہی تو تھے، پھر آگ سے وہ بھلا کس طرح جلتے۔ آپ کی حفاظت آپ کے محافظ گھرانے نے کی، جو خندق جیسی بلند مرتبہ خاتون کا ہے۔ وہ بلند مرتبہ خاتون کہ دامن اس کا قدموں میں لوٹتا تھا۔ اس کی یہ شان تھی شوکت تھی، وہ قبیلہ خندق تمام قبائل میں اشرف تھا۔ خندق آپؐ کی دادی کا لقب ہے) تو اب ہم سب اسی روشنی اور نور میں ہیں اور رشد و ہدایت و استقامت کی راہیں نکال رہے ہیں۔'' عہد عباس میں ملک شاہ سلجوقی 485ھ میں بغداد میں مجلس مولود منعقد کرائی۔ نعت کے فن کو یہیں سے تقویت ملی ۔ شب معراج، شب قدر، میلاد النبیؐ، آخری چہار شنبہ وغیرہ کے موقع پر نعت کی محفلوں کا انعقاد ہوتا۔ اس کے بعد مولوی خدا بخش خان وکیل اور مولانا سلیمان پھلواریؒ (130ھ) میں پھلواری بستی میں محفل میلاد کے انعقاد کے انتظامات کیے جو باقاعدگی سے ہوتیں۔ یہ شاعری کی صنف دوسری اصناف سے بڑی مختلف ہے۔ عربی، اردو اور فارسی میں بڑے بڑے نعت گو شاعر پیدا ہوئے ہیں۔ جن کے دم سے معاشرہ زندہ ہے۔

مرسلہ: نعمان اشرف، حیدر آباد

اس کیس کو کوئی اور رنگ دے دیا تھا۔

میرا خیال تھا کہ شاید فولاد خان کو اب نصیحت ہو گئی ہوگی، ہوسکتا ہے کہ وہ اب محتاط ہو کر بس چلا رہا ہو، یہ دیکھنے کے لیے میں ایک دن اسی بس اسٹاپ پر کھڑا ہو گیا جس طرف سے اس روٹ کی بسیں گزرا کرتی ہیں۔

مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑا تھا۔

کچھ دیر بعد ہی وہ بس اسی شیطانی اور طوفانی رفتار سے نمودار ہوئی تھی اور میں نے ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے فولاد خان کو پہچان لیا تھا۔

اس حادثے نے اس پر کوئی اثر نہیں ڈالا تھا۔ وہ اب تک ویسا ہی تھا، نہ جانے ایسے لوگوں کو سدھارنے کے لیے قدرت کیسا بندوبست کرتی ہوگی۔

میرا دل چاہا کہ اس موضوع پر فولاد خان سے بات کر کے دیکھوں لیکن پھر یہ سوچ کر خاموش رہا کہ ایسے لوگوں کو باتوں کی پروا کب ہوتی ہے، ہوسکتا تھا کہ وہ مجھ سے چڑ کر ندیم کو پڑھانا ہی ختم کر دے۔

لیکن میں نے اسے سمجھانے کا فیصلہ کر رکھا تھا۔

ایک دن میں نے ندیم سے کہا۔ ''بیٹے کل تمہیں میرے ساتھ چلنا ہے۔''

''کہاں سر؟''

''ایک جگہ، ایک میوزیم ہے، میں یہ چاہتا ہوں کہ تم وہ میوزیم دیکھ لو۔''

''ہاں سر، میں آپ کے ساتھ ضرور چلوں گا۔'' ندیم خوش ہو گیا تھا۔

اسکول ختم ہونے کے بعد میں نے ندیم سے پوچھا۔ ''تم نے گھر میں بتا دیا تھا کہ تم میرے ساتھ جا رہے ہو؟''

''جی سر بتا دیا تھا۔''

''کیا کہہ رہے تھے؟''

''کچھ نہیں سر۔ کہہ رہے تھے ضرور جاؤ۔''

''تو پھر آؤ۔ بس سے چلتے ہیں۔''

ندیم نے اپنا چھوٹا سا بستہ اٹھایا اور میرے ساتھ ہو لیا۔

میں اسے لے کر اسٹاپ پر آ گیا۔ کئی بسیں آئیں اور گزر گئیں۔ حالانکہ یہ سب اسی روٹ کی بسیں تھیں لیکن میں ان پر سوار نہیں ہوا تھا۔

اور جیسے ہی فولاد خان کی طوفانی بس آ کر رکی، میں نے مسافروں کی بھیڑ میں ندیم کو اٹھا کر کسی طرح بس کے اندر داخل کیا اور خود بھی اندر آ گیا۔

ندیم شاید اپنے باپ کو پہچان کر کچھ کہنے ہی والا تھا کہ میں نے اسے منع کر دیا۔ ''نہیں بیٹا، ابھی ابو کو مت بتاؤ کہ تم اسی بس میں ہو۔''

پھر دوڑ شروع ہو گئی، وہی بھیانک اور وحشت ناک دوڑ اور اس وقت میں نے ندیم سے کہا۔ ''بیٹا، اب آواز دے کر ابو کو بتاؤ کہ تم اسی بس میں ہو۔''

میرے کہنے پر اس نے اپنے باپ کو آواز دی۔ ''ابو، میں اسی بس میں ہوں۔ سر کے ساتھ میوزیم جا رہا ہوں۔''

''اچھا اچھا۔'' فولاد خان خوش ہو کر بولا۔

اور اس کے بعد حیرت انگیز طور پر بس کی رفتار معمول پر آ گئی تھی۔ وہ اب انتہائی سلیقے کے ساتھ بس کو روک کر مسافروں کو اتار رہا تھا۔

پھر جب ہمارا اسٹاپ آیا تو اس نے چیخ کر مجھ سے کہا۔ ''سنبھل کر اتریے گا سر۔ خدا حافظ۔''

''فولاد خان، مجھے تم سے ایک بات کہنی ہے۔ میں دوسری طرف سے آ رہا ہوں۔''

میں اور ندیم بس سے اتر کر دوسری طرف سے ڈرائیونگ سیٹ کے پاس پہنچ گئے۔ ''فولاد خان، مجھے تم سے صرف اتنا ہی کہنا ہے کہ اس بس میں سوار ہونے والے ہر شخص کی جان کی ذمے داری تم پر ہے۔ کوئی ضروری نہیں ہے کہ تمہاری رفتار کو کنٹرول کرنے کے لیے ہر بار تمہارا بیٹا تمہاری بس میں سفر کرے۔ اسی لیے پلیز دوسروں کے بچوں کو بھی اپنے ندیم جیسا ہی سمجھو۔''

فولاد خان سکتے میں رہ گیا تھا۔ میں ندیم کو لے کر آگے بڑھ گیا۔ اس کے بعد فولاد خان نے اپنی رفتار پر کنٹرول کر لیا تھا۔

یہ میں خود بس اسٹاپ پر جا کر دیکھ چکا تھا لیکن کب تک، کیا ایک شخص کے سدھرنے سے سارا معاشرہ سدھر سکتا ہے؟

اس کہانی کو ممکن ہے کہ کچھ ڈرائیور حضرات بھی پڑھ رہے ہوں تو وہ بس یہ سوچ لیں کہ کیا دنیا کا ہر بچہ ان کے بچے کی طرح نہیں ہوتا، کیا یہ زیادتی نہیں ہے کہ عین بیچ سڑک پر بس روک کر اسے زبردستی بس سے چھلانگ لگانے پر مجبور کر دیا جائے۔

کب تک یہ سب ہوتا رہے گا، آخر کب تک؟

فوبیا

محترم معراج رسول
السلام علیکم!
میں سرگزشت کا مستقل قاری ہوں، ہر ماہ پابندی سے پڑھتا ہوں۔ آج میں خود بھی ایک تحریر کے ساتھ اس محفل میں شریک ہونے آیا ہوں۔ یہ میرے ایک جاننے والے کی داستانِ عبرت اثر ہے۔ امید ہے پسند آئے گی۔
نفیس
(لاہور)

یہ کہانی میری نہ ہونے کے باوجود میری ہے۔ میری اس لیے ہے کہ میں نے یہ کہانی لکھی ہے۔ اس کے علاوہ اس کہانی کا جو مرکزی کردار ہے میں اس کا دوست رہا ہوں۔

اس کا نام شہریار تھا۔ میں شہریار کی دوستی پر فخر کیا کرتا۔ بہت کم لوگ ایسے ہوں گے جن کا مطالعہ اتنا وسیع ہوگا۔ اس شخص کا بھی کمال تھا جس موضوع پر بات کی جائے اس موضوع پر دریا بہا دیتا تھا۔

کیا معلومات تھیں اس کی۔ ہم سب اس کی باتیں بہت دھیان سے سنا کرتے اور اسے سراہا کرتے۔

وہ ایک بڑے کاروباری ادارے سے وابستہ تھا۔ ویسے تو وہ اکاؤنٹس کا آدمی تھا لیکن پڑھنا پڑھانا اس کا شوق رہا ہے۔

ہم اکثر اس کے ڈرائنگ روم میں جا کر بیٹھ جایا کرتے۔ ہم چار پانچ دوست ہوا کرتے تھے۔ میں یعنی نفیس حسین، دوسرا اطہر فاروق تھا' ادب کا استاد، تیسرا شیراز ملک تھا۔ وہ ایک بڑے بینکنگ ادارے سے وابستہ تھا اور چوتھا خود شہریار تھا۔

ہم چاروں کے مشاغل ایک جیسے تھے۔

WWW.PAKSOCIETY.COM

شہریار کے گھر میں کتابیں ہی کتابیں بھری ہوئی تھیں۔ وہ ایک شادی شدہ آدمی تھا۔ بہت اچھی ازدواجی زندگی گزر رہی تھی اس کی۔

میرا خیال ہے کہ میں اس قصے کو وہاں سے شروع کروں جب شہریار کی شادی نہیں ہوئی تھی۔ اس وقت وہ ثمرین سے محبت کرتا تھا۔

ثمرین ایک بہت خوبصورت، طرح دار اور پڑھی لکھی لڑکی تھی۔ شہریار اس کے عشق میں دیوانہ ہو رہا تھا۔ اس نے مجھ سے ثمرین سے ملاقات کا حال بتایا تھا۔

اس وقت ہم دونوں ہی طالب علم تھے۔ یعنی یونیورسٹی میں پڑھا کرتے۔ شہریار مجھے ڈھونڈتا ہوا میرے پاس آیا۔ وہ بہت پُرجوش ہو رہا تھا۔ ''یار نفیس، آج میری جیب میں پیسے بھی ہیں اور مجھے ایک زبردست خوشی بھی ملی ہے۔ بتاؤ کیا کھاؤ گے، کہاں کھاؤ گے۔''

''میرے دوست تمہاری جیب میں پیسے ہونا کوئی انہونی بات نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''تمہارے ابا تمہیں پیسے دیتے ہی رہتے ہیں۔ البتہ خوشخبری کیا ہے۔''

''خوش خبری یہ ہے میری جان کہ مجھے کسی سے عشق ہوگیا ہے۔'' اس نے بتایا۔

''کیا! تمہیں عشق ہوگیا ہے۔'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''ہاں یار، ثمرین بہت اچھی ہے۔''

''لیکن یہ سانحہ ہوا کب۔ تم تو اس جذبے کو پاگل پن کہا کرتے تھے۔''

''ہاں پہلے کہتا تھا۔ لیکن اب نہیں کہوں گا۔''

شہریار اکثر ہم دوستوں کے سامنے اپنی علمیت اور قابلیت کے ذریعے یہ ثابت کر دیتا کہ محبت ایک پاگل پن کا جذبہ ہے۔ انسانی دماغ میں خاص قسم کے کیمیکلز پیدا ہونے لگتے ہیں جو سوچنے سمجھنے کی صلاحیت ختم کر دیتے ہیں۔ وہی شہریار آج اپنی محبت کی بات کر رہا تھا۔

''مبارک ہو! ویسے وہ ہے کون۔''

''ثمرین نام ہے اس کا۔'' اس نے ایک گہری سانس لی۔

''لیکن یہ ملاقات کہاں ہوئی۔''

''شادی کی ایک تقریب میں۔'' اس نے بتایا۔ ''میری رشتے کی ایک کزن ہے۔ ثمرین اس کی دوست ہے۔ جب میں نے اسے پہلی بار دیکھا تو اسی وقت میرے دماغ کی کیمسٹری اس سے میچ کرنے لگی۔ وہ صرف خوبصورت ہی نہیں بلکہ بہت پڑھی لکھی اور بہت میچورڈ ہے۔''

''ہاں یہ تو اچھی بات ہے۔ اب کیا مرحلے ہیں۔''

''یار یہ نہیں سنو گے کہ اس سے پہلی بار کیا باتیں ہوئیں اور ملاقاتیں کیسے بڑھنے لگیں۔''

''نہیں یہ سننے کی ضرورت نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔ ''کیونکہ محبتوں کی داستانیں تقریباً ایک ہی طرح کی ہوتی ہیں اور بات یہاں تک آجاتی ہے کہ دونوں ایک دوسرے سے ملنے لگتے ہیں۔ عام طور پر ہوٹلنگ ہوتی ہے یا آؤٹنگ پر چلے جاتے ہیں۔ کچھ اسی قسم کے سلسلے ہوتے ہیں۔''

''ہاں یار، کچھ ایسا ہی ہوا ہے۔'' وہ ہنس پڑا۔ ''آج کل ہم اپنی شام ایک دوسرے کے ساتھ ہی گزارتے ہیں۔'' تو یہ تھا شہریار کی محبت کا احوال۔

وہ اس کے لیے تقریباً جنونی سا ہو رہا تھا۔ ایک بار اس نے مجھے فون کیا۔ ''نفیس، کیا تم میرے فلیٹ تک آسکتے ہو۔'' اس نے پوچھا۔

''کب؟'' میں نے سوال کیا۔

''ابھی آجاؤ یار۔'' اس نے کہا۔ ''بس اپنے گھر سے چل دو۔ کچھ دیر میں پہنچ ہی جاؤ گے۔''

''خیریت تو ہے نا۔''

''ہاں ہاں بالکل خیریت ہے۔ بس کسی سے ملوانا تھا تمہیں۔ ایک خاص مہمان ہے۔''

میں سمجھ گیا کہ شاید وہی لڑکی اس کے فلیٹ میں آئی ہوگی۔ مجھے بھی اس کو دیکھنے کا شوق ہو رہا تھا۔ اسی لیے میں تیار ہو کر اس کے فلیٹ پہنچ گیا۔

اس کا فلیٹ بہت خوبصورت تھا۔ دراصل یہ لگژری فلیٹ اس کے باپ کی دین تھی جو انتقال کے بعد شہریار کے پاس اس لیے آگیا تھا کہ وہ اپنے والدین کی اکلوتی اولاد تھی۔

شہریار کی والدہ کا بہت پہلے انتقال ہو چکا تھا اور دو سال ہوئے والد بھی چل بسے تھے۔ اسی لیے وہ اپنے فلیٹ میں تنہا ہوا کرتا۔

اور ہم دوست اسی لیے بڑی آسانی اور آزادی کے ساتھ اس کے فلیٹ میں اپنی مجلس جما لیتے تھے۔ پڑھنے کا شوق تو اسے شروع سے رہا تھا۔

کتابیں اس کی ساتھی ہوا کرتیں۔ وہ اپنی تنخواہ کا بہت کچھ کتابوں کی خریداری پر لگا دیتا تھا۔

اور اب ثمرین کی صورت میں ایک دوسری دل چسپی اس کے پاس آگئی تھی۔

میرا اندازہ درست نکلا۔ وہ لڑکی اس کے فلیٹ ہی میں موجود تھی۔ شہریار نے اس کا تعارف کرواتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ''یار، یہ تو میرے فلیٹ میں آتے ہوئے بہت خوفزدہ ہو رہی تھی۔ پھر جب میں نے یقین دلایا کہ میں بہت شریف آدمی ہوں تو پھر آنے کے لیے تیار ہو گئی۔''

ثمرین ہنس پڑی۔ پھر ہمارے درمیان باتیں شروع ہو گئیں۔ شہریار نے اس کے بارے میں جو کچھ بتایا وہ بالکل درست تھا۔ وہ واقعی ایک ذہین لڑکی تھی۔ خوبصورت تو تھی ہی۔

ہم بہت دیر تک باتیں کرتے رہے۔ شہریار نے کھانے پینے کا بھی بہت اہتمام کر رکھا تھا۔

اس کے بعد شہریار کی شادی تک ثمرین سے میری ملاقات نہیں ہو سکی۔ لیکن شہریار اس کے بارے میں بتاتا رہتا تھا۔

''یار آج ہم نے یہ کیا۔ ہم فلاں جگہ گئے۔ آج اس نے مجھے پرفیوم کا تحفہ دیا۔ وغیرہ وغیرہ۔''

پھر ایک دن جب وہ میرے پاس آیا تو بہت پریشان دکھائی دے رہا تھا ورنہ وہ تو آتے ہی بولنا شروع کر دیتا تھا لیکن اس وقت وہ بالکل خاموش تھا۔

''کیا بات ہے یار، خیریت تو ہے۔'' میں نے پوچھا۔

''یار ایک گڑبڑ ہو گئی ہے۔'' اس نے بتایا۔

''خدا خیر کرے کیسی گڑبڑ؟''

''ثمرین کی طرف سے۔'' اس نے کہا۔

''کیا ہوا۔ کیا اسے کچھ ہو گیا ہے۔''

''نہیں بھائی اسے کچھ نہیں ہوا۔ بس ابرار درمیان میں آگیا ہے۔ یہ ساری گڑبڑ اسی کی وجہ سے ہو رہی ہے۔''

''اور یہ ابرار کون ہے۔''

''وہ کم بخت ثمرین کا کزن ہے۔'' اس نے بتایا۔ ''بہت پیسے والا ہے۔ بہت بڑا بزنس ہے اس کا۔ اور میں نے تو اپنا کیریئر ابھی شروع ہی کیا ہے۔ میرے پاس اتنی دولت کہاں سے آئے گی کہ اس کا مقابلہ کر سکوں۔''

''سمجھ گیا۔ تو یہ رقیب روسیاہ قسم کا معاملہ ہے۔'' میں نے کہا۔

''ہاں ایسا ہی ہے یار، اور مصیبت یہ ہے کہ ثمرین کے والدین کا جھکاؤ بھی اسی کی طرف ہے۔ ایک تو وہ رشتے دار ہے۔ دوسرے دولت مند بھی ہے۔ اسی لیے وہ یہ چاہتے ہیں کہ ثمرین کو اس کے حوالے کر دیں۔''

''اور خود ثمرین کیا کہتی ہے۔''

''وہ بے چاری بہت پریشان ہے۔ کئی بار میرے پاس آ کر رو چکی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ وہ کبھی اس رشتے کو قبول نہیں کرے گی۔''

''اور تم کیا کہتے ہو۔'' میں نے پوچھا۔

''میری تو بات ہی مت کرو۔'' وہ اداس ہونے لگا تھا۔ ''میں تو شروع سے ایک تنہا انسان ہوں۔ ثمرین کے آنے کے بعد یہ احساس ختم ہونے لگا تھا۔ سوچا تھا کہ اسے اپنا لوں گا۔ زندگی کو خوبصورت بنانے کی کوشش کروں گا لیکن درمیان میں یہ ابرار آگیا۔''

''یار میرا خیال ہے کہ تم خوامخواہ اتنے مایوس ہو رہے ہو۔'' میں نے کہا۔ ''کیونکہ تم دونوں پڑھے لکھے ہو۔ اپنی مرضی کے مالک ہو۔ ثمرین اٹھارہویں صدی کی لڑکی نہیں ہے کہ والدین جو کہیں وہ اس پر آنکھیں بند کر کے عمل کر لے۔ وہ صاف انکار بھی کر سکتی ہے۔''

''یہی تو پرابلم ہے کہ وہ ایسا نہیں کر سکتی۔'' شہریار نے کہا۔

''کیوں، کیوں نہیں کر سکتی۔''

''اس لیے کہ اس کے خاندان کی روایات کچھ اور ہیں۔ وہ ابرار ہی کے حق میں فیصلہ دیں گے۔''

اس نے یہ بھی بتایا کہ ایسا بھی نہیں ہو سکتا کہ وہ اور ثمرین کورٹ میں جا کر شادی کر لیں۔ میں خود بھی اس قسم کی شادی کے حق میں نہیں تھا۔

بہرحال اب یہی کہا جا سکتا تھا کہ شہریار کے حق میں دعا کی جائے۔ اسے تسلی تشفی دی جائے اور کیا ہو سکتا تھا۔

پھر مجھے میرے ابو نے لاہور بھیج دیا۔

لاہور جانے کی وجہ یہ تھی کہ میرے بہنوئی صاحب اپنی جاب کے سلسلے میں ملک سے باہر جا رہے تھے۔ لاہور میں ہمارا اور کوئی رشتے دار نہیں تھا۔ اسی لیے بہن اکیلی رہ جاتی۔ بہنوئی صاحب کا پروگرام یہ تھا کہ میری بہن کچھ دنوں کے لیے کراچی آجائے گی۔ پھر باہر سے اس کے ویزے کا بندوبست کر کے اسے بلا لیا جائے گا۔

لیکن پرابلم یہ تھی کہ کراچی آنے کے بعد اس کے بچے کی پڑھائی کا سلسلہ ختم ہو جاتا اور اس کے فائنل بھی ہونے والے تھے۔ اسی لیے سب نے یہی مناسب سمجھا کہ بہن

چونکہ اکیلی نہیں رہ سکتی اسی لیے میں بھی اس کے پاس چلا جاؤں۔ مختصر یہ کہ میں دو تین مہینوں کے لیے لاہور آگیا۔

اس دوران شہریار سے فون پر بات ہوتی رہی تھی۔ لیکن اس کے زیادہ حالات معلوم نہیں ہو سکے تھے۔ پھر شاید دو مہینوں کے بعد اس کا جب فون آیا تو اس نے ایک حیرت انگیز خبر سنائی۔ "یار نفیس، ابرار کا انتقال ہوگیا۔"

"انتقال ہوگیا؟" مجھے بھی ایک جھٹکا سا لگا تھا۔ "کیسے؟ کس طرح انتقال ہوا۔"

"ہارٹ فیل ہوگیا تھا اس کا۔" شہریار نے بتایا۔ "بہرحال تم آجاؤ تو پھر بتاؤں گا۔"

ایک مہینا اور گزر گیا۔

اس دوران اس نے ایک بار فون کر کے بتایا تھا کہ ثمرین سے سلسلہ پھر چل پڑا ہے۔ اور شاید ہم دونوں ایک ہو جائیں کیونکہ اس کے والدین نے مجھے پسند کرلیا ہے۔

بہرحال ایک دن یہ خبر ملی کہ ثمرین سے اس کی شادی ہوگئی ہے۔ بے چارے ابرار کی بے وقت موت نے اس کے لیے یہ راستہ نکال دیا تھا۔

تین مہینوں کے بعد میری بہن بیرونِ ملک چلی گئی اور میں کراچی واپس آگیا۔ سب سے پہلے میں شہریار ہی کے پاس گیا تھا۔

اب تو اس کی زندگی کچھ اور ہو چکی تھی۔ ثمرین اس کی بیوی تھی۔ دونوں بہت اچھا اور خوش گوار وقت گزار رہے تھے۔ صحیح معنوں میں وہ محبت کرنے والا جوڑا تھا۔ انہیں دیکھ کر خوشی ہو رہی تھی۔

میں اکثر ان کے گھر جایا کرتا۔ اس دوران شہریار نے بہت ترقی کرلی تھی۔ وہ ایک بڑی فرم میں منیجر ہوگیا تھا۔ خدا نے اسے بہت کچھ دے دیا تھا۔ اپنا فلیٹ تھا۔ اچھی نوکری تھی۔ گاڑی تھی۔ اور اس نے اپنی محبت کو بیوی کی شکل میں حاصل کرلیا تھا۔ کسی انسان کو اس کے علاوہ اور کیا چاہیے۔

ایک شام میں اس کے فلیٹ گیا تو وہاں بہت عجیب صورتِ حال تھی۔ دروازہ ثمرین ہی نے کھولا تھا۔ وہ بے انتہا پریشان دکھائی دے رہی تھی۔ اور اندر کہیں سے دروازہ زور زور سے پیٹنے اور شہریار کے چیخنے کی آوازیں آرہی تھیں۔

"کیا ہوگیا بھابی خیریت تو ہے نا۔"

"کوئی خاص بات نہیں ہے۔ لیکن ان کے لیے بہت بڑی بات ہوگئی ہے۔" ثمرین نے بتایا۔ "بالکل ہی پاگل ہو رہے ہیں۔ چیخ چیخ کر اپنا گلا بٹھا لیا ہے۔"

"آخر ہوا کیا ہے۔"

"کچھ نہیں۔ واش روم کا دروازہ اس طرح لاک ہوگیا ہے کہ کھل نہیں رہا۔ بس اتنی سی بات پر انہوں نے قیامت مچا رکھی ہے۔"

شہریار زور زور سے دستک دیتے ہوئے چیخ رہا تھا۔ "خدا کے لیے نکالو مجھے۔ نکالو، میں مرجاؤں گا۔ مرجاؤں گا میں۔"

"میں واش روم کے دروازے پر پہنچ گیا۔" "کیوں بچوں کی طرح شور کر رہے ہو۔" میں نے کہا۔

"یار نفیس خدا کے لیے نکالو مجھے۔ میں مر رہا ہوں۔ دم گھٹ رہا ہے میرا۔"

"اچھا اچھا پریشان نہ ہو، میں لاک والے کو بلا کر لاتا ہوں۔"

پھر کچھ بھی نہیں ہوا۔ میں بازار سے لاک میکر کو بلا کر لے آیا۔ اس نے دروازہ کھول دیا۔ شہریار باہر آگیا۔ اس وقت اس کی حالت غیر ہو رہی تھی۔

وہ پسینے سے پورا بھیگا ہوا تھا اور بری طرح کانپ رہا تھا۔ بہت بری حالت تھی اس کی۔

میں اور ثمرین اس بات پر اس کا مذاق اڑاتے رہے لیکن وہ بالکل خاموش رہا۔ اسے چپ لگ گئی تھی۔ خدا جانے کیسا دل پایا تھا اس نے۔ اتنی عام سی بات پر اس کا یہ حال ہوگیا تھا۔

میں بہت دیر تک اس کے پاس بیٹھا اس کو بحال کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ لیکن اس کی حالت میں کوئی تبدیلی نہیں آئی تھی۔ پھر بہت دیر بعد جب وہ کچھ ٹھیک ہوگیا تو میں واپس آگیا تھا۔

دو دن کے بعد اس کی بیوی ثمرین کا فون آیا۔ وہ بہت گھبرائی ہوئی تھی۔ "نفیس بھائی، جلدی آجائیں۔ وہ پاگل ہوگئے ہیں۔"

"کیا ہوا ہے بھابی۔"

"وہ اپنی کتابیں پھاڑ رہے ہیں۔" اس نے بتایا۔

"کتابیں پھاڑ رہے ہیں۔" میں نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں۔ جلدی آجائیں پلیز۔"

"ابھی آتا ہوں۔"

میں راستے بھر یہ سوچتا رہا کہ یہ کیا تماشا ہے۔ شہریار اپنی

کتابوں کو تو اپنی جان سے زیادہ عزیز رکھتا تھا۔ کسی کو ہاتھ تک نہیں لگانے دیتا۔ پھر اپنی کتابیں کیوں پھاڑنے لگا تھا۔

اس نے واقعی بہت سی کتابیں پھاڑ کر پرزے پرزے کر دیے تھے۔ دو کتابیں اور اس کے سامنے رکھی تھیں۔ اس پر ایک وحشت سی طاری تھی۔

میں نے بڑی مشکلوں سے اسے روکا۔ اسے زبردستی اٹھا کر ایک طرف بٹھا دیا۔ اس دوران ثمرین ایک طرف کھڑی روئے جا رہی تھی۔

"خدا کے بندے، کیا ہوگیا ہے تمہیں۔ یہ کیا کر رہے تھے؟"

"میں اپنی کتابیں پھاڑ رہا ہوں۔ آگ لگا دوں گا ان کو۔"

"آخر کیوں بھائی، بے چاری کتابوں نے کیا بگاڑا ہے۔"

"ان کتابوں نے مجھے مجرم بنا دیا ہے۔ مجرم۔" اس نے وحشت زدہ انداز میں کہا۔

"وہ کس طرح۔ کتابیں مجرم کو تو سدھارنے کا کام کرتی ہیں۔ تم مجرم کیسے ہوگئے۔"

"بس بنا دیا ہے مجھے۔ میں کہہ رہا ہوں نا۔"

اس دوران ثمرین پاس آکر کھڑی ہوگئی تھی۔ "وہ نفیس بھائی، خدا جانے انہیں کیا ہوگیا ہے۔ روز بروز ان کی ذہنی کیفیت خراب ہوتی جا رہی ہے۔"

"ہاں ہاں پاگل ہوگیا ہوں میں۔ پاگل۔"

"اچھا اچھا، یہ ڈراما بند کرو۔ تم نہ مجرم ہو، نہ پاگل ہو۔ تم بالکل ٹھیک ہو۔" میں نے اس کے شانے پر تھپکی دی۔ "سنبھالو خود کو۔ کیوں بے چاری بھابی کو پریشان کر رہے ہو۔"

وہ کچھ نہیں بولا۔ خاموش ہو کر ان اوراق کو دیکھتا رہا جو اس نے پھاڑ پھاڑ کر پھینک دیے تھے۔ میں نے ثمرین کو پانی لانے کے لیے کہا۔ وہ پانی لے آئی تھی۔

پانی پی کر اس کی حالت کچھ بہتر ہوئی۔ میں بہت دیر تک اس کے پاس بیٹھا رہا۔ اس سے اِدھر اُدھر کی باتیں کرتا رہا۔ پھر اپنے گھر واپس چلا آیا۔

سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ شہریار جیسے ہوش مند انسان کو کیا ہوگیا ہے۔ وہ تو دوسروں کو راہ دکھایا کرتا تھا۔ ان کی الجھنیں دور کرنے کی کوشش کرتا۔ اور اب خود کسی الجھن میں مبتلا ہوگیا تھا۔

اور سب سے بڑی بات یہ تھی کہ اس نے اپنی کتابیں پھاڑ دی تھیں۔ میں اس کا بہت گہرا دوست تھا۔ اگر میں بھی اس سے کوئی کتاب لیتا تو ہزار ہدایتوں کے بعد دیا کرتا۔ "دیکھو، احتیاط سے پڑھنا۔ جلد خراب نہ ہو۔ پڑھ کر واپس کر دینا۔ وغیرہ وغیرہ۔"

اور ایسا آدمی اب خود اپنے ہاتھوں سے اپنی کتابیں پھاڑ رہا تھا۔ آخر کیوں۔

دو چار دنوں کے بعد میں نے اس کے گھر فون کیا۔ ثمرین نے فون اٹھایا تھا۔ "جی بھابی، اب بتائیں۔ اب تو کتابیں نہیں پھاڑ رہا۔"

"نہیں۔ کتابیں تو نہیں پھاڑتے لیکن ذہنی حالت خراب ہوتی جا رہی ہے۔" اس نے بتایا۔

"وہ کیسے؟"

"دروازہ بند نہیں کرتے۔ واش روم میں بھی دروازہ کھول کر جاتے ہیں۔ ذرا سی دیر کے لیے بھی اگر کمرے کا دروازہ یا کوئی کھڑکی بند ہوتی ہے تو ان کی حالت خراب ہونے لگتی ہے۔"

"اوہ، یہ تو بہت عجیب صورت حال ہے۔"

"آپ مشورہ دیں، کیا کروں۔"

"میرا خیال ہے کسی ماہرِ نفسیات سے رجوع کیا جائے۔" میں نے کہا۔

"میں تو کسی ماہرِ نفسیات کو نہیں جانتی۔"

"آپ پریشان نہ ہوں۔" میں نے دلاسا دیا۔ "میں کسی کا پتا چلاتا ہوں۔"

پتا نہیں کیا ہوگیا تھا اس کو۔ کتابیں پھاڑنے، اپنے آپ کو مجرم کہنے اور دروازے کے بند یا کھلے ہونے میں کیا ربط تھا۔ یہ میری سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔

لیکن کسی ماہرِ نفسیات کے پاس جانے کی نوبت ہی نہیں آئی۔

ایک شام وہ خود میرے پاس آگیا۔ بہت اداس اور تھکا تھکا سا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے بیمار ہو۔ ڈرائنگ روم میں بیٹھنے کے بعد بہت دیر تک خاموش رہا۔ اس دوران میں اس کے تاثرات کا جائزہ لیتا رہا تھا۔ اس کے چہرے پر وحشت نہیں بلکہ ایک ٹھہراؤ سا تھا۔

"نفیس، تم لوگ مجھے شاید پاگل سمجھ رہے ہوگے۔" بہت دیر بعد اس نے کہا۔

"نہیں تو۔"

"جھوٹ مت بولو۔ لیکن میں یہ بتا دوں کہ میں پاگل نہیں، مجرم ہوں۔" وہ میری طرف دیکھ کر بولا۔ "میں نے خون کر دیا ہے اور یہ خون کرنا مجھے کتابوں نے سکھایا۔ انہوں

نے طریقہ بتایا۔ میری نالج نے مجھے قاتل بنادیا ہے۔''

''خدا کے بندے، کس کا خون کردیا ہے تم نے۔''

''ابرار کا۔'' اس نے بتایا۔

''وہ کیسے؟''

وہ سوچنے لگا۔ پھر آہستہ آہستہ اس نے بتانا شروع کیا۔ ''ایک دن ثمرین اور میں ایک ہوٹل میں تھے کہ وہ بھی وہاں کسی کے ساتھ آگیا۔ اس موقع پر ثمرین نے میرا اس سے تعارف کروادیا۔ وہ ایک شاندار نوجوان تھا۔ مجھے خوف محسوس ہونے لگا کہ ثمرین واقعی اس کی ہوجائے گی۔ اس نے بھی کہا تو کچھ نہیں۔ لیکن گہری نگاہوں سے میری طرف دیکھتا رہا۔ پھر اپنے ساتھی کے ساتھ ایک طرف جا کر بیٹھ گیا۔ میں اور ثمرین اس کے بارے میں باتیں کرنے لگے۔ کچھ دیر بعد وہ اپنے ساتھی سے اجازت لے کر اس طرف چلا گیا جہاں واش روم بنے ہوئے تھے۔ کچھ دیر بعد مجھے بھی واش روم کی طرف جانے کی ضرورت ہوئی تو میں نے وہاں ایک عجب تماشا دیکھا۔''

وہ خاموش ہوکر سوچنے لگا۔ اس کے بیان میں کہیں کوئی ایسی علامت نہیں تھی کہ کوئی ذہنی مریض بیان دے رہا ہو۔

''جب میں وہاں پہنچا تو پتا چلا کہ ایک واش روم سے کسی کے چیخنے اور رونے کی آواز آرہی تھی۔ اور باہر سے کچھ لوگ اس کا دروازہ کھولنے کی کوششیں کررہے تھے۔ بہر حال کچھ دیر بعد جب دروازہ کھولا تو اندر ابرار بند ہوگیا تھا۔ اسے نیم بے ہوشی کے عالم میں باہر نکال لیا تھا۔''

''اور اس وقت میری کتابوں اور میرے علم نے مجھے بتادیا کہ ابرار ایک ایسے نفسیاتی مرض میں مبتلا ہے جس کو کلاسٹروفوبیا کہتے ہیں۔ بند جگہوں کا خوف۔ اور اس وقت میرے ذہن میں اس کو اپنے اور ثمرین کے راستے سے ہٹانے کی ترکیب آگئی۔''

''مختصر یہ بتادوں کہ میں نے اسے اسی کے دفتر میں جا کر مارا تھا۔ میں جانتا تھا کہ اس کا دفتر کہاں ہے... اور اس کے معمولات کیا ہیں۔ وہ کتنی دیر تک بیٹھا رہتا ہے۔''

''یہ سب تمہیں کیسے معلوم ہوا۔''

''یہ کون سا مشکل تھا۔'' اس کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ آگئی۔ ''جب کسی کے بارے میں اس قسم کی پلاننگ کرلی جائے تو اس قسم کی معلومات حاصل کرنی ہوتی ہیں۔''

''اس کا دفتر بہت شاندار ہے۔ بہت خوبصورت۔ اس بلڈنگ کے تیسرے فلور پر اور بھی کئی دفاتر ہیں۔ اس کا معمول یہ تھا کہ وہ چھ بجے کے بعد بھی دفتر میں اکیلا بیٹھا کام کیا کرتا تھا۔ سب کے سب چلے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ چپراسی بھی نہیں رہتا تھا۔''

میں نے ان معمولات کا فائدہ اٹھایا... اور چھ بجے کے بعد اس کے دفتر پہنچ گیا۔ توقع کے مطابق وہ اکیلا ہی تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ حیران رہ گیا تھا۔''

''آپ کا ایڈریس مجھے ثمرین نے دیا تھا۔'' میں نے اس سے کہا۔ ''آپ سے ضروری بات کرنے آیا ہوں۔''

''آؤ اندر آجاؤ۔''

میں اس کے ساتھ ساتھ اس کے دفتر میں داخل ہوا۔ کچھ دیر اِدھر اُدھر باتوں کے بعد میں نے واش روم جانے کی خواہش ظاہر کی۔ اس نے بتادیا کہ اس کے کمرے سے اس طرف کو واش روم ہے۔ میں اس کے کمرے سے نکلا۔ دروازہ بند کیا... اور بڑے آرام سے باہر کی کنڈی لگادی۔ اب وہ دروازہ اندر سے کھل ہی نہیں سکتا تھا۔ اس کے بعد اطمینان سے باہر بیٹھ کر انتظار کرتا رہا۔''

اور بالآخر وہی ہوا جو میں نے سوچا تھا۔ اندر سے وہ دروازہ کھولنے کی کوششیں کرتا رہا۔ چیختا چلاتا رہا۔ روتا رہا۔ لیکن کون سننے والا تھا۔ پھر دھڑ دھڑ چیزیں گرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ میں پھر بھی انتظار کرتا رہا۔ اور جب بہت دیر تک خاموشی رہی تو میں نے آہستہ سے باہر کی کنڈی کھولی۔ رومال سے انگلیوں کے نشانات مٹائے اور واپس آگیا۔''

''دوسری صبح اس کی موت کی خبر مل چکی تھی۔ اور یہ بھی کہ اس کی موت ہارٹ فیل ہونے سے ہوئی تھی۔ میڈیکل رپورٹ یہی بتاتی تھی۔ تو اس طرح میں نے اپنے علم کا استعمال کرکے ایک آدمی کا خون کردیا ہے۔ یہ طریقہ مجھے کتابوں نے سکھایا تھا۔ خونی ہوں میں۔ اور اب میں اس مرض میں مبتلا ہوگیا ہوں۔ کلاسٹروفوبیا کا مریض۔ اگر دروازے اور کھڑکیاں بند ہوجائیں تو مرجاؤں گا میں۔''

میرے خدا میرے سامنے ایک قاتل بیٹھا تھا۔ لیکن ایسا قاتل جو خود اپنے انجام کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ میرے گھر سے چلا گیا۔ اس کے بعد آج تک میری اس سے ملاقات نہیں ہوئی۔

لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ وہ ایک عرصے سے ایک شفا خانے میں ہے جہاں اسے کھلی فضا میں رکھا جاتا ہے۔

میں آفس وین سے اتری۔ وین گلی کے سرے پر اتارتی تھی۔ کیونکہ ہماری گلی چوڑی ہونے کے باوجود پارک گاڑیوں کی وجہ سے اتنی تنگ ہو جاتی تھی کہ ہائی ایس وین اندر نہیں آسکتی تھی۔ مجھے کوئی مسئلہ نہیں تھا تیسرا ہی گھر ہمارا تھا۔ مجھے چند قدم چلنا پڑتا تھا۔ میں گیٹ تک آئی تو اندر سے تیز میوزک کی آواز باہر تک آرہی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ فاریا گھر میں تھی۔ میں نے کال بیل دی تو ساحر نے دروازہ کھولا اور خوش ہو کر بولا۔ ''آپی آ گئی۔''

خاطرِ دنیا

محترمہ عذرا رسول

تسلیم!

بدلتے حالات نے ہمارے معاشرے کو کس طرح بدل ڈالا ہے کہ اب رشتوں کی پاسداری بھی ختم ہوچکی ہے۔ مفاد پرستی کا طوفان سب کچھ اڑالے گیا ہے۔ ایک بہن کس طرح اپنے مفاد کی خاطر سنگ دل بن جاتی ہے آپ کو اس آپ بیتی میں بخوبی نظر آجائے گا۔ اپنے دکھ درد کو دوبارہ بیان کرنا خاصا مشکل ہے پھر بھی میں اس پل صراط سے گزری ہوں تاکہ سرگزشت کے قارئین سبق حاصل کریں۔

ماریا اسد

(کراچی)

میں روز اسی وقت آتی تھی۔ ساحر روز دروازہ کھولتا اور مجھے دیکھ کر اسی طرح خوش ہوتا تھا۔ ساحر مجھ سے چار سال چھوٹا اور فاریا سے تین سال بڑا تھا۔ مگر چوبیس برس کی عمر میں اس کا ذہن دس سال کے بچے سے زیادہ نہیں تھا بلکہ آج کل دس سال کے بچے بھی بہت ہوشیار ہوتے ہیں۔ ساحر پیدائش کے وقت ہی دماغی پسماندگی کا شکار تھا۔ تین سال کی عمر میں اس نے چلنا اور چھ سال کی عمر میں بولنا شروع کیا تھا۔ جب تک امی ابو زندہ رہے وہ اس کی دیکھ بھال اور علاج کے لیے کوشاں رہے۔ مگر جب ایک حادثے میں ان دونوں کا انتقال ہوا تو ساحر بس گھر کا ہو کر رہ گیا۔ میرے لیے ممکن نہیں تھا کہ اس کی دیکھ بھال کے ساتھ ساتھ جاب بھی کرتی۔ فاریا بے پروا تھی اور خود میں ہی مقید رہتی تھی۔ وہ ایک پرائیویٹ یونیورسٹی میں پڑھ رہی تھی۔ وہ چھوٹی اور امی ابو کی لاڈلی تھی اس لیے اس نے ان کی ناگہانی موت کا بہت زیادہ اثر لیا تھا۔

امی کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ ابو انہیں ڈاکٹر کے پاس لے گئے تھے۔ واپسی میں ایک بس نے ابو کی کار کو ٹکر مار دی۔ حادثہ اتنا شدید تھا کہ دونوں موقع پر وفات پا گئے۔ اس حادثے نے ہمارے گھر پر قیامت ڈھا دی تھی۔ دنیا میں ماں باپ کے سوا ہمارا کوئی نہیں تھا۔ ہم بکھر کر رہ گئے تھے۔ خاص طور سے فاریا اور ساحر کی حالت بری تھی۔ حالت تو میری بھی اچھی نہیں تھی لیکن میں بڑی تھی اور اب مجھے ہی گھر دیکھنا تھا۔ دور پرے کے چند رشتے دار تھے جو سوم تک ہمارے ساتھ رہے اور پھر اپنے گھروں کو چلے گئے۔ کسی نے نہیں پوچھا کہ ماں باپ کے بعد ہم کیا کریں گے۔ کیسے گزارا کریں گے۔ میں اس وقت صرف اکیس برس کی تھی اور چند مہینے پہلے گریجویشن کا امتحان دیا تھا۔ ابھی میرا رزلٹ بھی نہیں آیا تھا۔ ساحر نے اسکول کی حد تک پڑھا تھا۔ وہ بھی پرائمری پاس تھا۔ وہ کچھ کرنے کے قابل بھی نہیں تھا۔ اگر وہ ٹھیک ہوتا تب بھی سترہ سال کا لڑکا کیا کر سکتا ہے۔ فاریا چودہ سال کی تھی اور اس وقت میٹرک میں تھی۔ میں نے محسوس کیا کہ جو دیکھنا ہے مجھے ہی دیکھنا ہے۔

ابو ایک آئل ریفائنری میں درمیانے درجے کے آفیسر تھے۔ تنخواہ اور دوسری سہولیات اچھی تھیں۔ اسی لیے وہ ایک اچھے علاقے میں یہ گھر بنانے میں کامیاب ہوئے تھے۔ مگر یہ گھر اتنا مہنگا پڑا تھا کہ ابو کی ساری جمع پونجی اس پر لگ گئی تھی اور انہیں دفتر سے ادھار لینا پڑا تھا۔ اس لیے جب ان کے بقایاجات ملنے کا وقت آیا تو ہمیں بس چھ لاکھ ملے تھے۔ کچھ انشورنس کی رقم تھی۔ مل ملا کر چھ لاکھ بچے تھے۔ میں نے فیصلہ کیا کہ میں جاب تلاش کروں گی۔ ہمارا مکان دو منزلہ تھا۔ اوپر والی منزل کا کچھ کام باقی تھا اور ابو کا ارادہ تھا کہ اسے مکمل کرا کے کرائے پر دے دیں گے۔ فوری آمدنی کے لیے یہی ایک چیز تھی۔ میں نے ہمت کی اور اپنی نگرانی میں اسے مکمل کرا کے ایک اسٹیٹ ایجنٹ کے توسط سے کرائے پر دے دیا۔ خوش قسمتی سے کرائے دار اچھے ملے تھے۔ دو میاں بیوی تھے۔ دونوں جاب کرتے تھے اور ان کے دو بیٹے تھے جو اسکول جاتے۔ انہوں نے بچوں کی دیکھ بھال کے لیے ملازمہ بھی رکھی ہوئی تھی۔

ماہانہ کرایہ آنے لگا تو گھر کے اخراجات کی طرف سے بے فکری ہوئی۔ چھ لاکھ میں نے پہلے ہی ڈیپازٹ کرا دیے تھے۔ ان سے بھی کچھ نہ کچھ ملتا رہتا تھا۔ رزلٹ آنے تک میں نے کمپیوٹر پر اکاؤنٹس کا ایک مختصر کورس کیا اور اس دوران میں جاب کے لیے سی وی بھیجتی رہی۔ کئی جگہ سے انٹرویو کال آئی مگر بات نہیں بنی۔ پھر ایک چھوٹی گارمنٹ فیکٹری میں آفس اسسٹنٹ کی جاب ملی۔ تنخواہ بھی زیادہ نہیں تھی مگر کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہوتا ہے یہی سوچ کر میں نے جاب کر لی۔ میں صبح دفتر جاتی اور فاریا کالج جاتی تھی۔ اس نے میٹرک کر لیا تھا۔ امی ابو کی وفات کے دو مہینے بعد اس کے پیپرز ہوئے تھے۔ ساحر گھر پر ہوتا۔ مگر اوپر بچوں کی ملازمہ ہوتی تھی اس لیے مجھے اطمینان تھا کہ کوئی بات ہوئی تو وہ دیکھ لے گی۔ پھر ساحر اتنا سمجھدار ضرور تھا کہ جو ہدایت دی جاتی اس پر عمل کرتا تھا۔ میں شام پانچ بجے دفتر سے اٹھ جاتی تھی اور آدھے پون گھنٹے میں دفتر سے گھر پہنچ جاتی۔ اتنا وقت بھی بس یا وین کے انتظار اور ٹریفک جام میں لگتا تھا ورنہ دفتر سہراب گوٹھ انڈسٹریل ایریا میں تھا۔ ہمارا گھر سفاری پارک کے ساتھ گلستان جوہر میں تھا۔

ایک سال بعد تجربے اور مزید کچھ کورسز کی بنیاد پر مجھے ایک بڑی کمپنی میں جاب مل گئی۔ یہاں تنخواہ کے ساتھ ماحول بھی بہتر تھا اور کنوینس کی سہولت تھی جو آج کے دور میں بہت بڑی سہولت ہے۔ اب میں آرام سے پندرہ بیس منٹ میں گھر پہنچ جاتی تھی اور صبح جاتے ہوئے اس سے بھی کم وقت لگتا تھا۔ یہیں میری ملاقات ریحان سے ہوئی۔ ریحان گارمنٹس اور لیدر کا سامان بنانے والی کمپنیوں کو مختلف نوعیت کا سامان مہیا کرتا تھا۔ اس سے پہلی ملاقات ایک بل

کی ادائیگی کے سلسلے میں ہوئی تھی۔ اس نے کچھ سامان ہماری کمپنی کو دیا تھا اور اسے بل ادا نہیں کیا گیا تھا۔ اصل میں پرچیز رکا اس سے کسی بات پر معمولی سا جھگڑا ہوا تھا اور اب وہ اسے تنگ کر رہا تھا۔ میں نے معاملہ جنرل منیجر کے سامنے رکھا اور انہوں نے ایک منٹ میں اسے حل کر دیا۔ ادائیگی تین لاکھ کی تھی اور ریحان اس پر بہت شکر گزار ہوا تھا۔ اگلی بار وہ آیا تو ایک پیکٹ میرے سامنے رکھا۔ میں نے پوچھا۔ ''یہ کیا ہے؟''

''ایک کلینڈر اور ایک ڈائری ہے۔ میرے پاس آئے تھے میں آپ کے لیے بھی ایک سیٹ لے آیا۔''

دفتروں میں اس قسم کی چیزیں ملتی رہتی ہیں اس لیے میں نے شکریے کے ساتھ وصول کر لیں۔ اس کے چند ہفتے بعد کی بات تھی۔ دفتر سے واپسی پر یونیورسٹی روڈ پر وین میں کچھ مسئلہ ہوا۔ اتفاق سے میں تھی اور دو آدمی تھے۔ وین والے نے مجھ سے کہا۔ ''باجی آپ خود چلی جائیں یہاں سے کچھ ہی دور ہے۔''

میں نے سوچا کہ رکشا کر لوں مگر رکشا ملا نہیں اس لیے پیدل چل پڑی۔ ویسے بھی یہ بارونق سڑک تھی اور ابھی شام کا وقت تھا۔ میں سروس روڈ پر چل رہی تھی کہ اچانک ایک بائیک میرے پاس سے گزری اور پھر آگے جا کر رکی تھی۔ بائیک والے نے ہیلمٹ اتار کر میری طرف دیکھا۔ وہ ریحان تھا۔ اس نے کہا۔ ''آپ آج پیدل جا رہی ہیں۔''

''ہاں وین میں مسئلہ ہو گیا تھا اور کوئی رکشا ملا نہیں تو پیدل جا رہی ہوں گھر بس کچھ ہی دور ہے۔''

''میں جانتا ہوں۔'' اس نے اطمینان سے کہا۔ ''میں بھی اسی علاقے میں رہتا ہوں جن فلیٹوں کے بعد آپ کے گھر کی گلی آتی ہے میں اسی میں رہتا ہوں۔''

میں حیران ہوئی تھی۔ ''اچھا! آپ نے مجھے بتایا نہیں۔''

''کبھی ضرورت نہیں پڑی، ویسے آپ کو کئی بار وین سے اترتے اور صبح جاتے دیکھا ہے۔''

ریحان خوش شکل لڑکا تھا۔ متوسط قد لیکن مضبوط ورزشی جسامت تھی۔ عمر اس کی ستائیس اٹھائیس سے زیادہ نہیں تھی۔ رنگ سرخ و سفید نہیں تھا مگر صاف ضرور تھا۔ چہرے پر ہلکی سی شیو ہوتی تھی اور کبھی کلین شیو ہوتا تھا۔ لائٹ براؤن آنکھیں اور اسی رنگ کے گھنے گھنگریالے بال تھے۔ لباس ہمیشہ بہترین پہنتا تھا۔ میں نے ایک بار بھی اسے الٹے سیدھے حلیے میں نہیں دیکھا تھا جیسا کہ آج کل کے نوجوانوں کا انداز ہے۔ اسی طرح گفتگو بھی نپی تلی اور بہت مہذبانہ انداز میں کرتا تھا۔ عورتوں سے بات کرتے ہوئے اس کی نگاہیں غیر ضروری طور پر نہیں بھٹکتی تھیں اور نہ ہی وہ نظریں جما کر دیکھتا تھا۔ اس کے باوجود مجھے احساس ہوتا تھا کہ وہ لڑکیوں میں دل چسپی لیتا ہے اور یقیناً لڑکیاں بھی اس میں دل چسپی لیتی ہوں گی۔ مگر میں نے کبھی اس کی آنکھوں میں اپنے لیے دل چسپی محسوس نہیں کی تھی۔ وہ مجھ سے ذرا محتاط انداز میں بات کرتا تھا۔ اس وقت بھی اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ''آپ برا نہ مانیں تو میں آپ کو ڈراپ کر دوں۔''

فاصلہ اب بھی خاصا باقی تھا مگر میں نے انکار کر دیا۔ ''نہیں میں چلی جاؤں گی ویسے بھی مجھے کچھ چیزیں... لینی ہیں۔''

''اوکے بائے۔'' اس نے کہا اور بائیک اسٹارٹ کر کے روانہ ہو گیا۔ اس نے پھر اصرار نہیں کیا تھا اور مجھے یہ بات اچھی لگی۔ مجھے کچھ لینا نہیں تھا مگر میں نے بہانہ کر دیا تھا۔ چند دن بعد ساحر کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی میں اسے لے کر نزدیک ہی کلینک آئی۔ وہاں ریحان بھی موجود تھا۔ ساحر کو دیکھ کر وہ جھجکا پھر اس نے سلام کیا اور خیریت پوچھی۔ میں نے سلام کے جواب کے بعد اسے ساحر کے بارے میں بتایا۔ مگر یہ نہیں بتایا کہ وہ ذہنی لحاظ سے پسماندہ ہے۔ یہ بات ریحان نے خود محسوس کر لی۔ اس کی بھی طبیعت خراب تھی اور وہ بھی ڈاکٹر کو دکھانے آیا تھا۔ اتفاق سے کلینک میں ہم تین تھے۔ اس نے اپنی باری پر ساحر کو اندر بھیج دیا اور اس کے جانے کے بعد اس نے آہستہ سے کہا۔

''آپ کا بھائی....''

''ذہنی پسماندہ ہے۔'' میں نے بھی آہستہ سے کہا کیونکہ ڈاکٹر کا کارڈ بورڈ کا کیبن ساتھ ہی تھا اور اندر آواز جا سکتی تھی۔ ''اس کی سمجھ دس سال کے بچے سے زیادہ نہیں ہے۔''

''اوہ!'' اس نے افسوس کیا۔ ''دیکھنے میں بالکل ٹھیک ہے بہت صحت مند ہے۔''

''جسمانی صحت بالکل ٹھیک ہے۔''

''آپ کے باقی گھر والے؟''

''امی ابو کا ایک حادثے میں انتقال ہو گیا تھا۔ بس ہم تین بہن بھائی ہیں۔ ساحر مجھ سے چھوٹا ہے اور فاریا سب سے چھوٹی ہے۔ وہ یونیورسٹی میں پڑھ رہی ہے۔''

''آپ سب سے بڑی ہیں اور گھر کی ذمے داری آپ پر ہے؟'' اس نے تصدیق چاہی۔ میں نے سر ہلایا۔

اس نے گہری سانس لی۔

"بڑا ہونا آسان نہیں ہے۔"

"آپ بھی سب سے بڑے ہیں؟"

"ہاں ابو کے بعد میں ہی گھر چلا رہا ہوں۔ میٹرک کے بعد سے اس کام میں ہوں۔ ساتھ ہی ایجوکیشن بھی جاری رکھی۔ آج کل ایک ایم بی اے کی ایوننگ کلاسز لے رہا ہوں۔ امی کے ساتھ تین چھوٹے بہن بھائیوں کا میں ہی سہارا ہوں۔"

میں متاثر ہوئی تھی ۔وہ اتنی ساری ذمّے داریاں اٹھانے کے ساتھ ساتھ تعلیم بھی جاری رکھے ہوئے تھا۔ اس کی دو چھوٹی بہنیں تھیں اور سب سے چھوٹا بھائی تھا جو ابھی اسکول میں پڑھ رہا تھا۔ ایک بہن نے گریجویشن کرلیا تھا اور اس کا رشتہ طے کر دیا تھا۔ دو مہینے بعد اس کی شادی تھی۔

ریحان نے کہا۔ "آپ شادی میں آیئے گا۔"

"کیوں نہیں اگر آپ بلائیں گے تو ضرور آؤں گی۔" میں نے کہا۔

وہ خوش ہو گیا۔ "ٹھیک ہے میں امی کے ساتھ کارڈ دینے آؤں گا۔"

"آپ نے میرا گھر دیکھا ہوا ہے؟"

وہ جھینپ گیا۔ "اتفاق سے دیکھا ہے، ایک بار آپ وین سے اتر کر اندر جا رہی تھیں۔"

اسی دوران میں ساحر اندر سے آ گیا۔ کمپاؤنڈر نے اس کی تیار دوا اور مزید دوا جو میڈیکل اسٹور سے لینی تھی اس کا پرچہ دیا۔ ساتھ ہی سمجھایا کہ دوا کیسے دینی ہے۔ ساحر اس پر خوش تھا کہ اسے انجکشن نہیں لگا۔ وہ انجکشن سے ڈرتا تھا۔ البتہ دوا آرام سے کھا پی لیتا تھا۔ فاریہ گھر پر اکیلی تھی اس لیے دوا لے کر ہم جلد گھر آ گئے۔ فاریہ حسبِ معمول کمرے میں تھی اور وہاں سے تیز میوزک کی آواز آ رہی تھی۔ جب تک وہ اکیلی ہوتی تو بہت تیز آواز میں سنتی تھی مگر جب میں گھر آ جاتی تو اسے آواز ہلکی کرنا پڑتی تھی۔ میں کھانا بنا کر گئی تھی۔ آفس سے آنے کے بعد میں سالن تیار کرتی تھی اور اتنا بنا لیتی کہ اگلے دن دوپہر میں بھی چلتا تھا۔ صبح ناشتا فاریہ بناتی تھی اور دوپہر میں آ کر روٹیاں بناتی تھی۔ میں رات کا کھانا بناتی اور کچن کی صفائی کرتی تھی۔ فاریہ رات میں کچھ نہیں کرتی تھی۔ میں نے اس کے دروازے پر دستک دی۔

"کھانے کے لیے آ جاؤ۔"

دوسری بار پکارنے پر وہ باہر نکل آئی۔ فاریہ شروع سے موڈی تھی۔ ہر کام اپنے موڈ پر کرتی تھی اس میں کھانا پینا بھی شامل تھا۔ یونیورسٹی میں داخلہ بھی اس نے مرضی سے لیا تھا۔ حالانکہ میں چاہ رہی تھی وہ جس کالج میں ہے اسی سے گریجویشن کر لے۔ مگر اس نے ضد کر کے یونیورسٹی میں داخلہ لیا۔ حالانکہ اسے پڑھنے کا زیادہ شوق نہیں تھا۔ سال کے بیشتر حصے میں وہ تفریحات میں مگن رہتی تھی جس میں میوزک اور اس کی فرینڈز سرِفہرست تھیں۔ اسے میوزک کا جنون کی حد تک شوق تھا۔ اس پر وہ اونچی آواز میں سننے کی عادی تھی۔ البتہ میں گھر میں ہوتی تو آواز کم ہو جاتی تھی کیونکہ مجھے میوزک سے دل چسپی نہیں تھی اور تیز آواز میں میوزک میری برداشت سے باہر تھا۔ فاریہ نے مارکیٹنگ میں بی بی آنرز میں داخلہ لیا تھا اور ایم بی اے ملا کر یہ چھ سال کا ہو جاتا۔ ہر مہینے اچھی خاصی فیس اور دوسرے اخراجات ہو جاتے تھے۔ لیکن یہ مسئلہ نہیں تھا۔ کرائے، انویسٹ کی ہوئی رقم اور میری تنخواہ اتنی تھی کہ آرام سے اس کے یہ اخراجات پورے ہو جاتے تھے... میں چاہتی تھی کہ وہ گریجویشن کر لے تو کوئی مناسب رشتہ دیکھ کر اس کی شادی کر دوں۔

فاریہ اور مجھ میں بہنوں والی بے تکلفی نہیں تھی۔ اگرچہ محبت بہت تھی۔ وہ میری تکلیف پر بے قرار ہو جاتی تھی اور اگر اسے کوئی مسئلہ ہوتا تو مجھے چین نہیں آتا تھا۔ اگر وہ کوئی خواہش کرتی تو میرے لیے اسے پورا کرنا جیسے فرض ہو جاتا تھا۔ وہ لا ابالی تھی۔ خود سے بے پروا رہتی تھی۔ اس کے کپڑے اور ضرورت کی دوسری چیزیں بھی میں لاتی تھی۔ اس کی ساری شاپنگ میوزک، سی ڈیز اور اپنی پسند کی چیزوں تک محدود تھی۔ ان سب باتوں کے باوجود میری اس سے بے تکلفی نہیں تھی۔ میں اس سے اپنی باتیں بہت کم شیئر کرتی تھی اور وہ مجھ سے بہ مشکل ہی کوئی بات شیئر کرتی تھی۔ اس کی اکثر مصروفیات مجھے اطلاع کی صورت میں ملتی تھیں۔ جیسے آج فلاں دوست کے ہاں جانا ہے وہ یونیورسٹی سے چلی جائے گی۔ یا اس کی فرینڈز گھر آ رہی ہیں۔ ان کے لیے کچھ بنانا ہو گا۔ تب میں پہلے سے اس کا انتظام کرتی تھی۔ فاریہ کو کھانے پکانے سے کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ بس وہ روٹی بناتی تھی اور برتن دھو لیتی تھی۔ صبح کا ناشتا ریڈی میڈ ہوتا تھا۔ دودھ ڈبل روٹی اور انڈوں سے کیا جاتا تھا۔ مجھے بھی خیال نہیں آیا کہ اس پر ذمّے داری ڈالوں کہ اسے دوسرے گھر جانا ہے۔

اس وقت وہ چار سال کی تعلیم مکمل کر چکی تھی اور اب دو سال رہ گئے تھے۔ میں سوچ رہی تھی کہ اس کے لیے رشتے کی

تلاش شروع کر دوں تاکہ جیسے ہی اس کی تعلیم مکمل ہو اس کی شادی کر دی جائے۔ مگر جب میں نے اس سے یہ بات کی تو اس نے بے پروائی سے کہا۔ "آپی مجھے جاب کرنی ہے۔"

"کیوں؟"

"آپ کیوں کر رہی ہیں؟"

"مجھے شوق نہیں ہے۔" میں نے کسی قدر تیز آواز میں کہا۔ "یہ میری مجبوری ہے۔"

"میں جانتی ہوں آپ پر بردن ہے۔" اس نے رسانیت سے کہا۔ "آپ اپنی شادی کی فکر کریں.... میری نہیں، میری تو ابھی عمر ہے اور ایم بی اے کمپلیٹ ہونے میں بھی دو سال باقی ہیں۔"

"جب تک میں تمہاری ذمّے داری نہیں نمٹا لیتی میں اپنے بارے میں نہیں سوچ سکتی۔"

"مرضی آپ کی، اپنا میں نے بتا دیا ہے، ابھی میرا شادی کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔" اس نے حتمی لہجے میں کہا اور کھانے کی میز سے اٹھ گئی۔ ساحر ہم دونوں کی گفتگو سے بے نیاز کھانے میں مصروف تھا۔ اسے دنیا میں اگر کوئی کام اچھا لگتا تھا تو وہ کھانا پینا تھا۔ اسے باہر کی چیزیں جیسے پزا اور بیکری آئٹمز پسند تھے اس لیے اگر وہ گھر سے باہر جاتا تو یہی سب لینے جاتا تھا۔ شاید اسی لیے اس کی جسامت خاصی بڑی تھی۔ قد چھ فٹ سے ذرا زیادہ اور وزن نوّے کلوگرام تھا۔ جسمانی قوت بھی خاصی تھی۔ بہت مشکل اور سخت کام بھی آسانی سے کر لیتا تھا۔ کبھی کبھی میں سوچتی کہ وہ کیا کرے گا۔ میں اور فاریہ اس کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ فاریہ کی شادی ہو جاتی اور شاید میری بھی تو تب بھی میں اسے اپنے ساتھ رکھتی۔ مگر مجھے یہ خیال بھی تھا کہ کوئی غیر شخص اتنا خیال کہاں کرے گا کہ ایک آدمی کو مستقل ذمّے داری بنا کر پاس رکھے۔ شاید اسی لیے مجھے اپنی شادی کا خیال نہیں آتا تھا۔

مگر اس روز فاریہ نے کہا کہ پہلے میں اپنی شادی کی فکر کروں تو مجھے اپنی عمر کا خیال آیا۔ میں اٹھائیس کی ہو چکی تھی۔ اگرچہ خوب صورت تھی۔ جسم اور چہرے سے لڑکی لگتی تھی۔ دیکھنے والے مجھے چوبیس سے زیادہ کا نہیں سمجھتے تھے۔ مگر اب میرے پاس زیادہ وقت نہیں رہا تھا۔ چند سال بعد عمر چہرے سے بھی جھلکنے لگتی۔ جسم ہلکا رکھنے کے لیے میں کھانے پینے میں احتیاط کرتی تھی اور دفتر سے تھکی آنے کے باوجود گھر کے بہت سے کام بھی خود کرتی تھی۔ اس طرح میں فٹ رہتی تھی۔ اگرچہ میں شادی کے لیے ذہنی طور پر آمادہ نہیں تھی لیکن اگر ہو بھی جاتی تو ہمارے سر پر کوئی بڑا نہیں تھا جو میری شادی کی فکر کرتا۔ دور پرے کے کچھ رشتے دار تھے جنہیں ہم سے کوئی دل چسپی نہیں تھی۔ امی ابو کے بعد انہوں نے پلٹ کر ہمیں پوچھا بھی نہیں تھا۔ میں خود سے تو اپنے لیے بر تلاش نہیں کر سکتی تھی۔

اس روز اتوار تھا۔ ہر روز صفائی کرنے والی ماسی آتی تھی۔ کپڑے بھی ہر دوسرے دن دھوتی تھی مگر اتوار کو بہت سا کام نکل آتا تھا اور یہ نمٹانا ہوتا تھا۔ میں اپنے کمرے کی جھاڑ پونچھ کر رہی تھی۔ گراؤنڈ فلور پر دو بیڈروم تھے۔ دونوں بیڈروم میرے اور فاریہ کے پاس تھے۔ پہلے میں اور فاریہ ایک ہی کمرے میں تھے لیکن انٹر کے دنوں میں اس نے ضد کر کے اپنا بیڈروم الگ کر لیا تھا۔ پہلے یہ ساحر کے پاس تھا اب وہ لاؤنج میں سوتا تھا۔ رات میں اسے واش روم جانا ہوتا تو وہ سیڑھیوں کے نیچے والا واش روم استعمال کرتا تھا۔ پورچ کے ساتھ ڈرائنگ روم تھا۔ پہلے اوپر والے پورشن کی سیڑھیاں کھلی تھیں پھر میں نے اس پر دیوار کرا دی اب یہ مکمل طور پر الگ تھی۔ ایک دروازہ تھا جس کی مدد سے ہم بھی چھت پر جا سکتے تھے لیکن یہ اندر سے بند کر لیتے تو سیڑھیوں کی طرف سے کوئی اندر نہیں آ سکتا تھا۔ نہ ہی اوپر آنے جانے والے ہمارے پورشن میں دیکھ سکتے تھے۔ اس وقت میں پورشن دھو رہی تھی۔ اچانک کال بیل بجی تو میں نے باہر جھانک کر دیکھا۔ ریحان ایک بوڑھی عورت کے ساتھ کھڑا تھا۔ میں حیران ہوئی پھر جلدی سے دوپٹا لے کر گیٹ کھولا۔

"آپ....."

"جی اور یہ میری والدہ ہیں۔" ریحان بولا۔ "میں اپنی بہن کی شادی کا کارڈ دینے آیا ہوں۔"

میں نے ریحان کی امی کو سلام کیا اور انہیں اندر آنے کو کہا پھر انہیں نشست گاہ میں لے آئی۔ "سوری آج چھٹی کا دن ہے تو صفائی کر رہی تھی۔ آپ کیا پئیں گی؟"

"کوئی بات نہیں بیٹا۔" انہوں نے نرمی سے کہا۔ "ہم بس کھڑے کھڑے آئے ہیں کسی تکلف کی ضرورت نہیں ہے۔"

"اس میں تکلف کی کیا بات ہے۔" میں نے کہا اور ان کے لیے کولڈ ڈرنک لے آئی۔ ریحان کے پاس کارڈز کا شاپر تھا اس نے ایک کارڈ نکال کر اپنی ماں کو دیا اور انہوں نے مجھے تھما دیا۔ "بیٹا ریحان نے مجھے تمہارے بارے میں بتایا تھا۔ اگر تم اپنے گھر والوں کے ساتھ آؤ گی تو ہمیں بہت

خوشی ہوگی۔‘‘

’’جی میں ضرور آؤں گی۔‘‘ میں نے کہا۔

وہ کچھ دیر بیٹھیں اور پھر چلی گئیں۔ اس دوران میں وہی بولتی رہی تھیں اور ریحان خاموش تھا۔ اس نے ایک دو باتیں کیں اور بس۔ البتہ اس کی امی نے مجھ سے کئی سوالات کیے جو گھر اور گھر والوں کے بارے میں تھے۔ میں نے مختصر الفاظ میں انہیں اپنے گھر کا بتایا۔ جانے کے بعد میں نے کارڈ دیکھا اس پر لکھا تھا۔ ماریا اسد و تھ فیملی۔ ریحان کی امی سادہ خاتون لگیں۔ وہ کسی قدر بے تکلفی لیکن بہت مہذب انداز میں گفتگو کر رہی تھیں۔ انہوں نے گھر کے دوسرے حصوں کو دیکھنے کی کوشش نہیں کی اور دس منٹ بعد اٹھ گئی تھیں۔ ساحر ٹی وی دیکھ رہا تھا اور فاریا اپنے کمرے میں سو رہی تھی۔ اتوار کا دن وہ دیر تک سوتی تھی اور عام طور سے بارہ بجے اٹھتی تھی۔ ریحان اور اس کی امی کے جانے کے بعد میں نے پورشن دھویا اور سیڑھیوں پر پانی ڈال کر اندر آئی تو فاریا اٹھ گئی تھی۔ وہ ڈائننگ ٹیبل پر رکھا ہوا کارڈ دیکھ رہی تھی۔ اس نے پوچھا۔ ’’آپی یہ مدیحہ عدنان کون ہے؟‘‘

میں نے اسے بتایا تو اس نے برا سا منہ بنایا۔ ’’میں نہیں جاؤں گی۔‘‘

’’بھئی یہ محلے کا معاملہ ہے۔ اگر ریحان دفتر میں آ کر کارڈ دیتا تو میں بھی نہ جاتی۔‘‘

’’آپ ساحر کو لے جایئے گا۔‘‘ اس نے بات ختم کر دی۔ ’’سب کا جانا لازمی نہیں ہے۔‘‘

’’تمہاری مرضی۔‘‘ میں نے اصرار نہیں کیا۔ شادی اگلے اتوار کو تھی اور نزدیک ہی لان میں تھی۔ یہاں تو پیدل بھی جا سکتے تھے۔ ساحر سن کر خوش ہو گیا کہ ہم شادی میں جائیں گے۔ اسے تقریبات میں جانے کا شوق تھا مگر اس کا موقع کم آتا تھا کیونکہ ہمارے جاننے والے اور رشتے دار بہت کم تھے۔ کہیں مہینوں میں جا کر کسی تقریب کی نوبت آتی تھی۔ زیادہ تر ہم محلے کی شادیوں میں شرکت کرتے تھے کیونکہ محلے میں سب سے جان پہچان اور سلام دعا تھی۔ امی ابو کی وجہ سے وہ لوگ بھی ہمیں جانتے تھے جن کے گھر ہم کبھی نہیں گئے تھے۔ اگلے اتوار کو میں اور ساحر مقررہ وقت پر شادی ہال پہنچ گئے کیونکہ کارڈ میں وقت کی پابندی کی خاص تاکید کی گئی تھی۔ میرا خیال تھا کہ وہاں شاید ابھی کوئی نہیں ہو گا مگر ریحان کے گھر والے مع دلہن کے آ چکے تھے اور دولہا والے آنے والے تھے۔

ریحان کی امی تپاک سے ملیں اور مجھے ڈریسنگ روم میں لے جا کر اپنی بیٹی سے ملوایا۔ مدیحہ پیاری لگ رہی تھی۔ اندر آتے ہوئے ساحر کو مردانہ حصے میں بھیج دیا تھا۔ میں اسے سمجھا کر لائی تھی کہ کسی سے زیادہ بات مت کرنا اور چپ رہنا۔ کوئی مسئلہ ہو تو میرے موبائل پر کال کرنا۔ مگر اسے ریحان مل گیا اور اس نے اسے اپنے کسی کزن کے پاس بٹھا دیا۔ میں ڈریسنگ روم سے نکل رہی تھی کہ ریحان وہاں آ گیا۔ پہلی بار اس نے مجھے غور سے دیکھا۔ ’’آپ بہت اچھی لگ رہی ہیں۔‘‘

میرا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ میں نے جھینپ کر کہا۔ ’’ہاں آج بہت دن بعد تیار ہوئی ہوں۔‘‘

’’میں جانتا ہوں ورنہ آپ دفتر میں بھی سادہ سی آتی ہیں۔‘‘

میں اسی میز پر آ گئی جہاں ریحان کی فیملی تھی۔ اس کا خاندان بھی زیادہ بڑا نہیں تھا۔ بس ایک چچا اور ایک خالہ تھیں۔ کچھ دور پرے کے رشتے دار تھے۔ شادی میں زیادہ تر محلے والے تھے اور ان میں سے کئی خواتین اور لڑکیاں میری جان پہچان والی نکل آئیں۔ ان سے اچھی گپ شپ رہی دولہا والے آئے۔ نکاح پہلے ہی ہو چکا تھا۔ رسمی کارروائی ہوئی پھر کھانا کھل گیا۔ میں نے مدیحہ کو نقد سلامی اور ایک سوٹ گفٹ کیا تھا۔ کھانے کے بعد میں نے اجازت لی تو ریحان کی امی اور چھوٹی بہن فریحہ مجھے باہر تک چھوڑنے آئے تھے۔ پھر ریحان سے ساحر کو بلوایا۔ رات کے کھانے کے بعد اسے جلد نیند آنے لگتی تھی۔ ہال کے باہر کئی ٹیکسیاں موجود تھیں ...... میں ٹیکسی لے رہی تھی مگر ریحان نے کہا۔ ’’میں چھوڑ آتا ہوں۔‘‘

’’نہیں آپ کی یہاں مصروفیت ہے اور دور ہی کتنا ہے۔‘‘

’’اسی لیے تو کہہ رہا ہوں بس چند منٹ لگیں گے۔‘‘ ریحان نے کہا۔ ایک کار پاس ہی موجود تھی۔ بعد میں پتا چلا کہ وہ ریحان کی کار تھی۔ کام کے لیے وہ بائیک استعمال کرتا تھا۔ اس نے ہمیں دروازے پر اتارا اور چلا گیا۔ فاریا گھر میں تھی۔ شام کو میں نے اسے پھر چلنے کو کہا مگر وہ اپنے انکار پر برقرار رہی تھی۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ وہ بہت کم شادیوں اور تقریبات میں جاتی تھی۔ ہاں اپنی فرینڈز کی کوئی تقریب وہ نہیں چھوڑتی تھی۔ کبھی کبھی مجھے غصہ آتا مگر میں اسے کہہ نہیں پاتی تھی۔ ایک تو میری فطرت میں نرمی

تھی۔ مجھے غصہ کرنا نہیں آتا تھا۔ دوسرے مجھے خیال رہتا تھا کہ کہیں میری ڈانٹ سے اسے امی ابو کی کمی کا احساس نہ ہو۔ اس معاملے میں وہ حساس تھی اور کئی بار رو دھو چکی تھی۔ اس لیے میں اس بارے میں محتاط رہتی تھی۔ ساحر بے پروا تھا اور وہ اکثر اس سے لڑ جاتا تھا۔ اسی پر وہ روتی تھی۔ مگر ساحر اس سے محبت بھی بہت کرتا تھا۔ جب وہ روتی تو اس وقت تک بے قرار رہتا جب تک اسے منا نہیں لیتا تھا۔ اگلے دن میں صبح اٹھی تو موبائل پر ایک ایس ایم ایس تھا۔

’’تھینکس فار کمنگ۔‘‘

میں سمجھ گئی تھی کہ وہ ریحان ہے مگر میں نے پوچھ لیا۔ ’’ہو آر یو؟‘‘

’’میں ریحان ہوں کل ساحر سے آپ کا نمبر لیا تھا۔‘‘

’’آپ کو میرا نمبر چاہیے تھا تو مجھ سے مانگ لیتے میں انکار تو نہ کرتی۔‘‘

’’کاش کہ مجھے معلوم ہوتا۔ دراصل میں جھجک رہا تھا۔‘‘ اس نے لکھا۔ ’’ویسے کیا میں آپ کو ایس ایم ایس کر سکتا ہوں۔‘‘

’’آپ کر سکتے ہیں۔‘‘

’’تھینک یو۔‘‘ اس نے مسکراہٹ کا سائن بنا کر لکھا۔

اس کے بعد وہ کبھی کبھی مجھے فارورڈ ایس ایم ایس کرتا اور کبھی مجھے خود میسج کرتا۔ اس نے مجھ سے پوچھا کہ اس کی امی اور بہنیں کیسی لگیں۔ میں نے کہا کہ بہت اچھی لگیں۔ ایک دن اس نے کہا کہ اس کی امی ہمارے گھر آنے کا کہہ رہی تھیں اور یہ بھی کہ موقع نکال کر چکر لگائیں گی۔ میں نے جواب دیا کہ وہ ضرور آئیں۔ کیونکہ ریحان نے نارمل انداز میں اپنی امی کے آنے کی بات کی تھی اس لیے میں نے بھی اسے نارمل لیا۔ ریحان نے کہا کہ جب وہ آئیں گی تو وہ پہلے سے بتا دے گا۔ میں نے کہا اس کی ضرورت نہیں ہے وہ ہمارے محلے دار بھی ہیں اور پڑوسیوں میں ایسا تکلف نہیں ہوتا ہے۔ وہ بے شک کسی وقت بھی آ جائیں جب میں گھر پر ہوتی ہوں۔ مگر یہ اتفاق تھا کہ آنے والے سنڈے کو ایک آفس کولیگ کی منگنی تھی اور اس نے مجھے بلا لیا۔ وہ میرے سیکشن میں ہوتی تھی اور اچھی بات چیت تھی اس لیے انکار کا سوال نہیں تھا۔ تقریب شام کی تھی اور میں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ میں رات کے کھانے پر نہیں رکوں گی۔ اسی شرط پر میں منگنی میں شریک ہوئی تھی۔ وہ گلشن اقبال میں رہتی تھی۔ میں تین بجے گھر سے نکلی اور سات بجے تک واپس آ گئی تھی۔

جب گھر میں داخل ہوئی تو ساحر نے مطلع کیا۔

’’آپی ریحان بھائی کی امی آئی تھیں۔‘‘

’’اچھا۔‘‘ میں نے کمرے کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ ’’وہ اندر آئی تھیں؟‘‘

’’ہاں بہت دیر بیٹھی تھیں۔ فاریا سے بات ہوئی تھی۔‘‘

’’یہ تو اچھا ہوا...... ورنہ وہ بے چاری ایسے ہی چلی جاتیں۔‘‘

چینج کر کے میں کچن میں آئی تو فاریا کمرے میں تھی۔ میں رات کے کھانے کی تیاری میں لگ گئی۔ میں منتظر تھی کہ فاریا باہر آئے تو میں اس سے پوچھوں کہ ریحان کی امی سے کیا بات ہوئی مگر وہ باہر ہی نہیں آئی، کچن سے نمٹ کر میں نے خود اس کے کمرے میں جھانکا۔ وہ بستر پر اوندھے منہ لیٹی ہوئی ایم پی تھری پلیئر پر گانے سن رہی تھی۔ کم سے کم اس کے ہلتے پاؤں سے یہی لگ رہا تھا۔ میں اندر آئی پھر اس کے سامنے آئی تو وہ جلدی سے سیدھی ہوئی۔ ’’آپ کب آئیں؟‘‘

’’ایک گھنٹے سے زیادہ وقت ہو گیا ہے۔ میں نے تو کھانا بھی بنا لیا۔ تم باہر نہیں نکلیں۔‘‘

’’میں گانے سن رہی تھی۔‘‘ فاریا نے کہا۔ ’’آپ بتائیں کیسا رہا؟‘‘

’’بہترین..... لیکن میں جلد اٹھ آئی۔‘‘

فاریا ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہی اور میں منتظر رہی کہ وہ ریحان کی امی کے بارے میں بتائے گی لیکن جب اس نے نہیں بتایا تو میں نے خود پوچھ لیا۔ ’’ریحان کی امی آئی تھیں؟‘‘

’’ہاں ثمینہ آنٹی آئی تھیں۔‘‘ اس نے چہک کر کہا۔ ’’بہت نائس ہیں، ہم بہت دیر باتیں کرتے رہے۔‘‘

مجھے تعجب ہوا کیونکہ فاریا شاذ ہی کسی سے ملتی تھی۔ خاص طور سے محلے میں اس کی کسی سے سلام سے زیادہ بات نہیں تھی۔ ’’اچھا کیا بات ہوئی..... میرا پوچھ رہی تھیں۔‘‘

’’نہیں..... وہ تو میرے بارے میں پوچھتی رہیں۔‘‘ فاریا نے صاف گوئی سے کہا۔ میں چپ ہو گئی تھی۔ فاریا بھی چپ ہو گئی اس نے مزید کچھ نہیں بتایا۔ اسی دوران میں باہر سے ساحر نے آواز دی۔

’’آپی بھوک لگ رہی ہے۔‘‘

’’ایک منٹ ابھی کھانا لگاتی ہوں۔‘‘ میں نے کہا اور

فاریا کو کھانے کی میز پر آنے کا کہہ کر باہر نکل آئی۔ کھانے کے بعد برتن دھوتے اور کچن صاف کرتے ہوئے میں نے سوچا کہ ریحان سے پوچھوں کہ اس کی امی نے واپس جا کر کیا بتایا لیکن پھر مجھے اچھا نہیں لگا اور میں نے ارادہ ملتوی کر دیا۔ فاریا کے رویے پر مجھے تعجب نہیں ہوا تھا۔ میں نے بتایا کہ ہم بہنوں کے درمیان بے تکلفی نہیں تھی اور فاریا بہت کم بات کرتی تھی۔ حیرت مجھے صرف ثمینہ آنٹی سے متعلق اس کے رویے پر تھی۔ وہ خاصی پُر جوش تھی۔ اگلے دن تک یہ سب میرے ذہن سے نکل گیا تھا۔ میں شام کو دفتر سے گھر آ رہی تھی راستے میں موبائل دیکھا۔ سارے دن کے ایس ایم ایس اسی وقت دیکھنے کا موقع ملتا تھا۔ اس میں ریحان کے بھی دو ایس ایم ایس تھے۔ ایک میں اس نے بتایا تھا کہ وہ کل اپنی امی کو چھوڑنے آیا تھا اور گیٹ سے پتا چل گیا تھا کہ میں گھر پر نہیں ہوں۔ میری بہن اس کی امی کو اصرار کر کے اندر لے گئی تھی۔ دوسرا ایس ایم ایس عجیب سا تھا۔ اس نے لکھا تھا۔

"امی جب سے آئی ہیں چپ چپ سی ہیں، وہ بتا نہیں رہی ہیں کہ آپ کے ہاں کیا بات ہوئی؟"

میں نے پوچھا۔ "امی نے کیا بتانا تھا جو نہیں بتا رہی ہیں۔"

"ماریا کیا میں آپ کو کال کر سکتا ہوں جب آپ فری ہوں اور کوئی آس پاس نہ ہو؟"

"خیریت ایسی کیا بات ہے؟"

"بس ہے میں آپ سے بات کرنا چاہ رہا ہوں۔"

میرا دل دھڑک اٹھا تھا۔ میں نے ایس ایم ایس کیا۔

"ہاں آپ رات دس بجے کے بعد کال کر لیجیے گا۔"

رات دس بجے تک میں بے چین رہی تھی۔ پتا نہیں ریحان کیا بات کرنا چاہ رہا تھا۔ میرے دل میں رہ رہ کر ایک خیال آ رہا تھا۔ مگر میں اسے ذہن سے جھٹک رہی تھی۔ ڈنر کے بعد عجلت میں کچن نمٹا کر میں کمرے میں چلی آئی۔ دس بجے کے بعد میں نے موبائل کی بیل آف کر دی۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ بیل فاریا یا ساحر کے کانوں تک پہنچے۔ اس وقت مجھے کوئی کال نہیں کرتا تھا اس لیے میں نہیں چاہتی تھی کہ وہ ریحان کی کال سے آگاہ ہوں۔ جیسے ہی اسکرین آن ہوئی میں نے کال ریسیو کی اور دھیمی آواز میں بولی۔

"ہیلو.....!"

"ماریا.....!" ریحان نے کہا۔

"بات کر رہی ہوں۔"

ریحان کچھ دیر خاموش رہا۔ "ماریا پلیز میری نیت پر شک نہیں کیجیے گا۔ میں جو کہوں وہ ٹھنڈے دل سے سنیے گا۔"

"آپ کہیں میں سن رہی ہوں۔"

"ماریا میں نے امی کو آپ کے لیے بھیجا تھا۔ میں جب سے آپ سے مل رہا ہوں، میرے دل میں آپ کے لیے جگہ بنتی جا رہی ہے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ میری زندگی میں شامل ہو جائیں۔ لیکن اس کے لیے آپ کی رضامندی لازمی ہے۔ میں نے امی کو اسی لیے بھیجا تھا۔"

میرا خیال درست ثابت ہوا تھا۔ ریحان کے انداز سے مجھے لگ رہا تھا کہ اس نے اپنی امی کو کسی خاص مقصد سے بھیجا تھا۔ میں نے آہستہ سے کہا۔ "میری ان سے ملاقات نہیں ہوئی۔"

"مجھے معلوم ہے ان کی ملاقات آپ کی بہن فاریا سے ہوئی اور وہ ان کے پاس خاصی دیر بیٹھی تھیں کیونکہ پھر انہوں نے مجھے کال کر کے بلایا تھا اور میں انہیں واپس لے گیا تھا وہ تقریباً دو گھنٹے وہاں بیٹھی تھیں۔"

میں حیران ہوئی۔ "دو گھنٹے.....لیکن فاریا نے تو نہیں بتایا۔"

ریحان نے گہری سانس لی۔ "دوسری طرف امی بھی کچھ نہیں کہہ رہی ہیں۔ ماریا آپ نے میری بات کا برا تو.....؟"

"ہرگز نہیں بلکہ آپ کی شرافت نے مجھے اور زیادہ قائل کر لیا ہے۔ آپ چاہتے تو یہ بات مجھ سے بھی کر سکتے تھے لیکن آپ نے امی کو بھیج دیا۔" میں نے بے ساختہ کہا تھا۔ ریحان خوش ہو گیا۔ اس نے جھجک کر کہا۔

"تو آپ راضی ہیں۔"

"ریحان آپ میں انکار کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ جو لڑکی آپ کی بیوی بنے گی وہ یقیناً خوش نصیب ہو گی۔ لیکن آپ جانتے ہیں میرے اوپر دو ذمے داریاں ہیں۔ فاریا کی ذمے داری اس وقت تک ہے جب تک اس کی شادی نہیں ہو جاتی لیکن ساحر....."

"ماریا آپ کو یہ سب بتانے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ میں اچھی طرح جانتا ہوں آپ کے یہ سارے مسائل اور میں یقین دلاتا ہوں کہ یہ سب میرے مسائل ہوں گے۔ آپ کو کبھی مجھ سے شکایت نہیں ہو گی۔"

میں کشمکش میں پڑ گئی تھی۔ ریحان کے انداز سے لگ رہا تھا وہ ابھی مجھ سے جواب چاہتا ہے۔ میں نے کہا۔ "ریحان کیا آپ مجھے سوچنے کی مہلت دیں گے؟"

اس نے جواب دیا۔ "آپ سوچ لیں اور مجھے بتا دیں کہ میں آپ کو پھر کب کال کروں؟"

میں نے سوچ کر کہا۔ "دو دن بعد....."

"ٹھیک ہے۔" ریحان بولا۔ "اب میں آپ کو دو دن بعد کال کروں گا۔ پر ماریا جو بھی فیصلہ کریں یہ سوچ کر کیجیے گا کہ میرے دل میں آپ کے لیے جو مقام ہے وہ مقام کوئی اور حاصل نہیں کر سکتا۔"

"میں اس کے لیے شکر گزار ہوں۔" میں نے کہا اور کال بند کر دی۔ لیکن میرے کانوں میں رہ رہ کر ریحان کی آواز گونج رہی تھی کہ اس کے دل میں جو مقام میرا ہے وہ کوئی اور حاصل نہیں کر سکتا..... ہر لڑکی چاہتی ہے کہ کوئی اسے چاہے اور صرف اسے چاہے اس سے زیادہ کسی کو اہمیت نہ دے۔ میری بھی یہی خواہش تھی۔ اس لیے جب ریحان نے میرے لیے خواہش ظاہر کی تو مجھے بہت اچھا لگا تھا۔ پھر مجھے اس کی امی کا خیال آیا۔ وہ یہاں آئیں اور دو گھنٹے فاریا کے ساتھ بیٹھ کر گئیں۔ مگر نہ تو فاریا کچھ کہہ رہی ہے اور نہ ہی ریحان کی امی نے اسے واپس جا کر کچھ بتایا۔ اگلے روز ناشتے کی میز پر میں نے فاریا سے پوچھا۔

"ریحان کی امی کوئی خاص کہہ رہی تھیں؟"

"نہیں۔" فاریا نے توس پر مارجرین لگاتے ہوئے کہا۔ "بس وہ اپنی اور مجھ سے میری باتیں کرتی رہیں۔ اتنا کرید کرید کر میرے بارے میں پوچھا کہ مجھے حیرت ہوئی کہ کسی کو مجھ سے اتنی دل چسپی بھی ہو سکتی ہے۔"

"تم سے دل چسپی ہے۔" میں نے کہا کیونکہ مجھے لگا جیسے اس نے یہ بات مجھے سنائی ہو۔ "لیکن تمہیں اپنے بارے میں بات کرنے میں دل چسپی نہیں ہے۔ ویسے مجھے حیرت ہے ریحان کی امی میں ایسی کیا خاص بات تھی جو تم ان کے ساتھ دو گھنٹے بیٹھی رہیں۔"

"آپ کو کیسے پتا چلا کہ وہ یہاں دو گھنٹے رکی تھیں۔"

میں گڑبڑائی مگر اتفاق سے ساحر واش روم میں تھا اس لیے میں نے اس کا نام لے دیا۔ "ساحر بتا رہا تھا۔"

"وہ غلط کہہ رہا ہے اسے پتا نہیں چلا ہو گا ورنہ وہ تو پون گھنٹے بعد اٹھ گئی تھیں۔"

"کیا وہ اکیلی آئی تھیں؟"

"پتا نہیں لیکن جب میں نے دروازہ کھولا تو وہ اکیلی

نفل

نفل کی جمع نوافل ہے اور یہ عربی اصطلاح ہے، شرع میں وہ نیک کام جو بندہ اپنی مرضی ومنشا سے کرے۔ یہ فرض نہیں ہوتا۔ نہ کرنا گناہ نہیں مگر کرنے سے ثواب ضرور ملتا ہے۔ اگر کوئی شخص رمضان کے علاوہ روزہ رکھ لے، کسی وقت نماز زائد پڑھ لے تو یہ نفل کے روزے یا نماز کہلائیں گے۔ قرآن مجید میں نافلہ کا لفظ دو مقام پر آیا ہے۔ حدیث شریف میں بھی یہ لفظ متعدد مقام پر آتے ہیں مستحب اور مندوب بھی انہیں معنوں میں آتے ہیں۔

نفی واثبات

نفی واثبات اصطلاحات صوفیا ہے، صوفیا کرام نفی سے مراد "خود" کی نفی اور اثبات سے مراد صفات باری تعالیٰ کا "ثبوت"۔ کل میں اس کے معنی یوں بنے کہ صفات بشریت کی نفی کرتے ہوئے حقیقت مطلق کا اثبات کرنا۔ نفی ذات بشریت کی بقا کی حالت میں ممکن نہیں۔ پس لازم ہے کہ ابتداً دعویٰ کی نفی کی جائے جو نفس کی سرکشیوں میں سے ایک ہے۔ محبت میں کمزوری بھی اپنے اختیار کی نفی کرتا ہے۔ اس لیے حق اللہ تعالیٰ کا اختیار ازلی ہے جس کی نفی ممکن نہیں۔ اس کی کسی صفت کو فنا نہیں۔ اسلام کے بنیادی ارکان میں نفی واثبات کو مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ صوفیا کرام میں کلمہ شریف کا ابتدائی حصہ جو اللہ کی توحید سے متعلق ہے۔ "نفی واثبات" کا مظہر ہے۔ اس کے علاوہ یہ قرآن مجید میں کئی مقام پر آیا ہے کہ "نہیں کچھ ماسوا اللہ کے" یہ بھی نفی واثبات کے سلسلے میں آیا ہے۔ یہ فلسفہ وحدت الوجود کے قریب تر ہو جاتا ہے، مشرق میں اس کے بہت بڑے قائل اور رومی اقبال تھے۔ مغرب میں افلاطون اور برگساں، برگساں اپنے غیر اسلامی نظریات کے باعث "وحدت" کے طور پر "خدا" کا مبہم طور پر اظہار کرتا تھا۔ اقبال نے نعرہ انا الحق، کو اس کی ایک اعلیٰ مثال قرار دیا ہے۔ ایک حدیث شریف اس کی تشریح یوں کرتی ہے۔ "اللہ ایک مخفی خزانہ تھا۔ جب اس نے چاہا کہ دنیا اس سے آگاہ ہو تو اس نے انسان پیدا کر دیا۔"

مرسلہ: اکرم الدین شیخ، چنوٹ

تھیں۔'' فاریا نے پھر جھوٹ بولا۔

ریحان خود اپنی امی کو چھوڑنے اور لینے آیا تھا اسے وقت کا اچھی طرح پتا تھا۔ اگر فاریا ڈیڑھ گھنٹا بھی کہتی تو مانا جا سکتا تھا کہ وقت کا اندازہ نہیں ہوا لیکن پون گھنٹے اور دو گھنٹے میں بہت فرق ہوتا ہے۔

''وہ گئی بھی اکیلی تھیں؟''

''ہاں وہ اکیلی ہی گئی تھیں۔'' فاریا نے تیسرا جھوٹ بولا۔

''کیا تمہیں یقین ہے؟''

''ہاں بھئی میں نے خود ان کو جاتے دیکھا تھا۔'' فاریا نے کہا تو میں گہری سانس لے کر رہ گئی۔

''آپ اتنے سوالات کیوں کر رہی ہیں؟''

''کیونکہ وہ مجھ سے ملنے آئی تھیں۔ اس لیے پوچھ رہی ہوں۔''

''انہوں نے آپ کی کوئی بات نہیں کی۔''

میری سمجھ میں فاریا کا رویہ نہیں آ رہا تھا۔ وہ کیوں جھوٹ بول رہی تھی اور اس طرح تسلسل جھوٹ بغیر کسی وجہ کے نہیں بولے جاتے ہیں۔ کیا فاریا نہیں چاہتی تھی کہ میری شادی ہو؟ مگر کیوں جب کہ اس نے اپنی شادی کی بات پر خود مجھ سے کہا تھا کہ میں اپنی شادی کا سوچوں اس کا ابھی شادی کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔ پھر وہ ایسا کیوں کر رہی تھی؟ اس کے قول و فعل میں یہ تضاد کیوں تھا؟ فاریا کرسی سے اٹھی تو میں چونکی۔ مجھے آفس سے دیر ہو رہی تھی۔ میں تیار ہونے چلی گئی۔ پھر ذہن سے یہ بات نکل گئی۔ سارا دن دفتر میں مصروف رہی۔ مگر شام کو گھر آئی اور کاموں سے فارغ ہوئی تو سوچوں نے پھر یلغار کی تھی۔ مجھے خیال آنے لگا کہ فاریا نے ایسا کیوں کیا تھا؟ بہت سوچنے کے بعد میرے ذہن میں ایک خیال آیا کہ فاریا نہیں چاہتی کہ میری شادی ہو۔ کیونکہ اس گھر کی تقریباً ساری ذمے داری میں نے اٹھا رکھی تھی۔ کمانے سے لے کر گھر کے بیشتر کام میرے ذمے تھے۔ فاریا صبح سے رات تک یا تو یونیورسٹی میں ہوتی تھی یا پھر اپنے کمرے میں اپنی سرگرمیوں میں لگی ہوتی تھی۔ گھر کے چند لگے بندھے کام کرتی تھی اور اس سے ہٹ کر وہ کچھ نہیں کرتی تھی۔ صفائی اور کپڑے دھونے کے لیے ماسی آتی تھی اور بقیہ کام میں چھٹی والے دن کر لیتی تھی۔

اگر میری شادی ہو جاتی تو بہت سے کام اسے کرنے پڑتے۔ اگرچہ اس کی تعلیم کا مسئلہ نہیں تھا۔ کرائے اور فلسڈ کی ہوئی رقم سے اتنی آمدنی ہو جاتی تھی کہ یہ بھی گزارے کے لیے کافی ہوتی اگر میری تنخواہ نہ آتی تو خاص فرق نہیں پڑتا۔ میں نے اچھی خاصی بچت کی تھی اگر شادی کا موقع آتا تو اس سے کام چل جاتا۔ میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اگر وہ ایسا سوچ کر یہ سب کر رہی تھی تو کیا اسے مجھ پر اعتبار نہیں تھا کہ میں اپنے بہن بھائی کو ایسے نہیں چھوڑ سکتی تھی یا وہ خود غرض ہو رہی تھی اور اپنی آسانیاں اور تفریحات قربان کرنے کو تیار نہیں تھی۔ میرے بعد اسے کم سے کم گھر کی ذمے داریاں اٹھانی پڑتیں۔ سوچ سوچ کر میرے سر میں درد ہونے لگا تھا۔ پھر مجھے رونا آ گیا اور میں روتے روتے سو گئی۔ عام طور سے میں سونے سے پہلے کچھ نہ کچھ پڑھتی ہوں کہ اس سے سارے دن کا تھکا ہوا ذہن تازہ دم ہو جاتا ہے اور نیند اچھی آتی ہے۔ مگر اس رات میں نے کچھ پڑھا بھی نہیں۔

اگلے دن میرا موڈ خراب تھا اور میں نے محسوس کیا کہ فاریا بھی چپ چپ تھی۔ یہ پہلا موقع تھا جب ہم دونوں بہنوں میں دوری آئی تھی۔ بے تکلفی تو کبھی نہیں تھی لیکن دوری بھی نہیں آئی۔ ساحر حسب معمول چہک رہا تھا۔ وہ ہم دونوں کے ساتھ خوش رہتا تھا۔ رات دیر تک رونے اور کم سونے کی وجہ سے سر میں درد ہو رہا تھا اور چہرہ بھی ستا ہوا تھا پھر میں آج اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنا چاہتی تھی اس لیے میں نے کال کر کے دفتر سے چھٹی لے لی۔ فاریا یونیورسٹی چلی گئی۔ ساحر اوپر والے بچوں کے ساتھ گلی میں فٹ بال کھیلنے لگا۔ ان کے اسکول میں سردیوں کی چھٹی تھی۔ ماسی آئی تو میں نے اس سے صفائی کرائی۔ آج کپڑے دھونے کے لیے نہیں تھے۔ اس کے جانے کے بعد میں نے ساحر کی فرمائش پر بریانی کی تیاری شروع کی وہ بریانی شوق سے کھاتا تھا۔

کاموں کے دوران میرے ذہن میں شروع سے اب تک کا عرصہ فلم کی طرح چل رہا تھا۔ امی ابو کے بعد میں نے کس طرح اس گھر کو سنبھالا تھا۔ میں اکیلی لڑکی تو تھی اور اکیلی لڑکی کے لیے کچھ کرنا آسان نہیں ہے۔ میں نے بھی بہت مشکل وقت دیکھا تھا۔ شروع میں مجھے بہت مشکل پیش آئی تھی۔ پھر گھر سے نکلنا اور جاب کرنا۔ جب کہ کوئی میری پشت پر بھی نہیں تھا۔ بہت مشکل کام تھا۔ پہلی ملازمت میں کئی تلخ تجربات ہوئے۔ جب وہاں مجھے صرف لڑکی سمجھ کر ٹریٹ کرنے کی کوشش کی گئی۔ وہ مشکل وقت بھی میں

نے ثابت قدمی سے گزارا پھر اللہ نے کرم کیا اور مجھے یہاں ملازمت مل گئی۔ ٹینشن ختم ہو گئی تھی مگر ذمے داریاں ختم نہیں ہوئی تھیں۔ امی ابو کے انتقال کے وقت فاریا چودہ سال کی تھی مگر چند سال میں وہ لڑکی بن چکی تھی اور اسے وہ سارے کام کرنے چاہیے تھے جو لڑکیاں کرتی ہیں۔ مگر وہ نہیں کرتی تھی۔ میں نے بھی کبھی نہیں کہا۔ ساحر کو سمجھ نہیں تھی لیکن فاریا کے پاس تو سمجھ تھی۔ اسے احساس ہونا چاہیے تھا کہ میں زیادہ ذمے داریاں اٹھا رہی ہوں اور اسے میرا ہاتھ بٹانا چاہیے مگر اس نے کبھی یہ کوشش نہیں کی۔ اسے کبھی فکر نہیں ہوئی کہ میں سب کیسے کر رہی ہوں۔ بہت بار ایسا ہوا کہ میری طبیعت خراب ہوئی تب بھی میں لگی رہی اور اس نے تب بھی میری مدد نہیں کی۔

فاریا کے اس رویے کی اس کے سوا اور کوئی وجہ نہیں تھی کہ ریحان کی امی نے اس سے میرے لیے بات کی تھی اور اس نے ایسی کوئی بات کی جس سے وہ چپ ہو گئی تھیں۔ دوسری طرف وہ مجھے جھوٹ بول کر حقیقت چھپا رہی تھی۔ مجھے اب غصہ آنے لگا تھا۔ پہلے میں نے سوچا کہ اس سے بات کروں گی۔ مگر یونیورسٹی سے اس کا میسج آ گیا کہ وہ آج اپنی ایک فرینڈ کے گھر جائے گی اور وہاں سے شام تک آئے گی۔ شام تک میرا دماغ کسی قدر ٹھنڈا پڑ گیا تھا اور میں نے فیصلہ کیا کہ فاریا سے کوئی بات نہیں کروں گی۔ میری زندگی پر میرا حق بھی تھا اور میں اپنا حق لینا چاہتی تھی اس لیے میں نے ریحان سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ یہ فیصلہ کر کے میں ہلکی ہو گئی تھی۔ ساحر کے بارے میں میں نے سوچ لیا تھا کہ وہ اس شادی کے لیے میری واحد شرط ہو گی میں اسے اکیلا نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ فاریا شام کو آئی تو بہت خوش اور کسی قدر پُرجوش ہو رہی تھی۔ اس نے مجھے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ کس دوست کے گھر گئی ہے اور نہ میں نے پوچھا۔

رات کے کھانے کے بعد میں جلدی کمرے میں آ گئی۔ مجھے ریحان کی کال کا انتظار تھا۔ مگر اس کی کال دس بجے کے بعد آئی تھی۔ اس نے سب سے پہلے پوچھا۔ ''تم آج دفتر کیوں نہیں گئیں؟''

مجھے اس کا یوں مخاطب کرنا اچھا لگا تھا ورنہ وہ اب تک آپ جناب سے بات کرتا تھا۔ ''طبیعت ٹھیک نہیں تھی، آپ کو کیسے پتا چلا؟''

''میں وہاں گیا تھا..... وہاں سے آیا تو پتا چلا کہ تمہاری بہن ہمارے ہاں آئی تھی۔''

''فاریا.....؟'' میں حیران ہوئی۔ ''اس نے تو مجھے نہیں بتایا۔''

''ممکن ہے وہ تمہیں سرپرائز دے رہی ہو۔'' ریحان نے کہا۔ ''ماریا تم نے سوچ لیا.....؟''

''ہاں ریحان میں نے سوچ لیا ہے۔'' میں نے شرما کر کہا۔

''کیا..... فیصلہ کیا ہے؟''

''وہی جو آپ چاہتے ہیں۔'' اس بار مجھے زیادہ شرم آئی تھی۔

''سچ!'' ریحان کی آواز خوشی سے بھر گئی تھی۔ ''مجھے بھی یقین تھا کہ تم یہی فیصلہ کرو گی۔''

''اچھا آپ کو کیوں یقین تھا؟''

''بس تھا۔'' اس نے شوخی سے کہا۔ ''خدا نے عقل دی ہے، اس سے سمجھ لیا تھا۔''

''ریحان آپ کی اپنی امی سے بات ہو گئی۔''

''اب کروں گا ویسے تو ایک بار کی تھی مگر اب میں زیادہ مضبوط ہو کر بات کر سکوں گا کیونکہ میرے ساتھ تمہاری رضامندی بھی شامل ہو گئی ہے۔''

''پلیز انہیں میرے بارے میں مت بتایئے گا، مجھے شرم آئے گی، بس اپنی پسند بتایئے گا۔'' میں نے گھبرا کر کہا تو ریحان کچھ دیر مجھے چھیڑتا رہا پھر مان گیا کہ وہ اپنی ماں کو میری رضامندی کا نہیں بتائے گا۔ کاش میں نے ریحان سے یہ بات نہ منوائی ہوتی۔ اسے اپنی ماں سے بات کرنے دیتی مگر قسمت میں یہی لکھا تھا۔ چند دن بعد ریحان نے بتایا کہ اس کی امی اور بہن ہمارے گھر آئیں گی۔ میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔

''ریحان ہمارا تو کوئی بڑا بھی نہیں ہے، ان سے بات کون کرے گا؟''

''تم فکر مت کرو امی کو سب معلوم ہے تم بغیر کسی جھجک یا گھبراہٹ کے ملنا..... یوں سمجھ لو کہ مجبوری ہے.. تمہیں اپنے لیے خود بات کرنی ہو گی۔''

''مجھے بہت عجیب لگے گا۔''

''اس دنیا میں ہر انسان کو کبھی نہ کبھی ایسا کام کرنا پڑتا ہے جو رواج سے ہٹ کر ہو لیکن مجبوری کراتی ہے۔'' ریحان نے مجھے تسلی دی۔

اتوار میں تین دن باقی تھے۔ میں سوچ رہی تھی کہ فاریا سے کیسے بات کروں کیونکہ وہ نہیں چاہتی کہ میری

شادی ہو۔ اب اسے پتا چلے گا تو نہ جانے اس کا کیا ردِعمل ہو۔ مجھے خوف یہ تھا کہ اتوار کے دن کوئی ہنگامہ نہ کردے اور ماحول خراب ہوجائے۔ مگر اسے بتانا تو تھا۔ اگلے دن میں دفتر سے آئی تو ڈنر کے دوران میں نے اسے بتایا کہ ریحان کی امی اور بہن اتوار والے دن آئیں گی۔ خلافِ توقع وہ خوش ہوگئی۔ ''سچ سچ؟''

''ہاں سچ میں آرہی ہیں۔'' مجھے اس کی خوشی پر تعجب ہوا تھا مگر خوشی بھی ہوئی کہ اس نے الٹا ردِعمل نہیں دیا۔ اس نے کہا۔

''میں ٹھیک سے تیار ہوں گی۔'' اس نے کہا۔

''بالکل تم میری بہن ہو اور تمہیں اچھا سا تیار ہونا چاہیے۔''

''میں اس لیے تیار تھوڑی ہوں گی کہ آپ کی بہن ہوں۔'' اس نے عجیب سے لہجے میں کہا۔ ''میں تو بہت اچھی نظر آنا چاہتی ہوں۔''

ریحان نے بتایا تھا کہ اس کی امی اور مدیحہ شام کے وقت آئیں گی۔ میں نے سوچا کہ کچھ چیزیں گھر میں بنالوں اور کچھ باہر سے منگوالوں گی۔ ہفتے والے دن میں نے ہاف ڈے کیا اور گھر آکر ڈرائنگ روم کی ٹھیک سے صفائی کی۔ ماسی بس کام چلاؤ صفائی کرتی تھی۔ اتوار کا دن میں اپنے لیے رکھنا چاہتی تھی۔ مجھے بھی تیار ہونا تھا اگر صفائی میں لگ جاتی تو تیار کس وقت ہوتی۔ فاریا نے اس موقع پر بھی مجھ سے کچھ نہیں پوچھا کہ کیا کرنا ہے اور کچھ کام اسے بھی کرنا چاہیے۔ اس کے بجائے وہ اپنی تیاری میں لگی رہی ایسا لگ رہا تھا ریحان کی امی اور بہن مجھے نہیں اسے دیکھنے آرہی ہیں۔ اس نے اپنا ایک اچھا سا جوڑا نکالا تھا اور رات میں اپنا چہرہ صاف کرنے میں لگی تھی۔ اس نے کلینزنگ کے ساتھ ماسک بھی استعمال کیا تھا۔ وہ اکثر یہ ٹوٹکے آزماتی رہتی تھی اور مجھے ان کی عادت نہیں تھی مگر اس رات میں نے بھی چہرہ صاف کیا۔ اگلی صبح میں جاگی تو مجھے لگا یہ میری زندگی کا سب سے خوب صورت دن ہے۔ آج کے بعد میری زندگی بدل جائے گی میں کسی کی ہوجاؤں گی اور کوئی میرا ہوجائے گا۔

☆☆☆

جس دن کو میں اپنے لیے خوش قسمت ترین سمجھ رہی تھی وہ میرے لیے بدقسمت ترین بن کر آیا تھا۔ شام تک میں بہت خوش تھی، جیسے ہواؤں میں اُڑ رہی تھی۔ ریحان کی امی اور مدیحہ چار بجے آئے تھے تب تک میں تمام چیزیں تیار کرکے خود بھی تیار ہوگئی تھی۔ ان لوگوں سے ملتے ہوئے شرم آئی تھی مگر کیا کرتی، میں خود ہی بڑی تھی۔ کولڈ ڈرنک سے آغاز ہوا۔ فاریا مجھ سے بھی پہلے کی تیار تھی اور آج غیر معمولی چمک رہی تھی۔ صورت شکل کے لحاظ سے وہ مجھ سے زیادہ پیاری تھی اور پھر نوعمری کی اپنی دلکشی ہوتی ہے۔ مگر اس دن بھی اس نے کچھ نہیں کیا اور کولڈ ڈرنک سے لے کر ایک ایک چیز مجھے لانی اور سرو کرنی پڑی تھی۔ اس لیے مجھے بیٹھنے کا موقع بھی کم ملا تھا۔ زیادہ تر فاریا بیٹھ کر بات کرتی رہی۔ ریفریشمنٹ کے بعد گفتگو کا مرحلہ آیا تو ریحان کی امی نے کہا۔ ''ماریا ہمیں تمہارا گھر اور اس کا ماحول بہت پسند آیا ہے، اسی لیے ہم چاہتے ہیں کہ یہاں سے ریحان کے لیے دلہن لے کر جائیں۔''

میرا چہرہ تپ گیا تھا اور میں نے بہ مشکل کہا۔ ''جی آنٹی؟''

''ریحان بڑا ہے اور اس نے بڑے پن سے اپنا گھر اور بہن بھائیوں کو سنبھالا ہے، میرا بچہ ماشاءاللہ بہت ذمّے دار اور سلجھا ہوا ہے۔ اس نے ہمیں بہت دیا ہے اور میں چاہتی ہوں کہ اس کی شادی کردوں۔''

''جی آنٹی۔'' میں پھر اتنا ہی کہہ سکی تھی۔

''تم نے ریحان کو دیکھا ہے ماشاءاللہ شکل صورت کا اچھا ہے۔ ایم بی اے بھی مکمل کرلے گا۔ اس کے لیے مجھے تمہاری بہن فاریا پسند آئی ہے۔''

ایک دھماکا ہوا جس نے میرے وجود کو ریزہ ریزہ کردیا تھا۔ یہ ایسا تھا کہ میں جسے پھول سمجھ کر اٹھاؤں وہ بم ہو جو ہاتھ میں آتے ہی پھٹ جائے۔ میرا چہرہ بجھ گیا تھا اور اس کے برخلاف فاریا کا چہرہ مزید چمک اٹھا تھا جیسے اسے پہلے سے علم ہو کہ ریحان کی امی کیا بات کرنے والی تھیں۔ میں چند لمحے سوچتی رہی کہ انہوں نے یہی کہا ہے یا مجھے کچھ غلط سنائی دیا ہے۔ مدیحہ اٹھ کر فاریا کے پاس بیٹھ گئی تھی۔ وہ شرما رہی تھی۔ کچھ دیر بعد ریحان کی امی نے کہا۔ ''ماریا بیٹے تم نے جواب نہیں دیا۔''

میں چونکی اور شاید میکانکی انداز میں مسکرائی تھی۔ ''جی جی.... آنٹی.... یہ تو ہماری عزت افزائی ہے۔''

''تو تمہیں اس رشتے پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔''

''اعتراض تو نہیں ہے۔'' میں جیسے خود بہ خود بول رہی تھی۔ ''لیکن آپ جانتی ہیں، ایسے معاملات میں سوچ بچار کرنی پڑتی ہے، ہمارا کوئی بڑا نہیں ہے، رشتے دار بھی

دور پرے کے ہیں جنہیں ہم سے کوئی دل چسپی نہیں ہے۔ سمجھ لیں میں ہی بڑی ہوں۔ پھر بھی میں آپ کو فوری جواب نہیں دے سکتی۔''

''کوئی بات نہیں بیٹا، تم سوچ لو، فاریا تمہاری بہن ہے اور تمہاری ذمّے داری ہے۔ اس کے بارے میں تم نے ہی فیصلہ کرنا ہے۔''

''فاریا میری ذمّے داری ہے لیکن میں کسی کی ذمّے داری نہیں ہوں۔'' میں نے تلخی سے سوچا۔

ریحان کی امی اور مدیحہ کچھ دیر اور بیٹھی تھیں اور پھر چلی گئیں۔ ان کے جاتے ہی فاریا اپنے کمرے میں چلی گئی اور میں اپنے کمرے میں آگئی۔ میرا سر گھوم رہا تھا اور ایسا لگ رہا تھا جیسے ابھی پھٹ جائے گا۔ یہ سب کیا ہوا تھا؟ میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا تھا۔ ریحان نے میرے ساتھ مذاق کیا تھا یا اس کے گھر والوں نے اس کے ساتھ دھوکا کیا تھا۔ میں نے اسی وقت ریحان کا نمبر ملایا۔ اس نے چھوٹتے ہی پوچھا۔

''ماریا امی اور مدیحہ چلے گئے۔''

''ہاں۔'' میں نے سرد لہجے میں کہا۔ ''وہ کچھ دیر پہلے نکلے ہیں، مبارک ہو وہ میرا نہیں فاریا کا رشتہ لے کر آئے تھے۔''

''کیا.... کیا کہا تم نے....؟'' وہ بے یقینی سے بولا۔ ''ماریا تم مذاق کررہی ہو۔''

''مذاق شاید آپ نے کیا تھا۔ اگر کوئی شک ہے تو اپنی امی اور بہن سے پوچھ لیجیے گا وہ گھر پہنچ گئی ہوں گی۔'' میں نے کہا اور کال کاٹ دی اور پھر موبائل بھی بند کردیا۔ میں رونا نہیں چاہتی تھی مگر آنسو جیسے خود نکل رہے تھے۔ کچھ دیر بعد ساحر نے دروازے پر دستک دی۔

''آپی ریحان بھائی کا فون ہے وہ بات کرنا چاہ رہے ہیں۔''

''ان سے کہہ دو میں بات نہیں کرنا چاہتی۔'' میں نے جواب دیا۔ ''پلیز اب مجھے تنگ مت کرنا۔''

ریحان کے پاس ساحر کا نمبر تھا اس نے اسے کال کی تھی کیونکہ میرا نمبر اسے بند ملا ہوگا۔ اس کے بعد ساحر نے مجھے پھر آواز نہیں دی۔ اگلے دن میں دفتر جانے کے لیے تیار ہوکر نکلی، میں نے رات کا کھانا نہیں کھایا تھا مگر میرا دل بالکل کچھ کھانے کو نہیں چاہ رہا تھا۔ فاریا بالکل نارمل انداز میں ناشتا لگا رہی تھی۔ ''آپی ناشتا نہیں کریں گی؟''

''مجھے بھوک نہیں ہے۔'' میں نے اس کی طرف

> نعمت اللہ بت شکن بنگال کے قدیم ترین صوفیوں میں شمار ہوتے ہیں۔ نام شاہ نعمت اللہ بت شکن کے لقب سے مشہور ہوئے۔ اس لقب کے پس منظر میں ایک کہانی ہے، کہا جاتا ہے کہ بوڑھی گنگا کے کنارے کھل گاؤں تک ایک بڑی بستی تھی، بیر پانڈوندی کے کنارے تھی۔ جب منہ اندھیرے وہاں کے ہندو اپنے بتوں کو بوڑھی گنگا میں دھونے کے لیے لے جاتے تو ان کو ان کی قیام گاہ سے گزرنا پڑتا تھا۔ آپ کے اشارے سے وہ بت ٹکڑے ٹکڑے ہوجاتا۔ اسی وجہ سے آپ بت شکن مشہور ہوئے، آپ کے بارے میں تاریخ مزید کچھ بتانے سے قاصر ہے صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا مزار مبارک ڈھاکا میں ''باغِ دلکشا'' کے متصل احاطے میں دکنی صاحب کی مسجد کے جانب شمال میں ایک بلند چبوترے پر واقع ہے۔ آپ کے دائیں بائیں آپ کے دو خلفاء کے مزارات ہیں۔
>
> مرسلہ: سلطان شیخ، چنیوٹ

دیکھے بغیر کہا۔ ''مجھے دیر ہورہی ہے۔''

دفتر پہنچ کر میں نے موبائل آن کیا تو فوراً ہی ریحان کے ایس ایم ایس کی بھرمار ہوگئی۔ تقریباً ہر ایک میں اس نے مجھ سے التجا کی تھی کہ میں اس سے بات کروں۔ آخری دو میسج میں اس نے وضاحت کی تھی کہ اس کی امی نے اپنی مرضی سے فاریا کا رشتہ دیا ہے اور اس کی مرضی بالکل شامل نہیں ہے۔ وہ ان سے بات کررہا ہے۔ میں نے ایک میسج میں جواب دیا۔ ''اس سلسلے میں جو بھی بات ہوگی وہ آپ کی امی کے توسط سے اور ان کی رضامندی سے ہوگی اور پلیز مجھے دفتر میں کال کرنے یا یہاں آنے کی کوشش مت کیجیے گا۔''

یہ میسج کرکے میں نے موبائل پھر آف کردیا۔ مجھے خدشہ تھا کہ وہ کال کرے گا۔ کچھ دیر بعد میرے آفس فون پر فاریا کی کال آئی۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ''آپی سیل آن کریں میں آپ سے کچھ کہنا چاہتی ہوں۔''

''کیا کہنا چاہتی ہو؟'' میں نے سرد لہجے میں پوچھا۔

''اس پر نہیں درمیان میں آپریٹر ہوتا ہے۔''

''اوکے ایک منٹ بعد کال کرو مجھے۔'' میں نے کہا اور فون رکھ کر اپنا موبائل آن کیا۔ ایک منٹ بعد فاریا کی کال آگئی۔

''آپی میں آپ سے کہنا چاہتی ہوں کہ پلیز اس

رشتے سے انکار مت کیجیے گا۔"

"تمہارا تو شادی کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔" میں نے پُر سکون لہجے میں کہا حالانکہ اندر سے میں اتنی پُرسکون نہیں تھی۔

"آپی اب ہوگیا ہے۔" اس نے کسی قدر بے چینی سے کہا۔ میں اپنے کمرے میں اکیلی ہوتی تھی اور یہاں سننے والا کوئی نہیں تھا۔ اس لیے میں کھل کر بات کر رہی تھی۔

"اب کیسے ہوگیا ہے؟"

"آپی مجھے ریحان اچھا لگا ہے۔ پلیز آپی آپ انکار مت کیجیے گا۔ میں شادی کروں گی تو صرف ریحان سے کروں گی، پلیز آپی۔" اس کا لہجہ ملتجی ہوگیا۔

"فاریا تم جانتی ہو وہ میرے لیے رشتہ لائی تھیں؟"

"ہاں آپی پر انہوں نے مجھے پسند کیا ہے، پھر ریحان بھی مجھے پسند ہے۔"

میں جاننے کے باوجود اس سے نہ کہہ سکی کہ ریحان اصل میں مجھے پسند کرتا ہے۔ "اگر وہ میرے لیے آئی تھیں تو تمہیں کیسے پسند کرلیا۔"

"آپی ان کا کہنا ہے کہ آپ ریحان کی ہم عمر ہیں، میں آپ سے سات سال چھوٹی ہوں۔ اس لیے انہوں نے مجھے پسند کرلیا۔ آپی آپ بھی چاہتی تھیں کہ میری شادی ہو جائے تو سمجھ لیں آپ کی خواہش بھی پوری ہو جائے گی۔"

"میری خواہش۔" میں نے تلخی سے کہا۔ "خیر میں سوچوں گی۔"

شام تک میں سوچتی رہی۔ اس دن ٹھیک سے کام بھی نہیں ہوا۔ گھر آتے ہوئے میں نے ایک بار پھر ریحان سے بات کرنے کا فیصلہ کیا۔ میں نے اسے رات کو کال کی۔ اس نے بیتابی سے کال ریسیو کی، ایک بیل بھی نہیں گئی تھی۔ "ماریا شکر ہے تم نے موبائل آن کرلیا، میں نے امی سے کہا ہے....."

"ان کا کہنا ہے میں آپ کی ہم عمر ہوں۔"

"میں جانتا ہوں اور مجھے اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا ہے۔" ریحان بولا۔

"آپ کی امی نے اسی دن فاریا کو پسند کرلیا تھا جس دن وہ ہمارے ہاں آئی تھیں۔ یہ بتائیں کہ جب وہ رشتہ لے کر آرہی تھیں تو کیا آپ نے میرے لیے بات کرنے کو کہا تھا؟"

"بالکل۔" ریحان بولا۔ "میں تو حیران ہوا تھا۔"

"لیکن میں حیران نہیں ہوئی ہوں، پہلے میں فاریا کو قصوروار سمجھ رہی تھی اور وہ اس حد تک قصوروار ہے کہ اس نے تمہیں پسند کیا ہے لیکن اصل قصور آپ کی امی کا ہے۔ میں غیر ہوں لیکن آپ تو ان کی اولاد ہیں آپ کے ساتھ ایسا دھوکا کیوں کیا؟"

"میں نے بھی امی سے پوچھا ہے اور ان کو صاف بتا دیا ہے کہ میں صرف تم سے شادی کرسکتا ہوں۔"

"تو کیا وہ مان گئی ہیں؟"

ریحان چند لمحے کے لیے خاموش ہوا پھر اس نے کہا۔ "میں انہیں منا رہا ہوں۔"

"ریحان انہوں نے جو کیا ہے میرا نہیں خیال کہ وہ اس کے بعد مانیں گی۔" میں نے کہا۔ "آپ ان سے بات کرلیں، مجھے یہ بتائیں کہ کب تک بات کرلیں گے۔"

"اسی ہفتے۔" اس نے کہا۔

"ٹھیک ہے اگر اس ہفتے تک وہ میرے لیے مان جاتی ہیں تو ٹھیک ہے ورنہ میں انہیں فاریا کے لیے اپنی رضامندی سے آگاہ کردوں گی۔" میں نے کہا اور کال بند کردی۔ ریحان نے جوابی کال کی لیکن میں نے کاٹ کر موبائل بند کردیا تھا۔ امی ابو کی وفات کے بعد زندگی میں پہلی بار مجھے کسی جذباتی صدمے سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ میں نے سوچا نہیں تھا کہ میری بہن ہی میری خوشیوں کے آڑے آئے گی لیکن اصل قصور تو ریحان کی امی کا تھا۔ اگر انہیں میں پسند نہیں تھی تو وہ آئیں کیوں اور اگر آئی تھیں تو فاریا کو پسند کرکے انہوں نے ایک ایسا تنازع کھڑا کردیا تھا جس نے میرے لیے کوئی فیصلہ کرنا نہایت دشوار کردیا تھا۔ اسی لیے میں نے ریحان سے کہا تھا کہ وہ اپنی ماں کو منا لے اس صورت میں میں فاریا سے بات کرسکتی تھی۔ اگرچہ یہ صورت بھی کوئی آئیڈیل نہیں تھی کیونکہ فاریا ریحان کو پسند کرنے کا اقرار کرچکی تھی اور اس کے لیے یہ بہت مشکل ہوتا کہ وہ اسے بدلے اور ہوئے رشتے کی صورت میں پسند کرے۔ مگر اس کا منہ بند ہوسکتا تھا کیونکہ مجھے ریحان نے پسند کیا تھا اور اسی نے اپنی ماں کو رضامند کرنا تھا۔ دوسری صورت میں میں ریحان کی امی کو ہاں کردیتی اور پھر یہ رشتہ ان کی ذمے داری بن جاتا۔ اگر ان کی طرف سے انکار ہوتا تو مجھ پر اس کی ذمے داری نہیں آسکتی تھی۔ مگر اس طرح میں ریحان سے محروم ہو جاتی۔ عجیب چویشن ہوگئی تھی۔ میں نے اپنا سر تھام لیا۔ دروازے پر دستک ہوئی تو میں چونکی۔

"آجاؤ۔"

دروازہ کھلا اور فاریا اندر آئی۔ جب سے میں دفتر سے آئی تھی ہم دونوں ایک دوسرے سے نظریں چرا رہے تھے۔ مشکل سے چند جملے بولے تھے۔ ساحر محسوس کرنے والا لڑکا نہیں تھا ورنہ وہ محسوس کرلیتا کہ ہمارے درمیان کوئی کشیدگی ہے۔ میں نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا تو وہ ہچکچا کر بولی۔ "آپی میں پوچھنے آئی ہوں۔"

"کیا؟"

"یہی کہ آپ نے کیا سوچا؟"

"ابھی میں سوچ رہی ہوں۔"

"آپی ریحان کے گھر والوں نے رشتہ مانگا ہے اور میں راضی ہوں اب اس میں سوچنے کو کیا رہ جاتا ہے؟" اس نے کسی قدر تیز لہجے میں کہا۔

"یہ سب کافی نہیں ہے آدمی کو بہت سی باتیں سوچنی اور دیکھنی پڑتی ہیں۔" میں نے آہستہ سے کہا۔ "تم ان معاملات میں ناتجربے کار....."

"معاف کیجیے گا آپی تجربہ آپ کو بھی نہیں ہے۔" اس نے بات کاٹ کر کہا۔ "میرا تو خیال ہے بات کچھ اور ہے۔ آپ نہیں چاہتیں کہ میری شادی یہاں ہو کیونکہ وہ اصل میں آپ کے لیے آئی تھیں۔"

میں نے بہ مشکل خود پر قابو پایا ورنہ میں اس کے منہ پر تھپڑ مار دیتی۔ میں نے کہا۔ "فاریا تم اپنے لہجے پر قابو رکھو اور فکر مت کرو..... میں چھپ کر کچھ نہیں کروں گی اور نہ ہی تمہاری مرضی کے خلاف کچھ ہوگا۔"

وہ کچھ دیر مجھے گھورتی رہی پھر اس نے اسی لہجے میں کہا۔ "اگر میری مرضی کے خلاف کچھ ہوا تو میں اسے تسلیم نہیں کروں گی۔" وہ کہتے ہی بل کھا کر کمرے سے چلی گئی۔

میں نے ایک بار پھر سر تھام لیا تھا۔ ایسا لگ رہا تھا کہ یہ معاملہ میرے لیے بہت بڑا دردِ سر بننے والا تھا۔ ابھی سے میں اندر سے ہل کر رہ گئی تھی۔ آگے پتا نہیں کیا ہوتا۔ اتوار تک کا وقت میں نے جس طرح گزارا وہ میں ہی جانتی ہوں۔ میری کیفیت عجیب سی تھی۔ میری خواہش تھی کہ ریحان اپنی امی کو منا لے اور میں دعا کر رہی تھی کہ اس کی امی نہ مانیں۔ اس کے باوجود ہفتے کی رات میری آنکھوں سے نیند بہت دیر تک غائب رہی۔ جب صبح آنکھ کھلی تو ریحان کا ایک ایس ایم ایس آیا ہوا تھا۔

"ماریا آئی ایم سوری..... تم امی کو فاریا کے لیے انکار کردو۔"

ایس ایم ایس پڑھ کر میرے ہونٹوں پر تلخ سی مسکراہٹ آئی تھی۔ ریحان کا جواب واضح تھا۔ وہ میرے لیے اپنی ماں کو نہیں منا سکا تھا اور اب میرے کندھے پر بندوق رکھ کر چلا رہا تھا۔ میں نے جوابی ایس ایم ایس کیا۔

"آئی ایم سوری تو ریحان..... میرے گھر ایک خاتون اپنے بیٹے کا رشتہ لے کر آئی تھیں اور میری بہن کی خواہش بھی یہی ہے اس لیے میں انکار نہیں کرسکتی..... یہ کام تم کرو تو زیادہ مناسب ہوگا۔"

صبح ناشتے کی میز پر میں نے ریحان کی امی کو کال کی۔ فاریا سامنے موجود تھی۔ "آنٹی میں ماریا بات کر رہی ہوں..... کیسی ہیں آپ؟"

"میں ٹھیک ہوں۔" وہ اپنے مخصوص لہجے میں بولیں۔ "تم سناؤ..... سب ٹھیک ہے؟"

"جی آنٹی اللہ کا شکر ہے۔ آنٹی میں نے غور کیا اور مجھے یہ رشتہ اپنی بہن کے لحاظ سے مناسب لگا ہے۔" ابھی میں نے اتنا کہا تھا کہ فاریا کے تاثرات بدل گئے۔ وہ لپک کر آئی اور میرے کان سے کان لگالیا۔

"شکریہ بیٹی۔" وہ خوش ہو کر بولیں۔

"ویلکم آنٹی، آپ جب چاہیں باقاعدہ رشتہ لے کر آجائیں۔"

"میں جلد آؤں گی۔" وہ بولیں تو میں نے کچھ دیر گفتگو کرکے کال ختم کی۔ فاریا نے جوش سے میرا رخسار چوما۔

"تھینک یو آپی..... تھینک یو ویری مچ۔"

میں مسکرائی۔ "تم بلاوجہ ٹینس ہو رہی تھیں۔ میں نے کہا تھا نا کہ تمہاری مرضی کے خلاف کچھ نہیں ہوگا۔"

اچانک وہ فکر مند ہوگئی۔ "لیکن آپی اگر ریحان نہ مانا؟"

"اس کا میں کہہ نہیں سکتی۔" میں نے جواب دیا۔

"آپی وہ آپ....."

"پلیز فاریا اب کچھ مت کہو..... میں جس حد تک کرسکتی ہوں میں نے کردیا ہے اور میری خواہش ہے تم اپنے گھر میں خوش رہو لیکن دوسروں کی ذمے داری میں نہیں لے سکتی۔ پلیز اب اس موضوع پر مجھ سے بات مت کرنا۔"

میں کہہ کر اپنے کمرے میں آگئی۔ ریحان کی امی نے جس طرح اس کی خواہش کو رد کیا تھا۔ مجھے خاصی حد تک یقین تھا کہ وہ فاریا کے لیے اپنی بات اس سے منوالیں گی اور ایسا ہی ہوا۔ ایک ہفتے بعد وہ باقاعدہ رشتہ لے کر

نفقہ

عربی لفظ نفقہ کا مطلب ہے کہ وہ اشیا جو زندگی کے لیے ضروری ہیں۔ قانون نفقہ۔ تین بنیادیں بتاتا ہے۔ شادی، رشتہ داری اور جائداد۔ ان تینوں کی وجہ سے مرد یا عورت پر مختلف فرائض لاگو ہوتے ہیں۔ ماں باپ پر بیٹوں کی طرف سے۔ اس طرح کی اور بہت سی اشیاء جو زندگی میں بنیادی نوعیت کی ہیں، نفقہ کہلاتی ہیں۔ اگر شوہر بوجوہ بیوی کو نفقہ فراہم نہ کرسکے، تو بیوی کا فرض ہوتا ہے کہ اپنے نفقہ کے لیے خود کوشش کرے۔ اور اگر بچے کا باپ مرجائے، تو دودھ پلانے کی اجرت ماں پر نہیں، بلکہ مرد کے وارثوں پر عائد ہوگی۔ اگر صورت یہ ہو کہ شوہر زندہ ہو، اور نفقہ نہ دے، تو جائز ہے، کہ بیوی بلا اجازت اس کے مال میں سے بقدر ضرورت اپنے لیے اور اپنی اولاد کے لیے خرچ کرے۔ اسی طرح غریب شخص کا نفقہ اس کے رشتہ داروں پر واجب ہوتا ہے۔ مگر یہاں یہ دیکھنا ضروری ہے کہ کوئی شخص غریب کیوں ہے۔ تساہل کی وجہ سے تو نہیں۔ ابوہریرہؓ راوی ہیں کہ نبی انسانیتؐ فرماتے ہیں کہ بہترین صدقہ وہ ہے جس سے دینے والا غریب نہ ہوجائے۔ دینے والا ہاتھ، لینے والے ہاتھ سے اونچا (بہتر) ہوتا ہے اور پہلے انہیں دے، جو تیری عیال داری میں ہوں۔ یعنی رشتہ دار۔ عورت شوہر سے کہتی ہے کہ مجھے نفقہ دے، یا طلاق، اور غلام کہتا ہے کہ مجھے نفقہ دے، اور کام لے۔ اور بیٹا کہتا ہے کہ مجھے نفقہ دے۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے کہ مائیں اپنے بچوں کو دودھ خود پلائیں۔ اور اگر رضاعت کی مدت پوری کرنا چاہیں، تو دو سال تک پلائیں، ورنہ دوسری عورت سے باپ اجرت دے کر پلائے۔ یونسؓ زہریؓ کے حوالے سے بیان کرتے ہیں کہ اگر کوئی ماں بچے کو کسی اور سے دودھ پلوانا چاہے، تو باپ اس کی بات تسلیم کرلے، نہ کہ اس کی بات مسترد کرکے زک پہنچائے۔ دوسروں کو نان نفقہ فراہم کرنے والوں کو روز محشر ثواب ملے گا، جس کے بارے میں حضرت ام سلمہؓ ام المومنین سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہؐ سے عرض کیا، کہ میں ابوسلمہؓ کے بچوں کو نان نفقہ دوں، جبکہ وہ محتاج ہیں، اور میری اولاد ہیں، آیا اس کا مجھے ثواب ملے گا۔ فرمایا، جو ان پر خرچ کرے گی، اس کا تجھے ثواب ملے گا، لیکن یہ حدیث صرف اس صورت میں ہے کہ انسان پر نفقہ فرض نہ ہو۔ نفقہ کی فضیلت پر قرآنی آیت کا بیان ہے: اے محمدؐ! تم سے لوگ پوچھتے ہیں کہ کیا نفقہ دیں۔ کہہ دو، جو تم آسانی سے دے سکو۔ اور حسنؓ نے کہا کہ عفو سے مراد اپنے حاجت سے زائد ہے۔ ابومسعود انصاریؓ مزید وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ آپ نے فرمایا کہ نفقہ اپنے اہل وعیال کو دے کر نیت راہ خدا کی کرے، تو اس کو صدقہ کا ثواب ملے گا۔ اسی طرح ابوہریرہؓ سے روایت ہے کہ نبی نورؐ نے فرمایا بیوہ عورت اور مسکین کے ساتھ حسن سلوک کرنے والا ایسا ہے جیسا کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والا، یا رات کو عبادت کرنے والا اور دن کو روزہ رکھنے والا۔ انہیؓ سے ایک اور روایت ہے کہ نبی پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے اولاد آدم، میں تم کو نفقہ دوں گا۔

مرسلہ: عائشہ بٹ، لاہور

آ گئیں۔ ہماری طرف سے میں بڑی تھی اور میں نے کسی کو نہیں بلایا تھا۔ میں نے رشتہ منظور کرلیا۔ فاریا کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں تھا۔ اس کی بعض باتوں سے مجھے احساس ہوا کہ وہ جانتی ہے ریحان نے مجھے پسند کیا تھا اس کے باوجود اس نے اپنی پسند ظاہر کرنے میں کوئی جھجک محسوس نہیں کی بلکہ وہ مجھ سے لڑنے کی حد تک چلی گئی تھی۔ اس کا انداز واضح دھمکی آمیز تھا کہ اگر یہ رشتہ نہیں ہوا یا میں نے انکار کیا تو بہت برا ہوگا۔ اس رات میں آخری بار روئی اور فاریا پر افسوس کیا جس نے بہن کے بجائے اپنا خیال کیا تھا۔ مجھے ریحان کی کمزوری پر بھی افسوس ہوا تھا جب وہ اپنی بات منوا نہیں سکتا تھا تو اسے مجھ سے بات کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ نہ وہ مجھ سے بات کرتا اور نہ میرے دل میں خیال میں آتا۔

ریحان کی امی کو جلدی تھی کیونکہ ان کے گھر میں بس ایک لڑکی تھی اور وہ بھی پڑھ رہی تھی اس لیے وہ بہو لے آنا چاہتی تھیں۔ میں نے انہیں فاریا کی عادات و اطوار کے بارے میں خبردار نہیں کیا تھا۔ وہ من پسند بہو لے جارہی تھیں اور اب وہ خود اس کی ذمّے دار تھیں۔ فاریا کا اگلا سمسٹر ہوتے ہی اس کی تاریخ طے کردی گئی۔ تاریخ کے ساتھ یہ بھی طے پایا تھا کہ وہ اپنا ایم بی اے مکمل کرے گی۔ میرے پاس جو جمع پونجی تھی وہ میں نے اس کی شادی پر لگا دی۔ اسے شاندار جہیز دیا جس میں ہر چیز تھی۔ وہ پندرہ تولے کا زیور لے کر گئی تھی کچھ امی چھوڑ کر گئی تھیں اور کچھ میں نے بنایا تھا جو اس کی پسند کا تھا۔ ایک بار معاملہ طے ہونے کا بعد میں نے اپنا دل نارمل کرلیا تھا اور اب میں ریحان سے فاریا کی بہن کی حیثیت سے ملتی تھی مگر وہ مجھ سے شرمسار سا رہتا تھا۔ شادی تک وہ مشکل سے دو تین بار ہمارے ہاں آیا تھا اسی طرح میں کسی وجہ سے اس کے ہاں جاتی تھی تو وہ مجھ سے سامنا کرنے سے گریز کرتا تھا۔

شادی کے بعد فاریا بہت خوش تھی اور میں اس کی خوشی میں خوش تھی۔ ماضی بھول گئی تھی۔ ریحان اس کے ساتھ آتا تھا مگر زیادہ دیر نہیں رکتا تھا۔ مجھ سے بے تکلفی سے بات نہیں کرتا تھا اگر کبھی میں سالی کی حیثیت سے ذرا بے تکلفی دکھاتی تو وہ گھبرا جاتا تھا۔ یہ بات محسوس کرکے میں نے بھی اپنا رویّہ محدود کرلیا تھا۔ شادی کے بعد کچھ دن تو فاریا یونیورسٹی نہیں گئی۔ پھر اس نے جانا شروع کردیا۔ یہی نہیں بلکہ وہ یونیورسٹی سے عام طور سے اپنے گھر جانے کے بجائے ہمارے ہاں آجاتی تھی۔ شام تک یہاں رہتی اور شام کے وقت چلی جاتی تھی۔ مجھے ساحر سے پتا چلتا تھا کیونکہ عام طور سے میری واپسی تک وہ جاچکی ہوتی تھی۔ ایک دن میں گھر آئی تو وہ موجود تھی اور حسب معمول اپنے کمرے میں (یہ اس نے اب تک اپنے نام رکھا تھا اور ساحر کو دینے سے انکار کردیا تھا) اونچی آواز میں گانے سن رہی تھی۔ میں نے اس کے کمرے میں جھانکا۔

"خیریت آج تم اپنے گھر نہیں جارہیں؟"

"نہیں۔" اس نے بے پروائی سے کہا۔ "ریحان اپنے کام سے حیدرآباد گئے ہیں وہ کل آئیں گے تب تک میں یہیں رہوں گی۔"

میں کمرے میں آگئی۔ "فاریا یہ تمہارا گھر بھی ہے لیکن تمہارا اصل گھر وہی ہے جہاں تم بیاہ کر گئی ہو۔ تمہیں زیادہ وقت وہاں رہنا چاہیے۔"

اس کی تیوری چڑھ گئی۔ "آپ کیا کہنا چاہتی ہیں؟"

"فاریا ریحان کے گھر والوں نے اس کی شادی اس لیے کی ہے کہ اس کی بیوی اس کے گھر پر رہے نہ کہ اپنے میکے میں رہے۔"

"آپ کو اس کی بہت فکر ہے؟" فاریا کا لہجہ طنزیہ ہوگیا۔

"مجھے تمہاری فکر ہے، آج کل دور بہت بدل گیا ہے اور لوگ زیادہ دیر بے وقوف نہیں بنتے ہیں اور نہ برداشت کرتے ہیں اس سے پہلے معاملہ خراب ہو اور لڑائی جھگڑوں کی نوبت آئے....."

"تو میں دیکھ لوں گی۔" اس نے بات کاٹ کر کہا اور ڈیک کی آواز پھر سے تیز کردی اور بیڈ پر اوندھے منہ لیٹ گئی۔ اس کا جواب واضح تھا۔ میں اس کے کمرے سے نکل آئی اور ڈنر تیار کرنے لگی۔ کیونکہ تقریباً سارے کام میں ہی کرتی آئی تھی اس لیے مجھے فاریا کے جانے سے کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔ مجھے اس کا آنا نہیں کھلتا تھا لیکن وہ جس طرح آئے دن یہیں پڑی رہتی تھی یہ بات ریحان اور اس کے گھر والے کب تک برداشت کرتے۔ میں خلوص دل سے چاہتی تھی کہ وہ اپنے گھر پر توجہ دے اور اسے مضبوط بنائے۔ مگر اسے کوئی پروا نہیں تھی۔ بلکہ یہ ہونے لگا کہ جب اس کے سمسٹر یا کوئی ٹیسٹ ہونے لگتا تو وہ تیاری کے نام پر مستقل آجاتی۔ میں نے ایک دو بار اور سمجھایا اور جب اس نے اپنے رویّے سے جتایا کہ اسے میرا سمجھانا پسند نہیں ہے تو میں چپ ہوگئی۔ اس کا آخری سمسٹر قریب تھا اور وہ تیاری کے نام پر صبح سے شام تک اپنے کمرے میں میوزک لگا کر بیٹھی رہتی تھی تو وہی ہوا جس کا مجھے خدشہ تھا ایک دن اس کی ساس اور مدیحہ چلے آئے۔ ان کے انداز سے مجھے پتا چل گیا تھا کہ وہ کیوں آئے تھے۔ میں خوش خلقی سے پیش آئی اور انہیں ڈرائنگ روم میں لے آئی۔ ریحان کی امی نے بیٹھتے ہی کہا۔

"بیٹا فاریا کا یہ رویّہ کب تک چلے گا؟"

"کون سا رویّہ؟" میں نے تحمل سے پوچھا۔

"یہی کہ وہ یہاں زیادہ رہتی ہے اور اپنے گھر پرائے نام پائی جاتی ہے۔"

میں نے مصنوعی حیرت سے کہا۔ "تو کیا وہ آپ لوگوں کی اجازت اور مرضی سے یہاں نہیں آتی ہے؟"

انہوں نے پہلو بدلا۔ "ہم نے اسے کبھی روکا ٹوکا نہیں....."

"لیکن آپ چاہتی ہیں کہ آپ کا کام بھی میں کروں۔" میں نے بات کاٹ کر کہا۔ "آنٹی معذرت کے ساتھ..... جب آپ نے اسے روکا ٹوکا نہیں تو آپ مجھ سے کیوں توقع کررہی ہیں۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ پہلے آپ اپنے گھر میں اس پر بات کریں اور اگر بات نہ بنے تو پھر مجھ تک

لے کر آ گئیں۔ اگرچہ میں صرف فاریا کی بڑی بہن ہوں لیکن میں آپ کو یقین دلاتی ہوں کہ اسے سمجھانے کی پوری کوشش کروں گی۔"

ریحان کی امی کا منہ اتر گیا تھا۔ مدیحہ بولی۔ "ماریا آپی آپ بھابی کی بڑی ہیں اور سمجھدار ہیں۔ امی اور مجھے تو وہ کسی خاطر میں نہیں لاتی ہیں۔"

میں طنز کرتے کرتے رک گئی کہ وہ ان کی پسند ہے۔ پھر یہ بات بھی تھی کہ فاریا مجھے کب خاطر میں لاتی تھی مگر یہ دونوں باتیں ان سے نہیں کہہ سکتی تھی۔ میں نے کہا۔ "ٹھیک ہے آنٹی میں اس سے پوچھ کر دیکھتی ہوں۔"

وہ جب تک موجود رہیں فاریا کمرے سے باہر نہیں آئی۔ ان کے جانے کے بعد وہ نکلی تو میں نے اسے ریحان کی امی اور بہن کا پیغام دیا۔ اس نے مخصوص بے پروائی سے کہا۔ "بولنے دیں انہیں.... میری جو مرضی ہوگی میں وہ کروں گی۔"

"فاریا تمہاری جو مرضی ہوتی ہے تم وہی کرتی ہو۔" میں نے کسی قدر برہمی سے کہا۔ "لیکن یہ تمہارا اور تمہاری سسرال کا معاملہ ہے۔ بہتر ہوگا اسے وہیں نمٹاؤ۔"

میں کہہ کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ میرا خیال تھا کہ شاید اس پر کوئی اثر ہو مگر اس پر تو جوں بھی نہیں رینگی تھی۔ وہ عرصے سے اپنے مشاغل میں لگی رہی۔ یہی نہیں اس نے اپنی دوستوں کے ساتھ گھومنا پھرنا اور مختلف جگہوں پر آنا جانا شروع کر دیا تھا۔ پہلے وہ مجھے بتا دیتی تھی لیکن اب وہ اس کی زحمت بھی نہیں کرتی تھی۔ اسی طرح پہلے وہ شام تک گھر آ جاتی تھی لیکن اب رات دس گیارہ بجے تک بھی باہر رہنے لگی تھی۔ ریحان کی امی و بہن کی آمد کے ہفتے بھر بعد ایک شام ریحان آ گیا۔ وہ کام سے آ رہا تھا اور تھکا ہوا لگ رہا تھا۔ اس نے کہا۔ "میں فاریا سے بات کرنے آیا ہوں۔"

"وہ گھر پر نہیں ہے اپنی ایک دوست کے گھر گئی ہے۔"

"لگتا ہے اسے دوستوں کے علاوہ دنیا میں کسی سے دلچسپی نہیں ہے۔" ریحان کے لہجے میں تلخی تھی۔ میں نے اسے اندر بلا لیا۔ میں ڈنر تیار کر رہی تھی۔ ریحان لاؤنج میں آ گیا۔ ساحر وہیں موجود تھا اور ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ میں نے اس کے لیے چائے بنائی۔

"آپ کو پتا ہے وہ پورے دو مہینے سے ایک بار بھی گھر نہیں آئی ہے۔"

"میں جانتی ہوں لیکن میں اس سلسلے میں کیا کر سکتی ہوں۔" نہ چاہتے ہوئے بھی میرا لہجہ سرد ہو گیا۔ ریحان شرمندہ نظر آنے لگا۔

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں.... آپ کا قصور نہیں ہے، قصور میرا، فاریا اور امی کا ہے۔ اس لیے ہمیں ہی اس سے نمٹنا ہوگا۔"

"میں بھی یہی چاہتی ہوں کہ تم تینوں آپس میں بات کرو۔" میں نے کہا۔ ریحان کچھ دیر فاریا کا انتظار کرتا رہا پھر اس نے اسے کال کی مگر وہ ریسیو نہیں کر رہی تھی۔ مایوس ہو کر وہ جانے کے لیے اٹھا۔ میں نے اسے کھانے پر روکا مگر وہ چلا گیا۔ فاریا حسب معمول دس بجے تک آئی۔ میں نے اسے ریحان کے بارے میں بتایا تو وہ برہم ہو گئی۔

"وہ کس خوشی میں یہاں آیا تھا اور وہ بھی میری غیر موجودگی میں۔"

"خوشی میں تو نہیں خاصی تکلیف میں آیا تھا۔" میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ "اور اسے شاید خبر نہیں ہے کہ تم اب دس گیارہ بجے تک گھر سے باہر رہتی ہو ورنہ وہ اسی لحاظ سے ملنے آتا اپنی بیوی سے۔"

"اب وہ آئے تو اسے منع کر دیجیے گا۔"

"یہ نیک کام بھی تم خود کرو۔" میں نے کہا۔ "میں نے ریحان سے بھی یہی کہا ہے، یہ تم تینوں کا معاملہ ہے آپس میں خود نمٹو مجھے مت گھسیٹو۔"

مجھے لگ رہا تھا کہ معاملہ خرابی کی طرف جا رہا ہے۔ ابھی فاریا کے سمسٹر بھی مکمل نہیں ہوئے تھے کہ اس نے کسی جگہ جاب کر لی۔ اس نے مجھے بتانے یا اطلاع دینے کی زحمت بھی نہیں کی تھی۔ یہ تو مجھے ریحان نے کال کر کے بتایا۔ وہ غصے میں تھا۔ "فاریا حد سے بڑھ رہی ہے۔"

مجھے اس سے اتفاق تھا لیکن میں نے کہا۔ "تم اس سے بات تو کرو۔"

"میں نے کی تھی اور اس نے گھر واپس آنے سے انکار کر دیا ہے۔ وہ اس رشتے کو ختم کرنا چاہتی ہے۔"

فاریا کا رویہ چیخ چیخ کر یہی کہہ رہا تھا۔ وہ گھر آئی تو پہلے میں نے اس سے ملازمت کا پوچھا۔ اس نے جواب دیا۔ "ہاں ایک جگہ انٹرن شپ ہے۔"

"تم نے مجھے بتانے کی زحمت بھی نہیں کی۔"

"ذہن میں نہیں رہا تھا۔"

"خیر دوسری بات یہ کہ ریحان کی کال آئی تھی وہ کہہ رہا تھا کہ تم یہ رشتہ ختم کرنا چاہتی ہو۔"

"یہ تو اس کا کہنا ہے میں نے صرف اتنا مطالبہ کیا ہے

کہ مجھے الگ گھر چاہیے۔"

"فاریا اس کی ماں اور چھوٹے بہن بھائی اس پر انحصار کرتے ہیں وہ ان سے الگ کیسے ہو سکتا ہے؟"

"تو نہ ہو..... مجھے تو الگ گھر چاہیے، میں ان لوگوں کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ میں نے ریحان سے شادی اس لیے نہیں کی تھی کہ اس کی ماں اور بہن بھائی کی خدمت کروں۔"

اس بار میں تشویش زدہ ہو گئی۔ ہمارے ماں باپ سر پر نہیں تھے جو معاملہ سنبھال لیتے۔ فاریا میرے بس کی بات نہیں تھی۔ پھر بھی میں نے کوشش کی اور ریحان اور اس کی امی سے بات کی۔ ریحان کی امی راضی تھیں کہ ریحان فاریا کو الگ گھر لے دے مگر ریحان اس معاملے پر ڈٹ گیا تھا۔ اس نے صاف انکار کر دیا تھا۔ اس نے کہا کہ وہ دس بار فاریا کو طلاق دے سکتا ہے لیکن اپنے گھر والوں سے الگ نہیں ہو سکتا۔ میں نے فاریا کو سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ کچھ عرصے ساتھ رہ لے اور پیار محبت سے ریحان کو منائے تو وہ مان بھی جائے گا مگر فاریا ایسی زحمتوں میں پڑنے کی قائل نہیں تھی۔ اس نے نہ صرف انکار کیا بلکہ ریحان سے کہہ دیا کہ اسے طلاق دے دے اور ریحان نے کچھ عرصے بعد اس کی فرمائش پوری کر دی۔ اس نے کوریئر سے طلاق نامہ بھجوا دیا تھا۔ حق مہر وہ اسے پہلے ہی دے چکا تھا۔ طلاق نامہ بھی میں نے ریسیو کیا اور رات جب فاریا آئی تو اس کے منہ پر مارا۔ "مبارک ہو تم نے اپنی ایک ضد اور پوری کر لی۔"

"آپ کو تو خوش ہونا چاہیے....."

زندگی میں پہلی بار میں نے اسے تھپڑ مارا۔ "تم نہایت گھٹیا اور ذلیل لڑکی ہو..... کاش کہ تم میری بہن نہ ہوتیں۔"

اس طلاق اور میرے تھپڑ دونوں کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا تھا۔ وہ جاب کرنے لگی تھی۔ میں نے اوپر والا پورشن خالی کرا کے اس کے سپرد کر دیا۔ "اب تم خود مختار ہو اور اپنی مرضی کی مالک تو پہلے بھی تھیں اس لیے بہتر ہے تم الگ ہی رہو اور جو مرضی آئے کرو۔"

وہ بھی خوشی خوشی اوپر منتقل ہو گئی۔ ساحر میرے ساتھ ہی تھا۔ کچھ عرصے بعد فاریا نے اپنے ایک کولیگ سہیل سے شادی کر لی اور وہ اس کے ساتھ رہنے لگا۔ حالانکہ اس کا پورا خاندان تھا اور اپنا گھر بھی تھا لیکن فاریا نے اسی شرط پر شادی کی تھی کہ وہ الگ رہے گا۔ اس بار بھی اس نے مجھ سے پوچھنے کی زحمت نہیں کی اور بس اطلاع دی کہ وہ شادی

نظام الملک بحری

دور اقتدار 1481ء۔ 1490ء

بہمنی سلطنت کے مرکز بیدر کے نامور سیاست دان محمود گاوان کے قتل کے بعد اس کی جگہ سلطان محمد ثالث کا وزیر مقرر ہوا۔ اور اپنے بیٹے ملک احمد کو جنیر کا حاکم مقرر کیا۔ 1498ء میں ملک احمد نے اپنی خود مختاری کا اعلان کر دیا اور 1499ء میں احمد نگر فتح کر لیا اور وہاں نظام شاہی سلطنت، کی بنیاد رکھی۔

نظام الملک بیجاپور کے برہمن کا بیٹا تھا اور اس کا اصل نام ٹیما بھٹا تھا۔ سلطان احمد شاہ بہمن کے زمانے میں گرفتار ہو کر اسلام لایا۔ شہزادہ محمد شاہ کا ملازم ہوا اسلامی نام ملک حسین رکھا گیا۔ اس کے بعد عوام میں ملک حسین بھیرو کے نام سے مشہور رہا۔

"بحری" اسی "بھیرو" سے نکلا ہے کیونکہ شہزادہ بھیرو کی ادائیگی درست طور پر نہ کرتے ہوئے بحری کہتا تھا۔ اس طرح اس کا خطاب و القاب "نظام ملک بحری" نامور ہوا۔ خواجہ محمود گاوان نے تلنگانہ کا حکم مقرر کیا۔ بعد قتل وہ اس کے منصب پر فائز ہوا۔ نو سال بعد اسی منصب پر قتل ہوا۔

مرسلہ: رضا ہمدانی، ملتان

کرنے جا رہی ہے۔ جواب میں میں نے بھی وہی رویہ رکھا کہ خوش رہو۔ میں نے شادی میں کسی قسم کا کوئی حصہ نہیں لیا۔ بس شریک ہو گئی۔ ویسے بھی شادی سادگی سے ہوئی تھی۔ فاریا کو جو جہیز دیا تھا وہی لا کر اوپر والے فلور پر رکھا تھا اور وہ اب بھی وہی استعمال کر رہی تھی۔ سہیل خوش شکل لیکن چالاک قسم کا شخص تھا۔ مجھ سے بہت ادب سے پیش آتا تھا لیکن میں محسوس کرتی تھی کہ اس کا یہ ادب و آداب بس اوپری اوپری ہے۔ ساحر سے فاریا کا کوئی تعلق نہیں تھا اب تو اسے کہاں سے ہوتا۔

وقت گزرتا رہا فاریا کی شادی کے چند مہینے بعد اچانک ہی ریحان کی امی غیر متوقع طور پر آ گئیں۔ وہ شرمندہ اور دکھی تھیں۔ میرا دل نہیں چاہ رہا تھا مگر میں انہیں اندر لے آئی۔ وہ آتے ہی پھوٹ پھوٹ کر رو پڑی تھیں۔ "میں نے اپنی ضد پر اپنے بچے کی زندگی تباہ کر دی۔"

"آنٹی اللہ کے ہر کام میں کوئی مصلحت ہوتی ہے۔" میں نے انہیں تسلی دی۔ میں طنز نہیں کر سکی تھی، مجھے سچ مچ افسوس ہو رہا تھا۔

"اسی لیے تو تم سے معافی مانگنے اور اپنے بچے کی خوشی مانگنے آئی ہوں۔"

مجھے ان کی بات سمجھنے میں ذرا دیر لگی۔ پھر بھی میں نے تصدیق چاہی۔ "آپ کیا کہنا چاہ رہی ہیں؟"

"بیٹی جو کام پہلے میری ضد کی وجہ سے ادھورا رہ گیا تھا اسے مکمل کرنا چاہتی ہوں، میں تم سے تمہیں مانگ رہی ہوں ریحان کے لیے۔"

ایک لمحے کو شدید غصے نے مجھے بے قابو کر دیا تھا۔

"آنٹی میں ایک جیتا جاگتا انسان ہوں کوئی کھلونا نہیں ہوں جسے آپ پہلے اپنے بیٹے کے لیے مسترد کر دیں اور پھر اس کے لیے خرید لیں۔"

"بیٹا میں تو مانگ رہی ہوں، تم سے تمہیں.... میں اپنی غلطی پر بہت شرمندہ ہوں جو میں نے تمہارے جیسا ہیرا چھوڑ کر پتھر منتخب کیا تھا۔ خدا کے لیے مجھے معاف کر دو۔"

انہوں نے کہتے ہوئے ایسی حرکت کی کہ میں بوکھلا گئی تھی۔ انہوں نے اچانک جھک کر میرے پاؤں پکڑ لیے۔

"میری بچی مجھے معاف کر دو۔"

"پلیز یہ کیا کر رہی ہیں آپ۔" میں نے جلدی سے انہیں اٹھایا۔ "کیوں مجھے گناہ گار کر رہی ہیں۔"

"گناہ گار تو میں ہوں۔" وہ رونے لگیں۔ "اپنی ضد پر اپنے بچے کی بچی خوشی قربان کر دی۔ وہ میری بلیک میلنگ کی وجہ سے مان گیا۔ میں نے اسے دودھ نہ بخشنے کی دھمکی دی تھی۔"

میرا دل پگھل گیا تھا ان کی اس حرکت پر، مگر ان کی بات ماننا بہت مشکل تھا۔ مجھے آگے پیچھے کا سب سوچنا تھا۔ فاریا نے پہلے اپنی ضد پوری کی پھر اس نے ریحان سے طلاق لے لی اور اب اپنی زندگی میں مگن تھی لیکن اگر میں ریحان سے شادی کر لیتی تو بہت سی زبانیں کھل سکتی تھیں۔

میں نے ریحان کی امی سے کہا۔ "آنٹی یہ بہت مشکل ہے آپ خود سوچیں لوگ کیا باتیں کریں گے۔"

"بیٹا لوگ تو بہر صورت باتیں کرتے ہیں۔"

"آپ ٹھیک کہہ رہی ہیں لیکن ہم اپنی حد تک انہیں بات کرنے کا موقع کیوں دیں؟" میں نے کہا۔ "اگر میں دوسروں کا خیال کرنے والی نہ ہوتی تو فاریا کے رشتے سے انکار کر سکتی تھی کم از کم اس شادی میں میری رضامندی شامل نہ ہوتی۔"

وہ پھر شرمندہ ہو گئیں کہ میں انہیں اپنی من مانی کرنے کا طعنہ دے رہی ہوں۔ حالانکہ میں نے اپنی طرف سے بات کی تھی۔ "بیٹا بس اور شرمندہ نہ کرو اب مان جاؤ۔"

"آنٹی مجھے سوچنے کی مہلت دیں۔"

"تم سوچ لو بیٹا۔" انہوں نے امید سے کہا۔ "مجھے یقین ہے تم ہمارے حق میں فیصلہ کرو گی۔"

لیکن بہت سوچنے سمجھنے کے بعد میں نے جو فیصلہ کیا وہ ان کے حق میں نہیں تھا۔ اگر میں فاریا کی طرح صرف اپنے لیے سوچنے والی ہوتی تو پھر کوئی مسئلہ ہی نہیں تھا۔ مگر میں ایسا نہیں کر سکتی تھی۔ ریحان کے ذمے داری اس کی ماں، بہن اور بھائی تھا۔ میری ذمے داری ساحر تھا۔ میں اس کی بہن تھی لیکن وہ کسی اور کے آسرے پر رہے یہ مجھے قبول نہیں تھا۔ دوسری طرف ریحان اپنے گھر والوں سے الگ نہیں رہ سکتا تھا۔ پھر فاریا اور ان لوگوں کی سوچ کا مسئلہ تھا جو ہمارے واقف کار تھے۔ آدمی کا حلقہ احباب کتنا ہی محدود کیوں نہ ہو اسے رہنا اسی میں ہوتا ہے۔ مجھے بھی اسی حلقے میں رہنا تھا اور میں ساری عمر لوگوں سے نظریں چرا کر نہیں رہ سکتی تھی۔ اس لیے میں نے چند دن بعد ریحان کو کال کر کے حتمی انکار کر دیا۔ میں نے اس سے کہا۔ "پلیز یہ مت سوچیے گا کہ میں انتقاماً ایسا کر رہی ہوں۔ ریحان اگر آپ مجھے جانتے ہیں تو سمجھ سکتے ہیں کہ میں اس رشتے کو مناسب نہیں سمجھ رہی۔"

"میں تمہیں سمجھتا ہوں۔" ریحان نے سرد آہ بھری۔

"بہت سارے عوامل ہیں جن کی وجہ سے میں ہاں نہیں کر سکتی، امید ہے آپ مجھے معاف کر دیں گے اور میری خواہش ہے کہ آپ پھر شادی کر لیں اور خوش رہیں۔"

ریحان نے میری خواہش پوری کر دی۔ چند مہینے بعد اس کی شادی سادگی کے ساتھ اس کی ایک بیوہ کزن سے ہو گئی جس کا شوہر شہر میں ہونے والی اندھی فائرنگ کا نشانہ بن گیا تھا اس کی شادی کو چند مہینے گزرے تھے۔ ریحان اب خوش تھا۔ میں بھی خوش ہوں۔ میرے دفتر میں کام کرنے والے اصغر صاحب نے مجھے پرپوز کیا تو میں نے ہامی بھر لی۔ اصغر صاحب عمر میں مجھ سے دس سال بڑے ہیں مگر صحت اور صورت سے اتنے بڑے نہیں لگتے ہیں۔ وہ بھی ایک بار شادی کر چکے ہیں اور آزاد ہیں، ماں باپ مر چکے ہیں اور بہن بھائی سارے شادی شدہ ہیں اس لیے ہمارے گھر رہنے میں انہیں کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ میں مطمئن ہوں کہ اب مجھے کسی کے سامنے نظر جھکانا نہیں پڑتی ہے۔

بھیدی

مکرمی مدیر اعلیٰ سرگزشت

السلام علیکم!

لوگ مجھے پتا نہیں کس کس نام سے یاد کرتے ہیں۔ انہیں مجھ سے دشمنی نہیں ہے، صرف پیار میں وہ لوگ ایسا کہتے ہیں۔ اس کی وجہ میرے کارنامے ہیں۔ میں نے کیا کارنامے انجام دیے ہیں بطور نمونہ آپ بھی ملاحظہ کریں۔

ریاض ملک
(سیالکوٹ)

میں نے اپنی شناخت بھیدی رکھی تھی۔

بھیدی وہ کردار جو گھر کے اور باہر کے راز فاش کیا کرتا ہے۔ جو اپنے انجام کی پروا نہیں کرتا۔ جو سچ بولتا ہے اور سچ ہی ظاہر کرتا ہے۔ کم از کم میں ایسا ہی بھیدی بننا چاہتا تھا۔

اس کی تحریک مجھے مرزا داستان کو دیکھ کر اور ان سے مل کر ہوئی تھی۔ وہ ایک عام سے اخبار میں ایک عام سے صحافی تھے اور اس اخبار میں بھی ان کی کوئی خاص اہمیت

نہیں تھی۔

میں جب ان سے ملا تو وہ اس دن بہت اداس اور پوری دنیا سے خفا خفا سے دکھائی دے رہے تھے۔ اگر ان کے بس میں ہوتا تو وہ خودکشی کر لیتے۔ لیکن وہ جانتے تھے کہ ان کی غضب ناک اور چیختی دہاڑتی ہوئی بیوی ان کی قبر میں بھی گھس آئے گی۔ اسی لیے شاید وہ مرنا نہیں چاہتے تھے۔

میں نے ان سے پوچھا۔ ”مرزا صاحب، خیریت تو ہے۔ آج آپ بہت اداس دکھائی دے رہے ہیں۔“

”ہاں، صرف آج کیا میں تو پچھلے پندرہ دنوں سے اداس ہوں۔“ انہوں نے ایک آہ بھرتے ہوئے کہا۔

مرزا صاحب پھیپھڑوں کی پوری قوت لگا کر آہ بھرتے تھے۔ اس وقت ان کا چہرہ چار آنے والے غبارے کی طرح مضحکہ خیز ہو جاتا تھا۔

”آخر کیوں مرزا صاحب، آخر آپ پندرہ دنوں سے کیوں اداس ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”اس لیے کہ اپنے اخبار کے مالک کے خیال میں میری کوئی حیثیت نہیں ہے۔“ انہوں نے کہا۔ ”میں ایک ناکام صحافی ہوں۔“

”آخر کیوں۔“ میں نے پوچھا۔ ”میں تو آپ کو کئی بار اسی ہوٹل کی اسی میز پر بیٹھ کر کئی کئی صفحات لکھتے ہوئے دیکھ چکا ہوں۔“

”میاں، ہمارے مالکان میری رپورٹنگ سے خوش نہیں ہیں۔ وہ یہ چاہتے ہیں کہ میں کوئی زبردست خبریں لاؤں۔ اندر کی خبریں، اندر کے راز تاکہ تہلکہ مچ جائے۔“

”مرزا صاحب، اگر میں آپ کو ایسی خبریں مہیا کیا کروں تو مجھے کیا ملے گا۔“ میں نے پوچھا۔

”ہر خبر پر تین سو روپے۔“ مرزا صاحب نے کہا۔ ”لیکن شرط یہی ہے کہ خبر بالکل سچی ہو۔“

”اس کی تو فکر ہی نہ کریں۔ آج سے میں آپ کے لیے بھیدی کا کام کروں گا۔ اس وقت میرے پاس پہلی خبر یہی ہے کہ شبانہ سپر اسٹور میں چوری کا مال بکتا ہے۔“

”کیا بکواس کر رہے ہو میاں! شبانہ سپر اسٹور اس شہر کا بہت مستند اسٹور ہے۔“ مرزا صاحب نے کہا۔ ”اس کی ایک ساکھ ہے۔“

”کچھ بھی ہو، میں نے آپ کو ایک کنفرم نیوز دے دی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”آپ شائع کر دیں، ثبوت میں آپ کو لا کر دوں گا۔“

”اگر ایسی بات ہے تو پھر پرسوں کے اخبار میں دیکھ لینا۔ لیکن شرط یہ ہے کہ یہ خبر تمہارے حوالے سے شائع ہوگی۔“

”بالکل! اور میرا نام لکھیے گا بھیدی۔“ میں نے بتایا۔

”ثبوت کیا ہے تمہارے پاس۔“

”وہ چور جو بہت سی چیزیں انتہائی کم قیمت پر شبانہ والوں کو فروخت کرتا رہتا ہے۔“ میں نے بتایا۔

”کون ہے وہ۔“

”میں اس کا نام ظاہر نہیں کروں گا۔ ہاں عدالت بلائے گی تو اسے عدالت میں حاضر کر دوں گا۔“

”بس میاں، میرے لیے اتنا اطمینان کافی ہے۔“

مرزا صاحب اتنا خوش تھے کہ انہوں نے میرے لیے چائے اور بسکٹ بھی منگوا لیے تھے۔

تیسرے دن کے روزنامہ ”دوپہر“ میں یہ خبر بھیدی کے حوالے سے شائع ہوگئی تھی کہ شبانہ سپر اسٹور چوری کا مال خرید و فروخت کیا کرتا ہے۔

اس کے بعد ایک ہنگامہ مچ گیا تھا۔ اسٹور والوں نے اخبار کے خلاف مقدمہ دائر کر دیا تھا۔ مرزا صاحب نے مجھ سے کہا۔ ”میاں، اب تم اس چور کو عدالت کے سامنے پیش کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اسٹور والوں نے ہم پر کیس کر دیا ہے۔“

”آپ اس کی فکر ہی نہ کریں مرزا صاحب، جب ضرورت ہوگی میں اسے حاضر کر دوں گا۔“

دراصل یہ خبر مجھے راجا پہلوان نے دی تھی۔ راجا پہلوان ایک مریل سا نوجوان تھا۔ نہ جانے کیوں اسے پہلوان کہا جاتا تھا۔ میں نے اس کے پاس ہمیشہ پیسے دیکھے تھے۔ کوئی بھی حالات ہوں اس کی جیب ہمیشہ بھری رہتی تھی۔ وہ دوستوں کی محفل میں قہقہہ لگایا کرتا۔ بہت ہی بے فکر انسان تھا۔

لیکن پچھلے کچھ دنوں سے وہ بہت پریشان سا دکھائی دینے لگا تھا، نہ جانے کیوں۔ میں نے جب اسے کریدا تو وہ پھٹ پڑا۔ ”یار، میں اب اپنی زندگی سے تنگ آ چکا ہوں۔“

”کیوں؟ کیا ہوا ہے تمہاری زندگی کو۔“

”بھائی، گناہوں کے بوجھ نے مجھے پریشان کر دیا ہے۔“ اس نے بتایا۔

”کیسا بوجھ۔ کیسے گناہ؟“

پھر اس نے بتایا کہ وہ دراصل چور ہے اور دکانوں سے مختلف چیزیں کمال صفائی کے ساتھ چرا کر مارکیٹ میں کم سے کم قیمت پر فروخت کر دیتا ہے۔ اسی لیے اس کے پاس ہر وقت پیسے ہوتے ہیں۔

”لیکن تم یہ چیزیں بیچتے کہاں ہو۔ تم سے کون خریدتا ہے۔“

”میں نے ایک دکان پکڑ رکھی ہے۔“ اس نے بتایا۔ ”شبانہ سپر اسٹور۔ میرا سارا مال وہی خریدتے ہیں۔“

”یار، یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ تو بہت اچھی شہرت کا اسٹور ہے۔“

”بھائی اونچی دکان پھیکا پکوان ہے۔“ اس نے کہا۔ ”اگر وقت پڑ جائے تو میں ان کے خلاف سارے ثبوت دے سکتا ہوں۔“

اسی راجا پہلوان کے بھروسے پر میں نے یہ خبر مرزا صاحب کو سنا دی تھی.... مرزا صاحب نے شائع بھی کر دی تھی اور اب ان کے اخبار کے خلاف کیس بھی ہو گیا تھا۔

مجھے یہ اطمینان تھا کہ جب چاہوں گا راجا پہلوان کو عدالت میں بھیج دوں گا۔ لیکن جب میں نے راجا پہلوان سے ذکر کیا تو اس نے صاف انکار کر دیا۔ ”نہیں بھائی، میں ان چکروں میں نہیں پڑوں گا۔“

”کیا مطلب۔“ میں تو بوکھلا کر رہ گیا تھا۔ ”کیا تم گواہی نہیں دو گے۔“

”نہیں بھائی، میں ایک غریب آدمی ہوں۔ شبانہ سپر اسٹور والے پیسے والے لوگ ہیں۔ وہ بعد میں میرا کباڑا کروا دیں گے۔ اسی لیے مجھے تو اس جھنجھٹ سے دور رکھو۔“

”بے وقوف انسان! میں نے تمہارے بھروسے پر یہ خبر لیک کی۔ اب تو اخبار والوں پر مقدمہ بھی ہو گیا ہے اور تم پیچھے ہٹ رہے ہو۔“

”کچھ بھی کہتے رہو، میں اس جھگڑے میں نہیں پڑوں گا۔“

یہ لیں۔ اب تو معاملہ ہی الٹا ہو گیا تھا۔ پہلا ہی تجربہ اتنا بھیانک ہوا کہ اخبار والوں نے تو کسی نہ کسی طرح نمٹ لیا لیکن بے چارے مرزا صاحب کی نوکری ختم ہو گئی تھی اور وہ ڈنڈا لیے مجھے تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ میں نے یہ تجربہ وکی لیکس سے متاثر ہو کر کیا تھا۔

میں اپنی جگہ جولین آسانج بننے کی کوشش کر رہا تھا۔ سوچا تھا آہستہ آہستہ اس ایکٹویٹی کو بڑھاتا جاؤں گا۔ لوگوں کے راز ظاہر کروں گا۔ اپنے معاشرے کو بتا دوں گا کہ سچ بولنے والے دنیا میں ہر جگہ پائے جاتے ہیں۔

لیکن پہلا ہی تجربہ ناکام ہوا تھا۔

خیر، یہ ایسی کوئی بات نہیں تھی۔ مجھے مایوس نہیں ہونا چاہیے تھا۔ سچ کے سفر کو ہر حال میں جاری رہنا چاہیے تھا۔ پھر میں نے سوچا کہ بیرونی گواہی کے چکر میں نہیں پڑوں گا۔ بلکہ خود ہی واقعات کی گواہی دیا کروں گا بشرطیکہ وہ واقعہ میرے سامنے پیش آیا ہو۔

عجیب سا جوش پیدا ہو گیا تھا مجھ میں۔ میں اپنے تصور کی آنکھوں سے دیکھ رہا تھا کہ پوری دنیا میں ہلچل مچ گئی ہے۔ لوگ ”بھیدی“ زندہ باد کے نعرے لگا رہے ہیں۔ مجھے اس صدی میں سچ کا سب سے بڑا نمائندہ تسلیم کیا جا رہا ہے اور مجھے نوبل پرائز تک مل چکا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

اب میں موقع کی تلاش میں رہنے لگا۔ کوئی ایسا واقعہ کوئی ایسی بات جو میرے سامنے آئے اور میں اس کا ڈھنڈورا پیٹ دوں۔ ہاں، ایک بات بتانا بھول گیا۔ میں نے اپنی معاونت کے لیے اپنے ایک دوست اکمل کو بھی ہائر کر لیا تھا۔

میں نے جب اسے بتایا کہ میں وکی لیکس بننے کی تیاریاں کر رہا ہوں تو وہ بھی خوش ہو گیا تھا۔

”ریاض بھائی تم فکر ہی مت کرو۔ میں تمہارے لیے ایسی ایسی خبریں لے کر آؤں گا کہ پوری دنیا کے ہوش اُڑ جائیں گے۔“

”شاباش! میں جانتا ہوں کہ تم ہی یہ کام کر سکتے ہو۔“

”لیکن بھائی، اس میں کچھ خرچ تو ہوگا۔ بھاگ دوڑ، کسی ہوٹل میں بیٹھنا، کسی کو رشوت دینا۔ یہ سب تو کرنا پڑے گا۔“

”اس کے لیے میں تین ہزار روپے مہینے تمہیں دیا کروں گا۔“

”تین ہزار تو بہت کم ہوں گے۔“ اس نے کہا۔

”افسوس کی بات ہے اکمل کہ تم میرے جذبے کو نہیں سمجھ سکے۔ یہ خدمت خلق ہے، ہم معاشرے کی اصلاح کر رہے ہیں۔“

”وہ تو ٹھیک ہے۔ اس قسم کا شوق تو مجھے بھی ہے لیکن ان سب کاموں کے لیے پیسے تو خرچ ہوں گے نا۔“

"اسی لیے تو تین ہزار سے اسٹارٹ دے رہا ہوں۔"
میں نے کہا۔ "کام بڑھ جائے تو پیسے بھی بڑھ جائیں گے۔"
"ٹھیک ہے، تو پھر میں کل ہی سے کام شروع کرتا ہوں۔"

میں نے اسے ایڈوانس کے طور پر ایک ہزار روپے بھی دے دیے تھے۔

تیسرے ہی دن وہ ایک خبر لے کر آ گیا۔ وہ بہت ہی پُرجوش ہو رہا تھا۔ "ریاض بھائی، تمہارے لیے ایک ایسی خبر لے کر آیا ہوں کہ تم بھی کیا یاد کرو گے۔"

"کیا خبر ہے؟"

"وہ جو نواز ہے نا، وہی جس کی پرچون کی دکان ہے۔ اس کی لڑکی دودھ والے سے عشق کر رہی ہے۔"

"تو پھر اس سے کیا ہوا؟"

"ارے، نواز کی لڑکی دودھ والے سے عشق کر رہی ہے اور یہ کوئی بات ہی نہیں ہوئی۔"

"بے وقوف انسان! نواز کی لڑکی سے اس معاشرے کو کیا دلچسپی۔ کون جانتا ہے نواز کو اور اس کی لڑکی کو۔ ایسے واقعات تو یہاں ہوتے ہی رہتے ہیں۔"

"کچھ بھی ہو، نیوز تو ہے نا۔" وہ کھسیا کر بولا۔

"گدھے! ایسے لوگوں کی خبریں لاؤ جن کی معاشرے میں کوئی اہمیت ہو۔ میں وکی لیکس بننے جا رہا ہوں۔ مجھے شام کا اخبار نہیں نکالنا جس میں اس قسم کی خبریں ہوں کہ فلاں کی لڑکی فلاں کے ساتھ بھاگ گئی اور فلاں نے فلاں کو طلاق دے دی۔ مجھے اہم انسانوں کی خبریں چاہئیں تاکہ پورا معاشرہ چونک اٹھے۔ تمہاری یہ خبریں تو مجھے دو کوڑی کا کر دیں گی۔"

"ٹھیک ہے۔ اب میں سمجھ گیا ہوں کہ تمہاری ریکوائرمنٹ کیا ہے۔" اکمل نے کہا۔ "اب کل ہی لو، ایک دوسری زوردار خبر لے کر آتا ہوں۔"

دوسرے دن تو نہیں البتہ تیسرے دن وہ ایک خبر لے کر آ گیا تھا۔ "ریاض بھائی، اس بار کی خبر واقعی بہت زوردار ہے۔"

"اور وہ کیا ہے؟"

"سلمٰی خاتون کو جانتے ہو نا۔"

"پھر وہی بات۔" مجھے غصہ آنے لگا تھا۔ "کسی کو سلمٰی خاتون سے کیا دلچسپی۔ کون سلمٰی خاتون۔"

"وہی جو کونے والے مکان میں کرائے پر آ کر رہنے لگی ہے اور بچوں کو ٹیوشن پڑھایا کرتی ہے۔"

"ہاں وہ تو بہت اچھی عورت ہے۔ اس کے ساتھ کیا ہو گیا؟"

"کیا تمہیں معلوم ہے کہ اس علاقے کا تھانے دار روز رات کو اس سے چھپ چھپ کر ملنے آتا ہے۔" اکمل نے بتایا۔

"کیا!" میں اچھل پڑا تھا۔ "کیا تم سچ کہہ رہے ہو؟"

"بالکل سچ۔" اس نے کہا۔ "اب بتاؤ یہ کیسی خبر ہے۔"

"اگر یہ سچ ہے تو پھر ایک خبر بن جاتی ہے۔" میں نے کہا۔ "کیونکہ تھانے دار ایک اہم انسان ہے۔ قانون کا محافظ ہے۔ وہ ملک میں کرپشن روکنے کے لیے رکھا گیا ہے اور خود ہی کرپشن کرتا پھر رہا ہے۔"

"اب بتاؤ، کیسی خبر لے کر آیا ہوں۔"

"کیا تم مجھے دکھا سکتے ہو؟" میں نے پوچھا۔

"کیوں نہیں۔ آج ہی رات کو دیکھ لینا۔" اکمل نے کہا۔ "سلمٰی خاتون کے مکان کے سامنے جو ایک ٹوٹی دیوار ہے اس کے پیچھے چھپ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ وہ گیارہ اور بارہ کے درمیان آتا ہے۔ اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا۔"

ہم سب اس علاقے کے تھانے دار کو اس طرح جانتے تھے کہ اسی محلے میں اس کا سالا رہا کرتا تھا۔ تھانے دار بذاتِ خود ایک معقول اور اچھا انسان تھا۔ اسی لیے بہت شرافت سے محلے میں آیا کرتا اور اپنے سالے سے مل کر واپس چلا جاتا۔ البتہ دو چار گارڈز اس کے ساتھ ضرور ہوا کرتے تھے۔

دوسری طرف سلمٰی خاتون تھی۔ اس نے کونے والا مکان کرائے پر حاصل کیا تھا۔ وہ خود بھی ایک نیک عورت تھی۔ اس نے محلے کے بچوں کو پڑھانے کا سلسلہ شروع کیا تھا۔

پورے محلے میں اس کی بہت اچھی ساکھ تھی اور اب یہ کھل رہا تھا کہ علاقے کا تھانے دار اس سے خاموشی سے ملنے آیا کرتا ہے۔ اکمل واقعی ایک زوردار خبر لے کر آیا تھا۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ بھیدی کے کارنامے مشہور ہونے والے تھے۔ آج ایک تھانے دار کی خبر تھی تو کل کسی سیاست دان کی ہو سکتی تھی۔ پرسوں کسی وزیر کی ہو سکتی تھی اور میں وکی لیکس کی طرح مشہور ہو جاتا۔

رات ساڑھے دس بجے اکمل میرے پاس پہنچ گیا۔ "چلو بھائی، تھانے دار کے آنے کا وقت ہو گیا ہے۔

چل کر خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لو۔"

میں اپنی زندگی کے پہلے ایڈونچر پر چل پڑا۔

سلمٰی خاتون کے مکان کے سامنے ایک ٹوٹی دیوار تھی۔ ہم دونوں اس کے پیچھے جا کر چھپ گئے۔ ٹھیک گیارہ بجے ایک گاڑی آ کر رکی اور تھانے دار گاڑی سے اتر کر دروازے کی طرف بڑھ گیا۔ "اکمل میرے دوست، تم نے بالکل ٹھیک خبر دی تھی۔" میں نے گرم جوشی سے اکمل کا ہاتھ دبا دیا۔

تھانے دار نے دروازے پر دستک دی۔ چند لمحوں بعد دروازہ کھل گیا۔ تھانے دار کے اندر جانے کے بعد دروازہ بند کر لیا گیا تھا۔

پھر اکمل نے کہا۔ "چلو اب دروازے کے قریب چلتے ہیں۔ ان کی باتیں بھی سن لیں گے۔"

ہم دونوں دبے پاؤں دروازے کے پاس آ گئے۔ تھانے دار کی آواز آ رہی تھی۔ "میری جان، میں تو ہر وقت تمہارے پاس رہنا چاہتا ہوں لیکن یہ جو ظالم سماج ہے، یہ موقع ہی نہیں دیتا۔"

بس اتنا ثبوت کافی تھا۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔ اپنے کانوں سے سن لیا تھا۔ سلمٰی خاتون بہت نیک اور پارسا بنتی تھی۔ دوسری طرف وہ تھانے دار بہت اچھی شہرت کا آدمی سمجھا جاتا تھا اور ان دونوں کے یہ کرتوت تھے۔

ہم واپس آ گئے۔ اس رات خوشی سے مجھے نیند نہیں آ رہی تھی۔ میں نے یہ سوچ لیا تھا کہ صبح اٹھتے ہی پورے محلے میں اپنے اس انکشاف سے ہنگامہ برپا کروا دوں گا۔

صبح میں بے دھڑک محلے کے اس ہوٹل میں پہنچ گیا جہاں محلے کے سارے ہی بوڑھے آ کر سیاست پر تبصرہ کیا کرتے تھے اور ایک دوسرے کی بہو بیٹیوں کے بارے میں انکشافات کیا کرتے۔

اس وقت بھی وہاں سب جمع ہو کر وکی لیکس ہی کے بارے میں باتیں کر رہے تھے۔ میں نے ان سبھوں کی طرف فاتحانہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے بلند آواز میں اعلان کیا۔ "میرے محلے کے معزز بوڑھو...! ذرا میری طرف بھی توجہ دو۔"

سب کے سب میری طرف متوجہ ہو گئے تھے کیونکہ کسی نے پہلی دفعہ انہیں اس انداز میں مخاطب کیا تھا۔

"یہ تم لوگ کیا وکی لیکس وکی لیکس کرتے رہتے ہو۔ بھائی لوگ اس محلے، اس شہر اور اس ملک کا وکی لیکس میں ہوں۔ میں بھیدی کے نام سے لوگوں کے پول کھولا کروں گا۔"

"ابے پاگل تو نہیں ہو گیا۔" ایک بوڑھے نے جھلا کر کہا۔

"نہیں بڑے میاں میں پاگل نہیں ہوا ہوں۔ بلکہ اس معاشرے کو سچ کا آئینہ دکھا رہا ہوں اور پہلا سچ یہ ہے کہ اس علاقے کا تھانے دار ایک بدمعاش آدمی ہے۔ اس نے اس علاقے کی ایک عورت سے تعلق قائم کر رکھا ہے۔"

"بکواس کیوں کر رہا ہے۔ نذیر حسین ایک اچھا آدمی ہے۔" دوسرا بوڑھا چلایا۔

"یہ تم کہہ رہے ہو نا۔ جبکہ سچائی یہ ہے کہ وہ راتوں کو چھپ کر اس عورت کے پاس آتا ہے۔"

"تو کیوں کسی پر بہتان لگا رہا ہے۔"

"بہتان نہیں ہے، یہ بھیدی کا پہلا انکشاف ہے۔ اس کے بعد تو میں لائن لگا دوں گا۔"

"چل یہ بتا، وہ کس کے پاس آتا ہے۔"

"اس کا نام سنو گے تو ہوش اُڑ جائیں گے۔"

"چل ہوش ہی اُڑا دے۔ بتا اس کا نام۔"

"سلمٰی خاتون کے پاس۔" میں نے انکشاف کر دیا۔

نظام الملک طوسی

ایران کے سلجوق فرمانروا کا مشہور وزیر 1017ء ۔ 1092ء مشہد سے 50 میل شمال کی جانب رذکان کے مقام پر پیدا ہوا۔ چاگر بیگ کے مشورے نے سلطان الپ ارسلان کا وزیر مقرر کرایا۔ 1067 میں بغداد میں مدرسہ نظامیہ قائم کیا جو اسلامی درس گاہ کے طور پر حامل شہرت ہوا۔ ملک شاہ کے بیس عہد حکومت میں سطروی طاقت اس کے ہاتھ رہی۔ اس کی تجویز پر 1074-75ء میں ہیئت دانوں کی کانفرنس طلب کی گئی اور انہیں ایرانی کلینڈروں کی اصلاح کی دعوت دی گئی اور جلالی کلینڈر رائج کیا جو انہی کے ایک بادشاہ جلال الدین ابوالفتوم ملک شاہ کے نام پر تھا۔ عمر کے آخری حصے میں وزارت سے برطرف ہوا۔ 1092ء میں حسن بن جام کے ایک فدائی کے ہاتھوں قتل ہوا۔

مرسلہ: رضا ہمدانی، ملتان

ایک لمحے کے لیے سناٹا ہوگیا۔ یہ انکشاف ہی ایسا تھا۔ میں ان لوگوں کی حیرت کو دیکھ کر خوش ہورہا تھا۔ اب مزہ آیا تھا وکی لیکس جیسا کام کرنے کا۔

''جھوٹ بولتے ہو تم!'' ایک آدمی زور سے چلّایا۔ ''شرم نہیں آتی ایسی بکواس کرتے ہوئے۔''

''یہ سچ ہے بھائی۔ تم اگر چاہو تو اس تھانے دار کو بھی بتاسکتے ہو۔'' میں نے کہا۔

اتفاق سے اس ہوٹل میں اس وقت تھانے دار کا سالا بھی موجود تھا۔ اس نے فوراً موبائل پر اس سے رابطہ کیا۔ ''بھائی صاحب، ذرا آپ یہاں ہمارے محلے میں آجائیں۔ ہاں ہاں بہت ایمرجنسی ہے۔''

''آرہے ہیں بھائی صاحب۔'' اس نے موبائل آن کرتے ہوئے کہا۔ ''جب تمہاری چھترول ہوگی تو سب پتا چل جائے گا۔''

''مجھے کوئی ڈر نہیں ہے بھائی، کیونکہ میں سچ کا جھنڈا لے کر اپنے سفر پہ نکلا ہوں۔''

تھانے دار اپنے قافلے کے ساتھ وہاں پہنچ گیا تھا۔

''کیا بات ہے۔'' اس نے اپنے سالے سے پوچھا۔ ''کیوں بلایا ہے تم نے، خیریت تو ہے؟''

''خیریت نہیں ہے بھائی صاحب۔'' سالے نے میری طرف اشارہ کیا۔ ''یہ لونڈا آپ پر الزام لگارہا ہے کہ آپ راتوں کو چھپ چھپ کر اس محلے کی کسی عورت سے ملنے کے لیے آتے ہیں۔''

تھانے دار نے خونخوار نگاہوں سے میری طرف دیکھا۔

''تھانے دار صاحب، اب چھپانے سے کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔'' اس وقت میں ایک لیڈر کی طرح بولنے لگا تھا۔ ''میرے پاس اس کا مکمل ثبوت ہے کہ آپ اس سے ملا کرتے ہیں۔''

تھانے دار غصے سے لرزنے لگا تھا۔ پھر اس نے شرمندہ نگاہوں سے اپنے سالے کی طرف دیکھا، پھر میری طرف دیکھ کر بولا۔ ''کم بخت انسان! میں نے یہ راز آج تک چھپایا ہوا تھا۔ تم نے اسے ظاہر کرکے میرے گھر میں آگ لگانے کی کوشش کی ہے۔''

''تو یہ الزام سچ ہے نا تھانے دار صاحب۔'' میں نے کہا۔

''لعنت ہو تجھ پر! یہ اس طرح سچ ہے کہ میں اس کے گھر جایا کرتا ہوں۔ نام بھی بتادیتا ہوں۔ تنظلی نام ہے اس کا۔ وہ بیوی ہے میری۔ ہم نے چھپ کر شادی کی ہے۔ کوئی گناہ نہیں کیا ہے۔ میں اسی لیے رات کے اندھیرے میں چھپ کر ملنے آتا تھا کہ تنویر نہ دیکھ لے۔ ہماری شادی کو دو برس ہوگئے ہیں۔ بہرحال اب تو نے یہ راز فاش کر ہی دیا ہے تو اپنی پہلی بیوی کو Face تو کروں گا لیکن تجھے نہیں چھوڑوں گا۔''

اچانک میرا دل جیسے ڈوبنے سا لگا تھا۔ آنکھوں کے آگے تارے رقص کرنے لگے تھے۔ میری انفارمیشن غلط تو نہیں تھی لیکن اس کا استعمال بہت غلط ہوا تھا۔

یہ سب اس کم بخت اکمل کی وجہ سے ہوا تھا۔ اگر وہ مکمل معلومات فراہم کردیتا تو اس میں کیا نقصان تھا۔ بہرحال اس کے بعد کی صورتِ حال میرے لیے بہت تشویشناک ہوگئی تھی۔ تھانے دار نے تھانے لے جاکر میری ٹھکائی کروادی تھی اور میں لنگڑاتا جھومتا ہوا اپنے گھر واپس آیا تھا۔

ایک ہفتے کے بعد طبیعت ٹھکانے آئی تو میں نے اکمل کو جا پکڑا۔ ''کم بخت تو نے میرے ساتھ یہ کیسا سلوک کیا۔ یہ کیسی خبر لاکردے دی۔''

''اب اس میں میرا کیا قصور ہوا ریاض بھائی۔ تم خود سوچو، تم نے بھی تو وہی دیکھا جو میں نے دیکھا تھا۔ اب اندر کی کہانی کچھ اور نکل آئے تو میں کیا کرسکتا ہوں۔''

میں نے غور کیا تو اس کا بھی قصور اتنا نہیں تھا۔ اس نے واقعی ایک واردات ہوتے ہوئے دیکھی تھی اور مجھے آکر بتادیا تھا۔

''ریاض بھائی، اب یہ بتاؤ سچ کا سفر جاری رکھنا ہے یا یہیں ختم کردینا ہے۔'' اس نے پوچھا۔

''بے وقوف انسان! یہ سفر ہمیشہ جاری رہے گا۔'' میں نے کہا۔ ''میں نے ابھی ہار نہیں مانی ہے۔''

''تو چلو، تمہارے لیے ایک خبر اور بھی ہے میرے پاس۔''

''نہیں، اب میں سچ کے سفر میں تجھے ساتھ لے کر نہیں چلوں گا۔'' میں نے کہا۔ ''مجھے خود ہی خبریں تلاش کرنی ہیں۔''

''تمہاری مرضی ریاض بھائی، لیکن یہ خبر ایسی ہے کہ اس کی وجہ سے تم راتوں رات وکی لیکس کی طرح مشہور ہوجاؤ گے۔ ہر طرف تمہارے نام کے ڈنکے بجیں گے۔''

''چل بتادے کیا خبر ہے؟''

''ریاض بھائی، یہ جو افضل حسین ہے نا۔''

''کون افضل حسین!''

''ارے وہی سیاست دان جو فلاں پارٹی میں ہے۔ اور آج کل الیکشن لڑنے کی تیاریاں کررہا ہے۔''

''ہاں ہاں سمجھ گیا۔ آگے بتاؤ۔''

''مجھے پہلے یہ بتاؤ، کیا وہ آدمی پورے ملک میں مشہور ہے یا نہیں۔'' اکمل نے پوچھا۔

''اسے کون نہیں جانتا۔ وہ پورے ملک میں شیطان کی طرح مشہور ہے۔'' میں نے کہا۔

''تو اب یہ سن لو کہ اس آدمی نے اپنے باپ کا خون کیا ہے۔'' اکمل نے بتایا۔ ''وہ قاتل ہے اپنے باپ کا۔''

''ابے کیا بکواس کررہا ہے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے۔''

''یہی تو بات ہے۔'' اکمل نے فاتحانہ انداز سے میری طرف دیکھا۔ ''یہ ایسی خبر ہے کہ جس کو لیک کرنے کے بعد تم خود وکی لیکس بن جاؤ گے۔''

''لیکن اس کا ثبوت کہاں سے لاؤں گا۔''

''ثبوت خود افضل حسین کا اعتراف ہوگا۔'' اس نے بتایا۔ ''تم خود اپنے کانوں سے سن لوگے کہ وہ اپنے مجرم ہونے کا اعتراف کررہا ہے۔ پھر تو مان لوگے نا۔''

''ظاہر ہے۔ اس کے بعد تو ماننا ہی پڑے گا۔'' میں نے کہا۔ ''لیکن یہ ہوگا کس طرح۔''

''تم آج شام کو میرے ساتھ قبرستان چلو گے تو سب معلوم ہوجائے گا۔'' اس نے بتایا۔ ''تیار رہنا، شام پانچ بجے میں تمہیں آکر لے جاؤں گا۔''

''کون سا قبرستان۔''

''پاپوش نگر والا۔'' اس نے کہا۔ ''یہ بھید تم پر وہیں ظاہر ہوگا۔''

''دیکھو، مروا مت دینا مجھے۔''

''ریاض بھائی، جب ایک آدمی خود اپنی زبان سے اعتراف کررہا ہوگا تو پھر تمہیں کیا پریشانی۔ تم تو پھر دھڑلے سے اس کا پول کھول سکتے ہو۔''

''ٹھیک ہے، میں تیار رہوں گا۔''

دوسرے دن شام پانچ بجے میں اکمل کے ساتھ پاپوش کے قبرستان پہنچ گیا جہاں ہر طرف پھیلی ہوئی قبروں کے کتبے دیکھ دیکھ کر خود اپنا انجام یاد آنے لگا تھا۔ انسان بھی کیا چیز ہے۔ جب تک زندہ رہتا ہے اس کے نخرے ہی ختم نہیں ہوتے۔ لیکن موت اسے خاک میں ملاکر رکھ دیتی

نعیم الخائم رضی اللہ عنہ

نعیم نام، لقب خائم، ہجرت سے قبل نویں یا دسویں مسلمان تھے۔ 6 ہجری میں کعبہ کے چالیس افراد کے ساتھ ہجرت کرکے مدینہ آئے، آپؐ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ میں نے جنت میں نعیم کی نحمہ (آواز) سنی ہے۔ اس وقت سے نحائم لقب پڑا۔ مدینے کی تمام غزوات میں حصہ لیا۔ خلیفہ اول حضرت ابوبکرؓ کے عہد کی جنگ اجنادین میں شہادت پائی۔ یہ جنگ جمادی الاول 13ھ میں ہوئی تھی۔ آپؓ نہایت حلیم، رحم پرور انسان تھے۔ یتیموں، مسکینوں، اور ایسے ہی طبقات کی اعانت کیا کرتے تھے۔

سلطان شیخ، چنیوٹ

نعیم رضی اللہ عنہ بن مسعود الثقفی

5ھ میں جنگ احزان کے موقع پر اسلام کے حوصلے پست کرنے کی خوب خوب تدابیر کیں، لیکن جنگ کی نوبت نہ آئی۔ اس کے بعد آپؓ اسلام لے آئے اور کئی جنگوں میں حصہ لیا۔ حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کی باہمی جنگ کے دوران آپؓ شہید ہوئے۔ آپ حضرت علی کے ساتھیوں میں سے تھے۔ آپؓ کے صاحبزادے حضرت مسلمؓ نے آپؓ سے کئی احادیث روایت کی ہے۔

مرسلہ: نعیم اختر، کراچی

نفخ صورہ

جو روزِ محشر کو حضرت اسرائیل پھونکیں گے۔ قرآن میں اس کے بارے میں ارشاد ہے کہ پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح اڑیں گے اور ہر چیز ریزہ ریزہ ہوکر بکھر جائے گی۔

مرسلہ: زاہد علی خاں نقشبندی، سرائے عالمگیر

ہے۔ اس کا وجود بس ایک فسانہ بن کر رہ جاتا ہے۔

"ریاض بھائی جس طرح ہمارے یہاں کی ٹریفک بے ڈھنگی ہے اس طرح قبریں بھی بے ڈھنگی ہیں۔" اکمل نے ایک قبر کو پھلانگتے ہوئے کہا۔ "خود دیکھ لو۔ کوئی ادھر لیٹا ہوا ہے، کسی کو اس کے اوپر ڈال دیا ہے۔ کوئی قبر راستے میں بنی ہوئی ہے، کوئی ترچھی ہے، کوئی......"

"یار، میں یہاں قبروں پر لیکچر سننے کے لیے نہیں آیا۔" میں نے کہا۔ "میں افضل حسین کے چکر میں آیا ہوں۔"

"وہ دیکھو سامنے۔" اکمل نے ایک پختہ قبر کی طرف اشارہ کیا۔ "وہ ہے افضل حسین کے باپ کی قبر۔"

"تو کیا مرنے والا اٹھ کر گواہی دے گا کہ اس کے بیٹے نے اس کا خون کیا ہے۔" میں نے غصے سے پوچھا۔

"ارے نہیں ریاض بھائی، خود افضل حسین آ کر گواہی دے گا۔ وہ ابھی آتا ہی ہوگا۔"

"کیا ضروری ہے کہ وہ آج بھی آ جائے۔"

"وہ روز آتا ہے۔" اکمل نے بتایا۔ "اس کا ضمیر اسے ملامت کرتا رہتا ہے۔ کہتے ہیں نا کہ خون سر چڑھ کر بولتا ہے۔ وہ دیکھو وہ آ رہا ہے۔ اب تم جلدی سے قریب کی کسی قبر پر فاتحہ پڑھنا شروع کر دو۔"

واقعی افضل حسین اپنے باپ کی قبر کی طرف چلا آ رہا تھا۔ میں اور اکمل اس کے باپ کی قبر سے کچھ فاصلے پر ایک اور قبر کے پاس کھڑے ہو گئے۔ ہم دونوں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیے تھے۔

افضل حسین نے اپنے باپ کی قبر پر... فاتحہ پڑھی۔ دعا کی، پھر زور زور سے بولنے لگا۔ "ابو، میں آپ کا قاتل ہوں۔ میں نے خون کیا ہے آپ کا۔ کاش میں نے ایسا نہ کیا ہوتا۔ اب میں تڑپ رہا ہوں ابو، سسک رہا ہوں۔ آپ کا لہو بول رہا ہے۔ میں قاتل ہوں آپ کا۔ مجھے معاف کر دیں ابو، معاف کر دیں۔"

اب کسی شک و شبے کی گنجائش ہی نہیں تھی۔ اتنے واضح ثبوت کے بعد اور کیا رہ جاتا تھا۔ افضل حسین اپنے باپ کا قاتل تھا۔ ایسی بات کوئی اور کہتا تو کون اس پر یقین کرتا۔ لیکن وہ خود ہی اقرار کر رہا تھا۔ خود ہی اعتراف کر رہا تھا۔ میں نے خود اپنے کانوں سے سنا تھا۔

بھیدی، بمقابلہ وکی لیکس زندہ باد! کیا خبر ملی تھی مجھے۔ اب میں اس نام نہاد محب وطن لیڈر کی دھجیاں بکھیر سکتا تھا۔ اس کو مجبور کر دیتا کہ وہ لوگوں کے سامنے اپنے اس جرم کا اعتراف کر لے۔

افضل حسین کچھ دیر بعد وہاں سے چلا گیا تھا۔ اس کے جانے کے بعد میں نے اکمل کو گلے سے لگا لیا۔ "یار، خوش رہ۔ کیا زبردست نیوز لے کر آیا ہے۔ تم نے پچھلی کسر بھی پوری کر دی۔ اب دیکھ لینا میں کیسی تیاری کرتا ہوں۔ زوردار خبر خاص انداز میں سامنے آئے گی۔"

"اب تو سب کچھ کلیئر ہے نا؟" اکمل نے پوچھا۔

"ہاں بھائی، بالکل کلیئر ہے۔ شیشے کی طرح۔"

"تو اپنا کام شروع کر دو۔"

کام شروع کرنے کے لیے سب سے بہتر مقام تھا افضل حسین کا وہ علاقہ جہاں سے وہ الیکشن کی تیاری کر رہا تھا۔ میں ایک فاتح اور جرأت مند سپہ سالار کی طرح جھومتا ہوا اس حلقے میں پہنچ گیا۔

یہ پڑھے لکھے لوگوں کا علاقہ تھا۔ یہاں کے مکینوں نے ایک لائبریری بھی بنا رکھی تھی جس کے برابر میں ایک لان تھا۔ یہاں اس علاقے کے معزز افراد آ کر بیٹھا کرتے تھے اور آنے والے الیکشن کے حوالے سے باتیں ہوتی تھیں۔ افضل حسین کی پوزیشن یہاں بہت مضبوط جا رہی تھی اور میں اسی مضبوطی کو برباد کرنے کے لیے آیا تھا۔

"حاضرین...!" میں نے اچانک ان کے درمیان پہنچ کر بولنا شروع کر دیا۔ "پلیز۔ آپ لوگ مجھے چندہ مانگنے والا یا منجن بیچنے والا نہ سمجھیں۔ بلکہ میں افضل حسین کی طرف سے آپ کی آنکھیں کھول دینے کے لیے آیا ہوں۔"

"کیا بولنا چاہتے ہو؟" ایک نے پوچھا۔

"میں یہ بتانے آیا ہوں کہ افضل حسین ایک قاتل ہے۔ خونی ہے۔" میں نے کہا۔ "اس آدمی نے اپنے باپ کا خون کیا ہے۔"

ایک لمحے کے لیے وہاں سناٹا چھا گیا تھا۔ ظاہر ہے سچ کا سناٹا ایسا ہی ہوتا ہے۔ انتہائی بے رحم۔ سانپ سونگھ جاتا ہے۔

"یہ نہیں ہو سکتا۔ تم بکواس کر رہے ہو۔" ایک آدمی زور سے چلایا۔

"آپ کے چیخنے سے حقیقت میں تبدیلی نہیں ہوگی۔" میں نے کہا۔ "یہ سچائی ہے اور میں نے خود افضل حسین کا اعتراف اپنے کانوں سے سنا ہے۔ آپ خود اندازہ لگائیں، کوئی شخص اتنی بڑی بات یوں ہی نہیں کہہ سکتا لیکن

میں کہہ رہا ہوں اور یوں ہی ہوا میں تیر نہیں چلا رہا، ایک اور گواہ بھی ہے، میں اسے بھی پیش کر سکتا ہوں۔"

"جوان! اگر یہ خبر درست ہے تو میں تمہارا ساتھ دینے کو تیار ہوں۔" ایک آدمی کھڑا ہو کر بولا۔ وہ یقیناً افضل حسین کا مخالف ہی معلوم ہو رہا تھا۔

"اگر یہ سچ ہے تو پھر تم ہمارے پاس کیوں آئے ہو۔ بھائی پولیس میں رپورٹ کرو۔" کسی نے کہا۔

"جی ہاں، میں نے بھی سوچا ہے۔" میں نے کہا۔ "لیکن مزہ تو جب ہے کہ سچ کے اس سفر میں آپ لوگ بھی میرا ساتھ دیں۔ میں پولیس تک جانے کے لیے تیار ہوں۔"

"نہیں، ہم لوگ اس چکر میں نہیں پڑنا چاہتے۔"

"لیکن میں تمہارا ساتھ دوں گا۔" وہی مخالف بولا۔ "اتنے برسوں میں ایک تو ملا جس نے اتنا بڑا سچ بولا ہے۔"

"کیا تم میرے ساتھ پولیس اسٹیشن چلنے کو تیار ہو؟" میں نے اس آدمی سے پوچھا۔

"کیوں نہیں۔ میں چل رہا ہوں تمہارے ساتھ۔ سانچ کو آنچ کیا ہے۔"

ویسے تو ہم دونوں ہی پولیس اسٹیشن کی طرف چلے تھے۔ لیکن تماشا دیکھنے کے لیے اچھا خاصا قافلہ ہمارے ساتھ ہو گیا تھا لیکن تھانے کے اندر ہم دونوں ہی گئے تھے۔

تھانے کا محرر ایک کرخت صورت انسان تھا۔ اس کو دیکھ کر ہی مجھے احساس ہونے لگا تھا کہ میں ایک بار پھر پھنس گیا ہوں۔

"ہاں بھئی، کیوں آئے ہو تم دونوں۔" محرر نے پوچھا۔

"میں نہیں جناب، صرف یہ آئے ہیں۔" میرے ساتھ آنے والے نے میری طرف اشارہ کر دیا۔ "میں تو صرف تماشا دیکھنے ساتھ چلا آیا ہوں۔"

"ہاں بھئی، کیا پرابلم ہے تمہارے ساتھ۔" محرر نے پوچھا۔

"جناب عالی میں ایک شخص کے خلاف پرچہ کٹوانے آیا ہوں۔" میں نے بتایا۔

"کس کے خلاف۔"

"افضل حسین کے خلاف۔" میں نے بتایا۔ "وہی جو اس علاقے سے الیکشن میں کھڑے ہو رہے ہیں۔"

"کیوں؟ کیا افضل صاحب سے کوئی ذاتی دشمنی ہے۔"

"جی نہیں، بات کچھ اور ہے۔"

"کیا مطلب۔" وہ غرایا۔ "پولیس والوں سے کھل کر بات کیا کرو۔"

"جناب، افضل حسین نے اپنے باپ کا خون کیا ہے۔ قاتل ہے اس کا۔"

"تمہیں کیسے معلوم۔ کیا تم نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔"

دیکھا نہیں سنا ہے' اس نے خود اپنے قاتل ہونے کا اعتراف کیا ہے۔" میں نے بتایا۔ "ایک اور گواہ بھی ہے۔ وقت پڑنے پر اس کو بھی پیش کردوں گا۔"

"واہ! یہ تو بہت زبردست کیس بنے گا۔ میں خود اس بندے کو پسند نہیں کرتا۔ اب ہاتھ ڈالنے کا موقع مل رہا ہے۔"

اس نے جلدی جلدی افضل حسین کے خلاف پرچہ کاٹا۔ میرے سائن' شناختی کارڈ وغیرہ کے نمبر لیے اور جانے کی اجازت دے دی۔

آپ سوچ سکتے ہیں اس کے بعد کیا ہوا ہوگا۔ ایک ہنگامہ برپا ہوگیا۔ افضل حسین کو گرفتار کرلیا گیا۔ یہ اور بات ہے کہ کچھ دیر بعد اس کی ضمانت بھی ہوگئی تھی۔ لیکن یہ مقدمہ قائم ہوگیا تھا۔ اخبار والوں کو ایک زبردست چانس مل گیا۔ انہوں نے سرخیاں لگانی شروع کردیں۔ اور بھیدی اس طرح مشہور ہوگیا جس طرح وکی لیکس ہوا تھا۔ بالآخر عدالت میں ہمیں طلب کرلیا گیا۔

اب مجھے وہاں اپنے سچ کا ثبوت دینا تھا۔ ایک طرف افضل حسین کھڑا تھا اور دوسری طرف میں۔

"کیا تمہارے پاس کوئی ثبوت ہے کہ افضل حسین نے اپنے باپ کا خون کیا ہے۔"

"جی جناب! اس کا اعتراف خود میں نے اپنے کانوں سے سنا ہے' بلکہ اس اعتراف کا ایک گواہ بھی عدالت میں موجود ہے۔" میری مراد اکمل سے تھی۔

"جناب عالی! یہ آدمی پاگل معلوم ہوتا ہے۔" افضل حسین نے کہا۔ "میرے باپ کی موت کینسر سے ہوئی ہے۔ پورا ہاسپٹل گواہ ہے۔ وہ تین مہینوں تک ہاسپٹل میں رہا ہے۔ میڈیکل رپورٹس میں اپنے ساتھ لے کر آیا ہوں۔ اس کے علاوہ پورا شہر اس بات کو جانتا ہے۔"

یہ سن کر میرے تو ہوش اُڑنے لگے تھے۔ میں نے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے عدالت سے کہا۔ "جناب عالی اگر ایسا ہے تو پھر اس شخص سے معلوم کریں کہ یہ اپنے باپ کی قبر پر جا کر اپنے باپ کے قتل کا اعتراف کیوں کرتا ہے۔"

"جناب عالی اس آدمی پر لعنت ہو۔ یہ تو میں اس لیے خود کو اپنے باپ کا قاتل سمجھتا ہوں کہ میرا باپ ایک حکیم سے اپنے کینسر کا علاج کروانا چاہتا تھا۔ جبکہ میں نے اسے اس کی مرضی کے خلاف شہر کے سب سے مہنگے ہاسپٹل میں ڈال دیا تھا۔ بس یہ احساسِ پشیمانی ہے جس کی وجہ سے میں خود کو اپنے باپ کا قاتل سمجھتا ہوں اور اس کی قبر پر جا کر اس سے معافیاں مانگتا ہوں۔"

میں نے قہر آلود نگاہوں سے اکمل کی طرف دیکھا۔ لیکن وہ اتنی دیر میں عدالت سے کھسک چکا تھا۔ اب رہ گیا تھا میں' سو بڑی آسانی کے ساتھ مجھے وہیں عدالت ہی میں گرفتار کرلیا گیا۔

چونکہ میں نے ایک معزز شخص پر الزام لگا کر اس کو بدنام کیا تھا۔ اس لیے اس جرم میں مجھے سزا سنا دی گئی ہے۔ یہ بھیدی والا خواب دھرا رہ گیا ہے۔ میرا وکی لیکس اپنی موت آپ مرچکا ہے۔

اس سے یہ بات ثابت ہوچکی ہے کہ سچ کا سفر کتنا خطرناک ہوتا ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ میں نے غلط لوگوں پر ہاتھ ڈالا۔ وہ ایسے لوگ تھے جو بے گناہ تھے۔ میری حماقت یا غلط فہمی نے ان کے بارے میں کیسے کیسے افسانے تراش دیے تھے۔ لیکن اس ملک میں بے شمار گناہگار بھی تو ہیں جن کے بھیانک راز ہم سب کے سامنے آچکے ہیں۔ لیکن آپ ایمان سے بتائیں کیا ان کا کوئی نقصان ہوا؟

ہرگز نہیں! اور ہو بھی نہیں سکتا۔ کم از کم اس وقت تک جب تک ہمارے یہاں ہر دور ہر عہد میں ایک وکی لیکس پیدا نہیں ہوجاتا۔

ہوسکتا ہے کہ میرے انجام سے آپ نے اگر بھیدی ہونے کا سوچ رکھا ہو تو میری کہانی پڑھ کر پیچھے ہٹ جائیں۔ نہیں ایسا نہ کریں۔ سچ بولتے رہیں' بولتے رہیں اور بولتے رہیں۔ کبھی نہ کبھی تو سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔ کیا خیال ہے۔

وکی لیکس زندہ باد۔ جولین آسانج زندہ باد اور وہ تمام لوگ زندہ باد جو بھیدی بننے کے مرحلے سے گزر رہے ہیں۔

کوچوان

جناب ایڈیٹر سرگزشت
السلام علیکم!
میں اپنے ایک واقف کار کی سرگزشت کے ساتھ حاضر ہوں۔ یہ روداد نہیں آئینہ ہے۔ اس میں ہر کوئی اپنا چہرہ دیکھ کر اپنا احتساب کرے کہ کہیں وہ خود بھی تو ڈاکٹر کی طرح غلط راستے پر نہیں چل رہا ہے۔

منشی عزیز مٹے
(لڈن ،وہاڑی)

وہ گرمیوں کے دن تھے۔ غالباً مئی کی آخری تاریخیں تھیں، جب یہ واقعہ پیش آیا۔ ڈاکٹر نصیر اللہ گجر اپنے ذاتی اسپتال میں بیٹھے مریضوں کا چیک اپ کررہے تھے جب ایک دیہاتی شخص ہانپتا ہوا ان کے اسپتال پہنچا۔ ڈاکٹر نصیر کوئی عام ڈاکٹر تو نہ تھے۔ ان تک پہنچنے کے لیے پہلے ان کے کمپاؤنڈر سے نمبر لینا پڑتا تھا اور ہر مریض اپنی باری آنے پر ہی ان سے ملاقات کرسکتا تھا۔ لیکن اس دیہاتی کو، جس کا نام جان محمد تھا، کوئی ایمرجنسی تھی جو وہ بھاگتے ہوئے ڈاکٹر

صاحب تک جا پہنچا۔ ڈاکٹر صاحب کے پاس کام کرنے والا ملازم اسے روکتا رہ گیا لیکن جان محمد، ڈاکٹر نصیر اللہ کے کمرے میں پہنچ ہی گیا۔

"ڈاکٹر صاحب! ڈاکٹر صاحب!" وہ چلّایا "ڈاکٹر صاحب! میری بھابی کو بچا لیجیے۔"

تب تک ڈاکٹر نصیر اللہ کا کمپاؤنڈر جاوید اور دوسرا ملازم شریف دونوں اندر پہنچے اور انہوں نے جان محمد کو پکڑ کر اسے باہر نکالنا چاہا لیکن وہ ہاتھ جوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ "ڈاکٹر صاحب! آپ کو خدا کا واسطہ میری بھابی درد سے تڑپ رہی ہیں۔ خدا کے لیے آپ ان کا علاج کیجیے۔"

ڈاکٹر نصیر اللہ کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات واضح تھے لیکن انہوں نے اپنے ملازموں کو ہاتھ کے اشارے سے روک لیا۔ "کیا بات ہے، اطمینان سے بتاؤ؟" ڈاکٹر صاحب نے اپنے جذبات چھپاتے ہوئے جان محمد سے پوچھا۔

"ڈاکٹر صاحب! میں اُدھر بستی لعل شاہ سے آیا ہوں۔" جان محمد نامی وہ شخص ہاتھ جوڑ کر کھڑا تھا۔

"میری بڑی بھابی بہت تکلیف میں ہے۔ اس کو دورے پڑتے ہیں اور درد کی شدت سے وہ سر پیچ پیچ کر ٹکریں مارتی ہے۔ آپ جلدی چلیے آپ کی مہربانی ہوگی۔"

"دیکھو! پہلی بات تو یہ ہے۔" ڈاکٹر صاحب نے اسے سمجھانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ "یہاں اسپتال میں میرے مریض موجود ہیں اور میں انہیں چیک کیے بغیر نہیں جا سکتا، دوسری بات یہ ہے کہ تم اپنے مریض کو یہاں اسپتال لے آؤ تو بہتر علاج ہوگا۔"

"ڈاکٹر صاحب! بھابی کی حالت ایسی نہیں ہے کہ انہیں یہاں لایا جا سکے۔" جان محمد نے کہا۔ "آپ مہربانی کیجیے، میرے ساتھ چلیے، گھنٹے دو تک آپ واپس آ جائیں گے تب تک آپ کے یہ مریض آپ کا انتظار کر سکتے ہیں۔ کیونکہ یہاں کوئی ایمرجنسی والا مریض مجھے نظر نہیں آ رہا ہے اور میری بھابی کی حالت بہت سیریس ہے۔"

ڈاکٹر نصیر اللہ کے کمرے میں موجود مریض حیرت اور دلچسپی کے ملے جلے تاثرات کے ساتھ ڈاکٹر نصیر اللہ اور جان محمد کی بات چیت سن رہے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے معذرت کر کے اس مریض کو عارضی طور پر کمرے سے باہر بھیج دیا اور پھر جان محمد سے مخاطب ہوئے۔ "دیکھو بھئی! مانا کہ تمہارے مریض کی حالت سیریس ہے لیکن میرے بھی کچھ اصول ہیں۔ میں یہاں اپنے اسپتال میں آئے ہوئے مریضوں کو چھوڑ کر تمہارے ساتھ چلتا ہوں لیکن اس طرح میری "فیس" ڈبل ہو جائے گی۔"

"ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب!" جان محمد منمنایا "فیس آپ بے شک جتنی مرضی لے لیں، بس میری بھابی کو بچا لیں۔"

"اچھا ٹھیک ہے، میں چلتا ہوں تمہارے ساتھ۔" ڈاکٹر صاحب نے کہا اور میز کے ساتھ لگی ہوئی گھنٹی کا بٹن دبایا۔ تھوڑی ہی دیر میں کمپاؤنڈر جاوید آ پہنچا۔

"جی ڈاکٹر صاحب؟" جاوید نے پوچھا تو ڈاکٹر نے اسے اسپتال میں موجود مریضوں سے متعلق مختلف ہدایات دیں۔ پھر کچھ سامان اپنے بیگ میں رکھنے کو کہا اور پھر جان محمد سے مخاطب ہو کر بولا، باہر میرا ملازم شریف بیٹھا ہے، اسے کہو کوئی تانگا پکڑ کر لے آئے۔"

جان محمد تیزی سے باہر دوڑا اور شریف سے تانگا لانے کا کہہ کر فوراً ہی واپس ڈاکٹر نصیر اللہ کے کمرے میں جا پہنچا۔ یوں محسوس ہوتا تھا کہ گویا اسے ڈر ہو کہ مبادا ڈاکٹر صاحب اپنا ارادہ نہ بدل لیں۔ لیکن ایسا کچھ نہیں ہوا۔ ڈاکٹر صاحب اپنا بیگ اٹھانے لگے تو جان محمد نے جلدی سے وہ بیگ ان کے ہاتھ سے لے لیا اور ڈاکٹر صاحب کے ہمراہ باہر گیٹ کی طرف چل دیا۔

"تم لعل شاہ سے پیدل ہی آئے ہو؟" باہر آتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے پوچھا۔

"نہیں ڈاکٹر صاحب!" جان محمد نے کہا۔ "میں تو پیدل ہی آ رہا تھا لیکن پیچھے سے بستی کا ایک اور شخص فیض کمہار اپنی بائیسکل پر شہر کی طرف آ رہا تھا تو میں اسی کے ساتھ ہی سائیکل پر بیٹھ گیا۔"

باتیں کرتے ہوئے وہ اسپتال سے باہر آ گئے۔ جہاں ایک تانگے والا ان کا انتظار کر رہا تھا۔ رواج کے مطابق ڈاکٹر صاحب تانگے کی اگلی سیٹ پر بیٹھے اور جان محمد ان کا بیگ تھامے پچھلی سیٹ پر بیٹھ گیا۔ کوچوان نے چلنے کی اجازت چاہی "چلیں جی؟"

"ہاں بھئی چلو لیکن ذرا آرام سے۔" ڈاکٹر صاحب نے کوچوان سے کہا تو اس نے تانگا چلا دیا۔

"کہاں جانا ہے جی؟" تانگے والے نے پوچھا تو ڈاکٹر نصیر اللہ سے پہلے جان محمد بول پڑا۔

"بستی لعل شاہ لے چلو۔"

"اچھا" کوچوان نے طمانیت سے سر ہلا دیا۔

"یہاں سے کتنی دور ہے یہ بستی؟" ڈاکٹر صاحب نے پوچھا۔

کوچوان نے جواب دیا۔ "جناب شہر سے کم و بیش آٹھ نو میل کا فاصلہ ہوگا۔"

"راستہ تو پختہ ہے ناں؟" ڈاکٹر صاحب نے پھر سوال کیا۔

"نہیں جناب، کچی پگڈنڈی نما سڑک ہے۔" کوچوان نے جواب دیا تو ڈاکٹر صاحب کے چہرے کے تاثرات بدل گئے اور وہ خاموش ہو کر اپنے ماضی میں پہنچ گئے جب ان کی ماں وقت پر مناسب دوا نہ مل سکنے کے سبب اللہ کو پیاری ہو گئی تھی۔ وہ اس وقت چھٹی کلاس میں پڑھتے تھے۔ ماں کے مرنے کے بعد نصیر اللہ نے دل میں پختہ عزم کر لیا تھا کہ بڑے ہو کر ڈاکٹر بنیں گے اور انسانیت کی خدمت کریں گے۔

"اونہہ خدمت......" ان کے چہرے پر طنزیہ مسکراہٹ تھی۔

اپنی ہاؤس جاب مکمل کر لینے کے بعد ان کی ڈیوٹی، گھر سے تقریباً چالیس کلومیٹر دور ایک سرکاری اسپتال میں لگی جہاں وہ ایمانداری اور جانفشانی سے اپنا کام کرتے تھے۔

وقت گزرتا رہا۔ ڈاکٹر نصیر اللہ نے اپنے علاقے میں اپنا پرائیویٹ کلینک بنوا لیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھ میں شفا رکھی تھی۔ مریض روتے ہوئے آتے تھے اور ہنستے مسکراتے واپس جاتے تھے۔ وقت کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر نصیر کی سوچ بھی بدلتی گئی۔ پہلے تو انہوں نے "فیس" والا کام نہیں رکھا تھا لیکن جب تھوڑا کام چل نکلا تو دو سو روپے چیک اپ فیس کے طور پر فی مریض وصول کرنے لگے لیکن مریض تھے کہ کم ہونے کا نام ہی نہ لیتے تھے۔ ہر وقت ان کے پرائیویٹ کلینک پر مریضوں کا ہجوم رہتا۔ سرکاری ڈیوٹی کے دوران جو مریض ان کے پاس جاتے، ان مریضوں کو بھی وہ یہی سبق دیتے کہ "شام کو میرے پرائیویٹ کلینک چلے آنا، وہاں اطمینان اور تسلی بخش علاج ہوگا تمہارا۔" اور پھر مریض بے چارے کو "اچھے علاج" کی خاطر ان کے پرائیویٹ کلینک جانا پڑتا۔

وقت کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر کی "چیک اپ فیس" میں بھی اضافہ ہوتا گیا اور ان کی دولت میں بھی۔ انہوں نے اپنے کلینک کے ساتھ والی زمین بھی خرید لی تھی اور ایک بہت بڑے پرائیویٹ اسپتال کا سپنا پورا کرنے کو

غزوہ نضیر

یہ جنگ 4ھ میں جنگ احد کے چھ ماہ بعد بنو نضیر کے یہود سے لڑی گئی۔ جنگ کا پس منظر یہ ہے کہ عمرو بن امیہ نے بنی عامر کے دو افراد کو قتل کر دیا۔ خراج دینے کے لیے حضرت علیؓ حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ کے ہمراہ گئے تاکہ خون بہا دیا جا سکے، نضیر نے آپؐ کو سایہ دیوار میں بٹھایا۔ بعد میں انہوں نے پتھر پھینک کر آپؐ کے قتل کا قصد کیا۔ وحی الٰہی نے آگاہی دی اور آپؐ خاموشی سے اٹھ کر چلے آئے۔ بعد میں تینوں صحابہ کرام بھی کافی دیر انتظار کر کے واپس آ گئے۔

بعد میں محمد بن مسلمہؓ کو بھیجا کہ وعدہ خلافی اور دغابازی کے الزام میں دس دنوں میں شہر خالی کر دیں۔ بنو نضیر مایوس ہو کر شہر سے جانے والے تھے کہ منافقین نے ورغلایا اور 2000 ہزار افراد کی امداد کا یقین دلایا۔ جس پر بنو نضیر نے شہر خالی کرنے سے انکار کر دیا۔ آپؐ نے ایک اور معاہدہ کی پیش کش کی، وہ نہ مانے۔ آپؐ نے عبداللہ بن ام کلثوم کو مدینہ کا امیر بنا کر خود جنگ کے لیے نکلے۔ یہود قلعہ بند ہو گئے۔ پندرہ یوم تک محاصرہ جاری رہا۔ اس دوران آپؐ نے تمام وہ درخت جو ان کو پھل دیتے تھے کاٹ دینے کا حکم دیا۔ ان پر رعب پڑا اور شہر چھوڑ دینے کی اجازت چاہی۔ آپؐ نے جلاوطن ہونے کی درخواست منظور کرتے ہوئے اجازت دے دی کہ جتنا مال اپنے اونٹوں پر لے جانا ہو لے جا سکتے ہو تاہم اسلحہ لادنے کی اجازت نہ تھی۔ چنانچہ یہ وہاں سے خیبر اور حرا میں منتقل ہو گئے۔ جاتے جاتے انہوں نے اپنے تمام مکانات جلا دیے کہ وہ ان مکانوں میں مسلمانوں کی رہائش برداشت نہیں کر سکتے۔ سورہ حشر اسی واقعہ سے متعلق ہے اور اس میں بنو نضیر کی غداری، منافقین کا کردار، درخت کاٹنے کا حکم، مال غنیمت کا مصرف اور بہت سی ہدایات درج ہیں۔

مرسلہ: نعمت اللہ محسود، لاہور

جارہے تھے۔

تانگا اب کچی سڑک پر چل رہا تھا جس میں جابجا چھوٹے بڑے گڑھے تھے۔ ایسے ہی ایک گڑھے میں تانگا پہنچا تو ڈاکٹر صاحب درد کی شدت سے ''آہ'' بھر کر رہ گئے اور ماضی سے حال میں پہنچ گئے۔

''ابھی کتنی دور ہے تمہاری بستی لعل شاہ؟'' ڈاکٹر نصیر اللہ نے پیچھے بیٹھے جان محمد سے پوچھا۔

''حضور! ابھی تو ہم نے آدھا سفر طے کیا ہے۔'' جان محمد نے کہا۔

اس سے پہلے کہ وہ کوئی اور بات کرتے، تانگے والا چلّایا ''بچ کے بھائی!''

''روکو، روکو، تانگا روکو۔'' کوئی شخص چلّا رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے آگے کی طرف دیکھا، جان محمد نے بھی گردن ٹیڑھی کر کے آگے کی جانب دیکھا اور پھر فوراً بیگ سمیت تانگے سے نیچے چھلانگ لگا دی۔ تانگا رک چکا تھا۔ آگے بائیسکل پر دو شخص تھے جو کہ تانگے سے تھوڑا آگے کچی سڑک پہ نیچے گر گئے تھے۔ سائیکل چلانے والا غالباً کوئی ''کچا ڈرائیور'' تھا جو کہ بائیسکل کو کنٹرول نہیں کر سکا تھا۔

جان محمد نے بیگ ایک طرف رکھا اور تیزی سے ان کی طرف لپکا۔ ''ہاشم بھائی! خیریت تو ہے؟'' اس نے بائیسکل سوار کو اٹھاتے ہوئے پوچھا۔

''جانو میاں! اب ڈاکٹر کی ضرورت نہیں رہی۔'' ہاشم نامی اس شخص نے جان محمد کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے اسے دلاسا دیا۔ ''تمہاری بھابی اب وہاں جا چکی ہے، جہاں کسی ڈاکٹر کی، کسی دوائی کی کوئی ضرورت ہی نہیں پڑتی۔''

''نہیں! یہ نہیں ہو سکتا۔'' جان محمد زمین پر بیٹھتا چلا گیا۔

ڈاکٹر نصیر اللہ ساری بات سمجھ چکا تھا۔ ہاشم جان محمد کا ہمسایہ تھا اور اسی کام کے لیے گاؤں والوں نے بھیجا تھا کہ ڈاکٹر صاحب کو آنے سے روک دیا جائے۔

''صبر کرو! جان محمد، رب کی یہی رضا ہے۔'' ہاشم روتے ہوئے جان محمد کو تسلی دے رہا تھا۔ ''تم نے تو اپنی طرف سے خدمت میں کوئی کمی نہیں چھوڑی، علاج معالجہ بھی بہت کروایا۔ لیکن موت کو بھلا کون ٹال سکتا ہے؟''

ڈاکٹر نصیر اللہ نے کچھ دیر تو انتظار کیا۔ پھر ان کی برداشت جواب دے گئی۔ انہوں نے جان محمد سے کہا۔

''جانو میاں! بھابی تمہاری تو اللہ کو پیاری ہو گئی۔ میری فیس تو دے دو تاکہ میں واپس جا کر 'انسانیت' کی خدمت کر سکوں۔''

ڈاکٹر صاحب کے منہ سے فیس کا سن کر ہاشم اور جان محمد کے ساتھ ساتھ کوچوان بھی حیران رہ گیا۔ ''یہ ڈاکٹر ہے یا قصاب؟'' اس نے سوچا لیکن خاموش رہا۔

ان تین دیہاتیوں کی منت سماجت پر ڈاکٹر صاحب نے اتنی رعایت کی کہ صرف سنگل فیس لینے پر اکتفا کیا جو کہ تین سو روپے تھی۔ فیس جیب میں ڈال کر ڈاکٹر صاحب تانگے پر سوار ہوئے اور تانگا واپس موڑنے کو کہا۔ اپنے اسپتال کے گیٹ پر تانگے سے اتر کر انہوں نے جیب سے دس روپے نکالے اور تانگے والے کو دینا چاہے۔ لیکن تانگے والے نے کہا۔ ''میرا کرایہ پانچ سو روپے بنتا ہے۔''

''کیا؟'' ڈاکٹر صاحب کی چیخ نکل گئی۔ ''تم باؤلے تو نہیں ہو گئے۔ اتنے سے سفر کا کرایہ پانچ سو روپے؟''

''جی ہاں!'' تانگے والے کا لہجہ تیز ہو گیا۔ شور سن کر کافی سارے لوگ جمع ہو گئے۔ تانگے والا شاید غصے میں تھا۔ اس نے لوگوں کو ساری بات بتائی اور پھر کہا۔ ''اگر ڈاکٹر صاحب بغیر معائنہ کیے، ایک مرے ہوئے مریض کے لواحقین سے فیس کے طور پر تین سو روپے لے سکتا ہے تو میں کرائے کی مد میں پانچ سو کیوں نہیں لے سکتا؟''

''شاباش!'' سبھی لوگوں نے اسے سراہا۔ ڈاکٹر نصیر اللہ نے خاموشی سے جیب سے پانچ سو روپے نکال کر کوچوان کو تھمائے اور تیزی سے اپنے اسپتال کے اندر چلے گئے۔ وہ کوچوان اسی وقت واپس بستی لعل شاہ کی طرف گیا اور جان محمد کو اس کے تین سو روپے واپس کر آیا۔

ڈاکٹر نصیر اللہ کی آنکھیں کھل چکی تھیں۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں ہدایت دی۔ انہوں نے بڑے اسپتال والا سپنا اس طرح پورا کیا کہ وہ تمام زمین ایک مدرسے کو دے دی اور اس کے بعد آج تک کسی مریض سے فیس نہیں لی۔ یہ واقعہ پچیس سال پرانا ہے۔ ڈاکٹر نصیر اللہ اس وقت بھی زندہ ہیں اور صحیح معنوں میں انسانیت کی خدمت کر رہے ہیں وہ کہتے ہیں ''وہ کوچوان میرا محسن ہے جو کہ مجھے راہِ راست پہ لے آیا۔'' اور وہ ''محسن'' میرے دوست کے والد تھے۔

مادرِ وطن

محترمہ عذرا رسول

سلامِ تہنیت!

زندگی میں پہلی بار میں نے اتنی بڑی تحریر لکھی ہے، ایک فوجی کی بیوی ہونے کے ناتے میں نے پاکستان کے کئی علاقے دیکھے ہیں۔ فوجیوں کے بارے میں لوگوں کے تاثرات بھی سنے ہیں۔ میری یہ کہانی شاید کسی کے دل کو بھا جائے۔

ثانیہ

(راولپنڈی)

مجھے آرمی پسند نہیں تھی۔ ان معنوں میں نہیں جن معنوں میں اس ملک کے بہت سے لوگ ناپسند کرتے ہیں کیونکہ ان کے ذہنوں میں آرمی سے متعلق وہ خیالات بسے ہوئے ہیں جو مغرب زدہ طبقے نے جان بوجھ کر پھیلائے ہیں۔ گزشتہ دس سال سے ملک بھر میں ہنگامے کی فضا پھیلی ہے، آئے دن بم دھماکے، خودکش حملے اور قتل و غارت گری معمول بن گیا ہے۔ فوج پر بھی حملے ہونے لگے ہیں۔ کبھی شہروں میں اور کبھی شمال میں جہاں شورش ہے۔ ہمارے

فوجی جوان اور افسران شہید ہوتے ہیں۔ ٹی وی پر ان کے اہلِ خانہ بیوی بچوں، ماں باپ اور بہن بھائیوں کو دکھایا جاتا ہے۔ ان کے تاثرات ان کے دکھ اور ان کے آنسو دکھائے جاتے ہیں تو میرا دل بہت خراب ہوتا تھا۔ اس لیے مجھے فوج کا شعبہ پسند نہیں تھا جہاں ہر وقت آدمی کی جان کو خطرہ ہو اور دوسری طرف اس کے گھر والوں، خاص طور سے بیوی کی جان سولی پر لگی رہے۔ اس لیے میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا کہ میری شادی کسی آرمی آفیسر سے ہوگی۔

لیکن میری شادی آرمی آفیسر سے ہوئی، مزے کی بات یہ ہے کہ کیپٹن علی احمد سے شادی پسند کی تھی۔ میرا تعلق لاہور کی ایک پوش فیملی سے ہے۔ پاپا زمیندار ہیں اور قصور میں ہماری وسیع زمین ہے۔ لیکن ہمارا قیام لاہور میں ہے اور یہیں کالج کی ایک تقریب میں میری ملاقات کیپٹن علی احمد سے ہوئی۔ ہمارے کالج کی طرف سے شمالی علاقے میں جنگ سے متاثر افراد کی مدد کے لیے کیمپ لگا تھا۔ اس میں جمع کیا جانے والا سامان آرمی کے توسط سے وہاں بھیجا جاتا۔ علی اس کیمپ میں کوارڈینیشن کے لیے آئے تھے۔ دو دن اس کیمپ میں علی سے ملاقات ہوتی رہی اور جب کیمپ ختم ہوا اور میں اس شام واپس گھر آئی تو مجھے لگا کہ میرے وجود کا کوئی حصہ وہیں رہ گیا ہے۔ اس وقت میں سمجھی نہیں تھی۔ بائیس سال کی عمر میچور ہوتی ہے لیکن پھر بھی بہت سی باتیں تجربے سے سمجھ میں آتی ہیں۔ اگلے دن جب میرے سیل فون پر ایک اجنبی نمبر سے کال آئی اور میں نے کال ریسیو کی تو علی کی آواز سن کر میرا دل تیزی سے دھڑکنے لگا تھا۔ انہوں نے پہلے معذرت کی۔

''سوری، میں نے آپ کا نمبر آپ سے پوچھے بغیر حاصل کیا ہے۔''

''وہ کیسے؟'' میں نے کہا۔ ''اس میں سوری کی کیا بات ہے آپ نے کسی وجہ سے ہی نمبر حاصل کیا ہوگا۔''

''ہاں میں آپ سے بات کرنا اور آپ کی آواز سننا چاہتا تھا۔''

میرے دل کی دھڑکن تیز ہونے لگی۔ ''کیوں؟''

''میں نہیں جانتا۔'' انہوں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''میں قسم کھا کر کہتا ہوں میرے ذہن میں کوئی خیال نہیں تھا لیکن جب میں واپس آیا تو مجھے لگا کہ میرے جسم کا کوئی حصہ وہیں کالج میں رہ گیا ہے۔''

''مجھے بھی ایسا ہی لگا۔'' میں نے بے ساختہ کہا اور پھر بوکھلا کر فون بند کر دیا۔ میرا تعلق جس فیملی اور سوسائٹی سے ہے اس کی وجہ سے میں فطری طور پر بولڈ ہوں۔ لڑکوں اور مردوں سے بغیر کسی جھجک کے بات کر لیتی ہوں۔ عام لڑکیوں کی طرح شرماتی نہیں ہوں۔ لیکن اس وقت مجھے ایسی شرم آئی کہ پسینے پسینے ہوگئی۔ میں اپنی فطری بولڈنیس میں بول گئی تھی۔ علی نے پھر کال کی لیکن مجھ سے ریسیو نہیں کی گئی۔ میں نے میسج کیا۔ ''پلیز ابھی مجھ سے بات نہیں ہو گی۔''

''اوکے میں پھر کال کر سکتا ہوں؟'' انہوں نے ایس ایم ایس پر پوچھا۔

''ہاں لیکن ابھی نہیں۔'' میں نے جواب دیا۔

میری فیملی بڑی ہے۔ چھ بھائی اور تین بہنیں۔ میرا نمبر آٹھواں ہے۔ مجھ سے چھوٹا ایک بھائی ہے۔ بس ہم دونوں رہ گئے تھے ورنہ سب کی شادی ہو چکی تھی۔ پاپا اور ماما نے آزادی دی تھی لیکن ساتھ ہی ہمیں حدود بھی سمجھا دی تھیں۔ کچھ چیزیں انہوں نے اپنے ہاتھ میں رکھی تھیں اور ان میں سے ایک شادی کا اختیار تھا۔ ہم کسی کو پسند کر سکتے تھے لیکن حتمی فیصلہ ماما اور پاپا نے کرنا ہوتا تھا۔ میرے دو بھائیوں کی پسند سے شادی ہوئی مگر اس وقت جب پاپا اور ماما نے ہاں کی۔ ایک اور بھائی نے بھی اپنی پسند سے شادی کرنا چاہی لیکن یہاں ماما اور پاپا نے ہاں نہیں کی اور ان کی شادی وہاں نہیں ہو سکی۔ یہ آزادی ہم بیٹیوں کو بھی تھی لیکن اتفاق کی بات ہے مجھ سے بڑی دونوں بہنوں نے ماما پاپا کی مرضی سے شادی کی اور اب وہ اپنے گھر میں خوش تھیں۔ تین بڑے بھائی اپنی فیملیوں سمیت حویلی میں رہتے تھے۔ وہ زمین کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ ایک شادی شدہ بھائی لاہور میں تھے۔ پاپا نے یہاں آٹو شوروم کا بزنس بھی کر رکھا تھا اور یہ بھائی یہاں پاپا کے ساتھ شامل تھے۔ میں اور مجھ سے چھوٹا احد ابھی پڑھ رہے تھے۔ میرا ماسٹر کا آخری سال تھا۔ میں سوشیالوجی میں ماسٹر کر رہی تھی۔ ماما کا خیال تھا کہ اس کے فوری بعد میری بھی شادی کر دی جائے اور انہوں نے ابھی سے متوقع رشتوں کی چھان بین شروع کر دی تھی۔

میں نے نہیں سوچا تھا کہ میں پسند کی شادی کروں گی۔ میں نے بتایا کہ آزادی کے باوجود ہمارے گھر میں وہ مادر پدر آزاد ماحول نہیں تھا جس میں ہر لڑکی کا کوئی بوائے فرینڈ لازمی ہو۔ میری کالج اور اس سے ہٹ کر بھی جن لڑکوں سے بات چیت تھی تو وہ بھی ایک حد میں تھی۔ اس میں جنس کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔ یہ پہلی بار تھا جب میں نے کسی لڑکے کے بارے میں یوں سوچا۔ اس وقت بھی مجھے نہیں معلوم تھا کہ میرے اندر کیا تبدیلی آئی ہے۔ اگر علی مجھے کال نہ کرتا تو شاید میں کبھی نہ جان پاتی۔ اب میں جان گئی تھی کہ میں کیا کالج میں چھوڑ آئی تھی۔ علی کی کال اگلے دن آئی۔ شام کا وقت تھا اور میں لان میں لگے صوفہ نما جھولے پر بیٹھی کامک بک دیکھ رہی تھی۔ مجھے کامک کا شوق تھا اور میں نے بعض سیریز مستقل لی ہوئی تھیں۔ یہ ساری کی ساری باہر سے آتی تھیں اس لیے مجھے دیر سے ملتی تھیں۔ کامک بکس کے چکر میں میرا ہر دوسرے تیسرے دن بک اسٹور کا چکر لگتا تھا۔

بیل بجی تو علی کا نام دیکھ کر میرا دل دھڑک اٹھا تھا۔ علی کا نمبر میں نے محفوظ کر لیا تھا۔ کال ریسیو کر کے میں نے بہ مشکل کہا۔ ''ہیلو.....''

''ثانیہ..... کیسی ہیں آپ؟''

''میں ٹھیک ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''آپ کیسے ہیں؟''

''چند دن پہلے تک تو ٹھیک تھا لیکن اب کچھ گڑبڑ ہے۔''

''پلیز.....'' میں نے یوں گھبرا کر کہا جیسے کوئی میری بات سن لے گا۔

''ثانی میں سیدھا سا فوجی بندہ ہوں اور مجھے الفاظ کا ہیر پھیر نہیں آتا۔ میں آپ کو بتانا چاہتا ہوں کہ آپ مجھے کیسی لگیں لیکن پہلے میں آپ سے پوچھنا چاہوں گا کہ میں آپ کو کیسا لگا؟''

''آپ..... اچھے ہیں۔'' میں نے مشکل سے کہا۔

''میں اچھا ہوں گا، میں پوچھ رہا ہوں آپ کو کیسا لگا؟''

''آپ..... اچھے لگے۔'' میں نے کہا اور شرما گئی۔

''تھینک یو سو مچ۔'' علی نے خوش ہو کر کہا۔ ''ثانی آپ مجھے بہت اچھی لگی ہیں، اتنی اچھی کہ آج تک کوئی اتنا اچھا نہیں لگا۔ میں چاہتا ہوں کہ ساری عمر آپ کے ساتھ رہوں۔ ثانی میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔''

ان کے یوں کھل کر اقرار پر میرا دل ایک لمحے کو رکا لیکن پھر اسے قرار آ گیا۔ اس بار میں نے زیادہ اعتماد سے کہا۔ ''علی میں آپ کے جذبے کی قدر کرتی ہوں لیکن ہمارے ہاں شادی ماں باپ کی پسند سے ہوتی ہے۔''

''یعنی میرے لیے کوئی چانس نہیں ہے۔'' ان کا لہجہ ڈوب گیا تھا۔

''میں نے ایسا تو نہیں کہا۔ ہمارے ہاں پسند کا اختیار ہے لیکن ماما پاپا کے پاس ویٹو کا اختیار ہے۔ اگر وہ مناسب نہیں سمجھیں گے تو انکار کر دیں گے۔''

''تھینک گاڈ۔'' علی کی رکی سانس جیسے بحال ہوئی۔ ''یعنی میں رشتہ بھیج سکتا ہوں۔ آپ کو تو کوئی اعتراض نہیں ہے۔''

''نہیں۔'' میں نے ایک بار پھر مشکل سے کہا۔ علی میں اعتراض والی کوئی بات نہیں تھی۔ وہ ہینڈسم، خوش شکل آدمی تھے۔ عمر بھی کم لگتی تھی یعنی لک لڑکوں جیسی تھی۔ ان کا تعلق بھی لاہور سے تھا لیکن ان دنوں ایک شمالی چھاؤنی میں تعینات تھے۔

''تھینک یو! میں جلد اپنے گھر والوں کو آپ کے گھر بھیجوں گا۔''

''میں پہلے اپنی ماما سے بات کر لوں۔'' میں نے کہا۔ ''ممکن ہے انہوں نے میرے بارے میں کچھ سوچ لیا ہو اور مجھے علم نہ ہو۔''

علی پھر پریشان ہو گئے۔ ''اگر انہوں نے کچھ سوچ لیا ہو تو؟''

''تب میں آپ کا پروپوزل بھی ماما کے سامنے رکھ دوں گی اور وہ جو مناسب سمجھیں گی وہ فیصلہ کریں گی۔''

''یعنی میری پسند کی کوئی اہمیت نہیں ہوگی؟''

''اہمیت تو ہوگی لیکن یہ ماما اور پاپا پر ہے کہ وہ اسے کتنی اہمیت دیتے ہیں۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔

''ٹھیک ہے تو آپ کب تک ان سے بات کر لیں گی؟'' وہ سرد آہ بھر کر بولے۔

''آج ہی۔'' میں نے کہا۔

''آپ کو ان سے یہ بات کرتے ہوئے مسئلہ نہیں ہوگا؟'' علی کو کسی قدر حیرت ہوئی تھی۔

''نہیں کیونکہ ماما اور پاپا نے ہمیں یہ بات سمجھائی ہے۔ کسی کو پسند کرنا ہمارے ہاں برا نہیں سمجھا جاتا ہے لیکن رشتے ماما پاپا کی مرضی سے ہی ہوتے ہیں۔''

''میں سمجھ گیا۔ میں کل آپ کو کال کروں گا۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہے جیسے ہی ماما نے مجھے کوئی جواب دیا میں آپ کو خود بتا دوں گی۔''

وہ کسی قدر افسردہ ہو گئے۔ ''لگتا ہے میری پسند کی آپ

کے نزدیک کوئی اہمیت نہیں ہے۔"

"اگر اہمیت نہ ہوتی.... تو میرے منہ سے کل وہ جملہ کیسے نکلتا؟" میں نے کہا اور کال کاٹ دی۔ اقرار کر کے مجھے پھر شرم آئی تھی۔ میں نے اسی دن موقع پا کر ماما سے بات کر لی۔ انہیں صاف گوئی سے بتا دیا کہ علی احمد سے میری ملاقات کیسے ہوئی اور پھر انہوں نے مجھ سے کال پر کیا باتیں کیں۔ ماما نے سنا اور بولیں۔

"میں بھی آج کل تمہارے رشتے کے بارے میں سوچ رہی ہوں۔ تمہارے پاپا سے کہتی ہوں وہ اس کے... بارے میں تحقیق کرا لیں پھر اس کے گھر والے رشتہ لے کر آ سکتے۔ ویسے وہ تمہیں کیسا لگا؟"

"اچھا ہے ماما۔" میں نے جھینپ کر کہا۔ "لیکن میں نے انہیں بتا دیا ہے کہ ہمارے ہاں شادی ماما پاپا کی مرضی سے ہوتی ہے۔"

"ٹھیک ہے ہم دیکھتے ہیں اگر مناسب لگا تو پھر کوئی حرج نہیں ہے۔"

میں نے اگلے دن کال کر کے علی کو ماما کا جواب سنا دیا۔ وہ بے تاب ہو گئے۔ "انکوائری ضرور کریں لیکن کب تک....؟"

"اس میں کچھ وقت تو لگے گا۔"

"ثانی میں بڑی مشکل سے ایک ہفتے کی چھٹی لے کر آیا ہوں اور میں چاہتا ہوں...."

"سوری.... میں اس معاملے میں آپ کی کوئی مدد نہیں کر سکتی۔" میں نے جلدی سے کہا۔ "میں نے آپ کی خواہش ماما تک پہنچا دی ہے، اب یہ ان کا کام ہے کہ وہ کیا کرتی ہیں اور کیسے کرتی ہیں۔"

"آپ ان سے بات تو کر سکتی ہیں کہ وہ مجھ سے براہِ راست انٹرویو لے لیں۔"

"ہاں یہ کہہ سکتی ہوں۔" میں نے کہا۔

ماما سے بات کی تو انہوں نے کہا۔ "اب تو میں نے تمہارے پاپا سے کہہ دیا ہے اور وہ اپنے طور پر معلوم کر رہے ہیں۔ اب میں نہیں کہہ سکتی۔ ہاں جب وہ انکوائری کروا لیں گے تب کہہ سکتی ہوں۔"

مجھے بھی معلوم تھا کہ پاپا اسے پسند نہیں کریں گے۔ اگر علی پہلے کہہ دیتے تو یہ ممکن تھا۔ میں نے علی کو بتایا تو وہ سرد آہ بھر کر رہ گئے۔ سچی بات ہے میں بھی دل مسوس کر رہ گئی تھی مگر بات وہی تھی کہ ماما پاپا کی مرضی ہو گی تب ہی یہ رشتہ ہو گا۔ اس لیے میں نے کوشش کی کہ علی یا اپنے دل کو کوئی آس نہ دلاؤں۔ مگر جیسے جیسے وقت گزر رہا تھا مجھے لگ رہا تھا کہ یہ علی کی نہیں میری خواہش بن گئی ہے۔ میں ان کی ہونا چاہتی تھی۔ پھر ایک ہفتے بعد ماما پاپا نے مجھ سے علی کا نمبر لیا اور براہِ راست ان سے بات کی، ان سے کہا کہ وہ اپنے گھر والوں کو بھیج سکتے ہیں۔ پاپا اور جاوید بھائی نے علی کے بارے میں تفتیش کر لی تھی اور وہ ان سے مطمئن تھے۔ اس لیے انہیں رشتہ لانے کے لیے کلیرنس دے دی تھی۔ اس کے دو دن بعد علی کی بڑی بہن اور والد ہمارے ہاں آئے تھے۔ ان کی والدہ کئی سال پہلے دنیا سے گزر چکی تھیں۔ علی کی بس ایک بڑی بہن تھیں اور والد ریٹائرڈ آرمی آفیسر تھے۔ لاہور بحریہ ٹاؤن میں ان کا گھر تھا۔ علی کی چھٹی ختم ہو گئی تھی اور وہ واپس چلے گئے تھے۔

ماما پاپا نے اچھا ردِعمل دیا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ انہیں علی کا رشتہ پسند آیا تھا۔ حالانکہ وہ ہماری طرح دولت مند نہیں تھے مگر اچھے کھاتے پیتے لوگ تھے اور ماما پاپا نے کبھی رشتوں میں دولت کو ایک حد سے زیادہ اہمیت نہیں دی تھی۔ میری ایک بہن کے شوہر یونیورسٹی میں پروفیسر تھے۔ وہ ذرا اوپری متوسط طبقے جیسی زندگی گزارتے تھے۔ دو بھابیاں بھی متوسط گھرانوں سے تھیں۔ اس لیے علی کے معاملے میں بھی اس چیز کو زیادہ اہمیت نہیں دی گئی تھی۔ اپنی رضامندی ظاہر کرنے سے پہلے ماما نے مجھے سمجھایا تھا کہ وہ اتنے پیسے والے نہیں ہیں اور دوسرے آرمی آفیسر کے ساتھ زندگی آسان نہیں ہوتی ہے کیونکہ وہ پورے کیریئر میں اِدھر اُدھر ہوتا رہتا ہے۔ کہیں بھی دو تین سال سے زیادہ جم کر نہیں رہتا۔ ممکن ہے اگر علی کا رشتہ عام طریقے سے آتا اور ماما مجھ سے پوچھتیں تو میں انکار کر دیتی مگر اب میں محبت کر چکی تھی۔ اس لیے میں نے ماما سے کہا۔ "جیسے آپ ان چیزوں کو زیادہ اہمیت نہیں دیتی ہیں اس طرح میں بھی نہیں دیتی اور یہ اچھی بات ہے اس طرح مجھے آپ کے پاس آ کر رہنے کا زیادہ موقع ملا کرے گا۔ علی جب کہیں کسی کورس یا ایکسرسائز پر جائیں گے میں آپ کے پاس آ جاؤں گی۔"

میری طرف سے مطمئن ہو کر ماما پاپا نے ہاں کر دی۔ اگلی بار علی بھی آئے تھے۔ وہ اس کے لیے خاص طور سے دو دن کی چھٹی لے کر آئے تھے۔ اس میں ایک دن تو ڈرائیونگ میں گزر گیا تھا۔ طے ہوا کہ وہ ترکی میں ایک کورس میں شرکت کر کے آئیں گے تو شادی کی تاریخ رکھ

دی جائے۔ مہینا مارچ کا پہلے ہی منتخب ہو گیا تھا۔ اس وقت تک میں پیپرز دے لیتی اور شادی تک میرا رزلٹ بھی آجاتا۔ پیپرز ہوتے ہی میں نے تیاری شروع کر دی تھی۔ ماما چاہتی تھیں کہ سب میری پسند سے ہو اس لیے وہ ہر روز مجھے لے کر نکلتی تھیں۔ میرے منع کرنے کے باوجود انہوں نے ہر چیز میری مرضی سے لی تھی۔ علی نے جہیز دینے سے منع کیا تھا اس لیے صرف بیڈ روم سیٹ دیا۔ دوسری چیزوں کی جگہ پاپا نے مجھے کیش دے دیا تھا اور کپڑے اور زیور اس کے علاوہ تھا۔ علی نے کہہ دیا تھا کہ وہ سادگی سے شادی کریں گے۔ برات میں زیادہ لوگ نہیں ہوں گے۔ بری بھی انہوں نے سادہ رکھی تھی۔ میرے گھر والوں نے اس کو محسوس نہیں کیا کیونکہ ماما پاپا اس بات کے قائل تھے کہ شادی بیاہ میں ہر فریق کو اپنی سہولت کے مطابق عمل کرنا چاہیے۔ نہ کہ رسم و رواج کے پیچھے بھاگنا چاہیے۔ شادی کے بعد علی نے کہا۔

”ثانی میرے پاس رقم تھی۔ میں نے اپنی جاب سے جمع کی تھی، چاہتا تو تم کو بہت اچھے سوٹ اور جیولری بنا کر بری میں دیتا لیکن میں نے سوچا کہ ہم شادی کے بعد سب سے پہلے اللہ کے گھر عمرے پر جائیں گے۔“

مجھے ان کی بات یہ اچھی لگی اور یہ بھی اندازہ ہوا کہ علی مذہبی ذہن رکھتے تھے۔ ویسے پانچوں وقت کی نماز پڑھتے تھے اور چہرے پر ہلکی سی شیو ہوتی تھی جو اچھی لگتی تھی۔ مگر سوچ میں شدت نہیں تھی۔ میں نماز بہت کم پڑھتی تھی مگر شادی کے بعد انہوں نے مجھ سے ایک بار بھی نہیں کہا کہ میں نماز پڑھوں۔ جب ہم عمرے پر گئے اور وہاں باقاعدگی سے پانچوں وقت کی نماز پڑھی تو خود عادت ہو گئی۔ شادی کے بعد وہ ایک ہفتہ لاہور رکے پھر چلے گئے۔ یہ ہفتہ ایسے گزر گیا جیسے سات دن نہ ہوں بس سات پل ہوں جو ہم نے ساتھ گزارے ہوں۔ علی کہہ کر گئے تھے کہ جیسے ہی چھاؤنی میں مکان ملا وہ مجھے لے جائیں گے۔ میں ان کے ساتھ جانا چاہتی تھی۔ شادی کے بعد ایسا لگا جیسے ہمیشہ سے ان کے ساتھ رہتی آئی ہوں۔ جب کئی دن اداس اداس پھرتی رہی تو میرے سسر مجھے خود ماما پاپا کے پاس چھوڑ آئے کہ کچھ دن رہ لوں تو میرا دل بہل جائے۔ یہاں آکر کچھ دل بہلا مگر علی کی یاد ستاتی رہی۔

پھر دو ہفتے بعد ہی علی نے کال پر خوشخبری سنائی کہ گھر مل گیا ہے۔ زیادہ بڑا نہیں ہے بس ایک بیڈ روم اور ایک نشست گاہ پر مشتمل تھا۔ مگر ہمارے لیے بہت تھا۔ ابھی علی اس میں ضروری سامان ڈلوا رہے تھے۔ کچن کا اور کچھ دوسرا سامان میں یہاں سے لے جاتی۔ جب انہوں نے گھر سیٹ کر لیا تو مجھے لینے آئے۔ ان کے پاس منی پجارو تھی۔ یہ ذرا پرانا ماڈل تھا مگر علی نے بہت سنبھال کر رکھا تھا۔ ان کا کہنا تھا یہ پہلی بڑی چیز تھی جو انہوں نے اپنی آمدنی سے خریدی تھی۔ میرا سامان رکھنے کے بعد اتنی جگہ مشکل سے نکلی کہ میں بیٹھ سکتی۔ بارہ گھنٹے کا طویل سفر خاصا مشکل تھا مگر منزل پر پہنچ کر ساری تھکن اتر گئی۔ یہ جگہ اتنی خوب صورت تھی کہ چھاؤنی کے بجائے جنت کا ٹکڑا لگ رہی تھی۔ چاروں طرف جنگلات سے ڈھکے پہاڑ تھے اور ان کی ڈھلانوں پر سبز گھاس کے درمیان پانی کے چشمے بہہ رہے تھے۔ میں حیران رہ گئی۔ ”اللہ آپ اتنی خوب صورت جگہ رہ رہے ہیں۔ مجھے پتا ہوتا تو میں پہلے آجاتی چاہے مجھے خیمے میں رہنا پڑتا۔“

”تمہارا مقدر تھا کہ اپنے گھر میں رہو..... یہ چھوٹی چھاؤنی ہے اور یہاں بڑی مشکل سے گھر ملتا ہے۔“

علی کو ملنے والا گھر ایک بڑے بنگلے کا پورشن تھا۔ مین گیٹ سے داخل ہوتے ہی بائیں طرف لان اور یہ پورشن تھا۔ گھر اصل میں علی کے کمانڈنگ آفیسر کا تھا اور ان کی ضرورت کے لحاظ سے بڑا تھا کیونکہ وہ اکیلے رہتے تھے۔ ان کی فیملی اسلام آباد میں تھی۔ جب انہیں پتا چلا کہ علی کی شادی ہو گئی ہے اور وہ بیوی کو لا کر رکھنا چاہتے ہیں مگر مکان نہیں مل رہا تو انہوں نے اپنے بنگلے کا یہ پورشن ان کے سپرد کر دیا۔ بیڈ روم خاصا بڑا تھا اور اس کی ایک کھڑکی اس طرح کھلتی تھی کہ شمال میں دور تک پہاڑوں جنگلوں اور برف پوش چوٹیوں کا منظر کسی سینری کا حصہ لگتا تھا۔ تمام سہولتوں سے آراستہ ٹائلڈ باتھ روم تھا۔ نشست گاہ کے ساتھ ایک چھوٹا سا اسٹور روم تھا جسے کچن میں تبدیل کیا گیا تھا۔ یہ امریکن کچن تو نہیں تھا مگر علی نے تمام لوازمات مہیا کر دیئے تھے جن سے کھانے پکانے میں آسانی ہو۔ پھر انہوں نے ایک ملازم بھی تلاش کر لیا تھا۔

پندرہ سال کا نوازش حسن مستعد اور ہوشیار لڑکا تھا۔ وہ میٹرک کر رہا تھا اور ساتھ ہی جاب بھی۔ میری آمد سے کچھ دن پہلے اس نے نویں کا امتحان دیا تھا۔ اکیلی جان تھی دادی کے سوا کوئی نہیں تھا۔ دادی نے ہی اسے پالا تھا مگر اب وہ بوڑھی ہو گئی تھیں اور نوازش چاہتا تھا کہ وہ کام نہ کریں۔ ان کے پاس کچھ بکریاں اور مرغیاں تھیں جن کے دودھ اور

انڈوں کی فروخت سے ان کی گزر بسر ہوتی تھی۔ بکریاں جو بچے دیتیں انہیں بھی بیچنے سے کچھ رقم مل جاتی تھی۔ گھر میں انگور کی بیلیں اور چیری کے درخت لگے تھے۔ ان کا پھل اترتا تو وہ فروخت کرتے تھے۔ نوازش اسکول سے سیدھا ہمارے ہاں آتا۔ ایک بجے سے شام چھ بجے تک وہ یہاں کام کرتا۔ کچن کے برتن دھونے سے لے کر صفائی ستھرائی اور علی کے کپڑے دھونے تک وہ سارے کام کرتا تھا۔ میں اپنے کپڑے خود دھوتی تھی اور یہاں تو کپڑے گندے ہی نہیں ہوتے تھے۔ علی صبح سات بجے جاتے اور تین بجے آجاتے تھے۔ ان کے جانے کے بعد میں پھر سو جاتی۔ دس بجے اٹھ کر ناشتا کرتی اور کچھ دیر لان میں چہل قدمی کرتی یا آس پاس نکل جاتی تھی۔ ایک بجے تک نوازش آتا تو اس کے ساتھ گھر کے کام نمٹاتی۔ کام وہی کرتا تھا لیکن میری نگرانی میں۔ پھر کھانا تیار کرتی۔ علی آتے تو ہم مل کر دوپہر کا کھانا کھاتے تھے۔ اس کے بعد علی نزدیکی قصبے تک سامان لینے چلے جاتے تھے کیونکہ چھاؤنی میں کچھ نہیں ملتا تھا۔ ہاں راشن آتا تھا تو وہ مل جاتا تھا ورنہ گوشت سبزی اور دوسری تازہ اشیا اسی قصبے سے ملتی تھیں۔

یہ چھاؤنی شمال میں تھی مگر ہنگاموں اور شورش زدہ علاقوں سے دور تھی۔ ماحول بہت پُر سکون اور پُر امن تھا۔ اپنے کام نمٹا کر ہم روز شام کو آس پاس سیر کرنے نکل جاتے تھے۔ سورج ڈوبنے تک گھوم پھر کر آجاتے۔ نوازش پہلے چلا جاتا تھا۔ چھٹی والے دن پکنک کے لیے جاتے۔ عام طور سے نزدیک اور پیدل ہی جاتے تھے۔ کھانا بنا لیتے اور ساتھ ہی چائے کافی کا تھرماس بھی بھر لیتے تھے۔ کبھی نوازش بھی ساتھ چلا جاتا تھا۔ اگر دور جانا ہوتا تو جیپ پر جاتے تھے۔ شروع میں بہت سردی تھی مگر مئی تک موسم خوشگوار ہو گیا۔ اب رات کو آگ جلائے بغیر بھی گزارا ہو جاتا تھا۔ بیڈ روم اور نشست گاہ دونوں جگہوں پر آتش دان تھے، ان میں لکڑی جلائی جاتی تھی۔ کچن میں چولہے کے لیے ایل پی جی سلینڈر منگواتے تھے۔ یہاں بجلی تھی اور فون کی سہولت بھی تھی۔ ایک موبائل فون سروس کے سگنل بھی آتے تھے۔ ٹی وی نہیں تھا بعض شوقین لوگوں نے خود ڈش لگا کر چینل دیکھنے کا بندوبست کیا ہوا تھا۔ علی کو ٹی وی کا شوق نہیں تھا اور مجھے بھی اتنا شوق نہیں تھا۔ کچھ ڈرامے اچھے لگتے تھے جو علی نے ڈی وی ڈی پر لا دیئے تھے اور میں ان کو لیپ ٹاپ پر دیکھ لیتی تھی۔

علی کو پڑھنے کا شوق تھا اور ان کے پاس بے شمار کتابیں تھیں۔ میں اپنا کامک اسٹوریز کا ذخیرہ لے آئی تھی۔ تازہ کامک بکس پاپا مجھے بائی ڈاک بھیج دیتے تھے اور وقت گزاری کے لیے میں پرانی کامک پڑھتی یا پھر علی کی کتابوں میں سے کوئی کتاب اٹھا لیتی۔ کبھی کبھی ڈائجسٹ پڑھ لیتی۔ علی کے پاس سارے ڈائجسٹ آتے تھے۔ رات کو جب تک وہ ایک ڈیڑھ گھنٹے مطالعہ نہیں کر لیتے تھے ان کو نیند نہیں آتی تھی۔ اس معمول میں صبح سے شام تک ایسے مواقع کم آتے تھے جب مجھے بوریت محسوس ہوتی اور اگر ایسا ہوتا تو میں ماما پاپا یا کسی بہن کو کال کر لیتی تھی۔ ویسے ان کی طرف سے روزانہ ہی کسی نہ کسی کی کال آجاتی تھی۔ یوں وقت اچھا گزر رہا تھا۔ مگر علی کے ساتھ رہنے کے لیے میں کسی ویرانے میں بھی رہنے کو تیار تھی۔ بس کبھی کبھی اپنے آس پاس انسانوں کی کمی محسوس ہوتی تھی۔ علی کے کمانڈنگ آفیسر کی فیملی یہاں نہیں تھی۔ وہ اکیلے رہتے تھے اور یہاں بھی کم ہی ہوتے تھے عام طور سے وہ اعلیٰ حکام سے میٹنگ میں نزدیکی بڑی چھاؤنی کی طرف گئے ہوتے تھے۔

علی کی محبت نے مجھے مجبور کر دیا تھا کہ میں ان سے شادی کروں۔ اس کے بغیر میں رہ ہی نہیں سکتی تھی لیکن ان سے شادی کے بعد مجھے ہر وقت دھڑکا سا لگا رہتا تھا کہ کہیں وہ کسی ایسی جگہ نہ بھیج دیئے جائیں جہاں خطرات ہوں۔ مگر جب میں اس جگہ آئی اور یہاں کا امن و سکون دیکھا تو مجھے اطمینان ہوا تھا۔ یہاں کوئی ہنگامہ نہیں تھا۔ علاقہ اور یہاں کے لوگ پُر امن تھے۔ عام طور سے گاؤں دیہات میں اسلحہ نظر آتا ہے۔ مگر یہاں کے لوگوں کے پاس اسلحہ تھا بھی تو اس کی سرِ عام نمائش نہیں کی جاتی تھی۔ جب مجھے اس جگہ کے بارے میں اطمینان ہو گیا تو میرے اندر خواہش جاگی کہ کاش علی کی پوسٹنگ مستقل نہ سہی لیکن زیادہ سے زیادہ عرصے کے لیے یہیں ہو۔ میرے ذہن میں تھا کہ میں رفتہ رفتہ علی پر زور ڈال کر ان کو آرمی سے ریزائن پر آمادہ کر لوں گی۔ وہ ایم بی اے تھے۔ جب ان کی کراچی میں پوسٹنگ ہوئی تو انہوں نے کراچی یونیورسٹی سے ایوننگ میں داخلہ لے کر ایم بی اے کیا تھا۔ اس تعلیمی قابلیت کے ساتھ انہیں آرام سے کہیں بھی جاب مل سکتی تھی۔

شادی کے بعد مجھے اندازہ ہوا کہ آرمی علی کا پروفیشن نہیں بلکہ اس سے بڑھ کر کچھ تھا۔ اس لیے میں کوشش کے باوجود اب تک ان سے بات نہیں کر سکی تھی۔ مجھے یہاں

آئے ہوئے دوسرا مہینا تھا کہ علی کو ایکسرسائز پر جانا پڑا۔ یہ دس دن کی ایکسرسائز تھی۔ چھاؤنی میں کچھ آفیسر کی فیملیاں تھیں اور ان سے ملنا جلنا بھی تھا مگر میں گھر میں اکیلی رہ نہیں سکتی تھی اس لیے انہوں نے دس دن کے لیے لاہور بھیج دیا۔ میں ماما پاپا کے پاس آئی تھی لیکن دو دن سسر کے ساتھ بھی رہی۔ وہ مجھ سے بہت شفقت سے پیش آتے تھے اور مجھے ان کا خیال بھی رہتا تھا۔ وہ اکیلے تھے لیکن خود کو مصروف رکھتے تھے اور پھر میری نند پاس رہتی تھیں تو ہر دوسرے تیسرے دن ان سے ملنے آجاتی تھیں۔ ان دس دنوں میں سب سے مل کر میں بالکل فریش ہوگئی تھی اور واپس آئی تو بہت خوش تھی۔ مجھے چھوٹا بھائی احد اور ڈرائیور گاڑی میں چھوڑنے آئے تھے۔ علی بے تابی سے میرے منتظر تھے۔ وہ عام طور سے اپنی محبت کی بے تابیاں یوں نہیں ظاہر کرتے تھے جیسے انہوں نے اس بار ظاہر کی تھیں۔ میں نے دوسرے دن پوچھ لیا۔ ''کیا بات ہے آپ بھول رہے ہیں ہماری شادی کو تین مہینے گزر چکے ہیں۔''

''تین مہینے تو کچھ بھی نہیں ہوتے، مجھے لگ رہا ہے ہماری شادی تین دن پہلے ہوئی ہے۔'' انہوں نے والہانہ انداز میں کہا۔

''اف آپ بھی۔'' میں جھینپ گئی تھی۔ مگر مجھے لگا تھا کہ اس والہانہ پن کے پیچھے کچھ بات اور ہے۔ میں نے زیادہ کریدا نہیں، مجھے معلوم تھا کہ جو بھی ہوگا وہ جلد سامنے آجائے گا۔ ان ہی دنوں اتفاق سے علی کے دو قریبی ساتھیوں کی فیملیز یہاں آئی تھیں۔ ایک لیفٹیننٹ ضیا اور ان کی بیوی ماہا تھی۔ ان کی شادی دو سال پہلے ہوئی تھی اور ان کا بہت پیارا سا سات مہینے کا بیٹا تھا جو آتے ہی سب کی توجہ کا مرکز بن گیا تھا۔ دوسری فیملی کیپٹن مدثر کی تھی ان کی بیوی ریحانہ اور دو چھوٹی بیٹیاں تھیں۔ یہ ہمارے گھر کے پاس ہی آئے تھے اور ان کے آجانے سے یہاں کچھ رونق اور چہل پہل نظر آنے لگی تھی۔ شام کے وقت ہم خواتین بچوں کو لے کر نکل آتی تھیں۔ چھاؤنی کے پارک میں گھومتیں یا پھر نزدیکی پہاڑوں کے دامن تک چلی جاتی تھیں۔ چھاؤنی اور اس کے آس پاس کی زمین ہموار تھی۔ یہاں گھومنا پھرنا مشکل نہیں تھا۔ ہم چار پانچ خواتین مل کر کچھ وقت ساتھ گزارتی تھیں۔ بے تکلفی ہوئی تو طے ہوا کہ ہفتے میں ایک بار کسی کے گھر ون ڈش ہوا کرے گی۔ یوں مل بیٹھنے کا ایک بہانہ اور مل جائے گا۔ مہینے میں ایک بار سب مل کر کہیں پکنک منانے جاسکتے تھے۔ دو ہفتے بعد ہی پہلی پکنک منانے ایک نزدیکی آبشار تک گئے تھے۔ یہ بہت خوب صورت جگہ تھی جہاں میں پہلی بار آئی تھی۔

☆☆☆

''کیا آپ کہیں جارہے ہیں؟'' میں نے بے یقینی سے کہا۔ علی نے آج مجھے خاص طور سے تیار کرکے بتایا تھا۔ وہ کچھ دیر تمہید باندھتے رہے تھے۔ پھر انہوں نے بتایا کہ ان کے گروپ کو شمال میں ایک شورش زدہ علاقے میں بھیجا جارہا ہے۔ ان کے ذمے وہاں امن و امان قائم کرنا تھا۔ لازمی بات ہے انہیں متحارب گروپوں سے نمٹنا تھا اور وہاں سے جو اطلاعات آتی تھیں وہ خاصی خوفناک تھیں۔ آئے دن سیکورٹی فورسز پر حملے ہوتے تھے اور جھڑپوں میں دونوں طرف جانی نقصان ہوتا تھا۔ جب سے میں علی کی زندگی میں آئی تو مجھے اس کا دھڑکا تو تھا لیکن اب مطمئن ہوگئی تھی کہ انہیں محاذِ جنگ پر نہیں بھیجا جائے گا۔ مگر اب وہ بتارہے تھے کہ انہیں شورش زدہ علاقے میں بھیجا جارہا تھا اور یہ محاذِ جنگ ہی تو تھا۔

''علی آپ نہیں جائیں گے۔'' میں نے تڑپ کر کہا۔ ''میں مرجاؤں گی۔''

انہوں نے حیرت سے مجھے دیکھا۔ ''ثانی تم کیسی بات کررہی ہو؟ ایک آرمی آفیسر کی بیوی کے منہ سے ایسی بات کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا ہے، اور تم جانتی ہو یہ جاب نہیں ہے میرا مشن ہے۔''

''میں جانتی ہوں، لیکن میں کیا کروں میرا دل نہیں مانتا۔'' میں رو دی تھی۔ ''پلیز علی میری کیفیت سمجھنے کی کوشش کریں۔''

''تم میری بات سمجھنے کی کوشش کرو۔'' انہوں نے برہمی سے کہا اور اٹھ کر بیڈ روم سے باہر چلے گئے۔ میں روتی رہی۔ ان کے نزدیک یہ ان کی ڈیوٹی تھی مگر میرا دل نہیں مان رہا تھا کہ وہ وہاں جائیں جہاں خطرات ہی خطرات تھے۔ جہاں سے بہت کم لوگ زندہ اور صحیح سلامت واپس آتے تھے۔ علی کچھ دیر بعد واپس آئے اور لائٹ بند کرکے دوسری طرف کروٹ لے کر لیٹ گئے۔ آج تک ایسا نہیں ہوا تھا کہ میں جاگ رہی ہوں اور وہ دوسری طرف کروٹ لے کر لیٹ جائیں۔ ان کی اس بے رخی نے میرا دل اور دکھا دیا تھا۔ نہ جانے کب تک روتی رہی اور پھر آنکھ لگی تو صبح کھلی نہیں۔ جب میری آنکھ کھلی تو علی ناشتا کرکے جاچکے تھے۔

ایسا بھی پہلی بار ہوا تھا کہ میرے ہوتے ہوئے انہوں نے خود ناشتا بنایا ہو اور میں سوتی رہی ہوں۔ شام تک میں اسی کیفیت میں رہی۔ علی آئے تو میں نے ناشتے پر نہ اٹھنے پر سوری کی مگر انہوں نے اٹس او کے کہہ کر معاملہ ختم کردیا۔

اصل موضوع پر نہ انہوں نے بات کی اور نہ میں نے کچھ کہا۔ ہمارے درمیان ایک خاموش سرد مہری سی آگئی تھی۔ ہم آپس میں بات کررہے تھے اور بعض اوقات ہنستے بولتے بھی تھے لیکن تناؤ برقرار تھا۔ شام کو لیفٹیننٹ ضیا آگئے۔ وہ بھی اس گروپ کا حصہ تھے جو شورش زدہ علاقے میں جارہا تھا اور وہ اسی پر بات کرنے آئے تھے۔ ضیا بھائی کے ساتھ ماہا بھی آئی تھی۔ میں اسے بیڈ روم میں لے آئی۔ میرا خیال تھا کہ وہ اپ سیٹ ہوگی۔ اس کا ایک بیٹا بھی تھا مگر وہ مجھے معمول کے مطابق لگی اور اس نے بھانپ لیا کہ میں اپ سیٹ ہوں اس نے کہا۔ ''کیا بات ہے ثانیہ تم کچھ پریشان ہو؟''

میں نے سر ہلایا۔ ''میرا دل نہیں مان رہا کہ علی جائیں۔''

''میں تمہاری کیفیت سمجھ رہی ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''شروع میں میں بھی بہت پریشان ہوتی تھی لیکن اب نہیں ہوتی۔''

''حالانکہ اب تمہارا بیٹا بھی ہے۔'' میں نے ننھے ایان کی طرف دیکھا۔ ''تمہیں زیادہ فکرمند ہونا چاہیے۔''

''تم ٹھیک کہہ رہی ہو مجھے پہلے سے زیادہ فکرمند ہونا چاہیے لیکن کچھ عرصے پہلے ایسا واقعہ ہوا کہ میرا اس بات پر دل پکا ہوگیا کہ موت اپنے وقت پر آئے گی، نہ اس سے پہلے اور نہ اس کے بعد۔''

''یہ کیا بات ہوئی؟''

''واقعہ سنو ہوا یہ کہ میں اور ضیا گھر جارہے تھے۔ اس وقت میں آٹھ مہینے سے تھی۔ ہم بس میں تھے اور بس ایک دوسری بس کو اوورٹیک کرتے ہوئے الٹ گئی۔ اس حادثے میں کئی مسافر ہلاک اور تقریباً سارے زخمی ہوئے۔ لیکن ضیا اور میں محفوظ رہے تھے۔ ان کو معمولی سے زخم آئے تھے جن کے لیے مرہم پٹی کی ضرورت بھی نہیں تھی۔''

''اچھا!''

''یقین کرو میرے ساتھ بیٹھی عورت مرگئی اس کا شوہر شدید زخمی ہوا۔ آگے پیچھے بیٹھے لوگوں کو شدید چوٹیں آئیں مگر میں بالکل محفوظ رہی، حد یہ کہ میرا بچہ بھی محفوظ رہا۔ ڈاکٹر

نعیم الدین مراد آبادی

فلسفہ، منطق وحدیث کے ماہر، معروف عالم دین اور اسلمی شاعر، اسم گرامی سعید محمد نعیم الدین مولانا معین الدین کے بیٹے۔ 21 صفر 1300ھ یکم جنوری 1887ء میں مراد آباد میں پیدا ہوئے۔ آٹھ برس کی عمر میں قرآن پاک حفظ کیا۔ اردو اور فارسی کی کتب اپنے والد بزرگوار سے اور درس نظامیہ شاہ تفضل احمد سے لیا۔ سید شاہ محمد گل سے 1318ھ میں افتاد نویسی میں سند لی، انہی کے ہاتھ پر سلسلہ قادریہ میں بیعت کی۔ آپ کے آباؤ اجداد مشہد کے رہنے والے تھے۔ وہاں سے اورنگ زیب کے زمانے میں بھارت آگئے۔ بادشاہ نے عزت افزائی کی اور جاگیر عطا کی۔ مختلف شہروں سے ہوتے ہوئے لاہور تشریف لائے اور ابو الحنات کے پاس قیام کیا۔ مختلف اسلامی تحاریک میں زبردست حصہ لیا۔ سلطنت ترکی کے سلسلے میں بننے والی خلافت کمیٹی کے آپ بھی رکن تھے اور اس موقع پر زبردست تقاریر کیں۔ شودھی تحریک جو اسلام کو مسخ کرنے کے لیے چلائی گئی ۔ اس کے خلاف آپ نے آگرہ، جے پور، کشن گڑھ، گوبند گڑھ، اجمیر، متھرا اور بھرت پور کے خود بھی طوفانی دورے کیے اور اپنے وفد بھی بھیجے۔ 1343ھ۔ 1924ء میں مراد آباد سے ماہنامہ ''اسواد الاعظم'' جاری کرکے دو قومی نظریہ کی زبردست حمایت کی۔ حصول پاکستان کے لیے 18 ستمبر 1928ء میں ہونے والی آل انڈیا سنی کانفرنس میں شاہکار خطبہ صدارت دیا۔ منٹو پارک میں پاس ہونے والی قرارداد پاکستان میں بھی آپ نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ 1365ھ 1942ء میں بنارس کانفرنس کے آپ ہی ناظم اعلیٰ تھے۔ اسلامی دستور کا خاکہ تیار کرنے کے دوران آپ علیل ہوگئے۔ زندگی نے مہلت نہ دی۔ 18 ذوالحج 1365ھ 13 اکتوبر 1948ء بروز جمعہ دنیا ان سے محروم ہوگئی۔ آپ کا مزار مبارک مسجد مراد آباد کے بائیں گوشے میں ہے۔ آپ نے چودہ تصانیف اور بہت سے مضامین چھوڑے ہیں۔ تصانیف میں تفسیر خزائن العرفان، دیوان اردو، کتاب العقائد، سیرت صحابہ، سوانح کربلا، آداب الاخیار مشہور ہیں۔

مرسلہ: احمد شاہ داودی، پشاور

حیران تھے کہ اتنے شدید حادثے میں میں اور میرا بچہ کیسے محفوظ رہے۔ ضیا کو بھی بس ہاتھ پر چوٹ آئی تھی۔ بہت دنوں تک ہمیں یقین ہی نہیں آیا تھا ورنہ جب بس الٹی تھی تو ہم دونوں نے سوچ لیا تھا کہ موت آگئی ہے۔ پھر ایمان ہوا تو یہ بھی بالکل ٹھیک تھا۔"

"واقعی موت کا وقت مقرر ہے۔" میں نے گہری سانس لی۔ "مگر وہ حادثہ تھا جو انسان کی زندگی میں ایک دو بار ہوتا ہے، یہ تو خود خطرے کے منہ میں جانے والی بات ہے۔"

"یہ ان کی اور ضیا کی ڈیوٹی ہے۔" ماہا نے رسانیت سے کہا۔

"میں کیا کروں میرا دل نہیں مان رہا۔" میں نے بے بسی سے اسے دیکھا۔

"آپ فکر نہ کریں اللہ نے چاہا تو سب ٹھیک رہے گا۔"

علی اور ان کے گروپ کی روانگی دو دن بعد تھی۔ انہیں جانے سے پہلے چھٹی مل گئی تھی کہ اپنے کام نمٹا کر جائیں۔ صرف علی اور ضیا بھائی ہی نہیں ان کے ساتھ تقریباً ساٹھ دوسرے افراد بھی جا رہے تھے۔ انہوں نے مجھ سے کہا۔ "اگر تم چاہو تو لاہور چلی جاؤ۔"

"نہیں۔" میں نے بے دلی سے کہا۔ "میں ابھی تو آئی ہوں۔"

"تم رہ لوگی؟"

"ویسے تو کوئی مسئلہ نہیں ہوگا۔" میں نے کہا۔

"یعنی کوئی اور مسئلہ موجود ہے؟"

"ہاں اور وہ موجود رہے گا۔" میں نے سپاٹ لہجے میں کہا۔ "آپ جا رہے ہیں یہ آپ کی ڈیوٹی ہے۔"

"یہ میرا مشن ہے۔"

"ٹھیک ہے، یہ آپ کا مشن ہے۔" میں نے سر ہلایا۔ "مگر اس میں میری رضامندی شامل نہیں ہے۔"

"مجھے اس معاملے میں تمہاری رضامندی کی ضرورت نہیں ہے۔" ان کا لہجہ کھردرا ہوگیا۔

"مجھے اندازہ ہوگیا ہے۔ میں سمجھتی تھی کہ آپ کے نزدیک سب سے زیادہ اہمیت میری ہے۔" میرے لہجے میں نمی آگئی تھی۔

علی نرم پڑ گئے۔ "پلیز ثانی تم جانتی ہو میرے لیے تم کیا ہو لیکن یہ مادرِ وطن کی سلامتی کا سوال ہے، میں اس سے منہ نہیں موڑ سکتا۔"

"آپ جانتے ہیں جب آپ یہاں سے جائیں گے تو میں کس طرح وقت گزاروں گی۔ میرا ایک ایک لمحہ کس اذیت میں گزرے گا۔"

"میں جانتا ہوں۔ لیکن اس اذیت میں صرف تم شامل نہیں ہوگی، میرے ساتھ جانے والے بہت سے شادی شدہ ہیں۔ ان کی بیویاں بھی یہی اذیت محسوس کریں گی۔ ضیا کی بیوی ماہا بھی جس کا صرف سات مہینے کا بیٹا ہے۔ اس کا سوچو۔"

"میں صرف اپنا سوچ رہی ہوں۔"

"ثانی مجھے افسوس ہے لیکن یہ خود غرضی ہے۔ مجھ سے شادی سے پہلے بھی تم جانتی تھیں کہ میں آرمی آفیسر ہوں۔ اس ملک اور قوم نے مجھ پر لاکھوں کروڑوں روپے اسی لیے خرچ کیے ہیں کہ جب ان کو کوئی خطرہ ہو تو میں اسے روکوں اور اگر نہ روک سکوں تو اپنی جان قربان کردوں۔ میں اپنے عہد سے منہ نہیں موڑ سکتا۔ یہ حالات بھی نئے نہیں ہیں۔ جس دن ہماری شادی ہوئی اسی دن ایک جھڑپ میں بارہ آرمی مین شہید ہوئے۔ ممکن ہے آنے والے کسی دن میں بھی وطن پر قربان ہو جاؤں۔"

"پلیز..... پلیز۔" میں شدت سے رو دی تھی۔ "میں آپ کے بغیر نہیں رہ سکتی۔"

"میں جانتا ہوں....." علی نے مجھے بازو میں لینا چاہا لیکن میں نے ان کا ہاتھ جھٹک دیا۔

"آپ نہیں جانتے ہیں..... اگر جانتے تو میری بات کو اہمیت دیتے، یوں نظر انداز نہ کرتے۔"

"میں تمہاری بات کی اہمیت جانتا ہوں لیکن میرے لیے اس سے زیادہ اہمیت اپنے فرض کی ہے۔" علی سنجیدہ ہو گئے۔ اس کے بعد ہمارے درمیان بات چیت بند ہوگئی۔ وہ تیاریوں میں لگے تھے۔ اپنے دوستوں اور جاننے والوں سے الوداعی ملاقاتیں کر رہے تھے۔ جو دور تھے ان سے کال پر سلام دعا ہو رہی تھی۔ میرے سسر کی کال آئی تو انہوں نے مجھ سے بھی بات کی۔ حیرت انگیز طور پر وہ فکر مند ہونے کے بجائے خوش تھے۔

"میں تو سوچ رہا تھا کہ میری طرح علی کی ساری جاب بھی ایسے ہی گزر جائے گی۔ مگر شکر ہے اسے اپنے وطن کی خدمت کا موقع مل رہا ہے۔"

"لیکن ابو وہاں بہت خطرہ ہے۔" میں بے چین ہو گئی۔

"تو بیٹا اسے خطروں سے نمٹنے کے لیے فوج میں لیا گیا ہے۔ یہ اس کا فرض ہے، جتنے اچھے طریقے سے ادا کرے گا اتنا ہی سرخ رُو ہوگا۔"

"ابو مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے۔"

"ثانیہ بیٹا تم ایک آرمی آفیسر کی بیوی ہو اور تمہیں بہادر ہونا چاہیے۔ ہمارے ہاں عورتیں اپنے سہاگ مسکرا کر رخصت کرتی ہیں، وہ ان کی لاش پر بھی نہیں روتی ہیں۔"

میرے سسر بھی وہی باتیں کر رہے تھے جن سے مجھے گھبراہٹ ہوتی تھی۔ میں نے فون علی کو تھما دیا۔ مجھ سے بات نہیں ہو رہی تھی۔ ابھی علی گئے نہیں تھے تو میرا یہ حال تھا ان کے جانے کے بعد پتا نہیں کیا ہوتا۔ جیسے جیسے یہ وقت قریب آ رہا تھا میرا دم گھٹ رہا تھا۔ جس صبح علی نے روانہ ہونا تھا اس ساری رات میں جاگتی اور دوسری کروٹ پر لیٹی روتی رہی۔ صبح تک میری آنکھیں سوج گئی تھیں اور سر درد کی شدت سے جیسے پھٹ رہا تھا۔ علی مجھ سے بات کرنا چاہ رہے تھے لیکن میرا موڈ دیکھ کر چپ تھے۔ پھر وہ تیار ہو کر جانے لگے تو میں باہر تک آئی تھی۔ انہوں نے آہستہ سے کہا۔ "پھر ملیں گے اگر اللہ نے چاہا تو....."

"ممکن ہے جب آپ واپس آئیں تو میں یہاں نہ ہوں۔"

علی نے کچھ کہنا چاہا لیکن پھر گہری سانس لی اور گاڑی کی طرف بڑھ گئے۔ میں انہیں جاتا دیکھ رہی تھی۔ ایک لمحے کو میرا دل چاہا کہ انہیں آواز دوں۔ ان سے سوری کرلوں مگر میں نہ کہہ سکی اور علی چلے گئے۔ نوازش موجود تھا۔ علی اسے میرا خیال رکھنے کا کہہ گئے تھے۔ مختصر عرصے میں نوازش گھر کے ایک فرد کی طرح ہو گیا تھا۔ علی اس پر بہت زیادہ اعتماد کرنے لگے تھے۔ اس نے علی سے کہا۔ "آپ فکر نہ کرو صاحب، میں باجی کا پورا خیال رکھوں گا۔ اگر باجی کو اکیلا محسوس ہوا تو دادی کو لے آؤں گا۔ وہ باجی سے بات کرے گا۔"

میرا موڈ نہیں تھا اس لیے اندر آگئی لیکن شام کو دل گھبرایا تو ماہا کے پاس چلی گئی۔ وہ اپنے بچے سے کھیل رہی تھی۔ مجھے دیکھ کر خوش ہوگئی۔ "میں سوچ رہی تھی تمہاری طرف چکر لگاؤں۔"

"میرا دل گھبرا رہا ہے۔"

"فطری بات ہے۔" وہ بولی۔ "میں نے بتایا تھا کہ شروع میں جب یہ جاتے تھے تو میرا دل بھی بہت گھبراتا تھا۔"

"ضیا بھائی پہلے بھی کہیں ایسے گئے ہیں؟"

"ہاں انہوں نے ایک بار آپریشن میں حصہ لیا تھا۔ چھ دن کے لیے گئے تھے۔ اس آپریشن میں ان کے ساتھی شہید ہوئے تھے۔ مگر اللہ نے انہیں محفوظ رکھا۔"

"اللہ سب کو محفوظ رکھے۔" میں نے کہا۔ "ماہا تمہاری ہمت ہے۔"

"کیا کریں ہمارے شوہروں کی ڈیوٹی ایسی ہی ہے۔ ہمیں دل بڑا کرنا ہی پڑتا ہے۔"

"لیکن مجھ سے نہیں ہو رہا۔ میں نے علی سے جاتے ہوئے بات بھی نہیں کی۔"

"بات نہیں کی لیکن کیوں؟" ماہا نے حیرت سے کہا۔ "ثانیہ علی بھائی جا رہے تھے اور ایک ایسی جگہ جا رہے ہیں جہاں اگلے پل کا پتا نہیں ہے ایسے میں تو انسان کو سب سے زیادہ اپنوں کی محبت اور حوصلے کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ تم نے کیا کیا؟"

میں شرمندہ ہوئی تھی۔ "ماہا میں کیا کروں، میرا دل نہیں مان رہا۔"

"دل کو مناؤ یار..... تم نے اچھا نہیں کیا..... میں ضیا کے جاتے جاتے ان کے سامنے رہی کہ وہ کوئی کمی محسوس کر کے نہ جائیں۔"

اب مجھے زیادہ شرمندگی محسوس ہو رہی تھی۔ مگر علی جا چکے تھے۔ ان سے سیل فون پر رابطہ بھی ممکن نہیں تھا۔ انہوں نے بتایا تھا کہ وہ محدود کمیونیکیشن اور کچھ فوجی حساسیت کی وجہ سے وہاں موبائل استعمال نہیں کر سکتے تھے اس لیے وہ بس چند منٹ کے لیے بات کر سکیں گے۔ میں کچھ دیر ماہا کے پاس رہی پھر واپس آئی تو دل پہلے سے زیادہ گھبرا رہا تھا۔ مجھے خیال آیا کہ مجھے علی کی بات مان لینی چاہیے تھی اور لاہور چلی جاتی تو وہاں شاید اتنی گھبراہٹ نہ ہوتی۔ نوازش کو شام کو چھٹی دے دی تھی اس نے اصرار کیا تھا کہ وہ رات کو رک جاتا ہے۔ برآمدے میں چارپائی ڈال کر سو جائے گا۔ مگر میں نے منع کر دیا۔ مجھے اچھا نہیں لگا کہ وہ سارا دن یہاں اور اسکول میں رہے اور پھر رات بھی گھر سے دور رہے۔ ایک تو چھاؤنی کا علاقہ تھا دوسرے گیٹ پر گارڈ ہوتا تھا اس لیے خطرے کی کوئی بات نہیں تھی۔ میرا پورشن مکمل طور پر بند اور محفوظ تھا۔ کوئی اندر نہیں گھس سکتا تھا۔

میں یہ رات سوتی جاگتی رہی پھر صبح سویرے نوازش آ گیا۔ وہ پوچھنے آیا تھا کہ مجھے کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے۔ یہاں سے وہ اسکول چلا گیا تھا۔ دوپہر میں وہ آیا تو بہت خوش تھا اس نے بتایا۔

"باجی میرا نویں کا رزلٹ آ گیا ہے۔ اے ون گریڈ آیا ہے۔"

میں بھی خوش ہوئی اسے مبارک باد دی۔ "بہت مبارک ہو نوازش.... اب تمہیں مٹھائی کھلانی ہوگی۔"

"کیوں نہیں باجی.... دادی اِدھر کی خاص مٹھائی بنا رہی ہے باجی.... وہ لے کر آؤں گا، آپ نے ایسی مٹھائی کبھی نہیں کھائی ہوگی۔"

"نوازش تم میٹرک کر کے کیا کرو گے؟"

"باجی میں سوچ رہا ہوں کہ فوج میں بھرتی ہو جاؤں پر دادی نہیں مانتی ہے۔"

میں سمجھ رہی تھی۔ نوازش اپنی دادی کا واحد سہارا تھا۔ وہ اسے فوج میں کہاں جانے دیتی۔ ایسا لگ رہا تھا وہ بے چارہ میٹرک کر کے رہ جائے گا۔ کیونکہ یہاں سے نزدیک ترین کالج بھی کوئی چالیس میل دور ایک چھوٹے شہر میں تھا۔ دادی جو اسے فوج میں نہیں جانے دے رہی تھی وہ اسے کالج میں پڑھنے کی اجازت کہاں دیتی۔ نوازش کا گھر اس کے گاؤں کے اوپری حصے میں پہاڑی پر تھا۔ اس نے ایک بار مجھے علی کی دوربین کی مدد سے اپنا گھر بھی دکھایا تھا۔ اس پر انگور کی بیل چھائی ہوئی تھی اور صحن میں چیری کے درخت لگے ہوئے تھے۔ یہ چھوٹا سا لیکن خوب صورت گھر تھا۔ لیکن یہ سارا علاقہ ہی اتنا حسین تھا کہ اس میں ایک انفرادی جگہ کی خوب صورتی محسوس نہیں ہوتی تھی۔ نوازش کبھی کبھی اپنی دادی کا ذکر کرتا کہ انہوں نے زندگی میں بہت مشکلیں برداشت کیں۔ اس کی خواہش تھی کہ وہ اب بڑھاپا آرام سے گزاریں۔

نوازش نے بتایا کہ وہ ابھی بیس سال کی تھی کہ بیوہ ہو گئی۔ اس کی گود میں نوازش کا باپ تھا۔ اس نے اکیلے ہی بیٹے کی پرورش کی اور اس کی شادی کی مگر اِدھر نوازش ہوا اُدھر قدرت نے پہلے اس کی ماں لے لی اور کچھ عرصے بعد بیٹا بھی دنیا سے چلا گیا۔ نوازش کا اب دادی کے سوا کوئی نہیں تھا۔ اسی نے اسے پال کر اتنا بڑا کیا تھا۔ مجھے اس بوڑھی عورت کی ہمت پر رشک آیا جس نے ساری زندگی دکھ ہی دیکھے اور اب بھی اپنے پوتے کی خاطر جی رہی تھی۔ اگلے دن نوازش آیا تو گھر کی بنی مٹھائی لایا۔ یہ واقعی بہت انوکھی مٹھائی تھی جو چقندر سے بنی تھی اور اس میں شکر قندی کی مٹھاس استعمال کی گئی تھی۔ اس کے ساتھ وہ فصل کے پہلے انگور بھی لایا تھا۔ اس نے بتایا کہ چیری پکنے میں کچھ وقت ہے پھر وہ میرے لیے چیری بھی لائے گا۔ وہ مٹھائی اتنی لایا تھا کہ میں نے آس پاس بھی بھجوائی تھی۔

جانے کے دو دن بعد علی کی پہلی کال آئی۔ مشکل سے دو منٹ بات ہوئی۔ میں چاہنے کے باوجود علی سے سوری نہیں کر سکی اور نہ ہی ٹھیک سے ان کا حال پوچھ سکی۔ زیادہ تر وہی بات کرتے رہے۔ میں چپکے چپکے روتی رہی۔ پھر وقت ختم ہو گیا۔ جب کال منقطع ہوئی تو میں ایک بار پھر تڑپ گئی تھی۔ پچھتاوے اور علی کی بے رخی نے میرا دل دکھا دیا تھا۔ شاید اسی لیے رات میری طبیعت خراب ہوئی۔ ہلکا سا بخار ہوا اور چکر آنے لگے تھے، رات کا کھانا بھی نہیں کھایا۔ صبح حسب معمول نوازش آیا تو اس نے جگایا۔ میں نے بڑی مشکل سے اٹھ کر دروازہ کھولا۔ میری حالت دیکھ کر وہ پریشان ہو گیا۔ اس نے کہا۔ "باجی آپ کو کیا ہوا؟"

"کچھ نہیں طبیعت خراب ہے۔" میں نے کہا۔ "ابھی ناشتا کر کے دوا لے لوں گی۔"

"نہیں آپ کچھ مت کریں۔ میں ابھی دادی کو لے کر آتا ہوں۔" اس نے کہا اور میرے منع کرنے کے باوجود چلا گیا۔ حالانکہ اسے اسکول جانا تھا اور اسے دیر ہو رہی تھی۔ اس کے باوجود وہ اپنی دادی کو لایا اور پھر اسکول گیا تھا۔ یہ اچھا ہوا کیونکہ میری اتنی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ ناشتا ہی بنا سکوں۔ میں نے پہلی بار نوازش کی دادی کو دیکھا تھا۔ وہ تقریباً ساٹھ باسٹھ سال کی سفید بالوں اور بہت سرخ و سفید رنگت کی صحت مند عورت تھی۔ اس نے آتے ہی مجھے بیڈروم میں بھیج دیا اور خود میرے لیے ناشتا بنانے لگی۔ وہ بکری کا دودھ لائی تھی۔ گرم کر کے اصرار کر کے وہ پلایا پھر میں نے ناشتا کیا۔ دوا لے کر میں لیٹ گئی تو اس نے پورے گھر کی صفائی کی اور دوسرے کام نمٹائے۔ میں دوپہر میں اٹھی تو طبیعت بہتر ہو رہی تھی۔ پہلی بار اس سے بات ہوئی۔ اس کا نام رشنابی بی تھا۔

"آپ کا بہت شکریہ آپ نے بہت زحمت کی میرے لیے۔"

"اس میں زحمت کی کیا بات ہے بی بی۔ آپ بھی تو

نوازش کا اتنا خیال رکھتے ہو۔" اس نے انکساری سے کہا۔ شام تک وہ میرے ساتھ رہی اور جب اسے اطمینان ہو گیا کہ میری طبیعت ٹھیک ہے تو وہ گئی اور بہت اصرار کر کے گئی کہ میں اس کے گھر ضرور آؤں۔ میں نے وعدہ کیا کہ اس کے گھر آؤں گی۔ جانے سے پہلے اس نے مجھ سے شادی اور اس سے متعلق کچھ سوالات بھی کیے تھے۔ پھر کہا۔ "آپ بہت کمزور ہو.... میں اب نوازش کے ہاتھ بکری کا دودھ بھیجوں گی۔ یہ روز پیو گی تو بالکل ٹھیک رہو گی۔"

"اس کی ضرورت نہیں ہے بی بی۔" میں نے منع کیا۔

"ضرورت ہے، آپ شہر کے لوگ ہو یہ بات نہیں سمجھتے۔ یہاں پہاڑ کی آب و ہوا الگ ہوتی ہے۔ اِدھر ٹھیک رہنے کے لیے اِدھر کی خوراک لینا ضروری ہے۔"

لہجے سے رشنابی بی پڑھی لکھی اور مہذب لگی تھی۔ وہ صبح سے شام تک میرے ساتھ رہی لیکن اس دوران میں اس نے نہ تو کوئی غیر ضروری بات کی اور نہ ہی سوالات کیے۔ صرف کام کی بات کی اور وہ بھی مختصر الفاظ میں۔ اس کے انداز میں بیک وقت خلوص اور احتیاط تھی۔ وہ مجھ سے ایک حد سے زیادہ فری نہیں ہوئی۔ مجھے اس کا یہ انداز اور رویّہ بہت اچھا لگا تھا۔ اب مجھے معلوم ہوا کہ نوازش اتنا سمجھدار اور تمیز والا لڑکا کیوں تھا۔ اس کی تربیت جو رشنابی بی نے کی تھی۔ اس میں بھی وہی خلوص اور سمجھداری تھی جو مجھے رشنابی بی میں نظر آئی۔ وہ بھی غیر ضروری بات نہیں کرتا تھا اور اس بات پر نظر رکھتا کہ اسے کیا کرنا چاہیے؟ اگلے دن سے رشنابی بی نے دودھ بھیجنا شروع کر دیا۔ میں نے سوچ لیا کہ نوازش کی تنخواہ بڑھا دوں گی اس سے ان کا نقصان نہیں ہوگا۔ ورنہ یہ تو سامنے کی بات تھی کہ وہ جو دودھ یہاں بھیج رہی تھی اس کا اسے نقصان ہو رہا تھا۔ اس کی کمائی ہی ان چیزوں سے ہوتی تھی۔ اس کے علاوہ یہاں کمائی کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔

دودھ سے سچ مچ مجھے بہت فرق پڑا تھا اور میں جو کمزوری محسوس کر رہی تھی وہ چند دن میں دور ہو گئی بلکہ میں خود کو پہلے سے بہتر محسوس کرنے لگی تھی۔ نوازش نے اپنے پاس ہونے کی مٹھائی کھلائی تھی تو میں نے سوچا کہ اسے کوئی تحفہ دوں گی۔ لیکن سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا تحفہ دوں۔ اس لیے میں نے باتوں باتوں میں جاننا چاہا کہ اسے کیا پسند تھا۔ تب مجھے معلوم ہوا کہ اسے پڑھنا پسند تھا مگر اس کی اتنی استعداد نہیں تھی کہ کتابیں خرید سکے۔ اس کے باوجود اس نے کچھ کتابیں لی تھیں۔ مجھے خوشگوار حیرت ہوئی کہ اتنے دور دراز علاقے اور پسماندہ معاشرے میں بھی ایک نوجوان لڑکا مطالعے کا شوق رکھتا ہے۔ جب کہ یہ شوق شہروں میں ختم ہو رہا ہے۔ وہ اتنا تمیز والا تھا کہ اس نے آج تک علی کی کتابوں میں سے بھی کچھ نہیں مانگا تھا۔ حالانکہ کتابوں کی دیکھ بھال اور جھاڑ پونچھ وہی کرتا تھا۔ میں نے احد سے کہہ کر کچھ کتابیں لاہور سے منگوائی تھیں۔

اتفاق کی بات ہے جس دن کتابیں آئیں۔ اسی دن نوازش کو چوٹ لگ گئی۔ اسکول سے آتے ہوئے نالا کراس کرنے کے دوران اس کا پاؤں پھسلا تھا اور پیر میں موچ آ گئی تھی۔ اس کا پڑوسی لڑکا مجھے بتانے آیا تھا کہ وہ ایک دو دن کام پر نہیں آ سکے گا۔ میں نے کہلوا دیا کہ وہ آرام سے آئے جب بالکل ٹھیک ہو جائے۔ پھر مجھے شام کو خیال آیا کہ میں خود جا کر اسے کتابیں دے آؤں۔ میں نے رشنابی بی سے اس کے گھر آنے کا وعدہ بھی کیا تھا۔ کبھی کبھی میں بھی سامان لینے کے لیے قصبے کی مارکیٹ تک چلی جاتی تھی۔ یہاں عورتوں کا باہر جانا معیوب نہیں سمجھا جاتا تھا وہ معاش اور گھر کے کاموں میں برابر کا حصہ لیتی تھیں۔ مگر اکیلے جانے کے خیال سے ہچکچا رہی تھی۔ میں نے ماہا سے کہا تو وہ تیار ہو گئی۔ علی کی جیپ یہیں تھی۔ مجھے ڈرائیونگ آتی تھی۔ ہم دوپہر کے وقت نکلے۔ جیپ قصبے کے نیچے چھوڑنا پڑی تھی کیونکہ اوپر جانے کا راستہ نہیں تھا۔ نوازش کے گھر تک ہم پیدل ہی آئے تھے۔ رشنابی بی مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوئی۔

"بی بی آپ...... میں سوچ رہی تھی آج آپ کے گھر چکر لگاؤں۔"

"میں خود آ گئی.... یہ میری دوست ہے۔" میں نے ماہا کا تعارف کرایا۔

رشنابی بی ہمیں اندر لے آئی۔ مکان کے سامنے والے حصے میں دو کمرے تھے اور ان کے آگے کھلے صحن کے بعد باورچی خانہ، غسل خانہ اور لیٹرین تھا۔ صحن اینٹوں سے بنا ہوا اور صاف ستھرا تھا۔ پچھلے حصے میں سبزیاں اور پھلدار درخت تھے۔ چیری پک رہی تھی اور انگور کے خوشے بھی پک رہے تھے۔ یہاں بھی صفائی ستھرائی تھی۔ اس کے ساتھ بکریوں اور مرغیوں کی دو کوٹھریاں تھیں۔ بدبو اور گندگی سے بچنے کے لیے انہیں الگ رکھا گیا تھا۔ یہاں ایک درخت تلے لکڑی کا تخت تھا جس پر سفید چادر بچھی تھی۔ رشنا

بی بی نے ہمیں یہاں بٹھایا اور خود لسی لے آئی۔ یہ گاڑھا سا دہی ہوتا ہے جس میں شکر ڈال کر اسے خوب ہلایا جاتا ہے۔ اسے یہاں لسی کہتے ہیں۔ جب میں نے پہلی بار پی تو مجھے بہت اچھی لگی تھی۔ پھر اس نے تھال میں تازہ چیری سامنے رکھی۔ میں نے پوچھا۔ ''نوازش کیسا ہے؟''

''اب ٹھیک ہے۔ اندر کمرے میں ہے، میں بلاتی ہوں۔''

''نہیں اسے آرام کرنے دیں۔ میں اس کے لیے یہ تحفہ لائی ہوں۔'' میں نے کتابوں کا پیک اس کے حوالے کیا۔ ''یہ اس کے پاس ہونے پر ہے۔''

رشانی بی خوش ہو گئی۔ ''بیگم صاحب بہت اچھا تحفہ ہے، اسے پڑھنے کا شوق ہے۔''

''ہاں وہ بتا رہا تھا کہ وہ فوج میں بھرتی ہونا چاہتا ہے۔'' میں نے کہا۔ پھر مجھے خیال آیا کہ ان کے معاملے میں دخل اندازی نہ ہو اس لیے میں نے موضوع بدل دیا تھا۔ رشانی بی اسے کتابیں دے آئی تو وہ کچھ دیر بعد خود لنگڑاتا ہوا چلا آیا۔ پاؤں پر دیسی پٹی بندھی تھی۔ اس نے شکریہ ادا کیا۔ پھر منع کرنے کے باوجود باہر سے کچھ لینے چلا گیا۔ میں نے شرمندگی سے کہا۔ ''میں نے آکر زحمت دی۔''

''نہیں بی بی.... اِدھر مہمان اللہ کی رحمت ہوتا ہے۔'' رشانی بی نے کہا۔ ''اور آپ لوگ تو خاص مہمان ہو.... سپاہیوں کا بی بی ہو۔'' کہتے ہوئے رشانی بی کے لہجے میں رشک آگیا۔

''کہاں .... ہمارے شوہر لڑائی پر گئے ہیں۔'' میں نے بے دلی سے کہا۔ مجھے اس کے رشک پر حیرت ہو رہی تھی۔ مجھے خیال آیا شاید اس کے لیے فوجی افسران کا طرزِ زندگی اور ٹھاٹ باٹ قابلِ رشک ہو گا۔ مگر اس نے خلافِ توقع کہا۔

''بیگم صاحب اسی لیے تو خوش قسمت ہو۔ میری تو خواہش ہے کہ نوازش بھی فوج افسر بنے۔ پر ابھی یہ پڑھ رہا ہے۔ کہتا ہے میں سپاہی بھرتی ہو جاتا ہوں۔ مگر میری خواہش ہے یہ افسر بنے۔''

''نہیں یہ تمہارا واحد سہارا ہے۔'' میں نے کہا تو انہوں نے مجھے تعجب سے دیکھا۔

''بی بی سہارا تو بس وہ اوپر والا ہے اور مجھ سے زیادہ کون یہ بات جانتا ہو گا۔ میں نے ساری زندگی اس کے سہارے کاٹی ہے۔ نوازش مرد بچہ ہے اور مرد گھر بیٹھنے کے لیے تھوڑی ہوتا ہے۔''

اب پتا چلا کہ رشانی بی اسے کیوں ابھی فوج میں جانے سے منع کر رہی تھی۔ وہ اسے فوج میں افسر بنانا چاہتی تھی جب کہ وہ اس کا ایک ہی رشتے دار تھا۔ دنیا میں نوازش کے سوا اس کا کوئی نہیں تھا۔ میں نے کہا۔ ''اس سے بہتر ہے وہ آگے پڑھے اور پڑھ لکھ کر کوئی اچھی نوکری کر کے آپ کو بھی یہاں سے لے جائے۔''

''نہیں بی بی میں یہاں سے نہیں جانا چاہتی ہوں۔ یہاں میرا گھر ہے، میرے شوہر اور بیٹے کی قبریں ہیں۔ میں زندگی کے آخری سانس تک یہاں رہنا چاہتی ہوں۔''

اسی دوران میں نوازش آگیا اور بات ختم ہو گئی۔ وہ چائے بنانے کے لیے پتی لے آیا تھا۔ ان کے ہاں چائے نہیں پی جاتی تھی بلکہ علاقے میں ہی رواج نہیں تھا اس لیے گھر میں پتی بھی نہیں تھی۔ چائے اس نے خود بنائی تھی۔ اس کے ساتھ رشانی بی مکئی کے آٹے سے بنی نمکین اور میٹھی ٹکیاں لے آئی۔ وہ کھانے پر روک رہے تھے لیکن ہم دن ڈھلنے سے پہلے واپس جانا چاہتے تھے۔ جاتے ہوئے انہوں نے ڈھیر ساری چیری اور انگور ساتھ کیے تھے۔ کیونکہ ابھی نوازش نہیں آسکتا تھا اس لیے رشانی بی نے کہا۔ ''بی بی میں کل آکر صفائی کر دوں گی۔''

میں نے منع کیا۔ ''اس کی ضرورت نہیں ہے ایک دو دن میں کر لوں گی اور یہاں دھول مٹی ہوتی کہاں ہے جو گھر گندہ ہو۔ بچے بھی نہیں ہیں۔''

''وہ بھی اللہ دے گا۔'' رشانی بی نے خلوص سے کہا۔ ''میں کل ضرور آؤں گی۔''

واپسی میں ماہا کہہ رہی تھی۔ ''حیرت ہے یہ اپنے اکلوتے پوتے کو فوج میں بھیجنا چاہ رہی ہے۔''

''ہاں جب کہ حالات کتنے خراب ہیں۔'' میں نے تائید کی۔ ''سب سے زیادہ نشانے پر ہماری فوج ہے۔''

''لیکن ہمیں یہ جنگ لڑنی ہے۔'' ماہا نے کہا۔

ماہا کی سسرال کراچی میں تھی اور وہ ان سے کچھ تنگ تھی۔ میکے میں صرف دو بھائی تھے۔ ماں باپ نہیں تھے اس لیے وہ یہاں چھوٹے سے بچے کے ساتھ رہنے پر مجبور تھی۔ اس نے ایک بار کہا۔ ''میں تو شروع سے اکیلے رہنے کی عادی ہوں۔ یہاں تو پھر آپ لوگوں کا ساتھ ہے کئی بار تو

ایسی جگہوں پر بھی رہی ہوں جہاں صرف میں واحد عورت ہوتی تھی۔ ہمارے علاوہ اور کسی کی فیملی نہیں تھی۔''

مجھے اس کی ہمت پر رشک آیا۔ اگر میری علی سے لڑائی نہ ہوئی ہوتی اور میں ذہنی طور پر منتشر نہ ہوتی تو شاید میں یہاں نہ رہتی۔ لاہور واپس چلی جاتی۔ مگر اب مجھے ایک ہی بار فیصلہ کرنا تھا اور میں اس کے لیے خود کو مضبوط کر رہی تھی۔ میرا ذہن علی کی بات ماننے کو کسی صورت تیار نہیں تھا۔ مجھے لگ رہا تھا کہ میں ہمیشہ یہ صورتِ حال برداشت نہیں کر سکوں گی۔ شاید اس مسئلے کا واحد حل یہی تھا کہ میں علی سے دور چلی جاؤں۔ اس رات میں نے سوچا اور فیصلہ کیا کہ اب علی کی کال آئے گی تو میں ان سے صاف کہہ دوں گی کہ میں واپس ماما پاپا کے گھر جا رہی ہوں اور جب وہ آرمی جاب چھوڑ دیں تو مجھے لینے آجائیں۔ مجھے یقین تھا کہ میری دوری انہیں مجبور کر دے گی۔ مگر ساتھ ہی خیال آتا کہ اگر وہ نہ مانے تو پھر کیا ہو گا؟

علی کو گئے ہوئے دس دن ہونے کو آئے تھے اور اس دوران میں انہوں نے صرف دو بار مجھے کال کی تھی۔ ان کو محدود وقت ملتا تھا اسی میں انہیں اپنے ابو اور بہن سے بھی بات کرنی ہوتی تھی۔ اگلے دن رشانی بی آئی اور اس نے گھر کی صفائی کے ساتھ میرے کپڑے بھی دھوئے تھے۔ میں نوازش سے کپڑے نہیں دھلوائی تھی۔ مجھے اچھا نہیں لگا تھا کہ ایک مرد میرے کپڑے دھوئے اور یہ مجھے خود دھونا پڑتے تھے جب کہ میں نے آج تک یہ کام نہیں کیا تھا۔ پہلی بار یہیں آکر مجھے کپڑے دھونا پڑے تھے۔ میں نے رشانی بی سے کہا۔ ''آپ دیکھ رہی ہیں۔ ایک آرمی آفیسر کی زندگی کتنی سادہ ہوتی ہے۔''

''مجھے پتا ہے بی بی۔'' اس نے کہا۔

''آپ شاید سمجھتی ہیں کہ آرمی آفیسر کتنے عیش و آرام کی زندگی بسر کرتے ہیں۔''

''بی بی میں ایسا نہیں سمجھتی... میرے بابا آرمی میں تھے اور ایک کرنل صاحب کے اردلی تھے، میں کئی سال ان کے ساتھ رہی اور کرنل صاحب نے ہی میری شادی کرائی تھی۔ میں جانتی ہوں وہ کتنی سادہ زندگی بسر کرتے تھے۔ آپ کے پاس تو بنگلا جیسا گھر ہے، ان کو سادہ بیرک ملی ہوئی تھی جس میں دیواریں بھی انہوں نے خود کھڑی کرائی تھیں اور کمرے بنوائے تھے۔ اس میں ان کی بیوی اور چار بچے رہتے تھے۔''

''جب آپ جانتی ہیں تو نوازش کو کیوں فوج میں بھیجنا چاہتی ہیں۔ وہ آپ کا واحد رشتہ ہے اگر خدانا خواستہ اسے کچھ ہوا تو آپ جیتے جی نہیں مر جاؤ گی؟''

''ایسا نہیں ہے بی بی۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔ ''آپ غلط سمجھ رہی ہو۔ میں نوازش کو کسی فائدے کے لیے فوج میں نہیں بھیجنا چاہتی۔ بی بی یہ تو ہمارے خون میں ہے، اس کے خون میں ہے۔ میرا باپ فوج میں تھا میرا شوہر فوج میں تھا۔ میرا بیٹا فوج میں تھا اور اب میرا پوتا فوج میں جائے یہ میری خواہش ہے۔''

میں حیران ہوئی تھی۔ ''ٹھیک ہے تمہارے خاندان میں لوگ فوج میں ملازمت کرتے ہیں۔ لیکن اب حالات بدل گئے ہیں۔ فوج کی نوکری آسان نہیں رہی ہے۔''

''فوج کی نوکری تو کبھی آسان نہیں تھی۔ ان کی تعیناتی ہوتی رہتی ہے، کبھی یہاں تو کبھی وہاں.... ایک جگہ ٹک کر بس ریٹائرمنٹ کے بعد بیٹھنا نصیب ہوتا ہے۔ میرے بابا نے کشمیر کی جنگ لڑی۔ میرے شوہر نے اکہتر کی جنگ لڑی۔ میرے بیٹے نے سیاچن کی جنگ لڑی۔''

رشانی بی کے جانے کے بعد میں سوچتی رہی کہ یہ بے چارے غریب لوگ ہیں، ان کے لیے سب سے آسان کچھ تعلیم حاصل کر کے فوج میں بھرتی ہو جانا ہے۔ یہی ان کی زندگی کی معراج ہے۔ میری سمجھ میں علی کا رویہ نہیں آرہا تھا۔ وہ کیوں فوج میں رہنے پر مُصر تھے۔ وہ چاہتے تو ان کو بہت اچھی جاب مل سکتی تھی۔ پیچھے سے بھی کوئی کمی نہیں تھی۔ یعنی مالی لحاظ سے کوئی مجبوری نہیں تھی کہ وہ اتنی پُرخطر جاب کرتے۔ اس رات ماما کا فون آیا تو میں نے ان سے کہا

کہ شاید میں کچھ دن میں گھر آجاؤں۔ ماما میرے لہجے سے کھٹک گئیں۔ انہوں نے پوچھا۔ ”کوئی بات ہوئی ہے ثانیہ، تمہارا لہجہ بدلا ہوا لگ رہا ہے۔“

”نہیں ماما۔“ میں نے جلدی سے کہا۔ ”بس علی کے جانے کے بعد طبیعت بوجھل سی ہے۔“

”ٹھیک ہے آجاؤ کیا ڈرائیور اور احد کو بھیج دوں؟“

”جی ماما لیکن جب میں کہوں تب بھیجئے گا۔“

اب مجھے علی کی کال کا انتظار تھا۔۔۔۔ ان کال اگلے دن آئی تھی۔ میں نے علیک سلیک کے بعد ان سے کہا۔ ”علی میں ماما کے پاس جارہی ہوں۔“

”یہ تو اچھی بات ہے میں تم کو پہلے ہی کہہ رہا تھا۔“ وہ بولے۔ ”میں واپس آکر تمہیں وہاں سے لے لوں گا۔“

”صرف ایک صورت میں جب آپ آرمی سے استعفا دے کر آئیں گے۔“ میں نے آہستہ سے کہا تو علی خاموش ہوگئے اور پھر انہوں نے کال بند کردی ایک لفظ کہے بغیر۔ میں نے اسی شام ماما سے کہہ دیا کہ وہ دو دن بعد احد اور ڈرائیور کو بھیج دیں۔ اگلے دن نوازش آیا تو میں نے اسے بتایا کہ اب میں جارہی ہوں۔ وہ اداس ہوگیا۔

”باجی واپس کب آئیں گی؟“

”دیکھو۔۔۔۔ شاید جب علی آجائیں تب آؤں گی۔“

”ٹھیک ہے باجی جب تک میں کوئی اور کام دیکھ لوں گا۔“

”بے شک تم کوئی اور کام بھی کرلو لیکن تمہاری تنخواہ رہے گی۔“ میں نے کہا۔ ”تم اس وقت کا فائدہ اٹھا کر پڑھو، جتنے اچھے نمبر آئیں گے کسی اچھے کالج میں داخلہ آسانی سے ملے گا۔“

”نہیں باجی تنخواہ تو کام کی لیتا ہوں۔“ اس نے فخر سے کہا۔ ”نمبر تو میرے ویسے بھی اتنے اچھے آئے جب میں کام بھی کررہا تھا۔ باجی میں فوج میں جانا چاہتا ہوں۔“

مجھے خیال آیا اور میں نے پوچھا۔ ”رشنا بی بی تم کو فوج میں افسر بنا کر۔۔۔۔ بھیجنا چاہتی ہیں۔ ان کو ڈر نہیں لگتا کہ تم ان کا واحد سہارا ہو۔“

”نہیں باجی وہ بہت بہادر ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ میں سپاہی کی بیٹی، سپاہی کی بیوی اور سپاہی کی ماں ہوں۔ اس لیے وہ چاہتی ہیں کہ میں بھی فوج میں جاؤں۔“

”اور تم ابھی جانا چاہتے؟“ میں نے کہا۔ ”کیا تمہیں ڈر نہیں لگتا؟“

”نہیں باجی، اللہ کی قسم میری بھی یہی خواہش ہے پر میں دادی کو اس عمر میں چھوڑ کر جانا نہیں چاہتا۔ لیکن میں فیصلہ نہیں کر پاتا اگر میں فوج میں گیا تو انہیں اکیلے رہنا پڑے گا۔“ نوازش نے کہا۔ ”پھر ابھی میں پڑھ رہا ہوں، ہو سکتا ہے انٹر کے بعد آئی ایس بی کے لیے اپلائی کروں۔“

مجھے عجیب سا لگا تھا۔ میں چاہتی تھی کہ علی استعفا دے دیں اور وہ کہہ رہا تھا کہ شاید وہ اپلائی کرے۔ میں نے کہا۔ ”تب بھی تو رشنا بی بی کو اکیلے رہنا پڑے گا۔“

نوازش شرمایا۔ ”بات یہ ہے باجی کہ دادی کہتی ہیں جب میں انٹر کرلوں گا تو وہ میری شادی کردیں گی۔ تب وہ اکیلی نہیں رہیں گی۔“

”لیکن پھر تمہاری بیوی ہوگی اور تمہاری ذمے داری اور بڑھ جائے گی۔“

”بی بی میں اٹھاؤں گا ذمے داری۔“ اس نے اعتماد سے کہا۔ ”بیوی اپنی جگہ اور کام اپنی جگہ۔“

”تمہاری بیوی مان جائے گی کہ تم فوج میں جاؤ۔ تین سال تو ٹریننگ ہوگی اور اس کے بعد بھی بہت سال تک تمہیں بیوی رکھنے کے لیے جگہ نہیں ملے گی۔“

”وہ یہیں رہے گی اور میں چھٹیوں میں تو آؤں گا۔“ اس نے یوں کہا جیسے پہلے سے سوچا ہوا تھا۔ ”اور کیوں نہیں مانے گی۔ میری خالہ کی لڑکی ہے بچپن سے میری منگ ہے۔“

”اچھا تم نے بتایا نہیں۔“

”بس جی شرم آتی تھی۔“ اس نے شرما کر کہا۔

اگلے دن احد اور ڈرائیور کو مجھے لینے آنا تھا اور میں نے رات میں تیاری کرلی تھی۔ اسی وجہ سے دیر سے سوئی اور صبح اٹھی تو چکر سے آرہے تھے۔ نوازش آیا تو بھانپ گیا۔ اس نے کہا۔ ”آج بھی آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے میں دادی کو بھیجتا ہوں۔“

رشنا بی بی کچھ دیر میں آگئی تھی۔ اس نے میری حالت دیکھی تو فکر مند ہوگئی۔ ”بی بی آپ نے آج لمبا سفر کرنا ہے لاہور جاتے ہی ڈاکٹر کو دکھانا۔“

”میں ٹھیک ہوں۔“ میں نے کہا۔

”نہیں بی بی۔۔۔۔ ڈاکٹر کو دکھانا ضروری ہے بعض اوقات ایسی حالت میں چکر آتے ہیں۔“

”کیسی حالت میں؟“

”بی بی ہو سکتا ہے خوشخبری ہو اللہ کی طرف سے۔“ رشنا بی بی نے کہا تب میری سمجھ میں آیا۔ میں نے جھینپ کر کہا۔

”نہیں ایسا کیسے ہوسکتا ہے۔“

رشنا بی بی ہنسی۔ ”کیوں نہیں ہوسکتا بی بی، ماشاءاللہ شوہر والی ہو۔“

میرا دل دھڑک اٹھا تھا۔ شادی کے بعد کئی بار علی نے بچوں کی خواہش کا اظہار کیا تھا اور سچی بات ہے خود مجھے بھی خواہش تھی کہ میں ماں بنوں۔ لیکن میں نے اس بارے میں زیادہ سوچا نہیں تھا۔ دوپہر تک میری حالت خاصی بہتر ہوگئی تھی پھر احد اور ڈرائیور آگئے تھے۔ دن میں ہی میدانی علاقے میں پہنچنے کے لیے ہم فوری روانہ ہوگئے تھے۔ احد مجھ سے چار سال چھوٹا تھا اور اسی سال اس نے ایف ایس سی کا امتحان دیا تھا۔ وہ ایک مہینا پہلے اٹھارہ سال کا ہوا تھا اسے ڈرائیونگ آتی تھی لیکن پاپا اسے اس خطرناک پہاڑی علاقے میں ڈرائیونگ کی اجازت نہیں دیتے اسی لیے اس کے ساتھ ڈرائیور آیا تھا۔ اس نے مجھے راستے میں بتایا کہ رزلٹ آنے کے بعد وہ آئی ایس بی کے لیے اپلائی کرے گا۔ میں اچھل پڑی تھی۔ ”تم بھی احد۔۔۔۔“

”ہاں آپی اور کون ہے جو اپلائی کررہا ہے۔“

”ہمارے ہاں جو لڑکا کام کرتا ہے اس کا بھی یہی ارادہ ہے۔ حالانکہ اس کی دادی کا اس کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔“

احد نے شانے اچکائے۔ ”ہوسکتا ہے آپی بہت سے لوگ آرمی میں جانا چاہتے ہیں۔“

”پلیز احد یہ بہت خطرناک ہے۔“

”آپی پاکستانی ہونا ہی خطروں کا نام ہے۔ آپ بتائیں یہاں کون سی جگہ اور ادارہ ہے جہاں خطرہ نہیں ہے۔ سڑک پر نکلنا بھی خطرناک ہے آپی اور پھر آرمی کا اپنا چارم ہے۔ میں تو کہتا ہوں آپ خوش قسمت ہیں جو علی بھائی آرمی میں ہیں۔ کیسی خوب صورت جگہ رہ رہی ہیں اور پورا پاکستان گھوم لیں گی علی بھائی کی ریٹائرمنٹ تک۔“

”تم جانتے ہو وہ کہاں ہیں اور وہاں کتنا خطرہ ہے؟“

”پھر وہی بات خطرہ کہاں نہیں ہوتا ہے۔“ احد نے بے پروائی سے کہا۔ ”اللہ نے چاہا تو وہ سرخرو ہو کر واپس آئیں گے۔“

مجھے حیرت ہوئی، کل تک کا لاابالی اور کھلنڈرا احد کیسی سنجیدگی سے بات کررہا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ جاتے ہی ماما سے بات کروں گی کہ وہ اسے منع کریں۔ صرف ماما پاپا ہی اسے منع کرسکتے تھے۔ مگر طویل سفر کے بعد لاہور پہنچی تو میری طبیعت پھر خراب ہورہی تھی اور میں نے ماما کو رشنا بی بی کے اندازے سے آگاہ کیا تو وہ پُرجوش ہوگئیں۔ اس وقت میری ہمت نہیں تھی کہ ان کے ساتھ اسپتال جاتی مگر اگلے دن وہ مجھے لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے گئیں اور اس نے ٹیسٹ کے بعد تصدیق کردی کہ میں امید سے تھی۔ ابھی آغاز تھا اور پہلا موقع تھا۔ اس لیے اس نے بہت ساری احتیاطی تدابیر کے ساتھ طاقت کی کئی دوائیاں اور سپلی منٹ بھی دے دیے۔ ماما بہت خوش تھیں مگر میں ذرا فکر مند تھی۔ اگرچہ خوشی تو مجھے بھی ہوئی تھی لیکن پھر مجھے یاد آگیا کہ

میں نے علی سے کیا کہا تھا اور اس پر ان کا کیا ردِعمل تھا۔ ماما نے بھانپ لیا انہوں نے گھر آتے ہی مجھ سے علیحدگی میں پوچھا۔ "ثانی کیا بات ہے جب تم نے کال کی تھی تب بھی تمہارا لہجہ بدلا ہوا تھا؟"

میں ہچکچائی پھر ماما کو بتا دیا۔ "ماما میں نہیں چاہتی کہ علی اب مزید آرمی کی جاب کریں۔"

"یہ کیا بات ہوئی اگر وہ آرمی چھوڑ دے گا تو کیا کرے گا اور وہ کیوں آرمی چھوڑے؟"

"ماما وہ کوئی اور جاب کر سکتے ہیں' ایم بی اے ہیں۔ میں دن رات کے اندیشوں کے ساتھ نہیں رہ سکتی۔ وہ پہلی بار گئے ہیں اور میں آپ کو بتا نہیں سکتی کہ ان کے جانے سے پہلے ہی میری کیا حالت ہو گئی تھی۔"

"ٹھیک ہے تمہیں اندیشے ہوئے ہوں گے لیکن اس کا حل آرمی چھوڑنا تو نہیں ہے۔"

"ماما میں ایسے نہیں رہ سکتی۔" اس بار میں نے صاف گوئی سے کہہ دیا۔ "میں نے آخری کال پر علی سے کہہ دیا ہے کہ وہ اسی صورت میں مجھے یہاں لینے آئیں جب وہ آرمی سے استعفا دے دیں۔"

ماما پریشان ہو گئیں۔ "ثانی یہ کیا حماقت کی ہے۔ ایک تو وہ اتنی نازک پوزیشن میں ڈیوٹی پر گیا ہے اور اوپر سے تم نے اسے ٹینشن دے دی۔"

"ماما تو کیا میں ٹینس نہیں ہوں۔" میں نے احتجاج کیا۔ "کیا مجھے حق نہیں ہے کہ میں علی سے کوئی مطالبہ کر سکوں۔"

"میں تمہارے پاپا سے کہتی ہوں لیکن مجھے لگ رہا ہے تم نے بہت غلط فیصلہ کیا ہے۔ ثانی تمہیں ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔"

"ماما احد بھی آرمی میں جانے کا سوچ رہا ہے، پلیز اسے منع کریں۔"

"ثانی اگر اس نے کوئی غلط فیصلہ کیا ہوتا تو میں اور تمہارے پاپا سوچتے بھی، اس نے بہت اچھا فیصلہ کیا ہے اور ہماری تائید اس کے ساتھ ہے۔"

"مگر کیوں ماما.... اسے کیا کمی ہے؟"

"بات کمی کی نہیں ہے۔ یہ اس کا شوق ہے اور تمہارے پاپا بھی خوش ہیں۔" ماما نے کہا۔

"میری سمجھ میں آپ لوگوں کا رویّہ نہیں آ رہا ہے۔" میں نے سر جھٹکا۔

"مجھے تو تمہاری سمجھ نہیں آ رہی ہے اگر تمہیں آرمی پسند نہیں تو علی کو کیوں پسند کیا؟"

"بس ماما.... یہ محبت بے بس کر دیتی ہے۔"

"تو اب تمہاری محبت کیا ہوئی؟"

"ماما یہ سوچ کر میرا دل ہولتا ہے کہ علی کو کچھ ہو نہ جائے۔"

"ثانی وہ مرد ہے۔ اس کا کام ہی دنیا کی سختیوں کا سامنا کرنا ہے۔ میں تمہیں بتا دوں اسے اگر کوئی زخم لگا تو اس کی اتنی تکلیف نہیں ہوگی جتنی تمہارے اس رویّے کی ہوگی۔"

میں چپ ہو گئی۔ ماما نے پاپا کو بتایا تو اگلے دن شوروم سے آنے کے بعد انہوں نے مجھ سے بات کی۔ "بیٹا آپ کیوں چاہتی ہو کہ علی آرمی چھوڑ دے۔"

"کیونکہ میں انہیں خطروں میں نہیں دیکھ سکتی پاپا۔"

"یہ کیا بات ہوئی بیٹا.... علی آرمی میں ہے اور آرمی کا کام ہی خطروں کا سامنا کرنا ہے اور بیٹا وطن کی حفاظت کرنا تو عزت کی بات ہے۔ یہ زمین ماں کی طرح ہے۔ ماں اپنی اولاد پال پوس کر اس لیے تو بڑا نہیں کرتی ہے کہ وہ خطرے کے وقت اسے چھوڑ جائے۔"

"پاپا میں یہ سب باتیں سمجھتی ہوں لیکن میرا دل نہیں سمجھتا۔"

"اسے سمجھاؤ بیٹا.... میں علی کو جانتا ہوں' وہ کبھی آرمی نہیں چھوڑے گا۔ بے شک تم ساری عمر یہاں بیٹھی رہو اور ایک بات اور ہے بیٹا ہم نے اسے داماد اسی لیے چنا تھا کہ وہ آرمی میں ہے۔ اس سے زیادہ باعزت پیشہ اور کیا ہو سکتا ہے۔"

"میں جانتی ہوں پاپا۔"

"تم نہیں جانتیں بیٹا کیونکہ تمہاری نسل کو پتا ہی نہیں کہ یہ ملک ہم نے کیسے حاصل کیا۔ اس میں قصور ہمارا ہی ہے جو ہم نے اپنی نئی نسل کو اس کی اہمیت سے آشنا نہیں کیا۔ میں ایک سال کا تھا اور ماں جی کی گود میں تھا جب یہ ملک بنا۔ ابا جی اور ماں جی دو دن مسلسل سفر کرتے رہے۔ وہ جس قافلے کے ساتھ تھے جب وہ مشرقی پنجاب سے چلا تو اس میں ہزاروں لوگ تھے اور جب وہ پاکستان کی سرحد میں داخل ہوا تو مشکل سے سو لوگ بچے تھے باقی سب اس ملک پر قربان ہو گئے۔"

میں حیران ہوئی۔ "پاپا یہ سب مجھے نہیں پتا ہے۔"

پاپا نے گہری سانس لی۔ "میں نے کہا نا یہ ہمارا قصور ہے جو اپنی اولاد کو اپنے ماضی کے ورثے سے آگاہ نہیں کرتے ہیں۔ ہم وہاں چھ مربع زمین چھوڑ کر آئے تھے اور یہاں ہمیں صرف ایک مربع بنجر زمین ملی۔ ابا جی نے اسی پر محنت کر کے اسے قابلِ کاشت بنایا اور پھر اسے دو مربع کیا۔ یہ ان کی محنت کا ثمر تھا جو ہم کھا رہے ہیں۔ پینسٹھ کی جنگ ہوئی تو میں انیس سال کا تھا۔ ابا جی اور ماں جی کا ایک ہی بیٹا تھا مگر انہوں نے بلا جھجک مجھے رضاکار فوج میں بھیج دیا۔ میں نے این سی سی کی ٹریننگ لی تھی۔ مجھے محاذِ جنگ پر بھیجا گیا اور وہاں مجھے یہ زخم آیا۔" پاپا نے پنڈلی سے پائنچا اوپر کر کے دکھایا۔ میں نے بارہا یہ زخم دیکھا تھا مگر مجھے نہیں معلوم تھا کہ یہ کیسے لگا۔ "بیٹا جی کمایا تو بہت ہے بلکہ کمایا کیا ہے اس ملک نے سب دیا۔ جواب میں بس یہ ایک زخم دیا ہے.... یہی اصل کمائی ہے۔" انہوں نے پائنچا نیچے کیا۔ "میری بڑی خواہش تھی کہ میرا کوئی بچہ فوج میں جائے۔ مگر میں نے کبھی کسی اولاد کو مجبور نہیں کیا کہ اسے یہ کام کرنا ہے۔ اب احد نے خود سے خواہش کی ہے تو مجھے کتنی خوشی ہے میں تمہیں بتا نہیں سکتا۔"

"لیکن پاپا آج کل جو حالات ہیں۔"

"بیٹا جی ان ہی حالات میں تو ضروری ہے کہ لوگ اپنے بچوں کو آرمی میں بھیجیں اور جو نہیں بھیج سکیں وہ آرمی کی حمایت کریں۔ یہ بھلے ہوں یا برے لیکن ہمارے محافظ یہی ہیں۔ بیٹا اگر ہماری فوج نہ ہو تو انڈیا ہمیں کھا جائے گا اور اسے کوئی نہیں روکے گا۔"

ماما اور پاپا کی باتیں سن کر میرا دل نرم پڑنے لگا تھا اور مجھے احساس ہوا تھا کہ میں نے علی کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ مگر میں ان سے بات نہیں کر سکتی تھی۔ مجھے ماما کے پاس آئے تیسرا دن تھا۔ میں نے اسی دن اپنے سسر کو خوشخبری سنا دی تھی۔ ان کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی وہ دو دن بعد ملنے آئے۔ وہ بھی علی کے لیے فکرمند تھے کیونکہ پانچ دن سے ان کی طرف سے کوئی اطلاع نہیں آئی تھی۔ شروع کے چھ دن میری طبیعت خراب رہی تھی لیکن جب باقاعدگی سے دوا کا استعمال کیا تو طبیعت سنبھل گئی۔ اب مجھے شدت سے علی کی کال کا انتظار تھا میں ان سے سوری کرنا چاہتی تھی۔ میں سارا دن موبائل اپنے ساتھ رکھتی تھی اور رات بھی اسے سرہانے رکھ کر سوتی تھی کہ کسی وقت علی کی کال آئے تو مجھے فوری پتا چل جائے۔ ماما کے ہاں آئے ہوئے ایک ہفتہ ہوا تھا کہ رات موبائل کی بیل بجی میں نے نیند سے جاگ کر کال ریسیو کی۔

"علی آپ ہیں...."

"نہیں بھابی میں ضیا بات کر رہا ہوں۔"

"ضیا بھائی.... آپ.... علی کہاں ہیں.... آپ بولتے کیوں نہیں؟"

"حوصلہ بھابی حوصلہ کریں.... کیپٹن ٹھیک ہیں۔" ضیا نے کہا تو میں نے سکون کا سانس لیا۔

"پھر انہوں نے کال کیوں نہیں کی؟"

"بھابی ایک ایکشن میں وہ زخمی ہوئے ہیں اور اس وقت سی ایم ایچ راولپنڈی میں ہیں۔"

"نہیں۔" میرے منہ سے چیخ نکلی۔ "آپ کہہ رہے ہیں کہ وہ ٹھیک ہیں۔"

"بھابی آپ کسی کے ساتھ آ جائیں۔ ہم ابھی یہاں پہنچے ہیں۔ میرے پاؤں میں بھی گولی لگی ہے لیکن میں نے ابھی ماما کو نہیں بتایا ہے اسے اب کال کروں گا۔"

میں نے اٹھ کر فوری ماما پاپا کو بتایا۔ میں اس طرح رو رہی تھی کہ وہ بھی دہل گئے۔ جب میں نے بتایا کہ علی سی ایم ایچ میں ہیں تو ان کی جان میں جان آئی۔ ماما اور پاپا جلدی تیار ہو گئے اور ہم صبح سے پہلے پنڈی روانہ ہو گئے۔ موٹر وے کے راستے تین گھنٹے میں وہاں جا پہنچے تھے۔ علی ابھی انتہائی نگہداشت کے شعبے میں تھے اور فی الحال کسی کو ملنے کی اجازت نہیں تھی۔ میں ضیا بھائی سے ملی۔ وہ اب کمرے میں شفٹ کر دیئے گئے تھے۔ انہوں نے بتایا کہ ایک چھوٹے گاؤں میں دہشت گرد آ کر چھپ گئے تھے۔ انہوں نے مقامی آبادی کو یرغمال بنا رکھا تھا اور وہ ان لوگوں کو انسانی ڈھال کے طور پر استعمال کر رہے تھے۔ تاکہ سیکورٹی فورسز ان پر حملہ نہ کر سکیں۔ گاؤں والوں کو بچانے کے لیے آرمی نے کمانڈو ایکشن کیا اور اس میں علی اور ان کی ٹیم شامل تھی۔ انہوں نے تاریکی کے بعد وہاں حملہ کیا اور تمام دہشت گردوں کو ہلاک کر دیا۔ اس ایکشن میں دو جوان شہید اور علی سمیت چھ افراد زخمی ہوئے تھے لیکن تمام مقامی افراد محفوظ رہے۔ کچھ زخمی ہوئے تھے لیکن جان کسی کی نہیں گئی تھی۔ تمام زخمیوں کو ہیلی کاپٹر سے یہاں منتقل کیا گیا تھا۔ علی کو سینے پر دو گولیاں لگی تھیں وہی سب سے زیادہ زخمی تھے۔ بڑی مشکل سے ڈاکٹروں نے مجھے ایک نظر دیکھنے کی اجازت دی تھی۔ علی بستر پر ساکت لیٹے ہوئے تھے اور ان کے چہرے پر آکسیجن ماسک تھا۔ مختلف مانیٹرز جسمانی حالت بتا رہے تھے۔ ڈاکٹروں نے پاپا کو بتایا کہ اگلے بارہ گھنٹے اہم ہیں۔ اگر اس دوران میں علی کو ہوش آ گیا تو ان کے بچنے کا

امکان تھا۔

میں اور ماما پاپا صبح تک اسپتال میں رہے۔ ہم ویٹنگ روم میں تھے۔ ایک نرس آئی میں سمجھی کہ وہ علی کے بارے میں بتانے آئی ہے لیکن اس نے کہا۔ "مسز علی احمد ایک عورت آپ سے ملنا چاہتی ہے۔"

"کون ہے؟"

"یہیں داخل ہے۔" نرس نے کہا۔ "آیئے میرے ساتھ۔"

عورت خواتین کے لیے مخصوص وارڈ میں داخل تھی اور حلیے وصورت سے شمالی علاقے کی رہنے والی لگ رہی تھی۔ اس نے بڑی واجبی سی اردو میں کہا۔ "میں گل جان اے.... آپ کا مرد..... سب کو بچایا..... میرا مرد..... بچہ..... سب بچایا..... ام کو ایک گولی لگا.... پر باقی سب بچ گیا۔"

وہ عورت جو زبان سے نہیں بتا سکی تھی وہ اس کے آنسو کہہ رہے تھے۔ وہ سراپا شکر گزار تھی کہ علی اور ان کے ساتھیوں نے اسے اور اس کے گھر کو دہشت گردوں سے بچا لیا تھا۔ اس لمحے فخر اور عزت کا جو احساس مجھے ہوا اس نے مجھے سرشار کر دیا تھا۔ میں بھول گئی کہ علی شدید زخمی ہیں اور ان کی جان خطرے میں ہے۔ میں نے اس عورت سے کہا کہ میرے شوہر نے اس پر یا اس کے گھر والوں پر احسان نہیں کیا ہے۔ یہ ان کا فرض تھا اور اگر وہ اپنا فرض پورا نہ کرتے تو میں کبھی ان کی صورت نہ دیکھتی۔ میں نے واپس آ کر ڈاکٹر سے کہا کہ مجھے علی کے پاس رہنے کی اجازت دی جائے۔ وہ بڑی مشکل سے مانے تھے۔ شاید بیوی ہونے کے ناتے مجھے اجازت مل گئی۔ میں ان کے بستر کے پاس بیٹھ گئی تھی۔ وہ بے ہوش تھے سن نہیں سکتے تھے لیکن میں ان سے باتیں کرتی رہی اور معافی مانگتی رہی۔ ان سے وعدہ کرتی رہی کہ اب کبھی نہیں تنگ نہیں کروں گی۔ آرمی چھوڑنے کا نہیں کہوں گی۔ رات بھر کے سفر اور تھکن کے ساتھ ذہنی دباؤ نے بھی اثر کیا تھا۔ نہ جانے کب میں کرسی پر بیٹھے بیٹھے سو گئی۔ پھر میری چھٹی حس نے جھنجوڑا تو میں چونکی۔ علی ہوش میں تھے اور ایک ٹک مجھے دیکھ رہے تھے۔ میں لپک کر ان کے پاس آئی۔

"آپ کو ہوش آ گیا.... اللہ کا شکر ہے۔"

"ہاں مجھے بے ہوشی میں لگا کہ تم پکار رہی ہو پھر ہوش آیا تو تم میرے سامنے تھیں۔"

میں نے ان کے بازو پر سر رکھ دیا۔ "علی، مجھے معاف کر دیں۔"

"اب تو مجھے آرمی چھوڑنے کا نہیں کہو گی۔"

"نہیں.... ہاں اگر آپ نے آرمی چھوڑی تو میں آپ کو چھوڑ دوں گی۔"

علی مسکرانے لگے۔ "یہ دونوں باتیں ناممکن ہیں۔"

میں نے بیل کا بٹن دبایا اور نرس دوڑی آئی۔

☆☆☆

ہم پورے دس مہینے بعد آئے تھے۔ علی دو مہینے اسپتال میں رہے تھے۔ ان کی ری کوری کے لیے دو آپریشن اور ہوئے تھے اس کے بعد صحت کی بحالی کے لیے وہ چھ مہینے آرام اور پھر دو مہینے ری کوری پروگرام پر عمل کرتے رہے۔ پھر ڈیوٹی پر آئے تھے۔ بہادری اور کامیاب آپریشن پر ان کا نام تمغا پانے والی لسٹ میں آیا تھا۔ ہم واپس شمالی چھاؤنی پہنچے تو سب نے گرم جوشی سے استقبال کیا تھا۔ ضیا بھائی بھی کیپٹن بن گئے تھے اور وہ اب ٹرانسفر ہو کر جا رہے تھے۔ میری گود میں موجود ننھے حمزہ نے اس بار سب کی توجہ حاصل کر لی تھی۔ اگلے دن نوازش اور رشنا بی بی ملنے آئے۔ نوازش نے میٹرک کا امتحان دے دیا تھا اور اس کا رزلٹ آنے والا تھا۔ میں نے نوازش سے کہا۔ "میں تمہارے لیے بندوبست کر کے آئی ہوں۔ تم لاہور جاؤ گے۔ وہاں کالج میں پڑھو گے اور پاپا کے شوروم میں پارٹ ٹائم جاب کرو گے۔ کالج میں داخلے اور ہاسٹل میں رہائش کا بندوبست پاپا کریں گے۔"

نوازش خوش ہوا تھا مگر پھر اسے رشنا بی بی کا خیال آیا۔ "میں دادی کو چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔"

"تم رشنا بی بی کی فکر مت کرو جب تک میں یہاں ہوں یہ میری ذمے داری ہیں۔ ہم ان کا خیال رکھیں گے۔"

نوازش ہچکچا رہا تھا مگر جب رشنا بی بی نے اپنے پالنے والے کا واسطہ دیا۔ "اگر تجھے میرا ذرا بھی خیال ہے تو تو ضرور جائے گا اور پھر فوج میں افسر بنے گا۔"

نوازش مان گیا تو رشنا بی بی کی خوشی دیکھنے والی تھی۔ میں سوچنے لگی کہ اس قوم اور فوج کو کون شکست دے سکتا ہے جس کی مائیں اپنے اکلوتے سہاروں کو ہنسی خوشی فوج میں بھیجتی ہیں اور اس پر فخر کرتی ہیں۔ اسی وقت میں نے سوچ لیا کہ حمزہ نے بڑے ہو کر فوج میں جانے کا فیصلہ کیا تو میں اسی طرح ہنسی خوشی اسے اجازت دوں گی۔